فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ

حیاتِ رسولِ اُمّی ﷺ

خالد مسعود

تلمیذ

مولانا امین احسن اصلاحی

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ

حیاتِ رسولِ اُمّی ﷺ

خالد مسعود

تلمیذ

مولانا امین احسن اصلاحی

دار التذکیر

□ اہتمام: محمد احسن تہامی
□ مطبع: گنج شکر پرنٹرز
□ طبع اول: 2003
□ تعداد: 500
□ قیمت: 375 روپے

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار
لاہور۔54000 فون:7231119

E-mail : info@dar-ut-tazkeer.com
Website : dar-ut-tazkeer.com

22528

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

اَلحمدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ

1960ء کی دہائی کے آغاز میں مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے کچھ نوجوانوں کو دین کی تعلیم دینے کے لیے 'حلقہ تدبر قرآن' منظم کیا جو چند سالوں تک قائم رہا۔ میں نے اس حلقہ میں شامل ہو کر مولانا سے عربی سیکھی، قرآن وحدیث پر غور وفکر کی تربیت پائی اور دین کا فہم حاصل کیا۔ بعد میں یہ حلقہ تو حوادث کا شکار ہو گیا لیکن مولانا کی ذات، ان کے علمی مشاغل اور ان کے طرز فکر کے ساتھ فی الجملہ میرا تعلق قائم رہا۔ اس زمانہ میں مولانا کی اولین ترجیح قرآن حکیم کی تفسیر لکھنا تھی جس کی تکمیل 1970ء کی دہائی کے اواخر میں ہوئی اور اب وہ 'تدبر قرآن' کے نام سے معروف اردو تفاسیر میں اپنا بلند مقام بنا چکی ہے۔

شاید یہ 1967ء کا سال تھا کہ مولانا رحمہ اللہ کے ایک دوست نے ان سے قرآن مجید کی روشنی میں سیرت النبیؐ پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی اور کہا کہ اگر آپ یہ کام کر سکیں تو ایک بڑی علمی و دینی خدمت ہو گی۔ مولانا نے فرمایا کہ بلاشبہ یہ ایک اچھی تجویز ہے اور میں اس کی ضرورت کا بھی قائل ہوں لیکن میں نے تفسیر قرآن لکھنے کا جو بیڑا اٹھایا ہے وہ اس وقت میری ہمہ تن مشغولیت کا تقاضا کرتا ہے اور میں اس مرحلہ میں اس سے صرف نظر نہیں کرنا چاہتا۔ ان صاحب نے پوچھا کہ آپ نے جن طلبہ کو پڑھایا ہے کیا ان میں سے کوئی اس کام سے عہدہ برا ہونے کی استعداد رکھتا ہے۔ مولانا نے اس کے جواب میں میرا نام لیا۔ مولانا کے اس جواب پر میں دل ہی دل میں ہنسا کہ من آنم کہ من دانم، مولانا میرے بارے میں کس قدر خوش فہمی میں مبتلا ہیں! اس طرح یہ بات آئی گئی ہو گئی اور میں نے کبھی اس موضوع پر سوچا تک نہیں۔

اس واقعہ کے گیارہ بارہ سال بعد مولانا نے اپنی تفسیر مکمل کی۔ جب فارغ ہوئے تو ان کی عمر 75 سال سے متجاوز تھی اور وہ کسی نئے علمی کام میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے ان کے دوستوں اور شاگردوں نے انہیں ہفتہ میں ایک یا دو دن قرآن وحدیث کا درس دینے پر آمادہ کیا۔ مولانا نے یہ ذمہ داری بارہ سال تک نبھائی یہاں تک کہ ان کے قویٰ بالکل مضمحل ہو گئے۔

1986ء میں یا اس کے لگ بھگ پاکستان کے نامور ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر بشیر الدین محمود نے اسلام آباد میں اپنی تنظیم ہولی قرآن فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس کے مندوبین کے لیے متعدد موضوعات تجویز کیے گئے تھے۔ مجھے بھی اس میں شرکت اور مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ میں نے عنوانات پر

ایک نظر ڈالی تو بہت سے عنوانات تو وہی تھے جو ہر دینی کانفرنس کے ایجنڈے پر ہوتے ہیں لیکن چند عنوانات روایت سے ہٹ کر بھی تھے۔ محض اس خیال سے کہ دوسری قسم کے ان عنوانات پر لکھنے کے لیے کسی قدر محنت کی ضرورت ہوگی اور مطالعہ کا موقع ملے گا، میں نے ان میں سے کسی میں حصہ لینے کا عندیہ دے کر منتظمین کو اپنی شرکت کی اطلاع دے دی۔ ان میں ایک عنوان تھا 'قرآن کی حربی تعلیم'۔ میں نے اس کے تحت اپنا مقالہ 'قرآن کا تصور جنگ' لکھا۔ اس کو کانفرنس میں پڑھا تو سامعین نے اس کی تعریف کی۔ کانفرنس میں میرے اس خطاب کو ریڈیو پر بھی نشر کیا گیا۔

مقالہ کی تیاری کے دوران مجھے قرآن کی حربی تعلیم کو اجاگر کرنے کے لیے دور رسالت کے بعض غزوات کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ ان کی روایت میں بعض باتیں قرآن کی تصریحات کے سراسر منافی تھیں اور عقلاً بھی ان کی توجیہ ممکن نہیں تھی۔ بعض روایات قرآن کے مطابق نظر آئیں لیکن معلوم ہوا کہ سیرت نگاران کو اہمیت نہیں دیتے، اس لیے دوسری روایات لوگوں میں مشہور ہو چکی ہیں جو قرآن کے بیان کردہ اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اس حقیقت کے انکشاف پر میں نے غزوہ بدر، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ پر تحقیقی مضامین شائع کیے جنھوں نے متعدد اہل علم کو متاثر کیا۔ انھوں نے میرے نقطہ نظر کو سراہا اور باقی غزوات پر بحث کو مکمل کرنے کا تقاضا کیا۔ میں نے جنگوں کے پورے سلسلہ پر اپنی تحقیق کو قلمبند کر لیا تو دوستوں کا تقاضا ہوا کہ اس کو کتاب کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ میں نے جب اس پر مجموعی نظر ڈالی تو اس نتیجہ تک پہنچا کہ اس میں رسول اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ اور آپ کے منصب رسالت کا ایک یک رخا اور ناقص تصور سامنے آتا ہے۔ اس کو مکمل کرنے کے لیے دور رسالت کی جنگوں کے تذکرہ کے علاوہ حضورؐ کی کامل شخصیت اور آپ کی دعوت کا بھرپور تعارف کرانا ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے اس پہلو سے نئے عنوانات قائم کر کے ان پر کام شروع کیا جس کے نتیجہ میں سیرت طیبہ پر یہ نئی کتاب تیار ہوگئی جو قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کی تحریر و تسوید کے دوران میرا رخ مذکورہ بالا واقعات نے متعین کیا ہے۔ یہ بات خدا ساز ہوئی ورنہ جب استاذ گرامی کی زبان سے اس کام کے لیے میرا نام نکلا تھا تو میرے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں سیرت النبیؐ پر کوئی کتاب تحریر کر سکتا ہوں۔

کتاب کے بہت سے ابواب استاذ گرامی مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کی زندگی میں شائع ہوئے لیکن اس وقت تک ان کی شکل متفرق مقالات سیرت کی تھی۔ ان کو سیرت پر ایک کتاب کے اجزا کے طور پر متعارف نہیں کرایا گیا تھا۔ اس لیے میں اس کتاب کے بارے میں مولانا رحمہ اللہ کی رائے متعین طور پر نقل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔

سیرت النبیؐ کے مآخذ:

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ایک مشہور قول کتب حدیث میں نقل ہوا ہے کہ جب ان

سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کَانَ خُلُقُہُ الْقُرآن یعنی آپ کا اخلاق وکردار تو قرآن ہی سے متشکل ہوا تھا۔ دوسرے الفاظ میں قرآن میں جو کچھ الفاظ میں ادا ہوا ہے اس کو عملی جامہ پہنایا جائے تو وہ حضورؐ کی سیرت طیبہ بن جاتی ہے۔ام المومنینؓ کا یہ قول قرآن سے ماخوذ اور حقیقت پر مبنی ہے۔قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَکُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ (الطلاق ۶۵: ۱۰۔۱۱)

اللہ نے تمہاری طرف ذکر اتارا ہے، یعنی رسول، جو اللہ کی واضح آیات تمہیں سناتا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور صالح اعمال کرتے رہے ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے۔

اس آیت میں رسول اللہؐ کو ذکر، یعنی قرآن مجید کے بدل کے طور پر پیش کیا ہے، گویا قرآن اور رسول حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ ایک الفاظ کی شکل میں ہے تو دوسرا انسانی جسم کی شکل میں ہے۔قرآن پڑھیے تو اس میں رسول اللہ ﷺ کی ذات وصفات، آپ کی بعثت کے کوائف، دعوت دین کے مراحل، ہجرت، جنگوں کے واقعات، مشرکین اور یہود کے ساتھ اہم بحثوں اور حضورؐ کی زندگی سے متعلق دیگر موضوعات کا بیان ملتا ہے۔ ایک آدمی قرآن کا مطالعہ غور سے کرے تو وہ سیرت النبی کے تمام ضروری مباحث سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔اسی لیے یہ بات علمی حلقوں میں مانی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات پاک یا سیرت کا سب سے اہم ماخذ قرآن مجید ہے۔ اس کے بعد احادیث صحیحہ اور اولین کتب سیرت کا مطالعہ اس کے مآخذ کی حیثیت سے رہنمائی دیتا ہے۔ اس اعتراف کے باوجود عملاً یہ دیکھا گیا ہے کہ حضورؐ کے جدید سیرت نگاروں نے ماضی میں لکھی گئی کتب سیرت ہی پر اعتماد کیا ہے۔جن لوگوں نے قرآن سے استفادہ کیا ہے وہ بالعموم محض آیات کو نقل کر دیتے ہیں، ان سے سیرت نگاری میں مدد نہیں لیتے۔ اس لیے نقل کردہ آیات بے ربط سی نظر آتی ہیں۔

سیرت کو پیش کرنے میں لوگوں کے سامنے الگ الگ مقاصد رہے ہیں۔بعض کتابوں میں حضورؐ کے محض ذاتی کوائف جمع کیے گئے ہیں، بعض میں آپ کو ہر پہلو سے ایک انسان کامل کی حیثیت میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کچھ کتابوں میں ایک مصلح کے طور پر حضورؐ کی خدمات کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔بعض کتابیں جنگوں میں اختیار کی گئی حضورؐ کی تدابیر کی روشنی میں آپ کو ایک بہترین جنگی کمانڈر ثابت کرتی ہیں، بعض میں حضورؐ ایک داعی دکھائی دیتے ہیں، بعض میں آپ کی جدوجہد کو ایک دینی تحریک کے طور پر دیکھا گیا ہے اور بعض مصنفین نے اپنی کتابوں کو عقیدت میں ڈوب کر اس طرح لکھا ہے کہ حضورؐ ایک فوق البشر ہستی نظر آتے ہیں۔ان تصانیف میں اگر کسی حیثیت کو نظر انداز کیا گیا ہے تو وہ آپ کی اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت ہے۔

سیرت نگاری کا مطلوب انداز:

اس میں شک نہیں کہ اللہ کا رسول ایک کامل انسان ہوتا ہے، وہ داعی بھی ہوتا ہے اور مصلح بھی، ضرورت پڑنے پر اس کو جنگیں بھی لڑنی پڑتی ہیں اور وہ ان میں کوئی کمزوری نہیں دکھاتا، وہ بہترین معلم بھی ہوتا ہے اور منصف بھی، اس کو سیاسی فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں لیکن اس کو جو چیز دوسرے انسانوں سے ممیز کرتی ہے وہ اس کا مہبط وحی، حامل کتاب اللہ اور لوگوں کی طرف اللہ کا رسول ہونا ہے۔ اس لحاظ سے اسے اللہ تعالیٰ اور انسانوں کے درمیان واسطہ بننا، نازل ہونے والی وحی کو محفوظ کرنا، اس کو اپنوں اور پرایوں تک پہنچانا، اس پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب مہیا کرنا اور اس کی روشنی میں ایمان لانے والوں کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔ اس کام میں رسول آزادی سے کوئی اقدام نہیں کرتا۔ وہ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت کام کرتا ہے۔ وہ اللہ کی براہ راست نگرانی میں ہوتا ہے۔ اس کو اپنے جانی دشمنوں کے اندر رہ کر دین حق کی تبلیغ کرنی ہوتی ہے لیکن وہ اس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے کیونکہ رسول کو اللہ تعالیٰ کی حفاظت حاصل ہوتی ہے۔ رسول کے مخاطب بھی اللہ کے بتائے ہوئے بعض قوانین کی زد میں ہوتے ہیں۔ وہ ان قوانین کے اثرات سے کسی طرح بچ نہیں سکتے اور رسول کی جدوجہد فیصلہ کن ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک رسول کی سیرت لکھتے وقت یہ تمام پہلو مدنظر رکھنے ضروری ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ رسول اللہؐ کی حیات مبارکہ اور دعوت دین کی جدوجہد کو اس تناظر میں پیش کروں۔ اس میں مجھے مشکل یہ پیش آئی کہ قدیم سیرت نگاروں نے حضورؐ کی رسول اللہ ہونے کی حیثیت کے حوالہ سے بہت کم واقعات قلم بند کیے، لہٰذا ان کو قرآن ہی کی مدد سے واضح کرنا پڑا۔ اسی لیے اس کتاب میں آیات کی کثرت مضمون کی تفہیم کے لیے ضروری تھی۔

میری یہ کوشش رہی ہے کہ کتب سیرت کی روایات سے بھی بھرپور استفادہ کروں۔ بالعموم میں نے ان کو سیرت نگاروں کی تحقیق وبیان کی روشنی میں قبول کرلیا ہے لیکن جہاں کوئی روایت رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت کے موافق نظر نہیں آئی وہاں میں نے اس کا سقم واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان تمام اعتبارات سے قارئین اس کتاب کو دوسری کتب سیرت سے مختلف پائیں گے لیکن ان شاء اللہ اس کی ہر اہم بحث دلائل وشواہد سے تہی دامن نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ میری اس کاوش کو شرف قبول عطا فرمائے۔ میرے لیے یہ کتاب توشۂ آخرت ثابت ہو اور قارئین کو اس سے منصب رسالت کے حقیقی مقام کو سمجھنے میں مدد ملے۔ واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

۱۲ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ	خالد مسعود
مطابق ۱۵ مئی ۲۰۰۳ء	لاہور

حصہ اوّل

تاریخی پس منظر

باب 1

تخلیق آدم اور منصب خلافت

تاریخ انسانی کا نقطۂ آغاز کرۂ زمین پر اولین انسانی فرد، آدم، کی تخلیق ہے۔ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے اس جداعلیٰ کی تخلیق کب، کہاں اور کیسے ہوئی، زمین کے کس حصہ میں اس نے زندگی بسر کی، کتنی عمر پائی، اور اس کے دوران میں کتنی نسل انسانی وجود میں آئی، اس کے بارے میں کسی کے پاس حتمی معلومات نہیں ہیں۔ علم الانسان کے بعض جدید علماء تخلیق آدم کو حیوانی ارتقا کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس اس دعویٰ کے حق میں فیصلہ کن سائنسی شواہد موجود نہیں ہیں۔ کسی بھی حیوانی فرد کو بہترین سے بہترین تربیت دے دی جائے، وہ صفات اور صلاحیتوں کے اعتبار سے انتہائی غبی اور کم عقل انسان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ علم الانسان کے اہل تحقیق انسان کے اندر غیر معمولی صلاحیتوں، وجدان اور عقل کے کرشموں، اور جانوروں پر اس کی نمایاں فوقیت کی معقول توجیہ پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

تخلیق آدم کی مذہبی توجیہ:

جدید علماء و مفکرین کے نقطہ نظر کے برعکس تمام آسمانی مذاہب نے تخلیق آدم کا ایک مختلف ماجرا سنایا ہے۔ اس کا نہایت مربوط اور جامع و دلنشیں بیان آخری آسمانی کتاب قرآن میں تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم سے قبل کرۂ زمین بنایا، اس کے اندر میدان اور پہاڑ رکھے، پانی کے ذخیرے پیدا کیے، ہواؤں کی گردش اور بارش کا نظام بنایا، مٹی میں فصلیں اور پھل پھول اگانے کی صلاحیت پیدا کی اور زمین کو انسانی حیات کی ضروریات کے لحاظ سے موزوں اور سازگار بنادیا[1]۔ اس کے بعد فرشتوں کے سامنے اس ارادہ کا اظہار فرمایا کہ میں زمین میں اپنی نیابت کا فرض ایک نئی مخلوق کے سپرد کرنا چاہتا ہوں جس کی تخلیق مٹی کے عناصر سے ہوگی۔ نائب کی حیثیت سے اس کو بعض اختیارات حاصل ہوں گے جن کو استعمال کرنے میں وہ آزاد ہوگا۔ وہ اپنی صوابدید پر فیصلے کرے گا اور ان پر عمل کرنے کا اس کو پورا موقع حاصل ہوگا۔ یہ سن کر فرشتوں نے عرض کی کہ اگر اس

نئی مخلوق کا مقصد وجود اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد کرنا ہے تو اس فریضہ کو ادا کرنے میں ہم کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ لیکن اگر اس مخلوق کو خود مختار بنا دیا جائے گا اور وہ اپنی صوابدید کے مطابق فیصلے کرنے اور ان کو بروئے کار لانے میں آزاد ہو گی تو ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ اپنی آزادی سے غلط فائدہ اٹھا کر زمین کو فتنہ وفساد اور خونریزی کی وارداتوں سے بھر دے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے خدشات درست نہیں ہیں کیونکہ ابھی تم میری پوری اسکیم سے آگاہ نہیں ہو۔ تم نہیں جانتے کہ میں اس مخلوق کو نیابت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے کس طرح تیار کروں گا۔ لہٰذا جب اس نئی مخلوق کو وجود بخشا جائے اور اس کو روح یزدانی سے مشرف کیا جائے تو تم سب اس کو سجدہ کرنا اور اس کی تعظیم بجالانا۔

جس مخلوق کو وجود میں لانے کا ابھی منصوبہ ہی تھا اور جس کے معیار کارکردگی کے بارے میں فرشتے ابھی مطمئن نہیں تھے، اس کو سجدہ کرنے کا حکم، ظاہر ہے کہ اس معنی میں نہیں تھا کہ یہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی طرح مقدس تھی بلکہ حقیقت میں یہ حکم فرشتوں کے جذبۂ اطاعت کی آزمائش کے لیے تھا۔ اس کا مقصد زمین میں بھیجی جانے والی نئی مخلوق کی اللہ تعالیٰ کے نائب وخلیفہ ہونے کی حیثیت کو تسلیم کروانا تھا تاکہ فرشتے اس کو اپنا اختیار پوری آزادی کے ساتھ استعمال کرنے میں معاون ہوں اور ان کی طرف سے اس کو کوئی مزاحمت پیش نہ آئے۔

سجدہ کا حکم اصلاً تو فرشتوں کے لیے تھا کیونکہ وہی اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو نافذ کرتے ہیں لیکن تبعاً یہ ہر اس مخلوق کے لیے بھی تھا جو اللہ رب العزت کی اس اسکیم کو نافذ کرنے میں رکاوٹ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ زمین پر پہلے جنات آباد تھے جو ایک ناری مخلوق ہیں۔ چونکہ وہ نئی مخلوق کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھ سکتے تھے اس لیے ان کو بھی سجدہ کے حکم میں شامل کیا گیا۔

جب آدم کو وجود عطا کیا گیا اور اس میں روح یزدانی پھونکی گئی تو فرشتوں نے حکم الٰہی کے مطابق ان کو سجدہ کیا لیکن جنات کے فرد ابلیس نے ایسا کرنے میں عار محسوس کی۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ میری تخلیق کا مادہ انسان کے مادۂ تخلیق سے افضل ہے۔ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا جبکہ آدم کو مٹی سے بنایا گیا ہے۔ آدم پر واضح برتری رکھتے ہوئے میں اس کو سجدہ کیوں کروں! ابلیس کا یہ رویہ رعونت اور تکبر پر مبنی تھا اور یہ صفت اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے کیونکہ کبریائی اسی ذات کے شایان شان ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی اور اظہار تکبر کے باعث ابلیس کو اللہ کے قرب سے محروم کر دیا گیا۔

آدم کی تخلیق کے ساتھ ہی ان کی پشت سے آئندہ پیدا ہونے والے تمام انسانوں کی روحیں بھی پیدا کر دی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کے سامنے ان کا مقصد تخلیق رکھا۔ ان سے اقرار لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا واحد

مالک وآقا تسلیم کریں گی۔ سب نے اس حقیقت کو مانا اور اس کے حق میں گواہی دی۔ یہ اقرار گویا اس بات کا تھا کہ ان روحوں کو جب جب مادی وجود عطا کر کے زمین پر بھیجا جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا مالک وآقا تسلیم کرتے ہوئے زمین میں اس کی نیابت کے فرض کو پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ ادا کریں گی۔ اس موقع پر آدم کو حکم ہوا کہ وہ اپنی نسل میں پیدا ہونے والی ان عظیم شخصیات کا تعارف فرشتوں سے کروائیں جو اللہ رب العزت کی نیابت کا حق نہایت احسن طور پر ادا کرنے والی ہیں۔ جب آدم نے ان کا تعارف فرشتوں سے کروایا تو وہ پکار اٹھے کہ پروردگار! ہمیں اپنی کوتاہی علم کا اقرار ہے۔ ہم تخلیق آدم کی اسکیم پر معترض ہوئے۔ ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اس مخلوق میں ایسے انسان بھی ہوں گے جو آزادی کے غلط استعمال پر قادر ہوتے ہوئے بھی تیرے تابع فرمان رہیں گے اور اظہار عبودیت میں ہم پر بھی بازی لے جائیں گے۔

ابلیس کو مہلت:

ابلیس کی تذلیل اور محرومی کا باعث چونکہ آدم بنے تھے اور اب وہ زمین میں مقتدر حیثیت کے مالک بننے والے تھے، ان کی نسل میں پیدا ہونے والی عظیم شخصیات بھی نہایت باصلاحیت ہونے والی تھیں، اس لیے ابلیس نے ان سے اپنی محرومی کا انتقام لینے کی منصوبہ بندی کی۔ اس نے بارگاہ خداوندی میں عرضداشت پیش کی کہ جب مجھے ایک کڑے امتحان سے دوچار کر کے اس میں میری ناکامی پر مجھے راندۂ درگاہ قرار دیا گیا ہے تو مجھے یہ موقع دیا جائے کہ جب تک آدم اور ان کی نسل زمین میں بسے، میں ان کو ورغلا کر ان کے قدم تیری ہدایت سے ڈگمگا سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے یہ کام کرنے کی آزادی ہو تو میں اولاد آدم کو اس طرح بھٹکا دوں گا کہ وہ تیری نیابت کی ذمہ داریوں کو بھول کر تیری باغی اور نافرمان بن کر اٹھے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی درخواست منظور کر لی اور اسے موقع دیا کہ وہ بجبر نہیں، بلکہ دلوں میں وسوسے پیدا کر کے، لالچ اور خوف دلا کر، جھوٹے وعدے کر کے اور مستقبل کے سہانے خواب دکھا کر انسان کو ورغلا سکتا ہے۔ ابلیس نے کہا کہ جب میری یہ درخواست منظور کر لی گئی ہے تو میں اپنی پوری قوت وصلاحیت کو بروئے کار لا کر آدم اور اس کی اولاد کو تیری ہدایت سے بھٹکاؤں گا، ان پر ہر چہار جانب سے حملہ آور ہوں گا، جو سیدھی راہ تو ان کو بتائے گا میں اس پر مورچہ لگا کر بیٹھوں گا تا کہ وہ اس کو اختیار نہ کر سکیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ تیری نافرمانی کریں گے بلکہ تیری وحدانیت کو بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ میں ان کو شرک میں اس طرح مبتلا کروں گا کہ وہ تیرے بالمقابل حقیر جانوروں کو زیادہ محترم جانیں گے اور مال واولاد میں تیرے شریک ٹھہرائیں گے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ تو یاد رکھ کہ جو لوگ تیرے پیچھے لگ جائیں گے، میں ان

سب کو تیرے ہمراہ جہنم میں ڈالوں گا۔ مجھے قطعاً اس بات کا ملال نہیں ہوگا کہ اتنی کثیر تعداد میں انسان آگ میں جھونکے جا رہے ہیں۔ لیکن میرے فرض شناس بندوں پر تیرا کوئی داؤ کامیاب نہیں ہوگا اور وہ میری اطاعت کی راہ نہیں چھوڑیں گے۔ انجام کار وہ میرے برگزیدہ بندوں کی حیثیت سے نعمتوں کے باغوں میں داخل ہوں گے۔

آدم کی اطاعت کا امتحان:

اللہ تعالیٰ نے آدم کی رفاقت کے لیے ان کی بیوی حوا پیدا کی اور ان دونوں کو جنت میں سکونت اختیار کرنے کا حکم دیا۔ وہ اس میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ جنت کی ہر نعمت ان کی دسترس میں تھی اور وہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ ان پر کسی طرح کی قدغن نہیں لگائی گئی۔ صرف ایک درخت ایسا تھا جس کا پھل کھانے سے ان کو منع کیا گیا۔ ان پر یہ بات واضح کر دی گئی کہ وہ پوری جنت میں گھومنے پھرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں بالکل آزاد ہیں، لیکن اس خاص درخت کے قریب بھی نہ جائیں ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔ ادھر ابلیس آدم سے دشمنی کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ اس تاک میں رہا کہ آدم اور حوا کو کسی طرح رب کی نظروں سے گرائے۔ اپنے کھلے عزم و اعلان کے مطابق اس نے اپنے داؤں انہی پر آزمانے کا فیصلہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ دونوں حکم عدولی کے مرتکب ہوں۔ اس مقصد کے لیے اس نے خاص درخت کا پھل نہ کھانے کے واحد حکم ہی کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے آدم اور حوا سے مل کر ان کو اس درخت کی جھوٹی خوبیاں بتائیں۔ اس نے بتایا کہ جو شخص اس درخت کا پھل کھا لے وہ اپنا مرتبہ بلند کر سکتا اور فرشتوں میں شامل ہونے کا اہل ہو جاتا ہے۔ نیز پھل کھانے کے نتیجہ میں اس کو دائمی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ باتیں دل کو بھانے والی تھیں۔ آدم کی خواہش ہوئی کہ وہ پھل کھا کر اپنا مرتبہ بلند کر کے فرشتوں میں شامل ہو جائیں لیکن اس میں اللہ کے حکم کی نافرمانی کرنی پڑتی تھی اس لیے وہ حکم عدولی کی جسارت نہ کرتے۔ ابلیس ان کی اس ذہنی کیفیت سے بالکل مایوس نہیں ہوا بلکہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے آدم اور حوا دونوں کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب اس کی یہ کوششیں بار آور نہ ہوئیں تو اس نے قسمیں کھا کھا کر ان کو یقین دلایا کہ وہ ان کا خیر خواہ ہے۔ اور اسی جذبہ کے تحت ان کی بہتری کے لیے یہ مشورے دے رہا ہے۔ غیر معمولی ترغیب و تحریص کے نتیجہ میں بالآخر آدم اور حوا اپنا مرتبہ بلند کرنے اور لازوال زندگی پانے کی آرزو میں حکم عدولی کے مرتکب ہو گئے اور شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ یوں ابلیس کی پے در پے کوششیں رنگ لائیں اور وہ بدیر ہی سہی، آدم اور حوا کو فریب دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس طرح آدم ابتدائی امتحان میں ناکام ہو گئے۔

رب کی حکم عدولی کا فوری نتیجہ یہ سامنے آیا کہ آدم جنت کے لباس سے محروم کر دیے گئے اور میاں بیوی کو

اپنا ستر چھپانے کے لیے جسم پر درختوں کے پتے جمانے پڑے۔ اب ان کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ ابلیس نے ان کو چکمہ دے کر اللہ کے حکم کی خلاف ورزی پر آمادہ کیا ہے اور اس طرح ان کو جنت کی نعمتوں سے محروم کر دیا ہے۔ اب وہ اپنے کیے پر سخت نادم ہوئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنی غلطی کی تلافی کس طرح کریں۔ وہ احساس ندامت کے ساتھ رب ہی کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے ان کی قلبی کیفیت کے مطابق دعا کے یہ الفاظ ان کی زبان پر جاری کر دیے کہ اے ہمارے رب، ہم نے تیری حکم عدولی کر کے اپنی جانوں پر بڑا ظلم ڈھایا۔ اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر ترس نہ کھایا تو ہم بڑے نقصان سے دوچار ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بندے کی طرف سے تقصیر کے اعتراف اور ندامت کے آنسوؤں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جب بندہ گناہ کے ارتکاب کے فوراً بعد تائب ہو کر بخشش کا طلب گار ہوتا ہے تو وہ اس کی تقصیر کو معاف فرما دیتا ہے۔ چنانچہ آدم اور حوا کی دعا قبول ہوئی اور ان کی غلطی معاف کر دی گئی لیکن آئندہ کے لیے ان کا مسکن زمین کو قرار دے دیا گیا۔

آدم کی کمزوری اور عزم و حوصلہ کی کمی اور دوسری طرف ابلیس کی مکاری کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ میں آئندہ زندگی میں وقتاً فوقتاً اپنی ہدایت تمہاری اور تمہاری نسل کی رہنمائی کے لیے نازل کرتا رہوں گا۔ تمہارا ہر فرد اس کی روشنی میں زندگی گزارے گا تا کہ اللہ رب العزت کی خلافت و نیابت کی ذمہ داری کا حق ادا کر سکے۔ ہر فرد کے لیے ایک متعین عرصۂ حیات ہوگا جس کے دوران اللہ تعالیٰ اس کو آزمائش میں ڈال کر دیکھے گا کہ وہ کیسا عمل کرتا اور خلافت کی ذمہ داری سے کیسے عہدہ برا ہوتا ہے۔ اس دوران میں وہ ابلیسی قوتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے عمل سے جنت کا استحقاق ثابت کرے گا اور اس امتحان میں سرخرو ہو کر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمیشہ کے لیے شادکام ہوگا۔ لیکن اگر وہ ابلیسی قوتوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور یہ قوتیں اس کو چکمہ دے کر پھر رب کی نافرمانی پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو وہ اللہ کے فضل و کرم سے محروم اور اس کی تجویز کردہ سزا بھگتنے پر مجبور ہوگا۔ زمین پر آدم و حوا کی سکونت کے اس حکم سے گویا اس اسکیم کا عملی نفاذ شروع ہوا جس کے لیے آدم کی تخلیق ہوئی تھی اور اسے رب کریم کی نیابت کی ذمہ داریاں کرہ ارض پر ادا کرنی تھیں[2]۔

جنت میں آدم کے قیام کا مقصد:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خلافت آدم کی اسکیم کا آغاز زمین پر سکونت کے حکم سے ہوا تو اس سے پہلے آدم کو جنت میں رکھنے کا مقصد کیا تھا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کو اس کے منصب خلافت پر فائز

کرنے سے پہلے جنت میں رکھ کر بعض حقائق کا ادراک کرانا مقصود تھا۔ ان کو ایک تجربہ سے گزار کر رب کی نیابت کی ذمہ داریوں کی نوعیت سے آگاہ کرنا، ابلیس کو دی گئی مہلت کے مضمرات، انسان کے ساتھ اس کی دشمنی کی سنگینی اور اس کے نتائج سے خبردار کرنا پیش نظر تھا۔ یہ ایک تربیتی پروگرام تھا جس سے آدم پر کئی حقیقتیں کھلیں:

اولاً، یہ کہ ان کو خلیفہ کی حیثیت سے کچھ احکام دیے جائیں گے اور کچھ چیزیں ان کے لیے ممنوع قرار دی جائیں گی۔ رب کی وفاداری کا تقاضا یہ ہوگا کہ اس کی ہدایت پر من وعن عمل کیا جائے۔ جن باتوں کو اس نے ممنوع قرار دیا ان کے قریب نہ پھٹکا جائے اور تمام معاملات میں رب کی مرضی پوری کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔

ثانیاً، ابلیس نے جو مہلت عمل حاصل کی ہے وہ آدم اور اولاد آدم کی بدخواہی، عناد اور دشمنی کے باعث حاصل کی ہے۔ لہٰذا اس کا انسان سے تعلق تعاون یا دوستی وخیر خواہی کا نہیں ہوگا۔ اگرچہ وہ اپنی مقصد براری کے لیے وقتی طور پر ہمدردی اور خیر خواہی کا ڈرامہ رچائے گا اور ایک ناصح ومشفق کا لبادہ بھی اوڑھ لے گا لیکن اس لبادہ کے اندر ایک مکار دشمن چھپا ہوا ہوگا، جس کو پہچاننا اور اس کے مکروفریب سے بچنا اولاد آدم کی ذمہ داری ہوگی۔

ثالثاً، ابلیس اور اس کے کارندے ہر دور میں اس کوشش میں رہیں گے کہ وہ اولاد آدم کو رب کی ہدایت پر عمل سے روکنے کے لیے لالچ، حرص، اندیشہ ہائے دور دراز، جھوٹے وعدوں، فریب، پروپیگنڈا اور وسوسوں کے ہر حربہ کو آزمائیں۔ ان کے انسان پر حملہ آور ہونے کی کوئی ایک ہی شکل نہیں ہوگی۔ لہٰذا اولاد آدم کو ان کی مکاری سے ہروقت چوکنا رہنا ہوگا۔

رابعاً، اگر کسی وقت اولاد آدم اپنی بے خبری یا سادہ لوحی کے باعث ابلیس کے دام تزویر میں گرفتار ہوکر اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کی مرتکب ہوجاتی ہے تو اس کی تلافی کے لیے اس کو فی الفور اپنے رب کے دامن عفو میں پناہ طلب کرنی ہوگی۔ خطا پر اصرار ابلیسی صفت ہے لہٰذا اس سے اس کو بچنا ہوگا۔

خامساً، جنت کی حقیقی وراثت پانے کے لیے ہر فرد کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی دنیاوی حیات میں شیطان کا مقابلہ کرے اور اس کو پچھاڑ دے۔ اگر شیطان اس کو پچھاڑنے میں کامیاب رہا تو وہ خلافت کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں ناکام سمجھا جائے گا اور اس کی سزا اس کو بھگتنا ہوگی۔

منصب خلافت کے اہم تقاضے:

یہ بات بالکل واضح اور بدیہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی خلافت ونیابت کے فرائض اسی وقت ادا کرسکتا ہے جب یہ بات اس پر اچھی طرح روشن ہو کہ خدا کی مرضیات کیا ہیں، وہ کس چیز کو پسند کرتا اور کس کو ناپسند کرتا ہے،

اس کی خوشنودی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا منصب خلافت کا بنیادی تقاضا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لیے ان کے علم کا اہتمام کرے اور اگر اس کی عطا کردہ ہدایات کبھی ذہنوں سے محو ہونے لگیں تو وہ پھر سے ان کی یاددہانی کرا دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس علم کا اہتمام یوں فرمایا کہ انسان کو فطری وجدان عطا فرمایا جو اس کے لیے حق و باطل، نیک و بد، اور صحیح و غلط کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت کے اندر موجود حق کی آواز سنتا اور اگر چاہے تو اس کی روشنی میں صحیح راستے کا انتخاب کر کے باطل اور غلط کاموں سے بچتا ہوا زندگی گزار سکتا ہے۔ اسی وجدانی علم کے باعث وہ بھلے کام کر کے ان سے سکون و اطمینان پاتا ہے، لیکن اگر وہ غلط روش اختیار کر لیتا ہے تو وہ اس پر شرمندگی محسوس کرتا اور حتی الوسع اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس فطری وجدان کی تائید و معاونت کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدمی کے گردوپیش میں اور خود اس کی ذات کے اندر دلائل کا ایک عظیم ذخیرہ فراہم کر دیا جس سے استفادہ کے لیے اس نے آدمی کو سمع و بصر، تجربہ و مشاہدہ اور واقعات و حوادث سے سبق حاصل کرنے کی صلاحیتوں سے نوازا۔ آدمی اگر ان صلاحیتوں کو بھرپور طریقہ سے استعمال کرے تو یہ وجدانی علم اس کی رہنمائی کا بیش قیمت ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ تاہم ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی ایک حد ہے جس سے آگے یہ کارآمد نہیں رہتیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل سے نوازا جو علم کا دوسرا ذریعہ اور اخذ نتائج میں نہایت کارآمد ہے۔ عقل جزوی امور کے مشاہدہ کی روشنی میں اصول و کلیات وضع کر لیتی اور ان کلیات کی مدد سے جزوی امور میں رہنمائی فراہم کر سکتی ہے۔ تاہم عقل کی رسائی بھی محدود ہے۔ حسی چیزوں سے بالاتر امور پوری طرح اس کی گرفت میں نہیں آتے۔ نیز اس کے فیصلے جذبات اور وسوسوں کی زد میں رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ غلط فیصلے بھی کر دیتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو محض وجدان اور عقل سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے نہیں چھوڑا بلکہ اپنی ہدایات ٹھیک طور پر انسان تک پہنچانے کا سامان کیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے وحی کا ذریعۂ علم اختیار کیا جو ان کمزوریوں سے پاک ہے جو وجدان اور عقل میں پائی جاتی ہیں۔ جب آدمی راہ راست پر ہوتا ہے تو وجدان، عقل اور وحی تینوں میں ہم آہنگی اور موافقت پائی جاتی ہے۔ انسان کی رہنمائی کا یہ ہمہ پہلو اہتمام ہی وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ میں انسان کی ہدایت اور رہنمائی کا ایسا انتظام کروں گا کہ میرے بندے میری مرضی کے مطابق کام کرنا چاہیں گے تو ان کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی اور وہ شیطان کے ہتھکنڈوں سے اپنے آپ کو بچا لے جائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو اس ہدایت کو نظرانداز کریں گے تو شیطان ان کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

انسان کو ذرائع علم عطا کر دینے کے بعد اور زمین پر اس کے قیام کو ایک امتحان قرار دینے کے بعد یہ بات مخفی نہیں رہ جاتی کہ انسان کی ذمہ داری کی مسئولیت بھی ہونے والی ہے۔ جس طرح ہر امتحان کا نتیجہ بھی ایک روز سامنے آتا ہے، آدمی کی خوبیاں اور خامیاں سب حساب میں آ جاتی ہیں اور انجام کار اس کی مجموعی کارکردگی کی روشنی میں اسے کامیاب یا ناکام قرار دیا جاتا ہے، اسی طرح لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسا دن لائے جس میں ہر شخص کی وفاشعاری یا بے وفائی، اطاعت یا حکم عدولی، امانت یا خیانت، ہر چیز کا ریکارڈ پرکھا جائے۔ چنانچہ منصب خلافت کا یہ اہم تقاضا بھی واضح کر دیا گیا کہ جو لوگ اپنے دنیاوی عرصۂ حیات میں اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دیں گے اور وحی کے ذریعے رب کی نازل کردہ ہدایات کے مطابق زندگی گزاریں گے ان کو اخروی زندگی میں اعزاز و اکرام کے ساتھ جنت میں داخل کیا جائے گا جہاں وہ ہر طرح کی نعمت سے متمتع ہو کر امن و سکون کے ساتھ رہیں گے۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے دنیا میں خلافت کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں کوتاہی کی ہوگی اور رب کی ہدایت کو ماننے سے انکار کیا ہوگا ان کا مواخذہ ہوگا اور انہیں ابدی سزا دینے کے لیے جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انسان کی دنیاوی زندگی اصل میں حق و باطل کی ایک کشمکش میں گزرے گی۔ اس آویزش میں بنیادی اہمیت آسمانی ہدایت کو حاصل ہوگی۔ اولاد آدم کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس ہدایت کو قبول کرے، اس کے مطابق زندگی بسر کرے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرے۔ ابلیسی قوتوں کا سارا زور اس بات پر صرف ہوگا کہ وہ اولاد آدم کو اس ہدایت سے بے بہرہ رکھیں۔ اس کے خلاف پروپیگنڈا کریں، اس کو بدلنے یا تلف کرنے کی کوشش کریں، اس پر عمل کرنے والوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کریں اور ان کو پریشان کریں، اور اگر کوئی شخص اس کا علمبردار بن کر سامنے آئے تو اس کو جھوٹا ثابت کریں اور اس کو شکست سے دوچار کرنے کی جدوجہد کریں۔

حواشی وحوالہ جات

ا دیکھیے سورہ حم السجدہ۔۴۱: ۹۔۱۲

۲ تخلیق آدم اور آدم کی ذمہ داریوں کے بارے میں قرآن حکیم کے مندرجہ ذیل مقامات کا مطالعہ مفید ہوگا:

سورہ البقرہ۔۲: ۳۰ تا ۳۹ سورہ الاعراف۔۷: ۱۱ تا ۲۷

سورہ الحجر۔۱۵: ۲۶ تا ۴۸ سورہ بنی اسرائیل۔۱۷: ۶۱ تا ۶۵

باب 2

نظام نبوت ورسالت

علم وحی انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک خصوصی عطا ہے جس کے ذریعہ سے اس نے انسان کی ہدایت کا ایک بے خطا نظام قائم کیا ہے۔ وحی کے اصل معنی دل میں بات ڈالنے اور اشارہ سے پیغام دینے کے ہیں۔ لیکن اس کے لیے یہ شکل اختیار نہیں کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کے ہر فرد کو بلاواسطہ کوئی ہدایات دی ہوں۔ ذات کبریا سے ہم کلام ہونے میں حقیقی مانع انسان کا اپنا ضعف، ناتوانی اور نااہلیت ہے۔ اس کے انوار وتجلیات ایسے ہیں کہ انسان اس سے رو در رو ہونے کی تاب نہیں لاسکتا۔ یہود کی تاریخ میں بیان ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے خواہش ظاہر کی کہ اللہ تعالیٰ خود ان سے ہم کلام ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی تجلی نمودار ہوئی، پہاڑ پر لرزہ طاری ہوگیا اور بنی اسرائیل کی جماعت بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

مخلوقات میں صرف ملائکہ یعنی فرشتوں کو، جو نورانی مخلوق ہیں، یہ خصوصیت عطا ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی سے براہ راست احکام وہدایات لیتے اور ان کو نافذ کرتے ہیں۔ اگر مزید رہنمائی کی ضرورت ہو تو وہ معاملات کو اسی بارگاہ میں پیش کر کے نئے احکام لیتے ہیں۔ مخلوق ہونے کے باعث فرشتوں کا تعلق دوسری مخلوقات کے ساتھ بھی ممکن ہے۔ انسان چونکہ مادی وجود رکھنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی پھونکی ہوئی روح کا بھی حامل ہے اس لیے فرشتوں کا اس کے ساتھ روحانی اتصال ممکن ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی ہدایت پہنچانے کا ذریعہ فرشتوں کو بنایا اور ان کے ساتھ روحانی اتصال کے لیے ایسے انسانوں کو چنا جو روحانی اعتبار سے مضبوط، اپنی نیک فطرت کی آواز پر لبیک کہنے والے اور اپنی عقل کو خیر وشر میں امتیاز کے لیے استعمال کرنے والے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو محض اپنے وجدان کی روشنی میں خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے والے اور اپنے اعلیٰ کردار، صداقت و امانت، عفت و پاکیزگی، نیکی وخداترسی کے باعث معاشرہ کے دیگر افراد سے ممتاز، برتر، معزز ومحترم تھے۔ اللہ تعالیٰ وحی کے طریقہ سے جو پیغام انسانوں کے لیے بھیجنا چاہتا وہ کسی فرشتہ کے حوالے کرتا جو انہی پاکباز انسانوں کے ایک معین فرد کے ساتھ روحانی اتصال کے ذریعے اس کو پہنچا دیتا اور وہ فرد اس کو اپنی ذمہ داری اور فریضہ سمجھ کر

ابنائے زمانہ تک پہنچا دیتا۔ جن معین افراد کو اس مقصد کے لیے چنا گیا وہ اللہ کے نبی کہلائے۔ اپنے اپنے دور میں انہوں نے انسانوں کی تعلیم و تربیت میں اپنی عمریں کھپا دیں۔

وحی کی مختلف شکلیں:

وحی کی کیفیت و ماہیت کیا ہے؟ اس کو سمجھنا کسی کے بس میں نہیں۔ یہ خدائی امور میں سے ہے۔ اس کی کیفیت وہی جانتا ہے جو اس کو نازل کرتا ہے یا پھر وہ نبی جانتا ہے جس کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ وحی کا طریقہ ہمیشہ ایک سا نہیں رہا۔ ہدایت کی اہمیت و نوعیت کے لحاظ سے اس کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے گئے، جو وحی ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس کی ادنیٰ شکل یہ ہے کہ انبیاء کو خواب میں اللہ کے حکم سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ یہ خواب سپیدۂ صبح کی طرح بالکل واضح اور روشن ہوتے ہیں اور نبی کے قلب پر انمٹ اثر چھوڑتے ہیں۔ عالم غیب کے وسیع الاطراف حقائق اور آئندہ پیش آنے والے واقعات نبی کو مکاشفہ کے ذریعے دکھائے جاتے ہیں۔ انبیاء کو بعض اوقات جاگتے میں بھی ہدایات ملتی ہیں اور وہ ہاتف غیبی کی آواز سنتے ہیں۔ وحی کی اعلیٰ شکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پیغمبر کے دل پر اپنا کلام القا کرتا ہے اور پیغمبر اس کو محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ کلام اسی زبان اور اسلوب میں ہوتا ہے جو پیغمبر یا اس کے مخاطبوں کے لیے نامانوس نہ ہو۔ وحی کے ایک طریقہ میں اللہ تعالیٰ نبی کے پاس اپنا فرشتہ بھیجتا ہے جو اللہ کے حکم سے اس کا پیغام اس کے دل میں ڈالتا ہے۔ وحی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ پردے کی اوٹ سے پیغمبر سے مخاطب ہوتا ہے۔ پیغمبر اللہ کا کلام اور اس کی آواز سنتا ہے لیکن اس کو دیکھ نہیں سکتا۔ ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ اللہ کے حکم سے فرشتہ انسانی جسم کے ساتھ نبی کے سامنے آ کر اس سے سوالات کرتا یا اس کو کوئی کام عملاً کر کے دکھاتا ہے، جس کی تعلیم نبی نے اپنی قوم کو دینی ہوتی ہے۔ مختلف انبیاء کے احوال میں وحی کے ان طریقوں کا استعمال ملتا ہے[1]۔

وحی کے ذریعے انبیاء نے دین حق سے آگاہی حاصل کی، کلام الٰہی ان کے دلوں پر نازل ہوا جس کو انہوں نے خود بھی ازبر کر لیا، اپنے ساتھیوں کو بھی سکھا دیا اور اپنی قوم میں اس کی تبلیغ کی۔ آسمانی ہدایت کے ازلی دشمن ابلیس اور اس کی ذریت نے نبیوں کی جدوجہد میں رکاوٹ پیدا کی، جس سے حق اور باطل کے درمیان آویزش شروع ہو گئی۔ اس آویزش میں اپنی جدوجہد کے دوران انبیاء نے وحی سے اپنی مشکلات میں رہنمائی پائی۔ وحی کی روشنی میں انہوں نے اپنے کام کی منصوبہ بندی کی، کبھی کوئی بشارت پائی اور کبھی آئندہ پیش آنے والے خطرات پر متنبہ ہو گئے۔ اگر وہ کسی اقدام میں چوک گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بروقت ان کی چوک سے آگاہ کر دیا اور انہوں نے اپنا رخ درست کر لیا۔

وحی کی بنیادی تعلیم:

وحی کی تعلیم، جس کو انبیاء نے اپنی اپنی قوم کے اندر پھیلایا، فطرت انسانی کے اندر ودیعت کردہ تصورات کو اجاگر کرنے کے لیے تھی۔ فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا شعور، اس کے سامنے جوابدہی کا احساس اور نیک و بد اور خیر و شر میں امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ وحی نے ان تصورات کو الفاظ کا جامہ پہنایا اور ان کی تفصیل کر دی تا کہ انسان کسی شک وشبہ میں گرفتار نہ رہے۔ اس کے علاوہ وحی نے ان تصورات کے حق میں دلائل بھی فراہم کر دیے تا کہ ہر عاقل شخص جانچ پرکھ کر کے اطمینان قلب حاصل کر سکے۔ وحی نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہی کو واضح نہیں کیا بلکہ اللہ کی صفات بھی بیان کیں اور ان صفات کے تقاضوں سے بھی آگاہ کیا۔ آخرت کے بارے میں پیدا ہونے والے اشکالات کو رفع کیا تو ساتھ ہی اس میں پیش آنے والی کیفیات کی تصویر کشی بھی کر دی۔ دنیا میں رہتے ہوئے انسان جن نشیب و فراز سے گزرتا ہے، وحی نے ان کی صحیح توجیہ کر دی تا کہ انسان کی کوئی غلط سوچ اس کو جادۂ حق سے ہٹانے کا باعث نہ بننے پائے۔ وحی نے نیکی اور بدی کے درمیان امتیاز کا فیصلہ انسان کی صوابدید پر نہیں چھوڑا بلکہ حرام وحلال کی واضح طور پر نشاندہی کر دی اور اس کے لیے قوانین تجویز کر دیے۔ اللہ تعالیٰ کی زمین پر نیابت کے تقاضے نہایت دوٹوک طریقہ سے انسان کے سامنے رکھے اور اقامت دین کا مطالبہ کیا۔ یعنی یہ کہ دین حق میں جن باتوں کے ماننے کا حکم دیا گیا ہے ان کو سچے دل سے مانو، جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان پر دیانت داری اور راستبازی کے ساتھ عمل کرو۔ لوگوں کی نگرانی کرتے رہو کہ وہ اس تعلیم سے منحرف نہ ہونے پائیں اور اہل بدعت اس تعلیم ہی کو نہ بدل دیں۔

تخلیق آدم کے بعد سے آج تک نہ اللہ کی وحدانیت اور اس کی صفات، نہ آخرت کے تصور، نہ حلال و حرام یا نیکی و بدی کے درمیان امتیاز میں سے کوئی حقائق بدلے ہیں اور نہ انسانی فطرت میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ لہٰذا وحی کی تعلیم جس طرح پتھر کے زمانہ کے انسان کے لیے موزوں تھی اسی طرح آج کمپیوٹر کے زمانہ کے انسان کے لیے بھی کفایت کرتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ تمام انبیاء نے اپنے اپنے زمانہ میں بنیادی طور پر ایک ہی دین پیش کیا۔ وہ نہ الگ الگ دینوں کی دعوت لے کر آئے اور نہ الگ الگ امتوں کی بنا ڈالی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ایک نبی کے جانے کے بعد اس کی امت نے دین میں بگاڑ پیدا کر دیا اور وحی کی تعلیم میں تحریف کر دی تو اللہ تعالیٰ نے اس بگاڑ کی اصلاح کے لیے دوسرے نبی بھیجے۔ بعض لوگوں نے تو ان کی بات سنی اور مان لی لیکن دوسروں نے اپنی تنگ نظری اور تعصب کے سبب سے اس کی مخالفت کی اور اپنے غلط موقف ہی پر قائم رہے جس کے

نتیجہ میں امتوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔

رسولوں کی بعثت:

وحی کی تعلیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر خاص شفقت فرماتے ہوئے ہمیشہ یہ اہتمام فرمایا کہ جس قوم کی طرف ہدایت بھیجنا مقصود تھا اسی قوم کی زبان میں وحی نازل ہوتی اور نبی بھی اسی قوم کا فرد ہوتا۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک علاقہ کے انسانوں کی زبان اور رہن سہن کے طور طریقے دوسرے علاقہ کے انسانوں کی زبان اور طور طریقوں سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ کسی علاقہ میں باہر سے آنے والا شخص وہاں کے لوگوں کے مزاج کو سمجھتا اور نہ ان کی روایات سے آگاہ ہوتا ہے۔ لیکن قوم کا ایک فرد جو نسبی طور پر انہی سے تعلق رکھتا، انہی کی زبان میں بات چیت کرتا اور انہی کے اندر رہتا بستا ہو، وہ اس قوم کا مزاج شناس ہوتا، ان کی روایات سے پوری طرح واقف ہوتا اور ان کے نیک و بد کو سمجھتا ہے۔ لہذا جس طرح وحی کی زبان ہمیشہ وہ منتخب کی گئی جو قوم کی زبان تھی، اسی طرح نبی بھی اسی قوم کے فرد ہوتے جس کی اصلاح کی ذمہ داری ان کو سونپی جاتی۔

تاریخ انسانی میں بارہا یہ حادثہ بھی پیش آیا کہ بعض قومیں اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹ کر فساد کی راہ پر چل کھڑی ہوئیں۔ اس کا سبب وہ اختیار تھا جو انسان کو اللہ کے خلیفہ کی حیثیت سے حاصل ہے۔ اس طرح کی قوموں کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے پے در پے نبی بھیجے جو نہایت دردمندی کے ساتھ ان کو راہ راست کی طرف لوٹنے کی دعوت دیتے اور غلط کار لیڈروں اور سرداروں کے مشوروں اور فساد کے انجام بد سے خبردار کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی قوموں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے باغیانہ رویہ کو پسند نہیں کرتا۔ وہ یہ برداشت نہیں کرتا کہ انسان اپنے مقصد تخلیق کی نفی کرتے ہوئے اس کی زمین پر دندناتا پھرے۔ نبیوں کے اس خیرخواہانہ مشورہ کے باوجود معاشرہ کے سرکش لوگوں کا وطیرہ یہ رہا کہ انہوں نے نبیوں کو اپنے مفادات کی راہ کا سنگ گراں سمجھا۔ ان کی تعلیم کو انہوں نے نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ اس کو جھٹلانے کے مجرم ہوئے۔ بعض بدبخت قومیں اپنے درمیان نبیوں کا وجود برداشت کرنے پر تیار نہ ہوئیں۔ تاریخ میں کتنے ہی انبیاء و مصلحین کو قتل کرنے کے واقعات ملتے ہیں۔ اس طرح کی صورت حال میں اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل انبیاء خصوصی اختیارات دے کر ان قوموں کی طرف بھیجے۔ انہوں نے قوموں کو اللہ کا پیغام دھیمے انداز میں بھی پہنچایا اور ڈنکے کی چوٹ بھی۔ انہوں نے بے حس لوگوں کو جھنجھوڑنے کے لیے ہر طریقہ استعمال کیا۔ ان کی بعثت کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی کہ ان نبیوں کی دعوت کو ماننا لازم ہے۔ یہ ہر ہر پہلو سے اس کی وضاحت کریں گے، قوم کے ہر اعتراض

کا جواب دیں گے اور لوگوں کے اشکالات کو رفع کرنے اور دعوت کو ان کے دلوں میں اتارنے کے لیے ہر موزوں طریقہ اختیار کریں گے۔ قوم کو اپنی اصلاح کے لیے معین وقت دیا جائے گا جس میں نہ کوئی اضافہ کیا جائے گا نہ کمی۔ اگر قوم نے ان نبیوں کی دعوت کو رد کیا اور ان کی ذات کے لیے خطرہ بنی تو رب کا قہر اس پر نازل ہوگا۔ نبی کو کوئی گزند نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔ قوم پر غلبہ پانا اس کا مقدر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی اختیارات کے حامل یہ خاص نبی 'رسول' کہلائے[2]۔ کسی قوم نے جب اپنے رسول کو جھٹلایا تو جونہی اس قوم کو اصلاح کے لیے دی گئی مدت ختم ہوئی قوم کو تباہ و برباد کر دیا گیا لیکن رسول اور اس پر ایمان لانے والے لوگ اس تباہی سے محفوظ رکھے گئے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد زیادہ ہوئی تو اللہ کی نصرت ان کو حاصل ہوئی اور بزور شمشیر انہوں نے اپنے دشمنوں پر غلبہ پالیا۔

چیدہ انبیاء ورسل کی جدوجہد:

روئے زمین کی آبادکاری کا آغاز حضرت آدمؑ اور حوا دو افراد کے کنبہ سے ہوا۔ ان کی نسل سے جو لوگ پیدا ہوئے ان کی ضروریات محدود اور مسائل مخصوص تھے۔ اس اولین معاشرہ کے لیے حضرت آدم علیہ السلام نبی مقرر کیے گئے اور انہوں نے اپنی اولاد کو رب کی ہدایت سے آگاہ کیا۔ جوں جوں آبادی میں اضافہ ہوا لوگ ابتدائی خطہ سے دوسرے علاقوں میں پھیلنے لگے۔ اب کنبوں کی بجائے خاندان اور قبیلے وجود میں آئے۔ معاشرہ کی وسعت کے ساتھ انسانوں کے باہمی تعلقات و معاملات میں رہنمائی ضروری ہوئی جس کی روشنی میں وہ اپنے مسائل حل کر سکیں اور آپس کے جھگڑوں کو عدل و انصاف کے ساتھ طے کر سکیں۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کے بعد جو نبی مبعوث ہوئے ان کے پاس اپنے اپنے معاشروں کے لیے وحی کی تعلیمات زیادہ تھیں اور ان کا دائرہ عمل بھی وسیع تر تھا۔

قدیم ترین قوم، جو اپنے رسول کی تکذیب کے جرم میں صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئی، قوم نوح ہے۔ اس قوم نے خدائے واحد کے بجائے متعدد بت تراش کر ان کو شریک خدا مان لیا اور ان کی پوجا کرنے لگی۔ اس کی اصلاح کے لیے حضرت نوح علیہ السلام رسول بنا کر بھیجے گئے۔ انہوں نے قوم کو ایک رب کی عبادت کی دعوت دی۔ اپنی تعلیم کو نہایت مدلل انداز میں پیش کیا اور قوم کو راہ راست پر لانے کے لیے ہر حربہ آزمایا، اس کو قائل کرنے کے لیے رازدارانہ بھی اور ڈنکے کی چوٹ بھی اپنی بات پہنچائی اور تکذیب کے نتیجہ میں اسے اللہ کی پکڑ سے ڈرایا لیکن تھوڑے سے لوگوں کے سوا قوم نے ان کی بات نہ مانی۔ نہایت طویل جدوجہد کے بعد حضرت نوحؑ نے اپنی بے بسی کا اظہار اپنے رب کے سامنے کیا تو ان کو ایک کشتی بنانے کا حکم ہوا۔ ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ صرف اہل ایمان کو اس کشتی میں

سوار کریں جن کو ایک طوفانی بارش کے عذاب سے بچالیا جائے گا جبکہ ان کو جھٹلانے والے بارش کے سیلاب میں غرق کر دیے جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بے پناہ سیلاب نے کفار کو غرق کر دیا اور اہل ایمان نے بارش کا پانی اترنے کے بعد از سر نو زندگی کا آغاز کیا۔

قوم نوح کی تباہی کے بعد ملک میں طاقت پکڑنے والی ایک سرکش اور مغرور قوم عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام رسول بنا کر بھیجے گئے۔ انہوں نے اپنی قوم کو رب کی ہدایت کی یاددہانی کرائی اور جن خرابیوں میں وہ مبتلا ہو چکی تھی ان سے بچانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ لیکن یہ قوم حضرت ہودؑ کا مذاق اڑاتی اور ان کو دھمکیاں دیتی رہی۔ وہ مسلمان ہونے والوں کو اذیتیں دیتی۔ اس نے ایمان لانے والوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ قوم عاد نے اصلاح کے لیے خدا کی طرف سے مقرر کردہ مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا، یہاں تک کہ رسول سے عذاب لانے کا مطالبہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کو تو ہجرت کا حکم دے دیا اور نافرمان قوم کو تند و تیز سرد ہوا کے عذاب سے دوچار کر دیا جس سے قوم عاد کی جڑ کٹ گئی۔ عاد کے جانشینوں میں قوم ثمود انہی کے نقش قدم پر چل کر اپنے رسول حضرت صالح علیہ السلام کی تکذیب کی مرتکب ہوئی اور انہی کے انجام کو پہنچی۔

اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل (موجودہ عراق) میں ایک ایسی قوم کے اندر پیدا ہوئے جو شرک میں بری طرح ملوث تھی۔ بعثت کے بعد انہوں نے اپنے والد، اپنی قوم، بتکدوں کے پجاریوں، حتیٰ کہ بادشاہ تک رب کی وحدانیت کا پیغام پہنچایا اور ان کے مشرکانہ عقائد کے خلاف ایسے دلائل دیے جن کا جواب کسی سے بن نہ آیا۔ اس کے باوجود سب نے ان کی تکذیب کر دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان پر حجت تمام کرنے کے لیے بتکدے کے بتوں کو پاش پاش کر کے اپنی قوم پر ثابت کیا کہ ان کے یہ معبود نہ کسی قوت ہی کے مالک ہیں اور نہ اپنا دفاع کرنے ہی پر قادر ہیں، لیکن قوم تھی کہ اس نے محکم دلیلوں سے قائل ہونے کے بجائے اپنے رسول کو آگ میں جلانے کی سازش تیار کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو تو آگ سے محفوظ رکھا لیکن ان کی نافرمان قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں ایک اولوالعزم رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کے حکمران فرعون کی طرف بھیجے گئے۔ فرعون بڑے جاہ و جلال والا تھا اور اپنے آپ کو خدا کا اوتار سمجھتا تھا۔ پورے ملک میں اس کے بت پوجے جاتے اور عملاً اسی کو خدا سمجھا جاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو راہ راست پر لانے کی بے حد کوشش کی لیکن اس میں ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ فرعون نے اپنے پروپیگنڈا سے اپنی قوم کو مرعوب کر لیا اور وہ اس کے دام تزویر

میں سے نہ نکل سکی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بالآخر اہل ایمان کو، جن کی بڑی تعداد بنی اسرائیل پر مشتمل تھی، ساتھ لیا اور مصر سے ہجرت کر گئے۔ فرعون اور اس کی فوج نے ان کا تعاقب کیا۔ راستہ میں سمندر کی پٹی حائل ہوتی تھی۔ حضرت موسیٰؑ وہاں پہنچے تو سمندر کی اس پٹی میں پانی ہٹ جانے کے باعث ایک گزرگاہ نمودار ہوگئی جس میں سے اہل ایمان گزر کر دوسرے کنارے پر بحفاظت جا اترے۔ فرعون اور اس کی فوج جب سمندر میں داخل ہوئی تو پانی مل گیا اور تعاقب کرنے والے غرق دریا ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تاریخ انسانی میں پہلی بار احکام الٰہی لکھے ہوئے عطا ہوئے۔ ان پر نازل ہونے والی وحی تورات کی شکل میں ایک عالم کے لیے صدیوں تک ہدایت کا وسیلہ بنی رہی۔

وقت گزرنے کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے پیرو بھی اللہ کی ہدایت کو پس پشت ڈالنے لگے تو ان کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے پے در پے متعدد انبیاء بھیجے لیکن ان کا بگاڑ درست نہ ہوا۔ بالآخر ان کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام بطور رسول مبعوث ہوئے جنھوں نے ان کو تکذیب کے برے انجام سے ڈرایا۔ اس کے باوجود قوم نے ان کو رسول ماننے سے انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوئی۔ البتہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم دوسری قوموں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی اور ان کے ماننے والے ایک وسیع علاقے میں برسر اقتدار آ کر اپنے مذہب کو پھیلانے میں کامیاب ہوئے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ انبیا اور رسول وہی ہیں جن کے نام آسمانی صحیفوں یا تاریخ میں محفوظ ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نبیوں اور رسولوں کا تعلق نسل انسانی کی ہدایت کے ساتھ ہے لہٰذا جہاں جہاں انسان جا کر آباد ہوا اسے آسمانی رہنمائی کی ضرورت تھی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کے مطابق اس کا انتظام کیا۔ ہر خطہ اور قوم میں انبیا کی بعثت ہوئی اور جب شریر لوگ حد سے بڑھ گئے اور انہوں نے نبیوں کی دعوت پر کان نہیں دھرے تو رسول بھی مبعوث ہوئے۔ پھر جب قوموں نے ان کی آمد کو بھی نظر انداز کر دیا تو ایسی قومیں صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئیں۔ تباہ ہونے والی قدیم بستیوں کے کھنڈرات مختلف ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ کھدائی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بستیاں کسی ناگہانی آفت کا شکار ہوئیں اور ان کے باسیوں کو گھروں سے نکلنے کا وقت بھی نہ ملا۔ عین ممکن ہے کہ ان میں بسنے والی قومیں ماضی بعید میں اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی مجرم ٹھہریں اور ان کو خدا کے عذاب نے آ گھیرا۔

تکذیب رسل کا انجام عدل پر مبنی ہے:

بظاہر رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کا برا انجام نہایت تکلیف دہ نظر آتا ہے اور یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ بندوں کے معاملہ میں اس قدر سخت رویہ اللہ رب العزت کی شان کریمی کے منافی ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرتے

ہوئے اگر چند حقائق پیش نظر رہیں تو پھر یہ معاملہ عدل کے منافی نہیں ٹھہرتا۔ مثال کے طور پر یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان زمین میں کوئی خودرو پودا نہیں ہے جس کا کوئی مقصد تخلیق نہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نہایت اہتمام سے پیدا کیا، کارکنان قضا وقدر سے اس کو سجدہ کروایا، اس کو غیر معمولی صلاحیتیں عطا کیں اور بیشتر مخلوقات کو اس کے تابع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ اللہ کے نائب کی حیثیت سے اپنے فرائض اچھے طریقہ سے ادا کر سکے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لیے نہیں چھوڑا بلکہ اس کے دل ودماغ میں روشنی پیدا کی، اس کے گرد وپیش کو سبق آموز بنایا، اس کو راہ راست پر رکھنے کے لیے اس کو وحی کی رہنمائی دی، اس کو حقیقت سے آگاہ رکھنے اور اس پر حجت تمام کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً نبیوں اور رسولوں کو مبعوث کیا اور ان کے ساتھ آسمانی صحیفے اتارے۔ اس غیر معمولی اہتمام کے بعد اگر شریر لوگ دنیا کو فساد اور بدی سے بھر دیں، آسمانی ہدایت کا مذاق اڑائیں، من مانی حرکتیں کر کے انبیاء کی تعلیم کی نفی کریں، کوئی نیک بخت ان کو ٹوکنے کی جرأت کرے تو اس کو اپنے رستے سے ہٹانے سے بھی دریغ نہ کریں، تو ان شریر لوگوں کا جرم معمولی نہیں رہ جاتا۔ یہ لوگ انسان کے مقصد تخلیق کی علانیہ نفی کے مرتکب اور رب کائنات نے بندوں کی رہنمائی کا جو وعدہ کر رکھا ہے اس کے ایفا میں رکاوٹ پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ اس ساری اسکیم کو ناکام بنانے کی ایک کوشش ہے جو مالک کائنات کے پیش نظر ہے۔ پس شریر قوموں پر عذاب بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ اپنی شیطنت کے باعث اللہ کے ان مخلص وباوفا بندوں کے لیے آزمائش کا سبب نہ بنیں جو اللہ کے باغی نہیں ہیں اور اپنے مالک کی ہدایت کی روشنی میں چلنے اور زندگی گزارنے کے آرزومند ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ دیکھیے سورہ الشوریٰ۔۴۲: ۵۱۔۵۲ وسورہ البقرہ ۲: ۹۷
سورہ الانفال۔۸: ۴۳۔۴۴
نیز مشہور حدیث جبریل جو کتب حدیث میں روایت ہوئی ہے۔

۲۔ سورہ المجادلہ۔۵۸: ۲۰۔۲۱

باب 3

مرکز توحید کی تعمیر اور دعائے ابراہیمؑ

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے وہ رسول ہیں جن کے آہنی عزم، مضبوط کردار، اللہ کی وحدانیت کے اثبات کے لیے سرفروشانہ جذبہ اور ان کے اہم عملی اقدامات کو بنی آدم کے لیے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کو اللہ رب العزت کے لیے اپنی عبودیت اور وفاداری کا ثبوت غیر معمولی طور پر سخت امتحانوں سے گزر کر پیش کرنا پڑا۔ جب وہ ہر آزمائش میں کامیاب رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام انسانوں کے امام و رہنما کی حیثیت عطا فرمائی۔ ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود یہود، نصاریٰ اور مسلمان ان کو اپنا پیشوا مانتے اور ان کے لیے عقیدت کے جذبات رکھتے ہیں۔ ان کی نسل میں اتنی کثیر تعداد میں انبیاء و رسل پیدا ہوئے کہ ان کو ابوالانبیاء یعنی نبیوں کے جد اعلیٰ کا لقب دیا گیا ہے۔

اہل تحقیق کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آباء و اجداد اصلاً عرب کے باشندے تھے جو نقل مکانی کر کے دجلہ و فرات کی زرخیز سرزمین کے مشہور شہر بابل میں آباد ہو گئے۔ یہ علاقہ آہستہ آہستہ شرک، بت پرستی اور کواکب پرستی کا گڑھ بن گیا۔ یہاں تک کہ عرب سے آنے والے لوگ بھی اسی مذہب کے پیرو بن گئے۔ مشہور روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر شہر کے بڑے بت خانہ کے ایک ذمہ دار فرد تھے لیکن بیٹے کو بت پرستی سے سخت نفرت رہی اور وہ اس کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ قوم کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو رسول مبعوث کیا۔ انہوں نے اپنے والد اور اعزہ کو اللہ کی وحدانیت کا درس دیا اور شرک کو رب سے بغاوت قرار دیا لیکن بجائے اس کے کہ وہ کوئی اثر قبول کرتے، والد نے ان کو گھر چھوڑنے کا الٹی میٹم دے دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعوت قوم کے سامنے رکھی اور استدلال کے اچھوتے اسلوب اختیار کیے جنہوں نے قوم کو لاجواب کر دیا۔ انہوں نے بادشاہ وقت کو بھی اپنی دعوت سے روشناس کرایا اور اس کے مناظرانہ دلائل کا ایسا توڑ کیا کہ اس سے کوئی جواب بن نہ آیا[1]۔ تاہم ان کی بیوی سارہ اور ایک بھتیجے لوط کے سوا کسی نے ان کی دعوت پر کان نہیں دھرے۔ جب حضرت ابراہیمؑ کو قوم کے رویہ سے مایوسی ہوئی تو آخری حربہ کے طور پر انہوں نے عظیم خطرہ مول لے کر قوم کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ ایک ایسی شب میں کہ جب لوگ کوئی تہوار منانے میں مصروف تھے وہ مرکزی

بت کدہ کو خالی پا کر اس میں داخل ہوئے اور اس میں رکھے ہوئے بڑے بت کے سوا باقی تمام بتوں کو توڑ دیا۔ صبح کو جب پجاری بت کدے میں داخل ہوئے اور بتوں کا حال دیکھا تو سوال پیدا ہوا کہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔ ان کو خیال ہوا کہ ہو نہ ہو، یہ حرکت ابراہیم نے کی ہوگی کیونکہ وہ بت پرستی کے خلاف بہت بولتا رہتا ہے۔ جب ابراہیمؑ سے جواب طلبی کی گئی تو انہوں نے بڑے بت کی طرف اشارہ کیا کہ یہ سلامت ہے، اسی سے پوچھ لو کہ دوسرے بتوں کو کس نے توڑا ہے۔ اس پر اصل حقیقت لوگوں کی زبان سے ادا ہوگئی۔ وہ کہنے لگے کہ تم جانتے ہو، یہ بت بول نہیں سکتے۔ ابراہیمؑ کو موقع مل گیا تو انہوں نے قوم کے آگے توحید کے حق میں اور شرک کے خلاف تقریر کردی کہ جب یہ بت نہ بول سکنے اور نہ اپنا دفاع کرنے پر قادر ہیں تو یہ تمہارے لیے کیسے نفع یا ضرر پہنچانے والے بن سکتے ہیں۔ حقیقی معبود صرف اللہ ہے جو ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ شرک کے خلاف اس عملی مظاہرہ کا قوم کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اندھے بہرے تعصب میں مبتلا ان لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام کو گردن زدنی قرار دیتے ہوئے ان کو آگ میں جلانے کی سزا تجویز کی۔ اپنے طور پر انہوں نے آگ بھڑکا کر حضرت ابراہیمؑ کو جلانے کی تدبیر کی لیکن اللہ تعالیٰ نے بروقت اس کو ٹھنڈا کر دیا اور ابراہیمؑ آگ سے محفوظ رہے[2]۔ اس کے بعد ان کو بابل سے ہجرت کا حکم ہوا اور وہ اپنی بیوی سارہ اور بھتیجے لوط کے ہمراہ شہر سے نکل گئے۔ ان کے نکل جانے کے بعد شہر پر عذاب نازل ہوا۔

ہجرت:

دین کی خاطر اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہہ کر کسی نئے علاقہ میں جا کر از سر نو زندگی کی جدوجہد شروع کرنا ہجرت کہلاتا ہے۔ یہ ایک بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ اس لیے جب اللہ کے بندے یہ عظیم قربانی دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر خصوصی نظر کرم فرماتا اور ان کے لیے نئے امکانات پیدا کرتا ہے۔ یہی کچھ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ہوا۔ وہ مختلف علاقوں میں سے گزرتے ہوئے عرب کے شمال میں پہنچے اور اپنے لیے کنعان (موجودہ اسرائیل) کا علاقہ بطور مسکن چنا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال میں برکت دی۔ بھیڑ بکریوں میں افزائش ہوئی اور جلد ہی ان کا شمار علاقے کے رئیسوں میں ہونے لگا۔ شمالی عرب میں بنو قحطان کی ریاستیں تھیں۔ یہ عرب قبیلہ مروت، فیاضی اور مہمان نوازی کے لیے مشہور تھا۔ حضرت ابراہیمؑ جس جگہ آباد ہوئے وہ بنو جرہم کے سردار ابوملک کے زیر اثر تھی۔ ابوملک کے تعلقات ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ اس نے ان کی بڑی مدارات کی[3]۔ ان کو اپنا حلیف بنایا اور عرب قبائل کے رواج کے مطابق ان حلیفانہ تعلقات کے استحکام کے لیے اپنی بیٹی ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ کے نکاح میں دے دیا۔ پچاسی برس کی عمر تک حضرت ابراہیمؑ لاولد رہے۔ بالآخر ان کو ایک حلیم الطبع فرزند عطا کیے جانے کی بشارت ہوئی۔ یہ بیٹا ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوا اور اس کا نام اسماعیل رکھا گیا۔ یہ بیٹا قول و فعل میں سچا، صابر اور اپنے

والد کی اعلیٰ صفات کا مظہر تھا۔ یہ اکلوتا فرزند والدین کی دلجمعی کا ذریعہ اور ان کی امیدوں کا مرکز بن گیا۔

یہودیوں نے نسلی تعصب کی بنا پر ہاجرہ کی تحقیر کے لیے ان کو ابراہیمؑ کی پہلی بیوی سارہ کی مصری لونڈی بتایا ہے لیکن قرائن سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ ابوملک نے حضرت ابراہیمؑ کی جہاں مدارات کی اور دنیاوی مال ومتاع دیا وہیں اس کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ اس نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ 'ہر کام میں جو تو کرتا ہے خدا تیرے ساتھ ہے'۔ اس صورت میں عربوں کے طریقہ پر اس کا اپنی بیٹی سیدنا ابراہیمؑ سے بیاہ دینا بعید نہیں۔ خود ہاجرہ نے زندگی بھر اپنا تعلق بنوجرہم کے ساتھ باقی رکھا، اپنے بیٹے اسماعیل اور ان کی اولاد کی شادیاں اسی قبیلہ میں کیں، اور یہ تعلق اتنا مضبوط ہوا کہ بنوجرہم مکہ میں آباد ہو گئے اور بعد کے ادوار میں بیت اللہ کا نظم ونسق تک بنوجرہم کے ہاتھ میں آ گیا۔ اگر ہاجرہ فی الواقع مصری خاتون ہوتیں تو انہیں بنوجرہم کے ساتھ وابستہ رہنے اور رشتہ داریاں قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

محبوب فرزند کی قربانی:

حضرت ابراہیمؑ کا محبوب فرزند جب ان کا ہاتھ بٹانے کے لائق ہو گیا تو ان کو ایک ایسی آزمائش میں مبتلا کیا گیا جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کو حکم ہوا کہ ہاجرہ اور بیٹے کو ساتھ لے کر جنوب کو روانہ ہوں۔ تورات کے بیان کے مطابق یہ سفر 'بیت ایل' پر جا کر ختم ہوا جہاں انہوں نے قربان گاہ بنائی۔ بیت ایل کے لفظی معنی بیت اللہ کے ہیں۔ آثار وقرائن اس بات کے حق میں ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے وادی بطحا میں پہنچے جہاں اس وقت مکہ مکرمہ واقع ہے۔ اس میں بیت اللہ بھی موجود ہے اور قربان گاہ مروہ بھی۔ مکہ کا ابتدائی نام بکہ تھا جو بابلی زبان میں آبادی یا شہر کے معنی میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وادی میں حضرت ابراہیمؑ کی آمد کے بعد جو گھر آباد ہوئے ہوں گے ان کے لیے انہوں نے اپنے پہلے وطن اور وہاں کی زبان کے لحاظ سے نام 'بکہ' تجویز کیا ہوگا جو امتداد زمانہ کے ساتھ مکہ میں بدل گیا۔ قرآن میں مکہ کے لیے یہی قدیم نام استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

> اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ. فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ. (آل عمران ۳:۹۶-۹۷)
>
> بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو بکہ میں ہے، جہان والوں کے لیے برکت اور ہدایت کا مرکز۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں۔ وہ مسکن ابراہیم ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے فرزند کو اللہ کی راہ میں قربان کر رہے ہیں۔ وہ جس عزم و

حوصلہ کے مالک تھے اس نے انہیں خواب کی کوئی توجیہ وتعبیر کرنے سے باز رکھا اور خواب کے ظاہر کے مطابق انہوں نے اسماعیل کو قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ جب بیٹے سے اپنے ارادہ کا ذکر کیا تو اس نے نہایت سعادت مندی سے منشائے الٰہی پورا کرنے کے لیے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ ابراہیمؑ اس کو مروہ پر لے گئے اور لٹا کر حلقوم پر چھری چلانا ہی چاہتے تھے کہ حکم ہوا، ابراہیم! بس کر دو، تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ بیٹے کو واقعی ذبح کرنا مطلوب نہیں ہے۔ اس کے فدیہ کے طور پر ایک جانور ذبح کرو اور ہم اس واقعہ کی یادگار ایک عظیم رسمِ قربانی کو بنائیں گے جو رہتی دنیا تک باقی رہے گی۔

توحید پر کامل یقین اور اس کے لیے مکمل یکسوئی، شرک کے تمام مظاہر سے انتہائی درجہ کی بیزاری، رب کی اطاعت و نیازمندی کا جذبۂ فراواں، اور رضائے الٰہی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کرنے کا حوصلہ حضرت ابراہیمؑ کے کردار کی پہچان بن گیا۔ اللہ رب العزت نے اس کو پذیرائی بخشی، اس کو 'ملت ابراہیم' یعنی ابراہیمی طریقہ قرار دیا اور اسلام کی حقیقت کی عملی تعبیر کے لیے ابراہیمؑ کے عمل کو بطور مثال پیش کیا۔

حضرت ابراہیمؑ بیٹے کی قربانی کے امتحان میں کامیاب رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مزید نوازا اور ان کو پہلی بیوی سارہ کے بطن سے ایک فرزند اسحاق کی ولادت اور اسحاق کی نسل میں ان کے بیٹے یعقوب کے تولد ہونے کی بشارت ہوئی۔ یہ بشارت سن کر ابراہیمؑ کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ 'کاش: اسماعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ:

> اسماعیل کے حق میں میں نے تیری دعا سنی۔ دیکھ، میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔
>
> (پیدائش ۱۷:۱۸-۲۰)

عہد نامہ قدیم میں قربانی کے واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ بھی نقل ہوا ہے:

> چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو، جو تیرا اکلوتا ہے، دریغ نہ رکھا، اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کی مانند کردوں گا، اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔ (پیدائش ۲۲:۱۶-۱۸)

عہد نامہ قدیم میں یہ وعدہ وہاں نقل ہوا ہے جہاں اس سے قبل حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کا بیان ہے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ اس وعدہ کو ان پر اور ان کی اولاد پر منطبق کرتے ہیں، حالانکہ وہ اس عبارت کا کسی طرح مصداق نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجوہات حسب ذیل ہیں:

۱۔ یہاں ذبیح بیٹے کو اکلوتا بتایا گیا ہے جبکہ حضرت اسحاقؑ اپنے بھائی حضرت اسماعیلؑ سے تقریباً چودہ برس چھوٹے تھے۔ اس لیے وہ کسی طرح اکلوتے نہیں کہلا سکتے۔ قرآن مجید نے جہاں واقعہ ذبح بیان کیا ہے وہاں دوسرے بیٹے کے تولد کی بشارت کو پہلے بیٹے کو ذبح کے لیے پیش کر دینے کا صلہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا وعدہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی نسل کے لیے ہے۔

۲۔ اولاد اسحٰقؑ میں کبھی وہ غیر معمولی اضافہ نہیں ہوا جو 'برکت پر برکت' کا تقاضا معلوم ہوتا ہے۔ آج اکیسویں صدی عیسوی میں بھی دنیا بھر کے بنی اسرائیل کی تعداد، جو اولاد اسحاق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، لاکھوں میں شمار ہوتی ہے جبکہ اولاد اسماعیل پہلے ملک عرب کے کونے کونے میں اور پھر اس ملک کی حدود سے نکل کر اکناف عالم تک پھیل گئی۔ اس کی تعداد کروڑوں میں ہے۔

۳۔ اولاد اسحاقؑ کو بہت کم دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوا ہے۔ ان کی حکومت محدود مدت تک اور محدود علاقے میں قائم ہو سکی۔ بالعموم وہ دوسروں کے دست نگر رہے حتیٰ کہ تاریخ میں کئی بار ان کو غلامی کی ذلت سہنی پڑی۔ اس کے برعکس اولاد اسماعیل ہمیشہ آزاد رہی۔ ابتدا میں ان کی حکومتیں پورے عرب میں قائم ہوئیں، بعد ازاں دوسری قوموں کو بھی انہوں نے مغلوب کیا اور فی الواقع دشمنوں کے پھاٹک پر قابض ہوئے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے برکت کا وسیلہ پہلے بنی اسرائیل (جو اولاد اسحاقؑ ہیں) کو بنایا لیکن انہوں نے اس کو اپنا استحقاق سمجھ لیا اور دوسری اقوام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ برکت، جو آسمانی ہدایت کی شکل میں ان کے سپرد کی گئی تھی، دوسری اقوام تک نہ پہنچ سکی اور بنی اسرائیل اس پر مار گنج بن کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد بنو اسماعیل کو یہی فریضہ سونپا گیا تو انہوں نے نہ صرف خود اس سے فائدہ اٹھایا بلکہ سو سال کے اندر ہندوستان اور چین سے لے کر سپین و پرتگال تک کے علاقے میں بسنے والی تمام اقوام کو اس برکت میں اپنے ساتھ شریک کر لیا۔

لہٰذا مذکورہ بالا اقتباس میں ذبیح کا اشارہ حضرت اسماعیلؑ کی طرف ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ کیا گیا وعدہ خداوندی بھی انہی کی اولاد کے بارے میں پورا ہوا۔ تورات میں اس موقع پر حضرت اسحاقؑ کا نام داخل کرنا تحریف کا کرشمہ ہے جس سے تورات کبھی محفوظ نہیں رہ سکی[5]۔ متعدد زمینی حقائق بھی اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ قربانی کا واقعہ حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ پیش آیا۔ مثلاً یہ کہ قربانی کی عبادت کا دنیا میں سب سے بڑا مرکز ہمیشہ سے مکہ چلا آ رہا ہے۔ وہیں مروہ کی قربان گاہ واقع ہے۔ بیت اللہ، جس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے کی، مکہ میں ہے اور اولاد اسماعیل کا تعلق اس معبد کے ساتھ کسی زمانہ میں ختم نہیں ہوا۔ عبادات کا جو نظام حج و عمرہ کی شکل میں حضرت ابراہیمؑ نے جاری کیا تھا، وہ ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود اب تک قائم ہے۔ اولاد اسحاق کے ہاں ایسی کوئی

نشانی محفوظ نہیں جس سے وہ اپنا تعلق واقعہ قربانی یا تعمیر بیت اللہ کے ساتھ ثابت کر سکیں۔

مرکز توحید کی تعمیر:

ذبح سے متعلق حضرت ابراہیمؑ کے خواب کی حقیقی تعبیر، جو بعد میں ملنے والی آسمانی ہدایات سے واضح ہوئی، یہ تھی کہ وادی بطحاء میں وہ ایک معبد خاص اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کریں اور اس کی حفاظت و خدمت کے لیے بیٹے کو اللہ کی نذر کر دیں تاکہ وہ اس مقدس گھر کی زیارت کے لیے آنے والوں اور یہاں عبادت کرنے والوں کے لیے اس کو پاک و صاف رکھیں۔ ایک روایت کے مطابق وادی میں ایک قدیمی معبد پہلے سے موجود تھا اور حضرت ابراہیمؑ کو اسی کی تعمیر نو کا حکم ہوا لیکن اس روایت کے حق میں کوئی شہادت نہیں ہے۔ اول تو 'بکہ' کا لفظ ہی بتاتا ہے کہ وادی میں پہلے کوئی آبادی نہ تھی، حضرت ابراہیمؑ یہاں تشریف لائے تو ان کی آمد سے اس بستی کا آغاز ہوا اور انہوں نے بابلی زبان کا لفظ اس کے نام کے لیے منتخب کیا۔ اگر پہلے یہاں لوگ ہی آباد نہ تھے تو ان کے بغیر بیابان میں آخر معبد کس مقصد سے تعمیر ہوا۔ دوسرے قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ بیت اللہ ہی کو بیت العتیق (قدیمی گھر) کہا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن نے اول بیت وضع للناس (پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر ہوا) کے الفاظ جہاں استعمال کیے ہیں وہاں اس کو 'مقام ابراھیم' (ابراہیم کا مسکن) بھی کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ میں جس اولیت اور قدامت کا ذکر ہوا ہے وہ یروشلم میں واقع بیت المقدس کے مقابلہ میں ہے جو صدیوں بعد سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں تعمیر ہوا اور یہود کے ہاں اس کو قبلہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔

دعائے ابراہیمؑ:

حکم خداوندی کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کو ساتھ لیا اور اللہ کے گھر کی تعمیر میں لگ گئے۔

جب باپ بیٹا دونوں تعمیر میں مصروف ہوتے تو اس مقدس کام کے دوران میں یہ دعا کرتے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ. اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (بقرہ۔ ۲: ۱۲۸۔۱۲۹)

اے ہمارے رب! ہم دونوں کو تو اپنا مسلم (فرمانبردار و اطاعت شعار) بنا اور ہماری ذریت میں سے اپنی ایک فرمانبردار امت اٹھا، اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بے شک تو توبہ قبول کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے ہمارے رب! تو ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے، اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ عظیم باپ بیٹا، جن کا ہر عمل اسلام کی روح سے دوسروں کو آشنا کرنے والا ہے، سب سے پہلے اپنے اسلام اور کامل فرمانبرداری کی دعا کرتے، اس لیے کہ اسلام کے درجات و مراتب کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی نسل کی خیرخواہی میں اس کے اندر ایک امت مسلمہ کے اٹھائے جانے کی التجا کرتے جوان باپ بیٹا کی روش پر چلنے والی ہو، وہ اپنے رب کی وحدانیت پر کامل یقین رکھنے والی، فرامین الٰہی پر دل و جان سے کاربند اور یکسوئی کے ساتھ رب کی اطاعت شعار ہو۔ اس کے بعد وہ اپنی نسل میں ایک ایسے رسول کے مبعوث کیے جانے کی درخواست کرتے جس کے پاس اللہ کا کلام ہو، وہ امت مسلمہ کو کتاب الٰہی اور حکمت دین کی تعلیم دے، اس کا تزکیہ کرے اور ان کے اخلاق و کردار کو سنوارے۔ یہ دعا چونکہ بیت اللہ کے دونوں معزز و محترم معماروں نے مل کر اپنی اولاد کے حق میں کی اس لیے حضرت ابراہیمؑ کی وہ اولاد اس میں شامل نہیں ہو سکتی جو ان کے دوسرے بیٹے اسحاقؑ کی نسل سے تھی۔ اس دعا کے مطابق امت مسلمہ اصلاً بنو اسماعیل پر مشتمل ہونی تھی اور اس رسول کی بعثت، کہ جس کے بھیجے جانے کی آرزو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے کی، بنو اسماعیل ہی میں ہونی تھی۔

حضرت اسماعیلؑ کی ذمہ داریاں:

مکہ کے مرکز توحید کی تعمیر مکمل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے دعائے ابراہیمؑ کے پہلے حصہ کو قبول فرماتے ہوئے انہیں عبادت کے احکام عطا کیے۔ ہدایت ہوئی کہ بیت اللہ تمام ذریت ابراہیمؑ کا مرکز اور قبلہ ہوگا۔ اپنی عبادات میں وہ اس گھر کا رخ کریں گے۔ اس گھر کی خاص عبادات نماز، اعتکاف، طواف کعبہ، حج اور قربانی ہوں گی۔ باپ بیٹے کو ان عبادات کے ادا کرنے کے طریقے اور مناسک سکھائے گئے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں یوں بیان ہوا ہے:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا. وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى. وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (بقرہ۔ ۲:۱۲۵)

اور یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ مسکن ابراہیم میں ایک نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم اور اسماعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ. ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ.
(الحج۔۲۲:۲۷۔۲۹)

اور لوگوں میں حج کی منادی کرو، وہ تمہارے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور نہایت لاغر اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز گہرے پہاڑی راستوں سے پہنچیں گی، تاکہ لوگ اپنی منفعت کی جگہوں پر بھی پہنچیں اور چند خاص دنوں

> میں ان چوپایوں پر اللہ کا نام بھی لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ پس اس میں سے کھاؤ اور فاقہ کش فقیروں کو کھلاؤ۔ پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور قدیم گھر کا طواف کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت اسماعیلؑ کو جو بیت اللہ کی نذر کیا گیا تو ان کی ذمہ داری یہ ٹھہری کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ اللہ کے اس گھر کو کبھی بت پرستی کا اڈا نہ بننے دیں۔ اس کی حیثیت توحید کے ایک مرکز کی ہو جہاں آ کر لوگوں کو اللہ واحد سے لو لگانے، اس سے اپنا تعلق استوار کرنے اور یکسوئی کے ساتھ اس کی خاص عبادات کا موقع ملے۔ لہٰذا اسماعیلؑ اس کو طواف کرنے والوں اور نماز ادا کرنے والوں کے لیے پاک وصاف رکھیں۔ وہ مکہ اور اس کے گرد و نواح میں بسنے والے لوگوں کو حج پر آنے کی دعوت دیں اور معین ایام میں حج وعمرہ پر آنے والوں کو سہولتیں فراہم کریں۔ ان کو مناسک حج سکھائیں اور اللہ کی راہ میں جانور قربان کرنے کی رسم ڈالیں۔ یہ لوگ جب سفر کا میل کچیل اتار لیں، خدا کی نذر کے جانور ذبح کر لیں اور بیت اللہ کا طواف کر لیں تو ان کا حج مکمل ہو جائے گا۔ یہ بشارت بھی دی گئی کہ جب حج کی منادی کی جائے گی تو لوگ ذوق وشوق سے اس مرکز کی طرف جمع ہوں گے اور راستوں کی دوری کی پروا بھی نہیں کریں گے۔

ان ہدایات سے یہ بات از خود ثابت ہو جاتی ہے کہ عرب کے دوسرے قبائل کی نسبت اولاد ابراہیمؑ، خواہ وہ بنو اسماعیل ہوں یا بنو اسرائیل، ان احکام کی اولین مخاطب تھی۔ لہٰذا شروع شروع میں بنی اسرائیل بھی اسی مرکز سے وابستہ رہے ہوں گے، ان میں حج کی عبادت رائج رہی ہو گی اور وہ نذر کی قربانیاں مکہ میں آ کر کرتے ہوں گے۔ نیز اس دور میں بیت اللہ ہی ان کی نمازوں کا قبلہ رہا ہو گا۔ اس کی تائید تورات کے اس جملہ سے ہوتی ہے کہ ''اسماعیل اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا''۔ (پیدائش ۱۶: ۱۲) چونکہ ابراہیم علیہ السلام کی نسل پھیل کر عرب کے مختلف علاقوں میں جا بسی اس لیے اسماعیلؑ کا سب بھائیوں کے سامنے بسنا اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کا مسکن سب کا قبلہ ہو اور وہ اس کی یہ حیثیت تسلیم کرتے رہے ہوں۔ لہٰذا بنی اسرائیل کا اصلی وقدیمی قبلہ بھی مکہ مکرمہ کا بیت اللہ رہا ہو گا۔ اس بات کی تائید بنی اسرائیل کے خیمہ عبادت اور بعد میں بیت المقدس کی تعمیر کی تفصیلات سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں خیمہ عبادت کی ہیئت اور اس کے بارے میں احکام پر بحث کرتے ہوئے حمید الدین فراہیؒ لکھتے ہیں:

> ہمارے نزدیک اس ساری ترتیب کا اصلی فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص خداوند کے حضور آئے اس کا رخ جانب جنوب یعنی کہ معظمہ اور ابراہیمی قربان گاہ کی طرف ہو۔ اس کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ خیمہ کے اندر مسکن مقدس بھی جنوب ہی کی سمت میں تھا اور مذبح اس کے سامنے دروازے کی طرف تھا۔ اس لیے جو شخص وہ قربانی پیش کرتا جس کو قدس الاقداس کہتے ہیں وہ مذبح کے شمالی جانب کھڑا ہوتا تا کہ اس کا رخ

مسکن ربانی کی طرف ہو سکے، جس کے معنی یہ تھے کہ اس کا رخ لازماً خانہ کعبہ کی طرف ہوتا جس کے پاس ہی مروہ ہے، جس کو اولین قربان گاہ ہونے کی عزت حاصل ہے اور اس کے پاس ہی مسکن اسماعیل بھی ہے[6]۔

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ اولادِ اسحاق کا قبلہ مکہ کا بیت اللہ تھا اور ان کی قربانیاں اسی کے رخ پر ہوتی تھیں۔ بعد میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب بیت المقدس کی تعمیر کی تو اس میں بھی عبادت گاہ کا رخ جنوب کی جانب تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح ہماری مسجدیں قبلہ رخ تعمیر ہوتی ہیں اسی طرح بیت المقدس کی تعمیر بھی قبلہ کے رخ پر ہوئی۔ بعد کے کسی دور میں یہودیوں نے بیت المقدس کو قبلہ بنالیا اور بیت اللہ سے تعلق توڑ لیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جب بیت اللہ کی خدمت کے لیے مکہ میں بسایا گیا تو اس وقت یہ سرزمین بالکل غیر آباد، وسائل رزق سے محروم اور پرخطر تھی۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے اس کی آبادی کی بھی دعا کی اور رزق وفضل کی کشائش اور امن وامان کی بھی۔ قرآن میں ان کی دعا یوں نقل ہوئی ہے:

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَ بَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ. رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ. رَبَّنَاۤ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ. رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ. (ابراہیم۔۱۴: ۳۵۔۳۷)

اے ہمارے رب! اس سرزمین کو پرامن بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب! ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد میں سے ایک بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب، تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کردے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔

یہ دعا قبول ہوئی اور اس زمانہ سے آج تک مکہ مکرمہ تجارت کا ایک ایسا مرکز رہا ہے جہاں ہر شہری سہولت میسر ہے اور وہاں کے باشندے تجارت ہی سے رزق پاتے ہیں۔ خانہ کعبہ کی بدولت جو تقدس اس شہر کو حاصل ہوا اور حج اور عمرہ کی عبادات کی عظمت جو دلوں میں قائم ہوئی اس کی بدولت نہ صرف حرم کعبہ میں، بلکہ پورے ملک میں، مخصوص مہینوں میں امن وامان قائم رہتا جس کی بدولت حج وعمرہ کے لیے آنے والے بحفاظت اپنا سفر کر سکتے بلکہ ان مہینوں میں تجارت بھی ممکن ہوتی۔

جہاں تک دعائے ابراہیمؑ کے اس حصہ کا تعلق ہے جو نسل اسماعیل میں رسول کی بعثت کے بارے میں ہے تو اس کی قبولیت کو موخر کر دیا گیا اور صدیاں گزر جانے کے باوجود اس رسول کی بعثت نہ ہوئی جس کے لیے تعمیر کعبہ کے وقت دعا کی گئی تھی۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سورہ البقرہ۔۲:۲۵۸

۲۔ سورہ الصافات ۳۷: ۸۳تا۱۰۰

۳۔ تورات کی کتاب پیدائش کے باب ۲۰ میں بیان ہوا ہے کہ ابو ملک جرار کا بادشاہ تھا۔ یہ علاقہ کنعان کے جنوب میں تھا۔ ابراہیمؑ ابو ملک سے ملے تو ان کو رخصت کرتے وقت اس نے بھیڑ بکریاں، گائے بیل، غلام اور لونڈیاں ان کو پیش کیں اور کہا کہ میرا ملک آپ کے سامنے ہے، جہاں جی چاہے رہو۔

اس باب میں حضرت ابراہیمؑ کا اپنی بیوی سارہ کو بادشاہ کے حرم میں بھیجنے کا واقعہ ابو ملک کے تعلق سے بیان کیا گیا ہے جبکہ بعینہٖ انہی تفصیلات کے ساتھ یہ واقعہ باب ۱۲ میں فرعون شاہ مصر کے حوالہ سے بیان ہوا ہے۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ سارہ دو مرتبہ ایک جیسے امتحان سے گزری ہوں اور دونوں مرتبہ اس کی تفصیلات بھی یکساں رہی ہوں۔ چونکہ عرب ابو ملک کو قبیلہ جرہم کا سردار مانتے ہیں جو حضرت اسماعیلؑ کے سسرال بھی تھے اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ واقعہ ابو ملک کے کردار کو مسخ کرنے کے لیے گھڑا گیا اور ہاجرہ کی ولدیت کے معاملہ میں خلط مبحث سے کام لیا گیا۔

۴۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے یہودی مفسر تورات ربی شلوموکی تحقیق یوں بیان کی ہے کہ ہاجرہ فرعون مصر کی بیٹی تھی۔ اس نے سارہ کی خدمت کے لیے اس بیٹی کو ان کے ساتھ کر دیا اور کہا کہ اس کا سارہ کے ہاں خادمہ ہو کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے بہتر ہے۔ اس محقق کے نزدیک ہاجرہ لونڈی نہیں بلکہ بادشاہ کی بیٹی تھیں۔

ابو ملک عربی نام ہے۔ اس کی ریاست بھی کنعان کے جنوب یعنی ملک عرب ہی میں بتائی گئی ہے جبکہ مصر کنعان سے مغرب کو ہے۔ صاحب تفسیر نظام القرآن حمیدالدین فراہیؒ نے اسیریا کے کتبوں کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس مصر سے گزرے وہ کنعان کے جنوب میں عرب کا شمالی ومغربی حصہ ہے نہ کہ مصر نیل۔ ان کے نزدیک ہاجرہ ابو ملک کی بیٹی تھیں۔ (دیکھیے آنحضرتؐ کا سلسلہ نسب اور اہل کتاب، حمیدالدین فراہیؒ۔ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی۔۱۹۹۱ء)

۵۔ اس موضوع پر نہایت جامع اور مدلل کتاب الرای الصحیح فی من هو الذبیح مؤلفہ حمیدالدین فراہیؒ ہے۔ جس کا ترجمہ 'ذبیح کون ہے؟' کے نام سے مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے کیا۔ (شائع کردہ: فاران فاؤنڈیشن لاہور)

۶۔ ذبیح کون ہے۔ حمیدالدین فراہیؒ، فصل ۱۵

باب 4

بنی اسرائیل میں ایک عظیم رسول کی آمد کی خبر

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ فرمایا تھا کہ ان کی نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کی مانند کردے گا تو یہ وعدہ پورا ہوا۔ ان کی نسل ان کے دونوں بیٹوں، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ، سے خوب پھیلی اور دو عظیم شاخیں بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل کے نام سے وجود میں آئیں۔

بنی اسرائیل:

حضرت اسحاقؑ کے دو بیٹے عیسو اور یعقوب ہوئے۔ یعقوبؑ، جن کا اصل نام اسرائیل تھا، کے بارہ بیٹے تھے۔ ان کی نسل بارہ قبیلوں کی شکل میں پھیلی اور بنی اسرائیل کہلائی۔ یعقوبؑ کے بیٹے یوسفؑ سوتیلے بھائیوں کی زیادتی کے نتیجہ میں غلام بن کر مصر میں بکے۔ وہاں طویل آزمائش سے گزرنے کے بعد ان کو بادشاہ کے دربار میں رسوخ حاصل ہوا تو انہوں نے اپنے والدین اور تمام بھائیوں کو کنعان کی کٹھن زندگی چھوڑ کر مصر میں آباد ہونے کی پیش کش کی۔ حضرت یعقوبؑ نے اسے قبول کرلیا۔ چنانچہ یہ پورا خاندان مصر کو نقل مکانی کر گیا۔ ابتدائی ادوار میں تو ان کو وقار اور عزت کی زندگی ملی لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ مصریوں کی اگلی نسلوں میں یوسفؑ سے عقیدت بھی کم ہو گئی اور بادشاہت بھی ایک ایسے خاندان میں چلی گئی جو ان کا نقاد اور بنی اسرائیل کے وجود کو مصر پر ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ اس خاندان نے بنی اسرائیل کو غلاموں کی حیثیت دے دی اور ان سے بیگار لی جانے لگی۔ کنعان سے آنے کے چند سو سال بعد ان کے اندر موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے جن کو اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر فائز کیا۔ انہوں نے اپنی قوم کو منظم کیا، ان کو فراموش کردہ آبائی دین کی ازسرِنو تعلیم دی اور ایمان کے تقاضے بتائے۔ انہوں نے مصر کے حکمران فرعون سے مطالبہ کیا کہ وہ بنی اسرائیل پر ظلم نہ ڈھائے اور ان کو اپنے قدیم وطن کو لوٹنے کی اجازت دے دے۔ برسہابرس کی کشمکش کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کو اجازت تو دے دی لیکن پھر وعدہ خلافی کر کے اپنے لاؤلشکر سمیت ان کے تعاقب میں نکلا۔ اس وعدہ خلافی اور اللہ کے رسول کی نافرمانی کی سزا کے طور پر فرعون اور اس کا لشکر سمندر میں غرق ہو گئے اور اہل مصر کے باغ وچمن آسمانی آفت سے تباہ ہو گئے۔

حضرت موسیٰؑ کی پیشین گوئی:

عبور دریا کے بعد بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ کیا۔ تمام جہان والوں میں سے ان کو اپنی ہدایت کا پرچار کرنے کے لیے منتخب کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ آسمانی کتاب، جو واضح احکام پر مبنی تھی، تحریری شکل میں عطا ہوئی اور انہوں نے بنی اسرائیل سے بار بار اس بات پر عہد لیا کہ وہ اس کتاب کو اپنی رہنما کتاب کی حیثیت دیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ اپنی وفات سے قبل انہوں نے بطور وصیت ایک بار پھر قوم کو جمع کر کے تمام احکام پر عمل کرنے کا عہد لیا۔ اس موقع پر انہوں نے بطور خاص آئندہ آنے والے ایک نبی کے مبعوث ہونے کی خبر دی، اس کی خصوصیات وعلامات بتائیں اور اس کی بعثت کے وقت اس پر ایمان لانے کی تلقین فرمائی۔ تورات میں اس کا تذکرہ حسب ذیل الفاظ میں ہے:

> خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے، میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔ (کتاب استثنا ۱۸:۱۵)

حضرت موسیٰؑ کو جب تورات کے احکام ملے تو وہ بنی اسرائیل کے لیڈروں کی ایک جماعت کو بھی کوہ طور پر ساتھ لے گئے تھے تا کہ وہ بھی ان احکام کے عہد میں شریک ہوسکیں۔ تورات کے بیان کے مطابق وہاں بنی اسرائیل نے ایک بہت بڑی آگ کے بیچ میں سے خداوند کی آواز سنی تو دہشت زدہ ہو گئے۔ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا کہ آئندہ انہیں اس طرح کی صورت حال سے دوچار نہ کیا جائے۔ اسی موقع کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت موسیٰؑ علیہ السلام اپنی وفات کے قریب بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> تم کہنے لگے کہ خداوند ہمارے خدا نے اپنی شوکت اور عظمت ہم کو دکھائی اور ہم نے اس کی آواز آگ میں سے آتی سنی۔ آج ہم نے دیکھ لیا کہ خداوند انسان سے باتیں کرتا ہے تو بھی انسان زندہ رہتا ہے۔ سو اب ہم کیوں اپنی جان دیں کیونکہ ایسی بڑی آگ ہم کو بھسم کر دے گی۔ اگر ہم خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سنیں تو مر ہی جائیں گے کیونکہ ایسا کون سا بشر ہے جس نے زندہ خدا کی آواز ہماری طرح آگ میں سے آتی سنی ہو اور پھر بھی جیتا رہا۔ سو تو ہی نزدیک جا کر جو کچھ خداوند ہمارا خدا کہے اسے سن لے اور تو ہی وہ باتیں جو خداوند ہمارا خدا تجھ سے کہے ہم کو بتانا اور ہم اسے سنیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ (استثنا۵: ۲۴۔۲۷)

معلوم ہوا کہ اس موقع پر بنی اسرائیل کو شریعت دینے کے ساتھ ساتھ خدا کے جلال کا مشاہدہ کرایا گیا اور انہوں نے سمعنا و اطعنا کا اقرار کیا۔ البتہ خوف زدہ ہو کر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے التجا کی کہ احکام عطا کرنے کا یہ انداز نہایت ہیبت ناک ہے لہٰذا ہمیں اس میں شریک نہ کیا جائے اور موسیٰؑ خود ہی احکام حاصل کر کے بتا دیا کریں تو بنی اسرائیل ان کی اطاعت کیا کریں گے۔

بنی اسرائیل کے عہد کی باقاعدہ تقریب بھی حورب کے مقام پر منائی گئی تا کہ وہ ان کے ہاں یادگار رہے۔

کتاب خروج میں ہے:

> اور موسیٰ نے خداوند کی سب باتیں لکھ لیں اور صبح کو سویرے اٹھ کر پہاڑ کے نیچے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے حساب سے بارہ ستون بنائے۔ اور اس نے بنی اسرائیل کے جوانوں کو بھیجا جنھوں نے سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور بیلوں کو ذبح کر کے سلامتی کے ذبیحے خداوند کے لیے گزرانے۔ اور موسیٰ نے آدھا خون لے کر باسنوں میں رکھا اور آدھا قربان گاہ پر چھڑک دیا۔ پھر اس نے عہد نامہ لیا اور لوگوں کو پڑھ کر سنایا۔ انہوں نے کہا کہ جو کچھ خداوند نے فرمایا ہے اس سب کو ہم کریں گے اور تابع رہیں گے۔ تب موسیٰ نے اس خون کو لے کر لوگوں پر چھڑکا اور کہا دیکھو یہ اس عہد کا خون ہے جو خداوند نے اب سب باتوں کے بارے میں تمہارے ساتھ باندھا ہے۔ (خروج ۲۴:۴۔۸)

گویا معاہدہ کے وقت ذبیحہ کا خون ایک طرف بنی اسرائیل پر چھڑکا گیا اور دوسری طرف قربان گاہ پر، جو خداوند تعالیٰ کی قائم مقام تھی۔ یہ حلف کی ایک قسم تھی۔ اس کا مطلب اس بات کا اظہار تھا کہ بنی اسرائیل اس عہد کی حفاظت میں اپنا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے اس عہد میں کون سے احکام شامل تھے۔ کتاب خروج میں مشہور ومعروف احکام عشرہ(Ten Commandments) کا ذکر بھی ہے اور مزید احکام کا بھی جو چند ابواب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ البتہ کتاب استثنا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ خطبہ شامل ہے جو انہوں نے وفات سے قبل بطور وصیت بنی اسرائیل کو دیا۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

> اے اسرائیلیو! تم ان آئین اور احکام کو سن لو جن کو میں آج تم کو سناتا ہوں تا کہ تم ان کو سیکھ کر ان پر عمل کرو۔ خداوند ہمارے خدا نے حورب میں ہم سے ایک عہد باندھا۔ خداوند نے یہ عہد ہمارے باپ دادا سے نہیں بلکہ خود ہم سب سے جو یہاں آج کے دن جیتے ہیں باندھا۔ خداوند نے تم سے اس پہاڑ پر روبرو آگ کے بیچ میں سے باتیں کیں۔ اس وقت میں تمہارے اور خداوند کے درمیان کھڑا ہوا تا کہ خداوند کا کلام تم پر ظاہر کروں کیونکہ تم آگ کے سبب سے ڈرے ہوئے تھے اور پہاڑ پر نہ چڑھے۔ (استثنا ۵:۱۔۵)

یادر ہے کہ حورب کوہ سینا کے دامن میں واقع اس مقام کا نام ہے جہاں بنی اسرائیل عہد کے لیے جمع ہوئے تھے اور پہاڑ پر زلزلہ طاری کر دیا گیا تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل نے یہ التجا کی تھی کہ ان تک احکام پہنچانے کی یہ ہیبت ناک شکل آئندہ اختیار نہ کی جائے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام پر اعتماد کریں گے اور وہ جو احکام دیں گے ان کو قبول کریں گے۔

اپنے اس خطاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے پچھلے چالیس برس کے رویوں پر تبصرہ کیا، ان کو دیے گئے خاص خاص احکام کی یاددہانی کرائی اور تلقین فرمائی کہ وہ خداوند کے عہد پر پورا اتریں۔ انہی

احکام میں سے حسب ذیل حکم بھی ہے:

> خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے، میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہو گا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تا کہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ (استثناء ۱۸: ۱۵-۱۹)

معلوم ہوا کہ حورب کے مقام پر کچھ بنیادی احکام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی موجودگی میں دیے گئے لیکن جب وہ گھبرا گئے اور یہ درخواست پیش کی کہ باقی احکام حضرت موسیٰؑ کو دے دیے جائیں تو وہ بے چون و چرا ان کو تسلیم کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ نے باقی احکام وفرامین موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے نازل فرمائے۔ ایک پیغمبر کے برپا ہونے کا وعدہ اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے کا حکم، معلوم ہوتا ہے، بعد میں دیا گیا لیکن یہ بنی اسرائیل کے قول وقرار کے مطابق ان کے عہد ہی میں شامل تھا۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے حورب کے عہد ہی کے حوالہ سے اس حکم کی یاد دہانی اپنی وصیت میں بنی اسرائیل کو کرائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس خطاب میں وہ علامات وخصوصیات بیان کر دی گئی ہیں جن کی مدد سے اس پیغمبر کو پہچاننا ممکن ہو سکے جب اس کی بعثت ہو۔ وہ علامات حسب ذیل ہیں:

۱۔ وہ پیغمبر 'بنی اسرائیل کے بھائیوں' میں سے ہو گا۔ یہ اس پیغمبر کے نسب کی اطلاع دی گئی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کا فرد نہیں ہو گا بلکہ ان کے بھائیوں میں سے ہو گا۔ بنی اسرائیل حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ان کے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اولاد ابراہیم میں سے اس پیغمبر کو بنی اسماعیل میں پیدا کیا جائے گا۔

۲۔ وہ 'حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند' ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد شکل وصورت کی مماثلت نہیں بلکہ منصب رسالت کی مماثلت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نمایاں ترین خصوصیات تین ہیں۔ اولاً آپ رسول تھے۔ ثانیاً آپ قانون وشریعت لائے اور ثالثاً آپ کی دعوت کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ گویا موعود رسول قانون و شریعت لائے گا اور وہ اپنے دعوت دین کے مشن میں کامیاب ہو گا۔

۳۔ اس کی نبوت میں وحی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی پہاڑ پر دہشت ناک مناظر نہیں دیکھنے پڑیں گے جن کے اندر سے لوگ خدا کا کلام سنیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالے گا اور وہ اسے پڑھ کر سنائے گا۔

۴۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہر کام کرے گا۔

۵۔ جو شخص اس رسول کی بات نہ مانے گا اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ فرمائے گا۔

ان خصوصیات وعلامات پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں کامل مطابقت ہے۔ یہ خبر بنی اسماعیل میں پیدا ہونے والے ایک رسول کی ہے جو لوگوں کو اللہ کا کلام سنائے گا اور ان کو احکام یعنی کتاب وحکمت کی تعلیم دے گا۔ گویا اس موقع پر حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو اپنے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے حوالہ سے تلقین فرمائی کہ جب وہ رسول پیدا ہوں تو بنی اسرائیل ان کی تعلیم پر کان دھریں اور ان کی اطاعت کریں ورنہ وہ خدا کے غضب کے مستحق ٹھہریں گے۔ قرآن کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے بعد آنے والے تمام انبیاء بنی اسرائیل کو اس عہد کی یقین دہانی کراتے رہے کہ وہ اس موعود رسول کی بعثت پر اس پر ایمان لائیں گے اور اس کی نصرت کریں گے۔ اس عہد کو میثاق النبیین کا نام دیا گیا ہے، یعنی نبیوں کا لیا ہوا عہد۔

حضرت داؤدؑ کی پیشینگوئی :

حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل کو تورات پر قائم رکھنے اور ان کے فرائض کی یاد دہانی کے لیے ان کے اندر پے در پے نبی مبعوث ہوئے۔ یہ لوگ کنعان میں حکومت بھی کرنے لگے۔ ان کے حکمرانوں میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو اقتدار کے ساتھ ساتھ نبوت بھی حاصل تھی اور وہ اپنے ہم عصر حکمرانوں پر مادی و روحانی فوقیت رکھتے تھے۔ حضرت داؤدؑ کو آسمانی کتاب زبور عطا ہوئی۔ اس کے اندر بھی آئندہ پیدا ہونے والے ایک عظیم رسول کی خبر ان الفاظ میں دی گئی:

جس پتھر کو معماروں نے رد کیا
وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا
یہ خداوند کی طرف سے ہوا
اور ہماری نظروں میں عجیب ہے
یہ وہی دن ہے جسے خداوند نے مقرر کیا
ہم اس میں شادمان ہوں گے اور خوشی منائیں گے
آہ! اے خداوند، بچالے
آہ! اے خداوند، خوشحالی بخش
مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے
ہم نے تم کو خداوند کے گھر سے دعا دی ہے۔ (زبور ۱۱۸: ۲۲۔۲۶)

اس اقتباس سے بھی چند باتیں ایسی نمایاں ہوتی ہیں جو آنے والے نبی کی علامت ہیں۔ مثلاً:

۱۔ قصرِ نبوت کی تعمیر میں جو لوگ نظر انداز ہوئے ان میں یہ پیغمبر آئے گا۔ دیکھا جائے تو بنی اسماعیل میں حضرت اسماعیلؑ کے بعد کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا تھا جبکہ بنی اسرائیل میں پے در پے بہت سے نبی آئے۔

۲۔ جو نبی مبعوث ہوگا وہ قصرِ نبوت کے کونے کا پتھر ہوگا۔ یعنی وہ آخری پیغمبر ہوگا جس پر نبوت کامل ہو جائے گی اور اس کے بعد کسی نبی کی بعثت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر بنی اسرائیل کو حیرت ہوگی کہ نظر انداز ہونے والے لوگوں کو کیوں یہ شرف بخشا گیا ہے۔ حضرت داؤدؑ دعا کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل اس رسول کی مخالفت سے باز رہیں۔

۴۔ اس پیغمبر کے حق میں دعا خداوند کے گھر سے یعنی بیت اللہ میں کی گئی۔ یہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی دعا کا حوالہ ہے۔

۵۔ وہ پیغمبر خداوند کے نام سے آ کر برکت دے گا۔ دوسرے الفاظ میں خدا کا کلام اس کے پاس ہوگا اور قومیں اس سے برکت حاصل کریں گی۔

بعد میں بنی اسرائیل اپنی ذمہ داریوں کو بھلا بیٹھے۔ تورات کو انہوں نے ضائع کر دیا اور مشرک قوموں کے اطوار سیکھ لیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسے دشمنوں کو مسلط کر دیا جنہوں نے قوم کی قوم کو غلام بنا لیا اور یروشلم کے معبد کو تاراج کر دیا۔ طویل عرصہ کے بعد اس قوم کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا۔ ان میں مصلحین پیدا ہوئے جن کی باتوں پر انہوں نے عمل کیا۔ تورات کو یادداشت کی مدد سے دوبارہ مرتب کیا گیا۔ قوم میں شعور پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر نظرِ عنایت فرمائی اور ان کو آزادی بخشی۔ معبد دوبارہ تعمیر ہوا۔ بنی اسرائیل میں پھر سے دین کا چرچا ہوا۔ لیکن یہ تبدیلی عارضی ثابت ہوئی۔ سابقہ غلط رویے پھر سے غالب آ گئے۔ تورات کے حصے بخرے کر کے ان میں تحریف کی جانے لگی۔ بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے اب جو نبی یا مصلحین آئے تو قوم نے ان کو خوش آمدید نہیں کہا بلکہ اصلاح کے لیے تنقید کرنے والی ہر زبان گنگ کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ تاریخ میں کئی نبیوں کے قتل کے واقعات ملتے ہیں۔ اس قوم نے دین کا حلیہ بگاڑ دیا اور نئے دین کو یہودیت (Judaism) کا نام دیا گیا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان میں اتمامِ حجت کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسول بنا کر مبعوث کیا۔ انہوں نے یہود کو تجدیدِ ایمان کی دعوت دی۔ پھر سے دین کے تقاضوں کی وضاحت کی اور تورات کو اس کی اصل روح کے مطابق پیش کیا۔ انہوں نے نئے نئے اسالیب اور پیرایوں میں ان کو تعلیم دی لیکن یہودی علماء نے ان کی کسی بات کو نہیں مانا بلکہ ان کی راہ میں روڑے اٹکانے کے درپے رہے۔ بالآخر سازش کر کے ان کی جان لینے کے لیے ان کو رومی حکومت کے حوالہ کر دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو بات بڑے شدومد سے پیش کی اور اس کو اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا وہ یہ تھی کہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آچکی ہے اور میں اس کی راہ صاف کرنے آیا ہوں' وہ مختلف شہروں میں جاتے تو اسی حقیقت کو بیان فرماتے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے ان کے خاص مقصد بعثت کو متعین کیا جائے۔

انجیلوں میں آسمانی بادشاہت کا تذکرہ:

انجیلوں کی موجودہ حیثیت اگرچہ ایک قابل بحث موضوع ہے لیکن چونکہ عیسائی دنیا چار انجیلوں کو قابل اعتماد قرار دیتی اور ان کے مذہبی رہنما ان کی حقانیت کے قائل ہیں اس لیے دوسرے ادیان کے ماننے والے خواہ ان کی استنادی حیثیت کے بارے میں ان سے مختلف رائے رکھتے ہوں، انہیں ان کتابوں سے متعلق کسی مسئلہ پر تحقیق کرتے وقت بہرحال انہی کتابوں کے بیان پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔

انجیلوں کا قاری ان میں بارہا استعمال ہونے والی اصطلاح ''آسمان کی بادشاہی'' (Kingdom of Heaven) کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کا ذکر عیسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر نبی یحییٰ علیہ السلام نے بھی کیا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام اس کو مختلف معانی میں بار بار استعمال کرتے ہیں۔ کہیں وہ اس سے محض نبوت مراد لیتے ہیں یعنی نبی پر ایمان لانے والا گویا آسمان کی بادشاہی میں داخل ہو جاتا ہے اور کہیں اہل ایمان کی آخری سرفرازی یعنی جنت میں داخلہ کو آسمان کی بادشاہی میں داخلہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ دونوں مواقع عبارت کے سیاق وسباق پر غور کرنے سے بہ آسانی متعین کیے جاسکتے ہیں۔ ان دو استعمالات کے علاوہ انہوں نے آسمان کی بادشاہی کے نزدیک آجانے کا نہایت قوت سے پرچار کیا، اس پرچار کو اپنی آمد کا مقصد قرار دیا اور اس بادشاہی کی خصوصیات کو متعدد تمثیلوں کی مدد سے سمجھایا۔ یہود کو بالخصوص خبردار کیا کہ اگر وہ اس بادشاہی میں داخل نہ ہوئے تو وہ ملعون قوم ٹھہریں گے۔ آسمان کی اس بادشاہی کا اطلاق عام نبوت پر ہوتا ہے نہ آخرت کے انجام پر، لہٰذا یہ ان دونوں سے مختلف کوئی چیز ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی منادی:

انجیل متی کو کھولیے تو حضرت یحییٰ (یوحنا) علیہ السلام آسمانی بادشاہی کے نزدیک آجانے کی خبر دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کی منادی یہ ہوا کرتی کہ ''توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آگئی'' (متی ۳:۲) انہوں نے یہود کے دو مشہور گروہوں ...... صدوقیوں اور فریسیوں ...... کو مخاطب کر کے متنبہ کیا کہ:

> اے سانپ کے بچو! تم کو کس نے جتا دیا کہ آنے والے غضب سے بھاگ سکو گے۔ پس توبہ کے موافق پھل لاؤ اور اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہیم ہمارا باپ ہے کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا ان پتھروں سے ابراہیم کے لیے اولاد پیدا کر سکتا ہے۔ اور اب درختوں کی جڑ پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے پس جو درخت اچھا پھل

نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ میں تو تم کو توبہ کے لیے پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں لیکن جو میرے بعد آتا ہے وہ مجھ سے زور آور ہے۔ میں اس کی جوتیاں اٹھانے کے لائق نہیں۔ وہ تم کو روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا۔ اس کا چھاج اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا اور اپنے گیہوں کو تو کھتے میں جمع کرے گا مگر بھوسی کو اس آگ میں جلائے گا جو بجھنے کی نہیں۔ (متی ۳: ۷-۱۲)

اس خطاب میں حضرت یحییٰ علیہ السلام یہود کو خبر دار کر رہے ہیں کہ ان کے لیے جو وقت آگے آرہا ہے اس سے وہ اپنی جان صرف اس صورت میں بچا سکتے ہیں کہ وہ اپنے نسب پر غرور کرنے کے بجائے توبہ کریں اور آسمانی بادشاہی کو قبول کریں۔ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ان کے سوا اور بھی ہے، جو اگرچہ وحی والہام سے بے بہرہ ہونے کے باعث پتھروں کے حکم میں ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان کو دین کی وراثت منتقل کر سکتا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل خداوند تعالیٰ سے کیے گئے اپنے عہد کو پورا کرنے سے قاصر رہے ہیں اس لیے اب ان کا وجود عبث ہے۔ اگر وہ توبہ نہیں کریں گے تو ان کو ایک بے ثمر درخت کی مانند کاٹ دیا جائے گا۔ میرے بعد آنے والا پیغمبر ایمان لانے والوں کے لیے تو سلامتی لائے گا لیکن مخالفین کو جہنم رسید کرنے کا باعث ہوگا۔ وہ میری طرح پانی سے بپتسمہ نہیں دے گا بلکہ روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا یعنی وحی الٰہی پر ایمان لانے کی دعوت دے گا اور جو لوگ اس کا انکار کریں گے ان کا دماغ آگ سے درست کرے گا۔ جنگ کے لیے آگ کا استعارہ نہایت معروف ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اس اقتباس کو منطبق کرنا ممکن نہیں۔ وہ بنی اسرائیل میں سے تھے، پانی سے بپتسمہ دیتے تھے، یوحنا کی طرح یہود کو تنبیہ کرتے کرتے ان کی عمر گزری اور ان کی زندگی میں جنگ کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے الفاظ 'جو میرے بعد آتا ہے' سے بھی یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اس اقتباس کا مصداق حضرت عیسیٰؑ ہیں۔ کیونکہ وہ آنجناب کے ہم عصر تھے اور متی کی روایت کے مطابق اس خطاب کے وقت بذات خود حضرت یحییٰ کی خدمت میں موجود بپتسمہ کی درخواست کر رہے تھے۔ (متی ۳: ۱۳) لہٰذا ماننا چاہیے کہ ایک پیغمبر کی رسالت کی خوشخبری پہلے حضرت یحییٰؑ نے دی اور اسی کو زیادہ واشگاف الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سنایا، جیسا کہ متی کے اگلے ابواب میں ہے۔ گویا آسمانی بادشاہت کے نزدیک آجانے سے مراد اس موعود پیغمبر کی بعثت کا زمانہ قریب آجانا تھا۔

حضرت مسیح کی منادی:

حضرت یحییٰ کو رومی گورنر نے گرفتار کر لیا تو

اس وقت سے یسوع نے منادی کرنا اور یہ کہنا شروع کیا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آگئی

ہے۔ (متی ۴:۱۷)

یہ خوشخبری آنجناب نے کسی ایک جگہ نہیں بلکہ علاقے میں گھوم پھر کر ہر جگہ دی:

اور یسوع تمام گلیل میں پھرتا رہا اور ان کے عبادت خانوں میں تعلیم دیتا اور بادشاہی کی خوشخبری کی منادی کرتا رہا۔ (متی ۴:۲۳)

گلیل کے بعد آپ کفرنحوم کی بستی میں یہ منادی کرتے رہے۔ جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو لوگوں نے درخواست کی کہ آپ ہمارے پاس سے نہ جائیں۔ آپ نے جواب دیا:

مجھے اور شہروں میں بھی خدا کی بادشاہی کی خوشخبری سنانا ضرور ہے کیونکہ میں اسی لیے بھیجا گیا ہوں۔ (لوقا ۴:۴۳)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی آمد کا خاص مقصد یہ بتایا کہ مجھے لوگوں کو نبی موعود کی آمد کی نوید سنانا ہے۔ آپ کی کتاب کا عنوان انجیل ہے جس کے معنی خوشخبری کے ہیں۔ عیسائی اس خوشخبری کا مصداق خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرار دیتے ہیں حالانکہ ایسا ماننے کا کوئی قرینہ نہیں۔ اس کے نمایاں وجوہ حسب ذیل ہیں:

ا۔ اگر حضرت یحییٰؑ کی بشارت اور اپنی خوشخبری کا مصداق سیدنا مسیحؑ خود ہوتے تو شہروں میں ان کی منادی ان الفاظ میں ہوتی کہ آسمان کی بادشاہی آ چکی۔ اب تمہیں انتظار کس کا ہے، ایمان لاؤ۔

ب۔ جب حضرت یحییٰ قید خانہ میں تھے اور انہوں نے سیدنا مسیحؑ کی تبلیغ کی شہرت سنی تو انہوں نے پیغام بھیج کر حقیقت معلوم کی۔ اس کے جواب میں حضرت مسیحؑ نے اس بات کی تردید فرمائی کہ آپ ہی موعود نبی ہیں:

یوحنا نے قید خانہ سے پچھوا بھیجا کہ آنے والا تو ہی ہے یا ہم دوسرے کی راہ دیکھیں تو جواب بھجوایا کہ غریبوں کو خوشخبری سنائی جا رہی ہے اور مبارک وہ ہے جو میرے سبب سے ٹھوکر نہ کھائے۔ (متی ۱۱:۴۔۶)

اس اقتباس میں ''آنے والا'' سے مراد وہ خاص پیغمبر ہے جس کی آمد کی اطلاع انبیائے بنی اسرائیل مسلسل دیتے آئے اور جس پر ایمان لانے کا عہد بنی اسرائیل کوہ طور کے دامن میں کر چکے تھے۔ غریبوں کو جو خوشخبری سنائی جا رہی تھی وہ آسمانی بادشاہت کے نزدیک آنے کی تھی۔ غریب سے مراد اللہ کے آگے عاجزی و فروتنی کا اظہار کرنے والے لوگ ہیں جن کے متعلق مسیح علیہ السلام کا قول یہ ہے کہ ''مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہی انہی کی ہے''۔ (متی ۵:۳) دوسرے الفاظ میں مغرور اور ہٹ دھرم لوگ اس بادشاہی میں شامل ہونے سے محروم رہیں گے۔

اوپر کے اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰؑ خود جس پیغمبر کی آمد کی خوشخبری دیتے رہے تھے اسی کی

آمد کی بابت انہوں نے حضرت مسیحؑ سے پچھوایا کہ کیا وہی موعود پیغمبر ہیں۔ آنجناب نے واضح الفاظ میں جواب بھجوایا کہ میں تو خود اس کی آمد کی خوشخبری سنا رہا ہوں۔ میری ذات کے بارے میں کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ مطلب یہ ہوا کہ موعود پیغمبر میں نہیں، میرے بعد آنے والا ہے۔

ج۔ حضرت مسیحؑ مدۃ العمر یہ نوید خود بھی سناتے رہے اور آخر میں اپنے خلفاء کو بھی اس بات کی تلقین فرمائی کہ میرے بعد اسی مشن کی تکمیل تم کرنا۔ آپ نے فرمایا:

> اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آگئی ہے۔ (متی ۱۰: ۷۔۸)

یہ تمام قرائن اس کے حق میں ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی بعثت کا مقصد اپنے بعد آنے والے اس نبی کی راہ ہموار کرنا تھا جس کی نوید پچھلے انبیاء بھی سناتے رہے تھے۔ آپ نے لوگوں کو خبردار کیا کہ جس خاص پیغمبر کا تمہیں انتظار تھا اب اس کی آمد کا وقت نزدیک آچکا ہے۔ میرے بعد اس کی آمد کا انتظار کرو۔

آسمانی بادشاہت کی حقیقت تمثیلات کی روشنی میں:

متی باب ۱۳ میں متعدد تمثیلات کے ذریعے سیدنا مسیح علیہ السلام نے آسمانی بادشاہت کی حقیقت سمجھائی۔ فی الواقع ان تمثیلات میں پیغمبر موعود کی رسالت کی خصوصیات سمودی گئی ہیں۔ بعض خصوصیات حسب ذیل ہیں:

ا۔ آسمانی بادشاہت رائی کے دانہ کی طرح ہوگی جو بہت چھوٹا ہوتا ہے لیکن جب اگتا ہے تو بڑھتے بڑھتے اس قدر تناور درخت بن جاتا ہے کہ اس کی ڈالیوں پر پرندے بسیرا کرتے ہیں۔ یا اس کی مثال وہ خمیر ہے جو ایک عورت ذرا سی مقدار میں بہت سے آٹے میں ملا دیتی ہے تو کچھ دیر بعد تمام آٹے میں خمیر اٹھ چکا ہوتا ہے۔ یعنی نبی موعود اپنی دعوت کا آغاز کریں گے تو وہ تنہا ہوں گے۔ اس کے بعد لوگ ان کے ہم نوا بنتے جائیں گے، ان کا قافلہ بڑھتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ ان کی تعلیم کی روشنی سے پورا ملک جگمگا اٹھے گا۔ ہوتے ہوتے کئی دوسری اقوام اسی کی نام لیوا ہو جائیں گی اور اسی کی پناہ میں آسودگی پائیں گی۔

ب۔ آسمانی بادشاہت کھیت میں چھپے کسی خزانے کی طرح ہے جس پر اگر کوئی شخص مطلع ہو جائے تو اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جائداد بیچ کر اس کھیت ہی کو خرید لیتا ہے۔ یا اس کی تمثیل یوں ہے جیسے عمدہ موتیوں کا کوئی سوداگر جب اپنی پسند کا بیش قیمت موتی کہیں دیکھ لیتا ہے تو اس کو حاصل کرنے کی خاطر اپنا سب کچھ بیچ دیتا ہے۔ یعنی نبی موعود کی دعوت کی قدر و قیمت سے جو شخص واقف ہو جائے گا وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے کسی چھوٹی یا بڑی قربانی سے

دریغ نہیں کرے گا۔ وہ مال و جان کو عزیز نہیں رکھے گا بلکہ دعوت کی خاطر جان لڑا دینے کو اپنی سعادت سمجھے گا۔

ج۔ آسمانی بادشاہت اس بڑے جال کی مانند ہوگی جو دریا میں ڈالا جاتا ہے تو اس میں ہر قسم کی چھوٹی بڑی مچھلیاں سمیٹ لی جاتی ہیں۔ اس کے بعد دریا کے کنارے پر لاکر اچھی مچھلیاں الگ کر لی جاتی ہیں اور خراب پھینک دی جاتی ہیں۔ علیٰ ہذالقیاس اچھے بیج کے ساتھ کچھ خراب بیج بھی کھیت میں پڑ جاتا ہے تو کسان اس کو اگنے اور بڑھنے دیتا ہے۔ جب فصل کٹتی ہے تو خراب بیج کے پودوں کو الگ جمع کر کے آگ لگا دی جاتی ہے اور اچھے بیجوں کی فصل کو سمیٹ کر محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اس تمثیل میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ موعود نبی کی رسالت میں مومن و منافق جمع ہو جائیں گے تو منافقوں کو برداشت کیا جائے گا اور ان پر فوری گرفت نہیں ہوگی۔ بعد کے مراحل میں ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے گا جس سے ان میں اور خالص و مخلص اہل ایمان میں امتیاز ہو جائے گا۔

یہود کو تنبیہ:

سیدنا مسیح علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل کی اصلاح پر مامور تھے اس لیے انہوں نے اپنی قوم کو خاص طور پر متنبہ کیا کہ ان کا ماضی کا رویہ ایسا ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت خداوندی کی حامل قوم کی حیثیت سے کام کرنے کا مزید موقع نہیں دے گا اور یہ تاج ان لوگوں کو پہنایا جائے گا جو اس کی ذمہ داریوں کا حق ادا کرنے والے ہوں۔ آپ نے فرمایا:

> ✓ میں تم سے کہتا ہوں کہ بہتیرے پورب اور پچھم سے آ کر ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے ساتھ آسمان کی بادشاہی کی ضیافت میں شریک ہوں گے مگر بادشاہی کے بیٹے باہر اندھیرے میں ڈالے جائیں گے۔ وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔ (متی ۸:۱۲-۱۳)

اس قول کا مفہوم نہایت واضح طور پر یہ ہے کہ مشرق و مغرب کی کتنی قومیں نبی آخرالزمان پر ایمان لا کر اپنے آپ کو اخروی ضیافت کا مستحق بنالیں گی لیکن بنی اسرائیل جس ڈگر پر چل رہے ہیں اس کا انجام یہ ہوگا کہ یہ پیغمبروں کی اولاد ہونے کے باوجود ایمان سے محروم رہ کر ابدی خسران کے مستحق ٹھہریں گے۔ ایسا کیوں ہوگا اور بنی اسرائیل سے خلعت نبوت کیوں چھین لی جائے گی، اس کو سیدنا مسیحؑ نے تاکستان کی مشہور تمثیل سے واضح فرمایا:

یہ تمثیل یوں ہے کہ ایک مالک نے تاکستان یعنی انگوروں کا باغ لگایا۔ وہ اسے باغبانوں کو ٹھیکے پر دے کر پردیس چلا گیا۔ پھل کا موسم آیا تو اس نے اپنے نوکروں کو پھل لانے کے لیے بھیجا۔ باغبانوں نے نوکروں کو پکڑ کر کسی کو پیٹا، کسی کو پتھر مارے اور کسی کو قتل کر دیا۔ مالک نے پہلے سے زیادہ نوکر بھیجے۔ ان کے ساتھ بھی یہی سلوک

ہوا۔ بالآخر مالک نے اپنے بیٹے کو بھیجا تو باغبانوں نے اس کو بھی قتل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مالک ان باغبانوں کو بری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ دوسروں کو دے دے گا جو موسم پر اس کو پھل پیش کریں۔ تمثیل سنا کر سیدنا مسیحؑ نے فرمایا:

کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ:

(جس پتھر کو معماروں نے رد کر دیا
وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا
یہ خداوند کی طرف سے ہوا
اور ہماری نظر میں عجیب ہے)

اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو، جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اس کو پیس ڈالے گا۔ (متی ۲۱: ۴۲-۴۴)

تاکستان کی تمثیل میں بنی اسرائیل کے جرائم سے پردہ اٹھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کو برگزیدہ کیا لیکن وہ اس کے عہد کو پورا نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی جانب متعدد نبی مبعوث کیے لیکن انہوں نے ان کی تحقیر کی، بعض کو سنگسار اور بعض کو قتل کر دیا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک عظیم رسول ...... یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ...... کو مبعوث فرمایا تو انہوں نے اس کے قتل کی بھی تدبیر کی۔ اس شیطنت کے بعد آخر اللہ تعالیٰ اس نا ہنجار قوم کو اپنے باغ کی رکھوالی کے لیے کیوں مسلط رکھے گا۔ وہ لازماً اس ذمہ داری کو دوسروں کے سپرد کر دے گا جو اس کا حق ادا کر سکیں۔

سیدنا مسیح علیہ السلام نے کتاب مقدس کا جو حوالہ دیا یہ اصل میں زبور ۱۱۸: ۲۲-۲۳ کی عبارت ہے جس کی وضاحت حضرت داؤدؑ کے حوالہ سے اوپر گزر چکی ہے۔ اسی کی تفسیر آنجناب نے آگے کی ہے۔ معماروں کے اس پتھر کو رد کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے ہمیشہ اپنے بھائیوں ...... بنی اسماعیل ...... کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کے اندر کسی خوبی کا اعتراف نہیں کیا۔ لہٰذا بنی اسماعیل کے اندر آخری پیغمبر کی بعثت بنی اسرائیل کو ہکا بکا کر دے گی لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اٹل ہو گا۔ بنی اسرائیل اگر اس پیغمبر سے ٹکرائیں گے تو اپنا سر پھوڑیں گے۔ اس کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے۔

جب سیدنا مسیحؑ سے یہود بیزار ہو گئے تو انہوں نے ان کو رومی حکومت کے ہاتھوں قتل کروانے کی سازش تیار کی۔ جب آنجناب اس سے مطلع ہوئے تو اپنی نا ہنجار قوم کو آخری مرتبہ یوں جھنجھوڑا:

اے یروشلم: اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتی اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتی ہے، کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں مگر تم نے نہ چاہا۔ دیکھو تمہارا گھر تمہارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے مجھے پھر ہرگز نہ دیکھو گے جب تک نہ کہو گے کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔ ✓

(متی ۲۳: ۳۸-۳۹)

یہاں حضرت مسیحؑ یہود کو خدا کی لعنت سے بچانے کے لیے اپنی کاوشوں کا ذکر کر رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ یہود نے ان کی قدر نہیں کی لہٰذا اب ان سے نبوت کا منصب ہمیشہ کے لیے چھین لیا جائے گا۔ اب ان میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔ ان کی فلاح کی واحد صورت اب یہ ہے کہ اس نبی موعود پر ایمان لائیں جو خداوند کے نام سے آئے گا۔

یہود سے مایوس ہو کر سیدنا مسیحؑ نے اپنے شاگردوں کو ملک میں پھیل جانے کا حکم دیا کہ وہ بستیوں میں گھوم پھر کر صحیح دین کی منادی کریں۔ بے حد مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ لوگ اصل دین کو عوام تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہودیوں نے اپنی سرشت کے مطابق حضرت مسیحؑ کی تعلیم میں تحریف کا منصوبہ بنایا اور حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا اور خدائی کے تین ستونوں میں سے ایک ستون قرار دے کر خدا بنا ڈالا۔ پال نے یہ عقائد مسیحؑ کے پیروکاروں میں پھیلائے تو ان کی اکثریت نے ان کو قبول کر لیا اور خالص دین مسیحی کے حاملین اقلیت میں ہو گئے۔ پال کے ماننے والے رومی سلطنت میں با اثر ہو گئے اور آہستہ آہستہ حکمران طبقہ عیسائی ہو گیا۔ اس طرح بحیثیت مجموعی یہود اور نصاریٰ، جنھیں کتاب اللہ کی وراثت سونپی گئی تھی، دونوں اصل دین توحید کے خادم اور مبلغ کے طور پر ناکام ہو گئے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سیدنا مسیحؑ نے اپنے بعد اس نبی کے آنے کی اطلاع دی جس سے یہود پہلے سے واقف تھے اور جس کے انتظار کا ان کو حکم دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے پیشرو انبیاء و رسل کی طرح حضرت عیسیٰؑ نے بھی اس رسول کی کئی علامات و خصوصیات بیان کیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

✓ اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔

(یوحنا ۱۴: ۳۰)

✓ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ (یوحنا ۱۶: ۷-۸)

مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو کامل سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ (یوحنا۱۶:۱۲۔۱۳)

اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے، یعنی سچائی کا روح۔ (یوحنا۱۴:۱۶۔۱۷)

ان اقتباسات سے حسب ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں:

۱۔ آنے والے پیغمبر کا مرتبہ و مقام سب سے اونچا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ بھی اس کے ہم پلہ نہیں۔

۲۔ اس کے پاس کامل سچائی یا مکمل حق ہوگا۔ یعنی جو تعلیم دے گا وہ آسمانی ہدایت کی تکمیل کرے گی جب کہ سابق انبیاء کے پاس ناتمام ہدایت تھی۔

۳۔ اس کی تعلیم ابد تک باقی رہے گی، یعنی وہ آخری نبی ہوگا اور اس کے پاس جو ہدایت ہوگی وہ اس وقت تک محفوظ رہے گی جب تک دنیا آباد ہے۔

۴۔ وہ پیغمبر آسمانی تعلیم ہی پیش کرے گا اور مستقبل کے بارے میں واضح اشارات دے گا۔

۵۔ وہ اپنے مخاطبوں کے اندر پائے جانے والے گناہوں، حق تلفیوں اور غلطیوں کی نشان دہی کرے گا اور ان کو اس کا الزام دے گا۔

۶۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اب وہی پیغمبر مبعوث ہوگا۔ درمیانی زمانہ میں کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔

۷۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس پیغمبر کا نام بھی بتایا جس کو مترجموں نے مددگار یا سچائی کا روح کے الفاظ سے ادا کیا ہے۔ حالانکہ ناموں کا ترجمہ نہیں کیا جاتا۔ قرآن نے جہاں حضرت عیسیٰؑ کے بتائے ہوئے نام کا ذکر کیا، وہاں نام 'احمد' بتایا ہے۔

بنی اسرائیل کے انبیاء و رسل نے جس وضاحت سے نبی موعود کا ذکر کیا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی روشنی میں اپنے قبیلوں کو ہر دور میں تیار کرتے رہے کہ جونہی اس نبی کی بعثت ہو وہ اس پر ایمان لانے میں تاخیر نہ کریں اور اس کے دست و باز و بن کر اس کے فرائض کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کریں۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھے اہل کتاب ہر دور میں اس آخری نبی کی آمد کے منتظر رہے اور اپنے ہم عصروں کو بھی ذہنی طور پر تیار کرتے رہے کہ وہ بھی اس عظیم رسول کو پہچاننے اور اس پر ایمان لانے میں پیچھے نہ رہیں۔

باب 5

بنی اسماعیل کی تولیت بیت اللہ

حضرت اسماعیلؑ کی شادی ہاجرہ کے قبیلہ بنو جرہم میں ہوئی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے معتقد تھے۔ اس قبیلہ کے لوگ مکہ میں بھی آ کر آباد ہو گئے۔ حضرت ابراہیمؑ کو ملنے والی بشارت کے مطابق اسماعیلؑ کی نسل میں خوب اضافہ ہوا۔ ان کے بارہ بیٹے تھے جن سے بارہ قبیلے وجود میں آئے اور وہ بیٹے ان قبیلوں کے سردار بنے۔ حضرت اسماعیلؑ تو بیت اللہ کی خدمت کے لیے اللہ کی نذر تھے ہی، ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی یہ ذمہ داری نبھائی۔ ان کے بڑے بیٹے نابت کے پاس بیت اللہ کے انتظام کی ذمہ داری رہی۔ نابت اور دوسرے بیٹے قیدار کے بارے میں قدیم صحیفوں میں یہ شہادت موجود ہے کہ:

> قیدار کی سب بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ نابت کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے۔ وہ میرے مذبح پر مقبول ہوں گے اور میں اپنی شوکت کے گھر کو جلال بخشوں گا۔ (یسعیاہ ۶۰:۷)

ظاہر ہے کہ پرشوکت گھر سے مراد بیت اللہ ہے۔ لہٰذا قیدار اور ان کی اولاد نے بھی اس عظیم گھر کی پاسبانی میں بھرپور حصہ لیا۔ بنو جرہم کا جو تعلق بنی اسماعیل کے ساتھ تھا اس کی بدولت وہ بھی بیت اللہ کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ان کی معاونت کرنے لگے۔

بیت اللہ کا انتظام غیر بنی اسماعیل میں:

جوں جوں بنی اسماعیل کی تعداد میں اضافہ ہوا وہ مکہ سے نقل مکانی کرنے لگے۔ وہ جہاں جہاں گئے اللہ تعالیٰ نے ان کو برکت دی اور جا بجا ان کی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ میں بنو جرہم نے طاقت پکڑی اور بالآخر بیت اللہ کے مجاور بن بیٹھے۔ ان کا تسلط بے حد طویل عرصہ تک رہا۔ شروع میں تو انہوں نے بیت اللہ کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان سے کعبہ کے حقوق و فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی ہونے لگی۔ انہوں نے اس مرکز توحید کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ یہاں لوگ جو نذریں پیش کرتے ان کو یہ خود ہڑپ کرنے لگے۔ زائرین کی خدمت کا جذبہ مضمحل ہو گیا۔ ظلم و زیادتی کر کے زائرین سے مال بٹورنے کے طریقے

وضع کر لیے گئے۔ انہوں نے خانہ کعبہ کی حلت وحرمت کی حدود کو بھی ملحوظ نہ رکھا۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے مکہ کے قریب آباد دو قبائل بنوبکر اور بنوخزاعہ نے مل کر جرہم کو مکہ سے بے دخل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں پارٹیوں میں جنگ ہوئی جس میں جرہم کو شکست ہوئی اور وہ مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے بیت اللہ کے پاس واقع کنویں زمزم میں اپنا اسلحہ اور دوسرا سامان پھینک کر کنویں کو بھر دیا اور اس کا نشان مٹا دیا۔

بنوبکر اصلاً خانہ بدوش تھے اس لیے اب بیت اللہ کا انتظام عملاً بنوخزاعہ کے پاس آ گیا اور تولیت کعبہ باپ سے بیٹے کو منتقل ہونے لگی۔ طریقہ ہے کہ اصلاح کے مقصد سے انقلاب لانے والے پہلے پہل بڑے خلوص نیت اور وفا شعاری کا ثبوت دیتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ معاملات ان کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور وہ پہلوں ہی کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ چنانچہ بنوخزاعہ نے بھی وہی حرکتیں شروع کر دیں جو بنوجرہم نے کی تھیں۔ اسی قبیلہ کا ایک بدبخت آدمی عمرو بن لحی خزاعی بیت اللہ میں مظاہر شرک کو داخل کرنے کا ذریعہ بنا۔ وہ مختلف ممالک میں آتا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ شام کے سفر سے واپس آیا تو اپنے ساتھ عمالقہ کا بت ہبل بھی لایا۔ اس کو اس نے عین کعبہ کے پاس نصب کیا اور لوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت کا نقش بٹھایا۔ چنانچہ لوگ اہم امور میں اس بت سے برکت کی دعائیں مانگنے لگے۔ جب ایک مرتبہ کعبہ کے تقدس کو داغدار کر دیا گیا تو پھر مزید بتوں کا اس میں داخلہ آسان ہو گیا۔ ہوتے ہوتے اس مرکز توحید کو مرکز شرک میں تبدیل کر دیا گیا۔

بیت اللہ کے انتظام کی بازیافت:

قُصَیّ بن کلاب:

حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں ایک بڑا نام عدنان کا آتا ہے جس کی نسل کا شجرہ نسب محفوظ ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں اس نسل میں کنانہ کی اولاد نمایاں ہوئی جو مکہ میں مقیم تھے۔ کنانہ کا پڑپوتا ایک نہایت باصلاحیت سردار فہر بن مالک تھا۔ اس کی اولاد قریش کہلائی۔ فہر کی چھٹی پشت میں قصی بن کلاب نے بے حد شہرت پائی۔ اس نے کعبہ کے خزاعی متولی حلیل بن حبشیہ کی بیٹی سے شادی کی اور امور بیت اللہ میں شریک ہو گیا۔ حلیل کی وفات پر قصی نے تمام انتظام خود سنبھال لیا۔ خزاعہ نے اس کی مخالفت شروع کر دی تو قصی نے اپنے خاندان بنوکنانہ کے علاوہ دوسرے بنی اسماعیل سے مدد طلب کر لی۔ اس نے ان کو دعوت دی کہ وہ مکہ کے قریب آ کر بسیں۔ چنانچہ بہت سے قبائل مکہ میں آ گئے جس کے نتیجہ میں قریش کی قوت میں اضافہ ہو گیا۔ اس خدمت کی بنا پر قصی کو مجمع کا لقب ملا۔

بالآخر فریقین کے درمیان جنگ کی نوبت آئی جس میں کافی نقصان ہوا۔ اس نزاع کے فیصلہ کے لیے

یعمر بن عوف کو ثالث مانا گیا۔ اس نے فیصلہ دیا کہ قصی بن کلاب خزاعہ کی نسبت تولیت کعبہ کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ نیز خزاعہ اور بنو بکر نے قریش کے جو خون کیے ہیں ان کو ان کا خون بہا دینا ہوگا۔ البتہ قصی کے ہاتھوں جو خون ان کے ہوئے ہیں ان کا خون بہا نہیں دینا ہوگا۔ اس طرح وراثت ابراہیم اور عرب کی مذہبی سیادت اس قبیلہ کے ہاتھ میں آ گئی جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے تھا اور جس کا تولیت کعبہ کا حق مقدم تھا[1]۔

قصی کے ذہن رسا نے مکہ میں ایک شہری ریاست قائم کرنے کا خاکہ تیار کیا تاکہ قریش کے تمام خانوادوں میں اس ریاست کی ذمہ داریاں تقسیم کر دی جائیں اور وہ سب محسوس کریں کہ ان میں سے ہر خانوادہ کو اہمیت دی جا رہی ہے اور اس کو امور ریاست میں اپنا حصہ ادا کرنا ہے تاکہ وہ شہر کے نظم و نسق میں برابر کا شریک رہے۔ اس مقصد سے قصی نے قریش کی تمام شاخوں کے لیے الگ الگ محلے مقرر کیے اور ان کے سرداروں پر مشتمل ایک مجلس مشاورت قائم کی۔ ہر شاخ کا سردار اس مجلس کا رکن تھا۔ لیکن یہ بات ملحوظ رکھی جاتی کہ سردار چالیس برس سے کم عمر کا نہ ہو۔ اس مجلس مشاورت کی سربراہی قصی کے پاس تھی اور اس کی اہم ذمہ داری انتظام بیت اللہ، صلح و جنگ، اہم امور مملکت اور شادی بیاہ کے فیصلے کرنا تھا۔ مجلس کے اجتماعات کے لیے اس نے دارالندوہ قائم کیا جس کا دروازہ بیت اللہ کی طرف کھلتا تھا۔ قصی نے بیت اللہ کی ذمہ داریاں خود سنبھالیں۔ لہٰذا وہ مکہ کا حاکم اور تمام عربوں کا روحانی پیشوا بھی تھا۔ اس منصب کی بدولت اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ شہری ریاست کے کئی محکمے تھے۔ ان میں حجابہ (خانہ کعبہ کی دربانی و حفاظت) اور سدانہ (کلید برداری) کا تعلق خانہ کعبہ سے تھا۔ سقایہ (پانی پلانا) اور رفادہ (کھانے کا بندوبست کرنا) زائرین بیت اللہ کی خدمت کے محکمے تھے۔ اللواء (پرچم)، قیادہ (جنگ میں قیادت) اور قبہ (چھاؤنی کا انتظام) کا تعلق حالت جنگ سے تھا۔ مختلف خانوادوں میں تقسیم کار سے شہر کا نظم و نسق بہتر ہو گیا، مختلف خاندانوں کی اہمیت بڑھ گئی اور ان کے درمیان وحدت پیدا ہو گئی۔ قصی نے باہر سے آنے والے تاجروں سے عشر لینا شروع کیا جو مکہ کی ثروت کا ایک اہم ذریعہ بن گیا۔ حج و عمرہ کے انتظام میں بھی اس نے کئی اصلاحات کیں۔ حجاج کی بہبود کے لیے اس نے قریش کو یہ شعور دیا کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے گھر کے خادم اور حجاج کو اللہ کے مہمان سمجھیں۔ اس نے پانی کی فراہمی کا نظام بہتر کیا اور قریش کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ چندہ جمع کر کے ایام حج میں حاجیوں کی ضیافت کیا کریں۔

قصی نے مرتے وقت انتظام ریاست اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کے حوالہ کر دیا حالانکہ اس کے چار بیٹوں میں سے دوسرا بیٹا عبد مناف سب سے زیادہ باصلاحیت تھا اور والد کی زندگی ہی میں دوسروں پر فوقیت پا گیا تھا۔ لوگوں کے اندر اس کے لیے بڑا احترام پایا جاتا تھا۔ باپ کے فیصلہ کے مطابق بھائیوں نے عبدالدار کی سیادت تسلیم

کرلی لیکن ان کی اولادیں اس پر مطمئن نہ تھیں۔ عبدالدار کے مرنے پر عبد مناف کے بیٹوں نے دادا کے فیصلہ کے خلاف آواز بلند کی اور محکموں کی منصفانہ تقسیم کا مطالبہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں جو بحث چلی تو قریش دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ بنو اسد، بنو زہرہ، بنو تیم اور بنو حارث عبد مناف کے بیٹوں کے مطالبہ کے حق میں تھے۔ انہوں نے ایک ساتھ رہنے کی قسم کھائی اور مطیبین کہلائے۔ عبدالدار کی اولاد کا ساتھ بنو سہم، بنو عدی، بنو مخزوم اور بنو جمح نے دیا۔ یہ احلاف کہلائے۔ قریب تھا کہ دونوں گروہوں میں جنگ برپا ہو جائے کہ بعض لوگوں نے درمیان میں پڑ کر اس بات پر سمجھوتہ کرا دیا کہ بنو عبدالدار کے پاس ندوہ، حجابہ اور لواء کے محکمے رہیں جب کہ بنو عبد مناف کو سقایہ اور رفادہ کا انتظام دے دیا جائے۔ اگر چہ معاملہ صلح صفائی سے طے ہو گیا لیکن مذکورہ خاندانوں کا میلان بعد میں بھی ایک دوسرے کی طرف مطیبین اور احلاف کی تقسیم کے مطابق رہا۔

ھاشم بن عبد مناف:

عبد مناف کے بعد قبیلہ کی سیادت عبد شمس کو ملی لیکن وہ زیادہ تر سفر میں رہتا اور مالی لحاظ سے بھی کمزور تھا۔ لہٰذا عملاً اس کی ذمہ داریاں عبد مناف کے دوسرے بیٹے ہاشم نے ادا کیں۔ وہ بے حد فیاض اور کریم النفس آدمی تھا۔ ایک مرتبہ مکہ میں قحط پڑا تو وہ فلسطین سے آٹا خرید کر لایا اور روٹیاں شوربے میں ڈال کر ثرید سے اہل مکہ کی ضیافت کی۔ ہاشم نے حجاج کی خدمت بڑھ چڑھ کر کی۔ پانی کی فراہمی کا انتظام بہتر بنایا۔ وہ زائرین بیت اللہ کو کھلانے پلانے کا بندوبست اپنی جیب سے کر دیا کرتا۔ ہاشم ایک کامیاب تاجر تھا۔ اس نے اور اس کے بھائیوں نے تعلقات اور اثر و رسوخ کو بروئے کار لا کر شام، فلسطین، عراق، حبشہ اور یمن کی حکومتوں، نیز قبائل عرب سے قریش کے تجارتی قافلوں کے لیے پر امن سفر کے اجازت نامے حاصل کیے۔ مطلب بن عبد مناف نے نجاشی سے اجازت نامہ حاصل کیا، نوفل بن عبد مناف نے شاہ ایران کسریٰ سے سہولتیں حاصل کیں۔ خود ہاشم نے شاہ روم قیصر سے قریش کے تجارتی سفروں کے لیے امن و حفاظت کے پروانے لیے[2]۔ ان بھائیوں کی تگ و دو کے نتیجہ میں قریش کو ایک ایسی سہولت ملی جو دوسرے قبائل عرب کو حاصل نہ تھی۔ دوسرے قبائل کو غیر قبائل کے علاقہ میں سے گزرنا ہوتا تو وہ پہلے ایک ٹیکس ادا کرتے۔ اس کے برعکس قریش کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ کچھ خرچ کیے بغیر قبائل عرب یا مذکورہ حکومتوں کے علاقوں میں سے گزر جائیں۔ ان کا پیشہ چونکہ تجارت تھا لہٰذا محفوظ سفر کی سہولت میسر آنے کے بعد ان کا ہر فرد اپنی استطاعت کے مطابق مال تجارت خود یا اپنے اہل کاروں کے ذریعے منڈیوں میں بھیج سکتا تھا۔ جن لوگوں کے پاس اپنا سرمایہ نہ ہوتا وہ دوسروں کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے اور اہل مکہ، حتیٰ کہ ان کی خواتین بھی، مکہ میں رہتے ہوئے تجارت کرتے اور منافع کماتے۔ قریش کا معمول تھا کہ وہ موسم سرما میں یمن و حبشہ اور موسم گرما میں فلسطین اور

شام کا قصد کرتے۔ لوگ ان کو بیت اللہ کے خادم، اس کے متولی اور حجاج کے ہمدرد سمجھ کر ان سے کوئی تعرض نہ کرتے۔ یہ سفر اہل مکہ کی خوشحالی اور دولت و ثروت کا اہم ذریعہ تھے۔ قرآن نے قریش کے لیے اس غیر معمولی سہولت کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ. اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ. فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ. (قریش۔۱۰۶:۱۔۴)

قریش کو اپنی وابستگی کے سبب سے، یعنی اس وابستگی کے سبب سے جو ان کو موسم سرما اور موسم گرما کے سفر سے ہے، چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک میں کھلایا اور خوف میں امن بخشا۔

یعنی قریش کو چونکہ یہ سہولت بیت اللہ کی تولیت کے باعث حاصل ہوئی ہے تو اس کا حق یوں ادا ہو سکتا ہے کہ وہ اس گھر کے رب ہی کی عبادت کریں اور شرک سے اجتناب کریں۔

عبدالمُطّلب بن ہاشم:

ہاشم نے یثرب کے قبیلہ بنونجار میں ایک باحیثیت خاتون سے شادی کی جس نے یہ شرط لگائی کہ وہ اپنے معاملات کی نگرانی کے لیے یثرب ہی میں رہے گی۔ اس خاتون کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شیبہ رکھا گیا۔ معاہدہ کے مطابق یہ بچہ ہاشم کو اس کی ماں کے پاس چھوڑنا پڑا۔ جب ہاشم کا انتقال ہوا تو اس کے بھائی مطّلِب نے یثرب جا کر اس کی بیوہ سے یہ مطالبہ کیا کہ بچے کی پرورش کرنے کے لیے اس کو مکہ میں بھیجے تا کہ وہ خاندان کی روایات کے مطابق تربیت پا سکے۔ ماں نے بڑی مشکل سے یہ مطالبہ تسلیم کیا اور بچے کو اس کے چچا کے حوالے کر دیا۔ مطّلِب مکہ پہنچا تو لوگوں نے بچے کو اس کا زرخرید غلام سمجھا اور اس کو عبدالمطلب کہہ کر پکارا۔ حقیقت کی وضاحت ہو جانے کے باوجود یہی نام شہرت پا گیا اور اصل نام شیبہ نظر انداز ہو گیا۔ ہاشم کے بعد مطلب بن عبد مناف کے پاس سقایہ اور رفادہ کے محکمے تھے۔ یمن کی طرف ایک تجارتی سفر میں اس کا انتقال ہو گیا تو بنو ہاشم کی سرداری کا منصب اور رفادہ اور سقایہ کی ذمہ داریاں عبدالمطلب کو ملیں[3]۔

عبدالمطلب کے دور کا اہم واقعہ چاہ زمزم کی بازیافت ہے جس کو بنوجرہم بیت اللہ کے معاملات سے بے دخلی کے بعد بند کر کے بے نشان کر گئے تھے۔ یہ کنواں اگرچہ بیت اللہ کے بالکل ساتھ تھا لیکن امتداد زمانہ کے باعث لوگ اس کا محل وقوع بھول گئے تھے۔ روایات کے مطابق عبدالمطلب نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک خاص مقام پر کنویں کی کھدائی کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس خواب کو اشارہ غیبی سمجھ کر قریش سے اس کا تذکرہ کیا اور کھدائی میں ان سے مدد طلب کی۔ قریش نے اس کو کار عبث سمجھا اور ان سے تعاون نہ کیا۔ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے حارث کو ساتھ لے کر خود کھدائی شروع کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد بنو جرہم کی دفن کی ہوئی تلواریں برآمد ہو گئیں۔ اب

قریش متمنی ہوئے کہ وہ بھی اس کار خیر میں شریک ہو جائیں لیکن عبدالمطلب نے اس مرحلہ میں ان کی حصہ داری تسلیم نہ کی اور خود ہی کنواں کھودا۔ مدتہائے دراز کے بعد پھر سے حجاج کو اس مبارک کنویں کا پانی پینا نصیب ہوا۔

کتب سیرت کی روایات کے مطابق عبدالمطلب کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ چاہ زمزم کی کھدائی میں قریش کے دوسرے خانوادوں نے ان کی مدد نہیں کی۔ انہوں نے نذر مانی کہ میرا رب اگر دس بیٹے مجھے عطا کر دے تو میں ایک بیٹے کی قربانی اس کی راہ میں کر دوں گا۔ یہ نذر قبول ہوئی اور ان کے دس بیٹے پیدا ہوئے۔ جب یہ جوان ہوئے تو باپ نے سب کو جمع کر کے اپنی نذر سے آگاہ کیا اور وہ اس پر عمل کرنے پر تیار ہو گئے۔ عبدالمطلب نے خانہ کعبہ کے پاس بیٹوں کے نام کا قرعہ ڈالا جو چھوٹے بیٹے عبداللہ پر نکلا۔ عبدالمطلب عبداللہ کو ساتھ لے کر قربان گاہ کو چلے تو قریش مزاحم ہوئے کہ بیٹے کی قربانی سے عرب میں ایک غلط رسم چل پڑے گی جس کو روکنا کسی کے لیے ممکن نہ ہو گا۔ انہوں نے عبدالمطلب سے مطالبہ کیا کہ وہ یثرب کی مشہور کاہنہ سے مشورہ کر کے بیٹے کا فدیہ دے دیں۔ قریش کے کچھ لوگ یثرب گئے تو کاہنہ نے یہ تجویز دی کہ خانہ کعبہ کے پاس دس اونٹ اور عبداللہ کے مابین قرعہ ڈالا جائے۔ اگر قرعہ عبداللہ پر نکلے تو پھر بیس اونٹوں پر قرعہ ڈالا جائے۔ دس دس اونٹ کا اضافہ اس وقت تک کیا جائے جب تک اونٹوں پر قرعہ نہیں نکلتا۔ جب یہ عمل کیا گیا تو عبداللہ کا فدیہ سو اونٹ ٹھہرا۔ یہ جانور ذبح کیے گئے اور ان کا گوشت مکہ کی آبادی میں تقسیم کر دیا گیا۔

عبدالمطلب ہی کی سرداری کے زمانہ میں یمن کے ایک متعصب عیسائی حکمران ابرہہ نے خانہ کعبہ کو ڈھانے کے ناپاک ارادہ سے ایک لشکر جرار کے ساتھ حجاز میں پیش قدمی کی۔ حملہ آور لشکر کے ساتھ ہاتھی بھی تھے۔ عربوں کو ایسے لشکر کے ساتھ جنگ کا تجربہ نہ تھا۔ چنانچہ قریش اور دوسرے عربوں نے بہترین جنگی پالیسی کے طور پر پہاڑوں میں محفوظ ہو کر گوریلا جنگ کا طریقہ اپنایا تاکہ ابرہہ کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکیں۔ ابرہہ نے حملہ کی جو اسکیم بنائی تھی اس میں حملہ کے نام نہاد سبب اور وقت کا خاص طور پر انتخاب کیا گیا۔ سبب تو یہ بتایا گیا کہ کسی عرب نے یمن میں نو تعمیر شدہ گرجا کو توہین کے ارادہ سے ناپاک کر دیا ہے لہٰذا اس کا بدلہ عربوں کے مقدس معبد خانہ کعبہ کو ڈھا کر لینا ہے۔ وقت کا انتخاب اس نے یوں کیا کہ جنگی کارروائی کے لیے محترم مہینوں کو چنا۔ اس کا خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ اور خونریزی کو جائز نہیں سمجھتے اس لیے ان کی طرف سے مدافعت نہیں ہو گی۔ اس نے حملہ بھی ان دنوں میں کرنا چاہا جب پورے ملک سے آئے ہوئے حجاج یا تو قربانی میں مصروف ہوتے ہیں یا تھکے ماندے گھروں کو لوٹ رہے ہوتے ہیں۔ نیز ان دنوں میں مکہ عملاً خالی ہوتا ہے کیونکہ وہاں کے باشندے بھی بیشتر حج کی مصروفیتوں میں گھروں سے باہر ہوتے ہیں۔ عبدالمطلب کو حملہ کی خبر ملی تو انہوں نے اس موقع پر خانہ کعبہ میں یہ دعا کی کہ:

اے خدا، آدمی اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے لوگوں کی حفاظت فرما۔ دشمن کی صلیب اور اس کی قوت تیری قوت پر ہرگز غالب نہ ہونے پائے۔ اگر تو ہمارے قبلہ کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑنا چاہتا ہے تو پھر کر جو تیری مرضی ہے۔[43]

ابرہہ کی چال اور پورے منصوبہ کو اللہ تعالیٰ نے خاک میں ملا دیا۔ یمن سے مکہ کو سفر کرتے ہوئے اس کو عرب قبائل کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مکہ کے قریب پہنچا تو اہل مکہ اور غیر مسلح حاجیوں نے منیٰ کے پتھروں سے اسلحہ کا کام لیا اور لشکر پر بار بار سنگ باری کر کے اس کے قدم مکہ کی طرف بڑھنے سے روک دیے۔ اس دوران میں قریش نے گوریلا جنگ کا طریقہ اپنایا۔ قریش اور حجاج دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرتے ہوئے برابر اپنے رب سے دعا بھی کرتے رہے کہ وہ دشمن کو پامال کرے۔ چنانچہ منیٰ سے متصل وادی محسر میں ابرہہ کی فوج پر سنگ باری کرنے والی ہوا چلی جس نے محسر کو دشمن کے لیے موت کی وادی بنا دیا۔ جھنڈ کے جھنڈ گوشت خور پرندے ان کا گوشت نوچنے کے لیے وادی میں آ گئے اور منیٰ کو لاشوں کے تعفن سے پاک کر دیا۔ اس کے بعد وادی میں سیلاب آیا جو مرنے والوں کے انجر پنجر بہا کر لے گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تائید سے قریش کی کمزور مدافعت اتنی موثر بنا دی کہ اصحاب فیل کھانے کے بھس کی طرح پامال ہو گئے۔ عربوں کی تاریخ میں یہ واقعہ اتنی اہمیت کا حامل تھا کہ انہوں نے اس سے اپنے کیلنڈر کا آغاز کیا اور یہ سال عام الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہلایا۔

بنوخزاعہ جب سے خانہ کعبہ کے امور سے بے تعلق ہوئے تھے ان کو اپنی محرومی کا بے حد قلق تھا۔ عبدالمطلب نے اپنی سربراہی کے دور میں بنوخزاعہ کے عمرو بن ربیعہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ باہم مدد و اعانت اور ایک دوسرے کے دست و بازو بنے رہنے کا معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ ان کی اولادوں پر بھی لاگو تھا۔ اس معاہدہ میں بنومطلب بھی شامل ہو گئے لیکن عبدشمس کی اولاد بنوامیہ نیز نوفل کی اولاد اس معاہدہ سے باہر رہی۔ عبدالمطلب نے اپنے جانشین و وصی زبیر بن عبدالمطلب کو اور انہوں نے ابوطالب کو اس معاہدہ کی پاسداری کی وصیت کی۔ اسی معاہدہ کے مطابق بنوخزاعہ اولاد عبدالمطلب کی بعد میں بھی حمایت کرتے رہے۔ اس طرح مکہ کے جوار میں بسنے والا قبیلہ خزاعہ ایک بار پھر قریش کے قریب آ کر امور بیت اللہ میں دلچسپی لینے لگا۔

اولاد عبدالمطلب:

عبدالمطلب کے بیٹوں میں سے حارث، زبیر، ابوطالب، ابولہب، عباس، حمزہ اور عبداللہ کو شہرت ملی۔ ان میں سے حارث کا انتقال والد کی زندگی میں ہو گیا۔ عبدالمطلب کی دوسری بیوی فاطمہ بنت عمرو بن عائذ سے ان کے تین بیٹے تھے۔ زبیر، ابوطالب اور عبداللہ۔ انہوں نے مرض الموت میں دستور کے مطابق سب سے بڑے بیٹے زبیر کو اپنی تمام ذمہ داریاں حوالہ کیں۔ چنانچہ وہ سربراہ خاندان مقرر ہوئے اور اس حیثیت میں انہوں نے اپنی نیکی اور

رحم دلی کا سکہ بٹھایا۔ زبیر اپنے والد کے وصی تھے۔[۵] وہ بنو ہاشم کی سربراہی پر تقریباً تیرہ چودہ برس فائز رہے۔ ان کی وفات پر یہ منصب ابوطالب کے حصہ میں آیا۔ ابوطالب غریب آدمی تھے۔ وہ اپنے بھائی عباس کے مقروض ہو گئے۔ قرض ادا نہ ہوسکا تو وہ سقایہ کے منصب سے ان کے حق میں دستبردار ہو گئے۔

عبداللہ کا انتقال عین جوانی میں باپ کے سامنے ہوا۔ ان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس پیغمبر اعظم کے والد ہوں جن کی بعثت کے لیے ابراہیم خلیل اللہؑ اور اسماعیل ذبیح اللہؑ نے دعا کی تھی، بنی اسرائیل کے انبیاء جن کے حق میں پیشینگوئیاں کرتے اور اپنی قوم سے ان پر ایمان لانے کا عہد لیتے رہے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد جن کی آمد کی خوشخبری دی اور ان کے لیے راہ ہموار کی۔ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ۔

گزشتہ زمانہ میں انبیاء علیہم السلام نے اپنے بعد آنے والے نبی کی جو بڑی نشانیاں بتائیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ اس کی بعثت بنی اسماعیل میں ہوگی جو بیت اللہ کی پاسبانی کرنے والے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ ٹھیک بنی اسماعیل کی شاخ قریش میں اور قریش کی بھی اس شاخ میں پیدا ہوئے جس کے پاس تولیت کعبہ کا منصب تھا۔ دوسری نشانی یہ تھی کہ حضرت عیسیٰؑ اور اس عظیم رسول کے درمیان کسی رسول کی بعثت نہیں ہوگی تو فی الواقع اس مدت میں کوئی رسول نہیں آیا۔ خود بنی اسرائیل، یہود اور نصاریٰ سب منتظر رہے کہ اس موعود رسول کی بعثت کب ہو کہ ہم اس پر ایمان لائیں۔ تیسری نشانی یہ تھی کہ وہ رسول رہتی دنیا کے لیے ہوگا اور اس کے بعد کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوگا۔ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد سے اب تک دعویٰ تو کئی لوگوں نے کیا کہ وہ نبی ہیں لیکن نہ وہ اپنے دعویٰ کو سچ ثابت کر سکے، نہ ان کے پاس اس طرح کی وحی کی تعلیم تھی جو نبیوں کے پاس ہوا کرتی تھی، اور نہ ان کے دعویٰ کو دنیا نے قبول کیا۔ ان کے علاوہ دوسری نشانیاں آنحضرت ﷺ پر کس طرح صادق آئیں اس کا بیان آئندہ صفحات میں آنحضرتؐ کے احوال میں آئے گا۔

حوالہ جات

۱۔ الطبقات الکبریٰ، محمد ابن سعد، ج ۱، دار الفکر بیروت، ص ۴۴

۲۔ ایضاً، ص ۵۱

۳۔ ایضاً، ص ۵۴

۴۔ ایضاً، ص ۶۰

۵۔ ایضاً، ص ۶۱

باب 6

بنی اسماعیل کو یہود پر ترجیح دینے کے اسباب

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اصل وراثت توحید خالص، حنیفیت (یعنی شرک سے نفرت اور توحید کے لیے یکسوئی)، نماز اور زکوٰۃ کے انتظام، بیت اللہ کی خدمت، حج اور اس کے مناسک کی تعلیم اور زائرین کو رہنمائی فراہم کرنے پر مشتمل تھی۔ چونکہ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو بیت اللہ کی نذر کر دیا تھا اس لیے اس گھر کی کامل وراثت کے حامل وہی تھے۔ ان کی اولاد بھی خانہ کعبہ کی تعمیر کے مقاصد کی نگہبانی پر مامور رہی۔ چنانچہ حج و عمرہ کا انتظام، زائرین کی میزبانی اور ان کو قیام مکہ کے دوران تمام ممکن سہولتیں مہیا کرنا، بیت اللہ کی قربان گاہ پر جانوروں کی قربانیاں کرنا ان کا دل پسند فریضہ رہا۔ چھوٹے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کی اولاد کا حج و عمرہ کے لیے مکہ آنا جانا تو ثابت ہے لیکن وہ بیت اللہ اور اس کے زائرین سے متعلق ذمہ داریوں سے ہمیشہ آزاد رہے۔ ان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ ان میں پے در پے نبی مبعوث ہوئے۔ ان کے لیے آسمانی ہدایت تورات، زبور اور انجیل کی شکل میں نازل ہوئی۔ شریعت کے احکام مرتب شکل میں ان کے پاس موجود تھے۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اولاد اسحاق اللہ تعالیٰ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کی ذمہ دار ٹھہرائی گئی۔

اولاد ابراہیم کی یہ دونوں شاخیں متمنی ہو سکتی تھیں، اور فی الواقع تھیں، کہ دعائے ابراہیمؑ ان کے حق میں پوری ہو اور موعود پیغمبر ان کے اندر پیدا ہوں، لیکن بنی اسماعیل کے اندر بعض ایسی خوبیاں تھیں جن سے بنی اسحاق محروم تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو اولاد اسحاق پر مقدم کیا اور دنیا کی امامت کے لیے ان کو چن لیا۔ اس انتخاب میں اولاد اسحاق پر بنی اسماعیل کو ترجیح دینے میں بعض پہلو جو کار فرما ہے ان کی طرف ہم یہاں توجہ دلائیں گے۔

بنی اسرائیل کی کارکردگی:

اولاد اسحٰق کو، جو بنی اسرائیل کے نام سے زیادہ معروف ہے، خدمت دین کے لیے منتخب کیا گیا تو اس انتخاب کو انہوں نے نبیوں کی اولاد ہونے اور اپنے اعلیٰ خاندانی نسب کا ثمرہ قرار دیا۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے

کہ وہ اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ اور چہیتا گروہ ہیں۔ وہ برملا اپنے آپ کو اللہ کی اولاد قرار دیتے اور کہتے کہ ہماری تخلیق روئے زمین کے دوسرے لوگوں سے ہٹ کر ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ دوسری کسی قوم کو اپنا ہم پلہ سمجھتے اور نہ اس کو خاطر میں لاتے۔ ان کے پاس آسمانی ہدایت موجود تھی لیکن اس پر وہ مارِ گنج بن کر بیٹھ گئے۔ وہ اس کی تعلیم کو عام کرتے اور نہ اصل کتاب لوگوں کے سامنے لاتے۔ جو کچھ جی میں آتا اس کو کتاب اللہ کا حصہ بتا کر خدا کی طرف منسوب کر دیتے۔ انہوں نے آسمانی کتابوں کی حفاظت نہ کی۔ جب وہ گم ہو گئیں تو یادداشت کی مدد سے ان کو دوبارہ مرتب کیا۔ اس طرح ان کی ہیئت بدل گئی۔ اس کے باوجود ان میں تحریف کی عادت سے چھٹکارا نہ پا سکے اور اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی سپرد کی ہوئی امانت میں خیانت کے مرتکب ہوئے۔ بنی اسماعیل کے ساتھ ان کا سلوک اس قدر تحقیر آمیز تھا کہ ان کے ساتھ ہر قسم کا ظلم و زیادتی کا رویہ اپنے لیے مباح سمجھتے۔ قرآن نے ان کے اسی رویہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ (آل عمران۔۳:۷۵)

اور اہل کتاب میں سے ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر ان کی امانت میں تم ایک خزانہ بھی دے دو تو وہ اس کو لوٹا دیں گے اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ تم ان کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک اس کو لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان امیوں کے معاملہ میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے۔

چنانچہ بنی اسرائیل نے وہ تمام آثار اپنے صحیفوں سے مٹانے کی کوشش کی جن سے بنی اسماعیل کا کوئی شرف ثابت ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے دینی لٹریچر سے حضرت ابراہیمؑ کی اصل وراثت ہی کے تذکرہ کو خارج کر دیا۔ بیت اللہ سے مراد بیت المقدس کو لے لیا۔ مکہ کے ابتدائی نام بکہ کو انہوں نے بکاء سے تبدیل کر دیا اور اس کو کسی وادی سے منسوب کر دیا۔ مروہ کو، جو اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا مقام تھا، تحریف کر کے موریاہ بنا دیا اور دعویٰ کیا کہ یہ مقام یروشلم میں ہے اور وہاں حضرت اسحٰقؑ قربانی کے لیے پیش ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل نے دین ابراہیمی کی دونوں بنیادیں، نماز اور زکوٰۃ، ڈھا دیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (مریم۔۱۹:۵۹)

سو پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کی پیروی کرنے لگے۔

یہی وجہ ہے کہ قدیم صحیفے نماز کے حکم سے خالی ہیں۔ زکوٰۃ اور عشر کا تذکرہ اگرچہ موجود ہے لیکن فقراء و مساکین کے بجائے کاہنوں کو ان کا مستحق بتایا گیا ہے۔ اور تو اور بنی اسرائیل نے اپنی زبان عبرانی کی بھی حفاظت نہ کی جو تورات

اور دوسرے قدیم صحیفوں کی اصل زبان تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اپنے لوگ جو یہود کہلائے اصل کتابوں سے بے بہرہ رہتے۔

بنی اسرائیل نے دین کی بنیادی تعلیمات میں ایسے رخنے ڈالے کہ توحید اور آخرت کے بارے میں حقیقی تصور ہی مفقود ہو گیا۔ نبیوں کو اللہ کا بیٹا مان لیا گیا، آخرت کے ذکر سے صحیفوں کو خالی کر دیا گیا۔ اگر کسی حد تک آخرت کا وجود تسلیم کیا گیا تو اس سے اپنی سرخروئی اور فائز المرامی کی موہوم امیدیں باندھ لی گئیں۔ تاریخ نے بنی اسرائیل کو بالخصوص اور یہود کو بالعموم ایک ظالم، سازشی، بے وفا، مفاد پرست گروہ کے طور پر جانا۔ ان کے ظلم اور کنجوسی کی داستانیں ضرب المثل رہی ہیں۔ اس کارکردگی کے باوجود وہ اپنا حق سمجھتے تھے کہ موعود رسول انہی کے اندر مبعوث ہوں۔ اس کا اعلان وہ عربوں کے سامنے برملا کرتے رہتے اور اس حوالہ سے انہوں نے عربوں کو مرعوب بھی کر رکھا تھا۔

بنی اسماعیل کی کارکردگی:

ذریت ابراہیم کی دوسری شاخ میں حضرت اسماعیلؑ کے بعد کوئی رسول نہیں آیا۔ ان کے پاس ہدایت ربانی بھی غیر تحریر شدہ تھی۔ ان کو بیت اللہ کی تولیت حاصل تھی جس کے ساتھ نماز، زکوۃ، قربانی، طواف، اعتکاف، حج اور عمرہ کی عبادات وابستہ تھیں۔ بنی اسماعیل کو اپنی کثرت تعداد کے باعث اگرچہ پورے ملک عرب میں پھیل جانا پڑا اور جگہ جگہ ان کو اقتدار حاصل ہوا تاہم انہوں نے اپنا تعلق اپنے دینی مرکز سے نہیں توڑا۔ چنانچہ جب جب بیت اللہ کے منتظمین کی طرف سے اُس مرکز کے احترام میں کمی ہوئی یا زائرین کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا تو بنی اسماعیل نے آگے بڑھ کر ان کا راستہ روکا اور انتظام کو بہتر کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ مدتہائے دراز گزر جانے کے باوجود بیت اللہ کی عبادات کا نظام بھی برقرار رہا اور اس سے بنی اسماعیل کی دلچسپی بھی قائم رہی۔

جہاں تک توحید کے تصور کا تعلق ہے بنی اسماعیل میں ہمیشہ ایک گروہ خالص توحید کو ماننے والا رہا۔ انہوں نے اسی دین کو اپنائے رکھا جس کی روایت اچھے لوگوں میں چلی آ رہی تھی۔ بنی اسماعیل اپنے بارے میں کسی غرور میں بھی مبتلا نہیں ہوئے بلکہ وہ اپنے مقابل میں بنی اسرائیل کے اس شرف کے معترف رہے کہ ان کے ہاں نبوت کا سلسلہ جاری رہا اور آسمانی کتابیں نازل ہوتی رہیں۔ وہ ان کو اہل کتاب کہتے اور احترام کا مستحق سمجھتے اور اپنے آپ کو بے پڑھے لکھے اور دین سے نا آشنا امی قوم سمجھتے۔ گویا وہ اپنی کثرت تعداد، ریاستوں کی حکمرانی اور دنیاوی وجاہت کو زیادہ اہمیت نہ دیتے بلکہ اصل سرفرازی نبوت و رسالت ہی میں سمجھتے رہے۔ ان کے اندر ابراہیمی دعا کی

بدولت ایک رسول کی بعثت کا موہوم تصور باقی رہا، اس لیے وہ یہود کے مقابل میں اپنی حق پسندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کرتے کہ اگر کوئی آسمانی کتاب ہمیں دی گئی تو ہم اس کا حق ادا کرنے میں تمہاری طرح بودے ثابت نہیں ہوں گے۔ بلکہ اس کو دل و جان سے قبول کر کے اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں میں شامل ہوں گے۔ اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَ هُمْ نَذِيْر" لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ .

(فاطر۔۳۵:۴۲)

انہوں نے اللہ کی پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نذیر آیا تو وہ ہر امت سے زیادہ ہدایت اختیار کرنے والے بنیں گے۔

وَ اِنْ كَانُوا لَيَقُوْلُوْنَ. لَو اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ . لَكُنَّا عِبَادَاللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ.

(صافات۔۳۷:۱۶۷۔۱۶۹)

اور یہ لوگ کہتے رہے ہیں کہ اگر ہمارے پاس اگلوں سے کوئی یاددہانی آئی تو ہم خدا کے مخصوص بندوں میں ہوں گے۔

بنی اسماعیل کے اندر کریمانہ اخلاق و کردار کی قدر دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ لوگ نہایت فیاض اور مہمان نواز تھے۔ ایثار و قربانی کا جذبہ ان کی سرشت میں داخل تھا۔ ان میں شجاعت و شہامت کا وصف بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ بڑے مقاصد کے لیے نہایت دلیری سے لڑتے۔ اس معاملہ میں ان کے درمیان مسابقت پائی جاتی اور وہ اپنے لوگوں کی شجاعت کے واقعات دوسروں کو سنا سنا کر ان پر فخر کرتے۔ یہ واقعات شاعروں کی شاعری کا موضوع بن کر زبان زدعوام ہو جاتے۔ بنی اسماعیل دوسروں کا حق پہچاننے والے اور رشتوں کا احترام کرنے والے تھے۔ معاملات میں ان کا رویہ اچھی فطرت پر مبنی اور تصنع سے پاک ہوتا۔ جھوٹ بولنے سے اجتناب اور سچ کی قدر، ایفائے عہد اور غریبوں کے لیے رحمت و شفقت کا جذبہ بھی عربوں کے کردار کا حصہ تھا۔ جو بات ان کے ذہن میں آجاتی اس کو قبول کرنے میں کسی مصلحت کو آڑے نہ آنے دیتے۔ ان کی زبان بھی تصنعات سے پاک تھی اور وہ اس کی حفاظت وصحت کا خاص طور پر اہتمام کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان الفاظ کے سوا جن کا تعلق غیر اقوام کی تہذیب و تمدن سے تھا عربی زبان ملاوٹ سے پاک رہی۔

بنی اسماعیل کی زندگی قبائلی طرز کی تھی۔ بحیثیت مجموعی ہر قبیلہ اپنے تمام افراد کی سلامتی اور بہبود کا ضامن

ہوتا۔ افراد قبیلہ نیز حلیفوں کے معاملات کو پرایا جھگڑا سمجھ کر ان سے پہلو تہی کرنے کی روش مذموم سمجھی جاتی۔ اپنے کسی آدمی کو دشمن کے حوالہ کرنا دناءت کی بات ہوتی۔ کسی فرد قبیلہ سے کوئی بڑا جرم سرزد ہوتا تو سارا قبیلہ اس کی جانب سے تاوان ادا کرتا۔ حلیفوں کے دفاع کے لیے بھی وہ اپنوں ہی کی طرح متحرک وسرگرم ہوتے۔ قبیلہ کا کوئی فرد، اگر کسی غیر شخص کو اپنی پناہ میں لے لیتا تو اس شخص کی حفاظت اپنے حقیقی اہل وعیال کی طرح کی جاتی۔ اس پناہ کے لیے جوار کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

بنی اسرائیل پر بنی اسماعیل کی فوقیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ بنی اسماعیل تاریخ میں کبھی غلام نہیں رہے جبکہ بنی اسرائیل کو غلامی کا داغ کئی بار لگا۔ فرعونوں کے عہد میں مصر میں اسرائیلیوں کو غلام بنا لیا گیا۔ بعد میں انہوں نے آزادی کے دن دیکھے لیکن پھر نبوخذ نصر نے قوم کی قوم کو غلام بنا لیا اور یہ عرصہ ستر برس تک طویل ہو گیا۔ بالآخر فارس کے حکمران خورس نے ان کو اس عذاب سے نجات دلائی۔ ظاہر ہے کہ ایک آزاد قوم کی نفسیات ایک غلام قوم کی نفسیات سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔

بنی اسماعیل کی مذہبی واخلاقی حالت:

مذکورہ بالا خوبیوں کے حامل ہوتے ہوئے بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنی اسماعیل کے اندر بہت سی عقائدی وعملی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں جنھوں نے ان کی خوبیوں کو گہنا دیا تھا۔ البتہ ان میں بے اعتدالیاں ایک خاص حد سے بڑھنے نہیں پائیں۔ ان خرابیوں کی نوعیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

تصورِ توحید:

قرآن مجید نے اس بات کو اچھی طرح واضح کیا ہے کہ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کو نہ صرف یہ کہ مانتے تھے بلکہ اس کی اعلیٰ صفات کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ وہ اس کو ہر چیز کا مالک وخالق، روزی رساں، مختارِ کل، زندگی اور موت کا منبع اور پوری کائنات کا مدبر ومنتظم مانتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ. فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ.

(یونس۔۱۰:۳۱)

ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ یا کون ہے جو سمع اور بصر پر اختیار رکھتا ہے؟ اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون ہے جو ساری کائنات کا انتظام کرتا ہے؟ تو

جواب دیں گے اللہ۔ تو ان سے کہو کہ کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں؟

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ. قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ. سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ. قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ. قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ. قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ.

(المومنون۔۲۳:۸۴۔۸۹)

ان سے پوچھو، یہ زمین اور جو اس میں ہیں کس کے ہیں اگر تم جانتے ہو۔ کہیں گے اللہ کے۔ کہو کہ کیا تم اس سے یاد دہانی نہیں حاصل کرتے؟ پوچھو ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا خداوند کون ہے؟ کہیں گے اللہ۔ کہو تو کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں؟ پوچھو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے لیکن اس کے مقابل میں پناہ نہیں دی جاسکتی، اگر تم جانتے ہو۔ وہ کہیں گے، یہ باتیں اللہ ہی کے اختیار کی ہیں۔ کہو پھر تمہاری مت کہاں ماری جاتی ہے؟

ان آیات میں اہل عرب کو توجہ دلائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جن صفات کو مانتے ہیں، ان کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے اور عملاً وہ کام کر دیتے ہیں جن سے ان کے ظاہری عقیدہ کی نفی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا انہیں اس تناقض کو دور کرنا چاہیے اور اپنے عقیدہ اور عمل میں ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیے۔

عربوں کا یہ شرک نہایت سادہ قسم کا تھا۔ دیکھا گیا ہے کہ وہ قومیں جن کی زندگی کے ہزاروں سال شرک کو پختہ سے پختہ تر کرنے میں گزرے ہیں، بالآخر ایک دیومالا تخلیق کر لیتی ہیں جس میں دیوی دیوتاؤں کی رشتہ داریاں، ان کی صلح و جنگ کے معاملات، ان کی محبتیں اور نفرتیں اور تدبیر امور میں ہر ایک کا مرتبہ و مقام متعین کر دیا جاتا ہے۔ اس بات کا مشاہدہ یونانیوں اور ہندوؤں کے شرک میں بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ان کی دیومالا اتنی پیچیدہ ہے کہ جو ذہن اس میں ایک مرتبہ الجھ جاتا ہے تو اس کو اس الجھاؤ سے نجات دلانا آسان نہیں ہوتا۔ عربوں کے تصور کے مطابق اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اور اختیار اسی نوع کا تھا جیسا دنیا کے بادشاہوں کا ہوتا ہے۔ دنیا کے بادشاہ اپنی ذمہ داریاں اپنے معتمد علیہ لوگوں کو سونپ دیتے ہیں جو ان کو اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں۔ عرب سمجھتے تھے کہ رب العرش تک رسائی ایک مشکل کام ہے لہٰذا اگر ان ہستیوں کو خوش رکھا جائے جن کو اللہ نے اپنے کام میں شریک بنالیا ہے تو وہ سارے کام درست کر دیتی ہیں۔ گویا ان شریکوں کی خوشنودی خدا ہی کے تقرب کا ذریعہ سمجھی جاتی۔

رب العرش کی بندوں سے دوری کے اسی تصور کے تحت بعض عربوں کا یہ خیال بھی تھا کہ آسمان کا الٰہ اور ہے اور زمین کا الٰہ اور۔ آسمان کا الٰہ اپنے عرش پر براجمان رہتا ہے جبکہ اہل زمین پر خدائی زمین کے الٰہ کی چلتی ہے۔ چونکہ

انسانوں کا واسطہ زیادہ تر زمینی الٰہ کے کارندوں سے پڑتا ہے، لہٰذا ان کو خوش رکھنا اور ان سے مرادیں مانگنا درست ہے۔

عرب جن چیزوں کو خدا کا شریک مانتے ان میں ملائکہ، جنات اور بعض موہوم بزرگ ہستیاں شامل تھیں۔ ملائکہ کو اللہ کی بیٹیوں کا درجہ دیا جاتا۔ ان کا گمان یہ تھا کہ فرشتوں کو خدا کے ہاں بڑا مرتبہ و مقام حاصل ہے۔ خدا ان کی ناز برداری کرتا ہے اور ان کی ہر خواہش کو پورا کر دیتا ہے۔ عرب دنیا کی نعمتوں کو فرشتوں کا عطیہ سمجھتے۔ آخرت کی بابت ان کا خیال یہ تھا کہ فرشتوں کی بدولت وہاں بھی ان کو بڑا مرتبہ حاصل ہوگا اور فرشتے ان کی سفارش کریں گے کیونکہ وہ ان کی پوجا کرتے ہیں۔

جنات کو خدا کی صفات اور حقوق میں شریک کیا جاتا۔ وہ علم غیب کے حصول کا ذریعہ تھے۔ ان سے تعلق قائم کرنے کے لیے طرح طرح کی ریاضتیں کی جاتیں۔ کہانت انہی جنات کا فیض تھی۔ جنوں سے نفع و ضرر وابستہ کیا جاتا اور ان کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے چڑھاوے، نذریں اور قربانیاں پیش کی جاتیں۔ سفر کے دوران عرب جن وادیوں اور گھاٹیوں سے گزرتے ان کے جن کو پکارتے اور اس کے علاقہ میں اپنی سلامتی کے لیے اس کی مدد کا واسطہ دیتے۔

عرب ستاروں کے اثرات کے بھی قائل تھے۔ ان کے نزدیک بعض ستارے مبارک اور بعض نحس تھے۔ کچھ ستاروں سے خوش حالی وابستہ کی جاتی۔ ان کے طلوع و غروب اور چلنے اور چھپنے کے ساتھ مختلف قسم کے اوہام وابستہ کر لیے گئے۔ ستاروں کی حرکتوں کا مطالعہ کہانت کے نظام کا حصہ بھی تھا۔ ہر اہم معاملہ میں لوگ کاہنوں سے غیب کی خبریں معلوم کرتے اور مشکل صورت حال میں ان سے مشورہ کے طالب ہوتے۔

بت پرستی:

بنی اسماعیل میں بت پرستی کا آغاز، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، عمرو بن لحی خزاعی نے اس وقت کیا جب بنو خزاعہ بیت اللہ کے متولی بن بیٹھے تھے۔ اس نے ہبل کا بت عین خانہ کعبہ کے پاس نصب کیا اور اس کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ آہستہ آہستہ مزید بت نصب ہونے لگے۔ اساف اور نائلہ کے بت گاڑے گئے تو یہ مقام قربانیوں کے لیے موزوں خیال کیا گیا۔ مکہ کے باشندے جب دوسرے علاقوں میں جاتے تو حرم کی حدود میں سے کوئی پتھر برکت کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیتے۔ حرم سے دوری کے باعث انہی پتھروں کے ساتھ عقیدت بڑھ جاتی اور لوگ ان کو مدد و نصرت کے حصول کا وسیلہ بنا لیتے۔ اس طرح بت پرستی کی وبا عرب کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئی۔

عربوں میں بت تراشی بطورفن رائج نہیں رہی۔ حرم کے پتھر، جن کا اوپر ذکر ہوا، ظاہر ہے تراشے نہیں جاتے تھے۔ ایک صحابی ابورجاء العطاردیؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ کسی بھی پتھر کو اٹھا کر پوجنا شروع کر دیتے۔ اس کے بعد اس سے اچھا کوئی پتھر مل جاتا تو پہلے پتھر کو پھینک کر اس کی پوجا شروع کر دیتے۔ اس سے بھی یہ خیال تقویت پاتا ہے کہ عرب جاہلیت میں شرک اپنی جڑیں پوری طرح جمانہیں سکا تھا۔ لہٰذا اگر کچھ ہاتھ اس کو اکھیڑنے کے لیے تیار ہو جاتے تو عربوں کی معمولی مزاحمت کا مقابلہ کر کے ان کو فطری مذہب پر جمع کرنے کا امکان موجود تھا۔

دیگر اہم بت عزیٰ، لات اور منات تھے۔ عزیٰ نخلہ کے مقام پر نصب تھا اور طائف سے مکہ آتے ہوئے راستہ میں پڑتا تھا۔ بنو ہاشم کا حلیف قبیلہ بنوشیبان اس کا مجاور تھا۔ قبیلہ ثقیف کا بت لات طائف میں نصب تھا۔ یثرب کی طرف سے آنے والوں نے مکہ کی راہ میں پڑنے والے ایک قصبہ قدید میں پہاڑی پر اپنا معبد تعمیر کیا اور منات وہاں نصب تھا۔ عزیٰ، لات اور منات فرشتوں کے بت تھے۔ مشرکین ان کی شان میں یہ نعرہ لگایا کرتے کہ یہ تینوں بڑے مرتبہ کی دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی قبولیت کی ہمیں پوری امید ہے۔ بت پرستی جب دوسرے قبائل میں بھی سرایت کر گئی تو بیت اللہ کے مجاوروں نے قبائل کی وفاداریاں حاصل کرنے کے لیے ان کے بتوں کو بیت اللہ میں لا بسایا۔ ایسے بتوں کی تعداد بالآخر تین سو ساٹھ تک جا پہنچی۔ مجاوران کو اپنی قوت کا بڑا ذریعہ سمجھتے۔ آہستہ آہستہ ان کے اندر یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ مکہ کی سیاسی قوت کے لیے ان بتوں کا وجود اشد ضروری ہے۔ بتوں کی حرم سے بے دخلی عرب قبائل کی نظروں میں ان کی سیاسی موت کے طور پر دیکھی جائے گی۔

بتوں کے بارے میں عربوں کا تصور یہ نہیں تھا کہ یہ زمین و آسمان کے خالق یا شمس و قمر کے موجد ہیں یا زندگی اور موت کا نظام ان کے کنٹرول میں ہے۔ وہ صرف یہ مانتے تھے کہ یہ ایسی ہستیوں کے بت ہیں جو خدا کی چہیتی ہیں۔ خدا ان کی سنتا ہے، ان کی سیوا کی جائے تو یہ دنیا کی نعمتیں دلاتی ہیں۔ قیامت ہوئی تو اپنی سفارش سے ہمیں بخشوا لیں گی۔ بتوں کی خوشنودی کے لیے ان کے نام کے چڑھاوے چڑھائے جاتے، ان سے مرادیں مانگی جاتیں اور ان کا نام لے کر قربانیاں کی جاتیں۔

بتوں میں عربوں کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے مفاد پرست لوگوں نے جگہ جگہ مقدس مقامات، تھان اور استھان قائم کر لیے اور لوگوں میں مشہور کر دیا کہ ان مقامات پر دیویوں، دیوتاؤں اور بھوتوں کا بسیرا ہے۔ ان کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کو راضی کرنے کی خاطر چڑھاوے چڑھائے جائیں۔ ان مقامات کے

پروہت من گھڑت فتوے دیتے اور اوہام پرست لوگ ان پر عمل کرتے۔ ان مقامات پر جانور بھی ذبح کیے جاتے۔

اس مشرکانہ نظام کے خلاف اصلاح کی غرض سے کوئی آواز بلند کرتا تو اس نظام کے پیرووں کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی کہ یہ نظام ہمیں اپنے آباء واجداد سے وراثت میں ملا ہے، لہٰذا ہم اس کو ترک نہیں کر سکتے۔ اگر خدا کی نظروں میں یہ ایک ناپسندیدہ نظام ہوتا تو وہ اپنی قدرت قاہرہ سے ہمیں اس پر عمل کرنے سے روک دیتا۔

حرمت وحلت:

جو قومیں شرک میں مبتلا ہو جاتی ہیں وہ عملی زندگی کے لیے بھی ایک الگ شریعت تصنیف کر لیتی ہیں تاکہ لوگ مشرکانہ نظام کے دام میں اچھی طرح گرفتار ہو جائیں اور اس کو ترک کرنے کی جسارت نہ کر سکیں۔ یہی کچھ عربوں کے ساتھ ہوا۔ ابراہیمی شریعت کے مطابق وہ اپنے چوپایوں اور کھیتی میں سے خدا کا حصہ نکالنے کے پابند تھے۔ مشرکانہ نظام میں انہوں نے اس کے ساتھ اپنے مزعومہ شرکاء کا حصہ بھی نکالنا شروع کر دیا۔ اس میں ظلم یہ کیا کہ اگر کسی مخصوص صورت حال میں وہ دونوں حصے نہ نکال سکتے تو خدا کا حصہ بتوں کی طرف منتقل کر دیتے لیکن مجال نہیں تھی کہ بتوں کا حصہ کسی حال میں خدا کی طرف منتقل کر دیں۔ اگر کسی بت کے نام کا حصہ تلف ہو جاتا تو اس کی تلافی خدا کے حصہ میں سے کر دیتے۔ خدا کا حصہ تلف ہونے کی صورت میں بتوں کے حصہ سے اس کی تلافی ناقابل تصور تھی۔

عرب وہ چیزیں تو بے دھڑک کھا لیتے جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے حرام چلی آ رہی تھیں۔ لیکن مشرکانہ تصورات کے تحت جو چیزیں انہوں نے حرام قرار دے لی تھیں ان کو کسی حالت میں بھی ہاتھ نہ لگاتے۔ قدیم شریعت میں ذبیحہ کی حلت کے لیے اس پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا ضروری تھا اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام تھا۔ لیکن تھانوں اور استھانوں پر جانور غیر اللہ کے نام پر ذبح ہوتے اور لوگ ان کو بلا کراہت کھاتے۔ جو چڑھاوے چڑھائے جاتے ان پر کئی طرح کی پابندیاں لگائی گئی تھیں۔ مثلاً مرد کھا سکتے لیکن عورتیں ان کو نہیں کھا سکتی تھیں۔ ذبح کے لیے پیش کردہ کسی جانور کے پیٹ سے بچہ نکل آتا تو مردوں کے لیے اس کا کھانا جائز سمجھتے، عورتوں کے لیے ناجائز۔ اگر بچہ مردہ پیدا ہوتا تو اس مردار کے کھانے میں مرد اور عورت سب شریک ہو سکتے تھے۔

بعض خاص جانور آزاد چھوڑ دیے جاتے۔ نہ ان پر سواری جائز تھی، نہ بوجھ لادنا، نہ ان کا دودھ پینا یا گوشت کھانا۔ یہ جانور جس گھاٹ سے چاہتے پانی پیتے اور جس کی چراگاہ میں چاہتے چرتے۔ ان کو اتنا مقدس سمجھا جاتا کہ لوگ ان کو چھیڑنے کے وبال سے ڈرتے۔ ایسے جانوروں میں سے قرآن نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کا

ذکر کیا ہے۔ ان جانوروں کی خصوصیات میں مورخین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے تاہم اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مشرکانہ ذہنیت کو سمجھنے کے لیے اتنا بتانا کافی ہے کہ بحیرہ وہ اونٹنی تھی جس سے پانچ بچے پیدا ہو چکے ہوتے اور ان میں آخری نر ہوتا۔ سائبہ وہ اونٹنی تھی جس کا مالک بیماری میں یہ منت مان لیتا کہ صحت یابی پر وہ اس کو آزاد چھوڑ دے گا۔ وصیلہ وہ بھیڑ یا بکری تھی جو لگاتار نر اور مادہ بچے ایک ساتھ جنتی۔ اس کے نر بچوں کو بتوں کی نذر کے قابل نہ سمجھا جاتا۔ حام وہ سانڈ اونٹ تھا جس سے دس پشتیں پیدا ہو چکی ہوتیں۔

عبادات حج:

عربوں نے بیت اللہ کی تمام عبادات کی شکل کو تو بالعموم قائم رکھا لیکن اس میں اپنی مرضی سے بعض تبدیلیاں بھی کر دیں جس کے نتیجہ میں ان عبادات کی وہ روح باقی نہ رہی جو مطلوب تھی۔ نماز کی اصل شکل بھی موجود رہی لیکن دوسری شکل مشرک اقوام کی نقالی میں اس عبادت کے دوران سیٹی بجانے یا تالی پیٹنے کی بدعت بھی رائج ہو گئی۔ حج وعمرہ کے سفر کے دوران تلبیہ پڑھنے کا حکم تھا جس کے اصل الفاظ شرک کی مطلق نفی کرتے ہیں لیکن قبائل نے اپنے اپنے بتوں کے لیے گنجائش پیدا کرنے کی غرض سے اس کے الفاظ میں بھی تغیر کر لیا۔ مناسک حج سے فارغ ہو کر احرام کھولنے کا حکم ہے لیکن اوس، خزرج، ازد اور غسان کے قبائل مناسک سے فارغ ہو کر مشرکانہ تلبیہ پڑھتے ہوئے منات کے بت کے پاس احرام باندھے ہوئے حاضری دیتے۔ اہل یثرب منات کی تلبیہ سے سفر کا آغاز کرتے اور جب تک تمام مناسک ادا نہ کر لیتے کسی چھت کے نیچے نہ جاتے۔ چنانچہ احرام باندھنے کے بعد اگر ان کو گھروں میں داخل ہونے کی اشد ضرورت ہوتی تو وہ گھر کی عقبی دیوار پھلانگ کر داخل ہوتے۔

حج کے دن عرفات کی حاضری مناسک کا رکن اعظم ہے۔ قریش اپنے لیے یہ حاضری ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرے حجاج جب منیٰ سے عرفات جاتے تو وہ مزدلفہ میں جا کر رک جاتے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ مکہ کے مکین اور بیت اللہ کے مجاور ہونے کے باعث حدود حرم سے ان کا باہر نکلنا مناسب نہیں کیونکہ حرم کی سرزمین کو باہر کی زمین پر فضیلت حاصل ہے۔ یہ رعایت انہوں نے اپنے تعلق کے خاص قبائل مثلاً ثقیف، غطفان، قضاعہ، اوس اور خزرج کو بھی دے رکھی تھی۔ جو قبائل اس رعایت کے مستحق سمجھے گئے ان کو 'حُمس' کہا جاتا۔ ان کو عام عرب بڑی عقیدت سے دیکھتے۔

قریش نے زائرین بیت اللہ پر ایک من مانی پابندی یہ لگا رکھی تھی کہ وہ طواف کے بعد اپنے کپڑے پھینک دیا کریں، وہ دوبارہ استعمال کے قابل نہیں رہ جاتے۔ اگر وہ اپنے ذاتی کپڑے ضائع نہ کرنا چاہیں تو پھر حمس میں

کے کسی فرد سے کپڑے مستعار لیا کریں ورنہ برہنہ طواف کرلیں۔ اس طرح انہوں نے مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے عریانی کو عبادت کا جزو بنا دیا اور عین بیت اللہ کے سایہ میں نظر بازی کی ایک شکل پیدا کردی۔ تاہم عربوں کے ہاں اس طرح کی فاحشہ عورتوں کے کسی کردار کا سراغ نہیں ملتا جو دوسری مشرک قوموں کی عبادت گاہوں میں ناچ گانے یا زائرین کا دل لبھانے کے لیے رکھی ہوتی ہیں۔

زمانہ قدیم سے سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے ۔۔ ذی قعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب ۔۔ محترم مانے گئے تھے۔ پہلے تین مہینوں میں سفر حج ہوتا اور رجب عمرہ کے لیے مخصوص تھا۔ ان مہینوں میں تمام عرب قبائل لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیتے۔ ملک میں ہر طرف امن و امان ہوتا اور زائرین بے خوف و خطر مکہ آتے جاتے۔ بیت اللہ کے منتظمین نے انتہائی چالاکی سے ان محترم مہینوں کی حرمت بھی قائم نہ رہنے دی۔ اس کے لیے نسی کا ایک ضابطہ وضع کیا گیا جس کی رو سے ہر مہینہ اپنی اصل جگہ سے ہٹ گیا۔ مزید براں کبھی سال تیرہ ماہ کا کر دیا جاتا اور اپنی مرضی سے ایک مہینہ داخل کر دیا جاتا۔ بے نام کا یہ مہینہ مقتدر لوگ اپنے خاص دوست قبائل کی سہولت کے لیے کبھی محرم سے پہلے یا بعد اور کبھی رجب کے ساتھ جہاں چاہتے داخل کر دیتے۔ اس کے اس نظام کے بارے میں سیرت نگاروں کی آرا مختلف ہیں جو عربوں میں رائج تھا۔ تاہم اصولی طریق کار کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

معلوم ہے کہ قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے۔ اس لیے ہر تیسرے سال دونوں میں ایک ماہ کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر قمری مہینہ ذوالحجہ شمسی ماہ ستمبر کے مطابق ہو تو تین سال بعد یہ ستمبر کے بجائے اگست کے مطابق ہو جائے گا۔ جوں جوں سال بڑھتے جائیں گے قمری ماہ اور پیچھے ہٹتا جائے گا اور ۳۳ برس میں دونوں تقویموں میں ایک سال کا فرق واقع ہو جائے گا۔ چونکہ موسموں کا تغیر شمسی تقویم کے مطابق ہوتا ہے اس لیے حج کا مہینہ کبھی موسم بہار میں، کبھی خزاں میں اور کبھی موسم سرما یا گرما میں پڑے گا۔ یہ صورت حال عربوں کو پسند نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ حج کسی ایسے موسم میں آیا کرے جب ان کے شش ماہی تجارتی سفر متاثر نہ ہوں۔ نیز وہ فصلیں سمیٹ کر فارغ ہو کر حج کے سفر کے لیے نکلیں۔ ایسا مہینہ ستمبر کا تھا چنانچہ ذوالحجہ کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ جب تین سال کے بعد وہ اگست میں پڑنے لگتا تو قمری سال میں ایک ماہ اضافی داخل کر دیا جاتا تاکہ ذوالحجہ پھر ستمبر ہی میں آئے۔ گویا وہ سال تیرہ ماہ کا ہوتا۔ عملاً بنو مالک بن کنانہ کو نسی کا یہ اختیار سونپا گیا۔ وہ آٹھ سالوں میں تین ماہ کا اضافہ کرتے۔ کبھی یہ اضافہ دو سال کے بعد ہوتا کبھی تین سال کے بعد۔ اضافہ شدہ مہینہ کا اعلان بنو مالک کا مقتدر آدمی کرتا۔ نسی کی اس

بدعت کے نتیجہ میں نہ صرف حج کا مہینہ اپنی جگہ سے ہٹ جاتا بلکہ چار محترم مہینوں کا تقدس بھی مجروح ہوتا۔

ماہ ستمبر کا موسم حج تجارتی میلوں اور تفریحات کے منعقد کرنے کے لیے انتہائی موزوں تھا۔ چنانچہ حج وعمرہ کی عبادات کے اصل مقاصد تو نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اصل دلچسپی تجارت اور تفریح سے رہ گئی۔ عرفات، مزدلفہ اور منیٰ دلچسپیوں کا مرکز بن گئے۔ عرب مبارزت اور مفاخرت کے رسیا تھے۔ ان کے درمیان قبائلی جنگیں برپا ہوتی رہتیں۔ مفاخرت کے مقابلوں میں ان کے شاعر اور خطیب زمین و آسمان کے قلابے ملاتے اور اپنے حریفوں پر اپنی بڑائی جتاتے۔ اس طرح ایام حج میں زیادہ زور اللہ کے ذکر کے بجائے قصیدہ خوانی، داستان گوئی اور مفاخرت کی مجالس منعقد کرنے پر ہوتا۔

معاشرت:

عربوں میں شراب خوری اور جوئے کا بہت رواج تھا تاہم اس سے مقصود ہمیشہ عیاشی یا قسمت آزمائی نہ ہوتی بلکہ اس میں غرباء ومساکین کے ساتھ ہمدردی اور ان کی خیر خواہی کے بعض پہلو بھی مضمر ہوتے۔ مثلاً موسم سرما میں کبھی سخت قحط سالی ہوتی اور غریبوں کو کھانا حاصل کرنے میں دشواری پیش آتی تو حوصلہ مند اور فیاض سرداران کی مدد کا یہ انوکھا طریقہ اختیار کرتے کہ بعض مقامات پر شراب خوری کی مجالس منعقد کرتے۔ پھر مدہوشی میں اٹھتے اور کسی کا اونٹ پکڑ کر ذبح کر ڈالتے۔ اس کے گوشت کی ڈھیریوں پر جوا کھیلا جاتا اور جیتا ہوا گوشت غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ اس کے بعد اونٹ کے مالک کو اس کے اونٹ کی منہ مانگی قیمت ادا کر دی جاتی۔ ایسے فیاض لوگوں کی معاشرے میں بڑی عزت تھی۔ شعرا ان کی دریا دلی کے قصیدے لکھتے۔

سودی لین دین عرب کے یہودیوں میں تو ہمیشہ سے تھا اور وہ اس معاملہ میں قابل نفرت کردار کا مظاہرہ کرتے۔ لیکن عربوں میں بھی یہ وبا پھیل گئی تھی۔ ان میں ایسے لوگ موجود تھے جو قرض دیتے وقت رقم کی واپسی کی مدت کا تعین کر دیتے۔ جب یہ مدت ختم ہوتی تو وہ مقروض شخص سے دریافت کرتے کہ اگر اس نے رقم مزید کچھ عرصہ اپنے پاس رکھنی ہے تو اس میں اضافی رقم سود کی شکل میں ادا کرنی ہوگی۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں کے بعض طبقات میں عورتوں کے ساتھ سلوک میں ناروا قسم کی زیادتیاں رواج پا گئی تھیں۔ مثلاً شوہر کے مرنے کے بعد اس کی جائداد اور مال مویشی کی طرح اس کی منکوحہ بیویاں بھی وارث کو منتقل ہو جاتیں۔ بیٹے اپنی حقیقی ماں کو چھوڑ کر باپ کی جس منکوحہ پر اپنی چادر ڈال دیتے وہ ان کی بیوی کی حیثیت میں ہو

جاتی۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہہ دیتا کہ اب تو میرے اوپر میری ماں کی طرح حرام ہے یا وہ اپنی بیوی کے کسی حصہ جسم کو اپنی محرمات میں سے کسی کے مشابہ قرار دے دیتا تو اس کو حتمی طلاق کا معاملہ مانا جاتا جس کے بعد اس شخص کے لیے طلاق سے رجوع کی کوئی شکل باقی نہ رہتی۔ طلاق کی اس قسم کو ظہار کا نام دیا جاتا۔

بیویوں کی تعداد پر کوئی قید نہ تھی۔ سرداران قبائل کثرت سے شادیاں کرتے۔ موقت نکاح یعنی متعہ کا رواج بھی تھا۔ ایسے نکاح کی خواہش مند عورتیں اپنے گھروں میں جھنڈے لہراتیں تاکہ متعہ کے خواہشمند ان کی طرف رجوع کرسکیں۔

نکاح میں قریبی رشتوں مثلاً دو بہنوں، پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی کو ایک ہی وقت میں جمع کرنے میں کوئی قباحت نہ سمجھی جاتی۔ متبنیٰ لڑکوں کو صلبی بیٹوں کا مقام دیا جاتا اور ان کی منکوحہ عورتوں کو حقیقی بہو کی طرح سمجھا جاتا۔ متبنیٰ بنانے والے ان سے نکاح کا تصور بھی نہ کرتے۔ یہ کام انتہائی معیوب تھا۔

بعض عرب بیٹیوں کو نفرت کی چیز سمجھتے۔ کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی اطلاع ملتی تو سخت مغموم ہو کر لوگوں سے چھپتا پھرتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قبائلی طرز زندگی میں بیٹے ضرب وحرب کے معاملات میں حصہ لے کر قبیلہ کی طاقت کا باعث بنتے جبکہ عورت ایسے کاموں میں خود ایک بوجھ بن جاتی۔ وہ مفاخرت کے مقابلوں میں بھی بے زبان تھی اور اس کو بیاہنے کی ذمہ داریاں والدین پر ایک اضافی بوجھ بنتیں۔

عرب جاہلیت میں قتل اولاد کے مذموم واقعات بھی رونما ہوتے۔ اس کی وجوہ تین تھیں۔

۱۔ تھانوں اور استھانوں کے پروہت اوہام پرست لوگوں کو ڈرایا کرتے کہ وہ کسی جن یا بھوت کی ناراضی کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ جن بھوت ان کی خلاصی صرف اس صورت میں کرے گا اگر وہ اپنی اولاد میں سے کسی کو اس کی بھینٹ چڑھا دیں۔ اس کے بعد وہ اس کے شر سے محفوظ رہیں گے۔

۲۔ کبھی ملک میں قحط سالی ہوتی اور لوگوں کو تنگدستی کے باعث فاقے کرنے پڑ جاتے تو بعض کم ہمت لوگ اس کا حل اولاد کا بوجھ کم کرنے میں تلاش کرتے اور بچوں کو قتل کر دیتے۔

۳۔ عربوں کے بارے میں یہ بات مان لی گئی ہے کہ وہ بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے لیکن یہ بات عمومی طور پر تمام عربوں کے بارے میں درست نہیں۔ اس گناہ کا ارتکاب بنوتمیم کے بعض 'غیرت مند' اور سنگ دل باپ کرتے تاکہ بچیوں کے بڑا ہونے پر ان کو غیروں کے نکاح میں نہ دینا پڑے۔ ظاہر ہے کہ بنوتمیم کے

تمام لوگ بھی یہ حرکت نہیں کرتے تھے۔ ورنہ اتنا بڑا قبیلہ صرف مردوں کے بل بوتے پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ چند لوگوں کا برا فعل تمام لوگوں کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے حالانکہ وہ اس جرم میں شریک نہیں ہوتے۔ غیرت کے اس طرح کے جذبات بعض ذہنی مریضوں تک ہی محدود ہوتے ہیں اور یہی صورت حال عرب میں بھی تھی۔

بنی اسماعیل کی یہ کوتاہیاں ایسی تھیں جن کو تعلیم اور استدلال سے رفع کرنا ممکن تھا کیونکہ عرب فطرتاً سادگی پسند تھے اور جب ایک بات ان کی سمجھ میں آ جاتی تھی تو اس کو قبول کرنے میں وہ وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان کے کردار کی خوبیاں بھی ایسی تھیں جو ان کو بنی اسرائیل سے ممتاز کرتی تھیں۔ لہٰذا اللہ رب العزت نے دعائے ابراہیمؑ کے اس حصہ کو، جس میں ایک رسول کی بعثت اور امت مسلمہ کے قیام کی التجا کی گئی تھی، بنی اسماعیل کے حق میں قبول فرمایا اور وہ مرحلہ آ گیا کہ آخری رسول کی بعثت ہو اور دنیا کامل ہدایت سے فیض یاب ہو۔

حصہ دوم

حیات قبل از بعثت

باب 7

نبی موعود کی آمد

حضرت عیسیٰؑ کو دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً ساڑھے پانچ سو برس گزر گئے تو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی دعا کی قبولیت کا وقت آ گیا کہ اس ہستی کی ولادت ہو

- جس کو اللہ تعالیٰ کی خلافت میں سب سے اعلیٰ و اشرف مقام عطا ہونے والا تھا۔
- جس کے ہاتھوں اس قصر نبوت کی تکمیل ہونی تھی جس کے لیے تمام انبیاء و رسل جدو جہد کرتے رہے۔
- جس کو اللہ تعالیٰ کسی خاص قوم کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کے لیے اخلاق و کردار کے اعلیٰ نمونہ کے طور پر پیش کرنے والا تھا۔
- جس کے ہاتھوں آسمانی ہدایت اس طرح محفوظ ہونے والی تھی کہ اس کے کسی حصہ کو چھپانا ممکن ہو، نہ اس میں تحریف کرنا۔
- جس کے انتظار میں یہود و نصاریٰ بھی چشم براہ تھے اور بنی اسماعیل بھی، اور ہر کسی کی خواہش تھی کہ یہ ہستی ان کے اندر پیدا ہو۔

بالآخر یہ شرف بنو اسماعیل کے حصہ میں آیا، جو شرک میں ملوث ہونے کے باوجود ابھی بہت سی خوبیوں کے مالک اور ابراہیمی مرکز توحید کے محافظ و منتظم تھے، کہ ان کے اندر اللہ کے عظیم رسول۔ حضرت محمد ﷺ۔ کی ولادت ہو اور ان کے ہاتھوں ایک عظیم امت مسلمہ برپا ہو جو رہتی دنیا تک خدا کے کلام کو اکناف عالم تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔

سلسلۂ نسب:

بنی اسماعیل میں اپنا نسب محفوظ رکھنے اور سلسلۂ نسب کو یاد رکھنے کا خصوصی اہتمام تھا۔ وہ نہ صرف اپنا بلکہ دوسرے قبائل کا نسب نامہ بھی یاد رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں مرد و زن سب کے کئی کئی درجوں تک نسب بالعموم نقل کیے جاتے ہیں۔ محمد رسول اللہؐ کا سلسلۂ نسب یوں ہے:۔

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ۔

حضورؐ کی والدہ آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مرہ ہیں۔ اس طرح کلاب بن مرہ سے والد اور والدہ دونوں کے نسب ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ کنانہ سے اوپر یہ سلسلہ عرب کی مشہور و معروف شخصیت عدنان تک اور مزید اوپر حضرت اسماعیلؑ تک پہنچتا ہے۔ یہ سلسلہ نسب شرافت ونجابت کے لحاظ سے عرب کے اعلیٰ سلسلوں میں سے ہے۔ خاندانوں کی مثال معادن کی ہوتی ہے۔ جس طرح سونے کی کان میں سے سونا اور چاندی کی کان میں سے چاندی نکلتی ہے، اسی طرح اچھی روایات کے حامل خاندانوں میں سے اچھے لوگ ہی پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضورؐ کا ارشاد ہے:

> اللہ تعالیٰ نے اسماعیل کی اولاد میں سے بنو کنانہ کو منتخب کیا۔ بنو کنانہ میں سے قریش کو چن لیا۔ قریش میں سے بنو ہاشم کو ممتاز کیا اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو منتخب کر لیا[1]

حضورؐ کے والد عبداللہ کی عمر ۲۴ سال تھی جب ان کے والد عبدالمطلب نے بیٹے کے لیے بنو زہرہ کے سردار وہب بن عبد مناف کی بیٹی آمنہ کا رشتہ مانگا۔ سیرت نگاروں کے مطابق وہب کا چند سال قبل انتقال ہو چکا تھا لہٰذا آمنہ کے ولی ان کے چچا وہیب بن عبد مناف تھے۔ انہوں نے عبدالمطلب کی تجویز مان لی اور عبداللہ اور آمنہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد قریش کا تجارتی قافلہ شام جا رہا تھا۔ عبداللہ اس میں شامل ہو کر غزہ روانہ ہو گئے۔ والد نے ان کو ہدایت کی کہ واپسی کے سفر کے دوران یثرب میں کھجوروں کا سودا طے کرتے ہوئے آئیں۔ وہ یثرب میں اپنے ننھیال بنو عدی بن النجار کے ہاں رکے تو بیمار ہو گئے۔ بیماری کی شدت میں سفر کے قابل نہ رہے۔ قافلہ مکہ پہنچا تو عبدالمطلب کو تشویش لاحق ہو گئی۔ انہوں نے بڑے بیٹے حارث کو یثرب روانہ کیا کہ بیٹے کی تیمارداری کریں اور ان کو مکہ لے آئیں۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ عبداللہ کا انتقال ہو چکا۔ حارث نے واپس مکہ آکر والد کو یہ خبر سنائی۔ عبداللہ کے انتقال کے وقت حضورؐ ابھی شکم مادر ہی میں تھے۔

تاریخ ولادت:

سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضورؐ کی ولادت دوشنبہ (پیر) کے روز پہلے عام الفیل کے ماہ ربیع الاول کے دوسرے ہفتہ میں ہوئی۔ ربیع الاول کی تاریخ کے بارے میں اختلاف ہے۔ مروج تصور کے مطابق

یہ تاریخ ۱۲ تھی لیکن اہل تحقیق کے نزدیک اگر یہ تاریخ درست مانی جائے تو پیر کے روز کے ساتھ اس کی مطابقت نہیں ہوتی۔ بالعموم سیرت نگاروں نے مصری ہیئت دان محمود پاشا کے حوالہ سے ۹ ربیع الاول کو درست تاریخ مانا ہے۔ یہی تاریخ قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی کتاب رحمۃ اللعالمین میں اختیار کی ہے، جو ۲۲ اپریل ۵۷۱ء اور یکم جیٹھ ۶۲۸ بکری سے مطابقت رکھتی ہے[۲]

رضاعت:

حضورؐ کو ابتدا میں اپنی والدہ آمنہ نے اور ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے دودھ پلایا۔ قریش کے ہاں دستور تھا کہ وہ اپنے نومولود بچوں کی ابتدائی پرورش ان کو صحرا کے بدو قبائل میں بھیج کر کرتے تھے تاکہ وہ شہر کی آلودہ فضا سے دور کھلی فضا میں پھلیں پھولیں۔ مکہ کی عام زبان مختلف علاقوں کے باشندوں کی آمدورفت اور تجارتی لین دین کے باعث کافی متاثر ہو چکی تھی۔ اس لیے قریش کو اعلیٰ عربی پر قدرت حاصل کرنے اور زبان کو محفوظ کرنے کے لیے خاص اہتمام کرنا پڑتا۔ مکہ اور طائف کے درمیانی علاقہ میں بسنے والا قبیلہ بنوسعد اپنی فصیح و بلیغ زبان کی بدولت عرب بھر میں شہرت رکھتا تھا۔ لہٰذا اس قبیلہ کی عورتیں نومولود بچوں کو دودھ پلانے کی خدمت کے مقصد سے وقتاً فوقتاً مکہ آیا کرتیں اور قریش اپنے بچے ان کے حوالہ کر دیا کرتے تاکہ انہیں خالص بدویانہ عربی زبان بولنا آ جائے۔

قریش کے اسی رواج کے مطابق حضورؐ کی والدہ نے کسی دایہ سے بچے کو دودھ پلوانے کے لیے بنوسعد کی عورتوں سے معاملہ کرنے کی کوشش کی تو انہیں ایک یتیم بچہ کو قبول کرنے میں تامل ہوا۔ انہیں یہ خیال ہوا ہوگا کہ جس بچے کا باپ موجود نہیں اس کی پرورش کا فراخ دلانہ حق الخدمت ہمیں کہاں سے ملے گا۔ بالآخر ایک دایہ حلیمہ سعدیہ نے حضورؐ کو قبول کر لیا۔ اس کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ نہایت مفلوک الحال تھیں اور ان کی سواری بھی نہایت کمزور تھی۔ لہٰذا قریش کی امیر زادیاں اپنے بچے ان کے حوالہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ جب حلیمہ کسی امیر گھرانے کا بچہ حاصل کرنے میں ناکام ہو گئیں تو خالی ہاتھ صحرا کو لوٹنے کے بجائے اس یتیم بچے ہی کو قبول کر لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ حضورؐ کی ذات بابرکات کی بدولت حلیمہ کے گھر میں برکت ظاہر ہوئی اور بعد میں انہیں اپنے فیصلہ پر کبھی پچھتانا نہیں پڑا۔ بنوسعد میں حضورؐ کا قیام شائد پانچ سال کی عمر تک رہا۔ بعد میں آپ صحابہ سے فرمایا کرتے:

میں تم سب میں فصیح تر ہوں کیونکہ میں قریش سے ہوں اور میری زبان بنوسعد بن بکر کی زبان ہے[۳]

مکہ اگر چہ ایک بین الاقوامی شہر تھا جہاں ملک عرب اور یمن کے تمام قبائل کی زبان سمجھی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود قریش کے ہاں زبان کی صحت و فصاحت کا خاص اہتمام پایا جاتا تھا۔

ماں کی جدائی:

صحرا میں چند برس گزارنے کے بعد حلیمہ سعدیہ حضورؐ کو مکہ واپس لائیں تو ایک مختصر مدت کے لیے آپ کو والدہ کی شفقت میسر آئی۔ جب آپ کی عمر چھ سال تھی والدہ آپ کو یثرب لے گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ والدہ کے پیش نظر اپنے شوہر کی قبر کی زیارت تھی جس کے لیے وہ وقتاً فوقتاً یثرب جایا کرتی تھیں۔ ان کا قیام طویل ہو گیا اور وہ عبدالمطلب کے ننھیال بنو عدی بن النجار کے ہاں تقریباً ایک ماہ رہیں۔ اس عرصہ میں حضورؐ کو یثرب کی گلیاں دیکھنے اور مضافاتی علاقہ جاننے کا موقع ملا۔ واپسی کے سفر کے دوران والدہ بیمار پڑ گئیں اور مکہ کی راہ کی ایک منزل ابواء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ام ایمن، جو عبداللہ کی لونڈی اور اس سفر میں آمنہ کے ساتھ تھیں، حضورؐ کو مکہ واپس لے آئیں اور انہی نے حضورؐ کو اپنی پرورش میں لیا۔

اب حضورؐ بنو ہاشم خاندان کا ایک فرد ہونے کے باعث قبیلہ کے سربراہ عبدالمطلب کی تولیت میں آ گئے۔ عبدالمطلب آپ پر بڑی شفقت فرماتے، حرم میں اپنے ساتھ لے جاتے اور اپنی مسند پر ساتھ بٹھاتے۔ یہ صورت دو برس ہی قائم رہ سکی اور جب حضورؐ کی عمر آٹھ سال تھی تو دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کا جنازہ اٹھا تو حضورؐ بھی تابوت کے پیچھے چلنے والوں میں تھے اور دادا کی شفقتوں کو یاد کر کے روتے جا رہے تھے۔

عبدالمطلب نے اپنے بعد اپنے بڑے بیٹے زبیر کو اپنا وصی بنایا تھا لہٰذا حضورؐ اب اپنے ان تایا کے سایۂ شفقت میں آ گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کو کم سنی ہی میں تایا زبیر سے زیادہ انس تھا اور وہ بھی آپ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ کتب سیرت میں ان کی لوریاں نقل ہوئی ہیں جو وہ بھتیجے کو سناتے تھے۔ ان کی زندگی میں آپ انہی کی کفالت میں رہے:

> كان الطف عمه به ويقال اوصاه عبدالمطلب بان يكفله بعده[1]
>
> وہ آپ کے چچاؤں میں آپ پر سب سے زیادہ شفیق تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے انہی کو وصیت کی تھی کہ ان کے بعد بھتیجے کی کفالت کریں۔

زبیر کی سربراہی کے دوران بنو کنانہ اور ہوازن کے درمیان ایک جنگ ہوئی جسے حرب فجار کا نام دیا جاتا

ہے۔اس میں زبیر بنی ہاشم کے رئیس کی حیثیت ہی سے شامل ہوئے۔انہی کے دور میں معاہدہ حلف الفضول ہوا تھا اور وہ اس کے روح رواں تھے۔ حضورؐ نے بھی اس معاہدہ میں شرکت کی اور اس وقت آپ کی عمر ۲۰ برس تھی۔ جب ۲۵ برس کی عمر میں آپ کی شادی ہوئی تو خطبہ نکاح ابو طالب نے بطور سربراہ خاندان دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبیر کا انتقال اس وقت ہوا جب حضورؐ ۲۲، ۲۳ برس کے ہو چکے تھے اور اب آپ کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ گویا کفالت کا پورا دور زبیر کے ساتھ آپ نے گزارا۔

لڑکپن کی دلچسپیاں:

لڑکپن میں حضورؐ نے اپنے خاندان کی بکریاں چرائیں۔ بعض اہل تحقیق آنحضرتؐ کی بکریاں چرانے کے معاملہ کی مطابقت حضورؐ کے احوال کے ساتھ نہیں پاتے۔ ان کے نزدیک قریش کے نوجوان بکریاں چرانے کا پیشہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ یہ کام غلاموں سے لیا جاتا تھا۔ ہمارے نزدیک مجمل طور پر یہ ماننے میں کوئی قباحت نہیں کہ جس طرح نوعمر لڑکے ہر کام کو انہماک سے دیکھتے اور اس سے شناسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح حضورؐ نے بھی نوعمری میں گلہ بانی میں دلچسپی لی ہوگی، اگرچہ اس کو بطور پیشہ اختیار نہ کیا۔ آخر بنو سعد کے ہاں تو لڑکوں بالوں کا مشغلہ ہی نہیں بلکہ پیشہ گلہ بانی تھا۔ اس سے حضورؐ کے اندر اس سے دلچسپی پیدا ہونا کچھ بعید نہیں۔ قریش کے دوسرے لڑکے بھی اس میں دلچسپی رکھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ تھے تو ایک مہاجر خاتون خولہ بنت حکیم کو آپ سے کچھ شکایت ہوئی۔ انہوں نے برملا کہا کہ اے عمر، میں نے تمہارا وہ زمانہ دیکھا ہے جب تم عکاظ میں دن بھر بکریاں چراتے تھے اور لوگ تمہیں اے عمیر، اے عمیر کہہ کر پکارتے تھے۔ آج مسلمانوں کے خلیفہ بن گئے ہو تو رعایا کے معاملہ میں خدا سے ڈرو[5]۔ یہ عمر وہ تھے جن کے پاس مکہ میں سفارت کا محکمہ تھا اور قریش کے با اثر لوگوں میں تھے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے بکریاں چرانے کا پیشہ تو اختیار نہیں کیا تھا، بس دلچسپی کے لیے بچپن میں کسی گڈریے کے ساتھ چلے جاتے ہوں گے۔

قریش کے نوجوان فنون حرب بھی سیکھتے تھے۔ آنحضرتؐ بہت اچھے نشانہ باز، تیرانداز، شمشیر زن اور پہلوانی کے کرتب جاننے والے تھے۔ آپ کی یہ تربیت بعد کے ادوار میں کفار کے خلاف کام آئی۔ آپ کے جنگی منصوبوں کی آج بھی اہل فن داد دیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ تربیت آپ نے عنفوان شباب ہی میں حاصل کی تھی۔

حلف الفضول:

ماضی بعید میں جب بنو جرہم کا مکہ پر تسلط تھا، حمایت مظلوم کے مقصد سے کچھ لوگوں نے ایک معاہدہ کیا تا کہ ظالموں کا ہاتھ روکیں اور مکہ میں آنے جانے والوں کو ان ظالموں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھیں۔ معاہدہ کرنے والے تین اشخاص کے ناموں میں 'فضل' کا لفظ آتا تھا اس لیے اس معاہدہ کا نام 'حلف الفضول' پڑ گیا۔ یہ معاہدہ تو صدیوں سے ختم تھا لیکن اس کا نام اچھے لوگوں کے حافظہ میں تھا۔ اس کی بازگشت مکہ میں دوبارہ اس وقت سنائی دی جب حضورؐ کی عمر ۲۰ سال تھی۔

قبیلہ زبید کا ایک تاجر سامان تجارت لے کر مکہ میں وارد ہوا۔ قریشی سردار عاص بن وائل نے سودا کر کے سامان اپنے قبضہ میں لے لیا لیکن جب قیمت ادا کرنے کا سوال آیا تو لیت ولعل سے کام لینے لگا۔ تاجر نے اپنی جان پہچان کے لوگوں سے مدد چاہی تو عاص کی حیثیت کے پیش نظر کوئی شخص اس کے خلاف کوئی اقدام کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ مایوس ہو کر وہ علی الصبح کوہ ابی قبیس پر چڑھ کر دہائی دینے لگا کہ اے اولاد فہر، وادی مکہ میں ایک غریب الدیار اور بے سہارا شخص کا سامان ہتھیا لیا گیا۔ وہ پراگندہ بال ابھی حالت احرام میں ہے اور اس نے عمرہ ادا نہیں کیا۔ حجر اسود اور حطیم کے درمیان جلوہ افروز ہونے والو! اس کی مدد کو پہنچو کیونکہ اس مقام کی حرمت کا مستحق شریف و کریم شخص ہے نہ کہ حق تلفی اور بدعہدی کرنے والا۔

یہ پکار سن کر زبیر بن عبدالمطلب اور بعض دوسرے لوگ بھاگ کر تاجر کے پاس گئے۔ اس نے صورت حال بیان کی تو زبیر کی تحریک پر لوگ قریشی سردار عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع ہوئے۔ سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ حلف الفضول کی طرز پر ایک نیا معاہدہ کیا جائے جس کے مقاصد یہ ہوں کہ ہم مسافروں کی حفاظت کریں گے، بے آسرا لوگوں کی معاونت کریں گے، زبردست کو کمزور پر ظلم کرنے سے روکیں گے اور مکہ میں مقامی و غیر مقامی کے درمیان امتیاز کیے بغیر ہر مظلوم کی نصرت و حمایت کریں گے۔ اس معاہدہ میں بنو ہاشم، بنو مطلب، بنو اسد، بنو زہرہ اور بنو تمیم شریک ہوئے۔

اس معاہدہ کے بعد سب نے مل کر عاص بن وائل سے زبیدی تاجر کو اس کا حق دلوایا اور بعد میں بھی بڑے لوگوں سے معاملہ کرنے میں یہ معاہدہ کام آتا رہا۔

حضورؐ عین شباب میں اس معاہدہ میں شریک ہوئے لیکن بعثت کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ عبداللہ بن جدعان کے گھر جو معاہدہ ہوا وہ مجھے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اگر آج بھی مجھے کسی ایسے معاہدہ میں شرکت کی دعوت دی جائے تو میں اس کو فوراً قبول کرلوں گا[1]۔

کسب معاش:

حضورؐ کی عمر جب معاشی جدوجہد میں باقاعدہ حصہ لینے کی ہوئی تو دوسرے قریشی نوجوانوں کی طرح آپ بھی تجارتی سفروں پر جانے لگے۔ آپ کے تجارتی سفروں کے بارے میں جتنا کچھ روایات میں آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ابتدائی سفر ابوطالب کی معیت میں شام کی طرف ہوئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابوطالب کوئی امیر آدمی نہ تھے، بمشکل اپنا کنبہ پالتے تھے۔ وہ ٹانگ سے معذور بھی تھے اس لیے تجارتی سفروں پر جانا ان کے لیے مشکل تھا۔ ان کا ذریعہ معاش عطر فروشی تھا یا کبھی کبھی وہ مقامی طور پر غلے کی تجارت کرلیا کرتے تھے[2]۔ لہٰذا ان کی ہمراہی میں بارہ تیرہ سال کے بھتیجے کا اتنے طویل سفروں پر جانا ناقابل فہم ہے۔ البتہ حضورؐ زبیر کی کفالت میں تھے اور وہ ایک معروف تاجر تھے جو مختلف اطراف میں تجارتی سفر کیا کرتے، لہٰذا جب حضورؐ کی عمر سفر کے قابل ہوئی ہوگی تو آپ ان کے ہمراہ شام، یمن، بحرین وغیرہ کو گئے ہوں گے۔ ابن کثیر کی روایت کے مطابق آپ چودہ برس کی عمر میں یمن گئے۔ ابتدا میں آپ کا سفر محض تعاون وتناصر کے لیے رہا ہوگا۔ بعد میں جیسے جیسے آپ کو کوئی تجارتی قافلہ مل جاتا ہوگا آپ سامان تجارت لے کر اس کے ہمرکاب ہوجاتے ہوں گے۔ سیرت کی کتابوں میں اگرچہ شام اور یمن کے سفروں ہی کا ذکر ملتا ہے لیکن احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ملک عرب کے بہت سے علاقوں کو دیکھ رکھا تھا اور ان کے بارے میں آپ کی معلومات سنی سنائی نہیں تھیں بلکہ چشم دید تھیں۔ حتیٰ کہ صحابہ کرام کو تعجب ہوتا تھا کہ آپ ملک کے بعید گوشوں کے بارے میں ایسی معلومات رکھتے ہیں جو صرف ان علاقوں کے اصل باشندوں ہی کو حاصل ہیں۔ اس لیے امکان اس بات کا ہے کہ حضورؐ کے تجارتی سفر اس سے کہیں زیادہ رہے ہوں گے جتنے کہ کتابوں میں مذکور ہوئے ہیں۔

تجارت کی ابتدائی تربیت کے بعد جب حضورؐ نے اپنے طور پر تجارت شروع کی تو مضاربت کے اصول پر دوسرے کے سرمایہ کے ساتھ اپنی محنت شامل کرکے کی۔ آپ قافلوں کے ساتھ شہر کے تاجروں کا مال لے کر دوسری

منڈیوں میں جاتے اور مال بیچ کر منافع میں سے اپنا حصہ وصول کر لیتے۔ اس کام میں آپ کو معاملہ فہمی، صداقت، امانت اور دیانت کے باعث اتنی شہرت ملی کہ مکہ میں آپ کو صادق اور امین کہا جانے لگا۔ آپ پر اعتماد کر کے کسی کو پشیمانی نہ ہوتی۔ آپ پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ ہر معاملہ طے کرتے۔ اس کی شہادت طویل عرصہ بعد ایک صحابی سائب بن صیفی بن عائذ مخزومی نے دی۔ وہ مسلمان ہوئے تو لوگوں نے ان کی تعریف و تعارف میں کچھ باتیں کہیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ میں ان کو آپ لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں کیونکہ یہ ایک زمانہ میں میرے شریک تجارت رہے ہیں۔ سائب نے کہا کہ بلاشبہ آپ نے معاملہ ہمیشہ صاف رکھا۔ یہی شہادت قیس بن سائب مخزومی نے بھی دی۔ سائبؓ حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر عتیق بن عائذ مخزومی کے حقیقی بھتیجے تھے۔

رشتہ ازدواج:

زبیر بن عبدالمطلب کے انتقال کے بعد حضورؐ کو اپنا گھر بسانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۲ یا ۲۳ برس کی تھی۔ آپ نے ابوطالب سے ان کی بیٹی ام ہانی ہند کا رشتہ مانگا۔ اس کے ساتھ ہی ہند کے لیے دوسرا پیغام ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی کا آیا، جو ابوجہل کے خاندان سے تھا۔ ابوطالب نے دوسرے رشتہ کو ترجیح دی۔ حضورؐ نے جب اس کا شکوہ کیا کہ آپ نے اپنے حقیقی بھتیجے کے مقابلہ میں بنو مخزوم کے ایک نوجوان کو دامادی کے لیے منتخب کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ معزز شرفاء کے کفو (ہم مرتبہ) معزز شرفاء ہی ہوتے ہیں[8]۔

مطلب یہ کہ حضورؐ کی یتیمی اور مالی اعتبار سے بہت اچھی حالت نہ ہونا اس رشتہ میں رکاوٹ بن گیا۔ ابوطالب نے زورآور اور بااثر خاندان میں ام ہانی کا رشتہ کر دیا۔ اس کا شوہر ھبیرہ عمر بھر رسول اللہ ﷺ کا دشمن رہا اور آخر دم تک اسلام قبول نہ کیا۔ فتح مکہ کے بعد اس نے اپنے گھر سے فرار ہونے کو ترجیح دی اور ساحل سمندر کی طرف کہیں نکل گیا۔

حضورؐ کی عمر جب ۲۵ برس ہوئی تو آپ کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے اسباب پیدا ہو گئے۔ خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزی بن قصی قریش کے خانوادہ بنو اسد کی ایک معزز خاتون تھیں۔ ان کا پہلا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا جس سے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کے بعد دوسرا نکاح ابوہالہ ہند بن نباش تمیمی سے ہوا۔ اس سے تین بیٹے ہالہ، طاہر اور ہند پیدا ہوئے جو صحابی ہیں[9]۔

خدیجہؓ اپنا سرمایہ تجارت میں لگایا کرتی تھیں۔کوئی بھی قافلہ شام یا یمن جانے والا ہوتا تو وہ کسی تاجر کو سرمایہ فراہم کرتیں۔ جب وہ واپس آتا تو منافع میں اپنا حصہ وصول کر لیتیں۔ چونکہ حضورؐ کا ذریعہ معاش بھی تجارت تھی، خدیجہ نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان کا مال لے کر منڈیوں میں جائیں اور منافع میں سے اپنا حصہ وصول کر لیں۔ آنحضرتؐ نے خدیجہ کے سرمایہ سے جو کاروبار کیا اس میں آپ کے حسن معاملت کے باعث منافع کی شرح پہلے کے مقابلہ میں بہت اچھی اور خدیجہ کی توقع سے بڑھ کر رہی اور وہ اس سے بے حد مطمئن ہوئیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ واقعہ صرف ایک بار پیش نہ آیا ہو بلکہ حضورؐ کئی بار خدیجہ کا مال لے کر گئے ہوں۔ ایک سفر میں خدیجہ نے اپنا غلام میسرہ بھی حضورؐ کے ہمراہ بھیجا جس نے واپسی پر حضورؐ کے اعلیٰ اخلاق اور عمدہ عادات و خصائل کی تعریف کی۔ روایات کے مطابق وہ اس رپورٹ سے اتنی متاثر ہوئیں کہ انہوں نے حضورؐ کو اپنا رفیق حیات بنانے کا عزم کر لیا اور سلسلہ جنبانی کے لیے اپنے اعتماد کی ایک خاتون نفیسہ کو آپ کے پاس بھیجا تو آپ نے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔

سیرت نگاروں کے بیان سے یہ تاثر ملتا ہے جیسے خدیجہ کوئی اجنبی خاتون ہوں، حضورؐ کی شہرت سن کر آپ کو تجارت کے لیے بھیجا ہو اور اپنے غلام میسرہ کی شہادت پر انحصار کر کے پیغام نکاح دیا ہو۔ حالانکہ یہ بات نہیں۔ قریش کے مختلف خانوادوں کے مابین رشتے ہوتے رہتے تھے اور باہم آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ حضورؐ کی پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب خدیجہ کی بھاوج تھیں۔ان کی شادی عوام بن خویلد سے ہوئی تھی۔ اس لیے یہ رشتہ دیکھا بھالا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کی تحریک صفیہ کی جانب سے ہوئی ہو جس کو خدیجہ نے قبول کر لیا ہو اور پھر حضورؐ سے بات کرنے کے لیے نفیسہ کو بھیجا ہو۔ نکاح ہوا تو خدیجہ کے ولی عمرو بن اسد تھے کیونکہ خویلد بن اسد کا پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ ابو طالب نے خطبہ نکاح پڑھا۔ اس موقع پر حضورؐ کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب بھی موجود تھے۔

سیرت نگاروں کے عمومی بیان کے مطابق نکاح کے وقت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال تھی۔لیکن اس پر اتفاق نہیں ہے۔ ابن کثیر نے اسے ۳۵ سال اور بقول بعض ۲۵ برس بتایا ہے۔ خدیجہ کی وفات کے وقت انہوں نے ان کی عمر ۵۰ برس بتائی ہے اور اسے صحیح ترین قول قرار دیا ہے۔ ۵۰ سال کے حساب سے نکاح کے وقت یہ عمر ۲۵ سال نکلتی ہے۔ اس کے حق میں ابن کثیر نے بیہقی کی روایات کا حوالہ دیا ہے۔ڈاکٹر حمید اللہ نے عمر بوقت نکاح ۲۸ برس بتائی ہے[۱۰]۔ ۴۰ برس کی روایت کے مقابلہ میں ۲۵ یا ۲۸ برس کی روایت درست معلوم ہوتی ہے۔ عرب میں بلوغت کے

جلد بعد لڑکیوں کی شادی کر دینے کا رواج تھا، جیسا کہ خود حضورؐ کی اولادوں کے معاملہ میں اور حضرت عائشہؓ کے نکاح کے معاملہ میں ہوا۔ تین بچوں کی پیدائش کے بعد شوہر کے وفات پانے کی صورت میں کوئی شریف خاتون ۴۰ سال کی عمر تک بلا نکاح بیٹھی نہیں رہتی تھی۔ کثرت ازواج کے اس معاشرہ میں بہت جلد رشتے مل جاتے تھے۔ عورتوں کے مطلقہ یا بیوہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام میں بلا امتیاز مطلقہ یا غیر مطلقہ بکثرت شادیاں ہوتی تھیں۔

علاوہ ازیں یہ بات ثابت ہے کہ حضورؐ کی خدیجہ سے اولاد دو بیٹوں اور چار بیٹیوں پر مشتمل تھی۔ چھ بچوں کی پیدائش کا لحاظ رکھا جائے تو ۲۵ یا ۲۸ برس کی عمر ہی قرین قیاس نظر آتی ہے۔ ۴۰ برس کی عمر کے بعد عورت کی بچہ جننے کی صلاحیت بہت محدود ہوتی ہے۔ قاضی سلیمان کی تحقیق کے مطابق حضور کے چھوٹے بیٹے عبداللہ کی ولادت بعثت کے بعد ہوئی تھی۔ بوقت نکاح ۴۰ برس کی عمر مانی جائے تو گویا عبداللہ کی ولادت ۵۶ سال کی عمر میں ہوئی جو طبی نقطۂ نظر سے قابل فہم نہیں۔ ہمارے نزدیک بیہقی کی روایت اور ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے درست ہے۔

روایات کے مطابق نکاح کے بعد حضورؐ نے اپنے والد عبداللہ کی لونڈی ام ایمن کو آزاد کر دیا اور خدیجہ نے اپنا غلام زید بن حارثہ حضورؐ کو دے دیا جس کو حضورؐ نے آزاد کر کے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ یہ زید بن حارثہ اب زید بن محمد کہلانے لگے۔ حضورؐ ان کے ساتھ بڑی شفقت کا معاملہ فرماتے۔ زید کوئی نسلی غلام نہ تھے بلکہ قبیلہ بنو کلب کے فرزند تھے۔ ان کو بچپن میں گرفتار کر کے غلام بنا کر مکہ میں بیچ دیا گیا۔ ان کے اعزہ کو کسی نے خبر دی کہ زید مکہ میں بنو ہاشم میں ہیں۔ زید کے والد اور دوسرے عزیز بچے کو حاصل کرنے کے لیے مکہ پہنچے۔ حضورؐ نے ان سے کہا کہ بچہ اگر جانا چاہے تو میں اس کے جانے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کروں گا۔ جب زید سے پوچھا گیا تو انہوں نے حضورؐ کے سایۂ عاطفت میں رہنے کو ترجیح دی اور اعزہ کو واپس بھیج دیا۔

تعمیر کعبہ:

حضورؐ کی عمر جب ۳۵ برس تھی تو سیلابوں نے بیت اللہ کی عمارت کو نقصان پہنچایا۔ قریش نے فیصلہ کیا کہ عمارت کو از سر نو تعمیر کیا جائے۔ سیلابوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی کرسی بلند کر دی جائے۔ پہلی عمارت چھت کے بغیر تھی اور دیواریں زیادہ اونچی نہ تھیں۔ اب طے ہوا کہ بیت اللہ کو بلند کر کے مسقف کر دیا جائے۔ قریش نے

یہ فیصلہ بھی کیا کہ تعمیر نو کے اس کام میں تمام خانوادے شرکت کریں اور اپنی حلال کمائی میں سے حصہ ڈالیں۔ اس میں کسی ایسے مال کی آمیزش نہ ہو جو حق تلفی یا ظلم سے حاصل کیا گیا ہو۔ جب یہ منصوبہ تیار ہوا تو اتفاق سے کوئی غیر ملکی جہاز، جس پر تعمیراتی سامان لدا ہوا تھا، جدہ کے ساحل پر ریت میں دھنس گیا۔ اس کو نکال کر واپس گہرے پانیوں میں لے جانے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو جہاز والوں نے سامان سے نجات حاصل کرنا چاہی۔ قریش کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے لکڑی اور دوسرا ضروری سامان خرید لیا اور مکہ لے آئے۔ پرانی عمارت کے انہدام کا کام قریش کے مختلف خانوادوں پر تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے بعد ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر شروع ہوئی۔ جب دیواریں چند فٹ بلند ہو گئیں تو حجر اسود کے نصب کرنے کا مرحلہ آیا۔ ہر قبیلہ کی خواہش تھی کہ یہ شرف اس کو حاصل ہو، لیکن ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ جھگڑا بڑھا تو اس کو نمٹانے کے لیے کئی تجاویز پیش ہوئیں لیکن وہ کسی بھی خانوادے کو مطمئن نہ کر سکیں۔ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اس مسئلہ پر تلواریں نیاموں سے نہ نکل آئیں۔ اتنے میں قریش کے ایک بزرگ ابوامیہ بن مغیرہ نے تجویز پیش کی کہ معاملہ کو خدا پر چھوڑ دیا جائے اور مسجد حرام کے باب بنوشیبہ سے جو قریشی سب سے پہلے داخل ہو اس کو ثالث مان کر فیصلہ اس پر چھوڑ دیا جائے اور تمام لوگ اس کو قبول کریں۔ لوگوں نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور سب کی نگاہیں باب بنوشیبہ پر لگ گئیں۔ اس دروازے سے جو پہلا شخص مسجد میں داخل ہوا وہ حضرت محمدؐ تھے جن کو سب لوگ صادق اور امین کہتے اور ان پر اعتماد کرتے تھے۔ آپ کو دیکھتے ہی سب لوگوں کے چہروں پر مسرت و اطمینان کی لہر دوڑ گئی کہ اب یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے طے ہو جائے گا۔

حضورؐ نے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد ایک چادر بچھائی۔ اس کے وسط میں حجر اسود رکھا اور قریش کے تمام خانوادوں کے سرداروں کو ہدایت کی کہ وہ چادر کو چاروں طرف سے تھام کر اونچا کریں۔ آپ خود دیوار پر چڑھ گئے۔ چادر اونچی کی گئی تو آپ نے حجر اسود کو اٹھا کر اس کے مقام پر نصب کر دیا۔ اس طرح ایک ایسا مسئلہ جس نے سنگین صورت اختیار کر لی تھی، حضورؐ کی دانش مندی سے بخوبی حل ہو گیا۔

ابراہیمی تعمیر میں کعبہ کی جنوبی دیوار میں دو کونے تھے اور شمالی دیوار نصف دائرہ کی شکل میں تھی۔ قریش کے پاس جمع شدہ رقم اس پوری تعمیر کے لیے ناکافی تھی۔ لہٰذا شمالی دیوار کو بنیادیں بھر کر چھوڑ دیا گیا۔ باقی چوکور حصہ کو مسقف کر کے ایک کمرہ کی شکل دے دی گئی۔ اس کا دروازہ فرش کی کرسی کے برابر بلند کر دیا گیا۔ وہ نیم دائرہ حصہ جو

چھوڑ دیا گیا تھا آج تک غیر مسقف ہے۔ اس کو حطیم کہتے ہیں۔ زائرین بیت اللہ آج بھی اس حصہ میں نوافل ادا کر کے خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کے احساس سے شاد کام ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ صحیح مسلم۔ کتاب الفضائل۔ باب فضل نسب النبیؐ۔ عیسی البابی الحلبی مصر ج ۲، ص ۳۱۰
۲۔ رحمۃ اللعالمین۔ قاضی سلیمان منصور پوری، ج ۲، ص ۱۶
۳۔ الطبقات الکبری، محمد بن سعد۔ ج ۱، ص ۷۶
۴۔ انساب الاشراف۔ بلاذری، ج ۱،
۵۔ الاستیعاب۔ ابن عبدالبر۔ ج ۲، ص ۴۲۳
۶۔ الطبقات الکبری۔ محمد بن سعد۔ ج ۱، ص ۸۶
۷۔ المعارف۔ باب صناعات الاشراف۔ ابن قتیبہ، ص ۲۴۹
۸۔ الطبقات الکبری۔ محمد بن سعد۔ ج ۶، ص ۱۱۲
۹۔ رحمۃ اللعالمین۔ قاضی سلیمان، ج ۲، ص ۱۷۳۔۱۷۶
۱۰۔ رسول اکرم کی سیاسی زندگی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ص ۶۵

باب 8

کارِ رسالت کے لیے تربیت

نبوت ورسالت کا منصب اپنے ساتھ بہت بڑی ذمہ داریاں لاتا ہے لہذا جس شخص کو اللہ تعالیٰ یہ منصب عطا کرنا چاہتا ہے، اس کی پیدائش ہی سے اس کی خاص تربیت فرماتا ہے۔ نبی کا کام لوگوں کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے تقاضوں سے آگاہ کرنا، احکام الٰہی کی یاددہانی کرنا اور جو ہدایات وحی سے ملیں ان سے اپنے مخاطبوں کو باخبر کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ لوگوں کے لیے نبی کی دعوت ان کے مفادات پر ضرب لگانے والی ہوتی ہے اس لیے اس سے مخاطبین بالعموم اور طبقۂ خواص بالخصوص بدکتے اور بالآخر اس کے مخالف بن کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اگر نبی نے مشکل حالات کا خود سامنا نہ کیا ہو اور لوگوں کی زیادتیوں سے اسے واسطہ نہ پڑا ہو، نیز وہ انسانوں کی نفسیات سے آگاہ نہ ہو تو کارِ نبوت کے ادا کرنے میں اسے مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ لہذا اس کی تربیت میں اس طرح کے عناصر شامل کر دیے جاتے ہیں جن سے واقف ہو کر وہ عملی زندگی میں اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکے۔ یہ تربیت اللہ کریم کی براہ راست نگرانی میں ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ہونے والے نبی کو خاص امداد فراہم کرتا اور اس کو مشکلات سے نکالنے کے لیے غیر معمولی انتظامات بروئے کار لاتا ہے۔

مصر کا حکمران فرعون ایک بے حد ظالم اور سفاک حکمران تھا جو اپنے آپ کو رب اعلیٰ کے طور پر لوگوں سے منواتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کے سامنے تبلیغ دین پر مامور کرنے کا فیصلہ ہوا تو انتہائی دشوار اور سنگین حالات میں ان کو پیدا کیا گیا۔ یہاں تک کہ موسیٰؑ کے خاندان کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالنے کا حکم اس وقت مملکت مصر میں نافذ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ ایک ٹوکری کے سوراخ بند کر کے اپنے نومولود بچے کو اس میں ڈال کر دریا میں بہا دے۔ پھر دیکھے کہ پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ ٹوکری دریا میں بہتی ہوئی فرعون کے محل کے قریب ہوئی تو فرعون کی بے اولاد بیوی کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے ٹوکری پانی سے نکلوائی تو اس میں ایک من موہنا بچہ دیکھ کر مچل گئی کہ وہ اس کو بیٹا بنا کر خود پالے گی۔ اس طرح موسیٰؑ کو فرعون کے

دربار میں اور ملک کے صفِ اول کے لوگوں کے درمیان پرورش پانے، ان کے طور طریقے سمجھنے اور ان کی نفسیات سے آگاہی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان کو مصر کے قبطی باشندوں اور بنی اسرائیل کے قبائل، جو کنعان سے آ کر مصر میں آباد ہو چکے تھے، کے درمیان کی آویزش، اسرائیلیوں کی مظلومیت اور بے بسی، اور مصریوں کے ظلم و تشدد کو دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ ایک مرتبہ شہر کو نکل گئے تو ایک مصری کو ایک کنعانی پر تشدد کرتے دیکھا۔ انہوں نے کنعانی کو چھڑانے کی خاطر مصری کو گھونسا مارا تو وہ غیر ارادی طور پر جسم کی کسی ایسی جگہ لگا جس سے وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ موسیٰؑ اس خلافِ توقع صورتِ حال پر سخت نادم ہوئے۔ اللہ سے معافی مانگی اور اپنے ایک خیر خواہ مصری درباری کے مشورہ سے شہر سے نکل گئے۔ طویل سفر کے بعد وہ مدین پہنچے جہاں ان کو ٹھکانہ نصیب ہوا۔ انہوں نے وہاں رہ کر بکریوں کے ریوڑ چرائے اور ان کے مالک کی صحبت سے نیکی کی تبلیغ کا فن سیکھا۔ یہ تمام تجربات ایسے تھے جنہوں نے ان کی شخصیت میں نکھار اور طبیعت میں ٹھیراؤ پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس تربیت میں سے گزار چکا تو انہیں پیغمبری عطا کی، فرعون کے دربار میں جا کر دین کی تبلیغ کا حکم دیا اور انہیں اپنے اس فضل سے بھی آگاہ فرمایا کہ میں نے اپنی دعوت کے لیے تمہاری خاص تربیت کی۔ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ. (طٰهٰ ۲۰:۴۱)

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے لڑکپن ہی سے اپنے سوتیلے بھائیوں کی زیادتیوں کا نشانہ بنے، جس سے ان کو تحمل و برداشت کی تربیت ملی۔ بھائیوں نے ان سے چھٹکارا پانے کے لیے ان کو اندھے کنویں میں ڈال دیا تو اللہ نے ان کی حفاظت فرمائی اور ان کو مصر کے ایک رئیس کی غلامی میں دے دیا۔ وہاں انہیں مالک کی جاگیر کی نگرانی، کاشت کاری کے طور طریقوں اور غلے کی برداشت اور ذخیرہ کی تربیت ملی۔ وہ غلامی کے مسائل سے دوچار ہوئے۔ انہیں بے گناہ قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ اس طرح انہیں زندگی کے معاملات کے تجربہ، تقویٰ اور صبر و استقامت کی تربیت میسر آئی جس کو وہ آئندہ زندگی میں، جب وہ قید خانے سے سرخرو ہو کر نکلے، بروئے کار لائے۔

حضور ﷺ کی یتیمی:

ہمارے رسولِ اکرم حضرت محمد ﷺ کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کی اسی سنت کے تحت معاملہ ہوا۔ وہ پیدا ہوئے تو والد کے وفات پا جانے کے باعث ان کے سایۂ عاطفت سے محروم تھے۔ عرب سوسائٹی میں یتیم بچوں سے ہر زیادتی روا رکھی جاتی تھی۔ وہ بے آسرا اور بے سہارا ہوتے، طاقتور رشتہ داران کے حصہ کی جائداد ہڑپ کر جاتے یا حیلے بہانوں سے ہتھیا لیتے، لہٰذا غربت اور تنگدستی ان کا مقدر بن جاتی۔

حضور کو بچپن میں یتیمی کے باعث جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کی تفصیل سے سیرت نگار واقف نہیں ہو

سکے۔ تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی بڑی پر مشقت تھی۔ قریش کے رواج کے مطابق حضورؐ کی والدہ نے کسی دایہ سے بچے کو دودھ پلوانے کے لیے جب بنی سعد کی عورتوں سے معاملہ کرنے کی کوشش کی تو وہ حضورؐ کے ایک یتیم بچہ ہونے کے باعث دودھ پلانے پر راضی نہ ہوئیں۔ بالآخر ایک غریب دایہ حلیمہ نے آپ کو قبول کر لیا۔

صحرا میں چند سال گزارنے کے بعد آپ کو واپس مکہ لایا گیا تو آپ کو اپنی والدہ آمنہ کی آغوش محبت ملی۔ لیکن یہ سکون کا عرصہ نہایت مختصر ثابت ہوا۔ والدہ آپ کو یثرب لے گئیں تو مکہ کو لوٹتے ہوئے ابوا کے مقام پر حضورؐ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور آپ کو دوہری یتیمی کے صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ماں زندہ رہتیں تو آپ کی پرورش، نشوونما اور معاشرہ میں آپ کو مقام دلوانے کی تدبیریں کرتیں۔ اب یہ سہارا بھی باقی نہ رہا۔ اب دادا عبدالمطلب حضورؐ کے سر پر دست شفقت رکھنے لگے۔ یہ صورت حال دو برس ہی قائم رہ سکی اور جب حضورؐ کی عمر آٹھ سال تھی تو دادا کا انتقال ہو گیا۔ اب حضورؐ بنو ہاشم خاندان کا ایک فرد ہونے کے باعث قبیلہ کی عمومی تولیت میں ضرور تھے لیکن آپ کو زندگی کی جدوجہد میں بہر حال خود ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تھا۔ آپ کے والد کا انتقال عین جوانی میں ہوا تھا اور انہوں نے کوئی قابل ذکر ترکہ نہیں چھوڑا تھا۔ شاید یہی وہ زمانہ ہے جس کے بارے میں دوسرے رسولوں کے بکریاں چرانے کے حوالہ سے آپ نے فرمایا کہ میں بھی مکہ میں خاندان کی بکریاں چراتا رہا ہوں۔

ایک چرواہا بڑے انہماک سے اپنے ریوڑ کی ہر بکری اور ہر بھیڑ پر نظر رکھتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھیڑ یا بکری بیمار ہو، چل نہ سکتی ہو یا چر نہ رہی ہو تو وہ چرواہے کی توجہ کی خاص طور پر مستحق ہوتی ہے اور وہ اس کی خصوصی دیکھ بھال کرنے لگتا ہے۔ کوئی بکری ریوڑ سے الگ ہو جائے تو وہ اس کو ڈھونڈتا اور گھیر گھار کر واپس ریوڑ میں شامل کرتا ہے۔ اگر چراگاہ کے اردگرد بھیڑیے پائے جاتے ہوں اور وہ ریوڑ پر حملہ آور ہوتے ہوں تو وہ چرواہا ان کو بھگانے کے لیے مناسب سروسامان اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ طرز عمل آدمی کے کردار کی بھی تعمیر کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کے منصب پر فائز ہونے والوں کو گلہ بانی سے اس لیے وابستہ کرتا رہا کہ وہ آگے چل کر اپنے صاحب ایمان ساتھیوں کی دیکھ بھال کرنے اور ان کو شیاطین کے حملوں سے بچانے کی تربیت حاصل کر لیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد بھی فرمایا کہ:

''تم میں سے ہر شخص ایک چرواہا ہے اور اس سے اس کے گلے کے بارے میں باز پرس ہوگی[1]''

اسی تربیت کے باعث حضورؐ اپنے صحابہ سے فرداً فرداً رابطہ رکھتے، ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے، ان کی خوشیوں پر ان کو مبارک باد دیتے اور حسب حال ان کی تربیت فرماتے۔

کسب معاش:

نبی علیہ کی عمر جب معاشی جدوجہد میں باقاعدہ حصہ لینے کی ہوئی تو دوسرے قریشی نوجوانوں کی طرح آپ بھی تجارتی سفروں پر جانے لگے۔ ان تجارتی سفروں سے آپ کو ممالک کے دیکھنے، وہاں کے باشندوں کے طور طریقے جاننے اور تجارت و معاملت کے انداز سیکھنے کا موقع ملا۔ یہ تربیت، جس کا موقع حضورؐ کی نوعمری ہی میں پیدا ہو گیا، بڑی قدر و قیمت کی چیز ہے۔ اس میں حضورؐ کو ملک کے بیشتر حصوں کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل ہوئیں۔ پھر مختلف علاقوں کے لوگوں کے مزاج، کردار، نفسیات اور رسوم و رواج کا علم ہوا اور ان سے بات چیت کرنے اور معاملات طے کرنے کا تجربہ حاصل ہوا۔ یہ تربیت اس وقت آپ کے کام آئی جب آپ اللہ کے دین کی دعوت پھیلانے پر مامور ہوئے اور اس سلسلہ میں افراد اور وفود کے ساتھ آپ کے مذاکرات ہونے لگے۔

حمایت مظلوم:

اپنے لڑکپن ہی میں حضورؐ کو اچھے لوگوں کے ساتھ نشست و برخاست کا موقع ملا۔ معاشرہ کے اندر صالح نوجوان آپ کے دوست تھے۔ بڑوں میں بھی اعلیٰ کردار کے مالک لوگوں کے مشوروں اور منصوبوں میں شریک ہونے کا آپ کو موقع ملا۔ جب آپ صرف بیس برس کے تھے تو ان اکابر کے اس حلف میں شریک ہوئے جس کا نام 'حلف الفضول' ہے۔ حمایت مظلوم کے لیے قائم اس سوسائٹی کا معاشرے پر نہایت اچھا اثر پڑا اور رحم دلی اور غریبوں کی دادرسی کا چلن عام ہوا۔ حضورؐ نے اعلیٰ مقاصد کے لیے قائم اس سوسائٹی سے جو تربیت پائی اور اس کے لیے جو خدمات سرانجام دیں، آپ بعد کی زندگی میں بھی ان کا تذکرہ کر کے مسرت حاصل کرتے۔

نبی کی تربیت کے لیے جہاں اللہ تعالیٰ اس کو سخت حالات میں سے گزارتا ہے وہیں اپنی غیر معمولی شانیں بھی ظاہر کرتا ہے جن کی بدولت نبی پر کوئی آنچ نہیں آنے پاتی۔ فرعون کی ظالمانہ پالیسیاں اور قتل کی اسکیمیں حضرت موسیٰؑ کا بال بیکا نہ کر سکیں۔ اسی طرح باپ اور ماں دونوں کی شفقت سے محروم ہونے کے باوجود حضورؐ کے دادا عبدالمطلب، تایا زبیر اور ابوطالب نے آپ سے محبت کا رویہ رکھا اور سہارا دیا۔ یتیم بچوں کو معاشرہ بالعموم اٹھنے میں مدد نہیں دیتا۔ کسب معاش میں ان کو غیر معمولی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن حضورؐ کے لیے کسب معاش کی راہیں کھلتی اور آسانیاں پیدا ہوتی گئیں، اگرچہ آپ کو اصل دولت اس غنا کی حاصل تھی جس کا تعلق دل کے احوال سے ہوتا ہے، محض مادی وسائل سے نہیں ہوتا۔ انہی انعامات کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن نے ایک موقع پر حضور کو

مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَاٰوٰى .... وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى. (الضحیٰ ۹۳:۶۔۸)

کیا اس نے تجھے یتیم نہ پایا تو اس نے ٹھکانا دیا.......... اور کیا اس نے تمہیں محتاج نہ پایا تو غنی کر دیا

مقصد یہ تھا کہ آپ ان انعامات کو یاد رکھیں اور ان کے شکریہ کے طور پر ایسا رویہ اختیار کریں کہ جس سے یتیموں کو سرپرستی حاصل ہو، غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی خیر خواہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ کی زندگی میں کمزوروں سے مواسات اور ہمدردی، غلاموں کی آزادی کی تدابیر اور یتیموں سے محبت نہایت نمایاں نظر آتی ہے۔

دینی رجحان:

نبیوں کی تربیت کا ایک پہلو یہ بھی رہا کہ وہ جس ماحول میں تبلیغ کے لیے مبعوث کیے جانے والے ہوتے اللہ تعالیٰ ان کو اس سے پوری طرح آگاہ کرنے کا سامان کر دیتا۔ وہ اپنے مخاطبوں کے عقائد، محبوبات، کردار کے اچھے اور برے پہلوؤں اور اخلاقی کمزوریوں سے بخوبی آشنا ہوتے۔ وہ لوگوں کے انداز فکر اور نفسیات کو بھی خوب سمجھتے۔ مثال کے طور پر حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم تجارت پیشہ تھی تو وہ خود بھی اسی پیشہ سے منسلک اور کاروبار میں لوگوں کی بددیانتیوں اور زیادتیوں سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول مبعوث ہونے کے بعد جب انہوں نے اپنی قوم کی پیشہ ورانہ بددیانتیوں کو بے نقاب کر کے ان کو بھلائی کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دی تو ان کی قوم نے ان کو یہ طعنہ دیا کہ تم ہمارے کاروبار پر اخلاقی قیدیں لگا کر خود اپنی تجارت چمکانا چاہتے ہو۔ قوم حضرت شعیبؑ کی معاملہ فہمی اور کاروباری بصیرت سے آگاہ تھی۔ اس لیے لوگ ان سے کہتے کہ ہم تو یہ توقع رکھتے تھے کہ تم اپنے تجربہ و بصیرت سے اپنی پوری قوم کو فائدہ پہنچاؤ گے لیکن تم تو ہمیں خود اپنے مالوں میں مرضی کا تصرف کرنے سے بھی روکتے ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس خانوادے میں پیدا کیا گیا جو بتوں کا پجاری ہی نہیں بلکہ بت گر اور بت خانوں کا منتظم بھی تھا۔ اس ماحول میں پرورش پا کر سیدنا ابراہیمؑ بتوں کے لیے قوم کی عقیدت مندیوں اور مشرکانہ عقائد کے ہر ہر پہلو سے واقف ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے بعثت کے بعد جب قوم کو توحید کی دعوت دی تو ایک مرحلہ میں بت خانہ میں اپنی رسائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم کو سبق سکھانے کے لیے انہوں نے ان کے بتوں کو توڑ ڈالا اور ان کو ان کے غلط موقف کا عملی ثبوت پیش کر دیا۔

حضورؐ کی بعثت چونکہ بنی اسماعیل میں ہونے والی تھی اور آپ نے ملت ابراہیم کو از سر نو زندہ کرنا تھا لہذا

آپ کو بنو اسماعیل کی مرکزی بستی مکہ میں ان کے معزز اور حکمران خانوادے قریش میں پیدا کیا گیا۔ آپ نے اپنی قوم کے بتوں پر انحصار اور ان کی عقیدتوں کے مراجع سے پوری واقفیت حاصل کر لی۔ آپ ملت ابراہیم میں کی گئی خیانتوں پر مطلع ہو گئے۔ مکہ میں پورے عرب سے اکٹھے ہونے والے تمام قبائل کے بارے میں آپ کی معلومات میں بے حد اضافہ ہو گیا جس سے آپ نے نبوت پانے کے بعد بھرپور فائدہ اٹھایا۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ جب قوم پر اتمام حجت کے طور پر حضرت ابراہیمؑ نے بت توڑنے کی کارروائی کی تو قوم نے ان کو سزا دینے کے لیے آگ کا الاؤ تیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس آگ سے محفوظ رکھا اور ان کو ہجرت کا حکم دیا۔ اس موقع پر جاتے جاتے حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم اور اس کے شرک سے برملا اظہار بیزاری کیا۔ یہ اعلان اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ اس کو 'کلمة باقية في عقبه' یعنی ان کی نسل میں ایک پائیدار اور باقی رہنے والی روایت کے طور پر زندہ رکھا۔ اچھے اسلاف اپنے اخلاف کو یہ روایت منتقل کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ امتداد زمانہ کے باوجود اور اس حقیقت کے باوصف کہ بنی اسماعیل میں شرک سرایت کر چکا تھا، ایک گروہ دین حنفی کا پیرو، اپنے جد امجد کی دعوت توحید کا حامل اور ان کی شرک بیزاری کی روایت کا امین رہا۔ یہی وہ گروہ تھا جو زمانہ جاہلیت میں 'حنیف' کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔ یہ لوگ بیت اللہ اور اس کے پاس کی جانے والی عبادات کے شیدائی تھے اور ان میں روا رکھی جانے والی بدعات کو ہدف تنقید بناتے تھے۔ دین ابراہیم کی جو روایت اپنی اصل شکل میں ان کے علم میں آتی اس پر کاربند ہوتے۔ ان میں امانت و دیانت، عفت و پاکیزگی، غریبوں سے ہمدردی، ہر خیر میں تعاون اور ہر شر سے اجتناب کی صفات موجود تھیں۔ حضورؐ نزول وحی سے قبل اسی حنیف گروہ کے ایک نمایاں فرد تھے۔ آپ قوم کی مشرکانہ عبادات اور قبیح سرگرمیوں میں ہرگز حصہ نہ لیتے۔ سچائی، امانت اور دیانت آپ کا شیوہ تھا۔ اس اعتبار سے قوم آپ کی قدردان تھی۔

حقیقت کی جستجو:

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کی رہنمائی کا اولین ذریعہ اس کی اپنی فطرت کی آواز ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جن شخصیات کو منصب نبوت کے لیے چن لیتا ہے وہ آغاز ہی سے فطرت سلیم کی روشنی سے بہرہ ور ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی وحدانیت اور آخرت پر اجمالی ایمان رکھنے کے علاوہ اس نیک و بد اور حلال و حرام سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں جس کی تعلیم فطرت کے اندر مرتسم کر دی گئی ہے۔ اس کے باوجود ان کے اندر ایسی آتش شوق فروزاں ہوتی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ حقیقت واشگاف انداز میں ان کے سامنے آئے، وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اس کو اپنائیں اور اس کو

اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔ سورہ ہود میں بیان ہوا ہے کہ حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہما السلام دونوں نے اپنی قوموں کو بتایا کہ ہم رسول بنائے جانے سے پہلے بھی ایک 'بینہ' (واضح دلیل) پر تھے، یعنی پاکیزہ فطرت نے ہمیں اپنے رب کی راہ پر ڈال دیا تھا اور دل پکار پکار کر کہتا تھا کہ یہی حق ہے۔ اسی واضح دلیل کی بنا پر ہم کفر و شرک کو غلط قرار دیتے رہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی جانب سے وحی کے رزق حسن سے بہرہ مند کیا تو فطرت کی آواز اور زیادہ بلند آہنگ ہوگئی۔ وحی کی تعلیم نے اس کو مدلل اور روشن تر کر دیا۔ یہ فطرت کے نور پر وحی کے حقیقی نور کا اضافہ تھا۔

یہی بات حضورؐ کے بارے میں بھی درست ہے۔ آپ کی زندگی فطرت سلیم پر گزری۔ شرک کے مرکز میں رہنے کے باوجود شرک کی پرچھائیں بھی آپ پر نہ پڑیں۔ مکہ کے 'حنفاء' کے بارے میں روایات میں آیا ہے کہ وہ خانہ کعبہ کی دیوار سے لگ کر رب سے یہ دعا کیا کرتے کہ اے رب، ہمیں معلوم نہیں کہ تیری عبادت کیسے کی جاتی ہے۔ اگر ہمیں اس کی خبر ہوتی تو ہم اسی طریقہ پر تجھے پوجتے۔ حیرانی اور سرگشتگی کی اس کیفیت سے حضور بھی دوچار تھے جس کی تعبیر قرآن نے ان الفاظ سے کی ہے:

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْاِيْمَانُ (الشوریٰ ۴۲:۵۲)

تم نہ کتاب کی حقیقت سے واقف تھے اور نہ ایمان کے بارے میں جانتے تھے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ دین کا بنیادی تصور درست بھی ہو لیکن اس کی تفصیلات سے آدمی آگاہ نہ ہو تب بھی وہ متردد سا رہتا ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں معلوم نہیں یہ حقیقت کے مطابق ہے یا نہیں اور اس سے میرا رب راضی ہو رہا ہے یا نہیں۔ اسے اطمینان تب حاصل ہوتا ہے جب وہ راہ بالکل واضح دکھائی دے رہی ہو جس پر اس کو چلنا ہے۔ کتاب آسمانی اس ضرورت کو پورا کرتی ہے کہ وہ مجمل ایمان کے تقاضوں اور مطالبات کو واضح کرتی اور اس کی عملی شکل بتاتی ہے۔ اس کے نزول کے بعد آدمی اپنی فطرت کی رہنمائی کو قابل اعتماد طریقہ سے استعمال کر سکتا اور دینی زندگی اختیار کر سکتا ہے۔ خود نبوت کے منصب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ نبی دین و شریعت کے فہم میں درجہ کمال پر فائز ہو۔ ہر حقیقت اس پر اس طرح واضح ہو کہ جیسے وہ اس کو بچشم سر دیکھ رہا ہے۔ جب خود اسے شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے مخاطبوں کو پورے یقین و اذعان کے ساتھ تعلیم دینے کے قابل ہوتا ہے۔ جب تک نبی کے اندر ہدایت کی طلب وحی کے ذریعے پوری نہیں ہوتی وہ برابر حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ حضورؐ کی اسی ذہنی کیفیت کا تذکرہ قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ ۹۳:۷)

اس نے تمھیں جویائے راہ پایا تو راستہ دکھایا۔

تحنث میں دلچسپی:

حضورؐ سرگشتگی کے اس عالم میں دین ابراہیمی کی باقی ماندہ عبادات (نماز، روزہ، طواف، حج اور قربانی وغیرہ) پر عمل کرتے اور اصل حقیقت کو پانے کے لیے برابر غور و فکر کرتے۔ جب اس پر بھی عقدہ نہ کھلا تو آپ کا رجحان بستی سے دور الگ تھلگ رہ کر دھیان و گیان کی جانب ہوا۔ اس کے لیے آپ نے شہر کے ہنگاموں سے ہٹ کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ایک چھوٹے سے غار میں وقت گزارنا اور ابراہیمی طریقہ پر عبادت کرنا شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے آپ خورد و نوش کا سامان لے کر پہاڑ پر چلے جاتے، غار حرا میں بسیرا کرتے اور جب سامان ختم ہو جاتا تو اپنے اہل و عیال میں واپس آ جاتے۔ غار حرا میں آمد و شد کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ حضورؐ کی اس عبادت کو تحنث کا نام دیا گیا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ تحنث کی اس عبادت میں منفرد نہیں تھے بلکہ دوسرے لوگ بھی جو دین ابراہیمی کی روایات میں دلچسپی رکھتے تھے، وہ بھی اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر تحنث کرتے جو بعض صورتوں میں خاصا طویل ہوتا۔ تحنث کی عبادت نے حضورؐ کے قلب مبارک کو وحی کے حصول کے لیے سازگار بنانے میں ابتدائی کام کیا اور وہ قلب صافی تیار کیا جو فرشتہ وحی سے اقتباس نور کے لیے موزوں تھا۔

تحنث کے بارے میں یہ تصور درست نہیں کہ یہ ریاضت، مجاہدہ اور مراقبہ کی قسم کی کوئی چیز ہے جو کاہنوں، جادوگروں اور نجومیوں کی تربیت کا حصہ ہوتی ہے اور جس کی تعلیم انہیں ان کے استاد اور گرو دیتے ہیں۔ یہ لوگ ایک منتخب پیشہ میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ایک عمر کھپا دیتے ہیں۔ ان کے اس شوق و تمنا سے ایک عالم آگاہ ہوتا ہے۔ ان سے ملنے جلنے والے انہیں تربیت حاصل کرتے، مجاہدے کرتے اور ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ نبوت و رسالت پانے والوں کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ اس میں ان کی اکتساب کی کوئی کوشش نہیں ہوتی کیونکہ نبوت کا منصب اکتسابی ہے ہی نہیں۔ یہ فضل یزدانی ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے یہ تاج پہنا دے۔ لہذا نبی نہ کسی کا شاگرد ہوتا، نہ کسی پیر و مرشد سے مراقبوں اور مجاہدوں کی تربیت حاصل کرتا اور نہ اس کے ذہن ہی میں یہ تصور ہوتا ہے کہ وہ نبوت کے منصب پر فائز ہونے کا اہل ہے۔ پھر یہ تجربہ عام انسانی تجربہ بھی نہیں کہ آدمی دوسروں کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کر لے۔ اس کا تجربہ انہی کو ہوا جن کو اللہ تعالیٰ اس عزت سے نوازنا چاہتا تھا۔ اسی لیے نبی کے ابتدائی مشاہدات اس کے لیے بالکل غیر مانوس، انوکھے اور عجیب ہوتے ہیں۔ لہذا نبی کی تربیت کا ایک پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبوت کے اسرار و رموز کو ان کے لیے مانوس بنانے کے لیے کچھ غیر معمولی حالات [illegible]

رویائے صالحہ:

تحنث کے ذریعے صفائی قلب کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد حضورؐ میں جو تبدیلی آئی وہ یہ تھی کہ آپ کو رویائے صالحہ یعنی اچھے اور خوشخبری کی نوید لانے والے خواب نظر آنے لگے۔ یہ ایسے روشن خواب ہوتے جیسے رات کی تاریکی کے اندر سے صبح نمودار ہو جاتی ہے۔ آپ کی طبع مبارک پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب دکھا کر آپ کو آنے والے دنوں کی برکات کے تحمل کے لیے تیار کرنا مقصود تھا تا کہ نبی کا دل و دماغ اور اس کی روح فرشتہ کے ساتھ اتصال اور اقتباس وحی کے لائق ہو جائے۔

روشنی کی ایک کرن:

مستند کتب حدیث کی رو سے ایک مرتبہ، جب حضورؐ غار حرا میں اپنی معمول کی عبادت میں مصروف اور اللہ سے لو لگائے ہوئے تھے، اچانک ایک فرشتہ نمودار ہوا۔ اس نے آپ کو حکم دیا: اقرأ (پڑھو) آپ نے جواب دیا: 'میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'۔ اس پر فرشتہ آپ سے بغلگیر ہو گیا اور اتنے زور سے بھینچا کہ آپ کو تکلیف ہونے لگی۔ پھر اس نے حکم دیا اقرأ (پڑھو) آپ نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے دوبارہ آپ کو سینے سے لگا کر بھینچا جس سے آپ کو بے حد تکلیف ہوئی۔ اس نے چھوڑ کر پھر پڑھنے کو کہا۔ آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ فرشتہ نے تیسری مرتبہ سینے سے لگا کر بھینچا اور کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِی خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَم ''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو پیدا کیا خون کی پھٹکی سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے''۔ یہ کہہ کر فرشتہ غائب ہو گیا۔

اس واقعہ سے حضورؐ گھبرا گئے اور پریشان ہو کر ایسی حالت میں گھر کو چلے کہ آپ کا جسم کانپ رہا تھا۔ نہایت دہشت زدگی کی کیفیت میں آپ نے اپنی زوجہ محترمہ سے کہا کہ میرے اوپر چادر اڑھا دو۔ آپ کی طبیعت قدرے سنبھلی تو زوجہ محترمہ نے اس دہشت زدگی کا سبب پوچھا۔ آپ نے ان کو واقعہ سنایا اور فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ انہوں نے آپ کو تسلی دی کہ آپ رشتہ داروں سے جڑتے ہیں، سچ بولتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، غریبوں کی دستگیری کرتے ہیں، حوادث میں لوگوں سے تعاون کرتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کا رب آپ کی جان خطرے میں ڈالے۔ یہ واقعہ ضرور آپ کے لیے خوشخبری لائے گا۔ پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ میرے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل ایک بڑے عالم اور نیک آدمی ہیں۔ وہ آسمانی کتابوں کا

علم رکھتے ہیں۔ ان کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا جائے اور اس واقعہ کی حقیقت معلوم کی جائے۔ آپ نے یہ مشورہ پسند کیا۔ آپ ان کے پاس گئے اور تمام روداد سنائی تو انہوں نے کہا کہ میری رائے میں آپ کے پاس وہی فرشتہ وحی آیا جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ پھر کہا 'کاش میں توانا ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو اس شہر سے نکال دے گی۔ حضورؐ نے حیران ہو کر پوچھا کہ کیا میری قوم میرے ساتھ ایسا سلوک کرے گی، تو ورقہ نے کہا کہ ہاں، جو شخص بھی یہ پیغام لے کر آیا اس کی قوم اس کی دشمن ہو گئی'۔

ورقہ بن نوفل کا نام بھی مکہ کے حنفاء کے گروہ میں شامل ہے۔ وہ ایک حق پرست آدمی تھے۔ تحقیق و جستجو کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ اس وقت اصل دین نصاریٰ کے پاس ہے تو انہوں نے اپنے آبائی مذہب کو خیر باد کہہ کر نصرانیت اختیار کر لی اور اپنے شوق کے باعث عبرانی زبان بھی سیکھی اور تورات کو اس کی اصل زبان میں سمجھنے پر قادر ہو گئے۔ اس بنا پر وہ پیغمبروں کے بارے میں اللہ کی سنت اور ان پیشین گوئیوں سے بھی واقف ہو گئے جو آخری نبی کی بعثت کے بارے میں صحف آسمانی میں موجود تھیں۔ اس دور میں وہ بڑے بوڑھے ہو چکے تھے اور جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

اس مستند روایت سے، جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ موجود ہے، چند نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ حضورؐ خود یہ بیان نہیں کرتے کہ میرے پاس غار حرا میں ایک فرشتہ آیا۔ یہ بیان راوی کا ہے کہ آپ کے پاس فرشتہ آیا۔ فرشتے نے حضورؐ سے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ اسی لیے حضورؐ کو جستجو ہوئی کہ کسی صاحب علم سے رائے لی جائے کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ ورقہ بن نوفل نے احوال معلوم کر کے اندازہ لگایا کہ یہ فرشتہ وحی ہو سکتا ہے۔

۲۔ یہ جان لینے کے باوجود کہ علامات فرشتہ وحی کی آمد کی ہیں، ورقہ بن نوفل نے حضورؐ سے یہ نہیں کہا کہ آپ اللہ کے رسول مقرر ہوئے ہیں۔ یعنی اس مرحلہ پر انہوں نے حضورؐ کو نبی یا رسول تسلیم نہیں کیا۔

۳۔ ورقہ بن نوفل کا ماضی گواہ ہے کہ وہ ایک حق پرست آدمی تھے۔ حقیقت کی تلاش ہی میں انہوں نے نصرانیت اختیار کی تھی۔ ان پر اگر یہ بات واضح ہوتی کہ حضورؐ اللہ کے رسول ہیں تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ آپ پر ایمان لا کر ایمان میں سبقت کا اعزاز حاصل نہ کرتے جبکہ وہ حسرت کا اظہار کرتے رہے کہ میں ناتوان ہو چکا ہوں، اس کے باوجود اگر میں زندہ رہا تو آپ کی نصرت کرنے میں پیش پیش رہوں گا۔ گویا

غار کے واقعہ میں انہوں نے اس بات کے آثار دیکھے کہ حضورؐ آئندہ کسی وقت منصب رسالت سے سرفراز ہو سکتے ہیں۔

۴۔ فرشتے کا حضورؐ سے مطالبہ صرف اتنا تھا کہ اقرأ۔ یہ لفظ اپنے طور پر پڑھنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور دوسروں کے سامنے پڑھ کر سنانے کے لیے بھی۔ قرآن میں یہ دوسرے مفہوم میں بکثرت آیا ہے۔ اس صورت میں اقرأ کا صحیح مفہوم ہوگا کہ لوگوں کو پڑھ کر سناؤ۔ یہ گویا نبی کی ذمہ داری کا بیان ہے کہ جو پیغام آپ کو دیا جائے گا، اسے لوگوں تک پہنچانا ہوگا۔

۵۔ فرشتے نے پڑھ کر سنانے کا حکم تو دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیا پڑھنا یا کیا سنانا ہے۔ اس وضاحت کو تشنہ چھوڑ کر وہ غائب ہو گیا، حالانکہ حضورؐ برابر یہ کہتے رہے کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ میں کیا سنا سکتا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں سنانے کے لیے کوئی پیغام نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے کوہ طور کے پاس جب ایک درخت پر تجلی دیکھی اور اس کے قریب گئے تو پہلی وحی ہی سے ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ منصب رسالت پر فائز کیے گئے ہیں اور انہوں نے توحید و آخرت کے بارے میں لوگوں کے عقائد کو درست کرنا اور ان کے اندر نماز کو رائج کرنا ہے۔ انہیں کسی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

۶۔ فرشتے نے تین بار حضورؐ کو سینے سے لگا کر بھینچا۔ اس عمل کا مقصد اگر یہ تھا کہ آپ کا سینہ کھل جائے اور پڑھنا آ جائے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ بعد کی زندگی میں بھی آپ لکھنے پڑھنے پر قادر نہیں ہوئے۔ لہذا فرشتے کے بھینچنے کا مقصد کچھ اور متعین کرنا پڑے گا۔

۷۔ کتب حدیث و سیرت میں یہ شہادت نہیں ملتی کہ واقعہ حرا کے فوراً بعد حضورؐ نے دین اسلام کی تبلیغ شروع کر دی ہو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت خود آپ پر اپنی حیثیت واضح نہ تھی اور نہ ہی کوئی پیغام تھا جسے لوگوں کو سنانا تھا۔

ان نکات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ واقعہ حراء میں حضورؐ کو جو تجربہ ہوا، یہ بھی آپ کی تربیت ہی کا حصہ تھا۔ فرشتہ وحی کی شخصیت سے تعارف اس کا اصل مقصد تھا۔ حضورؐ کو یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ یہ فرشتہ آئندہ آپ کے پاس آنے والا ہے۔ یہ رب کے پیغام آپ تک پہنچائے گا اور آپ کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ ان کو لوگوں تک پہنچائیں۔ لہذا یہ بات صحیح نہیں کہ واقعہ حراء حضورؐ کی رسالت کا نقطہ آغاز تھا اور اس میں پہلی وحی نازل ہوئی تھی۔

جہاں تک فرشتے کے حضورؐ کو بار بار مخاطب کرنے اور بھینچنے کا تعلق ہے اس کی توجیہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ یوں کرتے ہیں:

(ایک انسان کے لیے) کسی روحانی طاقت سے اتصال کا موقع بڑا نازک ہوتا ہے۔ اس کے لیے ذہن اور دماغ کو تیار کرنے کے لیے بار بار کی ملاقات، بار بار کی آشنائی اور بار بار کا انس ضروری ہوتا ہے ....
فرشتے کا بار بار بھینچنے اور چھوڑنے کا مطلب پوری طرح سے اپنے آپ کو محسوس کروا دینا، بے تکلف کر دینا اور اپنی ذات اور آواز سے پیغمبر کو آشنا کر دینا ہو سکتا ہے تا کہ جب دوبارہ ملاقات ہو تو آپ کو اطمینان ہو جائے کہ وہی یارِ غار آ گیا ہے۔ یہ کوئی شیطانی چیز نہیں ہے[2]۔

مطلب یہ ہوا کہ اس عمل کا مقصد فرشتۂ وحی سے محض تعارف تھا اور اصل وحی کا نزول یا دوسرے الفاظ میں منصب رسالت پر فائز کرنے کا معاملہ آئندہ کی کسی ملاقات پر چھوڑ دیا گیا۔

روایات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اس کے بعد ایک مدت تک فرشتہ کی آمد نہیں ہوئی۔ اس عرصہ کو فترۃ الوحی یا وحی کے انقطاع کا نام دیا جاتا ہے جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ جب پہلی مرتبہ وحی نازل ہی نہیں ہوئی تو اس میں انقطاع کیسے ہو سکتا ہے۔ حقیقت میں وحی کا نقطۂ آغاز فرشتہ وحی کی آمد ثانی کا موقع ہے جس میں کچھ عرصہ لگا۔

واقعہ حراء کو جو پہلی وحی کے نزول کا موقع ٹھہرایا جاتا ہے تو اس کی وجہ سورہ علق کی ابتدائی آیات ہیں جو روایت کی رو سے، فرشتہ نے تیسری مرتبہ حضورؐ کو بھینچنے کے بعد پڑھیں۔ اس پر بھی چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔ مثلاً:

۱۔ حضورؐ کو اگر پہلی وحی پہنچائی جا چکی تھی تو آپ کے اوپر اپنے رسول ہونے کا معاملہ مشتبہ کیوں رہ گیا کہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس جا کر پوچھنا پڑا کہ میرے ساتھ یہ کیا معاملہ ہوا ہے۔ آپ کو تو پورے یقین و اذعان کے ساتھ کہنا چاہیے تھا کہ میرے اوپر وحی ان الفاظ میں نازل ہوئی اور مجھے اس کو پڑھ کر سنانے کا حکم ہوا ہے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پہلی وحی نازل ہوئی تو دین کے بنیادی امور آپ کو بتا دیے گئے اور ذمہ داری کی نوعیت کے لحاظ سے ہدایات دے دی گئیں۔ اس کے برعکس حضورؐ کو اگر سورہ علق کی ابتدائی آیات دی گئیں تو ان میں یہ ہدایت تو ضرور ہے کہ پڑھ کر سنائیں لیکن پیغام کوئی نہیں ہے۔ محض اللہ تعالیٰ کی چند صفات ان آیات سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔

۳۔ سورہ علق کی آیات کے پہلی وحی ہونے کو امت نے بالاتفاق تسلیم نہیں کیا۔ صحیح مسلم میں یحییٰ سے روایت نقل ہوئی ہے کہ میں نے ابوسلمہ سے سوال کیا کہ قرآن کا کون سا حصہ پہلے نازل ہوا۔ انہوں نے کہا: یایھا المدثر۔ میں نے کہا: اقرأ سب سے پہلے نازل نہیں ہوئی؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے یہی سوال جابر بن عبداللہ سے کیا تھا تو ان کا جواب تھا: یایھا المدثر۔ جب میں نے پوچھا کہ اقرأ پہلے نازل نہیں ہوئی تو انہوں نے جواب دیا کہ میں وہ کچھ بیان کر رہا ہوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا[۳]۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تابعین کے زمانہ ہی میں یہ اختلاف سامنے آ گیا تھا، بعض لوگ اقرأ کو اولین وحی قرار دیتے تھے اور دوسرے لوگ رسول اللہؐ کے حوالہ سے یایھا المدثر کو پہلی وحی مانتے تھے۔ دیکھا جائے تو مدثر کی ابتدائی آیات میں نبی ﷺ کو بعض احکام دیے گئے ہیں اور تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ اقرأ کی آیات میں یہ بات نہیں۔

ان نکات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائے وحی کی روایت کا آخری حصہ، جس میں سورہ علق کی آیات نقل کی گئی ہیں، کچھ قابل اعتماد نہیں ہے۔ اس بارے میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی رائے بڑی اہم اور دل کو بھاتی ہے۔ وہ اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں:۔

> رب کے نام سے پڑھ کر سنانے کی ہدایت میں ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کے متعلق قدیم صحیفوں میں جو پیشینگوئی کی گئی ہے اس کا خاص پہلو یہ ہے کہ آخری نبی جب آئے گا تو اپنے رب کے نام سے سنائے گا...... (یہاں مولانا نے کتاب استثناء (۱۸:۸۔۱۹) کی عبارت نقل کی ہے جو مذکورہ پیشینگوئی پر مشتمل ہے)...... اگر فرشتے کا جواب اقرأ باسم ربک تک محدود مانا جائے تو یہ مذکورہ پیشینگوئی کے پورا ہونے کی خبر ہے۔ اس صورت میں آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا بھی ٹھیک ہے کہ میں تو جانتا نہیں کہ مجھے لوگوں کو کیا سنانا ہے اور فرشتے کا یہ بتانا بھی معنی خیز ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے نام سے سنانا ہے۔ وہی آپ کو بتائے گا کہ آپ کیا سنائیں۔ میرے خیال میں فرشتے کا جواب 'اقرا باسم ربک' تک ہی تھا اور اس کا مقصد پیغمبر کو خدا کا کلام خلق کو سنانے کے لیے تیار کرنا تھا[۴]۔"

حضورؐ کی گھبراہٹ:

ایک سوال اس واقعہ سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ فرشتہ کا سامنا ہونے پر حضورؐ پر گھبراہٹ کیوں طاری ہو گئی کہ آپ کو تخنث چھوڑ کر انتہائی سراسیمگی اور خوف زدگی کے عالم میں گھر جانا پڑا اور حواس بحال ہونے کے بعد آپ اس قابل ہوئے کہ زوجہ محترمہ کو تمام احوال کی خبر دے سکیں۔ ہمارے نزدیک اس کا سبب یہ تھا کہ حضورؐ بغیر کسی

آرزو اور منصوبہ بندی کے خالی الذہن ہو کر عبادت میں مصروف تھے۔ یہ موہبت ربانی یکا یک ہوئی جس کی توقع آپ کو پہلے سے نہیں تھی۔ لہٰذا اس نامانوس اور انوکھے تجربہ سے آپ گھبرا گئے۔ فوری طور پر اس کا مقصد بھی آپ کو نہیں بتایا گیا اور نہ اس کے اسرار و رموز پر آپ مطلع ہو سکے۔

یہاں تو حضورؐ ابھی تربیت کے مرحلہ سے گزر رہے تھے۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہو چکا تھا کہ آپ رسول مبعوث کیے جا چکے ہیں۔ آپ کو ہدایات تک بھی دے دی گئیں۔ لیکن جب عصا کا معجزہ عنایت کیا گیا تو وہ گھبرا کر موقع سے دوڑ پڑے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی لاٹھی حقیقی سانپ کی صورت اختیار کر لے گی۔ چنانچہ ان کو تسلی دی گئی کہ میرے ہاں اللہ کے رسول خوف زدہ نہیں ہوا کرتے۔

رسول کی یہ کیفیت بالکل عارضی ہوتی ہے۔ جب وہ وحی کے تجربات سے بار بار گزرتا ہے تو اس کو پوری طرح شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے کہ جو مشاہدے اس کو ہو رہے ہیں یہ من جانب اللہ ہیں اور وہ ایک خاص فریضہ ادا کرنے پر مامور کیا جا رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ۔ باب فضیلۃ الامام العادل۔ ج ۲، ص ۱۲۵،

۲۔ امین احسن اصلاحی۔ تدبر حدیث۔ شرح صحیح بخاری، جلد اول، ص ۲۸، ادارہ تدبر قرآن و حدیث لاہور، ۲۰۰۲

۳۔ صحیح مسلم۔ باب بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ص ۸۰

۴۔ امین احسن اصلاحی۔ تدبر حدیث۔ شرح صحیح بخاری جلد اول، ص ۲۹

حصہ سوم

نبوت کا مکی دور

باب 9

بعثت اور دعوت دین کا آغاز

آغاز وحی:

اوپر یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ صحابہؓ کے زمانہ ہی میں یہ سوال پیدا ہوا کہ نبی ﷺ پر کونسی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ بعض لوگ سورہ العلق کی ابتدائی آیات کو پہلی وحی مانتے تھے لیکن جابر بن عبداللہؓ کو اصرار تھا کہ میں نے بطور خاص خود آنحضرت ﷺ سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ سورہ المدثر کی ابتدائی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ حضورؐ نے بتایا کہ میں حسب معمول غار حرا میں ایک ماہ مقیم رہا۔ جب یہ مدت ختم ہوئی تو میں پہاڑ سے اترا۔ وادی میں مجھے یوں لگا کہ کسی نے مجھے پکارا ہے۔ میں نے آگے پیچھے اور دائیں بائیں مڑ کر دیکھا لیکن کوئی شخص نظر نہ آیا۔ پھر ندا آئی تو میں نے سر اٹھایا، کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا ہوا میں ایک تخت پر پورے شکوہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس منظر سے میرے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی[1]۔ چنانچہ میں گھر کو لوٹا اور کہا کہ مجھے چادر اوڑھا دو۔ بعض روایات میں ہے فرشتہ افق سے اترنے لگا اور مجھ سے اتنا قریب ہو گیا جتنا استاد اپنے شاگرد سے قریب ہوتا ہے۔ تب اس نے جھک کر پورے التفات واہتمام کے ساتھ وحی پہنچائی۔

ہمارے نزدیک یہ موقع ہے جب حضورؐ کو خلعت رسالت سے نوازا گیا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن نے بھی بڑے اہتمام سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ فرشتہ کو دیکھنا اور اس سے وحی حاصل کرنا ایک ایسا معاملہ تھا جس میں آپ کے واہمہ یا تخیل کو کوئی دخل نہ تھا۔ آپ کی عقل وفہم نے وحی کے پیغام کو سمجھنے میں ذرا بھی غلطی نہیں کی۔ فرشتہ نے اس موقع پر اللہ کا وہ پیغام پہنچایا جو اس موقع پر آپ کو پہنچانا مقصود تھا[2]۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ باقاعدہ جاری ہو گیا۔

رہی یہ بات کہ پہلی وحی کن آیات پر مشتمل تھی تو اس بارے میں متعین طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم اگر حضرت جابرؓ کی روایت پر انحصار کیا جائے تو پہلی وحی یوں تھی:

يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَاَنْذِرْ. وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ. وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ. (المدثر۷۴:۱۔۵)

اے چادر اوڑھنے والے۔ اٹھ اور لوگوں کو خبردار کر۔ اپنے رب کی بڑائی بیان کر، اپنے دامن کو پاک رکھ اور

ناپاکی سے دور رہ۔

ہمارے نزدیک یہ آیات ایسی ہیں جو وحی کا نقطۂ آغاز بن سکتی ہیں۔ ان میں نبی ﷺ کو ذمہ داری سے گھبرا کر چادر میں لپٹ جانے کے بجائے اٹھ کر لوگوں کا سامنا کرنے، ان کے آگے صرف اللہ کی کبریائی کا چرچا کرنے اور شرک کی نجاست سے دور رہنے کی تلقین ہے۔ ان میں نبی کی اصل ذمہ داری انذار کا واضح ذکر موجود ہے۔ جس کا مطلب ہے لوگوں کو اللہ کی ہدایت کی طرف بلانا اور اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو اس کے برے نتائج سے خبردار کرنا اور ڈرانا۔

پہلی وحی حضورؐ پر ماہ رمضان میں لیلۃ القدر میں نازل ہوئی۔ یہ بات قرآن مجید کی نص سے ثابت ہے۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے اہم امور کے لیے یہ رات مخصوص کی ہوئی ہے اور نزول قرآن چونکہ انسانیت کی بھلائی کے لیے سب سے اہم پروگرام تھا اس لیے ہزار ماہ سے بھی زیادہ قیمتی رات لیلۃ القدر میں اس کا اہتمام فرمایا گیا۔ مزید انتظام یہ کیا گیا کہ جبریل امین کو بارگاہ خداوندی سے رسول اللہؐ تک وحی پہنچانے میں جو شیطانی قوتیں، خصوصاً جنات، مزاحم ہو سکتی تھیں ان کی افلاک میں آمدورفت کو روکنے کے لیے پہرے لگا دیے گئے۔

چونکہ فرشتۂ وحی کی پہلی آمد، جو روشناسی کے مقصد سے تھی، اور دوسری آمد میں، جو فی الواقع حضورؐ کی بعثت کی خبر دینے کے لیے تھی، چند ہفتوں کا وقفہ تھا اس کو فترۃ الوحی سے تعبیر کر لیا گیا اور پھر اس کی مدت تین سال تک پھیلا دی گئی۔ حالانکہ قابل غور بات یہ ہے کہ اگر رسالت کے کام کو شروع کرانے کے بعد تین سال تک معطل ہی کرنا تھا تو اس کا آغاز ہی کیوں کیا گیا۔ اس کی کوئی مصلحت تو ہونی چاہیے۔ ہمارے نزدیک حضرت جابرؓ کی روایت مبنی بر حقیقت ہے۔ وحی میں کوئی انقطاع نہیں ہوا۔ جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو پہلے دن ہی سے وحی کا آغاز ہو گیا اور آپ اس کی روشنی میں دعوت دین دینے لگے۔

کیفیت وحی:

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی نازل ہونے سے پہلے آپ گھنٹی کی آواز سنتے یا آپ کو مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے ملتی جلتی آواز سنائی دیتی۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تو انہی آوازوں سے الفاظ وحی کی تراوش ہوتی۔ اس کیفیت میں آپ کا جسم پسینہ سے شرابور ہو جاتا اور اعضا پر کپکپی سی طاری ہو جاتی۔ جب یہ کیفیت ختم ہوتی تو آپ کے ذہن میں وحی کے الفاظ محفوظ ہو چکے ہوتے تھے[3]۔

نبیؐ کے جسم پر طاری ہونے والی یہ کیفیات دیکھنے والوں کو نظر آتیں لیکن نبی کے باطن میں کیا ہو رہا ہوتا

اس کو جاننے کا کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ اور جبریل امینؑ کے درمیان کا معاملہ ہوتا۔ گھنٹی کی آواز یا بھنبھناہٹ بھی صرف حضورؐ ہی سنتے۔ آپ کے ساتھی اس سے بے خبر ہوتے۔ ہوسکتا ہے یہ آواز آپ کو متوجہ کرنے کے لیے آتی ہو اور اس وقت تک جاری رہتی ہو جب تک پیغام وحی مکمل نہ ہو جاتا ہو۔ جہاں تک جسمانی تغیرات کا تعلق ہے یہ اس لیے واقع ہوتے کہ رسول اللہؐ کا رابطہ عالم ناسوت سے نکل کر عالم لاہوت میں فرشتہ کے ساتھ ہوتا۔ آپ کو اس میں غیر معمولی مشقت پیش آتی۔ اس کیفیت کو بدطینت مستشرقین نے العیاذ باللہ مرگی کے دورہ کا نام دیا ہے جبکہ مرگی کا مریض دورہ پڑنے پر بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے اور اس کے لیے دورہ کی کیفیت سے نکلنے کے بعد ڈھنگ سے باتیں کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ پیغمبرؐ وحی اترنے کی حالت میں بیہوش نہیں ہوتے تھے۔ اس کیفیت سے نکلنے کے بعد زندگی بخش معجز کلام آپ کی زبان سے ادا ہوتا اور آپ فوراً اس کی رہنمائی میں ساتھیوں کو نئی ہدایات دیتے اور پیش آمدہ مسائل کو حل فرماتے۔ وحی آپ کے لیے قوت اور تسکین کا باعث بنتی اور آپ کو اپنے کام کے لیے ولولہ تازہ مہیا کرتی۔ وحی شدہ کلام آپ اپنے دوست و دشمن، حلیف و حریف سب کو گوش گزار کرنے پر مامور تھے۔ اس لیے آپ کو نئی وحی نازل ہونے کا ہمیشہ انتظار رہتا۔

دعوت کا آغاز:

جب کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے تو وہ اس قوم کو مخاطب کر کے اللہ کا یہ پیغام دیتا ہے کہ لوگ اپنے غلط عقیدہ و عمل کو چھوڑ کر اللہ کے بندے بن جائیں۔ اس مقصد کے لیے وہ لوگوں کی فطری نیکی کو ابھارتا، غلط کاموں پر متنبہ کرتا، نصیحت و موعظت کے ذریعے ان کو خدا کی بتائی ہوئی راہ راست کو اختیار کرنے کی تلقین کرتا اور قوم کی فکری و عملی رہنمائی کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی کام خفیہ کرنے کا نہیں ہوتا۔ رسول کی ذمہ داری کی نوعیت سازش کر کے انقلاب برپا کرنے کی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی جدوجہد کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر رکھے اور اپنی جماعت کھڑی کر کے ایسے افراد مہیا کرے جو قوم کے اندر رائج نظام کو تلپٹ کر کے اس کے تجویز کردہ نظام کو نافذ کر دیں۔ رسول کے کام کی نوعیت ہی کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ اس بات کا آرزومند ہو کہ ساری قوم اس کی آواز پر لبیک کہہ دے لیکن عملاً اس کو اس بات کی زیادہ پروا نہیں ہوتی کہ اس کا ساتھ دینے والے کون اور کس حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ کل کتنے تھے اور آج انکی تعداد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض رسولوں پر ایمان لانے والے چند ہی افراد ہوئے، باقی ساری قوم نے ان کا انکار کیا، تاہم رسول اپنا فریضہ ادا کرنے میں کامران ہوئے۔

رسول دین کی دعوت اپنی کسی غرض کو پورا کرنے کے لیے نہیں دے رہا ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری مالک ارض و سماء اس کے سپرد کرتا ہے۔ جو اس کو کام کرنے کا پلان بھی عطا کرتا ہے۔ پیغمبر اسی پلان کی حدود میں رہ کر کام کرتا ہے اور جب اس کا قدم ان حدود سے باہر جانے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ رہنمائی کرتا اور اس کو واپس پلان کی حدود میں لے آتا ہے۔ چونکہ پیغمبر کا کام جان جوکھم میں ڈالنے کا ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لیتا ہے۔ ہر مشکل وقت میں وہی اس کی دستگیری فرماتا ہے۔ لہذا رسول کو کسی بھی مرحلہ پر اپنی قوم کے کسی سخت ردعمل سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی دعوت کو خفیہ رکھنے پر مجبور ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر میں تھے تو ان کے ہاتھوں ایک قبطی کے قتل کا واقعہ پیش آ گیا جس میں ان کے ارادہ کو کوئی دخل نہ تھا۔ چونکہ فرعون کو بنی اسرائیل سے بَیر تھا اس لیے موسیٰ علیہ السلام کو اس قتل کا ذمہ دار گردانا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب رسالت سے سرفراز فرمایا تو ساتھ ہی ان کو حکم ہوا کہ فرعون کے دربار میں جا کر میرا پیغام پہنچاؤ، وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے کوئی خفیہ منصوبہ تیار نہیں کیا بلکہ بے دھڑک فرعون کے پاس چلے گئے۔ فرعون نے ان کے پچھلے جرم کا حوالہ دیا اور یہ امکان بھی تھا کہ وہ ان کو گرفتار کر لے مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد تھا:

لَا تَخَافَا اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی۔ (طٰہٰ ۲۰:۴۶)

تم دونوں (یعنی موسیٰ وہارون علیہما السلام) اندیشہ مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، میں سنتا اور دیکھتا ہوں

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ رسول اللہ ﷺ جیسے عظیم المرتبت خاتم الانبیاء کے بارے میں آپ کے سیرت نگاروں نے یہ تاثر کیسے پھیلا دیا، اور امت نے اس کو قبول کیسے کر لیا، کہ بعثت کے بعد تین سالوں تک آپ نے خفیہ تبلیغ کی۔ یہ بات رسولوں کی سنت سے مطابقت نہیں رکھتی اور حقائق کے بھی منافی ہے۔ اگر آپ نے قریش کی مخالفت کے خوف سے ایسا کیا تو کیا اللہ تعالیٰ کی وہ حفاظت آپ کو حاصل نہ تھی جو تمام رسولوں کو حاصل رہی ہے؟ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ تین سالوں کے بعد جب آپ نے علانیہ تبلیغ شروع کی تو کیا اس وقت قریش کی عداوت ختم ہو چکی تھی؟ یا کیا اس عرصہ کے دوران میں آپ نے چوری چھپے اتنی نفری مہیا کر لی تھی کہ آپ قریش کے مدمقابل بن کر آ سکتے؟ تاریخ گواہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آنحضرت ﷺ نے اس عرصہ میں دعوت کو لوگوں کے علم میں لانے میں رکاوٹ پیدا کی تو یہ اللہ تعالیٰ کی ڈالی ہوئی ذمہ داری کے ادا کرنے میں کوتاہی تھی جو حضورؐ کی عظمت وشان کے منافی ہے۔ خفیہ تبلیغ کی کوئی اور حکمت سیرت نگار بیان نہیں

کرتے۔ ہمارے نزدیک آپ کی جدوجہد کا کوئی دور خفیہ نہیں رہا۔ آپ نے دعوت دین کا کام ٹھیک اس پلان کے مطابق کیا جو آپ کو اللہ رب العزت کی طرف سے دیا گیا تھا اور اس میں ایک تدریج ملحوظ رکھنے کا حکم تھا۔ فرمایا گیا:

وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ. (الشعراء۔۲۶:۲۱۴۔۲۱۷)

اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈراؤ اور جن اہل ایمان نے تمہاری پیروی کی ہے ان کے لیے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھو، اگر یہ لوگ تمہاری نافرمانی کریں تو ان کو سنا دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو میں اس سے بری ہوں اور خدائے عزیز ورحیم پر بھروسا رکھو۔

اس پلان کے مطابق دعوت دین کا آغاز آپ نے اپنے قریبی خاندان یعنی قریش سے کرنا تھا، جو لوگ دعوت قبول کرتے ان کے ساتھ شفقت ومحبت کا معاملہ کرنا اور ان کو کفار کے نرغے سے نکالنا تھا۔ بعد کے مرحلہ میں دعوت کو پورے زور وقوت کے ساتھ بلند آہنگ ہو کر پیش کرنا اور شرک پر جمے ہوئے ان لوگوں سے، جو آپ کی بات نہ سنیں، اعلان برأت کرنا تھا۔ اس پورے کام میں ہدایت یہ تھی کہ آپ محض اللہ پر بھروسہ کریں جو زبردست اور اپنے ارادوں کو بروئے کار لانے پر قادر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے کام کا آغاز بالکل فطری انداز میں **الاقرب فالاقرب** کے اصول پر کیا۔ یعنی اپنے قریب ترین لوگوں سے آغاز کر کے آپ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جو پہلوں کے بعد قریب ترین تھے۔ سب سے پہلے آپ نے اپنی نئی ذمہ داری سے اپنی اہلیہ محترمہ، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، کو آگاہ کیا جو پہلے ہی سے آپ کے عقیدہ وعمل کی مداح، اور آپ کی رسالت کی خبر کی منتظر تھیں، انہوں نے فی الفور آپ کی دعوت قبول کی۔ اس کے بعد یہ بات آپ کے باقی اہل خانہ کے علم میں آئی۔ ان میں سے آپ کی بیٹیوں زینبؓ اور رقیہؓ اور آزاد کردہ غلام و متبنیٰ زیدؓ بن حارثہ نے اسلام قبول کیا۔ حضورؐ کی تیسری اور چوتھی صاحبزادیاں ام کلثومؓ اور فاطمہؓ بھی کم سن تھیں۔ قاضی سلیمان منصور پوری کی تحقیق کے مطابق تو حضرت فاطمہؓ کی ابھی ولادت نہیں ہوئی تھی اور حضرت علیؓ، جو آنحضرتؐ کی تولیت میں تھے، صرف آٹھ سال کے تھے اور ابھی سن شعور کو نہیں پہنچے تھے۔ بہر حال یہ صاحبزادیاں اور حضرت علیؓ اسلام ہی کی آغوش میں پلے بڑھے اور سن شعور کو پہنچ کر انہوں نے اسلام ہی کو اوڑھنا بچھونا بنایا[12]۔

گھر سے باہر آنحضرت ﷺ کے دوستوں، قدردانوں اور مداحوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ آپ نے ان پر توجہ دی۔ جوں جوں وہ اسلام کی تعلیم کے قائل ہوتے گئے، نہ صرف خود حلقہ بگوش اسلام ہوئے بلکہ اپنے اپنے اہل

خانہ یا دوستوں کو بھی اس دین میں لانے کا ذریعہ بنے۔ان کا تعلق قریش کے سبھی خاندانوں سے تھا۔اس کا اندازہ سابقون اولون (یعنی شروع ہی میں ایمان لانے والوں) کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے جو سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے۔ہم قریش کے خاندانوں کے حوالہ سے اسے یہاں نقل کرتے ہیں:۔

بنو ہاشم:	جعفرؓ بن ابی طالب مع زوجہ اسماءؓ بنت عمیس	
بنو مطلب:	عبیدہؓ بن الحارث	
بنو عبد شمس:	عثمانؓ بن عفان	
	خالدؓ بن سعید بن العاص	
	سلیطؓ بن عمرو	
	ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ	
بنو اسد:	زبیرؓ بن العوام	
	خدیجہؓ بنت خویلد	زوجہ رسول اللہؐ
بنو مخزوم:	ابو سلمہؓ بن عبد الاسد	
	عیاشؓ بن ابی ربیعہ	مع زوجہ اسماءؓ بنت سلامہ
	ارقم بن عبد منافؓ	
بنو تیم:	عبد اللہ بن ابی قحافہؓ	(حضرت ابو بکرؓ)
	طلحہؓ بن عبید اللہ	
	اسماءؓ بنت ابی بکر	(حضرت عائشہؓ ابھی سن شعور کو نہیں پہنچی تھیں)
بنو زہرہ:	عبد الرحمٰنؓ بن عوف	
	سعدؓ بن ابی وقاص	و عمیرؓ بن ابی وقاص
	خبابؓ بن الارت	(حلیف)
	عبد اللہؓ بن مسعود	(حلیف)
بنو عدی:	سعیدؓ بن زید	مع زوجہ فاطمہؓ بنت خطاب

بنو جمح: عثمانؓ بن مظعون وقدامہؓ بن مظعون وعبداللہؓ بن مظعون

بنو سہم: خنیسؓ بن حذافہ

بنو اسد بن خزیمہ: عبداللہؓ بن جحش وابواحمدؓ بن جحش وزینبؓ بنت جحش

بنو حارث: ابوعبیدہؓ بن الجراح

ان کے علاوہ غلاموں میں عمارؓ بن یاسر، یاسر مع زوجہ سمیہؓ، عامرؓ بن فہیرہ اور صہیبؓ بن سنان کے نام قدیم الاسلام صحابہ کے طور پر آتے ہیں۔ سیرت کی قدیم ترین کتابوں کے مطابق نبوت کے پانچویں سال تک مسلمانوں کی تعداد سوا سو سے زیادہ ہو چکی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بالکل ابتدا ہی میں قریش کے تمام خاندانوں کے اچھے افراد کو متاثر کر کے ان کے دلوں کو جیت لینے والی دعوت کیا خفیہ تھی اور اتنے لوگوں کا اسلام کیا مخفی رہ سکتا تھا کہ قریش کی لیڈر شپ کو تین سالوں تک کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ وہ اس آنے والے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوئی تدبیر کر سکتے۔

دوسرے زاویہ سے دیکھیں تو قریش کے خانوادے کوئی الگ الگ جزیرے نہ تھے کہ بنو ہاشم میں پیش آنے والا ایک واقعہ بنو امیہ یا بنو اسد یا بنو مخزوم کے علم میں نہ آ سکتا۔ ان کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ آنحضرتؐ کی پھوپھی ام الحکیم بیضاء بنو امیہ میں، پھوپھی صفیہ بنو اسد میں، پھوپھی برہ بنو مخزوم میں اور پھوپھی امیمہ بنو اسد بن خزیمہ میں بیاہی ہوئی تھیں۔ عثمانؓ بن عفان بیضاء کے نواسے اور زبیر بن العوام حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور صفیہ کے بیٹے تھے۔ جحش کے صاحبزادے امیمہ کی اولاد اور ابوسلمہ برہ کے بیٹے تھے۔ بنو زہرہ آنحضرتؐ کے ننھیال اور بنو اسد آپ کے سسرال تھے۔ اتنی قریبی رشتہ داریوں میں باہمی تعلقات بے تکلف ہوتے ہیں، تمام لوگ ایک دوسرے کے احوال سے باخبر ہوتے ہیں اور کوئی بھی غیر معمولی واقعہ خفیہ نہیں رہ سکتا۔ آخر رسول اللہ ﷺ کی دعوت ہی تین سال تک کیسے خفیہ رہ گئی!

دعوت کو برداشت کرنے کا دور:

ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ نہ صرف یہ کہ قریش کی لیڈر شپ کی نگاہوں کے سامنے ہو رہی تھی بلکہ انہی کو مخاطب کیا جا رہا تھا کیونکہ حضور کے عشیرہ وقبیلہ وہی تھے۔ لوگوں کے قبول اسلام کی رفتار بالکل فطری تھی۔ لوگ آنحضرت ﷺ سے ملتے، آپ کا نقطۂ نظر معلوم کرتے اور جیسے جیسے دعوت کے معاملہ میں یکسو ہوتے قبول

اسلام کی راہ میں کوئی چیز سدِ راہ نہیں بنتی تھی۔ آغازِ کار میں بوجوہ قریش کے لیڈروں نے حضورؐ کی مخالفت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ دعوتِ توحید کو برداشت کیا۔ اس لیے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ آنحضرتؐ کی دعوت کا خفیہ دور تھا۔ قریش کے اس رویہ کے بظاہر تین اسباب سمجھ میں آتے ہیں:

اولاً: اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنے رسول پر ایک تدریج کے ساتھ نازل ہوا۔ ابتدا میں اس کا ہدف دلوں کے اندر نیکی کے فطری داعیہ کو ابھارنا اور معاشرتی برائیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنا تھا۔ اس میں خدا سے شکرگزاری کے تعلق، بندوں کے حقوق کے شعور، غرباء پروری، مسکینوں کی دستگیری، یتیموں پر شفقت اور مکارمِ اخلاق کو تعلیم کا مرکزی نقطہ بنایا گیا تھا۔ مثال کے طور پر کچھ آیات ملاحظہ ہوں:

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ. وَلَا تَحٰضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا. وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا. (الفجر ۸۹:۱۷تا۲۰)

ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے، مسکینوں کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے، وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کرتے اور مال کے عشق میں متوالے ہو۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ. وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ. وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ. فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ. وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاالْعَقَبَةُ. فَكُّ رَقَبَةٍ. اَوْ اِطْعٰمٌ فِىْ يَوْمٍ ذِىْ مَسْغَبَةٍ. يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ. اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ. ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ. (البلد ۹۰:۸تا۱۷)

کیا ہم نے (انسان) کو دو آنکھیں نہیں دیں، اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے، اور اس کو دونوں راہیں نہیں سجھا دیں: پر اس نے گھاٹی نہیں پار کی۔ اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھاٹی! گردن کو چھڑانا یا بھوک کے زمانہ میں کسی قرابت دار یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھلانا۔ پھر وہ بنے ان میں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی۔

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى. فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى. وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى. فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى. وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى. وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى. فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى. (اللیل ۹۲:۴تا۱۰)

تمہاری سرگرمی کے ثمرات الگ الگ ہیں۔ سو جس نے انفاق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ مانا اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دیں گے کٹھن منزل کے لیے۔

تمام اچھے اہلِ عرب ان اعلیٰ مقاصد کے ہمیشہ سے خوگر تھے جن کی تعلیم قرآن دے رہا تھا۔ اس تعلیم سے

شرفائے قریش کے دلوں میں کوئی کھٹک نہیں پیدا ہوئی۔ انہوں نے اس دعوت کو ایک مقبول و ہر دلعزیز مصلح کی ایک قابل قدر سرگرمی قرار دیا۔

ثانیاً: قریش کے اندر دین حنیف کے ماننے والوں کی ایک روایت پہلے سے موجود تھی۔ ان لوگوں کی تعداد اگرچہ زیادہ نہ رہی ہو لیکن یہ لوگ عین خانہ کعبہ کے سایہ میں اپنے عقائد کا برملا اظہار کرتے اور معاشرہ ان لوگوں کو برداشت کرتا تھا۔ نبی ﷺ حنیف تو تھے ہی، آپ معاشرے کے سب سے زیادہ باکردار، مکارم اخلاق کا پیکر، حسن عمل کا نمونہ، مجسم صداقت و امانت اور حق نصیحت ادا کرنے والے بھی تھے۔ قوم آپ کی قدردان اور آپ پر اعتماد کرتی تھی۔ آپ نے دین کی دعوت دینا شروع کی تو وہ آپ کے اسی کردار کو مزید نمایاں کرنے والی تھی۔ لہٰذا قریش کو ابتدا میں اس دعوت سے کوئی وحشت نہیں ہوئی۔ یہ اسی طرح کی صورت حال تھی جیسے حضرت ابراہیمؑ اپنے والد اور قوم کو بتوں کی پوجا سے منع کرتے رہے تو قوم ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے بتوں کو توڑ ڈالا اور بتوں کے پجاریوں نے قیاس آرائی شروع کی کہ یہ کارروائی کس شخص کی ہو سکتی ہے تو انہوں نے یقین کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کا نام نہیں لیا بلکہ محض گمان کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗ اِبْرٰهِيْمُ. (الانبیاء ۲۱:۶۰)

ایک نوجوان کو، جس کا نام ابراہیم ہے، ہم نے ان بتوں کا (برا) ذکر کرتے سنا ہے۔

یعنی یہ شخص چونکہ بتوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار مخالفانہ انداز میں کرتا رہا ہے لہٰذا ممکن ہے اسی نے یہ حرکت کی ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے جب وہ تقاضے سامنے آئے جن کی زد قریش کے مفادات پر پڑتی تھی اور انہیں اپنے مذہبی نظام میں دراڑیں پڑنے کا خطرہ محسوس ہوا تب انہوں نے نبی ﷺ اور آپ کی دعوت کے معاملہ میں رویہ تبدیل کیا۔

ثالثاً: عربوں کی زندگی قبائلی تھی۔ ہر خاندان اپنے افراد کا بہی خواہ اور محافظ ہوتا تھا۔ دوسرے قبائل اور خاندانوں کے لوگ کسی غیر خاندان کے فرد کو نقصان پہنچانے سے پہلے سو بار سوچتے تھے کہ اس فرد کے خاندان کے جذبۂ انتقام کو کیسے ٹھنڈا کریں گے اور ان کے نقصان کی تلافی کی کیا صورت ہوگی۔ قریش کے اندر جب اسلام قبول کرنے والوں پر تشدد کرنے اور دعوت دین کو زور و قوت سے کچل دینے کا خیال پیدا ہوا تو بار بار یہی سوال سامنے آتا رہا کہ متاثرین

کے خاندانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت بھی کسی میں ہے یا نہیں۔ عرب قبائل میں اپنے افراد کا ساتھ دینے اور ان کے ساتھ زیادتی کا انتقام لینے کی روایت اس قدر مستحکم تھی کہ بعد میں جب یثرب کے قبائل اوس اور خزرج نے اسلام قبول کیا اور آنحضرت ﷺ کو اپنے ہاں لے جانے کی پیشکش کی تو اس سے پہلے آپ سے یہ یقین دہانی حاصل کی کہ ان قبائل کے ان افراد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا جو یہودیت اختیار کر چکے ہیں۔ چنانچہ حضورؐ نے ان یہودیوں کے وہی حقوق تسلیم کیے جو اسلام لانے والوں کے تسلیم کیے۔

قریش کو انذار کا حکم:

نبی ﷺ کی دعوتِ اسلام کو برداشت کرنے کا یہ دور عارضی تھا۔ جلد ہی بیت اللہ کے متولیوں پر قرآن میں تنقید ہونے لگی اور ان کی کوتاہیوں کا پردہ چاک ہونے لگا تو ان کا رویہ بھی بدل گیا۔ انہوں نے رسول اللہؐ کی برملا مخالفت شروع کر دی اور دعوت کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگے۔ قرآن میں نبی ﷺ کو یہ ہدایت ملی کہ اپنے قرابت مند خاندان کو انذار کرو۔ انذار کا مطلب یہ تھا کہ ان کو خبردار کرو کہ وہ اپنی حرکتوں کو چھوڑ کر اسلام کی تعلیم کو قبول کریں ورنہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ کے لیے تیار رہیں، جس سے چھڑانے والا اور اللہ کے عذاب سے پناہ دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ قرابت مند خاندان سے مراد بنو ہاشم ہی نہیں بلکہ وہ تمام خاندان بھی تھے جن کا تعلق خانہ کعبہ کے نظم و نسق، اس کی حفاظت و خدمت اور مذہبی رسوم ادا کروانے سے تھا یعنی قریش کے تمام خانوادے۔ انذار کی ہدایت کا مقصد یہ تھا کہ اللہ کے گھر کے یہ متولی اور ناظمین اس سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی اصلاح کر کے دوسرے عربوں کے لیے قبول اسلام کی راہ کھولیں کیونکہ دین کے معاملہ میں یہ ان کے مذہبی پیشوا ہیں۔ اگر یہ طبقہ کسی طرح دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے تو دوسرے لوگ بہ آسانی ان کی پیروی میں دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور جب تک یہ طبقہ دعوت کو قبول نہ کرے تو یہ عوام الناس کو اپنے مشوروں اور نصیحتوں کے ذریعے دعوت کی مخالفت اور بیخ کنی پر اکساتا رہتا ہے۔

یاد رہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ اللہ واحد کی عبادت کے مرکز کے طور پر بنایا تھا اور اپنی اولاد کو اس میں نماز، طواف، اعتکاف، حج اور قربانی کی سہولتیں مہیا کرنے اور زائرین کی خدمت کرنے کا فریضہ سونپا تھا۔ لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ اولادِ ابراہیم بیت اللہ کے اندر شرک کو تحفظ دینے اور توحید کی آواز دبانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اگر یہ لوگ حضورؐ کی دعوت کو قبول کر لیتے تو بیت اللہ کے نظام کو اس کی اصل شکل میں قائم کرنا ممکن

ہوتا جس کی آرزو ابراہیمؑ نے کی تھی اور جس کے لیے دردِ دل کے ساتھ دعائیں کی تھیں۔

قرآن کی مذکورہ ہدایت پر عمل کرنے کے لیے نبی ﷺ نے جہاں ہر ممکن طریقہ اختیار فرمایا وہیں عربوں میں مروج طریقہ بھی اپنایا۔ ان کے ہاں یہ روایت تھی کہ اپنے دشمنوں کی غارت گری سے محفوظ رہنے کے لیے وہ اپنی بستی کے قریب کسی ٹیلہ پر ایک دیدبان مقرر کر دیتے جو چاروں طرف نگاہ رکھتا۔ اگر دیدبان کبھی خطرہ محسوس کرتا تو 'یا صباحاہ' کا نعرہ بلند کرتا جس کا مطلب ہوتا کہ غارت گری کا خطرہ ہے۔ لوگ آواز سنتے ہی گھروں سے نکل کر بھاگتے ہوئے اس کے پاس آتے اور خطرہ کی نوعیت پوچھتے۔ اگر حملہ ہونے والا ہوتا تو وہ اپنے ہتھیار لگا کر میدان میں آ جاتے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ایک صبح کوہ صفا پر کھڑے ہو کر یہی نعرہ لگایا تو لوگوں نے حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھا کہ یہ نعرہ کون لگا رہا ہے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ محمد (ﷺ) کی آواز ہے تو قریش کے عام و خاص صفا کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں ایک نذیر (یعنی خطرہ سے خبردار کرنے والا) ہوں۔ میری اور تم لوگوں کی مثال اس آدمی کی ہے جو دشمن پر نظر رکھنے کے لیے اپنے قبیلہ کی دیدبانی کرتا ہے۔ پھر جب ڈرتا ہے کہ دشمن کہیں ان تک پہنچ نہ جائے تو 'یا صباحاہ' کا نعرہ بلند کر دیتا ہے۔ (میں ایک آنے والے سخت عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ اے بنو کعب بن لوی، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو مرہ بن کعب، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد شمس، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد مناف، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو ہاشم، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد المطلب، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ میں اللہ کے ہاں تمہارے لیے کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ البتہ تمہارے ساتھ میرا رحمی رشتہ ہے، سو میں اس کا حق ادا کرتا رہوں گا۔ اس موقع پر واحد آواز جو آپ کے خلاف اٹھی وہ ابولہب کی تھی جس نے کہا تَبًّا لَّکَ اَلِهٰذَا دَعَوتَنَا (غارت ہو، کیا اسی لیے تم نے ہمیں بلایا تھا؟)[5]

دوبارہ آپ نے انذار کی ہدایت پر عمل کرنے کی یہ تدبیر اختیار کی کہ تمام قرابت داروں کو کھانے پر بلایا۔ جب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ نے ان سے خطاب کر کے اپنی دعوت پیش کرنا چاہی لیکن ابولہب آپ کی تقریر میں مخل ہو گیا اور لوگوں سے کہا کہ اب یہ شخص تم پر اپنا جادو چلانا چاہتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی منتشر ہو گئے۔ اس طرح حضورؐ کو دعوت پیش کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ تاہم نبی ﷺ نے برملا

انذار کے مضمون کو عوام میں بیان کرنا شروع کر دیا جس سے قریشی لیڈر چیں بجبیں ہوئے۔

حوالہ جات

۱۔ صحیح مسلم۔ باب بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ۔ ج ۱ص ۸۰

۲۔ سورہ النجم ۵۳: ۱۔۱۰

۳۔ صحیح بخاری۔ باب کیف کان بدء الوحی

۴۔ سلیمان منصور پوری۔ رحمۃ اللعالمین۔ ص ۸۱، ۱۲۳

۵۔ صحیح مسلم۔ باب فی قولہ تعالیٰ و انذر عشیرتک الاقربین۔ ص ۱۰۷۔۱۰۹

باب 10

قریش کی پریشانی اور مسلمانوں پر سختی

مسلمانوں پر تشدد کا دور:

قریش کے اکابر نے دیکھا کہ محمد (ﷺ) جو کلام پیش کر رہے ہیں وہ بے حد متاثر کرنے والا ہے، لسانی طور پر پُرکشش ہے اور اس میں عقل کے لیے بھی اپیل ہے۔ یہ کلام نت نئے تقاضے اور مطالبے سامنے لا رہا ہے اور اب اس نے مشرکانہ نظام زندگی کی بنیادوں پر تیشہ چلانا شروع کر دیا ہے۔ چونکہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی تعلیم کو قبول کر رہے تھے اس لیے انہیں اپنے خلاف عام بغاوت پیدا ہو جانے کا خطرہ محسوس ہوا۔ اس کو روکنے کی فوری تدبیر یہی اختیار کی جا سکتی تھی کہ اسلام قبول کرنے والوں پر سختی کر کے ان کے لیے زندگی گزارنا اجیرن کر دیا جائے۔ اس میں بڑی رکاوٹ قبائلی نظام تھا جس میں کوئی شخص کسی دوسرے خاندان کے فرد پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ ہر خاندان اپنے افراد پر خود ہی ہاتھ ڈالے۔ اس میں بھی پہلا ہدف غلاموں اور لونڈیوں کو بنایا گیا۔ سیرت کی کتابوں میں یاسر، ان کی بیوی سمیہ، عمار بن یاسر، بلال، خباب بن ارت، عامر بن فہیرہ، ابوفکیہہ، لبینہ، زنیرہ رضوان اللہ علیہم پر تشدد کے واقعات پڑھیے تو آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کو بھوکے پیاسے رکھنا، دھوپ میں گھنٹوں کھڑا رہنے پر مجبور کرنا، گرم ریت پر لٹانا، زدوکوب کرنا ایک معمول کی کارروائی تھی۔ لیکن دلوں میں ایمان کی جو شمع روشن ہو چکی تھی وہ اس ظلم سے بجھنے نہیں پائی۔ حضرت یاسرؓ اور ان کی زوجہ سمیہؓ نے جام شہادت نوش کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے متعدد غلاموں کو ان کے آقاؤں سے خرید کر آزاد کر کے ان کو ظلم وستم سے نجات دلائی اور اس میں اپنے والد ابوقحافہ کی ناراضی مول لی۔

سابقون اولون کی عمروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ تر نوجوان طبقہ آنحضرتؐ کی دعوت سے متاثر ہوا۔ بعثت کے وقت حضورؐ کی اپنی عمر چالیس برس تھی۔ ابوبکر صدیقؓ آپ سے تین سال چھوٹے تھے لیکن مسلمانوں کے بڑے بوڑھے کہلاتے تھے۔ گویا باقی مسلمانوں کی عمریں ان سے کم تھیں۔ زیادہ قریشی نوجوان بیس یا تیس کے پیٹے میں تھے۔ اکابرین قریش نے جب سربراہان خاندان کو یہ ہدایت کی کہ وہ اپنے ان نوجوانوں کو قابو میں لائیں جو محمد (ﷺ)

کا ساتھ دے رہے ہیں تو ظلم وتشدد کے دھارے کا رخ ان نوجوانوں کی طرف بھی مڑا۔ تاریخ میں عثمانؓ بن عفان، زبیرؓ بن عوام، مصعب بن عمیرؓ، خالدؓ بن سعید بن العاص وغیرہ کے نام محفوظ ہیں۔ ان کو اتنی ایذائیں دی گئیں کہ معاملہ ان کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ یہی حال باقی مسلمانوں کا تھا۔ ابو بکر صدیقؓ جیسے فرزانہ، ہمدرد و غم گسار شخص کو بھی نہ بخشا گیا۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق انہوں نے بھی راہ خدا میں زخم کھایا۔

مسلمانوں کے لیے ان حالات کا مقابلہ طاقت سے کرنا ممکن نہ تھا۔ کوئی چیز اگر ان کا حوصلہ قائم رکھ سکتی تھی تو وہ اللہ پر توکل، دین پر ثابت قدمی کے اچھے انجام اور آخرت کی کامرانی کا یقین تھا۔ اس موقع کی مناسبت سے متعدد آیات قرآنی نازل ہوئیں۔ چونکہ آدمی دوسرے کی مثال سے سبق حاصل کرتا ہے اس لیے اہل ایمان کی تربیت کی خاطر بنی اسرائیل کے ان نوجوانوں کا حوالہ دیا گیا جو فرعون کے تشدد کے اندیشہ کے باوجود حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے والے بنے۔ انہوں نے جب اپنے رسول سے فرعونوں کے ظلم کا تذکرہ کیا تو انہوں نے ان کو اللہ پر بھروسہ کرنے اور اسی سے مدد مانگنے کی ہدایت کی۔ قرآن میں بتایا گیا:

> فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۔ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۔ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۔ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۔ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۔ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (یونس ۱۰:۸۳۔۸۷)
>
> موسیٰ کی بات نہ مانی مگر اس کی قوم کے تھوڑے سے نوجوانوں نے، فرعون اور اپنے بڑوں سے ڈرتے ہوئے کہ مبادا وہ ان کو کسی فتنہ میں ڈال دے۔ بے شک فرعون ملک میں نہایت سرکش اور حد سے بڑھ جانے والوں میں سے تھا۔ اور موسیٰ نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر چکے ہو۔ وہ بولے کہ ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب! ہمیں ظالموں کے ظلم کا آماجگاہ نہ بنا اور ہمیں اپنے فضل سے کافروں کے پنجہ ستم سے چھڑا۔ اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھہرا لو اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز کا اہتمام کرو۔ اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دے دو۔

معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کے لیے بعض گھر مخصوص کر لینے کی اسی ہدایت کی روشنی میں نبی ﷺ نے حضرت ارقمؓ بن عبد مناف کے گھر کا انتخاب فرمایا جہاں مسلمان جمع ہوتے، نماز باجماعت ادا کرتے، قرآن سیکھتے اور

آنحضرتؐ کی نصیحت وموعظت سے حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت حاصل کرتے۔ اس طرح دارارقم مکہ میں اہل ایمان کی تعلیم وتربیت کا پہلا مرکز بن گیا۔

دارارقم کے انتخاب کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ بیت اللہ سے کوہ صفا کی طرف یعنی جانب جنوب میں تھا۔ اس گھر میں نماز پڑھتے ہوئے خانہ کعبہ (ابراہیمی قبلہ) اور بیت المقدس (اہل کتاب کا قبلہ) دونوں کو بیک وقت قبلہ بنانا ممکن تھا۔ چونکہ قبلہ کے بارے میں ابھی تک کوئی واضح حکم نازل نہیں ہوا تھا، نبی ﷺ نے اہل کتاب کے معروف قبلہ کو اپنے اجتہاد سے اختیار کرلیا۔ آپ کو ابراہیمی قبلہ سے علیحدگی بھی ناگوار تھی اس لیے آپ دونوں قبلوں کو جمع کرتے۔ آپ کا طریقہ مسجد حرام کے اندر بھی یہی تھا کہ آپ رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان کی دیوار کو سامنے رکھ کر نماز ادا کرتے تھے تاکہ دونوں قبلے جمع ہوجائیں۔

دوسرے موقع پر قرآن کا ارشاد یوں ہے:

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ وَّ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ. وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ. اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ. (البروج ۸۵:۴۔۱۰)

ہلاک ہوئے ایندھن بھری آگ کی گھائی والے، جب کہ وہ اس پر بیٹھے ہوں گے اور جو کچھ وہ اہل ایمان سے کرتے رہے اس کو دیکھیں گے، اور انہوں نے ان پر محض اس وجہ سے غصہ نکالا کہ وہ ایمان لائے اس خدائے عزیز وحمید پر، جس کی ہی بادشاہی آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو ستایا، پھر توبہ نہ کی، ان کے لیے لازماً جہنم کی سزا اور جلنے کا عذاب ہے۔

جب نوجوانوں کو ان کے کافر باپوں یا رشتہ داروں نے سختیاں کر کے محمد (ﷺ) کا دین چھوڑنے پر مجبور کیا تو اس صورت حال میں قرآن نے ان کو واضح ہدایات دیں کہ اللہ نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت ضرور کی ہے لیکن والدین کو یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اولاد کو اللہ کے شریک ماننے پر مجبور کریں۔ اس معاملہ میں ان کی اطاعت کی ضرورت نہیں۔ یہ بزرگان خاندان یہ بھی کہتے کہ ہم لوگ تم نوجوانوں سے زیادہ خیر وشر اور نیک وبد کو سمجھنے والے ہیں۔ اس وجہ سے تم ہمارے طریقہ پر چلتے رہو۔ فرمایا:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا. وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا. اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ. (العنکبوت۲۹:۸۔۹)

اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں تو ان کی بات نہ مان۔ میری ہی طرف تم سب کی واپسی ہے، تو جو کچھ تم کرتے رہے ہو میں اس سے تمہیں آگاہ کروں گا۔ اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو ہم ان کو صالحین کے زمرہ میں داخل کریں گے۔

(اسلام قبول کرنے والے قریش کے ہاتھوں ظلم ہی نہیں سہہ رہے تھے بلکہ قریش کے دوسرے گھٹیا ہتھکنڈوں کا مقابلہ بھی کر رہے تھے۔ ان میں جو لوگ تجارت پیشہ تھے ان سے لین دین نہیں کرنے دیا جاتا تھا۔ جو لوگ محنت مزدوری کرتے تھے ان کو ان کا حق خدمت دینے میں لیت ولعل سے کام لیا جاتا۔ مثال کے طور پر حضرت خبابؓ نیزے بھالے بنانے کا کام کرتے تھے۔ قرشی لیڈر عاص بن وائل کے ذمہ ان کی مصنوعات کی قیمت نکلتی تھی۔ عاص نے ان کی ادائیگی روک لی۔ خبابؓ اس کے پاس تقاضا کرنے گئے تو وہ کہنے لگا کہ جب تک محمد کا انکار نہیں کرو گے اس وقت تک میں کچھ نہیں دوں گا۔ خبابؓ نے جواب دیا، جب تک اللہ تجھے موت نہ دے دے یہ کام تو میں کرنے کا نہیں۔ بلکہ اس وقت تک بھی نہیں کروں گا جب مرنے کے بعد تمہارے جی اٹھنے کا وقت آئے گا۔ وہ بولا، ٹھیک ہے، مجھے میرے حال پر چھوڑو، یہاں تک کہ میں مر جاؤں، پھر اٹھایا جاؤں، پھر مجھے مال و اولاد ملے۔ جب ایسا ہو گا تو میں تیرا قرض ادا کر دوں گا[1])

جب رسول اللہؐ نے شرک کے خلاف قرآن کا یہ موقف پیش کیا کہ یہ ایک من گھڑت نظام ہے جس کی کوئی گنجائش دین ابراہیمی میں ہے اور نہ اس کے حق میں کوئی عقلی دلیل ہے، یہ گمراہی پچھلے دور کے لوگوں نے بے دلیل اختیار کر لی، تو قریش کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ ان کے خیال میں اگر یہ تصور عوام الناس میں پھیل جاتا تو ان کے اقتدار کی ساری عمارت زمین بوس ہو سکتی تھی۔ اس لیے انہوں نے آنحضرتؐ کے معاملہ میں مزید خاموشی کو خلاف مصلحت سمجھا اور آپ کی راہ روکنے کے لیے مؤثر طریقے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

اشراف قریش کا ایک وفد بنو ہاشم کے سردار ابو طالب کے پاس گیا اور شکایت کی کہ آپ کا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے، ہمارے مذہب کو غلط قرار دیتا ہے، ہمارے آباء و اجداد کو گمراہ سمجھتا ہے اور اپنے اس خیال کا برملا اظہار کرنے لگا ہے۔ اب یا تو آپ اس کو ایسا کرنے سے باز رکھیں یا اس کے اور ہمارے درمیان میں سے نکل جائیں تاکہ ہم خود اس سے نمٹ لیں۔ ابو طالب نے نرمی سے ان کو ٹھنڈا کیا اور خوش اسلوبی سے معاملہ کو ٹال دیا۔

جب حضورؐ کی دعوت اسی طرح زور و شور سے جاری رہی تو اشراف قریش دوبارہ وفد کی صورت میں

ابوطالب کے پاس پہنچے اور اب یہ دھمکی دی کہ اگر آپ نے بھتیجے کو نہ روکا تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کی اور اس کی رائے ایک ہی ہے اور یہ چیز ہمارے درمیان لڑائی کا باعث بن جائے گی۔ ابوطالب کو اس الٹی میٹم سے سخت فکر لاحق ہوئی۔ انہوں نے رسول اللہ کو بلا بھیجا اور کہا کہ بھتیجے! اپنے اوپر اور میرے اوپر رحم کرو۔ مجھ پر اتنا بوجھ مت ڈالو جس کو میں برداشت نہ کر سکوں۔ آنحضرت ﷺ نے اندازہ لگایا کہ چچا شاید اب میرا ساتھ چھوڑ جائیں کیونکہ ان کی باتوں سے کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا، چچا جان! میں اس کام کو نہیں چھوڑوں گا، یہاں تک کہ اللہ مجھے غلبہ عطا فرمائے گا یا میں اس جدوجہد میں ختم ہو جاؤں گا۔ ابوطالب نے حضورؐ کا جب یہ عزم دیکھا تو کہا، بھتیجے! جاؤ جو تبلیغ چاہو کرو۔ میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے کبھی نہیں کروں گا۔

قریش نے ابوطالب کو یہ پیشکش بھی کی کہ آدمی کے بدلے آدمی لے کر تصفیہ کر لیں اور محمد (ﷺ) کو ان کے حوالہ کر دیں۔ مطعم بن عدی، جو عبد مناف ہی کے خاندان بنو نوفل سے تھا، اس تجویز پر قریش کا ہم نوا ہو گیا۔ ابوطالب کو یہ تجویز ہتک آمیز لگی کہ بنو ہاشم کا بہترین فرد قریش کے حوالہ کر دیا جائے کہ وہ اس کو قتل کر سکیں، لہذا انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اس سے بنو عبد مناف بھی تقسیم ہو گئے۔ صرف بنو ہاشم (سوائے ابولہب کے) اور بنو مطلب رسول اللہؐ کے ساتھ رہ گئے۔

قریش کی پیدا کردہ دہشت اور خوف کی حالت میں بھی جب اسلام قبول کرنے والے نوجوان اور لونڈی غلام ثابت قدم رہے اور نبی ﷺ اپنی دعوت کے نئے نئے پہلو اجاگر کرتے رہے تو قریش کے اکابر کی تشویش مزید بڑھ گئی۔ انہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ اس دعوت کا مقابلہ کیسے کریں۔ ہر لیڈر اپنی سی کوشش کرتا لیکن ناکام ہو جاتا۔ اس سلسلہ کی ایک کوشش ایک بڑے لیڈر عتبہ بن ربیعہ نے بھی کی۔ اس نے دوسرے ساتھیوں سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں محمد (ﷺ) سے گفت و شنید کرتا اور کچھ پیش کش کرتا ہوں۔ ممکن ہے یہ منصوبہ کام کر جائے اور وہ کوئی بات قبول کر کے اپنی جدوجہد سے باز آ جائے۔ قریش نے اجازت دی تو وہ حضورؐ کے پاس گیا۔

عتبہ نے کہا بھتیجے! ہمارے خاندان میں تمہیں جو شرف اور عزت کا مقام حاصل ہے وہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ لیکن تم نے اپنی قوم کو بڑی مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ ان کے معبودوں اور دین کو عیب لگا کر ان کی عقلوں کو ماؤف کر دیا ہے۔ تم ان کے آباء کو کافر کہتے ہو۔ اگر تم اس جدوجہد سے مال و دولت چاہتے ہو تو ہم تمہیں مال اکٹھا کر کے دے سکتے ہیں۔ اگر شرف چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار تسلیم کر لیتے ہیں۔ تمہارے بغیر ہم کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ اگر بادشاہت چاہتے ہو تو تمہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں۔ اگر تم پر کسی

جن کا اثر ہے تو ہم کسی ماہر جھاڑ پھونک کرنے والے کو طلب کر لیتے ہیں۔ حضورؐ سنتے رہے۔ جب اس نے بات ختم کی تو آپ نے سورہ حم السجدہ کی تلاوت کی۔ اس کے بعد فرمایا تمہارا معاملہ اس تعلیم سے ہے۔ عتبہ واپس اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور ان کو بتایا کہ میں نے محمد سے جو کلام سنا ہے اس کی نظیر موجود نہیں۔ نہ یہ شعر ہے، نہ جادو، نہ کہانت۔ اے قریش! میری مانو تو اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ کلام کسی بڑے انجام تک پہنچنے والا ہے۔ اگر عرب محمد (ﷺ) کو کسی مصیبت میں ڈالیں گے تو تمہارا مقصد اس میں حصہ لیے بغیر بھی پورا ہو جائے گا۔ اگر یہ شخص غلبہ پا گیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت اور اس کی عزت تمہاری عزت ہو گی۔ اس پر قریش نے کہا اے ابوالولید! اس شخص نے اپنے کلام سے آپ پر جادو کر دیا ہے۔ عتبہ نے کہا، میں نے اپنی رائے دے دی، اب جو چاہو کرو۔

جب ہشام بن الولید کے بھائی الولید بن الولید مسلمان ہوئے تو بنو مخزوم کے کچھ لوگ ہشام کے پاس پہنچے۔ وہ یہ تجویز لے کر گئے تھے کہ ان کے خاندان کے نوجوان مثلاً سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ اور الولید بن الولید مسلمان ہو چکے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ نئے دین میں شامل ہونے والوں کو سزا دیں۔ لہٰذا الولید کو ہمارے حوالہ کیا جائے۔ ہشام نے کہا کہ الولید کو لے جاؤ لیکن اس کو بچا کر رکھنا۔ اللہ کی قسم: اگر تم نے اس کو قتل کیا تو میں تمہارے خاندان کے اشراف میں سے کسی بڑے آدمی کو بدلے میں قتل کر دوں گا۔ جب بنو مخزوم کے لوگوں نے یہ جواب سنا تو کان لپیٹ کر واپس چلے گئے[1]۔

اب تک قریش مسلمان ہونے والوں کو اذیتیں دیتے تھے لیکن اب انہوں نے خود نبی ﷺ کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ آپ کسی کو لا الہ الا اللہ کی تلقین فرماتے تو لوگ آپ کو برا بھلا کہتے اور آپ پر خاک پھینکتے۔ ایک مرتبہ حضورؐ مسجد حرام میں نماز ادا کر رہے تھے تو ایک شقی القلب لیڈر عقبہ بن ابی معیط نے آپ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اتنے زور سے کسا کہ آپ کا گلا گھٹنے لگا۔ حضرت ابوبکرؓ نے دیکھ لیا اور عقبہ کو دھکا دے کر علیحدہ کیا۔ ایک مرتبہ آپ طواف کر رہے تھے۔ اس وقت عقبہ بن ابی معیط، ابوجہل اور امیہ بن خلف حطیم میں مجلس آرا تھے۔ ہر شوط پر جب آپ ان کے پاس سے گزرتے تو وہ آوازے کستے۔ تین شوط کے بعد آپ نے رک کر ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔ اس پر وہ لوگ دہشت زدہ ہو گئے اور مزید جملے کسنے سے باز رہے۔

سیدنا حمزہؓ کا اسلام:

ایک مرتبہ ابوجہل حضورؐ کے ساتھ صفا کے پاس الجھ گیا۔ آپ کو برا بھلا کہا اور گالیاں دیں۔ حضورؐ نے خاموشی سے سب کچھ برداشت کیا اور ابوجہل کو کوئی جواب نہ دیا۔ ابوجہل مسجد میں جا کر لیڈروں کی محفل میں بیٹھ گیا۔

عبداللہ بن جدعان کی آزاد کردہ ایک لونڈی نے یہ سارا ماجرا دیکھا۔ اتنے میں حضورؐ کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب کمان لیے ہوئے مسجد میں طواف کے لیے داخل ہوئے تو اس خاتون نے ابوجہل کی حرکت سے ان کو مطلع کیا۔ وہ اپنے عزیز بھتیجے کے ساتھ اس غیر شریفانہ سلوک سے مشتعل ہو گئے۔ مسجد میں جا کر کمان ابوجہل کے سر پر دے ماری اور کہا میرے بھتیجے کو گالی دیتے ہو۔ میں بھی اس کے دین پر ہوں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے میں بھی وہی کہتا ہوں۔ اگر ہمت ہے تو مجھ سے دو دو ہاتھ کر لو۔ اس صورت حال کو دیکھ کر بنو مخزوم نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ لیکن حمزہؓ کے اندر اس واقعہ سے جو انسان جاگا وہ اسلام کا بہت بڑا شیدائی اور جاں نثار ثابت ہوا۔ ادھر قریش کے لیے حمزہؓ کا اسلام ایک غیر معمولی صدمہ تھا کیونکہ یہ نہایت جری اور شجاع آدمی تھے۔

ایک دن ابوجہل نے ڈینگ مارتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں کل محمد (ﷺ) پر اس کی نماز کی دوران حملہ کروں گا۔ جب وہ مسجد میں جائے گا تو میں ایک نہایت بھاری پتھر اس کے سر پر دے ماروں گا۔ بنو عبد مناف اس کے بعد جو کچھ کریں مجھے اس کی پروا نہیں ہوگی۔ اگلے دن وہ بہت بڑا پتھر مسجد حرام میں لے گیا اور حضورؐ کا انتظار کرنے لگا۔ حضورؐ تشریف لائے تو حسب معمول نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ قریشی سرداروں کی نظریں اب ابوجہل پر تھیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔ حضورؐ جب سجدہ میں گئے تو وہ اٹھا اور بھاری پتھر لے کر حضورؐ کی طرف بڑھا۔ ابھی حضورؐ سے کچھ فاصلہ پر تھا تو وہ دہشت زدہ ہو کر پلٹا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں طاقت نہ رہی اور پتھر اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ قریشی سرداروں نے بھاگ کر اسے سہارا دیا اور پوچھا، ابوالحکم کیا ہوا؟ اس نے بتایا کہ جونہی میں محمد کے قریب ہوا ایک عظیم الجثہ اونٹ آڑے آ گیا۔ میں نے اس جیسی کوہان، اس جیسے دانت اور گردن کسی اونٹ کے نہیں دیکھے۔ وہ لپک کر مجھے کھانے کو آیا جس سے میری حالت متغیر ہو گئی۔

دوسری روایت میں اونٹ کے بجائے آگ کی ایک کھائی کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اونٹ ہو یا آگ کی کھائی، یہ رسول اللہؐ کو اس شیطان سے محفوظ رکھنے کا الٰہی انتظام تھا۔

ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعودؓ نے ارادہ کیا کہ میں حرم میں جا کر بلند آواز سے تلاوت کروں گا۔ لوگوں نے منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے اور حرم میں جا کر سورہ الرحمٰن پڑھنا شروع کی۔ کفار ان پر ٹوٹ پڑے اور مارنا شروع کیا۔ وہ زخمی ہو گئے لیکن تلاوت ختم نہ کی۔ واپس ہوئے تو چہرہ زخمی تھا۔

منافقین:

پیغمبر کی دعوت کا جب چرچا ہوتا ہے تو اس کے اولین مخاطبوں کے علاوہ عوام الناس میں بھی اس کی بات

سننے کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔ جو لوگ پہلے سے حق کے متلاشی ہوتے ہیں ان کے لیے پیغمبر کی دعوت اجنبی نہیں ہوتی۔ وہ اس کو اپنے دل کی آواز سمجھتے، اس کو لپک کر قبول کرتے اور پھر ہر قیمت پر اس دولت کی حفاظت کرتے ہیں، خواہ اس راہ میں انہیں قربانیاں ہی دینی پڑیں۔ عقلیت پسند لوگ پیغمبر کے دلائل پر غور کرتے، اس کے ماضی و حال کا مطالعہ کرتے اور اس کو قبول کرنے کے نتائج وعواقب پر سوچ بچار کر کے کوئی فیصلہ کرتے ہیں، اور جب فیصلہ کر لیتے ہیں تو اس پر قائم رہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جو کسی خارجی اثر کے تحت پیغمبر کے قریب تو آ جاتے ہیں لیکن وہ پیغمبر کی دعوت کے تقاضوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ آگے چل کر حالات کیا رخ اختیار کریں گے، معاشرہ حق کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں، اور جو لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں ان کو آئندہ کن احوال سے گزرنا پڑے گا۔

نبی ﷺ کی دعوت جب مکہ میں پھیلی تو کئی ایسے نوجوان بھی اس سے متاثر ہوئے جنھوں نے قبول اسلام کی ذمہ داریوں کے پیش وعقب کو نہیں سمجھا۔ وہ مسلمان ہوئے تو ابتدا میں انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئی لیکن جب آباء واجداد اور اعزہ واقربا کی طرف سے سختی شروع ہوئی تو وہ گھبرا گئے۔ والدین ان کو سمجھاتے کہ اس نئے دین کو چھوڑو۔ ایسا کرنے سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اگر یہ گناہ کا کام ہے تو اس کا وبال ہماری گردن پر ہوگا۔ جب وہ اس طرح کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آتے تو بڑے اپنی اولادوں کو اذیتیں دیتے اور زدوکوب کرتے۔ حضرت عثمان غنیؓ اگرچہ شادی شدہ اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے تھے اس کے باوجود ان کا چچا ان کو رسی سے باندھ کر مارتا۔ زبیر بن العوامؓ کا چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتا۔ جب نوجوانوں کو اس صورت حال سے گزرنا پڑتا تو خام ذہن کے لوگوں میں شبہات پیدا ہونے لگتے کہ جب ہم نے اللہ کا سیدھا راستہ اختیار کر لیا ہے تو اس پر چلنا اس قدر دشوار کیوں ہے؟ رسول اللہ پر ایمان لانا جان جوکھم کا کام کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سوالات راہ حق کے تقاضوں سے بے خبری کے باعث پیدا ہوتے تھے۔ لہٰذا قرآن نے بڑی وضاحت سے بتایا کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اپنے نام لیواؤں کو آزمائشوں کی بھٹی میں سے گزارتا رہا ہے۔ جو لوگ انسانوں کی پہنچائی ہوئی اذیت سے اس طرح گھبراتے ہیں جس طرح خدا کے عذاب سے ڈرنا اور گھبرانا چاہیے تو وہ جان لیں کہ دنیا کا دکھ تو چند روزہ ہے لیکن اگر امتحان سے گھبرا کر یہ اپنے دین اور اللہ واحد کی عبادت سے دستبردار ہو جائیں گے تو خدا کی پکڑ ابدی ہو گی۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں سے ان لوگوں کو ممیز کرتا رہے گا جو منافق ہوں گے۔

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ. (العنکبوت ۲۹:۱۱)

اور اللہ ایمان لانے والوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا اور منافقوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔

انہی کمزور ایمان والوں کے بارے میں دوسری جگہ فرمایا کہ جس حد تک حالات سازگار رہتے ہیں وہ اہل ایمان کا ساتھ دیتے ہیں۔ جونہی کوئی آزمائش پیش آتی ہے لڑکھڑا جاتے اور خدا سے مایوس اور بدگمان ہو کر دوسروں کو مولیٰ و مرجع بنا لیتے ہیں۔ تاہم مکہ کی پُرمحن زندگی میں نفاق کا فتنہ ابھر نہ سکا۔ قرآن مجید کا چونکہ یہ طریقہ ہے کہ وہ لوگوں کے رویوں کے بعید نتائج کو بھی سامنے لاتا ہے تاکہ لوگ شروع ہی سے اخلاقی امراض سے اپنے کو بچا سکیں، اس لیے یہاں بھی نمایاں کر دیا کہ یہ روش منافقین کی ہوتی ہے۔

قریش کی نئی منصوبہ بندی:

بنو ہاشم کو حضرت محمد ﷺ کی حمایت سے دستبردار کرنے میں جب قریش کو کوئی کامیابی نہ ہوئی، ابو طالب بحیثیت سربراہ خاندان حضورؐ کی پشت پناہی پر مصر رہے اور ان کے بھائیوں نے اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا لیکن اپنے بھتیجے کو برابر تحفظ فراہم کرتے رہے، اسی طرح جو نوجوان حضورؐ کے ساتھ تھے وہ ظلم و تشدد سہنے کے باوجود اپنے موقف پر قائم اور اختیار کردہ دین پر ثابت قدم رہے، تو انہوں نے پیش آمدہ چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے دوسرے طریقوں پر غور شروع کیا۔ صورت حال یہ تھی کہ روز بروز مسلمان قوی تر ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ مکہ کے بہت سے گھروں میں یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ آبائی مذہب کو خیر باد کہہ کر کہیں کوئی باپ، کہیں بیٹا یا بھائی، کہیں شوہر اور کہیں بیوی، اسلام کی تعلیم قبول کر کے رسول اللہؐ کے ساتھی بن گئے اور ہر گھرانے میں ایک ایسی بحث چل نکلی جس سے پیچھا چھڑانا کسی کے لیے ممکن نہ رہا۔

رسول اللہؐ کی دعوت اور اسلام قبول کرنے والوں کی استقامت نے جو صورت حال پیدا کر دی تھی اس سے نکلنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ قریش اپنے منصب کے اصل تقاضوں، اپنے طرز عمل اور کمزوریوں کا جائزہ لے کر اصلاح پر آمادہ ہو جاتے، ان کی نگاہ مکہ کے ابراہیمی مرکز توحید کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں اپنی کوتاہیوں کی طرف اٹھتی، اور وہ اپنے غیر فطری اور غیر اخلاقی نظام میں تبدیلی لاتے جو ان کے معاشرہ میں عوام الناس کے لیے مشکلات کا باعث بنا ہوا تھا۔ لیکن یہ طریقہ قریش کے متکبرانہ رویہ سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس سے ان کی انا مجروح ہوتی اور مفادات پر ضرب پڑتی تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ دوسرا طریقہ، جس سے وہ صورت حال کا مقابلہ کر سکتے تھے، یہ تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے پیغام کی مخالفت کی راہیں تلاش کرتے۔ بدقسمتی سے انہوں نے اسی راستہ کا انتخاب کیا۔ حالات کا تجزیہ کرنے پر وہ اس نتیجہ تک پہنچے کہ لوگ دو اسباب کی بنا پر نئے

دین کو اختیار کر رہے ہیں۔ایک یہ کہ محمد (ﷺ) کے کلام میں غیر معمولی تاثیر ہے۔ جو نوجوان اس کو سن لیتا ہے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ جب کلام بار بار کسی کو سنایا جاتا ہے تو وہ اس کا اتنا شیدائی ہو جاتا ہے کہ نہ کسی سختی کو خاطر میں لاتا اور نہ کسی ترغیب وتحریص کا اثر قبول کرتا ہے۔ چونکہ محمد اس کو وحی الٰہی قرار دیتے ہیں تو یہ چیز عوام کو مرعوب کر دیتی ہے۔ دوسرا یہ کہ لوگ محمد کے اس دعویٰ سے متاثر ہو گئے ہیں کہ وہ خدا کا نمائندہ ہے اور اس کی طرف سے اس کو جو پیغامات ملتے ہیں ان کے پہنچانے پر وہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔ان دونوں باتوں کا توڑ ان کو اس میں نظر آیا کہ ایک طرف محمد ﷺ کے پیش کردہ کلام کو ساقط الاعتبار ٹھہرائیں تاکہ لوگ اس کو اللہ کی جانب سے نازل شدہ کلام کی حیثیت نہ دیں بلکہ ایک انسانی کاوش کے درجہ میں رکھیں۔ دوسری طرف ان کے اس دعویٰ کو جھٹلایا جائے کہ وہ خدا کے منتخب رسول ہیں تاکہ لوگ ان کو اپنے جیسا انسان ہی سمجھیں اور ان کے نبی ہونے کے دعویٰ سے مرعوب نہ ہوں۔ اگلے دو ابواب میں ہم قریش کے ان اعتراضات کا جائزہ لیں گے جو انہوں نے قرآن پر اور رسول اللہؐ کی شخصیت پر کیے۔

حوالہ جات

1۔ صحیح بخاری۔کتاب البیوع۔باب ذکر القین والحداد
2۔ السیرۃ النبویہ۔ابن ہشام۔ج ا، ص ۳۲۱

باب 11

قرآن پر قریش کے اعتراضات

شاعری اور کہانت:

قرآن مجید نازل ہونا شروع ہوا تو ابتدائی سورتوں میں، جو مصحف کے آخری حصہ میں شامل ہیں، آیات نہایت گٹھے ہوئے، مختصر، لیکن جامع جملوں کی شکل میں تھیں۔ یہ کلام بے حد فصیح و بلیغ، اعجاز بیان کا کامل نمونہ، پر معانی اور پر شکوہ ہے۔ اس میں جلالت شان ہے۔ علاوہ ازیں اس میں قافیہ بندی پائی جاتی ہے۔ ان سورتوں میں اس دنیا کے خاتمہ، اس کے بعد پیش آنے والے واقعات، آخرت میں انسان کے محاسبہ اور جزا و سزا کا بکثرت ذکر ہے۔ ان تمام باتوں کا تعلق مستقبل یا ایک دوسرے جہان سے ہے۔ اس کلام کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

- كَلَّا وَالْقَمَرِ. وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ. وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ. إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ. نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ. لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ. (المدثر ۷۴: ۳۲۔۳۷)

  ان آیات کے قافیہ میں ۔َ ر کی تکرار دیکھیے۔

- إِذَا السَّمَاءُ انفَطَرَتْ. وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انتَثَرَتْ. وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ. وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ. عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ. (الانفطار ۸۲: ۱۔۵)

  ان آیات میں تقریباً برابر جملوں کا اختتام قافیہ ۔َ ت پر ہو رہا ہے۔

- إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا. إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا. وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا. (المعارج ۷۰: ۱۹۔۲۱)

  یہاں جملے برابر طوالت کے ہیں اور ان کا اختتام ۔ُ وعًا پر ہوا ہے۔

- كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ. وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ. وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ. وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ. إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ. (القیامہ ۷۵: ۲۶۔۳۰)

  یہاں تمام آیات ۔َاق پر ختم ہو رہی ہیں۔

ان آیات میں قافیہ بندی دیکھیے تو شعروں کا گمان ہوتا ہے، لیکن شعر میں جو وزن ہوتا ہے وہ ان میں نہیں ہے، لہٰذا یہ نثری کلام ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، لیکن قافیہ کے ساتھ، اگر مماثلت رکھتے ہیں تو وہ کاہنوں کے کلام

میں پائی جانے والی سجع سے ہے، لیکن یہاں کلام با مقصد، پرحکمت اور ایک واضح پیغام کا حامل ہے، جبکہ کاہنوں کا کلام تک بندی کی نوعیت کا ہوتا جس کا مدعا سمجھنا بھی مشکل ہوتا۔ ان آیات میں مستقبل کا تذکرہ دوٹوک انداز میں ہے جو ایک ان دیکھی حقیقت سے پردہ اٹھا رہا ہے۔ اس کے برعکس کاہنوں کی خبریں ذو معانی اور غیر یقینی ہوتیں۔ جہاں تک فصاحت و بلاغت کا تعلق ہے وہ اس کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے لیکن یہ اس فصاحت سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے جو انسانوں کے یا خود نبی ﷺ کے ذاتی کلام میں پائی جاتی ہے۔ اس کلام میں اس طرح کے بے معنی الفاظ بھی نہیں ہیں جو جادو کے منتروں میں ہوتے ہیں۔ ہر بات پر مغز، حقیقت افروز اور دل کو بھانے والی ہے۔ پورا قرآن اسی طرح کے فصیح و بلیغ کلام پر مشتمل ہے۔ اس کی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے اس کو تنقید کا نشانہ بنانا اور اس کے مخالف جذبات ابھارنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں۔ تاہم قریش نے پروپیگنڈا کی خاطر قرآن کو ہدف بنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس کو کبھی شاعری، کبھی کہانت، کبھی انسانی کاوش اور کبھی جادو کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے۔

عرب بالعموم کلام کے حسن و قبح کو پہچاننے والے اور اس کے زبردست نقاد تھے، اس لیے قرآن کو شاعری قرار دینا اپنی نادانی کا ثبوت پیش کرنا تھا۔ لیکن ایک پہلو ایسا تھا جس کی رو سے قریش یہ غلط بات کر کے بھی اپنی بات کی لاج رکھ سکتے تھے۔ عربوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر شاعر کسی جن کے زیر اثر اپنا کلام پیش کرتا ہے۔ رسول اللہؐ چونکہ بتاتے تھے کہ میرے اوپر فرشتہ وحی کلام نازل کرتا ہے، قریش اس کو آپ کی غلط فہمی قرار دیتے کہ آپ جس کو فرشتہ سمجھتے ہیں وہ حقیقت میں جن ہے جو شاعروں پر کلام کا الہام کرتا ہے۔

عربوں میں کاہنوں کی بڑی قدر تھی جو غیب دانی کے دعویدار تھے۔ لوگ کسی معاملہ میں مشورہ لینے کے لیے ان سے رجوع کرتے تو کاہن مراقبہ کر کے جنات و شیاطین کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کا ڈھونگ رچاتے۔ پھر وہ کچھ ایسا کلام سناتے جس کے فقرے مختصر اور قافیہ کے ساتھ ہوتے۔ اس مقفّٰی و مسجع عبارت کے متعلق ان کا دعویٰ یہ ہوتا کہ ان کو اس کا الہام ہوا ہے۔ اس عبارت سے ایک سے زیادہ معانی نکالنا ممکن ہوتا۔ اس میں مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کا عنصر بھی شامل ہوتا۔ قریش جب قرآن کو کہانت سے تعبیر کرتے تو ان کے پیش نظر ابتدائی سورتوں کے مختصر جملے، آیات میں قافیہ اور سجع کا اہتمام اور امور غیب کے بارے میں رہنمائی جیسی چیزوں کا اہتمام ہوتا۔ وہ اس کو کسی جن سے رابطہ کا نتیجہ قرار دیتے۔

قریش کا پروپیگنڈا درست نہیں تھا۔ اس کے اسباب بالکل واضح ہیں۔ اولاً یہ کہ شاعروں کی شاعری ان کے احساسات و جذبات اور وجدان پر مبنی ہوتی ہے۔ ان کے دل پر جو کچھ وارد ہوتا ہے وہ اس کو کسی اچھوتے اسلوب میں شعر موزوں کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اگر کل انہوں نے کسی نیک

جذبہ کے تحت اچھا شعر کہا تھا تو آج اس کے برعکس بے حیائی کا مضمون کیوں باندھ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑے شاعر کا کلام پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ وقتی جذبات واحساسات کے تحت انہوں نے نیک اور بد ہر طرح کی باتیں کہہ رکھی ہیں۔ان کے جوانی اور بڑھاپے کے کلام میں نمایاں فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ایک جگہ وہ رند شاہد باز نظر آتے ہیں تو دوسرے مقام پر پارسا اور ولی دکھائی دیتے ہیں۔ ثانیاً، شاعر صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کی ان کے ہاں اہمیت نہیں ہوتی۔ان کے کلام میں اللہ و رسول کی اطاعت کا پیغام ہوگا لیکن اپنا عمل اطاعت کے معانی سے نا آشنا ہوگا۔وہ مسائل تصوف بیان کریں گے لیکن اپنا محبوب شغل بادہ خواری ہوگا۔رجزیہ کلام میں شجاعت وشہامت کا مضمون باندھتے ہوئے آسمان اور زمین کے قلابے ملا دیں گے لیکن بزدلی کا یہ عالم ہوگا کہ ایک چھپکلی دیکھ کر ان پر لرزہ طاری ہو جائے گا۔ ثالثاً شاعروں کے کلام میں ہر طرح کے لوگوں کو اپنے مطلب کے مضامین مل جاتے ہیں اور وہ ان کے مداح بن جاتے ہیں۔ان میں جہاں کچھ اچھے لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں وہیں گمراہ، شر پسند اور اوباش لوگ بھی ان کے نام کا جھنڈا اٹھا لیتے ہیں۔

شاعری کی ان خصوصیات اور شاعروں کے اس کردار کے برعکس نبی ﷺ پر جو کلام نازل ہو رہا تھا اس کا ایک متعین ہدف تھا جس سے کہیں انحراف نظر نہیں آتا تھا۔ جو بات انہوں نے پہلے دن کہی ساری عمر مختلف اسالیب میں اسی کی وضاحت کرتے رہے۔اس سے سر مو ہٹنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔حقیقت میں یہی چیز قریش کے لیے باعث تشویش بھی تھی۔ مثلاً اگر توحید کا مضمون اتفاقی طور پر کبھی کبھی سامنے آیا ہوتا تو وہ اس کو برداشت کرتے رہتے۔اس مضمون کی تکرار ہی اصل میں ان کے نظام پر ضرب لگاتی تھی اور یہ بات ان کے لیے سوہانِ روح تھی۔ پھر آپ جو کچھ پیش کر رہے تھے نہ صرف اس پر خود عمل کر رہے تھے بلکہ اپنے تمام ساتھیوں کے اندر بھی اسی عمل کی نمود چاہتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کی تربیت سے معاشرے کے بہترین افراد کی ایک بڑی جماعت تیار ہو رہی تھی جن کے قول وعمل میں کوئی تضاد نہ تھا۔وہ جس بات کو درست تسلیم کر رہے تھے اس کے لیے ایثار وقربانی کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ان کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اسی چشمہ سے سیراب ہونے کے خواہشمند ہوتے جس سے ان فرشتہ سیرت لوگوں نے فیض پایا تھا۔چونکہ حضورؐ کے ہاں اصل قدر و قیمت عمل صحیح کی تھی اس لیے کوئی آوارہ اور فضول شخص آپ کے ساتھیوں میں شامل ہو ہی نہ سکتا تھا۔ قرآن نے قریش کو بار بار توجہ دلائی کہ سوچو، پیغمبر کے ساتھی آخر معاشرے کے صالح اور خدا ترس افراد کیوں بن رہے ہیں؟ آوارہ منش لوگوں کو یہ کلام کیوں اپیل نہیں کر رہا ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پیغمبر اعلیٰ اقدار کو معاشرہ میں رواج دے رہے ہیں۔وہ رب کی بندگی، بندوں کے لیے ایثار اور غریبوں کے لیے مواسات اور رحم دلی کا ہدف اگر دوسروں کے سامنے رکھتے ہیں تو سب سے آگے بڑھ کر

اس ہدف کو خود حاصل کرنے کی جدوجہد بھی کر رہے ہیں، اور اسی کو دلائل سے بھی ثابت کر رہے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو اچھے اور نیک طینت لوگوں کو اپیل کر رہی ہے۔ اگر پیغمبر ایک شاعر ہوتے تو دوسرے شاعروں سے مختلف نہ ہوتے۔

قریش کا قرآن کو کہانت کہنا بھی ایک دور کی کوڑی لانے کے مترادف تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن جیسا پاکیزہ، بامقصد، خداترسی اور خدمت خلق کی دعوت دینے والا کلام شیاطین کی بری فطرت کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ شیاطین کے مقاصد کے ساتھ مطابقت رکھنے والا وہی کلام ہو سکتا ہے جو شیطانی مقاصد پورا کرنے کے لیے موزوں ہو۔ پاکیزہ کلام اتار کر اور نیکی کا چرچا کر کے وہ اپنے ہی پاؤں پر کیوں کلہاڑی ماریں گے۔ پھر کلام اللہ کاہنوں کے کلام سے مختلف بھی ہے۔ اس جیسا فصیح و بلیغ کلام کہنا کاہنوں اور ان کے شیطانوں کے بس کی بات نہیں۔ شیطان اپنی باتوں کا القاء کسی نیک سرشت والے آدمی پر نہیں کرتے۔ باطل کو پسند کرنے والے جھوٹے لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں جو مکروفریب کے ذریعے لوگوں کو بے وقوف بنا کر کہانت کی دکان چمکاتے ہیں۔ یہ لوگ اخلاقی اعتبار سے بے حد پست ہوتے ہیں۔ جہاں تک کاہنوں کی دی ہوئی خبروں کا تعلق ہے ان میں سچ اور جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے کیونکہ جنات و شیاطین کو بارگاہ الٰہی کے معاملات تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ ان کے پاس خرافات کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ ان کا القاء جھوٹ پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس پیغمبر روح القدس سے فیض پاتا اور صداقت و امانت میں اپنا مثیل نہیں رکھتا ہے۔

انسانی کاوش:

قرآن اپنے پیغام کو جب دلائل سے ثابت کرتا اور لوگ اس سے متاثر ہو کر یہ سوچتے کہ اس قسم کا پرمغز کلام اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے بغیر کوئی شخص کیسے پیش کر سکتا ہے اور وہ لیڈروں کے پاس آ کر اپنا وسوسہ بتاتے تو لیڈر ان کو قائل کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ کلام محمد (ﷺ) ہی کے ذہن کی پیداوار ہے البتہ وہ تنہا یہ کام نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ بعض عجمی لوگ اور کچھ اہل کتاب اس کے ساتھی بن گئے ہیں اور وہ سب مل کر یہ کلام گھڑتے ہیں اور جتنا بنا چکتے ہیں اتنا محمد آ کر پیش کر دیتے ہیں اور اس کا اعتبار قائم کرنے کے لیے اس کو منسوب خدا کی طرف کر دیتے ہیں۔ اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو اللہ کو تو سوچ سوچ کر اتارنے کی ضرورت نہ تھی۔ قریش کا یہ اعتراض بھی بے جان تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انتہائی معیاری عربی میں ہے۔ ایسا کلام تخلیق کرنا کسی عجمی کے بس کی بات ہے اور نہ پیغمبر ﷺ کا ذاتی کلام اس نوعیت کا ہے۔ قرآن اگر انسانی تصنیف ہوتا تو قریش کے پاس نہ بہترین شاعروں کی کمی تھی نہ اعلیٰ خطیبوں کی۔ ایسے بیسیوں افراد مہیا کرنا کچھ مشکل نہ تھا جو قرآن جیسا کلام تخلیق کر لیتے۔ قرآن کے مشابہ کلام وضع کرنا ممکن نہ تھا اسی لیے جب قریش کو ایک ہی پُر حکمت سورہ بنا کر پیش کرنے کی دعوت دی گئی تو آخر انہوں نے اس

چیلنج کا مقابلہ کیوں نہ کیا۔ باقی رہا یہ سوال کہ قرآن یکبارگی کیوں نہ اتارا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی بھی سنجیدہ اور پُر حکمت چیز فی الفور ذہنوں میں اتاری نہیں جاسکتی، اگر اس کی تعلیم دینا اور تفہیم کرنا مطلوب ہو۔ ایک ناول تو ایک ہی نشست میں پڑھا اور سمجھا جاسکتا ہے لیکن سائنس یا فلسفہ کی کوئی کتاب اس طرح پڑھنا اور سمجھ لینا ممکن نہیں ہوتا۔ قرآن کے نزول میں معاملہ اللہ کی قدرت کا نہیں بلکہ انسانوں کے تحمل کی صلاحیت کا ہے۔

سحر:

قرآن کی دعوت جس طرح لوگوں کو فتح کررہی تھی اس سے یہ بات واضح تھی کہ یہ کلام جہاں فصیح و بلیغ ہونے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا وہیں نہایت زوداثر بھی ہے۔ جب کوئی شخص اس کو سن لیتا ہے تو وہ نہ صرف اس کلام سے مسحور ہوجاتا ہے بلکہ اس کی خاطر خاندان اور قبیلے کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس بنا پر قریشی سردار قرآن کو جادو سے تعبیر کرتے۔ یہ معاملہ قرآن ہی کے ساتھ پیش نہیں آیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو پیغام پیش کیا اس کو بھی مخالفین سحر قرار دیتے۔ قریش کا یہ موقف بھی نادرست تھا۔ کلام وحی اور سحر میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ ساحروں کے شعبدوں کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے، وہ کبھی پائیدار کامیابی حاصل نہیں کرسکتے۔ سحر کے اثرات وقتی اور بہت جلد زائل ہونے والے ہوتے ہیں جبکہ قرآن نے لوگوں کے قلوب واذہان کو بدل کر رکھ دیا۔ سحر باطل ہوتا اور حق کے مقابلہ میں آکر بودا ثابت ہوتا ہے جبکہ قرآن سراپا حق ہے اور جب یہ حق باطل کے ساتھ ٹکرایا تو اس کو سرنگوں کردیا۔ قریش دیکھ رہے تھے کہ قرآن کے حق کی ان کے باطل کے ساتھ پنجہ آزمائی کامیابی سے ہمکنار ہورہی ہے اور ہر آنے والا دن باطل کو پسپا ہونے پر مجبور کررہا ہے۔ جادو کے اثر سے کردار کی تعمیر ممکن نہیں ہوتی جبکہ قرآن نہایت اعلیٰ کردار کے افراد تیار کررہا تھا۔ لہذا قریش کا پروپیگنڈا سادہ لوح عوام کو مطمئن کرتا رہا ہوگا یا ان کے خوشامدی اس سے ان کے ہمنوا ہوگئے ہوں گے لیکن عاقل وفرزانہ اس سے متاثر نہیں ہوسکتے تھے۔

قرآن کی حیثیت:

قریش کے پروپیگنڈے کا جواب مختلف پیرایوں میں خود قرآن میں دیا گیا اور ان کو ذہنی خلجان سے نکالنے کے لیے اس کلام کی حیثیت بار بار واضح کی گئی جس کو نبی ﷺ پیش کررہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ حق پسند طبیعتیں قومی تعصب سے نکلیں اور رسول اللہ کی دعوت کے لیے اپنے کان کھولیں۔ مختلف سورتوں میں کلام کے منبع، اس کو لانے والے فرشتہ کی صفات وخصوصیات اور اس کو وصول کرنے اور لوگوں تک پہنچانے والے رسول، سب کے بارے میں روشنی ڈالی گئی۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ. وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ. اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ. وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ. قَلِيْلًا مَّا

تُؤْمِنُوْنَ. وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ. قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ. تَنْزِيْلٌ" مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (الحاقہ ۶۹: ۳۸-۴۳)
پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو، اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے کہ بے شک یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے، اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں۔ تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔ اور یہ کسی کاہن کا بھی کلام نہیں۔ تم بہت ہی کم سمجھتے ہو۔ یہ خداوند عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ. الْجَوَارِ الْكُنَّسِ. وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ. وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ. اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ. ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ. مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ.. وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ. وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ. وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ. وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ. فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ.
(التکویر ۸۱: ۱۵-۲۶)

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے، چلنے والے اور چھپ جانے والے (ستاروں) کی، اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے، اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے، کہ لاریب یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔ وہ بڑا ہی قوت والا اور عرش والے کے نزدیک بڑا ہی بارسوخ ہے۔ اس کی بات مانی جاتی اور وہ نہایت امین بھی ہے۔ اور تمہارا یہ ساتھی (نبی ﷺ) کوئی خبطی نہیں ہے۔ اور اس نے اس کو کھلے افق میں دیکھا ہے۔ اور یہ غیب کی باتوں کا کوئی حریص نہیں ہے۔ اور یہ کسی شیطان رجیم کا القا نہیں ہے۔ تو تم کہاں کھوئے جاتے ہو؟

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ. عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ. بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ. وَ اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ. اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ.
(الشعراء ۲۶: ۱۹۲-۱۹۷)

اور بے شک یہ نہایت اہتمام سے خداوند عالم کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو تمہارے قلب پر امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے تاکہ تم لوگوں کو آگاہ کر دینے والوں میں سے بنو۔ واضح عربی زبان میں۔ اور اس کا ذکر اگلوں کے صحیفوں میں بھی ہے۔ کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ جہانوں کے مالک نے اپنے منصوبہ کے تحت اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے نہایت اہتمام سے اپنا کلام اتارا۔ اس کے نازل کرنے کے لیے جس فرشتہ کا انتخاب کیا وہ نہایت قوی اور مضبوط، عقل اور کردار میں محکم اور امانت دار ہے۔ ذمہ داری ادا کرنے میں وہ خیانت کا مرتکب نہیں ہوتا۔ وہ اعلیٰ صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ کوئی دوسرا اس کو متاثر یا مرعوب نہیں کر سکتا۔ وہ کسی سے دھوکا کھاتا اور نہ کسی کے ہاتھ بک سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے کلام میں کسی باطل کی آمیزش خارج از امکان ہے۔ اس مقرب فرشتہ نے نبی کو نہایت اہتمام، توجہ اور شفقت سے اس وحی کی تعلیم دی جو اللہ نے اس پر نازل کرنی چاہی۔ نبی کو ذاتی طور پر غیب دانی کا چسکا نہیں ہے۔ وحی الٰہی کی ذمہ داری تو بے سان وگمان اس پر آ پڑی ہے اور وہ اس کو نبھا رہا ہے۔ یہ نبی کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ وحی کی زبان نہایت معیاری اور واضح عربی ہے جس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ اس کی تعلیم میں کوئی کج پیچ نہیں۔ اس کی رہنمائی بالکل فطری، عقلی اور سیدھی راہ کی طرف ہے جس کے دلائل عقل و

فطرت، کائنات، اور انسانی نفسیات میں موجود ہیں۔ ان حقائق کے باوجود بھی قریش اگر اس کلام کی مخالفت کرتے ہیں تو یہ ان کے تعصب، تکبر اور ذاتی مفادات کے باعث ہے۔

زائرین کے لیے قریش کا یکساں موقف:

مکہ تمام قبائل عرب کا دینی مرکز تھا اور عرب حج اور عمرہ کی عبادات سے شغف رکھتے تھے اس لیے مکہ میں ان کی آمدورفت بکثرت ہوتی۔ قریش کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ باہر سے آنے والے لوگ مکہ آ کر جب ایک پیغمبر کی بعثت کی خبر سنیں گے تو قدرتی طور پر ان کو اس کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوگی۔ وہ مسلمانوں سے ملیں گے تو دعوت قبائل عرب میں بھی پھیل سکتی ہے۔ لہذا اس کے تدارک کے لیے اقدام کی ضرورت ہے۔ ولید بن مغیرہ کو، جو قریش کا ایک عمر رسیدہ اور زیرک سردار تھا، اس ضرورت کا احساس ہوا تو اس نے دوسرے سرداروں کے سامنے تجویز پیش کی کہ باہر کے لوگوں کے سامنے محمد کے بارے میں الگ الگ رائے ظاہر کر کے ان میں اس سے بالمشافہ ملاقات کا اشتیاق پیدا کرنے کے بجائے ہمیں متفق الرائے ہو کر ایک ہی بات بتانی چاہیے۔ طے ہوا کہ سب لوگ ایک ممکن وموزوں جواب سوچ کر آئیں تا کہ تمام آراء پر غور کر کے کسی ایک بات پر اتفاق کر لیا جائے۔ جب مجلس منعقد ہوئی تو ولید نے آرا طلب کیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہم محمد کے کلام کو کہانت کہیں گے۔ ولید نے کہا ہم نے کاہن دیکھ رکھے ہیں اور ان کا کلام بھی سن رکھا ہے۔ اللہ کی قسم، محمد کا کلام نہ تو کاہنوں کے خفیہ کلام کی طرح ہے نہ اس کی مماثلت ان کی قافیہ بندی سے ہے۔ کچھ لوگوں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ محمد کو جنون لاحق ہو گیا ہے۔ ولید نے کہا ہم جنونیوں کو پہچانتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں خلجان ہوتا اور وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ چیز محمد میں نہیں پائی جاتی۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ ہمیں چاہیے کہ محمد (ﷺ) کو بطور شاعر پیش کر دیں۔ ولید نے کہا کہ شاعری کی تمام اقسام اور ان کی خصوصیات سے ہم آگاہ ہیں، شعر کی پرکھ کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں جب شاعری کی یہ خصوصیات مفقود ہیں تو ہمارا یہ موقف کون مانے گا۔ لوگوں نے کہا پھر محمد (ﷺ) کو ساحر کہہ دینا چاہیے۔ ولید نے کہا، ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے۔ وہ منتر پڑھتے، پھونکیں مارتے اور گرہیں لگاتے ہیں۔ محمد (ﷺ) ایسا نہیں کرتے۔ اس پر لوگوں نے کہا، اے ابو عبد شمس! پھر آپ ہی ہمیں کوئی رائے دیں، ہم اسی پر قائم رہیں گے۔ اس نے جواب دیا، اللہ کی قسم! محمد کے پیش کردہ کلام میں شیرینی ہے۔ یہ پاتال میں اترا ہوا ایک ایسا درخت ہے جس کی شاخیں ثمرآور ہیں۔ ان تمام باتوں میں سے جو کچھ بھی تم کہو گے وہ صاف جھوٹ مانا جائے گا۔ البتہ اگر محمد کو ساحر کہو تو اس کا ایک محل ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ محمد کا کلام جادو کا سا اثر رکھتا ہے۔ جس طرح جادو کے عمل سے محبت والفت یا نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کیے جاتے ہیں اسی طرح اس کلام سے آدمی اور اس کے باپ، بیٹے یا بھائی کے درمیان، اور

شوہر اور بیوی کے درمیان، اور آدمی اور اس کے قبیلہ کے درمیان تفریق پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ طے ہوا کہ مکہ آنے والوں میں سے اگر کوئی شخص محمد کے بارے میں رائے طلب کرے تو سب اس کے کلام کو جادو کہیں اور کلام کے اس نتیجہ سے ڈرائیں۔ ولید کی اس تجویز پر قریش نے عمل کیا لیکن پھر بھی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا[1]۔

کتب سیرت میں بیان ہوا ہے کہ قبیلہ دوس کے ایک سردار طفیل بن عمرو ایک باصلاحیت آدمی تھے۔ وہ عمرہ کے لیے مکہ گئے تو وہاں سنا کہ ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کر رکھا ہے اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ انہوں نے قریش میں اپنی جان پہچان والوں سے دریافت کیا تو ہر ایک نے ان کو حضورؐ سے متنفر کیا اور آپ کے سایہ سے بھی بچ کر رہنے کی تلقین کی۔ قریش نے ان کو بتایا کہ اس شخص کے پاس ایک ایسا جادو ہے جو میاں اور بیوی کے درمیان تفریق پیدا کر دیتا ہے۔ طفیل کچھ روز تک حضورؐ کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے۔ مسجد میں آتے تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتے تاکہ مدعی نبوت کی کوئی بات کان میں نہ پڑ جائے۔ اتفاق سے ایک دن رسول اللہؐ نماز ادا کر رہے تھے کہ چند آیات ان کے کان میں پڑ گئیں۔ انہوں نے سوچا کہ میں ایک عاقل، جہاں دیدہ اور نیک و بد میں تمیز کی صلاحیت رکھنے والا آدمی ہوں۔ خود شاعر ہوں اور شاعرانہ کلام کی پرکھ کر سکتا ہوں۔ آخر ایک آدمی مجھے کیسے ورغلا سکتا ہے جب کہ میں اس کی طرف سے محتاط بھی ہوں۔ یہ سوچ کر طفیل انتظار میں رہے۔ جب آپ عبادت سے فارغ ہو کر گھر جانے لگے تو وہ آپ کے پیچھے ہو لیے۔ حضورؐ کے گھر پہنچ کر ملاقات کی خواہش کی۔ آپ نے اجازت دی تو انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کوئی جادو اثر کلام سناتے ہیں۔ پہلے تو میں اجتناب کرتا رہا تاکہ آپ کا کلام میرے کانوں میں پڑ کر مجھے گمراہ کرنے کا باعث نہ بن جائے لیکن اب میں نے سوچا کہ اس کو سننا تو چاہیے۔ اس لیے حاضر ہوا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو قرآن سنایا تو طفیل اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی وقت مسلمان ہو گئے۔ جب اپنے قبیلہ میں لوٹے تو اپنے والد اور بیوی کو بھی مسلمان کر لیا۔ بعد میں ان کی دعوت سے قبیلہ دوس کے مزید کئی افراد مسلمان ہوئے[2]۔

حوالہ جات

۱۔ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام۔ ج۱، ص ۲۷۰

۲۔ ایضاً، ص ۳۸۲

باب 12

رسول اللہ ﷺ کی شخصیت پر اعتراضات

رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں مکہ کے عوام وخواص کی دلچسپی اور اس سے مرعوبیت کو دیکھتے ہوئے جب قریش کے لیڈروں کو اس دعوت کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے اور ہر گھر میں اس کا چرچا ہونے لگا تو انہوں نے جہاں قرآن کی حیثیت کو مشکوک قرار دینے کی کوشش کی وہیں حضورؐ کے رسول اللہ ہونے کی حیثیت کو بھی مشتبہ ثابت کرنے کی سعی کی اور ایسے ایسے نکات پیش کیے جن سے عوام کو حضورؐ کے خلاف کیا جا سکے۔ یہ حملہ کئی جہتوں سے ہوا۔

بشریت کا طعنہ:

نبی ﷺ قریش کے خانوادہ بنی ہاشم میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شجرۂ نسب معلوم ومعروف تھا۔ آپ کی پرورش اہل مکہ کی نظروں کے سامنے ہوئی۔ آپ نے تجارت کو ذریعہ معاش بنایا۔ مکہ کے تاجروں کے ساتھ آپ کی شراکتیں رہیں اور آپ نے ایک سچے اور امانت دار تاجر کے طور پر نام پیدا کیا۔ آپ نے قریش ہی کے ایک خانوادہ میں شادی کی اور آپ کے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کی تمام ضرورتیں وہی تھیں جو معاشرہ کے ہر فرد کی ہوتی ہیں۔ آپ کو دوسرے انسانوں کی طرح زندگی کے نشیب وفراز سے گزرنا پڑا۔ جن مسائل سے آپ دوچار ہوئے وہ وہی مسائل تھے جو عام انسانوں کو پریشان رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے آپ کی زندگی دوسرے لوگوں سے کسی طرح مختلف نہ تھی۔ لہٰذا قریش کے پاس یہ پروپیگنڈا کرنے کا پورا موقع موجود تھا کہ محمد (ﷺ) تمام بشری خصوصیات رکھتے ہیں۔ یہ ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں۔ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے ان کو بازاروں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ یہ بیوی بچوں کے مسائل سے بالکل ہماری طرح دوچار رہتے ہیں۔ ان کو بیماری اور موت کے مراحل سے بھی دوسرے انسانوں کی طرح گزرنا ہے۔ پھر یہ کس برتے پر خدا کا نمائندہ ہونے کے دعویدار ہیں۔ یہ ہماری مانند صرف ایک بشر ہیں اور نبی ورسول ہونے کا ان کا دعویٰ بالکل بے حقیقت ہے۔

ظاہر ہے کہ محض اس پروپیگنڈے سے قریش کی بات ذہین لوگوں کے دلوں میں جگہ نہ پا سکتی تھی۔ وہ

دعوائے رسالت کی صداقت کا اطمینان کرنے کے لیے مزید سوالات کرتے تو قریش کے اکابر کو اپنی بات منوانے کے لیے کئی کئی توجیہات کرنا پڑتیں۔ وہ کہتے کہ محمد کو بطور رکن خاندان اور تاجراتی کامیابی حاصل نہیں ہوئی کہ ان کا شمار سادات قریش میں ہوتا اس لیے انہوں نے دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے کی غرض سے ایک ایسا دعویٰ کر دیا ہے جس کی صداقت کو جانچنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اگر ہم اس دعویٰ سے مرعوب ہو کر اپنے ہی جیسے ایک بشر کو خدا کا نمائندہ سمجھ کر سر پر بٹھا لیں گے تو بلا وجہ اس کے مطیع ہو کر نقصان اٹھائیں گے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے دعوائے نبوت کو قریش کے خانوادوں کی باہمی چپقلش کے تناظر میں بھی دیکھا اور بنوامیہ کے ایک لیڈر نے یہ کہا کہ ہم نے بنوہاشم کا مقابلہ ہر میدان میں کیا اور ان سے ہار نہ مانی۔ اب ان کے ایک فرد نے نبوت کا دعویٰ کر کے ہم پر اپنی فضیلت جمانے کا ارادہ کیا ہے تو کیا ہم ان کے غلام بن کر رہ جائیں!

کبھی قریش عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے اس حقیقت کا انکار کر دیتے کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر پر کوئی وحی نازل کر سکتا ہے۔ وہ کہتے کہ اگر محمد پر فرشتے اتر سکتے ہیں تو آخر ہم پر کیوں نہیں اتر سکتے؟ اگر یہ شخص اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو ہم بھی توقع رکھتے ہیں کہ ہمیں وہی کچھ ملے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔ اسی طرح کی وحی ہمارے پاس بھی آئے جس طرح کی وحی محمد پر نازل ہوتی ہے۔ اس صورت میں ہمیں کوئی شبہ لاحق نہ ہوگا، ہم وحی پر ایمان لے آئیں گے۔ اس کے بغیر محمد کے دعوائے نبوت کو ہم تسلیم نہیں کر سکتے۔ قریش یہ بھی کہتے کہ ایک بشر اللہ کے پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ لازم ہے کہ فرشتے یہ فریضہ سرانجام دیں جو ایک نورانی مخلوق اور اللہ کے مقرب ہیں۔ اگر اللہ کو ہماری تعلیم مطلوب ہوتی تو وہ فرشتوں کو ہماری رہنمائی کے لیے ہمارے درمیان بھیجتا۔ لہٰذا جب تک یہ انتظام نہیں ہوتا ہم محمد کے دعویٰ کو محض جھوٹ سمجھتے رہیں گے۔

مکہ کے عوام جب قریشی لیڈروں سے رسول اللہؐ کی دعوت کے بارے میں سوال کرتے جو لوگوں کو متاثر کر رہی تھی، پھر وہ انبیاء کی تاریخ کے ان واقعات کے بارے میں دریافت کرتے جو قرآن بیان کرتا اور رسول کے جھٹلانے والوں کو ان کے انجام کی خبر دینے کے لیے سناتا تھا تو قریش ان کو تسلی دیتے کہ محمد جو کچھ پیش کر رہے ہیں یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ یہ محض گزشتہ اقوام کے بے اصل قصے اور ماضی کے افسانے ہیں جن کو خدا کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں کسی قدر دخل اہل کتاب کی سازش کو بھی ہے۔ ان میں سے کوئی شخص محمد کو اپنی کتابوں کی معلومات صبح و شام فراہم کرتا ہے اور وہ ان معلومات کو وحی بتا کر پیش کرتے ہیں۔ قریش اسلاف کے ساتھ عوام کی محبت کے جذبہ کو بھی حق کی مخالفت میں بطور حربہ استعمال کرتے۔ وہ کہتے کہ محمد کی تعلیم کا ہمارے بزرگوں کی تعلیم سے

کیا مقابلہ ہے۔ اصل علم تو وہی ہے جو ہمارے پاس اسلاف سے منتقل ہو کر آیا ہے۔ یہ شخص تمہیں اپنے معبودوں سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے رسول کا روپ دھار لیا ہے۔ لہذا وقت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ محمد سے دور رہیں، اس کی باتوں پر کان نہ دھریں اور اپنے اسلاف کے طور طریقہ اور معبودوں کی پوجا پاٹ پر یکسوئی سے جمے رہیں۔ یہ جو بات کہہ رہا ہے ہم نے اس دور آخر میں تو سنی نہیں۔ یہ محض ایک من گھڑت بات ہے! اس خیال کے پھیلانے میں حصہ اگرچہ قریش کے متعدد لیڈروں نے لیا لیکن اس میں پیش پیش ان کے دو سردار ابولہب اور ابوجہل تھے جو حضورؐ کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے۔ آپ جب کسی فرد یا جماعت کو خدا کا پیغام سناتے اور توحید کی تعلیم دیتے تو یہ فوراً آپ کی تقریر کا اثر زائل کرنے کے لیے اسلاف کے حوالہ سے لوگوں کو بتاتے کہ یہ شخص ہمارے معزز و محترم اسلاف کی شان میں گستاخی کرتا اور ان کو حق سے منحرف سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کی بات کو اہمیت نہ دو۔ ابولہب کی یہ منادی تاریخ کے اوراق میں ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے:

> اے بنو فلاں! یہ شخص تم لوگوں کو اس بات کی دعوت دے رہا ہے کہ تم لات و عزیٰ اور بنو مالک بن اُقیش کے جنوں میں اپنے حلیفوں کا جوا اپنی گردنوں سے اتار کر اس کی لائی ہوئی بدعت و ضلالت کو قبول کر لو۔ پس تم نہ اس کی بات سننا، نہ اس کو قبول کرنا[1]۔

ان لوگوں نے اپنے غنڈہ عناصر کو بھی سکھا رکھا تھا کہ جب محمد لوگوں کو اپنی بات سنا رہے ہوں تو شور کر کے اور ہڑبونگ مچا کر اس بات کو ناممکن بنا دیا کرو کہ وہ اپنی بات پورے سکون کے ساتھ کسی کو سمجھا سکیں۔ وہ عوام کو اپنے موقف کے صحیح ہونے کی تسلی دیتے ہوئے کہتے کہ ہم جن معبودوں کو پوجتے اور ان کے نام پر جن چیزوں کو حلال و حرام ٹھہراتے ہیں یہ سب خدا ہی کی مرضی سے کرتے ہیں۔ اگر یہ کام غلط ہوتے تو خدا ان کو کیسے گوارا کرتا۔ وہ لازماً اپنی قدرت سے ہمیں ان سے روک دیتا۔ قیامت کے تصور کو وہ محض ایک ڈراوا قرار دیتے اور کہتے کہ جب ہم مر کر مٹی اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو اس کے بعد دوبارہ زندگی پانے اور اٹھائے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ محمد یہ تصور محض اپنے پیروؤں کی تعداد بڑھانے کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

قریش کا نبی ﷺ کی بشریت پر معترض ہونا بالکل ناروا تھا۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام عربوں کے جد امجد تھے۔ قریش ان کے شجرہ نسب کو جانتے اور اپنا شجرہ نسب ان تک پہنچانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ دونوں بزرگ شخصیتیں نبوت کے منصب پر فائز تھیں اور انہی کا بتایا ہوا دین تھا کہ جس کے بقایا قریش کو عزیز اور ان کی سیادت کا ایک سبب تھے۔ لہذا قریش سے یہ بات مخفی نہیں تھی کہ خدا کے پیغمبر بشر ہی

ہوتے ہیں، وہ دوسرے لوگوں کی طرح کھاتے پیتے، شادی بیاہ کرتے، بیوی بچوں میں رہتے اور زندگی کے ان مشاغل میں حصہ لیتے ہیں جن میں دوسرے لوگ حصہ لیتے ہیں۔ قریش انبیائے بنی اسرائیل کے بارے میں بھی معلومات رکھتے تھے کہ یہ سب بشر تھے۔ ان میں سے کوئی فرشتہ نہ تھا۔ لہذا البشریت پیغمبری میں کبھی مانع نہیں ہوئی۔

انبیاء کا تعلق کسی دوسری مخلوق سے سمجھنا ایک ناقابل فہم بات تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کی تعلیم و اصلاح کے لیے ایک انسان ہی موزوں ہوسکتا تھا کیونکہ اس کے جذبات و احساسات، عواطف وضروریات اور عمومی صلاحیتیں انہی جیسی ہوتی ہیں، ورنہ وہ انسانوں کو نہ ان کے اپنے انداز میں کوئی بات سمجھا سکتا نہ عمل میں ان کے لیے نمونہ پیش کرسکتا۔ ہاں اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے اور ان کی تعلیم مقصود ہوتی تب اللہ تعالیٰ یقیناً فرشتہ ہی کو نبی بناتا کیونکہ وہی اس کام کے لیے موزوں ترین ہوتا۔ اسی بات کو قرآن نے واضح کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَاۗءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰۗىِٕكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۔

(بنی اسرائیل ۱۷: ۹۴-۹۵)

لوگوں کے پاس جب ہدایت آگئی تو اس پر ان کے ایمان لانے میں اس کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں بنی کہ انہوں نے یہ کہا کہ اللہ نے ایک بشر کو رسول مبعوث کیا ہے! تم انہیں بتاؤ کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور قیام پذیر ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر اتارتے۔

فرشتوں کو فرداً فرداً انسانوں کے پاس بھیجنے کا مطالبہ بھی اس لیے ناروا تھا کہ نبوت کا تاج پہننے کے لیے موزوں شخص وہی ہوسکتا ہے جو معاشرے کا صالح ترین انسان، سلامتی طبع اور صفائی قلب کا اعلیٰ نمونہ اور بلند اخلاق و کردار کا عمدہ پیکر ہو۔ ایسا شخص اپنی فطرت کے لحاظ سے وحی کا نور اپنے اندر سمو لینے پر قادر ہوتا ہے جب کہ دنیاداری میں لتھڑے ہوئے لوگ اس لائق نہیں ہوتے کہ وہ فرشتۂ وحی سے کچھ اخذ کرسکیں۔ اسی لیے قرآن نے قریش کے مطالبہ کا یہ جواب دیا کہ ''اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کی ذمہ داری کس کو سونپے''۔

قریش کے اس مطالبہ کے جواب میں کہ آخر فرشتے ہم پر کیوں نہیں اترتے، قرآن نے جہاں یہ وضاحت کی کہ ہر شخص اس کا اہل نہیں کہ اللہ اس کو نبوت کے مقصد کے لیے منتخب کرلے، وہیں ایک مسکت جواب یہ بھی دیا کہ فرشتے کا نزول دوسرے لوگوں پر بھی ہوسکتا ہے لیکن یہ بندوں کے لیے بے حد خطرناک ہوتا ہے، کیونکہ فرشتے کسی مقصد حق کے ساتھ آتے ہیں اور رسولوں کے جھٹلانے والوں کے معاملہ میں مقصد حق ان کو کیفر کردار تک پہنچانا ہوتا ہے جس کی مثال قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لیے فرشتوں کی آمد کا واقعہ ہے۔ فرمایا:

وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِىْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ. لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰۤئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰۤئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ. اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ. (الحجر۱۵:۶۔۹)

یہ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر یاددہانی اتاری گئی ہے، تم تو ایک خبطی ہو۔ اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے؟ ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر فیصلہ کے ساتھ اور اس وقت ان کو مہلت نہیں ملے گی۔ یہ یاددہانی ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بشریت کے اعتراض کا سامنا رسول اللہ ﷺ کی طرح آپ سے پہلے آنے والے تمام انبیاء ورسل کو کرنا پڑا۔ قریش کا یہ موقف نیا نہیں تھا کہ اللہ نے ان کے پاس ایک بشر کو رسول بنا کر کیوں بھیجا۔ ہر دور کے لوگوں کو یہ اشکال پیش آیا اور انہوں نے نبوت ورسالت کے اعلان کو اپنے اوپر پیغمبر کی برتری حاصل کرنے کی کوشش ہی قرار دیا۔ یہ بات قرآن کے حسب ذیل بیان سے واضح ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ. اَفَلَا تَتَّقُوْنَ. فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ. وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۤئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِىْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ. (المومنون۲۳:۲۳۔۲۴)

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو اس نے دعوت دی کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم (اس کے غضب سے) ڈرتے نہیں؟ تو اس کی قوم کے سرداروں نے، جنہوں نے کفر کیا، کہا کہ یہ تو بس تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہے۔ یہ تم پر اپنی برتری جتانا چاہتا ہے۔ اور اگر اللہ رسول ہی بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ اس طرح کی بات ہم نے اپنے اگلے بزرگوں میں تو سنی نہیں۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ. فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ. اَفَلَا تَتَّقُوْنَ. وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ. وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ. اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ. (المومنون۲۳:۳۱۔۳۶)

پھر ہم نے ان کے بعد دوسرے لوگ اٹھائے اور ان میں بھی ایک رسول انہی میں سے اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم اس سے ڈرتے نہیں؟ اس کی قوم کے سرداروں نے، جنہوں نے کفر کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا، اور ان کو ہم نے دنیا کی زندگی میں خوشحالی دے

رکھی تھی، کہا کہ یہ تو بس تمہارے ہی مانند ایک بشر ہے۔ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی بات مان لی تو تم بڑے ہی گھاٹے میں رہو گے۔ کیا وہ تمہیں اس بات کا ڈراوا دیتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور خاک اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو تم پھر نکالے جاؤ گے؟ بہت ہی بعید اور نہایت ہی مستبعد ہے یہ ڈراوا جو تمہیں سنایا جا رہا ہے۔

جہاں تک سابق انبیاء کے واقعات کا تعلق ہے تو سچی بات یہ ہے، اور یہ قریش سے بھی مخفی نہ تھی، کہ رسول اللہ ﷺ ان کے بارے میں از خود کوئی معلومات نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے سابق آسمانی صحیفوں میں سے کچھ پڑھا تھا اور نہ لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف تھے۔ اس کے باوجود آپ جو کچھ سناتے وہ پوری صحت کے ساتھ سناتے بلکہ اس میں اگر اہل کتاب نے کوئی گھپلا کیا ہوتا تو اس کی اصلاح بھی شامل ہوتی، نیز ہر واقعہ میں پنہاں سبق بھی نمایاں ہوتا۔ گویا واقعات محض بطور قصہ نہ سنائے جاتے بلکہ ان کا اطلاق قریش کے حالات پر کیا جاتا۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کر کے ماضی کے کسی واقعہ کے بارے میں پوچھا گیا تو قرآن میں اس کی پوری وضاحت آ گئی۔ بالفرض حضورؐ کے پاس کوئی تعلیم دینے والا تھا تو اس طرح کے سوالات کا پورا جواب فی الفور آپ نے کیسے فراہم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ غیب کی یہ خبریں آپ کو بذریعہ وحی دی جاتی تھیں کیونکہ آپ اللہ کے رسول تھے اور ہر قدم پر اللہ تعالیٰ خود ہی آپ کی رہنمائی فرما رہا تھا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے مدین کے قیام اور کوہ طور کے واقعات، زکریا علیہ السلام کے ہاں بیٹے کی ولادت، مریمؑ کی کفالت کے احوال، یوسف علیہ السلام کی زندگی کی سرگزشت، ذوالقرنین کی فتوحات اور متعدد پیغمبروں کے واقعات قرآن میں مفصل بیان ہوئے۔ یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے حضورؐ کو بتائیں حالانکہ اس سے پہلے یہ آپ کے علم و اطلاع سے باہر کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایسے واقعات کو بیان کرنے کے بعد یہ وضاحت کر دی کہ:

تِلْکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَآ اِلَیْکَ مَا کُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُکَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا.
(هود ١١:٤٩)

یہ ماجرا غیب کی باتوں میں سے ہے جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے سنا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ہی اس کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم کے لوگ ہی۔

اسی طرح اسلاف کی تعلیم، جس پر قریش کو ناز تھا اور جس کے مقابلہ میں وہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کو نظر انداز کیے ہوئے تھے، معلوم تاریخی حقائق کی روشنی میں وہ نہیں تھی جو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے ان کی نسل کو منتقل ہوئی تھی۔ اس میں سب سے بڑی نقب عمرو بن لحی خزرجی نے لگائی جب اس نے خانہ کعبہ میں بت

داخل کیے۔ بعد میں بیت اللہ کے منتظمین نے اس شرک کی سرپرستی کی اور بدعات پر مبنی ایک پوری شریعت رائج کر دی۔ بدعات پر مبنی اسی مذہب کے خلاف حضرت ابراہیمؑ کے سچے پیرو حنفاء ہمیشہ احتجاج کرتے رہے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک اپنا وجود باقی رکھا۔ قریش کو نبی ﷺ کی عمومی اخلاقی تعلیم سے عناد نہ تھا، لیکن جب مشرکانہ نظام پر زد پڑتی تو ان کے مفادات آڑے آجاتے اور وہ حضورؐ کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے۔

اس طرح رسول اللہ ﷺ کی بشریت پر اعتراض کرنے کی قریش کے پاس کوئی واقعی بنیاد نہ تھی۔ اس حوالہ سے انہوں نے جو باتیں بنائیں وہ عقل اور حقائق کی روشنی میں بالکل غلط تھیں۔

دنیاوی خوشحالی نہ ملنے کا طعنہ:

قریش یہ بات بھی کہتے کہ اگر خدا نے ایک انسان ہی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا تو یہ کیوں نہ ہوا کہ اس کی دنیاوی حالت میں ایسی تبدیلیاں کر دی جاتیں جو اس کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کر دیتیں اور وہ عرب کے سرداروں کے سامنے بہتر اسباب حیات کے ساتھ گردن تان کر کھڑا ہو سکتا۔ محمد (ﷺ) کو تو خوشحالی تک بھی حاصل نہیں جبکہ مکہ اور طائف دونوں بستیوں کے اشراف میں متعدد لیڈر ایسے ہیں جو معاشی آسودگی اور اپنی بھاری شخصیت کی بنا پر محمد پر فوقیت رکھتے ہیں۔ یہ لیڈر اس لائق تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتا۔ محمد کے ساتھیوں میں بھی کوئی بڑی شخصیت نہیں۔ کچھ بے سمجھ نوجوان اور لونڈی غلام ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ کوئی عاقل و فرزانہ لیڈر ان کے دام میں نہیں پھنسا۔ گویا ان کی تعلیم صرف ان لوگوں کو متاثر کر سکی ہے جن کی ذہنی سطح اونچی نہیں اور جو سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہیں۔

قریش کے کچھ مطالبات ایسے تھے جو اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ نبی ﷺ کے سامنے پیش کیے جاتے۔ مثلاً یہ کہ آپ اگر فی الواقع خدا کے نمائندہ ہیں تو ہمارے لیے اس سنگلاخ زمین میں پانی کا ایک چشمہ ہی جاری کر دیں۔ یا اپنے لیے ہی ایک نخلستان اور تاکستان حاصل کر لیں جس کے بیچوں بیچ پانی کی نالیاں ہوں جو اس باغ کو سیراب کریں۔ یہ باغ آپ کی خوشحالی کا ذریعہ بنے اور خدا کی نگاہ میں آپ کے معزز و مکرم ہونے کا ثبوت ہو۔ یا قیام کے لیے خدا سونے کا ایک محل بنا دے جو آپ کی امارت کا منہ بولتا ثبوت ہو۔ قریش اس بات کی توقع بھی رکھتے کہ اللہ کے رسول کی حیثیت سے محمد کو کچھ غیر معمولی کام ان کے اطمینان کے لیے کر کے دکھانے چاہئیں۔ مثلاً اس بات کے ثبوت کے لیے کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ اللہ ہی کی جانب سے ہوتا ہے، ایسا کیوں نہیں ہو جاتا کہ آسمان کے کچھ ٹکڑے ہم پر گر پڑیں۔ یا خدا اور اس کے فرشتے ہمارے بالمقابل نمودار ہو جائیں۔ یا آپ ہماری نظروں

کے سامنے آسمان میں چڑھ جائیں اور وہاں سے وحی لکھوا کر لائیں جس کو ہم خود پڑھ سکیں۔ ان میں سے کوئی ثبوت مہیا ہو جائے تو ہم آپ کو خدا کا سچا پیغمبر مان لیں گے۔ قریش کا خیال یہ تھا کہ جب ہم دنیاوی اسباب و وسائل کے اعتبار سے مسلمانوں سے بہتر ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کی نگاہوں میں بھی ہم ان سے بہتر ہیں۔ اگر ہم خدا کے مبغوض ہوتے تو وہ ہمیں عیش کرنے کے لیے نہ چھوڑ دیتا۔

اسی طرح قریش آنحضرت ﷺ کے پیروؤں کو حقیر جانتے۔ اسی لیے ان کے اکابر ان کے برابر بیٹھنے میں اپنی سبکی سمجھتے اور صاف کہہ دیتے کہ ہم آپ کی بات اس وقت سنیں گے جب ان لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دیں۔ روایات میں آتا ہے کہ قریش ان غریب مسلمانوں کا بہت مذاق اڑاتے جو آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے تھے۔ ان کی تذلیل کی جاتی اور حضورؐ کو ان کی رفاقت پر طعنے دیے جاتے۔ اس طرح کی صورت حال میں نبی ﷺ کو پریشانی لاحق ہوتی کہ وہ ایسے خودسر سرداروں کے معاملہ میں کیا رویہ اختیار اور حق تبلیغ کس طرح ادا کریں۔

جب آخرت کے انجام کا بیان ہوتا اور اس میں پیغمبر کی دعوت کو جھٹلانے والوں کو ملنے والی سزاؤں کا ذکر ہوتا تو سادات قریش کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہ ہوتے کہ پیغمبر کے نادار اور مفلوک الحال ساتھی تو جنت کی نعمتوں اور آسائشوں سے نوازے جائیں گے اور قریش کے کئی پشتوں سے سردار جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ ایسے بیانات پر وہ مشتعل ہو جاتے تو ٹولیاں بنا بنا کر حضورؐ کو آنکھیں دکھاتے تاکہ آپ ان کے طیش و غضب سے مرعوب ہو کر اپنا مشن چھوڑ جائیں۔

نبی ﷺ کے ساتھ مادی لحاظ سے کوئی غیر معمولی امتیازی سلوک نہ ہونے پر اور آپ کے صحابہ کی بے سروسامانی پر قریش کے اعتراضات معقول نہیں کہے جا سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادی لحاظ سے آسودگی یا بے سروسامانی اور اخلاقی و روحانی اعتبار سے ہدایت پانے یا نہ پانے کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ یہ دو مختلف احوال ہیں۔ ایک آدمی معاشی طور پر آسودہ ہے تو یہ بات اس کے اخلاق و کردار کے افضل ہونے کی ضمانت نہیں ہو سکتی بلکہ دیکھا گیا ہے کہ ایسا آدمی کردار کی ایسی خامیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جن میں کم وسائل رکھنے والے لوگ مبتلا نہیں ہوتے۔ ہدایت تو رب کا فضل ہے۔ جو اس کا طالب بنتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ اسباب معیشت کی فراوانی ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اللہ کے ہاں یہ کسی کے منظور نظر ہونے کی دلیل نہیں بلکہ قرآن میں اس کا ذکر نہایت حقارت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ. اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ.

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا. وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ. وَلَوْ لَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ. وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ. وَ زُخْرُفًا. وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا. وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ. (الزخرف ۴۳:۳۱۔۳۵)

اورانہوں نے اعتراض اٹھایا کہ یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کے فضل کو یہی تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی معیشت کا سامان تو ہم نے تقسیم کیا ہے اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کیے ہیں تا کہ وہ باہم وگر ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو جو لوگ خدائے رحمان کے منکر ہیں ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی چاندی کے، جن پر وہ چڑھتے۔ اور ان کے گھروں کے کواڑ اور ان کے تخت بھی چاندی کے، جن پر وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ اور یہ چیزیں سونے کی بھی کر دیتے۔ اور یہ چیزیں تو بس دنیا کی زندگی کی متاع ہیں اور آخرت تیرے رب کے پاس متقیوں کے لیے ہے۔

بشریت کے اعتراض کی طرح نبی کے ساتھیوں پر طعنہ زنی بھی ہمیشہ سے کفار کا وطیرہ رہی ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات کے ضمن میں قرآن کا بیان ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ. اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ. اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ. فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ۔

(ہود ۱۱:۲۵۔۲۷)

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے ان کو آگاہ کیا کہ میں تمہارے لیے ایک کھلا ڈرانے والا ہو کر آیا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ میں تم پر ایک دردناک عذاب کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ تو اس کی قوم کے ان سربراہوں نے، جنہوں نے کفر کیا، جواب دیا کہ ہم تو تم کو بس اپنے ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں اور ہم تمہاری پیروی کرنے والوں میں انہی کو پاتے ہیں جو ہمارے اندر کے ذلیل لوگ بے سمجھے بوجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اور ہم تم لوگوں کے لیے اپنے مقابل میں کوئی خاص امتیاز بھی نہیں دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ ہم تم کو بالکل جھوٹا خیال کر رہے ہیں۔

اس اعتبار سے گویا قریش کا آنحضرت ﷺ کے ساتھ رویہ وہی تھا جو ماضی کے کفار نے ہر زمانہ میں اپنے انبیاء کے

ساتھ روا رکھا تھا۔ چنانچہ جب حضورؐ پر اعتراض ہوتا کہ آپ کوئی فوق الفطری خصوصیات کا مظاہرہ کریں تا کہ ہمارا اشکال رفع ہو تو آپ فرماتے کہ کامل اختیار میرا رب رکھتا ہے۔ میں تو تمہاری مانند ایک بشر ہوں، البتہ مجھے رسالت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ مجھے اگر جانچنا ہے تو میری اس حیثیت کے لحاظ سے جانچو۔ تم مجھے زچ کرنے کے لیے جو نت نئے مطالبات کر رہے ہو مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ لَّا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ. (الانعام٦:٥٠)

(اے پیغمبر) تم کہہ دو کہ میں تمہارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب جانتا، اور نہ تمہارے سامنے یہ دعویٰ کرتا کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔

شاعر، کاہن، ساحر، مسحور اور مجنون ہونے کا الزام:

کسی آدمی کے اصل منصب سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک کارگر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے مشن کو کوئی ایسا رنگ دے دیا جائے جو لوگوں کی نگاہوں میں اس کو بے وقعت بنا دے۔ یہ حربہ قریش نے نبی ﷺ کے معاملہ میں استعمال کیا۔ چونکہ آپ کے پاس پیش کرنے کی اصل چیز قرآن تھا جسے آپ لوگوں کو سناتے اور اپنی رسول ہونے کی حیثیت کو نمایاں کرتے، اس لیے سادات قریش نے آپ کو کبھی شاعر و کاہن ہونے کا الزام دیا، کبھی یہ کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے جو اپنے جادو کے زور سے معاشرہ میں تفریق پیدا کر رہا ہے، کبھی کہتے کہ یہ پہلے تو چنگا بھلا تھا، اب معلوم ہوتا ہے کسی نے اس پر جادو کا عمل کر دیا ہے جس کے باعث مخبوط الحواس ہو کر یہ عجیب عجیب باتیں کرتا ہے۔ حضورؐ کو شاعر کہہ کر وہ یہ توقع رکھتے کہ زمانہ خود ہی اس شخص اور اس کے کلام کو ختم کر دے گا۔ اس کی شہرت چند روزہ ہے۔ اگر جنون کے اثر کے تحت وہ ہمیں کچھ ڈراوے دے رہا ہے تو ان کو سنجیدہ لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ اس کی بہکی بہکی باتیں ہیں جن کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

جہاں تک حضورؐ کے پیش کردہ کلام پر اعتراضات کا تعلق ہے ان پر سیر حاصل بحث پچھلے باب میں ہو چکی ہے۔ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کی حیثیت عرفی کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی تو خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخالفین کے تمام الزامات سے بری کیا۔ فرمایا کہ ہمارے یہ رسول تمہارے لیے کوئی اجنبی نہیں ہیں، یہ تمہارے اندر پیدا ہوئے۔ تمہارے ساتھ رہے سہے۔ ان کی زندگی کا ہر دور بچپن سے جوانی تک تمہارے

اندر گزرا۔ تم میں سے ہر شخص ان کے خلق عظیم کا معترف اور ان کی شرافت، صداقت، امانت، دیانت اور عفت و پاکیزگی کا گواہ ہے۔ چالیس برس کی عمر تک تم نے ان پر ہمیشہ اعتماد کیا لیکن جب سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دل پر اپنی تعلیم نازل فرمائی ہے تم پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ گئے ہو اور ان کے سابق کردار کو بالکل بھلا بیٹھے ہو جب کہ نہ ان کے مشاہدات میں کسی جھوٹ اور فریب نفس کو دخل ہے اور نہ وحی کا القاء کوئی واہمہ ہے۔ یہ جو کچھ پیش کر رہے ہیں اس میں غیب دانی کی کوئی نمائش نہیں اور نہ یہ پیسہ بٹورنے کا ذریعہ ہے۔ کیا تم اس کلام کے اثر کو نہیں دیکھتے کہ اللہ اپنے ان کلمات کے ذریعہ سے باطل کو مٹا کر حق کا اثبات کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام شیطان کے کرنے کا نہیں ہے۔ دنیا میں آج تک کسی جھوٹے اور جعل ساز نے اس طرح کا فیض بخش اور روح و قلب کو منور کرنے والا کلام پیش نہیں کیا جس طرح کا کلام یہ قرآن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قریش کے پاس حضورؐ کے کردار پر حرف رکھنے کی کوئی گنجائش نہ تھی اور نہ وہ دلیلوں سے کسی کو آپ کے خلاف قائل کر سکتے تھے۔ اسی لیے وہ عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے قسمیں کھا کھا کر ان کو مطمئن کرتے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے اندر وسوسے اور غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لیے بھی کوشاں رہتے تا کہ ان میں پھوٹ پڑ جائے اور ان کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف بدگمانیاں پیدا کی جاسکیں۔

کفار کے اس الزام کے جواب میں کہ محمد اپنا کلام خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اس طرح لوگوں پر دھونس جماتے ہیں، قرآن نے ایک اہم حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اللہ کے رسول خدا کی نہایت کڑی نگرانی میں اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ جس طرح فرشتہ وحی سے کوئی جن یا کوئی شیطانی قوت وحی کا خزانہ چھین نہیں سکتی اور وہ بالکل خالص اور بے آمیز شکل میں اللہ کے رسول کے حوالہ ہوتا ہے، اسی طرح رسول کے پاس وہ خالص اور بے آمیز شکل میں اس طرح رکھا جاتا ہے کہ خود رسول کی بھی مجال نہیں ہوتی کہ وہ اپنے جی سے اس میں کوئی رد و بدل کر دے۔ اگر خدانخواستہ کوئی رسول ایسا کرنے کی جسارت کرے تو اللہ کی سنت یہ ہے کہ 'ہم اس کو اپنے قوی بازو سے پکڑیں گے اور اس کی شاہ رگ ہی کاٹ ڈالیں گے۔ پھر کوئی بھی اس کو ہم سے بچانے والا نہیں بن سکتا۔'

قرآن نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے یہ اعلان بھی فرمایا کہ تم قریش پر یہ بات واضح کر دو کہ اگر میں گمراہ ہوں اور تم اس بنا پر میرا ساتھ نہیں دے رہے ہو تو میں اپنی گمراہی کا خمیازہ خود بھگتوں گا اور تم اس کے وبال سے محفوظ رہو گے۔ لیکن اگر میں ہدایت پر ہوں اور یہ ہدایت میرے پاس اپنے رب کی طرف سے نازل ہو رہی ہے تو اس صورت میں تم وحی الٰہی کے جھٹلانے والے ٹھہرو گے اور اس جرم کا انجام کوئی سہل چیز نہیں ہوگا۔ اس لیے میرے

معاملہ میں اچھی طرح غور کر کے کوئی فیصلہ کرو۔

قرآن نے رسول اللہؐ کو یہ تسلی بھی دی کہ وحی تم نے اپنی خواہش سے نہیں پائی اور نہ اسے اپنی خواہش سے پا سکتے ہو۔ جس ذات نے یہ چشمہ فیض جاری کیا ہے وہی اس کو رواں بھی رکھ سکتا ہے اور اس کو روکنے پر بھی قادر ہے۔ اگر اس نے یہ امانت تمہارے سپرد کی ہے تو وہ اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی توفیق بھی عطا کرے گا اور دشمنوں کی سازشوں سے بھی محفوظ رکھے گا۔ بس تم صبر و استقامت سے اپنا کام کیے جاؤ اور دشمنوں کی چالوں کو خاطر میں نہ لاؤ۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ کافی ہے۔ بہت جلد یہ اپنا انجام دیکھ لیں گے۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے پیش کردہ کلام کو عوام الناس کی نظروں سے گرانے کے لیے قریشی سرداروں نے جتنے جتن بھی کیے وہ سب رائیگاں گئے۔ نہ حضورؐ ہی کی شخصیت کو داغدار کیا جا سکا اور نہ آپ کے کلام ہی سے متعلق بدگمانیاں پھیلا کر اس سے لوگوں کو متنفر کیا جا سکا۔ حضورؐ کے پیرووں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی اور قریش کے ہر خانوادے میں مسلم و کافر کی تقسیم واضح نظر آنے لگی۔ اس صورت حال میں قریش اکابر کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا کہ وہ مسلمان ہونے والوں پر مزید ظلم کریں، نبی ﷺ کی ذات کو بھی نشانہ بنائیں، قرآن سننے سنانے کو ایک مشکل کام بنا دیں اور دہشت پھیلا کر نئے دین کی دعوت کی راہ میں روڑے اٹکائیں۔

حوالہ جات

۱ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام۔ ج ۱، ص ۴۲۳

باب 13

ہجرت حبشہ

کفار کی جانب سے مسلمانوں کو جو آزمائشیں پیش آ رہی تھیں قرآن مجید ان کا عزم وحوصلہ کے ساتھ مقابلہ کرنے کا حکم دیتا اور بشارت دیتا کہ جو لوگ ثابت قدم رہیں گے ان کو ان کی قربانی کا صلہ ان کی توقعات، اندازوں اور قیاسوں سے بڑھ چڑھ کر ملے گا۔ قرآن نے یہ ہدایت بھی فرمائی کہ اگر دیکھو کہ تمہارے وطن کی زمین تم پر تنگ کر دی گئی ہے جب بھی بددل اور مایوس نہ ہونا۔ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ اگر اس شہر میں تمہارے لیے اللہ کے دین پر قائم رہنا ناممکن بنا دیا گیا تو اللہ تمہاری رہنمائی کسی ایسی سرزمین کی طرف فرمائے گا جہاں تم بے خوف وخطر اپنے رب کی عبادت کر سکو گے۔ اللہ تمہیں جائے پناہ عطا فرمائے گا اور رزق بہم پہنچائے گا۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ کتنے جاندار، چرند، پرند ایسے ہیں جو اپنے ساتھ اپنی روزی باندھے نہیں رکھتے لیکن ان کا رب ان کو رزق دیتا ہے اور وہ شکم سیر ہو کر رات کو اپنے ٹھکانوں پر واپس آتے ہیں۔ لہٰذا تم بھی اپنے رب پر بھروسہ کرو۔ وہ تمہاری مشکلیں آسان فرمائے گا۔ فرمایا:

> يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ. كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ. وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا. نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ. وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ اِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. (العنکبوت ۲۹: ۵۶-۶۰)
>
> اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو بے شک میری زمین بڑی کشادہ ہے تو بس میری ہی بندگی کرو۔ ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے، پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہم ان کو جنت کے بالا خانوں میں متمکن کریں گے۔ اس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ کیا ہی خوب صلہ ہے کارگزاروں کا، جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر ہر حال میں انہوں نے بھروسا رکھا۔ اور کتنے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی ان کو بھی رزق دیتا ہے اور تم کو بھی۔ اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

جب قریش کے ظلم وستم کا بازار گرم سے گرم تر ہوتا گیا تو اہل ایمان کے لیے مکہ کی سرزمین واقعی تنگ ہو گئی۔ اسلام کا نام لے کر کوئی شخص اپنے آپ کو معاشرہ کے غیظ وغضب سے بچا نہیں سکتا تھا۔ اسی زمانہ میں رسول اللہ ﷺ نے بارگاہ خداوندی میں درخواست کی کہ اے رب، اسلام کو عمرو بن ہشام یا عمر بن الخطاب کے اسلام سے قوت بخش۔ عمرو بن ہشام ابوجہل کا نام ہے جو نبی ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھا اور عمر بن الخطاب ایک دبنگ نوجوان کے طور پر معروف تھے اور ان کا دل پسند مشغلہ کمزور مسلمانوں کو تنگ کرنا تھا۔ مسلمان نبی ﷺ سے شکوہ کرتے کہ ان کی زندگی سخت عذاب میں ہے تو حضورؐ تسلی دیتے کہ حوصلہ رکھو، اللہ تعالیٰ آسانی کی راہ نکالے گا۔ تم سے پہلی قومیں بھی مخالفین کے ہاتھوں بے حد تنگ ہوئیں یہاں تک کہ ان کے سروں پر آرے چلا دیے گئے لیکن وہ اپنے دین سے دستبردار نہ ہوئیں۔

جب حالات تشویش ناک حد تک نازک ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو، جو خاص طور پر مصائب کا نشانہ بنے ہوئے تھے، حبشہ کی جانب ہجرت کی اجازت دی کیونکہ وہاں کا عیسائی حکمران اصحمہ اپنی رحم دلی اور عدل گستری کی بڑی شہرت رکھتا تھا اور اس کے ملک میں امن وامان کا دوردورہ تھا۔ دوسرے یہ ملک عرب سے مغرب میں بحر قلزم کے پار ہونے کے باعث نہایت قریب بھی تھا۔ عجیب بات ہے کہ قریش کے تقریباً تمام خانوادوں کے نوجوان مسلمان ہجرت کرنے میں پیش پیش تھے۔ پہلا گروپ جس نے ہجرت کی گیارہ مردوں اور پانچ خواتین پر مشتمل تھا۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

بنوامیہ:	عثمان بن عفانؓ	مع زوجہ رقیہ بنت رسول اللہؐ
بنوعبدشمس:	ابوحذیفہ بن عتبہؓ	مع زوجہ سہلہ بنت سہیل بن عمروؓ
بنومخزوم:	ابوسلمہ بن عبدالاسدؓ	مع زوجہ ام سلمہؓ
بنواسد:	زبیر بن العوامؓ	
بنوعبدالدار:	مصعب بن عمیرؓ	
بنوزہرہ:	عبدالرحمٰن بن عوفؓ	
بنوجمح:	عثمان بن مظعونؓ	
بنوعدی:	عامر بن ربیعہؓ	مع زوجہ لیلیٰ بنت ابی حثمہؓ
بنوعامر:	ابوسبرہ بن ابی رہمؓ	مع زوجہ ام کلثوم بنت سہیلؓ
	حاطب بن عمروؓ	

بنوحارث: سہیل بن بیضاءؓ

اس سے معلوم ہوا کہ دین کی خاطر اپنوں سے جدائی کا صدمہ جہاں ان نوجوان مسلمانوں کو سہنا پڑا وہیں اس سے قریش کے بیشتر خانوادے بھی متاثر ہوئے۔ سیرت نگاروں کے بقول یہ ہجرت رجب ۵ نبوی میں ہوئی۔

جب پہلے گروپ کے حبشہ بخیر وعافیت پہنچنے اور وہاں کی حکومت کے اس پر اعتراض نہ کرنے کی خبر مسلمانوں کو ملی تو پھر ہجرت کرنے والوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ بعض نمایاں نام یہ ہیں:

بنوہاشم: جعفر بن ابی طالبؓ مع زوجہ اسماء بنت عمیسؓ

بنوامیہ: خالد بن سعید بن العاصؓ

عروہ بن سعید بن العاصؓ مع زوجہ فاطمہ بنت صفوان بن امیہؓ

بنواسد: عبداللہ بن جحشؓ

عبیداللہ بن جحشؓ مع زوجہ ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ

بنوعامر: سکران بن عمروؓ مع زوجہ سودہ بنت زمعہؓ

عبداللہ بن سہیل بن عمروؓ

بنوحارث: ابوعبیدہ بن الجراحؓ

ان کے علاوہ عبداللہ بن مسعودؓ، عتبہ بن مسعودؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام آئے ہیں۔ یہ تعداد اسی سے متجاوز تھی۔ ظاہر ہے کہ مکہ سے ہر مسلمان نے ہجرت نہیں کی بلکہ انہی لوگوں نے کی جو قریش کے ظلم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ باقی لوگ رسول اللہ ﷺ سے کسب فیض کے لیے وہیں رہے۔

قریش کا تعاقب:

قریش نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کو حبشہ میں ایک پناہ گاہ میسر آ گئی ہے اور وہ امن اور سکون سے وہاں زندگی گزارنے لگے ہیں تو انہوں نے وہاں بھی ان کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا اور دو آدمی عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ اصحمہ کے دربار میں جانے کے لیے تیار کیے۔ یہ دونوں بادشاہ کے حضور پیش کرنے کے لیے ہدایا تو لے کر ہی گئے ان کے علاوہ اس کے مذہبی رہنماؤں کے لیے بھی تحائف لے کر گئے۔ انہوں نے پہلے مذہبی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور دربار میں تعاون کی ان سے یقین دہانی حاصل کی۔ اس کے بعد شاہ نجاشی کے دربار میں پیش ہو کر درخواست کی کہ اے بادشاہ! ہمارے کچھ بیوقوف نوجوان آپ کے ملک میں آئے ہیں۔ یہ اپنا آبائی دین چھوڑ چکے اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ یہ ایک نیا دین پیش کرتے ہیں جس سے نہ ہم واقف ہیں نہ آپ۔

ان کے بزرگوں نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ ان کو واپس بھجوائیں کیونکہ ان کے بزرگ ہی ان پر ٹھیک نظر رکھ سکتے ہیں۔ نجاشی نے درباریوں اور مذہبی رہنماؤں کی رائے لی تو سب نے قریش کے وفد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن نجاشی نے کہا کہ جن لوگوں نے میری پناہ پکڑی اور دوسروں کے مقابل میں انہوں نے میرا اور میرے ملک کا انتخاب کیا، میں ان کو تمہارے حوالے کیسے کردوں جب تک کہ میں اس معاملہ میں ان کا نقطہ نظر نہ جان لوں۔

بادشاہ نے اپنا ایلچی بھیج کر مسلمانوں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ جو ہو سو ہو، ہم وہی صحیح حقیقت حال بیان کریں گے جس کی تعلیم ہمیں اللہ کے رسول نے دی ہے۔ جب وہ حاضر ہوئے تو نجاشی نے قریش کا بیان ان کے سامنے رکھا اور جواب طلب کیا۔ مہاجرین کی جانب سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کھڑے ہوئے اور بیان کیا کہ اے بادشاہ! اس دین کو اختیار کرنے سے پہلے ہم بتوں کی پوجا کرتے، مردار کھاتے، قطع رحمی کرتے، بے حیائی کے کاموں میں شریک ہوتے۔ ہم اس حال میں تھے کہ اللہ نے ہماری طرف اپنا رسول بھیجا۔ اس کی خاندانی وجاہت، سچائی، پاکیزگی اور امانت سے ہم پہلے سے واقف تھے۔ اس نے ہمیں ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلایا اور پتھروں کی پوجا سے روکا۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، امانت و دیانت داری، صلہ رحمی، اچھی ہمسائیگی، نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے اور شرک نہ کرنے کا حکم دیا اور جھوٹ، تہمت، یتیم کا مال کھانے، بے حیائی اور دوسرے محرمات سے رکنے کی ہدایت کی۔ ہم نے اس کی تصدیق کی، اس پر ایمان لائے اور اس کے لائے ہوئے پیغام کی پیروی کی۔ ہماری قوم نے ہم پر بڑی زیادتیاں کیں، ہم کو سزائیں دیں اور ہمارے دین سے ہمیں پھیرنا چاہا۔ جب ہماری زندگی اجیرن کردی گئی تو ہم آپ کے ملک میں آگئے اور پناہ کے لیے اس ملک کو چنا۔ ہمیں توقع ہے کہ آپ کے ہاں ہم پر زیادتی نہیں ہوگی۔ یہ سن کر نجاشی نے قریش کے وفد کی درخواست رد کردی۔

عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ دربار سے ناکام لوٹے تو مشورہ کرکے نجاشی کے دینی جذبات کو بھڑکانے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے دن دوبارہ دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ نیا دین پیش کرنے والا آپ کے پیغمبر عیسیٰ بن مریم کے بارے میں بڑی غلط باتیں منسوب کرتا ہے۔ نجاشی نے دوبارہ مسلمانوں کو طلب کیا اور ان کا نقطہ نظر معلوم کیا۔ حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی تلاوت شروع کردی جس میں مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کی پوری تعلیم موجود ہے۔ نجاشی سنتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ جب تلاوت ختم ہوئی تو جعفرؓ نے کہا کہ اس کی رو سے حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور اس کا کلمہ تھے جو کنواری مریم کے حوالہ کیا گیا۔ نجاشی نے کہا کہ اللہ کی قسم، تم نے جو کچھ کہا یہ تعلیم اور عیسیٰ علیہ السلام جو کچھ لائے ایک ہی منبع سے نکلنے والی روشنی ہیں۔

اس صورت حال کو دیکھ کر قریش کے وفد کو نامراد لوٹنا پڑا اور مسلمانوں نے بادشاہ کے دل میں اسلام کا نور ڈال دیا جس کے نتیجہ میں وہ بعد میں مسلمان ہو گیا۔ نجاشی کے ردعمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق نصارٰی کے اس گروہ سے تھا جو پال کی بدعات کے خلاف اور صحیح دین مسیحی کو اختیار کیے ہوئے تھا۔ یہی وہ لوگ تھے کہ جب ان کو حضورؐ کی تعلیم پہنچتی تو قرآن میں آتا ہے کہ اس کو سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے کیونکہ وہ عیسٰی علیہ السلام کی پیشینگوئی کا مصداق اس کے اندر پاتے۔ ان لوگوں نے بالعموم اسلام قبول کر لیا۔

حبشہ کے عیسائی وفد کا قبول اسلام:

صحیح نصرانیت پر قائم لوگ عیسٰی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا یا تثلیث (TRINITY) کا ایک رکن نہیں مانتے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ مسیح علیہ السلام کی پیشینگوئی کے مطابق وہ نبی آخر الزماں پر اس وقت ایمان لے آئیں جب ان کی بعثت ہو۔ مسلمانوں کی حبشہ آمد نے حضرت عیسٰیؑ کے ارشادات کی تصدیق کر دی۔ انہوں نے مسلمانوں سے حضورؐ کی بعثت اور آپ کی تعلیمات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ قریش کے اہل ایمان پر ظلم و ستم کے واقعات سنے اور خود مسلمانوں کے کردار کا مشاہدہ کیا۔ چنانچہ ان کا ایک گروہ، جس میں بیس افراد شامل تھے، خود اپنی آنکھوں سے تمام احوال کا مشاہدہ کرنے اور اللہ کے آخری رسول سے ملاقات کے لیے مکہ آیا۔ انہوں نے ایک مجلس میں آنحضرتؐ سے بکثرت سوالات کر کے اطمینان کر لیا کہ یہ رسول ان علامات پر پورے اترتے ہیں جن کی تعلیم اب تک ان کو دی جاتی رہی تھی۔ ان کے سوالات کے جواب دینے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے موقع و محل کے مطابق ان کے سامنے قرآنی آیات کی تلاوت کی۔ اس کلام نے ان کے رہے سہے شکوک کا ازالہ کر دیا۔ ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں کیونکہ حق ان پر آشکارا ہو چکا تھا۔ ان خوش نصیبوں نے قبول حق میں ذرا سی دیر بھی گوارا نہیں کی۔ انہوں نے حضورؐ کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے۔ اس کے بعد یہ لوگ حبشہ روانہ ہو گئے کیونکہ ان کا مقصود مکہ میں قیام کرنا نہ تھا[1]۔ ظاہر ہے کہ اسلام کی باقی تفصیلات انہوں نے ان مسلمانوں سے حاصل کی ہوں گی جو حبشہ کو ہجرت کر چکے تھے۔ یہ ہجرت حبشہ کا ایک ایسا ثمرہ تھا جس کا تصور بھی قریش نے نہ کیا ہوگا۔ اس کے بعد نجاشی کو بھی خود نبی ﷺ نے خط لکھ کر اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گیا۔ حضورؐ ہمیشہ اس عادل حکمران کے حق میں دعا فرماتے رہے۔

کفار مکہ عیسائی گروہ کے اسلام قبول کرنے پر بے حد سیخ پا ہوئے۔ ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے ان حق پرست لوگوں کو احمق قرار دیا کہ وہ آئے تو تھے حقیقت حال کا مشاہدہ کرنے اور بے سوچے سمجھے مسلمان ہو کر واپس ہو لیے۔

اس واقعہ نے قریش کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ اگر لوگ یہاں آ کر محمدؐ سے متاثر ہوتے رہے تو وہ اس کا پیغام دوسرے قبائل تک پہنچا دیں گے اور اگر یہ دعوت مکہ کے بیرون میں جڑ پکڑ گئی تو ان کے لیے مزید پریشانیاں پیدا کر سکتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے بیرون مکہ سے آنے والوں پر بھی نظر رکھنا شروع کی اور اگر ان میں سے کوئی نبی ﷺ سے ملنے کی کوشش کرتا تو اس کی پٹائی کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔

عمرو بن عبسہ السلمی کا قبول اسلام:

عمرو بن عبسہ زمانہ جاہلیت میں حنفاء میں سے تھے۔ وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جو لوگ بتوں کی پوجا کرتے ہیں وہ گمراہی پر ہیں اور ان کی کوئی بنیاد نہیں۔ انہوں نے سنا کہ مکہ میں ایک شخص ایک نیا دین پیش کر رہا ہے۔ انہیں اس کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوئی تو سواری لے کر مکہ جا پہنچے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس شخص کی قوم اس کی دشمن ہو رہی ہے اور کسی کو اس سے ملنے نہیں دیتی۔ کہتے ہیں کہ میں نے جستجو کی اور چھپ چھپا کر حضورؐ سے ملا۔ میں نے پوچھا 'آپ کیا ہیں'۔ حضورؐ نے فرمایا 'میں اللہ کا نبی ہوں'۔ میں نے پوچھا 'نبی کیا ہوتا ہے!' آپ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے ایک پیغام دے کر بھیجا ہے۔ میں نے پوچھا 'اللہ نے آپ کو کون سا پیغام دے کر بھیجا ہے'۔ آپ نے فرمایا 'صلہ رحمی اور بت شکنی کا پیغام، اور یہ کہ اللہ کو ایک مانا جائے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کیا جائے'۔ میں نے پوچھا کہ اس تعلیم میں آپ کا ساتھ کون دے رہے ہیں۔ آپ نے بتایا آزاد اور غلام دونوں۔ میں نے کہا 'میں بھی آپ کا پیروکار بنتا ہوں'۔ آپ نے جواب دیا 'ابھی تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ دیکھتے نہیں کہ میرے معاملہ میں لوگوں کا حال کیا ہے۔ تم اس وقت واپس لوٹ جاؤ۔ پھر جب سنو کہ میں غالب آ گیا ہوں تم میرے پاس آ جانا'۔ عمرو کہتے ہیں کہ میں واپس اپنے قبیلے میں لوٹ گیا۔ میں آپ کے بارے میں ٹوہ میں لگا رہتا اور لوگوں سے دریافت کرتا رہتا۔ یہاں تک کہ اہل یثرب میں سے کچھ لوگ میرے ہاں آئے۔ انہوں نے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ مدینہ آ گئے ہیں اور لوگ آپ پر ایمان لانے کے لیے بھاگم بھاگ ان کے پاس آ رہے ہیں۔ ان کی قوم نے ان کی جان لینی چاہی لیکن وہ اس پر قادر نہ ہو سکی۔ کہتے ہیں یہ سن کر میں مدینہ گیا اور حضورؐ سے ملا۔ آپ نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ میں نے اس موقع پر آپ سے نماز اور وضو کے مسائل دریافت کیے[2]۔

اس واقعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں حضورؐ سے ملاقات کرنا بے حد مشکل بنا دیا گیا تھا۔ عمرو بن عبسہ مکہ میں حضورؐ کے ساتھ رہنے کے خواہش مند رہے ہوں گے لیکن آپ نے ان کو مشورہ دیا کہ اپنے قبیلہ کو واپس جائیں اور اسلام کے غلبہ کا انتظار کریں۔

ابوذر غفاری کا قبول اسلام:

قبیلہ غفار کے ابوذر کو کہیں سے معلوم ہوا کہ مکہ میں کسی شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے

بھائی انیس کو مکہ بھیجا کہ اس شخص کے بارے میں معلومات لے کر آئیں۔ انیس مکہ گئے اور تحقیق کے بعد بھائی کو جا کر بتایا کہ وہ شخص اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے اور ایسا کلام پیش کرتا ہے جو نہ شعر ہے نہ کہانت۔ ابوذر کو ان معلومات سے تشفی نہیں ہوئی تو انہوں نے خود رخت سفر باندھا اور مکہ پہنچ گئے۔ مسجد حرام میں اترے اور رسول اللہؐ کی جستجو کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ کسی سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ رات گئے حضرت علیؓ ان کو مسافر سمجھ کر اپنے گھر لے گئے اور صبح دم وہ پھر مسجد میں آ گئے۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی ایسا ہی ہوا۔ بالآخر حضرت علیؓ نے ان کی آمد کا مقصد دریافت کیا تو ابوذر نے ان سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ کسی سے اس کا تذکرہ نہ کریں گے۔ جب مقصد بتایا تو حضرت علیؓ نے کہا کہ بلاشبہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اگلی صبح آنحضرتؐ سے ان کی ملاقات کروائی تو ابوذر نے اسلام قبول کر لیا۔ آپ نے ہدایت فرمائی کہ اس وقت واپس چلے جاؤ اور اپنی قوم کو آگاہ کرو۔ البتہ جب تک میرے بارے میں تمہیں اطلاع نہیں پہنچتی وہیں رہنا۔ ابوذر کہنے لگے اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، میں لوگوں کے سامنے اپنے اسلام کا اظہار کر کے جاؤں گا۔ وہ مسجد میں گئے اور بلند آواز سے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ لوگ ان کے اوپر پل پڑے اور مار مار کر گرا دیا۔ عباس بن عبدالمطلب کی نظر پڑی تو لوگوں کو ہٹایا اور کہا کہ تم جانتے نہیں ہو کہ یہ شخص بنو غفار سے تعلق رکھتا ہے اور یہ قبیلہ شام کے راستے میں تمہاری تجارتی شاہراہ پر آباد ہے۔ تب ابوذر کی خلاصی ہوئی اور انہوں نے اپنی راہ لی[۳]۔

اس واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والوں کے لیے قریش نے کیسی فضا بنا رکھی تھی کہ کوئی شخص کھل کر نہ رسول اللہؐ کا نام لے سکتا تھا اور نہ ان سے ملاقات کر سکتا تھا۔ اگر اتفاق سے کوئی جری شخص آپ سے مل لیتا تو مار پیٹ سے اس کی تواضع کی جاتی۔ اس دور میں رسول اللہؐ لوگوں کو یہی مشورہ دیتے کہ وہ اپنے اپنے علاقہ میں رہیں اور جب غلبہ کی خبر سنیں تو پھر رابطہ کریں۔

رسول اللہؐ کی دعا کی قبولیت اور حضرت عمرؓ کا اسلام:

مکہ سے ایک بڑی تعداد میں مسلمانوں کا محض اس لیے نکل جانا کہ وہ اپنے دین کو بچا سکیں اور بھرے ہوئے آسودہ گھروں کو خیرباد کہہ دینا، جیسے ان کے درو دیوار ان کو کاٹتے ہوں، اتنا غیر معمولی واقعہ تھا کہ اس نے مکہ کی بقیہ آبادی کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ اپنے جذباتی موقف کا جائزہ لینے پر آمادہ ہوئی۔ انہی لوگوں میں ایک بڑا نام عمر بن الخطابؓ کا ہے جو ہجرت حبشہ کے بعد ۶ نبوی میں مسلمان ہوئے۔

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بارے میں دو روایتیں نقل ہوئی ہیں:

پہلی روایت: حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بارے میں جو روایت شہرت پا چکی ہے وہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ کو العیاذ باللہ قتل کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکلے۔ راستہ میں نعیم بن عبداللہؓ سے ملاقات ہوگئی جو مسلمان ہو چکے تھے۔ انہوں نے پوچھ لیا کہاں کا ارادہ ہے۔ بولے محمد کا فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا پہلے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن اور بہنوئی سعید بن زیدؓ بھی اسلام لا چکے ہیں۔ عمر بہن کے گھر پہنچے۔ وہاں میاں بیوی خباب بن الارتؓ سے قرآن پڑھ رہے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ عمر آ گئے تو انہوں نے قرآن کے صفحات چھپا دیے۔ چونکہ عمر بن الخطاب نے قرآن پڑھتے ان کو سن لیا تھا اس لیے مصر ہوئے کہ بتاؤ تم لوگ کیا پڑھ رہے تھے۔ میاں بیوی نے جب کچھ نہیں بتایا تو عمر نے دونوں کو مار مار کر لہولہان کر دیا۔ ان کا جواب یہ تھا کہ عمر، تم جو چاہے کر لو اب اسلام کی محبت دل سے نکل نہیں سکتی۔ عمر قدرے ٹھنڈے ہوئے تو بہن نے سورہ طٰہٰ (یا بروایت بعض سورہ الحدید) کے صفحات ان کے آگے رکھ دیے۔ پڑھتے ہی ان کے دل کی کیفیت بدل گئی۔ خباب سے پوچھا آنحضرت کہاں ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کوہ صفا کے قریب ایک گھر میں ہیں۔ عمر تلوار لٹکائے ہوئے وہاں پہنچے۔ کسی نے دروازے کے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا اور گھبرا کر حضورؐ کو اطلاع کی۔ حضورؐ نے دروازہ کھولنے کا حکم دیا اور عمر نے اسلام قبول کر لیا۔ ابن اسحاق کے مطابق یہ روایت اہل مدینہ سے ان کو پہنچی [1]۔

اس روایت کی شہرت کے باوجود اس پر کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا:

۱۔ عرب کی قبائلی زندگی میں کسی دوسرے قبیلہ کے ایک فرد کا قتل بڑے دوررس نتائج کا حامل ہوتا تھا۔ یہ کام اگر آسان ہوتا تو قریش کے تمام خانوادے بنو ہاشم پر یہ زور نہ دیتے کہ وہ محمد ﷺ کو خود روکیں۔ انہیں یہی خطرہ تھا کہ اگر ہم کوئی ایسا اقدام کر گزرے تو مکہ کے اندر ایک طویل جنگ چھڑ جائے گی جس سے عہدہ برا ہونا کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

۲۔ عمرؓ جہاں دیدہ اور زیرک آدمی تھے۔ وہ اس حقیقت کو جانتے ہوئے قتل جیسا اقدام نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان کا قبیلہ بنو عدی بنو ہاشم کے مقابل میں بے حد کمزور تھا۔

۳۔ حضرت سعید بن زیدؓ اور فاطمہ بنت الخطابؓ قدیم الاسلام صحابی ہیں جو بعثت نبوی کے فوراً بعد مسلمان ہوئے تھے۔ ان کا اسلام پوشیدہ بھی نہیں تھا کہ اس کی بھنک گھر کے افراد کے کانوں میں نہ پڑ سکتی۔ پانچ سال کے عرصہ میں تو ہر مسلمان معلوم و معروف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پورا قبیلہ قریش ان کو سبق سکھانے پر تلا ہوا تھا اور وہ علی الاعلان حبشہ کو ہجرت کر رہے تھے۔ اس روایت سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ۶ نبوی میں اس واقعہ سے ذرا پہلے مسلمان ہوئے ہوں۔

۴۔ عمر کا اصرار کہ بہن وہ چیز سنائیں جو پڑھ رہی تھیں ظاہر کرتا ہے کہ ان کے کان ابھی تک قرآن سے ناآشنا

تھے حالانکہ نبی ﷺ کا تو فریضہ منصبی ہی لوگوں کو قرآن سنانا تھا۔ آپ کئی مرتبہ قریش کے لیڈروں کو قرآن سنا چکے تھے اور خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھتے ہوئے خود بھی ایسی آواز سے پڑھتے تھے جو دوسرے لوگ سن سکیں۔ روایت کا یہ تاثر حقیقت سے بعید ہے۔

۵۔ فاطمہؓ کا صحیفہ سے پڑھنا اور پھر اس کو چھپا دینا بھی خلاف حقیقت ہے۔ مسلمانوں کی کسمپرسی کے ان ایام میں قرآن کی تحریر کا اہتمام کرنا اور پھر اس سے پڑھنا پڑھانا ناممکن تھا۔ قریش میں بھی بہت کم لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے چہ جائیکہ خواتین معمولاً کوئی صحیفہ پڑھنے پر قادر ہو سکتیں۔ اسی طرح خبابؓ ایک غلام تھے۔ ان کا پڑھا لکھا ہونا ثابت کرنا ہوگا۔

۶۔ سورہ حدید بالاتفاق مدنی سورہ ہے۔ ۶ نبوی میں اس کا نزول نہیں ہوا تھا۔

۷۔ دار ارقم ایک مدت سے مسلمانوں کا مرکز تھا جسے ہر مکی جانتا تھا۔ روایت میں اس کا تذکرہ اس طرح ہوا ہے جیسے وہ کوئی غیر معروف مکان ہو جو پہلی مرتبہ عمرؓ کے علم میں آ رہا ہو۔

۸۔ روایت کا تاثر یہ ہے جیسے نبی ﷺ اس مکان میں چھپے ہوئے ہوں۔ حالانکہ حضورؐ کی آمد و رفت نہ صرف مسجد حرام میں بلکہ قریش کی مجالس میں بھی رہتی۔ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ اپنی نماز میں بہ آواز بلند قرأت کیا کرتے اور قریش خانہ کعبہ کے پردوں میں چھپ کر اس کو سنا کرتے۔ اور یہ اس دور میں بھی ہوا جب حضورؐ سے مخالفت بڑے زوروں پر تھی۔ حضورؐ سے ملنا کبھی کسی کے لیے مسئلہ نہیں بنا تھا۔ اللہ کا رسول ہمیشہ اپنا کام ڈنکے کی چوٹ کرتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے اس کام پر مامور ہوتا ہے اور اللہ خود اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اسے چھپنے چھپانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

دوسری روایت: حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بارے میں دوسری روایت ام عبداللہ بنت ابی حثمہؓ کی ہے۔ عامر بن ربیعہؓ حضرت عمرؓ کے خاندان کے حلیف تھے۔ ان کا کنبہ حبشہ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ عمر آ گئے اور کھڑے ہو کر تیاری کا سماں دیکھنے لگے۔ اب تک ان کا رویہ نہایت سخت رہا تھا اور انہوں نے اس کنبہ کو بہت تکلیفیں دی تھیں۔ عمر پوچھنے لگے، اے ام عبداللہ، روانہ ہو رہی ہو؟ انہوں نے کہا، ہاں۔ تم لوگوں نے بہت سخت اذیتیں دیں اور ہم پر ظلم ڈھایا۔ اب ہم اللہ کی زمین میں نکل جائیں گے یہاں تک کہ اللہ کوئی راہ کھولے۔ عمر نے کہا، اچھا اللہ تمہارا ساتھی ہو۔ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی، دل میں رقت طاری ہو گئی اور وہ اسی کیفیت میں وہاں سے چلے گئے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اس قبیلہ کی روانگی سے دلی صدمہ پہنچا ہے۔ ام عبداللہؓ نے اپنے شوہر کو بتایا کہ آج اگر تم عمر کو دیکھتے تو ان پر رقت اور غم کے اثرات دیکھتے۔ مجھے تو ان کے اسلام لانے کی امید پیدا ہو گئی ہے۔[۵]

یہ روایت بالکل فطری معلوم ہوتی ہے۔ ایک گھرانہ، جس کے ساتھ برسوں کا بھائی چارا رہا ہو، افراد خانہ سے قلبی تعلق ہو، ایک وقتی مسئلہ پر جذبات کی شدت میں آدمی نے ان کے ساتھ اس قدر زیادتی کی ہو کہ وہ اپنا گھر چھوڑنے پر تیار ہو جائے لیکن اپنے نظریات پر آنچ نہ آنے دے، جب فی الواقع سامان باندھ لیتا ہے تو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کے جذبات میں بھی ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ خرابی کہیں میرے اندر ہی نہ ہو اور انہی لوگوں کے نظریات درست نہ ہوں۔ اس طرح کے واقعات زندگی کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ کی سوچ اسی واقعہ نے بدل دی اور کچھ عرصہ غور کرنے کے بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

عطا اور مجاہد کی ایک روایت کے مطابق عمرؓ رات کو کسی وقت مسجد حرام پہنچے۔ دیکھا تو حضورؐ نماز میں قرآن پڑھ رہے تھے۔ انہیں قرآن سننے کا شوق ہوا تو حطیم کی جانب سے غلاف کعبہ کے پیچھے داخل ہوئے اور چھپ کر عین اس جگہ پہنچے جہاں حضورؐ نماز پڑھ رہے تھے۔ جب نماز ختم ہوئی اور آپ گھر کو چلے تو یہ آپ کے پیچھے ہو لیے۔ جب آپ اپنے گھر کے قریب پہنچے تو یہ حضورؐ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے پوچھا، عمر اس وقت کہاں؟ انہوں نے کہا میں اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے ان کو ہدایت پر استقامت کی دعا دی اور مکہ کا یہ بطل جلیل اسلام کا خادم بن گیا[6]۔ اگلے ہی روز مسجد میں جا کر اعلان کیا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور اب علانیہ یہاں نماز پڑھوں گا۔ جو مجھے روک سکتا ہو روک کر دکھائے۔

حضرت عمر بن الخطابؓ کے اسلام سے نبی ﷺ کی ان کے حق میں دعا قبول ہو گئی۔ اس سے مسلمانوں کو بڑا حوصلہ ملا اور قریش کو اپنی شکست کا احساس ہوا۔

ہجرت حبشہ کے کچھ عرصہ بعد حضرت عمرؓ کا اسلام لانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس واقعہ نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اور انہی کو نہیں بلکہ متعدد دوسرے قرشی نوجوانوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا کیونکہ قریش کی توقع کے برعکس اس واقعہ کے بعد لوگوں کے مسلمان ہونے کی رفتار میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور اسلامی کاروان بڑھتا چلا گیا۔

مسلمانوں کو غلبہ کی بشارت:

ہجرت حبشہ نے ایک اور پہلو سے بھی قریش کو متاثر کیا۔ وہ یہ کہ حبشہ میں مسلمانوں کی پذیرائی اور شاہ حبشہ کے اسلام کی جانب میلان نے قریش کے اندر عیسائیوں کے لیے ایک نفرت سی بٹھا دی جبکہ مسلمان ان کے ممنون تھے اور ان کے حق میں تعریفی کلمات ادا کرتے۔

ملک عرب سے باہر لیکن اس سے متصل دو عظیم بادشاہتیں ایرانیوں اور رومیوں کی تھیں۔ ایرانی مشرک تھے جبکہ رومی پال کی لائی ہوئی بدعات کے باوجود خدا کی وحدانیت کا اقرار کرنے والوں میں تھے۔ قریش کو

عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی، وہ سب کو ایک ہی طرح کا مذہبی گروہ سمجھتے۔ ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان شام کے علاقہ میں بالعموم سرحدی جھگڑے پیدا ہوتے اور کبھی نوبت باقاعدہ جنگ کی پیدا ہو جاتی۔ ۶۱۶ء میں ایران نے قیصر روم کے علاقہ پر چڑھائی کی تو رومی فوجیں مقابلہ نہ کرسکیں اور ان کے بہت سے علاقہ پر خسرو پرویز کا قبضہ ہو گیا۔ وہ لڑائی کے نتیجہ کے بارہ میں اتنا پرامید ہوا کہ قیصر روم کو پابند سلاسل دیکھنے کے خواب دیکھنے لگا۔ یہ اطلاعات جب مکہ پہنچیں تو قریش نے مسلمانوں کا مذاق اڑانا شروع کیا کہ دیکھ لو اپنے ہم مسلکوں کا حشر۔ تمہارا نبی بھی ہم پر غلبہ کے خواب دیکھتا ہے۔ اگر یہ سچا ہوتا تو خدا ایرانی مشرکوں کو رومی توحید پرستوں پر کیوں غلبہ عطا کرتا۔ دیکھو رومیوں کے پاؤں کسی جگہ ٹکنے میں نہیں آ رہے ہیں اور ایرانی فوجیں ان کے ملک میں گھسی جا رہی ہیں۔ مسلمانوں کا حال بھی یہی ہو گا کہ کہیں ان کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔ مسلمانوں کی ہمدردیاں چونکہ عیسائیوں کے ساتھ تھیں اس لیے وہ شرمندہ ہو کر رہ جاتے اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ اس موقع پر سورہ الروم کی آیات نازل ہوئیں:

الٓمٓ. غُلِبَتِ الرُّوْمُ. فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ. فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ. لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ. وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ. بِنَصْرِ اللّٰهِ. يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ. وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ. وَعْدَ اللّٰهِ. لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ. (الروم ۳۰:۱۔۶)

یہ سورہ الم ہے۔ رومی پاس کے علاقے میں مغلوب ہوئے اور وہ اپنی مغلوبیت کے بعد عنقریب۔۔ چند سالوں میں۔۔ غالب آ جائیں گے۔ اللہ ہی کے حکم سے ہوا جو پہلے ہوا اور اللہ ہی کے حکم سے ہو گا جو بعد میں ہو گا۔ اور اس وقت اہل ایمان مسرور ہوں گے اللہ کی مدد سے۔ وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور غالب و مہربان تو وہی ہے۔ یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

ان آیات میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی کہ ایرانیوں کی کامیابیاں عارضی ہیں۔ بہت جلد حالات پلٹا کھائیں گے اور چند سالوں میں رومی فی الوقت اپنی مغلوبیت کے باوجود ایرانیوں پر غالب آ جائیں گے۔ اس وقت اہل ایمان کے مسرور ہونے کا وقت ہو گا اور مشرکین مکہ اپنا منہ چھپاتے پھریں گے۔

'چند سالوں' کے لیے عربی میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ 'بضع سنین' ہے۔ اس کا اطلاق نو سال یا اس سے کچھ کم مدت پر ہوتا ہے۔ فی الحقیقت ایسا ہی ہوا اور مدینہ کو ہجرت کے بعد دوسرے سال رومیوں نے ایرانیوں کو مکمل طور پر مغلوب کر لیا۔ اس موقع پر اہل ایمان کے لیے اللہ کی نصرت کی ایسی شانیں ظاہر ہوئیں کہ تین سو کمزور مسلمانوں نے ایک ہزار آہن پوش کفار کو بدر کے میدان میں شکست دے دی۔ اس جنگ میں کفار کے صف اول کے تمام سردار، جو رسول اللہؐ کی دشمنی میں پیش پیش رہتے تھے، مارے گئے۔ اس طرح ہجرت حبشہ کے موقع پر کی گئی

پیشینگوئی پوری ہوگئی اور اہل ایمان کو کئی مسرتیں ایک ساتھ حاصل ہوئیں۔

حبشہ سے مہاجرین کی واپسی:

حبشہ میں قیام کے کچھ عرصہ بعد ۳۳ مسلمان، جن میں سے بعض کی بیویاں بھی ساتھ تھیں، وہاں سے مکہ لوٹ آئے۔ ابن اسحاق کے مطابق ان کی آمد اہل مکہ کے اسلام لانے کی ایک غلط خبر سن کر ہوئی۔ واپس آ کر یہ ایک مخمصہ میں گرفتار ہو گئے کہ شہر میں کس کی ذمہ داری پر داخل ہوں۔ اپنے پہلے گھروں کے دروازے ان پر بند ہو چکے تھے۔ کسی مضبوط شخص کا جوار حاصل کیے بغیر مکہ میں رہنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ بعض مسلمانوں نے اپنے قبیلہ کو چھوڑ کر دوسرے خانوادوں کا جوار حاصل کیا۔ عثمان بن مظعونؓ ولید بن مغیرہ کی پناہ میں آئے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ میں تو ولید کے جوار کے باعث بڑے آرام اور سکون سے ہوں جبکہ رسول اللہؐ اور دوسرے مسلمان تکلیفیں اٹھا رہے ہیں تو وہ ولید کے پاس گئے کہ میں آپ کا جوار لوٹاتا ہوں۔ ولید نے کہا میں نے جوار مسجد میں دیا تھا، اس کو لوٹانا بھی مسجد ہی میں ہوگا۔ چنانچہ عثمانؓ مسجد میں گئے اور یہ اقرار کرنے کے بعد کہ ولید کا جوار نہایت شریفانہ تھا، اس کو واپس کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ اب اللہ کی پناہ پر اعتماد کروں گا۔

ابو سلمہ بن عبد الاسدؓ نے ابو طالب کا جوار حاصل کیا جس پر ابولہب بہت تلملایا اور اس جوار کی مخالفت کی۔ ابو طالب نے جواب دیا کہ ابو سلمہ میرے بھانجے ہیں۔ میں ان کو پناہ دیتا ہوں۔

حبشہ جانے والے باقی مہاجرین وہاں سے دوبارہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے اور اللہ کی راہ میں دو ہجرتوں کا ثواب حاصل کیا۔ شاید تمام امتوں میں یہ شرف صرف امت مسلمہ کو حاصل ہوا ہے کہ پیغمبر کے بعض ساتھیوں نے دومرتبہ ہجرت کا ثواب کمایا۔

حوالہ جات

۱۔ السیرۃ النبویہ۔ ابن ہشام۔ ص ۳۹۱۔۳۹۲

۲۔ سیرۃ النبیؐ۔ ابن کثیر۔ مترجم۔ مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور، ص ۲۸۱

۳۔ صحیح مسلم۔ باب من فضائل ابی ذرؓ۔ ص ۳۸۸

۴۔ السیرۃ النبویہ۔ ابن ہشام۔ ص ۳۴۳۔۳۴۶

۵۔ ایضاً، ص ۳۴۲

۶۔ ایضاً، ص ۳۴۸

باب 14

اسلام سے قریش کی وحشت کے اسباب

رسول اکرم ﷺ کی دعوت سے قریش کو جو وحشت ہوتی تھی اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ بیت اللہ کے متولی ہونے کے حوالہ سے انہوں نے جو دین رائج کر رکھا تھا وہ وہ نہیں تھا جس کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی تھی۔ اسلام کی دعوت اس خود ساختہ نظام پر تنقید کے نشتر چلاتی تھی۔ بیت اللہ پر قریش کے قابض رہنے کے جواز کو اس نے چیلنج کر دیا تھا۔ قریش محسوس کرتے کہ اگر یہ دعوت قوت پکڑتی گئی تو یہ کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں ان کا دینی پیشوائی کا نظام زمین بوس ہو جائے گا اور ملک میں ان کی مقتدر حیثیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

قریش نے ابراہیمی تصور توحید کو خیر باد کہہ کر بت پرستی کو جو اہمیت دے رکھی تھی اس کا فائدہ ان کو یوں پہنچا تھا کہ وہ عرب کے تمام قبائل کے بتوں کو خانہ کعبہ میں جگہ مہیا کر کے ان کو اپنا وفادار بنا سکتے تھے۔ یہ وہی ذہنیت ہے جس کے تحت ہندوستان میں ہندوؤں نے گوتم بدھ کے بتوں کو اپنے معاشرہ میں جگہ دے کر بدھوں کو اپنے ساتھ ملایا اور ان کی انفرادیت ختم کر کے بدھ مت کو دیس نکالا دے دیا۔ ہر قبیلہ کا بت کعبہ میں لا لا کر رکھنے کے نتیجہ میں پورا عرب قریش کو نظام شرک کا محافظ سمجھتا تھا اور اس کے بدلے میں ان کو تجارت اور اپنے علاقے میں سے گزرنے پر ان کو راہداری کی سہولتیں مہیا کرتا تھا۔ ابراہیمی تصور توحید کو اختیار کرنے کی صورت میں یہ فوائد معرض خطر میں پڑ سکتے تھے۔ نبی ﷺ کی دعوت نے قریش کے ایک ایک انحراف اور ہر ہر بدعت کو بالکل نمایاں کر کے رکھ دیا جس سے قریش پریشان ہو کر رہ گئے۔ یہاں مختصر طور پر حضورؐ کی دعوت کے ان عناصر کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے جو قریش کے نظریات پر تنقید کی نوعیت کے تھے۔

شرک اور بت پرستی پر گرفت:

چونکہ قریش اپنی ہر بدعت اور تصور دین کو حضرت ابراہیمؑ سے منسوب کرتے تھے اس لیے سیدنا ابراہیمؑ کے اسوہ کو قرآن میں کئی مقامات پر اجاگر کر کے بتایا گیا کہ ان کو شرک اور بت پرستی سے شدید نفرت تھی اور اسی نفرت

کے باعث انہوں نے اپنی قوم سے ٹکر لی اور بالآخر اپنے وطن سے ہجرت کر کے نکل آئے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ. اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا. اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا. يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا. يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ. اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا. يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا. قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا. (مریم۱۹:۴۱۔۴۶)

اور کتاب میں ابراہیم کی سرگزشت کو یاد کرو۔ بے شک وہ راست باز اور نبی تھا۔ یاد کرو جبکہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! آپ ایسی چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ وہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں۔ اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے تو آپ میری پیروی کریں، میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ! شیطان کی پرستش نہ کیجئے۔ شیطان خدائے رحمان کا بڑا ہی نافرمان ہے۔ اے میرے باپ! مجھے ڈر ہے کہ آپ کو خدائے رحمان کا کوئی عذاب آ پکڑے اور آپ شیطان کے ساتھی بن کر رہ جائیں۔ وہ بولا: اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو رہے ہو؟ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ تم مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جاؤ۔

ان آیات میں بتوں کی پوجا کو ایک بے فائدہ حرکت بتایا گیا ہے جو شیطان کی عبادت کے حکم میں ہے۔ اس حرکت کے باعث آدمی اللہ کے عذاب سے دوچار ہو سکتا ہے۔ سیدھی راہ اس سے بالکل الگ پیغمبر کی اطاعت سے ملتی ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ. رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ. رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ. وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ. (ابراہیم۱۴:۳۵۔۳۸)

اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی: اے میرے رب! اس سرزمین کو پرامن بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب! ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد میں سے ایک بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا

ہے۔اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں،تو تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اوران کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔اے ہمارے رب! تو جانتا ہے جو ہم پوشیدہ رکھتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔اور اللہ سے کوئی چیز مخفی نہیں،نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔

ان آیات میں شرک و بت پرستی سے نفرت ہر ہر لفظ سے عیاں ہے۔ پھر بیت اللہ کی ذمہ داریوں کی یاددہانی ہے جن سے قریش غافل تو تھے ہی، وہ بدعات کو رواج دیے ہوئے تھے۔قرآن کی یہ باتیں قریش کو کہاں ہضم ہوسکتی تھیں اور جب حضورؐ ان کی وضاحتیں کرتے ہوں گے تو قریش کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین کیوں نہ کھسکتی ہوئی محسوس ہوتی ہوگی؟

حقیقت توحید:

قرآن نے اس حقیقت کو بھی آشکارا کیا کہ اس کائنات میں شکر کے لائق ذات صرف اللہ کی ہے کیونکہ انسان اسی کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔لہٰذا نجات اللہ کے ان بندوں کو حاصل ہوتی ہے جن کو وہ نبیوں کا ساتھ دینے کے لیے منتخب فرمالیتا ہے۔ قرآن نے متعدد نعمتیں گنوا کر سوال کیا کہ کیا ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی ہے جس کو خدا کے کسی شریک کی طرف منسوب کیا جاسکے یا جس کی بنا پر شریکوں کو عبادت کے لائق سمجھا جاسکے:

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى. ءٰٓاللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ. اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا. ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ. بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ. اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا. ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ. بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ. اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ. ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ. قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ. اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ مَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ. ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ. تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ. اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ. ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ. قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ. وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ. (النمل ۲۷:۵۹۔۶۵)

کہو کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے۔اور اس کے ان بندوں پر سلامتی و رحمت ہے جن کو اس نے برگزیدہ کیا۔کیا اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں؟ (کیا تمہارے یہ معبود بہتر ہیں) یا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے جس نے آسمان سے پانی اتارا،پس ہم نے اس پانی سے خوش منظر باغ اگائے۔تمہارے امکان میں نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اگا سکتے۔کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟

بلکہ یہ راہ حق سے انحراف اختیار کرنے والے لوگ ہیں۔
(کیا تمہارے یہ اصنام سزاوار شکر ہیں) یا وہ جس نے زمین کو ٹھکانا بنایا اور جس نے اس کے درمیان نہریں جاری کیں اور اس کے لیے اس نے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان جس نے پردہ ڈال دیا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے، بلکہ ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔
(کیا تمہارے یہ شرکاء مستحق عبادت ہیں) یا وہ جو محتاج کی دادرسی کرتا ہے جب کہ وہ اس کو پکارتا ہے، اور اس کے دکھ دور کرتا ہے اور تم کو زمین کی وراثت دیتا ہے، کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے؟ بہت ہی کم تم لوگ یاددہانی حاصل کرتے ہو!
(کیا تمہارے یہ دیوی دیوتا لائق پرستش ہیں) یا وہ جو بر و بحر کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے اور جو ہواؤں کو اپنے باران رحمت سے پہلے خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ اللہ بہت ہی برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔
(کیا تمہارے مزعومہ شفعاء لائق بندگی ہیں) یا وہ جو خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کا اعادہ کرے گا اور جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ کہو کہ تم اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو! کہہ دو کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، اللہ کے سوا کسی کو بھی غیب کا علم نہیں ہے اور انہیں پتا بھی نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔

جب اس طرح دوٹوک انداز میں کسی کے عقائد کو بے بنیاد قرار دیا جا رہا ہو تو مخالفت میں اس کا خون کیوں کھولنے نہیں لگے گا!

فرشتوں اور جنات کی پوزیشن:

اہل عرب فرشتوں اور جنات کو خدا کی ذات میں شریک کرتے یا پھر اس کے حقوق وصفات میں ان کو اس کا ساجھی ٹھہراتے۔ وہ ان سے نفع وضرر وابستہ کرتے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے جتن کر کے ان سے بڑی امیدیں باندھ لیتے۔ فرشتوں کو تو وہ خدا کی بیٹیوں کی حیثیت دیتے جبکہ جنات اور خدا کے درمیان رشتہ مانتے۔ قرآن نے ان تصورات کے تار و پود بکھیر دیے اور واضح کیا کہ فرشتے ہوں یا جنات، دونوں کو اپنی اوقات خوب معلوم ہے۔ وہ شریک خدا ہونے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ وہ بھی خدا کی بندگی کر کے ہی رب کو راضی کر سکتے ہیں اور یہی اصول انسانوں کے لیے بھی ہے:

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ. اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شَاهِدُوْنَ. اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللّٰهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ. اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ. مَا لَكُمْ كَيْفَ

تَحۡكُمُوۡنَ. اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ. اَمۡ لَكُمۡ سُلۡطٰنٌ مُّبِيۡنٌ. فَاۡتُوۡا بِكِتٰبِكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ. وَجَعَلُوۡا بَيۡنَهٗ وَبَيۡنَ الۡجِنَّةِ نَسَبًا. وَلَقَدۡ عَلِمَتِ الۡجِنَّةُ اِنَّهُمۡ لَمُحۡضَرُوۡنَ. سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ. اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ. فَاِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَيۡهِ بِفٰتِنِيۡنَ. اِلَّا مَنۡ هُوَ صَالِ الۡجَحِيۡمِ. وَمَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعۡلُوۡمٌ. وَّاِنَّا لَنَحۡنُ الصَّاۤفُّوۡنَ. وَاِنَّا لَنَحۡنُ الۡمُسَبِّحُوۡنَ.

(الصافات ۳۷:۱۴۹۔۱۶۶)

ان سے پوچھو: کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے؟ کیا ہم نے فرشتوں کو عورتیں بنایا اور وہ دیکھ رہے تھے؟ یہ لوگ محض من گھڑت طور پر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ خدا نے اولاد بنائی ہے اور یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ کیا اس نے بیٹوں پر بیٹیوں کو ترجیح دی؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ تم کیسا فیصلہ کرتے ہو! کیا تم ہوش سے کام نہیں لیتے؟ کیا تمہارے پاس واضح حجت ہے؟ پس پیش کرو تم اپنی کتاب اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

اور انہوں نے خدا اور جنوں کے درمیان بھی رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ اور جنوں کو خوب پتا ہے کہ وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ بجز ان کے جو اللہ کے خاص بندے ہیں۔ پس تم اور جن کو تم پوجتے ہو خدا سے برگشتہ نہیں کر سکتے مگر انہی کو جو جہنم میں پڑنے والے ہیں۔

اور ہم (فرشتوں) میں سے ہر ایک کے لیے ایک معین مقام ہے اور ہم تو خدا کے حضور بس صف بستہ رہنے والے ہیں، اور ہم تو اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔

آخرت کا تصور:

اہل عرب آخرت کے معاملہ میں نہایت غیر سنجیدہ تھے۔ وہ اس کو ایک غیر یقینی امر سمجھتے۔ قرآن نے اس کے دلنشین دلائل بھی دیے اور اس صورت حال سے بھی پردہ اٹھایا جو آخرت کے واقع ہونے پر مجرموں اور رسولوں کو جھٹلانے والوں کو پیش آئے گی۔

اَللّٰهُ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ. وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ يُبۡلِسُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ. وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهُمۡ مِّنۡ شُرَكَآئِهِمۡ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوۡا بِشُرَكَآئِهِمۡ كٰفِرِيۡنَ. وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ يَوۡمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوۡنَ. فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمۡ فِىۡ رَوۡضَةٍ يُّحۡبَرُوۡنَ. وَاَمَّا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الۡاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِى الۡعَذَابِ مُحۡضَرُوۡنَ.

(الروم ۳۰:۱۱۔۱۶)

اللہ ہی خلق کا آغاز کرتا ہے۔ پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جس دن قیامت واقع ہوگی تو مجرم اس دن مایوس ہو جائیں گے اور ان کے شریکوں میں سے کوئی ان کے لیے سفارش

کرنے والا نہیں بنے گا۔ اور وہ اپنے شریکوں کا انکار کریں گے۔
اور جس دن قیامت واقع ہوگی مومن اور کافر الگ الگ ہو جائیں گے۔ پس جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہوں گے وہ تو ایک شاندار باغ میں مسرور ہوں گے۔ رہے وہ جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کی تکذیب کی تو وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔

وَيَقُولُ الْإِنسَانُ ءَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا. أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا. فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا. ثُمَّ لَنَنزِعَنَّ مِن كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا. ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا. وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا. (مریم۱۹:۶۶۔۷۱)

اور انسان کہتا ہے کہ کیا جب میں مر جاؤں گا تو پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔ کیا یہ انسان اس بات پر غور نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا درآنحالیکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ پس تیرے رب کی قسم! ہم ان کو بھی اور شیطانوں کو بھی ضرور اکٹھا کریں گے، پھر ہم ان کو جہنم کے گرد اس طرح حاضر کریں گے کہ وہ دوزانو بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ پھر ہم ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو چھانٹ کر الگ کریں گے جو خدائے رحمان سے سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے رہے ہوں گے۔ پھر ہم ان لوگوں کے سب سے زیادہ جاننے والے ہوں گے جو اس جہنم میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ سزاوار ہوں گے۔ اور (ان کو حکم دیں گے کہ) تم میں سے ہر ایک کو بہر حال اس میں داخل ہونا ہے۔ یہ تیرے رب کے اوپر ایک طے شدہ امر واجب ہے۔

وہ صنادید قریش، جو تکبر اور رعونت کے باعث کسی کو بھی خاطر میں لانے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے، اپنے بارے میں یہ سن کر کہ وہ اکابر مجرمین کی صف میں کھڑے ہوں گے اور ان کو اپنی سرکشی کی سزا بھگتنی ہوگی، اس دعوت کے تیوروں سے کیوں نہ برافروختہ ہوتے۔ اس کا تو ہر ہر لفظ ان کے لیے ناقابل برداشت اور تن بدن میں آگ لگانے والا رہا ہوگا۔

احکام وآداب حج:

قریش کے ہاتھوں میں مسجد حرام اور حج وعمرہ کی عبادت کا انتظام تھا۔ وہ یہ کام اپنی دینی ذمہ داری سمجھ کر بڑی محنت سے سرانجام دیتے لیکن صدیوں سے جو انحراف وہاں کے طور طریقوں میں در آیا تھا اس سے احکام خداوندی نظر انداز ہوتے۔ لہٰذا قریش کو ان معاملات میں بے اعتنائی برتنے سے روکا گیا۔ احکام وآداب حج نئے سرے سے دیے گئے جس سے وہ راہ پھر سے روشن ہوگئی جس پر صدیوں سے تاریکیوں نے ڈیرے جمار کھے تھے۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ

وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ. لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ. فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ. ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ. ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ. وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ. حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ. وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ. ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ. (الحج ۲۲:۲۶_۳۲)

اور یاد کرو جب کہ ہم نے ابراہیم کے لیے ٹھکانا بتایا بیت اللہ کی جگہ کو، اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھیو۔ اور لوگوں میں حج کی منادی کرو۔ وہ تمہارے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور نہایت لاغر اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز گہرے پہاڑی راستوں سے پہنچیں گی۔ تاکہ لوگ اپنی منفعت کی جگہوں پر بھی پہنچیں اور چند خاص دنوں میں ان چوپایوں پر اللہ کا نام بھی لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ پس اس میں سے کھاؤ اور فاقہ کش فقیروں کو کھلاؤ۔ پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور بیت قدیم کا طواف کریں۔ ان امور کا اہتمام رکھو اور جو حرمات الٰہی کی تعظیم کرے گا تو اس کے رب کے نزدیک یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ اور تمہارے لیے چوپائے حلال ٹھہرائے گئے ہیں بجز ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنا دیے گئے ہیں۔ تو بتوں کی گندگی سے اجتناب کرو اور جھوٹ بات سے بچو۔ اللہ ہی طرف یکسو رہو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور پرندے اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے۔ ان امور کا اہتمام رکھو اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یاد رکھے کہ یہ چیز دل کے تقویٰ سے تعلق رکھنے والی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جن مقاصد کے لیے یہ گھر تعمیر کیا تھا وہ مقاصد تم نے برباد کر دیے۔ بتوں کے تعلق سے شرک کی جو گندگی تم نے اپنے اوپر لاد رکھی ہے اس سے بچو اور اپنے جی سے چیزوں کو حرام یا حلال ٹھہرانے سے اجتناب کرو۔ حج کے تمام مناسک کی ادائیگی شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہونی ضروری ہے۔ بیت اللہ کے شعائر کی تعظیم کا حق محض ظاہرداری سے ادا نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے دل کا تقویٰ مطلوب ہے۔

قرآن نے طواف کے دوران عریانی کو عبادت کا جزو قرار دینے کی بدعت کو شیطنت قرار دیا اور بتایا کہ برہنگی سراسر بے حیائی ہے جس کا حکم خدا کبھی نہیں دے سکتا۔ لہٰذا مسجدوں میں پورے لباس میں آیا کرو:

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا. قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ. أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ...... يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ. قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ. قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ. كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ.

(الاعراف ۷:۲۸، ۳۱-۳۲)

اور جب یہ لوگ سنگین بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم نے اسی طریق پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور خدا نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہہ دو اللہ کبھی بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم لوگ اللہ پر وہ تہمت جوڑتے ہو جس کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں؟............

اے بنی آدم! ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس پہنو اور کھاؤ پیو البتہ اسراف نہ کرو۔ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پوچھو، کس نے حرام ٹھہرایا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو، کہہ دو کہ وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور آخرت میں تو وہ خاص انہی کا حصہ ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کر رہے ہیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔

یاد رہے کہ یہ تبصرے اس دین پر ہیں جو قریش نے رائج کر رکھا تھا اور جس میں عریاں طواف بھی جزو دین تھا۔ اس دین کے متعلق ان کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ ابراہیمی دین کی وراثت ہے جو ہمارے بزرگوں کو ملی تھی۔ قرآن نے اس کو سراسر تہمت قرار دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کبھی برائی اور بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ ایسی نسبت اس کی طرف کرنا بھی سوءِ ادب ہے۔

کھیتی اور جانوروں میں حرام وحلال:

حلال وحرام کے ضمن میں مشرکین نے بہت سی بدعات اختیار کر رکھی تھیں۔ وہ ان کو ابراہیمی دین کا ورثہ سمجھتے۔ فرمایا کہ تمہاری یہ سب باتیں بے سند ہیں۔ لہٰذا جو چیزیں اصلاً حلال ہیں، اگر ان پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لے لیا جائے تو ان کو بلا تکلف کھاؤ۔ لیکن وہ جانور جو تھانوں اور استھانوں پر غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے جاتے ہیں ان کا کھانا حرام ہے۔

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ. وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ. وَإِنَّ كَثِيرًا لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ

عِلْمٍ. اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِیْنَ. وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ. اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا کَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ. وَلَا تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ. وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰی اَوْلِیٰٓئِهِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّکُمْ لَمُشْرِکُوْنَ.

(الانعام ۶:۱۱۹-۱۲۲)

پس تم کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو، اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو۔ اور تم کیوں نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو جبکہ اس نے وہ چیزیں، جو تم پر حرام ٹھہرائی ہیں، تفصیل سے بیان کر دی ہیں، اس استثناء کے ساتھ جس کے لیے تم مجبور ہو جاؤ۔ اور بے شک بہتیرے ایسے ہی ہیں جو لوگوں کو، کسی علم کے بغیر اپنی بدعات کے ذریعہ سے گمراہ کر رہے ہیں۔ ان حد سے بڑھ جانے والوں سے تیرا رب خوب واقف ہے۔ اور چھوڑو گناہ کے ظاہر کو بھی اور اس کے باطن کو بھی۔ بے شک جو لوگ گناہ کما رہے ہیں وہ عنقریب اپنی اس کمائی کا بدلہ پائیں گے۔ اور تم نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اور بے شک یہ حکم عدولی ہے۔ اور شیاطین القاء کر رہے ہیں اپنے ایجنٹوں کو تا کہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کا کہا مانو گے تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔

مطلب یہ ہے کہ شرک کے عقیدہ کے تحت تم نے بدعات کا ایک جال بچھا رکھا ہے۔ ان بدعات کے مطابق جانوروں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لینے سے بھی اجتناب کرتے ہو اور تمہارا انحصار موہوم شریکوں پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ رب العزت سے اس بے اعتنائی کی تعلیم ابراہیم علیہ السلام نے کبھی نہیں دی۔ اسی طرح ابراہیمی شریعت کے لحاظ سے بہت سے جانوروں میں حرمت کا کوئی پہلو موجود نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود چونکہ وہ تمہاری بدعات کے تحت حرام ہوتے ہیں اس لیے ان کو اگر اللہ کے نام پر بھی ذبح کیا جائے تو تم ان کے گوشت کو ہاتھ لگانے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ سارا رویہ تمہارے خودساختہ مذہب کا حصہ ہے۔ یہ اللہ کی صریح نافرمانی ہے۔

علیٰ ہذا القیاس کھیتی اور چوپایوں کے بارے میں ابراہیمی شریعت کا قریش نے جو حلیہ بگاڑ دیا تھا اس پر سخت گرفت کرتے ہوئے اسے جھوٹ کا پلندہ اور افترا قرار دیا اور واضح کیا کہ اس افترا کا ان کو خدا کے دربار میں بدلہ چکانا پڑے گا۔ فرمایا:

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ لَّا یَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا یَذْکُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا افْتِرَآءً عَلَیْهِ. سَیَجْزِیْهِمْ بِمَا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ.

(انعام ۶:۱۳۹)

اور کہتے ہیں: فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں کھیتی ممنوع ہے۔ ان کو نہیں کھا سکتے مگر وہی جن کو ہم چاہیں

اپنے گمان کے مطابق۔ اور کچھ چوپائے ہیں جن کی پیٹھیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں اور کچھ چوپائے ہیں جن پر خدا کا نام نہیں لیتے، محض اللہ پر افترا کے طور پر۔ اللہ عنقریب ان کو اس افترا کا بدلہ دے گا۔

نبی ﷺ کا ان تمام امور میں جو موقف تھا وہ قریش کے تصور دین سے اتنا مختلف تھا کہ دونوں میں کوئی مقام اتصال آتا ہی نہیں تھا۔ قریش اس سے سیخ پا ہوتے۔ ان کا خیال تھا کہ محمد (ﷺ) کی یہ دعوت نہ صرف ہمارے آبائی عقائد کی نفی کر رہی ہے بلکہ جس دینی نظام کے بل بوتے پر ہم پورے عرب پر اپنی سیادت کا سکہ جمائے بیٹھے ہیں اس کو بھی بے بنیاد قرار دے رہی ہے۔ اگر یہ دعوت کامیاب ہو گئی تو ہمیں اپنی پیشوائی اور خانہ کعبہ سے متعلق اپنے مناصب سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس طرح قریش کے دنیاوی مفادات پر جو زد پڑتی تھی وہ ان کو بے کل کر دیتی تھی۔ وہ دعوت دین کی راہ روکنے کے لیے نبی ﷺ اور اہل ایمان کی مخالفت میں شدت لے آتے لیکن کسی طرح بات بنتی نظر نہ آتی۔ اس صورت حال میں قرآن پچھلی امتوں کی سرفروشیوں کا حوالہ دیتا، نبی ﷺ دین اسلام کی کامرانی و فتحیابی کی پیشینگوئیاں سنا کر مسلمانوں کا حوصلہ بڑھاتے اور ان کو قریش کی زیادتیوں کا پامردی سے مقابلہ کرنے کے لیے دل مضبوط کرنے کی تلقین فرماتے۔ آخرت میں اہل ایمان کی بلندی درجات کا وعدہ ان کو اتنی قوت فراہم کرتا کہ وہ قریش کے مظالم کو پرِ کاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دیتے۔

باب 15

طلب مدد کے لیے قریش کا یہود سے رابطہ

قرآن مجید قریش کے عقائد، عبادات اور تصور دین ہر چیز پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا اور نبی ﷺ بے کم و کاست ہر چیز کو عوام کے آگے رکھ رہے تھے۔ قریش اپنی معلومات کے مطابق ان چیزوں کا جواب مہیا کر کے اپنے عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے لیکن انہیں احساس ہوتا کہ اس پرشکوہ آسمانی کلام کے مقابلہ میں بات بنتی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ انہوں نے نئے دین کے توڑ کے لیے اپنے ایک لیڈر نضر بن حارث کو یثرب کے یہودی لیڈروں کے پاس بھیجا کہ وہ بھی محمد (ﷺ) کی مخالفت میں سرگرم ہو جائیں اور قریش کو ایسی چیزیں بتائیں جن کا حوالہ دے کر ان کا منہ بند کیا جا سکتا ہو۔ یہود اب تک خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے یا وہ اپنے تعلق کے مکی اکابر کو کچھ اعتراضات سجھاتے رہتے تھے لیکن نضر بن حارث کے مشن کے بعد وہ پوری طرح سرگرم ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کی بعثت کے بعد ابتدائی سالوں میں اہل کتاب کا تذکرہ قرآن مجید میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ جبکہ بعد کے سالوں میں اسلام کے ان درپردہ دشمنوں کی کارگزاری کو طشت از بام کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب رسول اللہؐ کی دعوت اور اس کے ممکنہ نتائج سے نہ صرف پوری طرح آگاہ تھے بلکہ انہوں نے قریش کو اس کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر آنے میں پوری علمی، اخلاقی اور سیاسی مدد دی۔

نضر بن حارث کا مشن یہ معلوم ہوتا ہے کہ قریش اہل کتاب کی رائے لینا چاہتے تھے کہ کیا ہمارے اندر پیدا ہونے والا یہ شخص واقعی نبی ہے یا ہمارے اوپر دھونس جمانے کے لیے نبوت کا دعویدار بن گیا ہے۔ نبی کو پہچاننے کے طریقے کیا ہیں۔ ہمیں اس شخص کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ دیکھا جائے تو قریش کے اندر نبی موعود کی بعثت کا معاملہ اہل کتاب کے لیے سوہان روح تھا۔ وہ اپنی کتابوں میں وارد پیشینگوئیوں کی بنا پر جانتے تھے کہ ایک عظیم رسول کی بعثت ہونے والی ہے۔ وہ اس کی ذات سے خدا کی نصرت اور دوسری اقوام پر غلبہ کی توقعات وابستہ کیے

ہوئے تھے۔ انہیں یہ امید تھی کہ آخری رسول بنی اسرائیل کے سلسلہ انبیاء ہی کے ایک فرد ہوں گے۔ یہ ان کی موہوم امید تھی کیونکہ انبیائے بنی اسرائیل کی پیشینگوئیوں میں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ نبی موعود بنی اسرائیل سے ہوگا۔

بنی اسماعیل کو یہود ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے تھے اس لیے رسالت کا تاج ان کے سروں پر سجا ہوا انہیں ایک نظر نہیں بھایا۔ دوسری طرف زمینی حقیقت یہ تھی کہ قریش عرب کے سردار تھے۔ رسول اللہؐ کی علانیہ مخالفت کرنے کی صورت میں اندیشہ تھا کہ عربوں کی قومی حمیت نہ جاگ اٹھے۔ اس لیے اہل کتاب کی منصوبہ بندی نہایت محتاط نظر آتی ہے۔ مکی دور میں ان کے دو رویے سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ نئی نبوت کے رنگ ڈھنگ دیکھتے رہو اور حالات پر کڑی نظر رکھو۔ جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنا نقصان دہ ہوگا۔ دوسرا یہ کہ قریش کو اکسا کر انہیں اس دعوت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا جائے اور اہل کتاب خود پارٹی بننے سے حتی الامکان گریز کریں۔

قرآن کے وحی ہونے پر اعتراض:

نبی ﷺ جو کچھ پیش کرتے اس کے بارے میں یہ وضاحت فرما دیتے تھے کہ یہ اللہ رب العزت کی طرف سے نازل ہوا ہے اور مجھے اس کی تبلیغ کا حکم ہوا ہے۔ اہل کتاب نے پہلے پہل قریش کو یہ باور کرانا چاہا کہ جو شخص بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر خدا نے کوئی کتاب اتاری ہے وہ بر خود غلط آدمی ہے۔ بھلا خدا کسی شخص پر وحی کے ذریعے کتاب کیوں نازل کرے گا۔ قرآن مجید نے اہل کتاب کی اس شرارت کو بے نقاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَ لَاۤ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ. (الانعام ۶:۹۱)

اور انہوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی جب یہ کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر بھی کوئی چیز نہیں اتاری۔ ان سے پوچھو، وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ روشنی اور لوگوں کے لیے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے، جس کو تم ورق ورق کر کے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو۔ اور تم کو ان باتوں کی تعلیم دی گئی جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا؟ کہہ دو اللہ ہی نے۔ پھر ان کو ان کی کج بحثیوں میں چھوڑ دو، کھیلتے رہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ اتنا لایعنی اعتراض اہل کتاب کو سوجھا کیوں، جبکہ ان کی اپنی شناخت اسی بنیاد پر تھی کہ وہ وحی والہام سے واقفیت رکھنے والے لوگ تھے۔ یقیناً وہ قریش کی سادہ لوحی اور امور وحی سے ان کی عدم واقفیت سے فائدہ

اٹھا رہے تھے۔ اسی لیے جواب یہ دیا گیا کہ آخر موسیٰ علیہ السلام جو کتاب (تورات) لائے تھے اس کا منبع کون سا تھا۔ تورات کے نزول کے وقت اگر انسانوں کو آسمانی رہنمائی اور روشنی کی ضرورت تھی تو کیا اب وہ اس کے ضرورت مند نہیں رہے؟ یا کیا اب اللہ تعالیٰ انسانوں کی رہنمائی کے کام سے دستبردار ہو چکا ہے؟ جب اہل کتاب تورات کی تعلیم کو چھپا چھپا کے رکھیں گے تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو تاریکی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے گا؟ خدا شناسی کے ان مدعیوں نے اللہ رب العزت کو بہت کم پہچانا ہے۔ وہ اس کی صفات سے آگاہ ہیں اور نہ اس کے افضال وعنایات سے۔

اہل کتاب کا القا کردہ اسی طرح کا مضحکہ خیز دوسرا اعتراض یہ تھا کہ وحی آسمانی کی خاص زبان عبرانی ہے۔ تمام صحیفے اسی زبان میں نازل ہوئے جبکہ قرآن عربی میں ہے۔ اگر یہ واقعی آسمانی صحیفہ ہوتا تو اسے عبرانی زبان میں ہونا چاہیے تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ وقت گزرنے کے ساتھ اپنی زبان تو نہیں بدلے گا۔ اس اعتراض کے جواب میں فرمایا:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ. ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ. قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاءٌ. وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى. اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ.

(حم السجدہ ۴۱: ۴۴)

اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی قرآن کی شکل میں اتارتے تو یہ لوگ یہ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیات کی وضاحت کیوں نہیں کی گئی! کلام عجمی اور مخاطب عربی! کہہ دو یہ ان لوگوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے جو اس پر ایمان لائیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لا رہے ہیں تو ان کے کانوں میں بہرا پن ہے اور یہ ان کے اوپر ایک حجاب ہے۔ اب یہ لوگ ایک دور کی جگہ سے پکارے جائیں گے۔

یعنی یہود کے صحیفوں کے مخاطب عبرانی تھے تو صحیفے بھی عبرانی میں نازل ہوئے۔ قرآن کے مخاطب عربی ہیں تو ضروری ہوا کہ آسمانی ہدایت عربی زبان ہی میں نازل ہو ورنہ اس کلام کو سمجھنے والا کوئی نہ ہوتا اور اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا کہ عربی مخاطبوں کے سامنے عجمی کلام پیش کرنے کا کیا تک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل کتاب نے اپنی کتاب ہدایت سے آنکھیں بند رکھ کر ان کو تاریکی ہی کا خوگر بنا لیا ہے۔ اب قرآن مجید کی روشنی مہیا ہوئی ہے تو یہ ان کی نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے اور وہ اس کی تاب نہیں لا رہے ہیں۔ کیا وہ رسول کے پیغام پر کان دھرنے کے بجائے یہ پسند کریں گے کہ قیامت کے روز اللہ کا منادی ان کو پکارے اور ہدایت سے اعراض کے جرم میں ان کو جہنم کی طرف لے جائے۔

اہل کتاب کی معاونت کا الزام:

اہل کتاب کے لیے ایک پریشان کن صورت حال اس وقت پیدا ہوتی جب قرآن انہی کی تاریخ کے حوالے دیتا اور قریش کو ایسی باتوں سے آگاہ کرتا جن کا ذکر ان کے صحیفوں میں تھا۔ اس پر وہ یہ موقف اختیار کرتے کہ محمد ﷺ اس کتاب کو بعض اہل کتاب کی مدد سے مرتب کر رہے ہیں۔ یہ اعتراض بالعموم مبہم ہوتا تا کہ اس کی اصلیت کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ یہ کہا جاتا کہ کچھ لوگ صبح و شام محمدؐ کو لکھ کر دے دیتے ہیں اور وہ اسے لوگوں کو سنا دیتے ہیں۔ اتفاق سے چند لوگ جو نبی ﷺ کے قریب بھی تھے وہ عجمی تھے، لہٰذا انہی کا نام ان کی زبان پر آتا۔ اس پر قرآن نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۔ لِسَانُ الَّذِیْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ ۔ (النحل ۱۶:۱۰۳)

اور ہمیں اچھی طرح علم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو تو ایک انسان سکھاتا ہے۔ اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں عجمی ہے جب کہ یہ فصیح عربی زبان ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ لغو اعتراض کرنے سے پہلے قرآن مجید کے بیان کی سطوت و جلالت اور اس کی زبان کی بے مثال فصاحت ہی پر غور کر لیتے۔ کیا ایک عجمی شخص ایسا کلام مرتب کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ اگر یہ انسانی کلام ہے تو قریش اپنے بے پناہ وسائل کو استعمال کر کے اہل کتاب کی ایک جماعت سے قرآن کی نظیر تیار کرنے کی خدمت کیوں نہیں لے سکتے۔

قرآن کی تالیف میں اہل کتاب کی معاونت کی بات دوسرے پہلو سے بھی بالکل بے حقیقت ہے۔ اگر فی الواقع یہ معاونت ہوتی تو قرآن کا بیان تورات کے مطابق ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقل تیار کرنے میں کوئی دانشمند آدمی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ نقل اصل کے مطابق نہ رہے۔ ورنہ لوگ فوراً انکار کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے تورات کے بیان کی موافقت کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ وہ بیان دیا ہے جو حقیقت پر مبنی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کے بیانات میں مضمون کا فطری ارتقاء نظر آتا ہے جبکہ تورات میں ایسا نہیں۔ بسا اوقات قرآن نے تورات کے بیان کو غلط کہہ کر اس کو درست کر دیا ہے۔ لہٰذا قرآن کا انداز محاکمہ کا ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے

کہ اہل کتاب کی کوئی جماعت پیغمبر ﷺ کی خاطر ایسا کیوں کرتی! بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن کے بیان میں قرآن منفرد ہے۔ آخران کا ذریعہ کون بنا؟

یادرہے کہ اہل کتاب کی معاونت کا یہی گھسا پٹا اعتراض آج کے عقلیت پسند دور میں مستشرقین نے اٹھا رکھا ہے۔ یہ چودہ سو سال پہلے جس طرح مبہم تھا آج کی دقیقہ رس جستجو کے بعد بھی اسی طرح مبہم ہے۔ وسائل تحقیق سے لیس مغربی محققین اس کو مدلل اور حقیقت پسندانہ بنانے پر قادر نہیں ہو سکے۔ گویا اس معاملہ میں ان کا ذہن دور نبوت کے قریش اور اہل کتاب کی ذہنی سطح سے بلند نہ ہو سکا۔ قرآن نے اپنے مخاطبوں کے ذہن سے تو تمام کانٹے نکال دیے تھے اور وہ اس کے بعد اس کتاب کے علمبردار بن کر ابھرے لیکن مستشرقین کو ابھی تک یہ توقع ہے کہ وہ قرآن کو ایک انسانی تصنیف ثابت کر پائیں گے۔ ولیم میور کی بے چارگی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وہ مختلف احتمالات کا تذکرہ ایسے طور پر کرتا ہے کہ تحقیق بھی اس پر سر پیٹ کر رہ گئی ہوگی۔ کہتا ہے:

> مکہ اور مدینہ میں عیسائی روایات ناکافی تھیں جن کی مدد سے محمد ایسی تحریر لا سکتے جو بہت سے مقامات میں بائبل سے مطابقت رکھتی ہو۔ ہوسکتا ہے محمد نے مکہ کے غلاموں سے اہل کتاب کی معلومات سن رکھی ہوں لیکن یہ غلام بالعموم لڑکپن میں اپنے اپنے علاقوں سے لائے گئے تھے، انہیں چند کہانیاں یا بنیادی عقیدے یاد رہ گئے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کسی نے لوقا کی ابتدائی سطور پڑھ رکھی ہوں جن میں یحییٰ کی ولادت کا ذکر ہے۔ اس نے محمد سے اس کا تذکرہ کر دیا ہو۔ ہوسکتا ہے کسی نے اپنی یادداشت سے کچھ بیان کر دیا ہو[1]۔

جہاں تک مکہ میں اہل کتاب کے وجود کا تعلق ہے۔ خاص مکہ میں یہود و نصاریٰ اجنبی نہ تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے عزیز ورقہ بن نوفل انجیل کو اس کی اصل زبان میں لکھتے پڑھتے تھے۔ زید بن عمرو بن طفیل، سلمان فارسی، ابو فکیہہ رومی، ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ پہلے عیسائی تھے۔ نبی ﷺ کے متبنیٰ حضرت زیدؓ بن حارثہ کا تعلق بنو کلب سے تھا جن میں عیسائیت جانی پہچانی تھی۔ جہاں تک یہود کا تعلق ہے ان کے اکابر کے دوستانہ تعلقات قریشی سرداروں کے ساتھ ایک تاریخی حقیقت ہیں۔ یثرب کے بعض بااثر یہودی مکہ میں آباد ہو گئے تھے۔ یہودی سردار کعب بن اشرف کا مکہ میں ہفتوں قیام رہتا۔ قریشی سرداروں کی آمد و رفت مدینہ کے بنو نضیر کے ہاں رہتی۔

نبی ﷺ کے زمانہ میں اہل کتاب حج کی عبادات میں شامل ہوتے رہے ہوں یا ان سے اجتناب کرتے

رہے ہوں، تاریخ سے اس اہم اجتماع میں ان کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔ خود مستشرقین تاریخی حوالوں سے بیان کرتے ہیں کہ ایک زمانہ میں نبی ﷺ نے منیٰ میں نجران کے اسقف اعظم قس بن ساعدہ کی تقریر سنی تھی۔ حج کے اجتماع کی سیاسی، سماجی اور تجارتی اہمیت کے باعث اہل کتاب کے لیے عربوں کے اس اہم قومی مرکز کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔

باقی رہ گیا یہ سوال کہ کیا مکہ یا اس کے گردونواح میں اہل کتاب کی موجودگی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کی مدد سے قرآن تصنیف کیا تو یہ بات کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ مستشرقین اوائل اسلام کے مکہ میں جن اہل کتاب کی موجودگی اب تک ثابت کر پائے ہیں وہ یا تو غلام تھے یا محنت کش۔ ان کی معلومات ایسی نہیں ہو سکتیں جن کی بناء پر اہل کتاب کی معلومات کو محل نظر ٹھہرایا اور معرض بحث میں لایا جا سکتا۔ قرآن مجید نے اہل کتاب کی تاریخ اور ان کے عقائد پر ایسی بھرپور بحث کی ہے جو سنی سنائی معلومات کے بل بوتے پر ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ اس میں اہل کتاب کے غلط تصورات کی تصحیح بھی کی گئی ہے۔

۲۔ کسی بھی مذہب کے لوگ اپنے مذہب کے وفادار ہوتے ہوئے ایک متوازی دین قائم کرنے میں کیسے مد و معاون ہو سکتے تھے؟ وہ اپنے ہی گھر میں نقب کیوں لگاتے؟ ان کی مخالفت تو قرین قیاس ہے لیکن نبی ﷺ کے مشن میں ان کی معاونت بالکل غیر فطری ہے۔ نبی ﷺ کی آواز بعثت کے وقت ایک تنہا آدمی کی آواز تھی۔ اس پر لبیک کہنا اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اہل کتاب ان کی اعانت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تو آخر کس طمع میں؟ ان کا کوئی مفاد اس سے پورا نہیں ہو رہا تھا۔ اہل کتاب کے دونوں گروہوں، یہود اور نصاریٰ، کے ساتھ تو بعد کے ادوار میں بڑی خونریز جنگیں ہوئیں۔ ابتدائی دور میں ان کے افراد اسلام کے معاون کیسے ہو سکتے تھے؟

۳۔ قرآن مجید میں اہل کتاب سے متعلق حصہ بہت زیادہ نہیں۔ فرض کر لیجیے کہ اس حصہ کی تصنیف اہل کتاب کی معاونت سے ممکن ہوئی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ باقی حصہ جو اہل کتاب سے متعلق حصہ سے چھ سات گنا زیادہ ہے کس کی اعانت سے مرتب ہوا؟ گویا قرآن کی تصنیف کا معاملہ پھر بھی حل طلب رہتا ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے یہ دانشور یہ بات تو تسلیم کرتے ہیں کہ بیسیوں مصنف باہم مل کر بھی شیکسپیئر کے ڈراموں کی نظیر پیش نہیں کر سکتے، جو بہر حال ایک انسانی ذہن کی تخلیق ہے۔ اسی طرح یہ تسلیم کرنا بھی ان کے لیے مشکل ہے کہ سائنس دانوں کی ایک بڑی جماعت آئن

سٹائن کی پشت پر رہی ہوگی جس کی مدد سے یہ عظیم سائنس دان اپنا نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) پیش کرنے کے قابل ہوسکا۔ لیکن قرآن مجید کے بارے میں، جس کے کھلے چیلنج کے باوجود اس کی سورتوں جیسی ایک سورہ چودہ صدیوں میں تصنیف نہ ہوسکی، یہ بڑہانک دی جاتی ہے کہ اس کو چند معمولی افراد کی مدد سے محمد ﷺ نے تصنیف کرلیا۔ جبکہ یہ بات بھی طے ہے کہ آنحضرتؐ نے کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا اور آپؐ امی تھے۔

قرآن مجید کا نقطہ نظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی دلیل کے طور پر یہی بات کافی ہے کہ ایک شخص جس نے نہ آسمانی صحیفوں میں سے کوئی صحیفہ پڑھا، نہ وہ لکھنے کے فن سے واقف ہوا، آخر اس کے اوپر سابق صحیفوں کی مانند کلام اور انہی جیسے اعلیٰ مضامین کیسے وارد ہوگئے اور وہ پچھلی امتوں اور رسولوں کے احوال سے کیسے واقف ہو گیا؟ فرمایا:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّا رْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ.

(العنکبوت۲۹:۴۸)

اور تم تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ ایسا ہوتا تو یہ جھٹلانے والے شک کرنے میں حق بجانب ہوتے۔

لہٰذا ہمارے نزدیک مکہ میں اہل کتاب کا موجود ہونا یا نہ ہونا قرآن کی تصنیف کے نقطہ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

قرآن اور قدیم صحف میں فرق کا اعتراض:

اہل کتاب نے جب یہ دیکھا کہ نئی نبوت کا انحصار قرآن مجید پر ہے جو الہامی کلام کے طور پر لوگوں کو سنایا جاتا ہے اور وہ اس سے متاثر ہوجاتے ہیں تو انہوں نے یہ موقف اختیار کرلیا کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سابق کتاب تورات موجود ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی نئی کتاب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ اس کے جواب میں قرآن نے یہود کا وہ رویہ سامنے کردیا جو انہوں نے تورات کے ساتھ ملحوظ رکھا تھا۔ فرمایا:

كَمَا اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ. الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِيْنَ. (الحجر۱۵:۹۰۔۹۱)

اسی طرح ہم نے ان تقسیم کرنے والوں پر بھی اتارا تھا جنھوں نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے۔

اس میں اشارہ ہے یہود کی اس حرکت کی طرف کہ انہوں نے حق کو چھپانے کی غرض سے تورات کے حصے بخرے کر دیے اوران پر خزانے کا سانپ بن کر بیٹھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی ہدایت عام لوگوں کی رسائی میں نہ رہی۔ یہود کے علماء اپنی حسب منشاء اس میں تحریف کرتے اور خلق خدا کو صراط مستقیم سے محروم رکھتے۔ علمائے یہود کی اس حرکت پر اپنے دور نبوت میں سیدنا مسیح علیہ السلام کو یہ کہنا پڑا کہ چراغ اس لیے دیا جاتا ہے کہ اس کو چراغ دان پر رکھا جائے تا کہ اس کی روشنی چاروں طرف پھیلے، نہ اس لیے کہ اس کو پیمانے سے ڈھانپ دیا جائے۔ یہود کی اس حرکت کے باعث تورات کے بعض حصے تلف ہو گئے۔ ایک وقت آیا جب تورات گم ہو گئی اوراس کو یادداشت کی مدد سے دوبارہ مرتب کیا گیا۔ چنانچہ نزول قرآن کے وقت تورات کے نام سے جو کچھ یہود کے پاس تھا وہ متضاد و متناقض روایات کا ایک مجموعہ تھا۔ آج بھی تورات کو پڑھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی راوی اپنے الفاظ میں کتاب کی املا کرا رہا ہے۔ کہیں کہیں بعض اقتباسات ایسے ملتے ہیں جن میں آسمانی کلام کا جمال وجلال نظر آتا ہے۔ تورات کی اس ہیئت کذائی کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے رہنمائی کا کوئی متبادل انتظام نہ کرتا تو اس میں مخلوق خدا کی حق تلفی ہوتی۔

اپنے اس اعتراض کو مدلل کرنے کے لیے یہود یہ کہتے کہ قرآن میں کھانے پینے کے احکام ان احکام سے مختلف ہیں جو تورات میں دیے گئے تھے۔ اسی طرح سبت کا حکم، جو تورات کی شریعت کا ایک اساسی حکم تھا، قرآن میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اگر قرآن ایک الہامی کتاب ہوتا تو اس میں تورات کے احکام سے سرمو انحراف نہ ہوتا۔ بھلا اللہ میاں آئے دن اپنے احکام بدل دیا کرتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ قرآن محض افترا پردازی ہے۔ قرآن مجید نے شریعت کی تبدیلی کے اس اعتراض کی وضاحت یوں کی کہ اللہ تعالیٰ نے نزول شریعت میں ترتیب و تدریج ملحوظ رکھی ہے۔ اس تدریج کا تقاضا ہوا کہ احکام اب کسی خاص قوم کے مزاج کے لحاظ سے نہیں بلکہ عام فطرت انسانی کے لحاظ سے دیے جائیں۔ قرآن میں جو احکام دیے گئے وہ ملت ابراہیم کے مطابق دیے گئے جب کہ یہود کی شریعت میں دخل ان کے قومی مزاج کو بھی تھا۔ یہود نے بہت سے احکام خود اپنے اوپر نافذ کر لیے اور اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر ان کو ان پر باقی رکھا۔ یہود اتنے سرکش تھے کہ ان کی تربیت کے لیے ملت ابراہیم سے ماوراان کے بندھنوں میں اضافہ کرنا پڑا۔ البتہ ان سے وعدہ کیا گیا کہ جب آخری رسول مبعوث ہوں گے تو وہ یہود کی ان بیڑیوں کو کاٹ کر ان کا بوجھ ہلکا کریں گے۔ لہٰذا اس وعدہ کے مطابق اب قرآن میں یہود کی شریعت کے سخت احکام کو ترک کر کے وہ بیڑیاں کاٹی جا رہی ہیں۔

معجزات کا مطالبہ:

وحی والہام اور قرآن مجید کے حوالے سے اعتراضات کے علاوہ اہل کتاب کی جانب سے یہ بھی کہا گیا کہ پیغمبر کی پہچان معجزات سے ہوتی ہے اور انبیائے بنی اسرائیل کی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے بکثرت معجزے دکھائے۔ لہٰذا محمد ﷺ اگر سچے نبی ہیں تو ان سے بھی معجزات ظاہر ہونے چاہئیں۔ اس مطالبہ کا جواب نبی ﷺ کی زبان سے یہ دلوایا گیا کہ اصل چیز پیغمبر کے مخاطبوں کا اپنے ذہنوں کو قبول ہدایت پر آمادہ کرنا اور اپنی نیک فطرت کی آواز سننا ہے۔ اگر لوگ اپنی عقل پر قفل لگائے رکھیں تو معجزات دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ خود بنی اسرائیل کی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دو نہیں، نو عظیم الشان معجزے فرعون کی طلب پر دکھائے تھے لیکن فرعون چونکہ ذہنی طور پر قبول ہدایت پر آمادہ نہ تھا اس لیے اس نے موسیٰ علیہ السلام کو سحر زدہ ہونے کا طعنہ دے دیا:۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْــَٔلْ بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا۔ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۰۱)

اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دیں تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں تو تم کو ایک سحر زدہ آدمی سمجھتا ہوں۔

نبی ﷺ کی زبان سے یہ وضاحت کرائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب عطا فرمائی ہے جو انسان کی فطرت کو اجاگر کرنے والی اور اپنی تعلیم کو مدلل طور پر پیش کرنے والی ہے۔ یہی معجز کتاب میرے دعوائے نبوت پر حجت ہے۔ اگر تم عقل سے کام لو گے اور اپنی فطرت کی صدا سنو گے تو تمہیں میری تعلیم کی حقانیت کا یقین آ جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب اس وضاحت کے باوجود اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہوئے۔ ان کا اصرار یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ پاک اور اچھوتے اوراق لے کر اترے۔ ان اوراق میں نہایت واضح اور قطعی احکام مرقوم ہوں۔ فرشتے کے سوا ان اوراق کو کسی جن و بشر نے ہاتھ نہ لگایا ہو۔ تب ہم مانیں گے کہ آپ خدا کے پیغمبر ہیں۔ اسی کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ۔ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ (البینۃ ۹۸:۱-۳)

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے (قرآن کا) انکار کیا وہ اپنی ہٹ سے باز آنے والے نہیں ہیں،
یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی ہوئی نشانی آ جائے۔ یعنی اللہ کی طرف سے ایک فرستادہ، پاکیزہ اوراق پڑھتا
ہوا، جس میں صاف احکام لکھے ہوئے ہوں۔

خیال ہوتا ہے کہ اس مطالبہ کے پس منظر میں یہ بات رہی ہوگی کہ تورات کے احکام عشرہ کی لکھی ہوئی الواح حضرت موسیٰ براہ راست کوہ طور پر عطا ہوئی تھیں اور بنی اسرائیل کی ایک جماعت اس کی شاہد تھی۔ قرآن مجید نے ایسے مطالبات کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی اور لوگوں کو قرآن کی دعوت کے دلائل وشواہد پر غور کرنے کی راہ اپنانے کی طرف توجہ دلائی۔

امتحان کے لیے سوالات:

قرآن مجید شاہد ہے، اور تاریخی روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں، کہ اہل کتاب، نصاریٰ اور یہود، دونوں نے اپنے زعم میں نبی ﷺ کے دعوائے نبوت کا پول کھولنے کے لیے قریش کو بعض ایسے سوالات القا کیے جو ان کی تاریخ کے کم معروف موضوعات سے متعلق تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ اول تو محمد ﷺ کو ان کے بارے میں کہیں سے معلومات نہیں ملیں گی اور اگر انہوں نے یونہی بات بنانے کی کوشش کی تو ان کو تالی پیٹنے کا موقع مل جائے گا کہ یہ شخص بے پر کی اڑا رہا ہے۔ حقیقت کچھ ہوتی ہے اور اس کو کچھ اور بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ یہ ایک برخود غلط آدمی ہے جسے وحی والہام سے کوئی علاقہ نہیں۔ قرآن مجید نے ایسے سوالات کے نہ صرف جامع وشافی جواب دیے بلکہ اہل کتاب کو لتاڑا کہ انہوں نے نہایت سبق آموز واقعات کو محض قصہ قرار دے رکھا ہے اور ان سے اپنی اصلاح میں کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ قرآن نے اہل کتاب کی تاریخ کے ان واقعات کی توجیہات کو ان کے صحیح تناظر میں پیش کیا۔ اس طرح یہ سوالات، جو اصلاً نبی ﷺ کو زچ کرنے، آپ کی مخالفت کے لیے قریش کی پیٹھ ٹھونکنے اور آنحضرتؐ کے دعوائے نبوت کو جانچنے کے لیے کیے گئے تھے، اہل ایمان کی تربیت اور قریش کے لیے عبرت ناک انجام کی پیش گوئی کا واسطہ بن گئے، اس نوعیت کے تین نمایاں سوالات اصحاب کہف، ذوالقرنین اور بنی اسرائیل کے مصر میں آباد ہونے کے بارے میں تھے۔

اصحاب کہف کا تعلق صحیح عقیدہ رکھنے والے نصاریٰ سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر طویل نیند مسلط کی جو نصاریٰ

کے لیے ایک عجوبہ کی حیثیت رکھتی تھی یا بصورت دیگر بعض نصاریٰ اس کو اپنے اولیائے کرام کی کرامات اور ان کی خاطر قدرت خداوندی کی عظیم شانوں کا ظہور قرار دیتے تھے۔ اہل کتاب کے مطالبہ پر قرآن نے جب ان کا واقعہ سنایا تو اس بات کو نمایاں کیا کہ اصحاب کہف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر مضبوط ایمان رکھنے والے اور اپنی قوم کے شرک سے بیزاری کا اظہار کرنے والے چند نوجوان تھے۔ انہوں نے قوم کے معبودوں کو برملا بے بنیاد قرار دیا تو ان کی قوم ان کی اس جسارت کو برداشت نہ کر سکی۔ اصحاب کہف کو جب اپنی جانوں کا خطرہ محسوس ہوا تو وہ شہر سے نکل کر کسی غار میں جا چھپے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص کی بدولت اپنی خاص شان ظاہر فرمائی اور ان کے وجود کو ان کی قوم کے لیے عظیم الشان نشانی بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ان پر طویل نیند طاری کر دی۔ ان کا کتا غار کے دہانے پر بیٹھا ان کی نگرانی کرتا رہا۔ اس مدت کے دوران شہر میں اصحاب کہف کی دعوت توحید کے ماننے والوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور ایک وقت آیا جب وہاں اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنے والوں کی اکثریت ہوگئی۔ اب اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو نیند سے بیدار کیا اور ان کو اپنی قدرت کا یہ کرشمہ دکھایا کہ وہی قوم جو ان کے خون کی پیاسی تھی اب ان کے لیے عقیدت کے فراواں جذبات رکھتی تھی۔ پہلے وہ شرک کے مظاہر پر جان چھڑکتی تھی لیکن اب اسے اصحاب کہف کی یادگار تعمیر کرنے کا خیال آیا تو اس نے اس کے لیے مسجد کی تعمیر کو ان سے اظہار عقیدت کا موزوں طریقہ خیال کیا۔ اصحاب کہف کی تاریخ کا یہ باب مکہ میں مشرکین قریش کے ہاتھوں آزمائشوں سے دوچار ہونے والے مسلمانوں کے لیے بے حد امید افزا تھا۔ ان پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ان کی مخلصانہ قربانیوں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نصرت کی عظیم شانیں ظاہر ہوں گی۔ البتہ عزیمت کے راستہ سے انہیں لازماً گزرنا ہوگا۔ اس طرح قرآن نے اہل حق کی تاریخ کے ایک گم گشتہ باب کو پھر سے روشن کر دیا تاکہ ان کے قافلہ کے نئے راہ رو اس سے سبق حاصل کر سکیں۔

ذوالقرنین (تورات کے خورس) کی فتوحات سے دلچسپی یہود کو تھی جو ان کو اپنا محسن بادشاہ سمجھتے تھے۔ خورس نے یہود کو بابل کی غلامی سے رہا اور تباہ شدہ بیت المقدس کو از سرنو ان کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ یہود کے سوال کے جواب میں قرآن نے ذوالقرنین کی شخصیت کے جس پہلو کو نمایاں کیا وہ یہ تھا کہ ذوالقرنین معلوم دنیا کے بیشتر حصہ پر ہمہ مقتدر حکمران ہونے کے باوجود کس طرح ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی دولت سے مالا مال تھے۔ تکبر اور ظلم و تعدی سے انہوں نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ وہ رعایا کے ہمدرد و غمگسار تھے۔ وہ ان کی مشکلات دور کرنا اپنا

فرض منصبی سمجھتے۔ اللہ کے بندوں میں وہ حق شناسی کا جوہر تلاش کرتے اوران کوایمان کی راہ اختیار کرنے پر مراعات دیتے۔ ذوالقرنین کے واقعہ میں نہ صرف دنیا پرست یہود کے لیے بلکہ ظالم و جابر متکبرین قریش کے لیے بھی بڑا سبق تھا جس کوقرآن نے اپنے جواب میں واضح کیا۔

مصر میں بنی اسرائیل کے داخلہ کی داستان قرآن نے نہایت دلچسپ انداز میں سنائی لیکن قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی شانوں کونمایاں کیا جواس واقعہ میں ظاہر ہوئیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اوران کی اولاد کا اصل وطن کنعان تھا۔ حضرت یوسفؑ نہایت ہونہار، صالح اور والد کی عزیز ترین اولاد تھے۔ ان کے سوتیلے بھائیوں کو ان سے خاص کد تھی۔ انہوں نے باپ کے اس محبوب بیٹے کو رستے سے ہٹانے کے لیے جنگل میں لے جا کر کسی غیر آباد کنویں میں ڈال دیا۔ وہ اپنے تئیں ان کے وجود سے نجات پا چکے تھے لیکن ہوا یوں کہ بنو اسماعیل کا ایک قافلہ پانی لینے کی غرض سے اس کنویں پر جا پہنچا۔ اس نے یوسف کو کنویں سے نکالا اور اپنے ساتھ مصر لے جا کر ان کوفروخت کر دیا۔ یوسف کا خریدار مصر کے شاہی دربار کا ایک افسر اعلیٰ تھا۔ اس نے یوسف کو بیٹے کی طرح رکھا اور اپنے تمام معاملات کا ذمہ دار بنایا۔ غلامی کے اس زمانہ میں بعض بیگمات نے یوسف کو بغیر کسی جرم کے قید خانہ میں ڈلوا دیا جس سے رہائی بالکل خداساز طریقہ سے ممکن ہوئی۔ یوسفؑ کو شاہ مصر کا قرب حاصل ہو گیا اور اس نے ان کو ملکی وسائل پیداوار کا با اختیار وزیر مقرر کر دیا۔ مصر میں طویل قحط پڑا جس کا مقابلہ کرنے میں یوسف کی عمدہ منصوبہ بندی کام آئی۔ کنعان میں بھی قحط تھا۔ برادران یوسف نے مصر کے حکمرانوں کے حسن انتظام کی شہرت سنی تو وہ بھی غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر پہنچے جہاں انہیں یوسف کے سامنے عرض داشت کے لیے پیش ہونا پڑا۔ یوسف بھائیوں کو پہچان گئے اور ان کو عنایات سے نوازا۔ برادران یوسف پر یہ راز بہت بعد میں کھلا کہ وہ جس شخص کے ممنون ہیں وہ یوسف ہیں۔ انہوں نے یوسف سے معافی مانگی اور تسلیم کیا کہ خطا کار وہی تھے اور اللہ تعالیٰ نے یوسف کو ان کی سلامت روی کا صلہ دیا۔ اس موقع پر یوسف نے تمام اہل خاندان کو کنعان سے بلا کر اپنے پاس مصر میں لا بسایا۔ اس سرگزشت میں اہل مکہ کے کردار اور نبی ﷺ کے ساتھ ان کے طرز عمل کی مماثلت واضح تھی۔ لہٰذا اس واقعہ کے ذریعے آنحضرتؐ کو یہ تعلیم دی گئی کہ ان کا راستہ نہایت کٹھن اور دشوار گزار ضرور ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی عظیم شانیں ظاہر فرمائے گا اوران کے مخالفین کو اسی طرح آپ کے قدموں میں ڈال دے گا جس طرح برادران یوسف اپنے مقتدر بھائی کے قدموں

میں آ گرے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہے۔

تفضیل انبیاء کی بحث:

کسی حریف کو زک پہنچانے اور اس کی حیثیت عرفی کو چیلنج کرنے کا ایک حربہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جس شرف وفضیلت کا دعویدار ہو اس میں اس کو دوسروں سے کم تر ثابت کیا جائے تاکہ عوام پر اس کے دعویٰ کے بارے میں شبہات پیدا ہو جائیں۔ یہود نے یہ حربہ استعمال کیا۔ انہوں نے نبی ﷺ کی تنقیص کی خاطر انبیائے بنی اسرائیل کے فضائل کا چرچا کیا۔ مقصد یہ تھا کہ جہاں اسلام کی طرف میلان رکھنے والوں کو بدکا دیا جائے کہ اس شخص کے اندر تو وہ خصوصیات ہیں ہی نہیں جو حقیقی انبیاء میں ہوتی ہیں، وہیں مسلمانوں کو ایک غیر ضروری بحث ومباحثہ میں گھسیٹ کر ان کو ان کے اصل ہدف سے غافل کر دیا جائے۔ ایسا کرنے سے یہود کو تعصبات ابھارنے میں مدد مل سکتی تھی۔ قرآن مجید نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ یہ تم کو پریشان کرنے اور الجھانے کی ایک شیطانی کاوش ہے۔ اس سے بچ کر رہو اور بحث میں پیغمبروں کے باب میں کوئی ایسی بات نہ کرو جو حق سے ہٹی ہوئی ہو۔ ان کو یہ تلقین بھی فرمائی کہ وہ آنحضرتؐ کی خصوصیات وامتیازات کے پہلوؤں کو ضرور اجاگر کریں لیکن اس بات کو یاد رکھیں کہ سابق انبیاء بھی بعض امتیازات کے حامل تھے، اس لیے ان کا انکار نہ کریں۔ فرمایا:

> وَ رَبُّکَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۵۵)
>
> اور تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

تعلیم کا مذاق:

اہل کتاب نے جہاں قریش کو ایسے اعتراضات سجھائے جن سے وہ پیغمبر ﷺ کو زچ کریں وہیں قرآن مجید کی بعض تعلیمات کو انہوں نے تضحیک کا نشانہ بنایا اور اس میں مشرکین کو بھی شریک کیا۔ ظاہر یہ کیا کہ یہ مضحکہ خیز تعلیمات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری ہوئی نہیں ہو سکتیں، یقیناً یہ نبوت کے اس دعویدار کی طبع زاد باتیں ہیں جن کو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے پیش کر رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے احوال آخرت کے بیان کا مذاق اڑایا گیا۔ مثال کے طور پر جب قرآن نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی نگرانی کے لیے انیس فرشتے بطور داروغہ مقرر کر رکھے ہیں، نیز دوزخ

کی تہہ میں زقوم کا ایک درخت اگے گا جس کا زہریلا اور کڑوا پھل جہنمیوں کو کھلایا جائے گا، تو یہود نے اس تعلیم کا مذاق اڑایا اور مشرکین کے اندر اس کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔ اس کے بعد تحقیر آمیز لہجہ میں یہ کہا کہ ہم نہیں سمجھتے کہ اس طرح کی باتوں سے خدا کی کوئی مصلحت پوری ہوسکتی تھی کہ وہ ایسی تعلیم نازل کرتا، یقیناً یہ محمد (ﷺ) کی اپنی ذہنی افتاد ہے کہ وہ اس طرح کی انہونی باتیں کر رہے ہیں۔ اگر مشرکین اس طرح کی باتیں کرتے تو ان کو کسی قدر معذور قرار دیا جاسکتا تھا کہ وہ آسمانی کتب سے نابلد تھے۔ یہود کا اس طرح کی باتیں کرنا ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ یہود آسمانی کلام کے محرم راز ہونے کے باعث قرآن کے بیان کی فوراً تصدیق کر دیتے تو ان کے لیے یہی زیبا تھا لیکن وہ خود بھی فتنہ میں پڑے اور اپنے ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی اس فتنہ میں مبتلا کرنے کا باعث ہوئے۔ قرآن مجید نے جب جہنم کے داروغوں کی تعداد کی خبر دی تو یہود کے ردعمل کا حوالہ دیتے ہوئے اس تعلیم کی حکمت واضح کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ يَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّ لَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا. (المدثر ۷۴:۳۱)

اور ہم نے دوزخ پر نگران تو فرشتوں ہی کو بنایا ہے اور ہم نے ان کی تعداد نہیں بیان کی مگر اس لیے کہ یہ آزمائش بنے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا، تاکہ یقین حاصل کریں وہ جن کو کتاب عطا ہوئی، اہل ایمان اس سے اپنے ایمان کو بڑھائیں اور اہل کتاب اور اہل ایمان شک میں نہ پڑیں۔ اور تاکہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ اور کفر کرنے والے کہیں کہ بھلا اس سے اللہ کی کیا مراد ہے۔

یہ اہل کتاب کی بدقسمتی تھی کہ وہ اس تعلیم سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہے جو ان آیات کے نزول میں پیش نظر تھا۔

حوالہ جات

۱۔ William Muir, The Life of Mahomed, vol II, p.310, Smith Elder & Co. London (1861)

باب 16

اہل کتاب پر تنقید

نضر بن حارث کی تحریک سے یہود مدینہ نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو نقصان پہنچانے کی جو کوششیں کیں ان کا تذکرہ تفصیل سے ہو چکا ہے۔ ان کے القا کیے ہوئے سوالات اور اعتراضات کے جوابات قرآن میں ایسے انداز سے آئے کہ وہ صحیح حقائق کو بھی سامنے لائیں، اہل کتاب کے لیے سبق آموز بھی ہوں اور قریش بھی ان کی مدد سے اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو کر سکیں۔

اس عمل میں یہ بھی ضروری ہو گیا کہ مکی دور ہی میں اہل کتاب کو ایک حد تک دین کی دعوت کے لیے مخاطب بھی کر لیا جائے تاکہ ان کے باصلاحیت لوگ اس کی جانب جھکیں اور ہدایت قبول کریں۔ اہل کتاب میں نصاریٰ اور یہود دونوں شامل تھے، لہٰذا ان دونوں کو اشارات و کنایات میں ضمناً مخاطب کیا گیا۔ اصل خطاب قریش ہی کی طرف رہا کیونکہ اصلاً حضورؐ کی بعثت انہی کی جانب ہوئی تھی۔

اچھے اہل کتاب کا رویہ:

قرآن مجید کے بارے میں تمام اہل کتاب کا رویہ یکساں نہیں تھا۔ اگرچہ مجموعی طور پر مخالفین ہی کی اکثریت تھی لیکن اچھے اہل کتاب کے ہاں انانیت، ضد اور ہٹ دھرمی کا رویہ نہیں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید نے جگہ جگہ ان کے طرز عمل کی تحسین کی اور توجہ دلائی کہ قرآن مجید کی ہر بات ان کو اپنے دل کی بات نظر آتی ہے اور وہ والہانہ انداز میں اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ اس کے اندر وہی خوشبو پاتے ہیں جس کا تجربہ ان کو اپنی کتاب پڑھ کر ہوتا ہے۔ وہ جب قرآن کی آیات کو سنتے ہیں تو ان سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ گریہ مسرت اور گریہ خشوع کی دوہری کیفیت ان پر طاری ہو جاتی ہے۔ چونکہ ان کے صحیفوں میں ایک عظیم رسول کی آمد اور اس کے واسطہ سے کامل آسمانی کتاب کے نزول کی خبر موجود ہے، لہٰذا وہ منتظر و مشتاق رہے ہیں کہ کب وہ عظیم رسول مبعوث ہوتا ہے۔ اب وہ اس رسول اور اس کی لائی ہوئی کتاب میں ان پیشین گوئیوں کا مصداق پا رہے ہیں، جن پر پہلے سے ان کا ایمان

رہا ہے۔قرآن مجید نے ان اہل کتاب کی بار بار تحسین فرمائی۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔سورہ عنکبوت میں ہے:

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِي صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ. وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ.
(العنکبوت۲۹:۴۹)

بلکہ یہ تو کھلی ہوئی آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا ہے اور ہماری آیات کا بس وہی لوگ انکار کر رہے ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔

سورہ رعد میں ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ.
(الرعد۱۳:۳۶)

اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس چیز پر خوش ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے اور ان جماعتوں میں سے ایسے بھی ہیں جو اس کے بعض حصوں کا انکار کرتے ہیں۔

سورہ انعام میں ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ.
(الانعام۶:۲۰)

جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے۔

یہی مضمون سورہ قصص کی آیات ۵۲ تا ۵۵ میں بھی ہے۔ وہاں ان اہل کتاب کی سلامت روی کا صلہ دوہرے اجر کی صورت میں دینے کا وعدہ فرمایا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے پہلے دین پر بھی استقامت دکھائی اور جب آخری پیغمبر کا ظہور ہوا تو ان کو پہچاننے میں بھی دیر نہیں کی۔

اچھے اہل کتاب کے اس رویہ میں قریش کے لیے ایک سبق پوشیدہ تھا۔ وہ یہ کہ کسی صداقت کو خود اس کی اپنی کسوٹی پر جانچا جاتا ہے۔ لہٰذا اول تو قرآن مجید کی حقانیت کو خود اس کے دلائل پر پرکھا جانا چاہیے تھا۔ بصورت دیگر اگر اس کے حق میں کوئی خارجی شہادت ہی مطلوب تھی تو یہ کافی تھا کہ وحی و الہام کا علم رکھنے والے سنجیدہ اور صاحب کردار اہل کتاب کی اس شہادت کو قبول کیا جاتا جو وہ اپنے عمل سے دے رہے تھے، اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم تھی۔سورہ شعرا میں اسی بات کی طرف قریش کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔فرمایا:

وَ اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ. اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ. (الشعرآء۲۶:۱۹۶۔۱۹۷)

اور اس (قرآن) کا ذکر اگلوں کے صحیفوں میں ہے۔کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو

علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں۔

سورہ بنی اسرائیل میں ہے:

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا وَّ يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا وَ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَ يَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا

(بنی اسرائیل ۱۷: ۱۰۷۔۱۰۹)

ان سے کہہ دو کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، وہ لوگ جن کو اس کے پہلے سے علم ملا ہوا ہے جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ شدنی تھا اور وہ ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے گرتے ہیں اور یہ ان کے خشوع میں اضافہ کرتا ہے۔

رہ گیا یہ سوال کہ یہ اچھے اہل کتاب کون لوگ تھے تو اس بارے میں تعین کے ساتھ صرف حبشہ کا اور مکہ میں مقیم تھوڑے سے نصاریٰ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید نے نصاریٰ کی جگہ جگہ تعریف کی ہے اور اس کثرت سے کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہی وہ گروہ ہے جو اسلام کی تعلیم سے جلد متاثر ہوا۔ چنانچہ مکہ میں رہنے والے نصاریٰ، جن کا تعلق دوسرے علاقوں سے تھا، ابتداء ہی میں مسلمان ہو گئے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ یہود مکی دور میں آنحضرتؐ کی دعوت سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔ جس قدر بحثیں اس دور میں انہوں نے اٹھائیں اور قرآن نے جس اہتمام سے ان کے موقف کو رد کیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہیں ہوگا کہ ان کے انصاف پسند علماء کے ذہن مکی دور میں اسلام کے بارے میں صاف ہوئے ہوں گے اور وقت آنے پر وہ بھی اہل حق کے قافلہ سے آملے ہوں گے، اگرچہ ان کی تعداد بہت کم رہی ہو۔ مکی دور میں وہ اگر نمایاں نہیں ہوئے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہود کے مراکز مکہ سے باہر تھے جبکہ دین اسلام کا مرکز اس وقت مکہ شہر ہی تک محدود تھا۔

اہل کتاب کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ:

آنحضرت ﷺ کی دعوت کے ابتدائی سالوں میں اہل کتاب کے ساتھ بحث و مباحثہ میں الجھنے سے مسلمانوں کو روکا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ گروہ دین و شریعت اور آسمانی صحف کا حامل اور پیغمبروں کی روایات کا امین تھا۔ اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ جلد یا بدیر دعوت کے بارے میں اس کے شبہات رفع ہو جائیں گے اور وہ حق کا علمبردار بن کر آگے بڑھے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی کہ وہ اہل کتاب کے ساتھ بحث میں تلخی پیدا کرنے سے گریز کریں۔ اس کے برعکس ان کو احساس دلائیں کہ ان کے اور اہل کتاب کے درمیان دینی تعلیمات اور اخلاقی

اقدار مشترک ہیں۔ مثلاً مسلمانوں اور اہل کتاب دونوں کا معبود ایک اللہ ہے۔ قرآن اور سابقہ صحیفوں میں توحید کی تعلیم یکساں ہے۔ اہل کتاب جس طرح اپنے صحیفوں پر ایمان رکھتے ہیں مسلمان نہ صرف قرآن پر بلکہ ان کے صحیفوں کی حقانیت پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ تمام کتب سماوی کا منبع و ماخذ ایک ہی ہے۔ پھر اہل کتاب کے صحیفوں کی پیشینگوئیاں قرآن اور پیغمبر ﷺ پر صادق آ رہی ہیں۔ لہٰذا مسلمان اہل کتاب کو بتائیں کہ ان کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ ان مشترک تعلیمات و اقدار کے لوازم کو تسلیم کریں اور اپنی مانی ہوئی باتوں کی اپنے عمل سے تردید نہ کریں۔

سورہ عنکبوت میں فرمایا:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ (العنکبوت۲۹:۴۶)

اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے، بجز ان کے جو ان میں سے ظالم ہیں، اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہم پر نازل ہوئی اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف اتاری گئی، اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔

چونکہ عرب معاشرہ میں اہل کتاب کو خاص احترام حاصل تھا قرآن نے اس کا لحاظ کیا۔ حتیٰ کہ قریش کو دین کی اس دعوت میں جو اشکالات درپیش تھیں ان کے بارے میں انہیں مشورہ دیا کہ اہل کتاب چونکہ دینی امور سے واقفیت رکھتے ہیں، لہٰذا وہ ان اشکالات کے حل کے لیے ان کی طرف رجوع کریں۔ مثلاً سورہ نحل میں ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ. (النحل۱۶:۴۳)

اور ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو دلائل اور کتابوں کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے رہے تو اہل کتاب سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔

یہ ہدایت اس موقع پر دی گئی جب قریش کو اس بات کا یقین نہیں ہوتا تھا کہ ایک بشر بھی خدا کا رسول ہوسکتا ہے۔ اہل کتاب کی تاریخ اس بات کی شاہد تھی کہ منصب رسالت پر ہمیشہ بشر ہی فائز ہوتے رہے۔ یہی مضمون سورہ انبیاء آیت ۷ میں بھی ہے۔ سورہ یونس میں فرمایا:

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ. وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. (یونس۱۰:۹۴-۹۵)

پس اگر تم شک میں ہو اس چیز کے بارے میں جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تو ان لوگوں سے پوچھو جو تم سے پہلے سے کتاب پڑھتے آ رہے ہیں۔ بے شک تم پر تمہارے رب کی طرف سے حق نازل ہوا ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ اور تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جیو جنھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی کہ تم بھی نامرادوں میں سے ہو جاؤ۔

اس آیت میں وحی الٰہی کے بارے میں شکوک وشبہات رفع کرنے کے لیے قریش کو اہل کتاب کی طرف رجوع کا مشورہ دیا ہے۔ اس میں خطاب بظاہر نبی ﷺ سے ہے لیکن عتاب کا رخ حقیقت میں مشرکین کی طرف ہے جن کا اٹھایا ہوا طوفان لوگوں کے دلوں میں قرآن کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔

اہل کتاب کے مخالفانہ رویہ پر گرفت:

بعد میں جب اہل کتاب کا مجموعی رویہ قرآن کی مخالفت کی صورت میں سامنے آیا اور وہ اپنے تئیں حق پر قائم گروہ کی حیثیت سے سامنے لا کر کسی بھی نئی نبوت کو غیر ضروری قرار دینے لگے تو قرآن نے بھی ان کی اصلیت کو کھولنا شروع کر دیا اور واضح کیا کہ یہود ہوں یا نصاریٰ، یہ اس امانت کو ضائع کر چکے جو ان کے حوالہ کی گئی تھی اور جس کے سبب سے ان کی دینی حیثیت تسلیم کی جاتی تھی۔ اس عمل میں، مکی دور کے آخری سالوں میں، قرآن مجید نے ان دونوں گروہوں کے مرغوبات وعقائد پر سخت ضرب لگائی اور ان کی غلطیوں کو بے نقاب کیا۔ برے اہل کتاب کے قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورت حال کے بارے میں مسلمانوں کو بتایا کہ تمام انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو اپنے اپنے زمانے کے شیاطین کے ہاتھوں ایسے حالات سے سابقہ پیش آیا ہے۔ وہ پیغمبروں کے دعوتی منصوبوں کی راہ میں اپنے دجل وفریب سے رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوتا ہے راہ حق کی آزمائش وابتلا کا حصہ ہوتا ہے جس سے گھبرانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ تمام مخالفت آہستہ آہستہ دم توڑ جائے گی۔ اہل ایمان یکسوئی کے ساتھ اپنے کام سے کام رکھیں۔

جوں جوں اہل کتاب کی طرف سے خلاف توقع مخالفت میں اضافہ ہوا تو ضروری ہو گیا کہ ان کی موجودہ دینی حیثیت کو واضح کیا جائے چنانچہ نصاریٰ اور یہود دونوں کے بارے میں نہایت اہم سورتیں مکی دور میں ہی نازل ہو گئیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ مکہ میں یہود ونصاریٰ دونوں کا عمل دخل خاصا بڑھ گیا تھا۔ اور وہ نئی دعوت کے مقابلہ میں خاصا موثر کردار ادا کر رہے تھے جن کا توڑ کرنا اسی دور میں ضروری ہو گیا۔

نبی ﷺ کی دعوت کے ابتدائی سالوں میں تو اس بات کی گنجائش موجود تھی کہ بعض اہل کتاب آنحضرتؐ

کے پیغام کو ٹھیک طور پر سمجھ نہ پائے ہوں یا آپ کی نبوت و رسالت کے دلائل ان پر پوری طرح واضح نہ ہو سکے ہوں یا ان کے ذہنوں میں واقعی شکوک و شبہات پائے جاتے ہوں جن کے ازالہ کے بغیر وہ اس دعوت کو قبول نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ بات واضح تر ہوتی گئی کہ اہل کتاب اچھی طرح یہ جان چکے ہیں کہ محمد ﷺ کی نبوت حقیقی نبوت ہے اور یہ وہی نبوت ہے جس کی بشارت انبیائے بنی اسرائیل دیتے رہے اور اپنی قوموں کو اس پر ایمان لانے اور اس کی نصرت کرنے کی تلقین کرتے رہے، جس کی نوید مسیح علیہ السلام نے سنائی اور جس کے انتظار میں اہل کتاب کی آنکھیں تھکتی رہیں۔ اس کے باوجود وقت گزرنے کے ساتھ انہوں نے ایسا رویہ اختیار کر لیا جو مکروفریب، سازش اور دین کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے سے عبارت تھا۔ لہٰذا مکی دور کے اواخر میں اہل کتاب کی ناسپاسی، منصب امامت کی ذمہ داریوں سے پہلوتہی، عہد خداوندی کی خلاف ورزی، اللہ کے دین کے خلاف مکروفریب، غرض ہر چیز کو نمایاں کیا گیا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی دعوت کے معاملہ میں یہود اور نصاریٰ غیر جانبدار نہیں رہ گئے تھے اور نہ ان کا معاملہ اجنبیوں کا معاملہ تھا۔ وہ مخالفت بھی بھرپور انداز میں کر رہے تھے اور قرآن نے بھی ان کا جواب اسی انداز میں دیا۔

یہود پر تنقید:

سورہ اعراف کی آیات ۱۰۳ تا ۱۷۱ میں یہود پر اللہ تعالیٰ کے انعام و احسان کی تاریخ خاصی تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے فرعون کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھائے۔ فرعون حضرت موسیٰ کی دعوت سے سیخ پا ہو گیا جس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل کو طویل ابتلا سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سرکشی اور زیادتیوں کی سزا اس طرح دی کہ بنی اسرائیل کو تو سرزمین مصر سے بحفاظت نکال لیا اور فرعون کو دریا میں غرق کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ عظیم شان دیکھنے کے بعد بنی اسرائیل پر واجب تھا کہ وہ اپنے رب کے شکرگزار رہتے لیکن انہوں نے فرعون کی غلامی سے آزادی پاتے ہی شرک اور بت پرستی کی طرف میلان ظاہر کیا اور خود موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے لیے ایک محسوس معبود مقرر کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے اس مطالبہ پر جھڑکا تو انہوں نے ان کی عدم موجودگی میں، جب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر تورات کے احکام لینے کوہ طور پر گئے ہوئے تھے، زیورات کو پگھلا کر بچھڑے کا مجسمہ تیار کیا اور اس کی پوجا میں لگ گئے۔ حضرت موسیٰ واپس آئے تو قوم کے ذمہ دار بزرگوں پر خفا ہوئے کہ انہوں نے اس فتنہ کو کیوں پنپنے دیا۔ بعد میں انہوں نے قوم کے ستر چیدہ بزرگوں کو ساتھ لیا اور اجتماعی توبہ کی غرض سے ان کو کوہ طور پر لے گئے۔ اس موقع پر سب نے اللہ کی

طرف رجوع کرتے ہوئے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر واضح کر دیا کہ میری رحمت کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں گے جو میری نافرمانی سے بچتے رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے، میری آیات پر ایمان لائیں گے اور اس نبی امی رسول کی پیروی کریں گے جس کی علامات ان کو بتائی جائیں گی۔ انہیں اس کی عزت کرنی ہوگی، اس کی مدد کرنی ہوگی اور اس روشنی کی پیروی کرنی ہوگی جو میں اس کے ساتھ اتاروں گا۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے کے مستحق ہوں گے۔

یہ مفصل روداد سنانے کا مقصد اہل کتاب، بالخصوص یہود، کو ان کی ذمہ داری یاد دلانا تھا کہ وہ نبی امی رسولؐ پر، جو ابفی الواقع ان میں مبعوث ہو چکے ہیں ایمان لائیں اور ان کی حمایت و نصرت پر کمربستہ ہو کر اپنے آپ کو فلاح کا مستحق بنالیں۔

اسی بیان میں آگے بنی اسرائیل کی بعض نالائقیوں کا ذکر کیا اور بتایا ہے کہ ایسے جرائم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو دنیا میں تتر بتر کر دیا اور وقتاً فوقتاً ان پر سخت گیر لوگ مسلط کیے جو ان کو طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالتے رہے۔ اگر یہ لوگ اپنے ماضی سے سبق سیکھیں تو اب ان کے لیے اصلاحِ احوال کا آخری موقع ہے ورنہ ان کا معاملہ دنیا کی ذلت کے علاوہ آخرت میں تباہی پر منتج ہوگا۔

یہود کو ہمیشہ اس بات پر فخر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ عہد و پیمان کیا۔ حضرت موسیٰؑ احکام کے نزول کے زمانہ میں ہر حکم پر قوم کو اکٹھا کرتے اور حکم سنا کر ان سے عہد لیتے کہ وہ اس پر کاربند رہیں گے اور کسی صورت میں اس سے انحراف نہیں کریں گے۔ بنی اسرائیل جماعت کی حیثیت سے اللہ کو ضامن اور گواہ بنا کر سمع و طاعت کا عہد کرتے۔ مکی دورِ نبوت کے اواخر میں یہود کو توجہ دلائی گئی کہ خداوند سے عہد باندھنے کی ایک طویل تاریخ کے بعد اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اس عہد کو پورا کریں اور مصلحتوں کے تحت اس عہد کے بخیے نہ ادھیڑیں ورنہ ان کی مثال اس بڑھیا کی ہوگی جو مدتوں بڑی محنت سے اپنا سوت نہایت مضبوط کاتے لیکن جب اس کے استعمال کا وقت آئے تو وہ اس کا تار تار ادھیڑ کر رکھ دے۔

یہود اپنے مشوروں کو دلفریب بنا کر قریش کے سامنے پیش کرتے اور ان کا اعتبار قائم رکھنے کے لیے قسمیں کھا کھا کر ان کو یقین دلاتے کہ ان کی رائے محض خیر خواہی کے جذبہ پر مبنی ہے۔ اصل میں یہ مکر و فریب کی ایک اسکیم ہوتی جس کا مقصد قریش کو اپنے موقف پر قائم رکھنا، آنحضرتؐ کی مخالفت پر مضبوط رکھنا، مسلمانوں کے حوصلے پست کرنا اور اللہ کے دین کی طرف بڑھنے والے قدموں کو روکنا ہوتا۔ قرآن مجید نے یہود کی اس سازش کا پردہ چاک

کیا اور ان کی تگ و دو کے مضمرات آشکارا کر دیے۔ اس نے بتایا کہ یہود کی تمام سرگرمی اس حاسدانہ اندیشہ کی بنا پر ہے کہ نئی قائم ہونے والی امت کہیں یہود سے تعداد اور قوت میں بڑھ نہ جائے۔ لہٰذا یہ مسلمانوں کے قدموں کو ڈگمگانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے اور نئی دعوت پر کان دھرنے والوں کے اندر وسوسے ڈالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

یہود کا طرز عمل کسی طرح اخلاص پر مبنی نہ تھا۔ وہ اپنے دنیاوی مفادات کے تحفظ کے لیے نبی ﷺ کے لیے مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ قرآن نے ان کے اس کردار کو کتوں کی حرص و دناءت سے تشبیہ دی۔ کتا اپنی مرغوبات کی بو سونگھتا ہوا چلتا اور جس طرف سے اپنی پسند کی بو پاتا ہے اسی طرف مڑ جاتا ہے۔ اسی طرح یہود نے بھی ہدایت کے معاملہ میں اپنی خواہشات نفس اور مفادات دنیا کو رہنما بنا لیا اور اس حرکت میں وہ اپنے عہد و میثاق اور منصبی ذمہ داریوں ہر چیز کو بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر انعامات بھی کیے اور تنبیہات بھی اتاریں لیکن یہ چیزیں ان کے لیے مفید ثابت نہ ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو زمین و آسمان کی سرفرازی سے نوازنا چاہا لیکن دنیا کی حرص اس میں رکاوٹ بن گئی اور یہ قوم اپنے آپ کو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے کام کرنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ یہود کی اس خصلت کا ہر ہر پہلو مکی دور ہی میں قرآن نے بے نقاب کر دیا۔ اس کی بے رحم تنقید اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ یہود کا کردار اس دور میں معمولی نہیں رہ گیا تھا اور وہ آنحضرتؐ کی جدوجہد میں مسلسل روڑے اٹکا رہے تھے جس کا تدارک ضروری ہو گیا تھا۔

نصاریٰ پر تنقید:

یہود کی طرح نصاریٰ کے معتقدات بھی مکی دور ہی میں زیر بحث آ گئے البتہ ان کے تذکرہ میں اس طرح کی تلخی نہیں معلوم ہوتی جو یہود کے لیے پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہود مکر و فریب اور سازش سے کام لیتے جب کہ نصاریٰ گمراہی اور غلط فہمی کا شکار تھے۔ نصاریٰ کے غلط معتقدات میں اس زمانہ میں بھی الوہیت مسیح یا مسیحؑ کے مجسم خدا ہونے کا عقیدہ، ان کے خدا کا بیٹا ہونے کا تصور اور آخرت میں نجات دہندہ ہونے کا عقیدہ شامل تھے۔ ان کے ابطال کے لیے ایک کامل سورہ مریم نازل ہوئی۔ اس سورہ کا آغاز حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں خارق عادت طور پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے تذکرہ سے ہوا ہے۔ وہ خود بڑے بوڑھے اور ان کی بیوی بانجھ تھیں۔ ان کی عاجزانہ دعا کی قبولیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹے سے نوازا۔ اسی بیت المقدس میں، جہاں حضرت زکریاؑ متولی و سربراہ کار تھے، حضرت مریم علیہا السلام ایک عابدہ و زاہدہ خدمت گار خاتون تھیں۔ اس پرہیزگار عفیفہ خاتون کے ہاں

بھی خارق عادت طریقہ سے اللہ تعالیٰ کے اپنے حکم خاص سے ایک بیٹے کی ولادت ہوئی جو بن باپ پیدا ہوا اور ماں کی گود ہی میں اپنے متعلق گواہی دی کہ وہ اللہ کا بندہ اور بنی اسرائیل کی طرف اس کا رسول ہے۔ یہ بچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے جن کو عیسائیوں نے ابن اللہ کا درجہ دے دیا اور ان کی الوہیت کے قائل ہو گئے۔ مذکورہ دونوں ولادتوں کو پہلو بہ پہلو لا کر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اگر خارق عادت ولادت کسی کے الٰہ ہونے کی دلیل ہوسکتی ہے تو یہ شرف حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بھی حاصل تھا لیکن اس بنا پر نہ انہوں نے اپنی الوہیت کا دعویٰ کیا نہ کسی دوسرے نے ان کو الٰہ مانا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے پیروکار عقل کا دامن کیوں چھوڑ دیتے ہیں۔

حضرت مریم ہیکل کی خدمت پر مامور خدا کی بندی تھیں۔ ان کے ہاں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی تو مسیح علیہ السلام کا بشر ہونا از خود ثابت ہو گیا۔ اس کے باوجود سیدنا مسیحؑ نے گہوارے سے لے کر اپنی دعوت کے آخری مراحل تک اس حقیقت کا برملا اعلان کیا کہ وہ اللہ کے بندے ہیں، اسی نے ان کو کتاب و نبوت سے سرفراز فرمایا اور دین و شریعت کی اساسات، نماز اور زکوٰۃ، پر قائم رہنے کا حکم دیا۔ وہ اپنے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ انہیں بھی دوسرے انسانوں کی طرح ولادت، موت اور دوبارہ جی اٹھنے کے مراحل سے گزرنا ہے لہٰذا ان کی حیثیت کسی طرح دوسرے انسانوں سے مختلف نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ وہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ گویا جو نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی اپنی تھی وہی نسبت انہوں نے اپنے مخاطبوں کے لیے بھی بیان کی۔ اگر اس نسبت کا مفہوم ابن اللہ ہونا ہے تو پھر تمام لوگ ابن اللہ ٹھہرے اور مسیح علیہ السلام کی یہ الگ خصوصیت نہ رہی۔

سورہ مریم میں انبیاء علیہم السلام کی روایت پر بھی روشنی ڈالی اور بتایا گیا ہے کہ صالحین واخیار کا یہ گروہ ہر دور میں شرک سے بیزار، اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنے والا اور اس کے لیے عبودیت کا اظہار کرنے والا رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی روایت کے امین تھے اور یہی روایت ان کے پیروکاروں کو عزیز ہونی چاہیے۔ ان انبیائے کرام کی ایک بڑی صفت وحی الٰہی کے لیے ان کی رغبت تھی۔ وہ اس کی ایک ایک آیت سے متاثر ہوتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ ان کے حقیقی متبعین اہل کتاب کو انہی کی طرح اس وحی کی طرف صدق دل سے راغب ہونا چاہیے جو اب نازل ہو رہی ہے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ شیاطین کے پیچھے لگ کر اس سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔

سورہ مریم کا ایک اہم مضمون یہ ہے کہ مرنے کے بعد تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔ ان کے لیے کوئی دوسری منزل نہیں ہے۔ ہر شخص فرداً فرداً محاسبہ کے لیے پیش ہوگا۔ نہ اس کے اعوان و انصار ساتھ ہوں گے

اور نہ کوئی حمایتی اور مددگار۔ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت بروئے کار آئے گی جس کا تقاضا اس دن یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان انصاف کرے، حق پرستوں کی دادرسی کرے، اور ظالموں کو جہنم رسید کرے۔ اس دن جنت میں داخلہ کے مستحق وہ لوگ قرار پائیں گے جو متقی ہوں گے اور ان کا عمل ان کی پرہیزگاری کی شہادت دیتا ہوگا۔ اس دن پذیرائی متقین کی ہوگی اور وہ خدائے رحمان کے حضور عزت واکرام کے ساتھ پیش ہوں گے جب کہ مجرم پیاسے اونٹوں کی طرح جہنم کے گھاٹ کی طرف ہانکے جائیں گے۔ ان کے مزعومہ شفعاء کو شفاعت کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ اس بیان میں عیسائیوں کے اس عقیدہ کی بھرپور تردید ہے کہ آخرت میں مسیح علیہ السلام نجات دہندہ ہوں گے اور ان پر ایمان کو اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام گناہوں کا کفارہ قرار دے گا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن نے قریش کی روش پر تبصرہ کر کے نہ صرف ان کو نیک و بد سمجھا دیا بلکہ ان کی حمایت میں بولنے والے اہل کتاب کی اپنی نالائقیوں سے بھی پردہ اٹھا دیا تاکہ قریش پر واضح ہو جائے کہ جن پر وہ تکیہ کیے ہوئے ہیں خود وہ خدا کی میزان میں کیا وزن رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ اہل کتاب ان کو کوئی مشورہ دیں گے تو اس کی کیا وقعت ہوگی۔

باب 17

بنو ہاشم کا مقاطعہ اور دعوت مصالحت

جوں جوں قریش کو احساس ہوتا کہ نئے دین سے متعلق معاملات ان کی گرفت میں نہیں آ رہے ہیں تو وہ اہل ایمان اور ان کے معاونین کے خلاف ایک کے بعد دوسرا سخت اقدام تجویز کرتے تا کہ ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکیں اور نئے دین کی دعوت کامیاب نہ ہونے پائے۔ بنو ہاشم نے چونکہ آنحضرتؐ کو تحفظ فراہم کر رکھا تھا اور قریش متعدد کوششیں کرنے کے باوجود ابو طالب کو حضورؐ کی حمایت سے دستبردار کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر بعض جذباتی لوگوں نے خود بنی ہاشم ہی کو اس حمایت کی سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کی شکل ان کو معاشرتی مقاطعہ کی سوجھی۔

مقاطعہ کی معروف روایت:

عام طور پر سیرت نگاروں نے مقاطعہ کے بارے میں جس روایت پر انحصار کیا ہے وہ یوں ہے کہ جب قریش کو رسول اللہؐ کے لیے نجاشی کے اظہار عقیدت اور مسلمانوں کے لیے خیر سگالی کے جذبات گراں گزرے تو انہوں نے رسول اللہؐ کو، معاذ اللہ، قتل کرنے پر اتفاق کر لیا۔ انہوں نے بنو ہاشم کے خلاف ایک معاہدہ تحریر کیا کہ جب تک یہ خانوادہ محمد (ﷺ) کو ان کے حوالہ نہیں کر دیتا، قریش کا کوئی خاندان بنو ہاشم سے نہ تو شادی اور نکاح کا تعلق جوڑے گا، نہ ان سے تجارت کرے گا، اور نہ ان سے میل جول رکھے گا۔ یہ معاہدہ تحریر کر کے خانہ کعبہ کے اندر لٹکا دیا گیا۔ روایت کے مطابق اس معاہدہ کے تحت کارروائی کرتے ہوئے محرم ۷ نبوی میں بنو ہاشم اور ان کے حمایتی بنو مطلب کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا۔ نہ ان کے پاس کھانے کی کوئی چیز جانے دی جاتی اور نہ بیرونی تاجروں سے ان کو کچھ خریدنے دیا جاتا۔ وہ بیریوں کے پتے کھا کھا کر گزارا کرتے۔ سعد بن ابی وقاصؓ کی بھوک کے مارے یہ حالت ہو گئی کہ ان کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ لگا تو اسی کو آگ پر بھون کر انہوں نے چبا لیا اور پانی سے نگل لیا۔ بعض اچھے لوگ کسی جانور پر غلہ لاد کر شعب ابی طالب کی طرف ہانک دیتے۔ بنو ہاشم کے بچے بھوک سے بلکتے تو قریش ان کی آوازیں سن سن کر خوش ہوتے۔ بنو ہاشم نے یہ مصیبتیں تین سال تک جھیلیں۔ بالآخر نبی ﷺ نے

ابو طالب کو بتایا کہ معاہدہ کی دستاویز کو دیمک نے چاٹ لیا ہے۔ ابو طالب کفار کے پاس گئے اور کہا کہ معاہدہ پیش کرو۔ میرے بھتیجے کے کہنے کے مطابق اس میں کوئی تحریر نہیں۔ اگر اس کی بات غلط ثابت ہوئی تو میں اس کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ جب معاہدہ لایا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی تحریر دیمک کے ہاتھوں محو ہو چکی ہے۔ اس موقع پر قریش کے بعض وسیع الظرف سرداروں مثلاً مطعم بن عدی، ابوالبختری بن ہاشم، زمعہ بن الاسود، عدی بن قیس اور زہیر بن ابی امیہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہم یہ ظلم مزید نہیں ہونے دیں گے اور وہ محصورین کو گھاٹی سے نکال لائے۔ وہ اس سے قبل بھی اس ظالمانہ معاہدہ کے خلاف آواز بلند کرتے رہے تھے۔

اس روایت کی رو سے قریش کا ہر خانوادہ اس بات کا پابند تھا کہ وہ:

(ا) بنو ہاشم سے شادی بیاہ کا تعلق قائم نہیں کرے گا۔

(ب) ان سے تجارت نہیں کرے گا۔ اور

(ج) ان سے میل جول نہیں رکھے گا۔

جب تک کہ وہ محمد ﷺ کو ان کے حوالے نہیں کر دیتے کہ قریش ان سے نجات حاصل کر سکیں۔

اس مضمون کی دوسری روایات تفصیلات میں باہم مختلف ہیں۔ بعض روایات کی رو سے قریش نے بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا لیکن بعض کے نزدیک بنو ہاشم اپنی مصلحت کے تحت یکجا ہو گئے۔ مختلف روایات محصوری کی مدت ۲ سال، ۳ سال یا اس سے کم یا زیادہ بتاتی ہیں۔ دیمک نے معاہدہ کے جس حصہ کو چاٹ لیا تھا اس میں بھی اختلاف ہے کہ وہ ابتدائی الفاظ باسمک اللھم تھے یا یہ الفاظ تو باقی رہ گئے، اصل معاہدہ تلف ہو گیا۔

ہمارے نزدیک ان روایات کے مضمون پر کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ مثلاً:

(ا) معاہدہ کی شقوں میں بنو ہاشم کے ساتھ شادی بیاہ اور تجارتی لین دین کی ممانعت تو ہے لیکن ان کا محاصرہ کرنے کی کوئی شق کسی روایت میں موجود نہیں۔ لہٰذا اس معاہدہ کے تحت ان کا محاصرہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور کوئی قرشی خانوادہ ایسا کرنے کا پابند نہیں تھا۔ جو چیز معاہدہ میں تھی ہی نہیں تو اس پر قریش نے بالاتفاق عمل کیسے کر لیا!

(ب) یہ معاہدہ بنو ہاشم اور ان کے حمایتی بنو مطلب کے خلاف تھا۔ دوسرے خانوادے اس سے متاثر نہیں ہوتے تھے لیکن روایت کی رو سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو چمڑے کا ٹکڑا کھاتے ہوئے بتایا گیا ہے جبکہ وہ بنو زہرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ محصورین میں کیسے شامل ہو گئے؟ اگر ان کو زبردستی وہاں

گھسیٹ لیا گیا تھا تو بنوزہرہ ان کی مدد کو کیوں نہ آئے؟

(ج) معاہدہ کی رو سے صرف قریش پر بنو ہاشم سے تجارت پر پابندی عائد کی گئی۔ غیر قرشیوں یا بیرونی تاجروں پر یہ معاہدہ لاگو نہیں ہوتا تھا۔ اس صورت میں بنو ہاشم کے لیے کوئی رکاوٹ نہ تھی کہ وہ ضرورت کی اشیا دوسرے تاجروں سے حاصل کریں اور اپنے بچوں کو بھوک سے ہلکان نہ کریں۔ لیکن روایت کے مطابق تین سال تک بنی ہاشم بھوکے محصور رہے۔

(د) عرب معاشرہ میں کسی بھی شخص کو قتل کرنا آسان کام نہ تھا۔ قریش کو اگر رسول اللہؐ کا قتل مطلوب تھا تو اس کے لیے فیصلہ کرنے کی بہترین جگہ دارالندوہ تھی جہاں قریش اہم فیصلے پورے سوچ بچار کے بعد اجتماعی طور پر کیا کرتے تھے لیکن اس موقع پر دارالندوہ میں کوئی مجلس منعقد نہیں ہوئی۔ اس سے باہر کیا گیا کوئی بھی اہم فیصلہ قریش کا اجتماعی فیصلہ نہیں کہلاتا تھا، لہٰذا وہ قابل عمل نہیں ہوتا تھا۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد وہ وقت آیا جب قریش کے تمام خانوادوں نے دارالندوہ میں جمع ہو کر بڑی بحث و تمحیص کے بعد حضورؐ کے قتل کی تدابیر پر اتفاق کیا۔ چونکہ بعد کا یہ فیصلہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ کیا گیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کو ان کے دشمنوں سے نجات دی اور آپ کو ہجرت کر جانے کا حکم ہوا۔

(ھ) بنو ہاشم کے محاصرہ کا واقعہ، اور وہ بھی تین سال کے لیے، اگر پیش آیا ہوتا تو یہ اتنا غیر معمولی تھا کہ اس کی صدائے بازگشت پورے عرب میں سنائی دیتی کیونکہ بنو ہاشم حاجیوں کی مہمانداری، ان کو پانی پلانے، بیت اللہ کی دیکھ بھال اور مسافروں کی خدمت پر مامور تھے۔ ان کا اپنی ذمہ داریوں سے غائب ہونا پورے ملک میں ہلچل پیدا کر دیتا۔ تاریخ میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ بنو ہاشم کو منظر سے ہٹا کر ان کی حج و عمرہ کی منصبی خدمات کے لیے کون سا متبادل نظام وضع کیا گیا تھا۔

ان حقائق کی روشنی میں اس طرح کی مضطرب روایات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ معاملہ کی شکل وہ نہیں رہی جو ان روایات کی روشنی میں دکھائی دیتی ہے۔

واقعہ کی ممکن شکل:

حضرت ابو ہریرہؓ حجۃ الوداع کے ضمن میں بیان کرتے ہیں کہ جب ہم منیٰ میں مقیم تھے تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ کل ہم بنو کنانہ کی گھاٹی میں اتریں گے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں لوگوں نے کفر کی حمایت میں باہم قسمیں کھائی تھیں۔ قریش اور بنو کنانہ نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خلاف حلف اٹھایا کہ وہ ان سے نکاح کا رشتہ جوڑیں گے اور

نہ تجارت کا معاملہ کریں گے جب تک کہ وہ رسول اللہ کو ان کے حوالہ نہیں کر دیتے[1]۔

یہ روایت اصل حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔ اس کی رو سے واقعہ کی جو شکل سامنے آتی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ کفار قریش کے ایک طبقہ نے بنو ہاشم اور بنو مطلب (جو بنو ہاشم کا ساتھ دینے میں ثابت قدم رہے تھے) کے معاشرتی مقاطعہ پر باہم حلف اٹھایا جس کے تحت ان کے ساتھ رشتہ نکاح قائم کرنا اور تجارت میں اشتراک یا لین دین ختم کر دیا گیا۔ اس میں کوئی ایسی شق نہ تھی جس کے تحت بنو ہاشم کو خوراک پہنچانا منع کیا گیا ہو یا ان کی نظر بندی مقصود ہو۔ یہ حلف مکہ میں نہیں بلکہ منیٰ کی ایک گھاٹی میں اٹھایا گیا اور اس کی حیثیت حلف اٹھانے والوں کی نظروں میں جو بھی رہی ہو، یہ قریش کا معاہدہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس کے لکھنے لکھانے کی نوبت نہیں آ سکتی تھی۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو حسب ذیل نتائج بہ آسانی نکالے جا سکتے ہیں۔

۱۔ یہ قریش کا کوئی ایسا اجتماعی معاہدہ نہیں تھا جو سوچ بچار کے بعد طے پایا ہو یا جسے تحریر کیا گیا ہو اور اس کی کوئی مدت مقرر ہو۔ قریش اور بنو کنانہ کے کچھ لوگوں نے بنی ہاشم کو زچ کرنے کے لیے بنو کنانہ کی گھاٹی میں اکٹھے ہو کر قسمیں کھائیں اور ان کے معاشرتی مقاطعہ کا فیصلہ کیا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ کچھ جذباتی لوگوں نے باہم یہ حلف اٹھایا ہو اور خاندانوں کے بڑے اس میں شامل نہ رہے ہوں۔ اس حلف میں بھی بنو ہاشم کی محصوری کی کوئی بات نہ تھی۔

۲۔ اس فیصلہ کو بعض اہم قرشی سرداروں، جن کے نام اوپر بیان ہو چکے ہیں، کی اشیرباد حاصل نہ تھی۔ وہ برابر اس کو ظلم و زیادتی قرار دے کر حلف اٹھانے والوں سے جھگڑتے رہے۔ بالآخر انہی کی کوششوں سے یہ محاذ آرائی ختم ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ قریش کا متفقہ فیصلہ نہ تھا اسی لیے اس کی خلاف ورزی کے واقعات بھی روایتوں میں ملتے ہیں۔

۳۔ چونکہ محاصرہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی اس لیے بنو ہاشم کے رشتہ دار ضرورت کی اشیا اپنے عزیزوں کو پہنچا سکتے تھے۔ چنانچہ حکیم بن حزام کے غلہ پہنچانے کا ذکر روایات میں ہوا ہے۔

۴۔ ابو ہریرہؓ کی روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بنو ہاشم کتنا عرصہ اس حلف کے باعث پریشان رہے۔ لیکن یہ پریشانی یقیناً محصوری یا خوراک نہ ملنے کی نہیں تھی بلکہ وہ پریشانی تھی جو بعض ایسے لوگوں کی طرف سے معاشرتی مقاطعہ کے سبب سے ہوتی ہے جن کے ساتھ پہلے تعلقات درست رہے ہوں۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے قریش اور بنو کنانہ کے بطون میں لوگ ایمان لا چکے تھے۔ چونکہ یہ حلف صرف بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خلاف تھا لہٰذا باقی بطون کے مسلمان مثلاً ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور وہ تمام لوگ جن کے نام

ان کے خانوادوں کے حوالہ سے اوپر بیان ہو چکے ہیں اس سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے۔ لہٰذا اس مقاطعہ نے دعوت دین کے معاملہ میں مسلمانوں کے لیے کوئی رخنہ نہیں ڈالا۔

علیٰ ہذا القیاس نبی ﷺ یا دوسرے لوگوں کے مسجد حرام میں آنے جانے یا شہر میں گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ چنانچہ آنحضرت کا دعوت و تبلیغ کا کام حسب سابق جاری رہا۔ اسی طرح حج و عمرہ کے حوالہ سے بنو ہاشم اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکتے تھے۔

۵۔ حلف میں شامل لوگوں کے سوا بنو ہاشم باقی لوگوں اور اہل مکہ سے مال لے سکتے تھے اور تجارتی لین دین کر سکتے تھے۔ ان پر اس حلف کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

۶۔ روایتوں میں محصوری کا مقام شعب ابی طالب بتایا جاتا ہے جبکہ اس نام کی کوئی جگہ مکہ کے آس پاس ثابت نہیں ہے۔ اگر ہوسکتا ہے تو شعب بنی ہاشم مراد ہوسکتا ہے۔ یہ مکہ کا وہ محلّہ ہے جس میں بنو ہاشم کی بڑی تعداد مقیم تھی اور جو ماضی قریب تک نبی ﷺ کی جائے ولادت کے جنوب مغرب میں موجود رہا ہے۔ حرم شریف کی توسیع کے پروگرام میں اس محلّہ اور اس پہاڑی کا، جس پر یہ آباد تھا، نام و نشان مٹ گیا ہے۔ اس شعب کے بارے میں یہ تصور بالکل غلط ہے کہ یہ مکہ سے دور کوئی گھاٹی تھی جس میں بنو ہاشم قید ہو گئے تھے جبکہ خود روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تو کفار ان کی آوازیں سن کر ہنستے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب گھاٹی مکہ کے دوسرے محلوں کے قریب ہی واقع ہو۔ اسی طرح یہ محلّہ بھی مکہ کے دوسرے علاقوں کی طرح بنجر تھا، اس میں بیریوں کے باغ نہیں تھے جن کے پتوں پر بنو ہاشم اتنا عرصہ گزر اوقات کرتے رہے ہوں۔

اگر بنو ہاشم اپنے اس محلّہ میں اکٹھے ہوئے ہوں تو اس کی یہ شکل ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے اس جذباتی حلف کے پیش نظر ابوطالب نے محلّہ سے باہر آباد بنو ہاشم کو یکجا ہو جانے کی ہدایت کی ہو تا کہ وہ لوگ کفار کی کسی زیادتی کا نشانہ نہ بننے پائیں۔ پھر جب قریش کے اچھے لوگوں نے شرارتی لوگوں کو لگام ڈال لی ہو تو بنو ہاشم دوبارہ اپنے مکانات میں منتقل ہو گئے ہوں۔ یہ بات ایک روایت میں بیان بھی ہوئی ہے[۲]۔

دعوت مصالحت:

قریش نے جب دیکھا کہ ان کی سخت گیری سے معاملہ بگڑ رہا ہے اور نیا دین معاشرہ میں جڑ پکڑ رہا ہے تو انہوں نے ایک سیاسی چال چلی۔ انہوں نے رسول اللہؐ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ لوگ ہمارے بھائی بند ہیں۔ ہمیں آپ

کی مخالفت سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ آپ کے ساتھ ہماری بڑی توقعات وابستہ تھیں کہ بنی ہاشم کی آپ قیادت کریں گے تو ہم سب کے وقار میں اضافہ ہوگا۔ اب بھی ہماری خواہش یہ ہے کہ آپ اپنی تعلیم کے ان حصوں میں، جو ہمارے لیے وحشت کا باعث بنتے ہیں، ترمیم کر کے ان کو ہم لوگوں کے لیے قابل قبول بنا دیں، نیز ہماری بعض عادات چونکہ نہایت پختہ ہو چکی ہیں جس کے باعث آپ کے بتائے ہوئے احکام کی موجودہ شکل میں لوگوں کے لیے ان پر عمل کرنا مشکل محسوس ہوتا ہے لہٰذا ان میں ذرا سا ردوبدل کر دیں تو پھر ہمارے لیے آپ کی باتوں کو ماننا ممکن ہو جائے گا۔ ہمارے عوام بھی آپ کے دین کو اختیار کر لیں گے۔ اس طرح آپ کی کامیابی کی منزل قریب آ جائے گی۔

اس طرح کی تجویز آدمی کو غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ اس کے امکانات کا جائزہ لینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر میں وقتی طور پر ان لوگوں کو کچھ رعایت دے دوں تو شاید کچھ عرصہ بعد یہ لوگ حقیقی دین کے رمز شناس ہو کر پورے دین پر عمل کرنے لگیں گے۔ حضورؐ کو اپنی قوم سے محبت تھی، آپ اس کے ایمان کے حریص تھے اور چاہتے تھے کہ یہ لوگ اپنی نادانی میں جہنم کا ایندھن نہ بن جائیں۔ لہٰذا آپ اس تجویز کے بارے میں سوچنے لگے۔ پیغمبر چونکہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کر رہا ہوتا ہے اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ اس طرح کے مواقع میں جہاں پیغمبر مذبذب ہو کر خود کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو غلط اقدام سے روک کر صحیح سمت میں اس کی رہنمائی کر دیتا ہے۔ یہی صورت حال یہاں پیش آئی۔ نبی ﷺ کے تذبذب کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا. وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا. اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۷۳۔۷۵)

اور بے شک قریب تھا کہ وہ تم کو فتنوں میں ڈال کر اس چیز سے ہٹا دیں جو ہم نے تم پر وحی کی ہے تاکہ تم اس سے مختلف ہم پر افترا کر کے پیش کرو، اور تب وہ تم کو اپنا گاڑھا دوست بنا لیتے اور اگر ہم نے تم کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف کچھ جھک پڑو۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم تم کو زندگی اور موت دونوں کا دوگنا عذاب چکھاتے، پھر تم ہمارے مقابل میں اپنا کوئی مددگار نہ پاتے۔

دوسرے مقام پر قرآن میں یوں بیان ہوا ہے:

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ. قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ

عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ. اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ۱۰: ۱۵-۱۶)

اور جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں، کہتے ہیں: اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کردو۔ کہہ دو: مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنے جی سے اس میں ترمیم کردوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہہ دو اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو نہ میں اس کو تمھیں سناتا اور نہ وہ اس سے تمھیں باخبر کرتا۔ میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں۔ تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

یعنی کتاب میری اپنی تصنیف نہیں کہ میں اپنی مرضی سے اس کے مضامین میں تغیر و تبدل کر دوں۔ یہ خدا کا کلام ہے جس کی پیروی پر میں مامور ہوں۔ میں اس کی کسی بات کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ اگر میں ایسا کروں تو میں خدا کی پکڑ میں آجاؤں گا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا. اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا.
(الجن ۷۲: ۲۶-۲۸)

غیب کا جاننے والا وہی (خدا) ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ رہے وہ جن کو وہ رسول کی حیثیت سے انتخاب فرماتا ہے تو وہ ان کے آگے اور پیچھے پہرہ رکھتا ہے کہ دیکھے کہ انھوں نے رب کے پیغام پہنچا دیے۔ اور وہ ان کے گردوپیش کا احاطہ کیے اور ہر چیز کو شمار میں رکھے ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جب غیب کی باتیں وحی کی صورت میں اپنے رسول کے حوالہ کرتا ہے تو پھر رسول کو آزاد نہیں چھوڑ دیتا کہ اب وہ اپنی مرضی سے لوگوں کے ساتھ جو معاملہ چاہے کر لے۔ بلکہ رسول کو سخت نگرانی میں رکھتا ہے۔ اس کے اردگرد فرشتوں کا پہرہ لگا دیتا ہے تاکہ اس کا پیغام صحیح شکل میں رسول کی قوم تک پہنچ جائے۔ لہٰذا اس بات کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ پیغمبر اپنے طور پر یا دوسروں کے کہنے پر کلام خداوندی میں کوئی تغیر و تبدل کر سکے۔ اس مضمون کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ. لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ. ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ. فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ. وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ. (الحاقۃ ۶۹: ۴۳-۴۸)

یہ (قرآن) خداوند عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ اور اگر یہ (پیغمبر) ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا تو ہم اس کو قوی بازو سے پکڑتے، پھر ہم اس کی شاہ رگ ہی کاٹ دیتے۔ پس تم میں سے کوئی بھی اس سے ہم کو روکنے والا نہ بن سکتا۔ اور یہ تو خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔

یہاں قریش کو بتایا ہے کہ جس شخص کو رسول منتخب کیا جاتا ہے اس سے اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا کہ وہ وحی خداوندی میں اپنی جانب سے جھوٹ کی ملاوٹ کر دے۔ اگر کوئی رسول ایسا کرنے کی جسارت کرے تو اس خیانت پر اسی لمحے اس کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کو رہنمائی دی کہ نازل شدہ وحی کو بے کم و کاست لوگوں تک پہنچانا تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ لوگ تو چاہتے ہیں کہ تم اگر نرمی اختیار کرو تو یہ بھی اپنی مخالفت میں نرمی پیدا کر لیں گے، لیکن تم اس تعلیم میں تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں ہو۔ تم خدا کے آگے مسئول ہو، ان لوگوں کے آگے مسئول نہیں ہو۔ لہٰذا مخالفین خواہ کتنا ہی زور لگائیں وہ اللہ کی آیات سے تمہیں روکنے نہ پائیں۔ یہ جن باتوں سے چڑتے ہیں ان کو برملا اور ڈنکے کی چوٹ کہو۔ خدا کی اتاری ہوئی بات نہ واپس ہو سکتی ہے اور نہ دبائی جا سکتی ہے۔ یہاں سے ایک سیاسی لیڈر اور ایک پیغمبر کا فرق واضح ہوتا ہے۔ پیغمبر اپنے موقف میں تبدیلی نہیں لا سکتا لیکن سیاسی لیڈر وقتی مصالح کے تحت فیصلے کرتا ہے اور اس طرح کے مواقع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ جس طرح کے مواقع قریش نے پیدا کیے اور رسول اللہ ﷺ کو مراعات دینے کا فیصلہ کیا۔

مذکورہ دعوت مصالحت ہی کے سلسلہ میں قریش کا ایک وفد ابوطالب سے بھی ملا۔ انہوں نے ان سے درخواست کی کہ اپنے بھتیجے کو قائل کریں کہ وہ اپنی دعوت میں ترمیم کرے اور اس کے بدلے میں وہ جو دولت، عزت، شرف اور سیادت قوم سے حاصل کرنا چاہتا ہے ہم وہ اس کے قدموں میں ڈالنے کو تیار ہیں۔ ابوطالب نے حضورؐ کو بلایا اور قریش کی تجویز آپ کے سامنے رکھی۔ اس پر آپ نے مشہور و معروف جملہ کہا کہ چچا جان، اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی لا کر رکھ دیں کہ میں اس دعوت سے دستبردار ہو جاؤں تو یہ چیز مجھے قبول نہیں۔ اس پر ابوطالب نے کہا کہ اچھا تم اپنا کام کیے جاؤ۔

مخالفین جب سمجھوتے کی کسی تجویز کے بروئے کار آنے سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے دہشت گردی کا بازار پھر سے گرم کر دیا اور نبی ﷺ اور آپ کے ساتھیوں پر سختیاں پھر سے شروع کر دیں۔

حضرت ابو بکرؓ کا ارادۂ ہجرت:

حضرت ابو بکر صدیقؓ قریش میں نہایت معزز سمجھے جاتے تھے اور مکہ کی ریاست میں دیت اور تاوانوں کے معاملات طے کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔ اس کے باوجود قریش کی نگاہوں میں ان کا اسلام لانے کا جرم بری طرح کھٹکتا تھا۔ وہ صاحب عزیمت آدمی تھے اور غریب مسلمانوں کی پشت پناہی سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے۔ سنگین سے سنگین حالات میں ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔ لیکن اب قریش اتنے وحشی ہو رہے تھے کہ حضرت ابو بکرؓ جیسے عزم کے پہاڑ نے بھی سوچا کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں اور حبشہ میں دوسرے مسلمانوں سے جا ملیں۔ مکہ سے نکل کر کئی میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے کہ ایک دوست ابن الدغنہ، جو قارہ قبیلہ کا سردار تھا، سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے پوچھا، ابو بکر کہاں جانے کا ارادہ ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ میری قوم نے مجھے مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ زمین میں چل پھر کر خدا کی عبادت کروں۔ ابن الدغنہ نے کہا کہ میں تمہیں اپنی پناہ میں لیتا ہوں، واپس چلو۔ یہ واپس آ گئے تو ابن الدغنہ نے قریش کے تمام خانوادوں کے سرداروں سے ملاقاتیں کیں اور اپنی پناہ کے حوالے سے کہا کہ ابو بکر جیسا شخص نہ مکہ سے نکل سکتا اور نہ نکالا جا سکتا ہے۔ کیا تم ایک ایسے شخص کو نکالو گے جو غریبوں کی اعانت کرتا ہے، صلہ رحمی کرتا ہے، لوگوں کا بار اٹھاتا ہے، مہمان نوازی کرتا ہے اور لوگوں کی مشکلات میں ان کا سہارا بنتا ہے۔ قریش نے ابن الدغنہ کی پناہ کو تسلیم کر لیا اور حضرت ابو بکرؓ کو اجازت دے دی کہ اپنے گھر میں اللہ کی عبادت کریں، نماز پڑھیں اور قرآن کی قرأت کریں مگر اس کا اعلان نہ کریں کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ اس طرح وہ ہمارے بچوں اور عورتوں کو بہکا دیں گے۔ ابو بکرؓ نے گھر کے سامنے صحن چھوڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اس میں جائے نماز بنا لی۔ وہاں نماز پڑھتے اور قرأت کرتے۔ جب قرآن پڑھتے تو اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکتے۔ مکان کے پاس سے گزرنے والے لوگ تعجب سے ان کو دیکھتے اور متاثر ہوتے۔ اس چیز نے مشرکین کو گھبرا دیا۔ انہوں نے ابن الدغنہ سے کہا کہ ابو بکر کو کنٹرول کریں۔ ابن الدغنہ نے ابو بکرؓ سے کہا کہ گھر کے اندر عبادت کیا کریں۔ اگر علانیہ ایسا کرنا ہے تو میرا ذمہ خود ہی لوٹا دیں۔ کیونکہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اہل عرب یہ کہیں کہ اس شخص نے ایک آدمی کو پناہ دی، پھر خود ہی اپنی امان کو توڑ دیا۔ حضرت ابو بکرؓ جیسا آدمی اس طرح کی پناہ گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کہہ دیا کہ میں آپ کی پناہ آپ کو واپس کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی پناہ پر راضی ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے کفار کی زیادتیوں کا خود ہی مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور حبشہ کو ہجرت کا خیال دل سے نکال دیا[23]۔ یوں اللہ

تعالیٰ نے کمزور مسلمانوں کے ایک ہمدرد اور خیر خواہ کو ان کی سر پرستی کے لیے مکہ ہی میں رکھا۔ ان کے قیام کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ وہ نبی ﷺ کے معتمد ترین دوست تھے اور حضورؐ تمام اہم امور میں ان کے مشورہ سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ مشورہ کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ ہی کے ہمراہ ہجرت فرمائی۔

حوالہ جات

۱۔ صحیح مسلم۔ باب استحباب النزول بالمحصب یوم النحر۔ ج۱، ص۵۴۹

۲۔ سیرۃ النبیؐ۔ ابن کثیر۔ ج۱، ص۳۴۴

۳۔ صحیح بخاری۔ کتاب الکفالہ۔ باب جوار ابی بکر فی عہد النبیؐ وعقدہ۔ ج۳، ص۱۲۶۔ دار احیاء التراث العربی

باب 18

قریش کو عذاب الٰہی کا انذار

اہل مکہ کے لیے آزمائشیں:

جب رسول کی قوم اپنے تکبر کے اظہار کے طور پر پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ظلم و زیادتی پر اتر آتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے کس بل نکالنے کے لیے اس قوم پر چھوٹی بڑی آفتیں نازل کرتا ہے تاکہ اس کے دلوں میں شکستگی پیدا ہو۔ وہ خدا کی طرف رجوع کریں، اس کے پیغام کو سنیں اور اس کی روشنی میں اپنی اصلاح کریں۔ یہ اللہ کا ایک ایسا قانون ہے جس سے تمام رسولوں کی قومیں متاثر ہوئی ہیں۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ. ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰی عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ.
(الاعراف ۷:۹۴-۹۵)

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا اس کے باشندوں کو مالی اور جسمانی مصائب سے آزمایا کہ وہ رجوع کریں۔ پھر ہم نے دکھ سے سکھ کو بدل دیا یہاں تک کہ وہ پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ دکھ اور سکھ ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچے ہیں۔ پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس کا کوئی گمان بھی نہیں رکھتے تھے۔

دوسرے مقام پر خود قریش کے بارے میں واضح طور پر بتایا ہے کہ جب تک فیصلہ کن مرحلہ نہیں آجاتا ان پر آفتوں اور مصیبتوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

وَلَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا تُصِیْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِیْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰی یَاْتِیَ وَعْدُ اللّٰهِ. اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ.
(الرعد ۱۳:۳۱)

ان کافروں کو برابر کوئی نہ کوئی آفت ان کے اعمال کی پاداش میں پہنچتی رہے گی یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتی رہے گی یہاں تک کہ اللہ کے وعدے کے ظہور کا وقت آجائے۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

قرآن مجید کے اس بیان کا تقاضا یہ ہے کہ قریش پر متعدد آزمائشیں آئی ہوں لیکن تاریخ نے ان کو محفوظ نہیں کیا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ صرف ایک آزمائش کا ذکر کرتے ہیں کہ قریش کی ضد و انانیت کے اسی زمانہ میں ان

پر سخت قحط آیا یہاں تک کہ آدمی بھوک کے مارے زمین اور آسمان کے درمیان دھواں سا دیکھتے تھے۔ ہوسکتا ہے اس دوران میں قریش کو تجارت میں نقصانات ہوئے ہوں اور یہ چیز ریکارڈ میں نہ آئی ہو۔

عذاب الٰہی کے بارے میں اللہ کا قانون:

کسی قوم کی طرف رسول کی بعثت اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہوتا ہے۔ رسول اپنی قوم کے افراد کے مزاج اور ان کی روایات سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے اس لیے جب وہ انہی کے ایک فرد کی حیثیت سے قوم کی زبان میں رب کا پیغام ان تک پہنچاتا ہے تو حقیقت میں وہ سب سے بڑی دولت ان میں بانٹ رہا ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف وہ اپنی دنیا کو سنوار سکتے بلکہ آخرت میں فلاح کے مستحق بھی ہوسکتے ہیں۔ کسی قوم کے لیے یہ بڑی بدبختی کی بات ہوتی ہے کہ وہ اپنے رسول کی ناقدری کرے اور اس کی بات ماننے سے انکار کردے۔ اس صورت میں وہ قوم اللہ کے اس عظیم انعام کو اپنے لیے ایک عظیم مصیبت بنالیتی ہے۔ چونکہ وہ رسول کی آمد کے نتیجہ میں خدا کے پیغام کی مخاطب بن جاتی ہے اس لیے اس کی بے پروائی کا مطلب کائنات کے بادشاہ حقیقی اور اپنے خالق و مالک کے فرمان سے بے اعتنائی ہوتا ہے اور یہ حرکت اللہ سے بغاوت ہے جس کی سزا سے وہ قوم اپنے آپ کو نہیں بچاسکتی۔ اگر قوم پیغام کی قدر کرتی ہے تو اس پر رب کریم کی رحمت کے مزید دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس کے لیے زمین اپنے خزانے اگل دیتی اور آسمان اس کی خوشحالی میں اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے رسول کو بشیر اور نذیر کہا جاتا ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے والوں کو اللہ کی رحمت کی خوشخبری سناتا اور حق کے جھٹلانے والوں کو ان کی بدانجامی سے خبردار کرتا ہے۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی بعثت کے ساتھ ہی اس کی قوم کے ایمان لانے کے لیے ایک مدت ٹھہرادی جاتی ہے جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہوتا ہے۔ رسول کو بھی اس سے بے خبر رکھا جاتا ہے۔ قوم جب خدا کے پیغام کو نظر انداز کرتی ہے تو رسول کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کو اس کی اس حرکت کے انجام سے آگاہ کرے اور بتائے کہ اس پیغام کی تکذیب کے نتیجہ میں قوم پر دنیا میں بھی عذاب آئے گا اور آخرت میں بھی وہ مجرمین کی صف میں ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم کو نہایت دردمندی سے سمجھاتے کہ رب کے پیغام کو جھٹلا کر وہ اپنے آپ کو اسی عذاب کا مستحق بنا رہے ہیں جو نابود ہوجانے والی اقوام، عاد اور ثمود وغیرہ، پر آیا۔ قوم آپ سے یہ سوال کرتی کہ یہ عذاب کب آئے گا، ہم اس کو دیکھنا چاہتے ہیں، تو حضورؐ نہایت صاف گوئی سے کام لے کر بتادیتے کہ میں عذاب کے آنے کی خبر تو پورے یقین کے ساتھ دے سکتا ہوں لیکن اس کے آنے کے وقت کے بارے میں کچھ

نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس کا علم صرف خدا کو ہے اور یہ امور غیب سے ہے۔

قریش کے لیے نزول عذاب کے اشارے:

قریش کے پیہم اصرار پر کہ ان پر عذاب کیوں نہیں آ رہا ہے نبی ﷺ کو وحی آسمانی کے ذریعے اشارے دیے گئے کہ عذاب کا آنا تو ایک حقیقت ہے لیکن متعین طور پر اس کا علم نہیں دیا جا سکتا۔ ممکن ہے وہ تمہاری زندگی میں آئے اور اس کا کچھ حصہ تم دیکھ سکو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو موخر کر دے اور تم اپنے مکذبین کا حشر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکو۔ لہٰذا تم پوچھنے والوں کو متعین طور پر کچھ نہ بتاؤ کہ یہ عذاب کب آئے گا۔ سورہ یونس میں فرمایا:

وَ اِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیۡدٌ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ. وَلِکُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوۡلُهُمۡ قُضِیَ بَیۡنَهُمۡ بِالۡقِسۡطِ وَهُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ. وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ. قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِکُ لِنَفۡسِیۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ. لِکُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ. اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ فَلَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّلَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ. قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ اَتٰٮکُمۡ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوۡ نَهَارًا مَّاذَا یَسۡتَعۡجِلُ مِنۡهُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ. (یونس۱۰:۴۶۔۵۰)

یا تو ہم تم کو اس (عذاب) کا کوئی حصہ دکھا دیں گے جس کا ان سے وعدہ کر رہے ہیں یا تمہیں وفات دیں گے پس ان کی واپسی ہماری طرف ہوگی۔ پھر اللہ گواہ ہے اس چیز پر جو وہ کر رہے ہیں۔ اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے تو جب ان کا رسول آ جاتا ہے ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے معاملہ میں بھی کسی نقصان اور نفع پر کوئی اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو پھر نہ ایک گھڑی پیچھے ہوتے نہ آگے۔ ان سے کہو کہ بتاؤ کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر رات میں آ دھمکے یا دن میں، تو کیا چیز ہے جس کے بل پر مجرمین جلدی مچائے ہوئے ہیں؟

قریش کو متنبہ کیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو اگلی قوموں سے مختلف نہ سمجھیں۔ کسی بھی قوم میں جب رسول کی بعثت ہوتی ہے تو اس کے لیے فیصلہ کن مرحلہ آ جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کے لیے عذاب دنیا کا فیصلہ کرتا ہے تو پھر نہ اس قوم کا نسب نامہ دیکھا جاتا ہے اور نہ اس کی طاقت و جمعیت کا کچھ لحاظ کیا جاتا ہے۔ وہ اسی انجام سے دوچار ہوتی ہے جو انجام قوم عاد اور قوم ثمود یا دوسری معذب قوموں کا ہوا:

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَقُلۡ اَنۡذَرۡتُکُمۡ صٰعِقَةً مِّثۡلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ. اِذۡ جَآءَتۡهُمُ الرُّسُلُ مِنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ مِنۡ خَلۡفِهِمۡ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ. قَالُوۡا لَوۡ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِکَةً فَاِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ

كٰفِرُوْنَ. (حم السجدہ ۴۱: ۱۳۔۱۴)

پس اگر وہ اعراض کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں اسی طرح کے کڑکے سے خبردار کرتا ہوں جس طرح کا کڑکا عاد اور ثمود پر نازل ہوا جب کہ ان کے پاس رسول ان کے آگے اور ان کے پیچھے سے آئے، اس دعوت کے ساتھ کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے اتارتا تو ہم تو اس پیغام کے منکر ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو۔

نبی ﷺ جب اپنی قوم کی ضد سے پریشان ہوتے تو سوچتے کہ میری کسی کوتاہی کے سبب سے تو قوم اپنے موقف پر نہیں اڑ گئی ہے۔ قرآن نے حضورؐ کو تسلی دی کہ ایسا ہرگز نہیں۔ آپ تو تبلیغ کے کام میں اس سے زیادہ مشقت اٹھا رہے ہیں جتنی آپ سے توقع کی جاتی تھی۔ آپ کا کام رب کا پیغام قوم کو سنا دینا ہے۔ اس پیغام کو دلوں میں اتارنا اور اس کے مطابق ان کے رویوں کو درست کرنا آپ کی ذمہ داری میں شامل نہیں۔ اگر یہ اس پیغام کو نہیں مانیں گے تو ان کو عذاب الٰہی کا سامنا کرنا ہوگا۔ قریش کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ اپنی تمام تر قوت وشوکت کے باوجود وہ عذاب سے کس طرح تباہ ہو سکتے ہیں اور بے سہارا مسلمان کیسے فتح مندی کا دعویٰ کر سکتے ہیں تو قرآن نے ان کو دعوت دی کہ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ مکہ کے گردونواح میں کس تیزی سے نیا دین مقبول ہو رہا ہے اور شہر مکہ کو کس طرح گھیرے میں لیا جا رہا ہے۔

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ. اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا. وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ. وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ. (الرعد ۱۳: ۴۰۔۴۱)

اور جس چیز کی ہم ان کو دھمکی دے رہے ہیں اس کا کچھ حصہ یا تو ہم تم کو دکھا دیں گے یا ہم تم کو وفات دیں گے۔ پس تمہارے اوپر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے حساب کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہم سرزمین (مکہ) کی طرف اس کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ فیصلہ اللہ کرتا ہے اور کوئی اس کے فیصلہ کو ہٹانے والا نہیں اور وہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے۔

ان آیات سے واضح اشارہ اس بات کا نکلتا ہے کہ قریش رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ مقابلہ میں شکست کھا جائیں گے اور مکہ فتح کر لیا جائے گا۔ اور غور کرنے والوں کو اس کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ مکہ کے گردونواح میں آباد قبائل میں اسلام کا اثر، عرب سے باہر حبشہ میں اس کی پذیرائی اور مکہ کے اندر ان لوگوں کی معتد بہ تعداد کہ جو اسلام قبول کر کے اس کے لیے جانیں فدا کرنے پر آمادہ اور آزمائشوں کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے

ہیں، اس بات کی علامت ہیں کہ ہرگز رنے والا دن قریش کے گرد گھیرا تنگ کرنے کا باعث ہوگا۔ البتہ اس بات کو مبہم چھوڑ دیا گیا کہ آیا حضورؐ خود اس صورت حال کا مشاہدہ کرسکیں گے یا نہیں جس سے قریش کو دو چار ہونا پڑے گا۔

> اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ. اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ. سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ. بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ. (القمر۵۴:۴۳-۴۶)
>
> کیا تمہاری قوم کے کفار ان قوموں کے کفار سے کچھ بہتر ہیں یا تمہارے لیے آسمانی صحیفوں میں برأت نامہ لکھا ہوا ہے؟ کیا ان کا زعم یہ ہے کہ ہم مقابلہ کی قوت رکھنے والی جمعیت ہیں؟ یاد رکھیں کہ ان کی جمعیت عنقریب شکست کھائے گی اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ بلکہ ان سے جو وعدہ ہے اس کے پورا ہونے کا اصلی وقت تو قیامت کا دن ہے اور قیامت کا دن بڑا ہی سخت اور نہایت کڑوا ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ القمر کی آیات میں بھی عذاب کی نوعیت کے بارے میں یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ اہل ایمان کے ساتھ مقابلہ میں کفار کی جمعیت کو شکست ہوگی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ حالانکہ اس دور میں جب یہ سورہ نازل ہوئی مسلمان سخت دباؤ میں تھے اور قریش ان کو جینے کا حق دینے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔ اس طرح کے حالات میں مستقبل کے بارے میں ایک پیشینگوئی کو حقیقت سمجھنا قریش کے لیے نا قابل فہم تھا۔ لیکن اہل ایمان نے اس سے جو اطمینان حاصل کیا ہوگا، اس کا بس اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔

قریش کو جس قریبی عذاب کی خبر دی جا رہی تھی اس کے بارے میں قرآن نے یہ اشارہ بھی دیا کہ اس کا ہدف قریش کا قلع قمع کرنا نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے پیغام کی طرف رجوع کریں اور اس عذاب کا نوالہ بننے والوں کے انجام کو دیکھ کر دوسرے لوگ عبرت پکڑیں، اور اپنی اصلاح کرلیں تاکہ بڑے عذاب سے بچ سکیں۔

> وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ. وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا. اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ. (السجدہ۳۲:۲۱-۲۲)
>
> اور ہم ان کو بڑے عذاب کے سوا قریب کا عذاب بھی ضرور چکھائیں گے تاکہ یہ رجوع کریں۔ اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جن کو ان کے رب کی آیات کے ذریعہ سے یاددہانی کی جائے، پھر وہ ان سے اعراض کریں۔ ہم ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لیں گے۔

جوں جوں مکہ کے حالات سنگین سے سنگین تر ہو رہے تھے عذاب کی دھمکی کی شدت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور قریش کو خبردار کیا جا رہا تھا کہ عذاب جب آئے گا تو اس سے بچنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوسکے گی۔ ان سے پوچھا

گیا کہ اگر خدا تمہارے قدموں کے نیچے کی زمین دھنسا دے اور تم پاتال میں چلے جاؤ تو کون تمہیں بچا سکے گا؟ اگر کنکر پتھر برسانے والی ہوا تمہارے اوپر مسلط ہو جائے تو کون سی طاقت اس کا رخ پھیر سکے گی؟ اگر اللہ تعالیٰ زمین کی تہوں میں موجود پانی ہی کو گہرا اتار دے تو صاف ستھرا پینے کا پانی کون تمہارے لیے مہیا کر سکتا ہے؟ پس عذاب سے بچنے کے لیے رسول کا دامن تھام لو۔ اس کی رہنمائی میں زندگی گزارو یہی چیز تمہاری حفاظت کی ضامن ہے۔

عذاب الٰہی کی نشانی کا مطالبہ:

اللہ کا رسول جب اپنی قوم کو عذاب سے ڈراتا اور اس سے بچنے کے لیے ان کو ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے تو قوم کے بدبخت سردار اس کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھ لیتے ہیں۔ وہ نہایت بے باکی سے یہ مطالبہ شروع کر دیتے ہیں کہ لو، ہم تمہاری تعلیم کا علی الاعلان انکار کرتے ہیں۔ اب لاؤ وہ عذاب جس کی دھمکی تم ہمیں دے رہے تھے۔ اور اگر تم عذاب نہیں لا سکتے تو اس کی کوئی نشانی اور علامت ہی مقرر کر دو جو تمہاری حقانیت کا ثبوت ہو۔ اللہ کا رسول خود سے کوئی نشانی بھی مقرر نہیں کر سکتا۔ یہ کام اس کے دائرہ اختیار میں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہی کے اذن سے نشانی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے پیغمبر کے لیے عذاب کی خبر دینا لیکن نشانی دکھانے پر قادر نہ ہونا دشمنوں کے استہزاء کا باعث ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے بار بار یہ بات واضح کی کہ پیغمبر سے نشانی طلب کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تبلیغ کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے۔ کفار اور مکذبین کی حرکتیں خدا کی نظر میں ہیں اور برابر ان کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ جب عذاب نازل ہونے کا وقت آئے گا تو ان کی کوئی تدبیر اس کو روک نہیں سکے گی۔ فرمایا:

> وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ. إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ. اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثٰى وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ. وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ. عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ. (الرعد۱۳:۷۔۹)
>
> اور جنہوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔ تم تو بس ایک آگاہ کر دینے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے ہر مادہ کے حمل کو اور جو کچھ رحموں میں گھٹتا اور بڑھتا ہے اس کو بھی، اور ہر چیز اس کے ہاں ایک اندازہ کے مطابق ہے۔ وہ غائب و حاضر سب کا جاننے والا، عظیم اور عالی شان ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حاملہ کے وضع حمل کا مرحلہ یقینی ہوتا ہے لیکن اس کے لیے ایک اندازہ مقرر ہوتا ہے۔ کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کس لمحہ بچہ جنے گی۔ اسی طرح عذاب آنے کے لیے بھی اندازہ مقرر ہے۔ اس کا آنا ناگزیر ہے

البتہ اس کے لیے وقت کا تعین کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے علم کی چیز ہے۔

کفار جب اللہ کے رسول سے عذاب کی نشانی دکھانے کا مطالبہ کرتے ہیں تو ایک طرف اس کو یقین دلاتے ہیں کہ جونہی نشانی ہمیں دکھادی جائے گی ہم آپ کی دعوت پر ایمان لے آئیں گے۔ چنانچہ رسول دل سے متمنی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی معجزہ اور نشانی دکھا ہی دے تو میری قوم کی ہدایت کی راہ کھلے۔ دوسری طرف جب وہ یہ مطالبہ پورا نہیں کر سکتا تو وہی لوگ اس کو طنز کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔ یہ صورت حال بھی رسول کے لیے نہایت پریشانی کا باعث ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون آڑے آ جاتا ہے۔ پیغمبر اگر تمنا کا اظہار کرنے میں کچھ زیادہ ہی رغبت دکھائے تو اس کو سختی سے روک دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی خاطر اللہ اپنے قوانین نہیں بدل سکتا۔ اسی طرح کے ایک موقع پر رسول اکرم ﷺ سے فرمایا گیا:

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ. وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ. اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ. (الانعام۶:۳۵-۳۶)

اور اگر ان کا (قریش کا) اعراض تم پر گراں گزر رہا ہے تو اگر تم زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی زینہ ڈھونڈ سکو کہ ان کے پاس کوئی نشانی لا دو (تو ایسا کر دیکھو) اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا، تو تم ہرگز جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔ بات تو وہی مانیں گے جو سنتے سمجھتے ہیں۔ رہے یہ مردے تو اللہ ان کو اٹھائے گا، پھر یہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

قرآن نے یہ بات واضح کی کہ ساری کائنات، آسمان، زمین اور چرند پرند خدا کی خالقیت، قدرت، حکمت، رحمت و ربوبیت کی لاتعداد نشانیاں ہی تو ہیں۔ اللہ چاہتا ہے کہ لوگ ان نشانیوں پر غور کرنے کی عادت ڈالیں اور زندگی کے حقائق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ نشانیاں اللہ رب العزت کی وحدانیت، اس کی تمام صفات، اس کی صفت عدل کے مظہر روز قیامت اور جزا و سزا کے نظام، سب کو واضح و روشن کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ اگر ان سے یہ لوگ سبق سیکھ لیں تو پھر کسی عذاب کی نشانی کے بھیجنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ وہ نشانی اگر نمودار ہو گئی تو کفار کا خاتمہ پھر قریب کی بات ہو گی۔ جو لوگ روزمرہ کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے وہ عذاب کی نشانی دیکھ کر بھی راہ راست پر نہیں آتے۔ فرمایا:

وَ اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا. كَانَ ذٰلِكَ فِي

الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا. وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ. وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا. وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا. وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ. وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ. وَ نُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۵۸-۶۰)

اور کوئی بستی (جس میں رسول بھیجا گیا ہو) ایسی نہیں ہے جس کو قیامت سے پہلے ہم ہلاک نہ کر چھوڑیں یا اس کو کوئی سخت عذاب نہ دیں۔ یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا اور ہم نے قوم ثمود کو ایک اونٹنی ...... ایک آنکھیں کھول دینے والی نشانی ...... دی تو انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اس کی تکذیب کر دی اور ہم نشانیاں بھیجتے ہیں تو ڈرانے ہی کے لیے بھیجتے ہیں۔ اور یاد کرو جب ہم نے تم سے کہا کہ تمہارے رب نے ان لوگوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے، اور وہ رویا جو ہم نے تم کو دکھائی تو اس کو ہم نے لوگوں کے لیے ایک فتنہ ہی بنا دیا، اور اس درخت کو بھی جس پر قرآن میں لعنت وارد ہوئی۔ اور ہم تو ان کو ڈراتے ہیں لیکن یہ چیز ان کی غایت سرکشی میں اضافہ کیے جا رہی ہے۔

یہاں قوم ثمود کی اونٹنی کا حوالہ ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام اس قوم کی طرف رسول تھے۔ جب طویل مدت کی تبلیغ کے بعد بھی ان کی قوم نے اصلاح قبول نہ کی اور حضرت صالحؑ نے اس کو عذاب سے ڈرایا تو انہوں نے عذاب کی نشانی مقرر کرنے کا مطالبہ کیا۔ حضرت صالحؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک اونٹنی مقرر کر دی کہ اگر قوم اس کو کوئی گزند پہنچائے گی تو پھر عذاب نمودار ہو جائے گا۔ قوم کے ایک بدبخت آدمی نے اونٹنی کو زخمی کر دیا تو عذاب کے آنے میں جو رکاوٹ تھی وہ دور ہو گئی اور قوم ثمود ملیا میٹ ہو گئی۔

رسول اللہ ﷺ کو ان آیات میں بتایا ہے کہ آپ دیکھتے نہیں کہ جب قریش کو ان حقائق سے آگاہ کیا جاتا ہے جو قریش کی شکست اور اسلام کے غلبہ کی دلیل ہیں تو یہ لوگ ان کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ اپنی خوش فہمیوں ہی میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں۔ یہاں تین ایسے حقائق کا حوالہ دیا ہے جن سے قریش نے مطلوب اثر قبول نہ کیا۔ پہلی حقیقت یہ کہ مکہ کے گرد و نواح میں بسنے والے قبائل میں اسلام کی دعوت اپنا اثر دکھا رہی ہے اور ان میں لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ حالت ہو گی کہ مکہ مسلمانوں کے گھیرے میں ہو گا۔ اس وقت قریش کو شکست قبول کرنے کے سوا کوئی چارا نہیں ہو گا۔ (کئی سالوں کے بعد مکہ فتح ہوا تو قریش نیز اہل مکہ نے ہتھیار ڈال دیے اور یہ شکست پورے اہل عرب کے اسلام لانے کا ذریعہ بنی)۔ دوسری حقیقت یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو جو رویا

دکھائی گئی اس سے قریش نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور اس کو مذاق میں اڑا دیا۔ رویا سے مراد اسراء و معراج کی رویا ہے جس میں نبی ﷺ کو بیت اللہ اور بیت المقدس دونوں کی روحانیت اور برکات کا حقیقی وارث بتایا گیا اور اس میں نہ صرف قریش اور عرب کے مشرکین بلکہ یہود و نصاریٰ کے لیے بھی یہ پیغام تھا کہ ان دونوں عظیم عبادت گاہوں کی تولیت اب رسول اللہ ﷺ اور ان کے پیروؤں کو منتقل کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ (یہ فیصلہ فتح مکہ کے بعد اور پھر حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں بروئے کار آیا)۔ تیسری حقیقت یہ کہ قرآن نے جہنمیوں کے لیے تھوہر کے درخت کا کھانا مہیا کرنے کی خبر دی لیکن بجائے اس کے کہ لوگ اس خبر سے دہشت زدہ ہوتے اور راہ حق کو اختیار کرتے، انہوں نے جہنم کے اس درخت ہی کو مذاق بنا لیا۔ اس طرح قریش نے ثابت کر دیا کہ انہیں اپنی خوش فہمیوں سے نکلنا گوارا نہیں۔ اگر عذاب کی نشانی بھی ان کو دکھا دی جائے گی تب بھی یہ اس کو جادو قرار دے کر اس کا انکار کر دیں گے۔ سلامتی کی راہ یہ ہے کہ یہ قرآن کو غور سے سنیں اور اس کی تعلیم کو حرز جان بنائیں۔ فرمایا:

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ. اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. (العنکبوت۲۹:۵۱)

کیا ان کے لیے یہ چیز کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب اتاری۔ وہ ان کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔ بے شک اس کے اندر رحمت اور یاددہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔

شق قمر کی نشانی کا ظہور:

قریش کے لیے عذاب کی فیصلہ کن نشانی تو مقرر ہوئی اور نہ اس کا ظہور ہوا۔ لیکن اللہ رب العزت نے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار اور رسول اللہؐ کی دی ہوئی خبروں کی صداقت کے اثبات کے لیے شق قمر کی ایک غیر معمولی نشانی دکھائی۔ روایتوں میں آیا ہے کہ قریش کے پیہم اصرار پر کہ دوسرے رسولوں کی طرح کا کوئی معجزہ ہمیں بھی دکھایا جائے، نبی ﷺ نے ان کو توجہ دلائی کہ چاند کی طرف دیکھو۔ چاند کے دو ٹکڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک جبل نور کے سامنے کی جانب اور دوسرا اس کے پیچھے جاتا نظر آیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اب اس پر گواہ رہو۔ لیکن قریش نے حسب معمول اس کو جادو قرار دیا۔ قرآن مجید نے اس واقعہ کا تذکرہ یوں کیا ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ. وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ. وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ. وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ. حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ. فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَىْءٍ نُّكُرٍ. (القمر۵۴:۱-۶)

عذاب کی گھڑی سر پر آ گئی اور چاند شق ہو گیا۔ اور یہ (قریش) کوئی سی بھی نشانی دیکھیں گے تو اس سے اعراض ہی کریں گے اور کہیں گے کہ یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ اور انہوں نے جھٹلا دیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ اور ان کو ماضی کی سرگزشتیں پہنچ چکی ہیں جن میں کافی سامان عبرت موجود ہے۔ نہایت دل نشین حکمت۔ لیکن تنبیہات کیا کام دے رہی ہیں۔ تو ان سے اعراض کرو (اور اس دن کا انتظار کرو) جس دن پکارنے والا ان کو ایک نہایت ہی نامطلوب چیز کی طرف پکارے گا۔

رسول اللہؐ کی پریشانی کا مداوا:

اللہ کا رسول ایک ایسے معاشرہ میں کام کرتا ہے جو اس کا دشمن بن چکا ہوتا ہے۔ ممکن نہیں ہوتا کہ اس کے لیے نت نئے مسائل پیدا نہ ہوں اور وہ حالات سے پریشان نہ ہو۔ معاشرہ اس کی تعلیم کو اپنے لیے سم قاتل سمجھتا ہے۔ وہ عوام تک جو پیغام پہنچانا چاہتا ہے لیڈر لوگ اس کی راہ میں روڑے اٹکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ نزول عذاب کے ڈراوے بھی جب قوم پر اثر نہیں کرتے اور رسول اس کی آہٹ سن رہا ہوتا ہے تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے حالات میں واحد سہارا اللہ کی ذات ہوتی ہے جس کا عائد کردہ فریضہ رسول ادا کر رہا ہوتا ہے۔ چنانچہ قدم قدم پر اس کو خدا کی رہنمائی کی طلب ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس کو تازہ بہ تازہ رہنمائی سے محروم نہیں کرتا۔

وحی الٰہی:

رسول اللہ ﷺ کا حال یہ تھا کہ آپ کو وحی کا شدت سے انتظار ہوتا۔ آپ وحی جلد نازل ہونے کی تمنا بھی فرماتے۔ بعض معاملات میں آپ کو کسی معاملہ کے آسمانی فیصلہ کا انتظار ہوتا تو فرشتہ وحی کی راہ تکتے آپ کی نظریں بار بار آسمانوں کی طرف اٹھ جاتیں۔ آپ کو یہ خیال بھی ہوتا کہ اگر میں پچھلی وحی کا سبق جلد یاد کر لوں گا تب اگلی وحی کے نزول کا حق دار بن جاؤں گا۔ چنانچہ جب فرشتہ وحی کا پیغام لاتا تو آپ اس کو جلدی جلدی اخذ کرنے کی کوشش فرماتے تاکہ اس کو محفوظ کر لیں۔ قرآن میں آپ کو ایسا کرنے سے روکا گیا کہ وحی کے معاملہ میں آپ کی جلد بازی مناسب نہیں ہے۔ وحی کی تکمیل کے لیے خدا نے جو مدت ٹھہرا رکھی ہے اس کے پورا ہونے ہی میں مصلحت ہے۔ اس وقت تک بس علم وحی میں اضافہ کے لیے دعا کیا کرو۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا. (طٰہٰ۲۰:۱۱۴)

اللہ بادشاہ حقیقی بہت برتر ہے۔ پس تم قرآن کے لیے، اپنی طرف اس کی وحی پوری کیے جانے سے پہلے،

جلدی نہ کرو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب، میرے علم میں افزونی فرما۔

نبی ﷺ کی تسکین واطمینان کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتہ وحی کو بھی حکم دیا کہ وہ اپنی زبان سے معذرت کر کے رسول اللہ ﷺ کو بتائیں کہ ہمارا اترنا ہماری اپنی مرضی سے نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اگرچہ آپ وحی پانے کے لیے چشم براہ ہوتے ہیں لیکن اس شوق کی تسکین کے لیے جلدی جلدی وحی لانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ جونہی ہمیں حکم دیا جاتا ہے ہم بلا تاخیر اور بغیر کسی کوتاہی کے آپ کے پاس حاضر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں اور پورے صبر واستقامت کے ساتھ اس پر جمے رہیں۔ آپ کی مشکل کا مداوا اللہ کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ہے۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّکَ لَہٗ مَا بَیْنَ اَیْدِیْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَیْنَ ذٰلِکَ وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا۔

(مریم۱۹:۶۴)

اور ہم اپنے رب کے حکم کے سوا نہیں اترتے۔ ہمارے آگے اور پیچھے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب اسی کے اختیار میں ہے۔ اور آپ کا رب کسی چیز کو بھولنے والا نہیں ہے۔

وحی نازل ہوتی تو اس میں حضورؐ کو درپیش مسائل کے حل کے لیے رہنمائی ہوتی۔ مخالفین کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا جواب ہوتا۔ اس سے حضورؐ کو نئی قوت حاصل ہوتی جس سے آپ نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ حالات کا مقابلہ فرماتے۔

کثرت نماز اور صبر کی تلقین:

قریش کے اٹھائے ہوئے مخالفت کے طوفان میں نبی ﷺ کی ذاتی تربیت کے لیے بھی ہدایات ہوتیں۔ بطور خاص آپ کو کثرت سے نماز ادا کرنے کا حکم دیا جاتا اور بتایا جاتا کہ نماز آپ کی دعوت کی کامیابی کی کلید ہے۔ جتنا زیادہ آپ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں گے اتنا آپ کا اعتماد اس پر بڑھے گا۔ اور آپ اپنے معاملات اس کے حوالہ کریں گے تو وہ آپ کو سنبھالے گا۔ اسی طرح اپنے موقف کی حقانیت پر کامل یقین کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر استقامت دکھائی جائے۔ جب آدمی مشکل سے مشکل حالات میں صبر کا دامن نہیں چھوڑتا تو ہر نیا چیلنج اس کے اندر نیا عزم وحوصلہ اور اپنے موقف کے ساتھ مضبوط تر وابستگی پیدا کرتا ہے۔ نبی ﷺ کی رہنمائی کے لیے ماضی کے رسولوں کے متعدد واقعات بار بار سنائے گئے کہ انہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں حالات کا مقابلہ کس صبر وعزیمت کے ساتھ کیا۔ حضورؐ کی تربیت کے لیے بعض ہدایات ملاحظہ ہوں:

یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ. قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا. نِّصْفَهٗٓ اَوِانْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا. اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا. اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا. اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلًا. اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا. وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا. رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَکِیْلًا. وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا. وَذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَةِ وَ مَهِّلْهُمْ قَلِیْلًا. (المزمل ۷۳:۱۔۱۱)

اے چادر میں لپٹنے والے! رات میں قیام کر مگر تھوڑا حصہ۔ آدھی رات یا اس میں سے کچھ کم کر دے یا اس پر کچھ زیادہ کر لے۔ اور قرآن کی تلاوت کر ٹھہر ٹھہر کر۔ ہم تم پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ بے شک رات میں المتناول جمعی اور فہم کلام کے لیے نہایت خوب ہے۔ دن میں بھی تمہارے لیے کافی تسبیح کا موقع ہے۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور اس کی طرف گوشہ گیر ہو جا۔ وہی مشرق و مغرب کا خداوند ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو اپنا کارساز بنا اور یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کر اور ان کو خوبصورتی سے نظر انداز کر۔ اور ان خوشحال جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ اور ان کو کچھ دیر اور مہلت دے۔

چادر میں لپٹنے والے سے مراد حالات سے پریشان، فکر مند اور سوچ بچار میں گم شخص ہے۔ یہ تصویر نبی ﷺ کی ہے۔ آپ صورت حال سے مغموم، اپنی قوم کی ضد سے پریشان سوچتے کہ میں اس کو کس طرح خدا کے پیغام کی طرف لاؤں اور اس کی وحشت دور کروں۔ آپ چادر تان کر اس میں ماحول سے لاتعلق ہو کر غور و فکر کرتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو رات کے بیشتر اوقات میں نماز پڑھنے اور قرآن کی تلاوت ٹھہر ٹھہر کر کرنے کا حکم دیا تا کہ اس کے پیغام کی صحیح معرفت اور اپنے رب پر کامل اعتماد و توکل آپ کو حاصل ہو۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوا:

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا. وَ مِنْ اٰنَآیِٔ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّکَ تَرْضٰی. وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا لِنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ. وَ رِزْقُ رَبِّکَ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی. وَاْمُرْ اَهْلَکَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا لَا نَسْئَلُکَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُکَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی. (طٰہٰ ۲۰:۱۳۰۔۱۳۲)

تو جو کچھ (مخالفین) کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی، اس کی حمد کے ساتھ، تسبیح کرو، سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے۔ اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے اطراف میں بھی تا کہ تم نہال ہو جاؤ۔ اور ان کی بعض جماعتوں کو آسائش زندگی کی جس رونق سے ہم نے، ان کی آزمائش کے لیے، بہرہ مند کر رکھا ہے اس کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ۔ اور تمہارے رب کا ذکر بہتر اور پائیدار ہے۔ اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو۔ ہم تم سے رزق کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ہم تم کو رزق دیں گے اور انجام کار کی

فیروزمندی تقویٰ کے لیے ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ . وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَالَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ. وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ. اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ. ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ. وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ. (ھود۱۱:۱۱۲۔۱۱۵)

پس تم جمے رہو جیسا کہ تمہیں حکم ملا ہے، اور وہ بھی جنہوں نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے اور کج نہ ہونا۔ بے شک وہ، جو کچھ تم کر رہے ہو اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہونا جنہوں نے ظلم کیا کہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ پکڑے۔ اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی حامی نہیں۔ پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔ اور نماز کا اہتمام کرو دن کے دونوں حصوں میں اور شب کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں بدیوں کو دور کرتی ہیں۔ یہ یاد دہانی ہے یاددہانی حاصل کرنے والوں کے لیے۔ اور ثابت قدم رہو، اللہ خوب کاروں کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔

اھل ایمان کا لحاظ:

آنحضرت ﷺ کے لیے دلبستگی کا بڑا سامان آپ کے وہ ساتھی تھے جو آپ کی دعوت پر لبیک کہہ کر اہل ایمان کے قافلہ میں شامل ہو گئے تھے۔ جب حضورؐ کفار کی ریشہ دوانیوں سے پریشان ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام ملتا کہ آپ اپنے ساتھیوں کی موجودگی سے اطمینان حاصل کریں، ان کے معاملات میں دلچسپی لیا کریں اور کفار سے بے اعتنائی برتیں۔ یہی وفادار ساتھی آپ کے لیے کفایت کریں گے۔

اوپر سورہ ہود کی آیات میں ایک ہدایت یہ بھی ہے کہ ظالموں کی طرف مائل نہ ہونا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیغمبر ﷺ کافروں کو منہ ہی نہ لگائیں۔ کفار سے ملنا ملانا اور اپنا پیغام ان کو سنانا تو آنحضرت ﷺ کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ بالعموم ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لا کر ساتھی بن چکے ہوتے ہیں ان کی طرف سے ایک طرح کا اطمینان ہوتا ہے کہ یہ لوگ تو اپنے ساتھیوں میں شامل ہو چکے۔ اب توجہ دوسرے لوگوں پر مرکوز کرنی چاہیے جو ابھی تک اس پیغام سے بدکے ہوئے ہیں۔ لیکن قابل غور بات یہ ہوتی ہے کہ جن لوگوں نے اپنے گھر والوں کی خواہشات کے علی الرغم اپنی ساری دلچسپیاں رسول کے پیغام کی پیروی میں تج دی ہوں ان کے ظاہری نقصان کی تلافی کی واحد شکل یہ ہوتی ہے کہ اللہ کا رسول ان کو اپنی خصوصی توجہ کا محور بنائے، ان کی مشکلات میں ان کو دلاسا دے اور حق پر استقامت کی خصوصی بشارتوں سے ان کو نوازے۔ اس مقصد کی خاطر اگر وقتی طور پر اسے کفار کے بڑے لوگوں سے بے اعتنائی بھی

برتنی پڑے تو وہ ان سے بے اعتنائی بھی برتے۔قرآن مجید میں حضورؐ کو خاص طور پر اس سلسلہ میں ہدایات دی گئیں:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ. مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ. وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا. اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ. وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا ۢ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (الانعام۶:۵۲-۵۴)

اور تم ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کیجیو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی خوشنودی چاہتے ہوئے۔ ان کی ذمہ داری کا کوئی حصہ تم پر نہیں اور نہ تمہاری ذمہ داری کا کوئی حصہ ان پر ہے کہ تم ان کو اپنے سے دور کر کے ظالموں میں سے بن جاؤ۔اور اسی طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے کہ وہ کہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہمارے درمیان سے اپنے فضل کے لیے چنا؟ کیا اللہ شکر گزاروں سے اچھی طرح واقف نہیں،اور جب تمہارے پاس وہ لوگ آیا کریں جو ہماری آیات پر ایمان لائے تو تم ان کو کہو کہ تم پر سلامتی ہو۔تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔جو کوئی تم میں سے نادانی سے کوئی برائی کر بیٹھے گا، پھر وہ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کرلے گا تو وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ. (الحجر۱۵:۸۸)

ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو جن چیزوں سے بہرہ مند کر رکھا ہے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور نہ ان کی حالت پر غم کرو،اور اپنی شفقت کے بازو اہل ایمان پر جھکائے رکھو۔

ابن ام مکتومؓ کی آمد پر حضورؐ کی ناگواری:

سورہ عبس میں ایک واقعہ کا حوالہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ قریشی سرداروں سے گفتگو فرما رہے تھے اور ان تک دین کی تعلیم پہنچا رہے تھے کہ اسی دوران میں ایک صحابی عبداللہ بن ام مکتومؓ آنکلے۔یہ حضرت خدیجہؓ کے خالہ زاد بھائی تھے اور تھے نابینا۔ کفار کے سامنے عین تبلیغ کے دوران ان کا موقع پر آنکلنا نبی ﷺ کو ناگوار ہوا۔ آپ کو اندیشہ ہوا کہ اب قریشی سرداروں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ تمہارا ساتھ اسی طرح کے معذور اور کچھ غریب لوگ دے رہے ہیں۔ان کو تو تم نے بے وقوف بنالیا۔اب چاہتے ہو کہ ہم بھی تمہارے دام میں گرفتار ہو کر ان کے ساتھ برابری کی سطح پر آجائیں۔ ہم کسی طرح تمہاری دعوت قبول نہیں کرسکتے۔ مصلحت تبلیغ و دعوت کے تقاضے سے حضورؐ

کی پیشانی سے جو ناگواری ظاہر ہوئی اس پر قرآن نازل ہوا:

عَبَسَ وَتَوَلّٰی. اَنْ جَآءَهُ الاَعْمٰی. وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰی. اَو يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی. اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی. فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی. وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی. وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰی. وَهُوَ يَخْشٰی. فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی. كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ. فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ. (عبس ۸۰:۱۔۱۲)

اس نے (پیغمبر نے) تیوری چڑھائی اور منہ پھیرلیا، اس پر کہ اندھا اس کے پاس آیا۔ اور تجھے کیا معلوم شاید وہ سدھرنا چاہتا ہو یا نصیحت سنتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی؟ جو بے پروائی برتتا ہے اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو۔ حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے۔ اور جو تمہارے پاس شوق سے آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے تو تم اس سے بے پروائی برتتے ہو! ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے تو جو چاہے اس سے یاددہانی حاصل کرے۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قوم کے لیے رافت و رحمت کے جذبہ اور ادائے فرض کے جوش میں نبی ﷺ فکرمند ہوئے کہ ابن ام مکتومؓ کی اس موقع پر آمد کفار کو بھگانے کا بہانہ نہ فراہم کردے اس لیے آپ نے اپنے صحابی کی طرف سے منہ پھیرا لیکن اس میں وہ ہدایت آپ کی نظروں سے اوجھل ہوگئی جس کا ذکر اوپر سورہ الحجر کے حوالہ سے ہوا ہے۔ سورہ عبس کی آیات میں اسلوب کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حضورؐ پر عتاب ہوا ہو، لیکن عتاب کا یہ رخ آپ کی طرف نہیں بلکہ کفار و منکرین کی طرف ہے۔ اس کی وضاحت امام حمیدالدین فراہیؒ نے اپنی تفسیر میں یوں کی ہے:

اس معاملہ کی اصل نوعیت کو ایک مثال سے سمجھو۔ فرض کرو ایک نہایت مستعد اور ذمہ دار چرواہا ہے۔ اس کے گلے کی کوئی فربہ بھیڑ گلے سے الگ ہوکر کھو جائے، چرواہا اس کی تلاش میں نکلے، ہر قدم پر اس کی کھر کے نشانات ملتے جارہے ہوں۔ جنگل کے کسی گوشہ سے اس کی آواز بھی سنائی دے رہی ہو تو چرواہا کامیابی کی امید میں دور تک نکل جاتا ہے۔ اور اپنے اصلی گلے سے تھوڑی دیر کے لیے غافل ہوجاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس لوٹتا ہے تو اس کا آقا اس کو ملامت کرتا ہے کہ تم پورے گلے کو چھوڑ کر ناحق ایک دیوانی بھیڑ کے پیچھے ہلکان ہوئے۔ اس کو چھوڑ دیتے اسے بھیڑیا کھا جاتا تو وہ اسی کی مستحق تھی۔ بتاؤ اس میں عتاب کس پر ہوا۔ چرواہے پر یا کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ ظاہر ہے کہ یہ عتاب کھوئی ہوئی بھیڑ پر ہے۔ چرواہے اور گلے کی تو اس میں زیادہ سے زیادہ دلداری ہوئی۔ بالکل یہی صورت معاملہ یہاں بھی ہے۔ عتاب کا روئے سخن بظاہر آنحضرت ﷺ کی طرف ہے لیکن خفگی کا تمام زور منکرین و معاندین پر پڑ رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے لیے تو اس عتاب کے اندر شفقت و التفات کی نہایت جاں نواز ادائیں پنہاں ہیں[1]۔

پس سورہ عبس میں آنحضرتؐ کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ مغروروں اور سرکشوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے کوئی ایسی شکل اختیار نہ کریں جو آپ کے بلند مرتبہ سے فروتر ہو اور کتاب الٰہی کے شایان شان نہ ہو۔ جو لوگ اس نعمت گراں مایہ سے منہ پھیر رہے ہیں وہ اس لائق نہیں ہیں کہ ان کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ توجہ کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جو اہل ایمان کی صف میں شامل ہو گئے اور اب چاہتے ہیں کہ وہ بہتر سے بہتر اخلاق و کردار کے مالک بنیں، دین سیکھیں اور اپنے نفس کا تزکیہ کریں۔

حوالہ جات

۱ حمیدالدین فراہی۔ مجموعہ تفسیر فراہی۔ ص ۲۵۷

باب 19

غموں کا سال

بعثت نبوی کا دسواں سال رسول اللہ ﷺ کے لیے پے در پے مشکلات کا سال تھا۔ اسی لیے اس کو حضورؐ کے لیے عام الحزن یعنی غم کا سال قرار دیا گیا ہے۔ اس میں آپ کے چچا اور بنو ہاشم کے سربراہ خاندان ابوطالب کا انتقال ہوا۔ اس کے جلد بعد رسول اکرم ﷺ کی غمگسار رفیقہ حیات کی رحلت ہوئی جو آپ کے لیے شدید صدمہ کا باعث ہوئی۔ بعدازاں حضورؐ نے طائف کے سرداروں سے راہ و رسم بڑھانے کی سعی کی جو بار آور نہ ہوئی اور آپ کو بے نیل مرام واپس آنا پڑا۔

ابوطالب کا انتقال:

ابوطالب نے بنو ہاشم کی سربراہی کی پوری مدت میں حضورؐ کی سرپرستی بڑی شفقت کے ساتھ کی اور وہ پورا تحفظ دیا جو قبیلہ کے ایک فرد کی حیثیت سے حضورؐ کا حق تھا۔ تاہم آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے ان کو متاثر نہ کیا اور وہ اپنے آبائی دین ہی پر قائم رہے۔ جب وہ مرض الموت کی کیفیت سے دوچار تھے تو حضورؐ ان کی بیمار پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ دیکھا تو ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ بھی ان کے پاس موجود تھے۔ حضورؐ نے چچا سے کہا کہ آپ لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے تاکہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی گواہی دے سکوں۔ ابوجہل اور عبداللہ دونوں نے ابوطالب کو عار دلائی کہ کیا تم عبدالمطلب کے طریقہ سے پھر جاؤ گے؟ نبی ﷺ برابر ابوطالب کو ایمان کی دعوت دیتے رہے مگر انہوں نے لا الہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں عبدالمطلب کے مذہب پر قائم ہوں۔ چنانچہ اسی پر ان کا انتقال ہوا۔[1]

ابوطالب کے انتقال کے بعد خاندان کی سربراہی ابولہب کے پاس آئی جو اسلام کا کٹر دشمن تھا۔ روایات

کے مطابق ابتدا میں تو اس نے نبی ﷺ کو اطمینان دلایا کہ وہ پہلے کی طرح اپنا مشن جاری رکھ سکتے ہیں لیکن جلد ہی قریش میں موجود اسلام کے مخالفین کے ساتھ اس نے ہم آہنگی پیدا کر لی اور حضورؐ کو اپنے قبیلے کا پہلے کی طرح کا تحفظ حاصل نہیں رہا۔ مخالفین کی زیادتیاں بہت بڑھ گئیں۔ آپ کو پریشان کیا جانے لگا۔ حضورؐ تبلیغ کرتے تو ابولہب جس طرح پہلے بطور فرد آپ کی باتوں کی نفی کرنے کے لیے آپ کا پیچھا کرتا تھا اسی طرح اب بطور سردار قبیلہ بھی یہی حرکت کرتا۔

حضرت خدیجہؓ کا انتقال:

سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات ایک ہی سال ہوئی البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ پہلے کس کا انتقال ہوا اور حضورؐ کو یہ دو صدمے کتنے وقفہ سے پیش آئے۔ بعض روایات میں تو دونوں کے درمیان چند روز ہی کا وقفہ بتایا گیا ہے لیکن بعض میں ڈیڑھ دو ماہ کی مدت کا تعین کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے لیے حضرت خدیجہؓ کی جدائی غیر معمولی مسائل کو جنم دینے والی تھی۔ وہ آپ کی قدردان، مزاج شناس اور غمگسار بیوی تھیں۔ ان سے آپ کی چھ اولادیں ہوئیں جن میں سے چار بیٹیاں تھیں۔ زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ۔ ان کے انتقال کے وقت صرف دو بیٹیاں شادی شدہ تھیں، زینب حضرت خدیجہؓ کے بھانجے ابوالعاص بن الربیع کے نکاح میں تھیں اور رقیہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے نکاح میں، جو اس وقت حبشہ میں مہاجر تھے۔ اس طرح گھر کو سنبھالنے کے لیے صرف دو بیٹیاں رہ گئیں جن کی عمریں اس وقت پندرہ اور دس گیارہ برس کے لگ بھگ رہی ہوں گی۔

اسلام کے لیے حضرت خدیجہؓ کی خدمات بے مثل تھیں۔ انہوں نے رسول اللہؐ کی بعثت کے مراحل میں آپ کو دلاسا دینے، آپ کی تصدیق کرنے اور تبلیغ کے کام میں آپ کی ہمت افزائی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنا مال راہ خدا میں صرف کر کے نبی ﷺ کو روزی کمانے کے دھندے سے آزاد ہی کر دیا، حضورؐ کی دعوتی مشکلات میں آپ کا بھرپور ساتھ دیا اور آخر دم تک اسلام کی وفادار خادمہ رہیں۔ نبی ﷺ کے ساتھ انہوں نے رفاقت کا حق ادا کر دیا جس کے باعث اس پورے عرصہ میں آپ نے دوسری شادی کا کبھی سوچا تک نہیں۔

حضورؐ مدۃ العمر ان کو یاد کر کے ان کی خوبیوں اور قربانیوں کا تذکرہ کیا کرتے۔

حضرت خدیجہؓ کے بعد جب گھر کا نظام چلنے میں دشواری پیش آئی تو عثمان بن مظعونؓ کی زوجہ خولہ بنت حکیمؓ نے آپ کو مشورہ دیا کہ پھر سے شادی کر لیں۔ انہوں نے دو رشتے تجویز کیے۔ ایک حضرت سودہ بنت زمعہؓ کا، جو سکران بن عمروؓ کی بیوہ تھیں اور ہجرت حبشہ سے لوٹنے والوں میں شامل تھیں، دوسرا عائشہ بنت ابی بکرؓ کا جو ابھی تک غیر شادی شدہ تھیں، لیکن ان کی نسبت مطعم بن عدی کے بیٹے جبیر کے ساتھ طے پا چکی تھی۔ آنحضرتؐ نے دونوں رشتے پسند فرمائے لیکن حضرت عائشہؓ کی نسبت پہلے سے طے ہونے کے باعث سودہؓ سے شادی کر لی۔ حضرت ابو بکرؓ اپنے لیے خیر و برکت کا یہ موقع کہاں کھونے والے تھے۔ انہوں نے مطعم بن عدی سے ملاقات کر کے اس کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ مطعم کی بیوی نے کہا کہ اگر ہم بیٹے کی شادی آپ کے ہاں کر دیں تو آپ میرے بیٹے کو بھی بے دین بنا لو گے۔ ابو بکرؓ نے مطعم سے اس کا موقف جاننا چاہا تو اس نے بیوی کے بیان کی حمایت کر دی۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ پھر ایسا رشتہ لٹکائے رکھنے کا فائدہ؟ چنانچہ انہوں نے نسبت توڑ دی۔ ابو بکرؓ نے خولہ بنت حکیم سے کہا کہ اب میری طرف سے اجازت ہے، حضورؐ تشریف لے آئیں۔ اس طرح حضرت عائشہؓ کی نسبت آنحضرتؐ کے ساتھ ٹھہر گئی۔ البتہ عربوں کے دستور کے مطابق رخصتی کا معاملہ موخر کر دیا گیا۔

سفر طائف:

ابولہب کی سرداری میں جب آنحضرت ﷺ کو بنو ہاشم سے وہ مدد نہ ملی جو بطور فرد قبیلہ آپ کا حق تھا تو قریش کی ستم رانی میں اضافہ ہو گیا اور مخالف سردار آپ کی ایذا رسانی میں بے حد جری ہو گئے۔ آپ کو تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ ابولہب کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوتی۔ جب آپ لوگوں کو دین کی بات سناتے تو یہ لوگ آپ پر خاک ڈالتے اور آپ کے مخاطبوں سے کہتے کہ اس شخص کے کہنے میں مت آؤ، یہ تمہیں لات اور عزیٰ سے چھڑانا چاہتا ہے۔ اسی طرح کی صورت حال میں ایک مرتبہ آپ گھر پہنچے تو آپ کی صاحبزادی نے آپ کے سر سے مٹی صاف کی اور بال دھوئے۔ وہ رونے لگیں تو آپ نے ان کو دلاسا دیا۔

ایک مرتبہ آپ بیت اللہ کے پاس کھڑے نماز ادا کر رہے تھے۔ ابو جہل اور اس کے ساتھی حسب معمول

وہاں بیٹھے تھے۔ان میں سے کسی نے کہا کہ تم میں کوئی ایسا شخص ہے جو فلاں قبیلہ کے محلہ میں جا کر اوجھ اٹھا لائے اور جب محمد سجدہ کی حالت میں ہوں تو ان کی پیٹھ پر رکھ دے۔ اس پر مجلس کا بد بخت ترین آدمی اٹھا اور جا کر اوجھ اٹھا لایا۔ وہ انتظار میں رہا۔ جونہی حضورؐ سجدہ میں گئے اس نے اوجھ آپ کے کندھوں پر رکھ دی۔ ابوجہل اور اس کی پارٹی یہ منظر دیکھ کر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ حضورؐ سجدہ ہی کی حالت میں رہے اور سر نہیں اٹھایا۔ آپ کی بیٹی فاطمہؓ کو اس حادثہ کی خبر ہوئی تو وہ بھاگی ہوئی مسجد میں آئیں اور اوجھ حضورؐ کے کندھوں سے اتاری۔ جب حضورؐ نے سجدہ سے سر اٹھایا تو دعا کی کہ اے اللہ، تو ان قریش کے لیڈروں، ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط سے نمٹ لے۔ اس پر پوری پارٹی نہایت جز بز ہوئی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس شہر میں جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے۔ راوی ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جن قرشی سرداروں کو بددعا دی، میں نے ان سب کو غزوہ بدر کے بعد گڑھے میں مردہ پڑے دیکھا[2]۔

ایذا رسانی کا یہ سلسلہ مسجد حرام ہی تک محدود نہ تھا بلکہ بد بخت لوگ آپ کے گھر کے اندر بھی غلاظت پھینک دیتے۔ روایات کے مطابق آپ اپنے ہمسایوں سے پوچھتے کہ کیا یہی حق ہمسائیگی ہے کہ پڑوسی کو اذیت دی جائے۔ لیکن ان لوگوں پر اس طرح کی اپیلیں کیا اثر کر سکتی تھیں جو خدا اور بندوں کے حقوق ہی سے ناآشنا تھے۔

جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ ابولہب نے ان کو اپنی سرپرستی سے عملاً محروم کر دیا ہے تو آپ کو متبادل جوار حاصل کرنے کا خیال آیا۔ مکہ اور طائف اس لحاظ سے جڑواں شہر تھے کہ دونوں کی لیڈرشپ ملک بھر میں معزز و محترم سمجھی جاتی تھی۔ قریش کی طائف میں جائدادیں تھیں۔ اسی طرح وہاں کے ثقیف قبائل مکہ میں بھی رہائش رکھتے تھے۔ لہٰذا ان دونوں شہروں میں لوگوں کی آمدورفت بھی رہتی اور باہم رشتے ناتے بھی ہوتے۔ عربوں میں کسی معزز آدمی کا جوار حاصل کرنا ایک معمول کی بات تھی اور شرفاء اس سے انکار نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا نبی ﷺ نے وہاں جا کر قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا[3]۔

حضورؐ نے اپنے متبنیٰ زید بن حارثہؓ کو ساتھ لیا اور طائف پہنچے۔ وہاں عمرو بن عمیر کے تین بیٹے -- عبد یالیل، مسعود اور حبیب -- سب سے بااثر سردار تھے۔ آپ نے ان کو اسلام کی دعوت بھی پیش کی اور جوار بھی

طلب کیا۔ نہایت غیر متوقع طور پر انہوں نے آپ کا ساتھ دینے اور قریش کے بالمقابل کھڑا ہونے سے انکار کیا اور آپ کی تعلیم کا بھی مذاق اڑایا۔ اس معاملہ میں تینوں بھائیوں کی رائے ایک ہی تھی۔ لہذا نبی ﷺ نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور واپسی کی راہ لی۔ ان ظالموں نے اپنے غلاموں اور لڑکوں بالوں کو ہدایت کی کہ اس شخص کا پیچھا کریں اور اس کو زچ کریں۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ حضورؐ کو اور زیدؓ کو زخمی کر دیا۔ راستہ میں انگوروں کا باغ نظر آیا تو حضورؐ ستانے کے لیے اس میں داخل ہو گئے اور بیلوں کی چھاؤں میں آرام فرمایا۔ یہ باغ مکہ کے سرداروں عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ اتفاق سے وہ دونوں اس میں موجود تھے۔ ان کی نظر آپ پر پڑی تو خاندانی نسبت کا لحاظ کرتے ہوئے انہوں نے ایک طشتری میں انگور آپ کو بھجوائے۔ ان کا نصرانی غلام عداس یہ تحفہ آپ کے لیے لایا۔ آپ نے بسم اللہ پڑھ کر انگور کھانے شروع کیے تو غلام چونکا۔ کہنے لگا کہ اس دیار کے لوگ تو کھاتے وقت یہ کلمات نہیں ادا کرتے۔ حضورؐ کو عداس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کا تعارف چاہا۔ اس نے بتایا کہ میں نینویٰ کا نصرانی ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا علاقہ تو ایک صالح شخص یونس بن متی کا ہے۔ وہ نبی تھا، میں بھی نبی ہوں۔ لہٰذا وہ میرا بھائی ہے۔ یہ سن کر عداس نے حضورؐ کے ہاتھوں اور سر کو بوسہ دیا۔

طائف سے رخصت ہوتے وقت حضورؐ نے نہایت آزردہ ہو کر دعا کی کہ اے رب، میں نہایت کمزور ہوں، میرے وسائل کم اور میرے حیلے کمزور ہیں۔ تو کمزوروں کا مالک ہے، تیرے سوا میرا بھروسہ کسی پر نہیں۔ تو ہی نصرت فرما۔ روایت میں آتا ہے کہ فرشتہ نے حاضر ہو کر اجازت چاہی کہ میں اس بستی کو دو پہاڑوں کے بیچ میں کچل دوں۔ لیکن آپ نے منع فرمایا کہ میں اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ انہی ظالموں کی نسل سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو صرف اس ذات واحد لاشریک لہٗ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔

مکہ کو واپس ہوتے ہوئے آپ نے نخلہ کے مقام پر قیام کیا اور قریشی لیڈر سہیل بن عمرو کا جوار حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس پیغام بھیجا۔ اس نے کہا کہ بنو عامر بن لوی (سہیل کا خاندان) بنو کعب بن لوی (آنحضرتؐ کا خاندان) کو پناہ نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد آپ نے مطعم بن عدی، جس کا تعلق بنو عبد مناف سے تھا، کے پاس یہی پیغام بھیجا تو اس نے قبول کر لیا اور کہلا بھیجا کہ میری پناہ میں تشریف لے آئیں۔ آپ نے مطعم

کے ہاں شب بسر کی اور صبح کو وہ اپنے بیٹوں کے جلو میں آپ کو مسجد حرام میں لے گیا اور اعلان کیا کہ محمد کو اب میرا جوار حاصل ہے۔ کوئی ان کو گزند نہ پہنچائے[71]۔

اس واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سردار بننے کے بعد ابولہب نے عرب روایت کے خلاف محض تعصب اور دشمنی کی بنا پر اپنے ایک فرد قبیلہ کا حق حفاظت ادا نہیں کیا اور اس کے دشمنوں کا علانیہ ساتھ دیا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ حضورؐ بنو ہاشم کے ساتھ اپنی وابستگی کے باوجود دوسرے خاندان کے ایک سردار کا جوار حاصل کر کے مکہ میں داخل ہوتے۔

حضورؐ کے سفر طائف کو بالعموم یہ معنی پہنائے جاتے ہیں کہ آپ نے اہل مکہ کو چھوڑ کر ثقیف میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور تبلیغ کا آغاز عبد یالیل، مسعود اور حبیب تین سرداروں سے کیا۔ یہ نقطہ نظر صحیح نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ حضورؐ نے اپنے اصل مخاطبوں یعنی قریش سے قطع تعلق کر لیا اور اپنا میدان عمل خود ہی تبدیل کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا رسول اپنے اولین مخاطبوں کو جن کی طرف اس کی بعثت ہوتی ہے بلا اذن الٰہی نہیں چھوڑا کرتا، حتیٰ کہ اس کو اپنے اوپر ایمان لانے والوں کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود بستی سے نکل جانے کی اجازت تک نہیں ہوتی۔ وہ جہاز کے کپتان کی طرح خود مسافروں کی بحفاظت ساحل کو روانگی کی نگرانی کرتا ہے اور سب سے آخر میں جہاز کو ڈوبنے کے لیے چھوڑ کر اپنی کشتی میں سوار ہو کر خود کو بچاتا ہے۔ چونکہ قریش کی طرح قبیلہ ثقیف بھی عرب کے مضبوط قبائل میں سے تھا اس لیے حضورؐ کا وہاں جوار حاصل کرنے کے لیے جانا، تاکہ آپ اپنا کام مکہ میں جاری رکھ سکیں، ایک قابل فہم بات ہے۔

رسول اللہؐ کے لیے طمانیت کا آسمانی انتظام:

ان پے در پے مشکلات اور دعوت دین کے مقابل میں کفار کے مایوس کن رویہ سے حضورؐ کو جو پریشانی لاحق ہوتی اس کے مداوا کے لیے ہدایات آپ کو ساتھ ساتھ دی جاتیں تاکہ آپ کو سکون اور اطمینان کی دولت میسر ہو۔ طائف سے مایوس لوٹنے پر آپ کو جنات کی قرآن سے اثر پذیری کا واقعہ سنایا گیا۔ یہ واقعہ طائف سے واپسی پر نخلہ میں قیام کے دوران پیش آیا۔ حضورؐ شب کی نماز میں بلند آواز میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے تو جنوں کی ایک جماعت کا وہاں گزر ہوا۔ قرآن کی تلاوت سن کر وہ ٹھٹک گئے اور نہایت غور سے اس کو سنتے رہے۔ جب

تلاوت ختم ہوئی تب انہوں نے اپنی راہ لی اور اپنی قوم میں واپس پہنچ کر اس بات کا تذکرہ کیا کہ ہم نے نہایت عالی شان اور تعجب خیز کلام سنا ہے جس میں پوری قوت سے رب کی وحدانیت کا اقرار اور شرک کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے جبکہ ہمارے بدبخت لیڈر رب کی شان میں گستاخیاں کرتے اور ہمیں غلط راہ پر چلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہ کلام اہل زمین پر بڑے اہتمام سے نازل کیا گیا ہے اور اس کے نزول کے دوران شیاطین کی دراندازی روکنے کے لیے پہرے لگا دیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے ہم چھپ چھپا کر عالم بالا کی خبروں کی سن گن حاصل کر لیا کرتے تھے لیکن اب ایسا کریں تو ہمارے اوپر شہابیے برسائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت پر جنوں کے اس ردعمل کے بارے میں آنحضرت ﷺ کو اس لیے بتایا گیا کہ آپ کو تسلی ہو کہ خرابی نہ اس کلام میں ہے اور نہ آپ کے سنانے میں۔ یہ صرف بعض سننے والوں کے دلوں کی سختی ہے جس کے باعث ان پر یہ کلام اثر نہیں کرتا۔ ورنہ طبیعت میں ہدایت کی طلب ہو تو جنوں جیسی ایک غیر متعلق جماعت بھی قرآن سے اتنا متاثر ہوتی ہے کہ اپنی قوم کی صحیح رہنمائی پر کمربستہ ہو جاتی ہے۔

جنوں کی اثر پذیری کا یہ واقعہ وحی کے ذریعہ سے حضورؐ کو بتایا گیا[5]۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس جماعت سے نہ آپ کی ملاقات ہوئی اور نہ کوئی گفتگو ہوئی۔ یہ جنات پہلے ہی سے صاحب ایمان تھے۔ ان کو قرآن میں اپنے عقیدہ توحید کی تائید نظر آئی تو وہ اس پر ایمان لائے اور اپنی قوم کو بھی اس کی دعوت دی۔

نماز تہجد کا حکم:

یوں تو شروع ہی سے مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے حضورؐ کو صبر و استقامت اور کثرت نماز کی تلقین کی گئی تھی اور آپ اس پر بھرپور عمل بھی کر رہے تھے لیکن نئے حالات میں، جب قریش ہی نہیں بلکہ بنو ہاشم کی طرف سے بھی آپ پر زیادہ سختی شروع ہو گئی تو آپ پر روزانہ کی پانچ فرض نمازوں کے علاوہ ایک چھٹی نماز -- نماز تہجد -- بھی واجب کر دی گئی اور فجر میں قرآن کی تلاوت میں اضافہ کرنے کی ہدایت کی گئی کیونکہ یہ وقت ایسا ہوتا ہے جب طبیعت ہشاش بشاش ہوتی ہے اور زبان سے ادا ہونے والے کلمات دل کی گہرائیوں میں اتر کر اس کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ ہدایت اگرچہ آپ کے لیے تھی لیکن تمام اہل ایمان نے بھی اس پر عمل شروع کر دیا کیونکہ نبی ﷺ اور آپ

کے تمام ساتھی ایک جیسے حالات میں زندگی گزار رہے تھے اور سب کے مسائل ایک جیسے تھے۔

حواشی و حوالہ جات

١ صحیح مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب اول الایمان قول لا الہ الا اللہ۔ ج ا،ص ۳۱
٢ صحیح بخاری۔ کتاب الوضو۔ باب اذا القی علی ظہر المصلی قذر
٣ السیرۃ النبویہ۔ ابن ہشام۔ ص ۴۱۹
٤ ایضاً،ص ۳۸۱
٥ جنوں کے قرآن سننے کا واقعہ زیادہ تفصیل سے سورہ الجن میں بیان ہوا ہے۔ اس کا مختصر ذکر سورہ الاحقاف میں بھی ہے۔

باب 20

رسول اللہ ﷺ کے لیے بشارتوں کا دور

یثرب میں اسلام کا خیر مقدم:

یثرب کی مرکزی بستی مکہ سے عین شمال میں کوئی دس یوم کی مسافت پر واقع تھی۔ اس میں دو قبیلے اوس اور خزرج آباد تھے۔ دونوں کا جد اعلیٰ ایک ہی تھا۔ یہ عربی النسل اور عقیدہ کے اعتبار سے دوسرے مشرکین عرب کے ہمنوا تھے۔ مورخین کی تحقیق کے مطابق ان کے آباء واجداد یمن سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ یثرب سے متصل تین قبائل یہود............ بنونضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع............ کی بستیاں تھیں جو بڑے اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ بنونضیر اور بنو قریظہ حقیقی بنی اسرائیل اور علمائے تورات وفقہائے یہود کے قبیلے تھے۔ نسب کے لحاظ سے بنونضیر کو بنو قریظہ پر فوقیت حاصل تھی اور ان کی برتر حیثیت کا اعتراف خیبر، فدک اور وادی القریٰ میں آباد یہود کو بھی تھا جن کی بستیاں یثرب سے شمال کو چند دنوں کی مسافت پر تھیں۔ یہ قبائل فلسطین کی طرف سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔

یہود کی ہمسائیگی نے اوس وخزرج کو کئی اعتبار سے متاثر کیا۔ یہ مشرک ہوتے ہوئے یہود کے تصور توحید و آخرت سے آگاہ تھے۔ ان میں بت پرستی کا چرچا دوسرے مشرک قبائل کے مقابل میں بہت کم تھا۔ اوس اور خزرج دونوں کے بعض خانوادوں میں کچھ لوگ یہودیت اختیار کر چکے تھے۔ قبائلی معاشرہ میں عرب دستور کے مطابق ان یہودیوں کے حقوق محفوظ تھے اور یہ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اپنے قبیلوں کے فیصلوں پر عمل درآمد کرنے میں برابر کے حصہ دار تھے۔

یہود دنیا میں ایک سازشی گروہ کے طور پر معروف ہیں۔ ان کی قومی خصوصیت یہ ہے کہ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہی قومیں جو ایک وقت میں ان کو تحفظ فراہم کرتی ہیں دوسرے وقت میں ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیریں کرتی ہیں۔ اسی سازشی فطرت کے مطابق یہود اپنے پڑوسی قبائل

اوس اور خزرج کو زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ان قبائل کے جد اعلیٰ مالک بن عجلان نے یہودیوں کی شوکت کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا اور ان کو اپنے قبیلہ پر حاوی نہ ہونے دیا۔ چنانچہ اوس اور خزرج نے گردونواح کے عرب قبائل مزینہ، سلیم، جہینہ اور فزارہ سے حلیفانہ معاہدے کر لیے۔ یہ بات یہود قبائل کو کھٹکتی تھی جس کا تدارک انہوں نے سازش سے کیا۔ انہوں نے اوس اور خزرج کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ان کو باہم جنگ میں الجھا دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جنگ عربوں کے مالی و جانی وسائل کو نقصان سے دوچار کر جاتی اور کوئی قبیلہ کسی بھی معاملہ میں یہود کو للکارنے کی پوزیشن میں نہ ہوتا۔ یہود کتاب آسمانی کے حامل ہونے کے باعث جانتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک عظیم المرتبت رسول کی بعثت ہونے والی ہے۔ وہ اس رسول کی علامات اور خصوصیات سے بھی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ رسول جب مبعوث ہوں گے تو اللہ ان کو کامیاب و کامران کرے گا اور ان کے مخالفین ذلیل و خوار ہوں گے۔ جب کوئی معاملہ اوس و خزرج کے ساتھ ہوتا تو یہود ان کو ڈراتے کہ عنقریب آخری پیغمبر تشریف لانے والے ہیں۔ جب وہ آئیں گے تو ہم ان پر ایمان لا کر تم لوگوں کے ساتھ جنگ کریں گے۔ تب تمہارا حشر عاد و ثمود کا سا ہوگا۔

یثرب میں اوس اور خزرج کے مابین جنگوں کا سلسلہ، جسے جنگ بعاث کہا جاتا ہے، سو سال سے زیادہ مدت تک رہا۔ آخری جنگ حضورؐ کی بعثت کے چند سال بعد ہوئی۔ اس میں دونوں قبیلوں کے سرداروں کی بڑی تعداد قتل ہوئی۔ اس صورت حال میں ان کو اپنی حماقت کا احساس ہوا اور وہ سوچنے لگے کہ کسی طرح اس مخمصہ سے چھٹکارا حاصل کریں اور ایک آدمی کو اپنا سربراہ مان کر باہم اتفاق و اتحاد سے زندگی گزاریں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس منصب کے لیے عبداللہ بن ابی بن سلول کی شخصیت ان کی نظروں میں تھی۔ بعض لوگ اس کی تاج پوشی کر کے اسے دونوں قبیلوں کا بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔

خزرج کی اسلام میں دلچسپی:

۱۱ نبوی کے ایام حج میں نبی ﷺ حسب معمول قبائل میں تبلیغ دین کے لیے نکلے تو آپ کی ملاقات قبیلہ خزرج کے لوگوں سے ہوئی۔ تعارف کے بعد آپ نے ان کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول بنا کر خلق خدا کی اصلاح پر مامور کیا ہے۔ حضورؐ نے ان کو اسلام کی بنیادی باتیں بتائیں اور اللہ کا کلام سنایا جس سے یہ لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ ان لوگوں نے باہم مشورہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی بعثت کی خبر یہود دیتے اور ان کے

حوالہ سے ہمیں دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہود اسلام لانے میں ہم پر سبقت لے جائیں۔ لہٰذا ہمیں پہل کر کے ان کی دعوت کو قبول کر لینا چاہیے۔ چنانچہ ان لوگوں نے نبی ﷺ سے کہا:

> یارسول اللہ! ہم اپنے پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑ کر آئے ہیں جو شر وعداوت میں اپنی مثال آپ ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ سے اس کو متحد کر دے۔ ہم واپس جا کر اپنی قوم کو آپ کی دعوت سے روشناس کرائیں گے۔ ہم نے جو دین قبول کیا ہے اس کی طرف ان کو بھی بلائیں گے۔ اگر اللہ ہم سب کو یکجا کر دے تو آپ سے زیادہ محترم و مکرم اور کوئی نہیں ہوگا[1]

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ جنگوں سے بیزار، تھکے ہارے اور زخم خوردہ لوگوں کے ہیں۔ ان کو اسلام کی تعلیم متاثر کرتی ہے تو وہ اس کی راہ سے دونوں برسرپیکار قبیلوں کے درمیان اتحاد کے امکانات بھانپ لیتے ہیں۔ کیونکہ دینی تعلق دوسرے تمام روابط کی نسبت مضبوط تر ہوتا ہے اور دین کی راہ میں آئی ہوئی اخلاقیات لادینی اخلاقیات کے مقابل میں زیادہ پائیدار ہوتی ہیں۔ جن خوش بخت خزرجیوں نے اس موقع پر اسلام قبول کیا ان کے نام یہ ہیں:

اسعد بن زرارہ۔ عوف بن الحارث	(بنونجار)
رافع بن مالک	(بنوزریق)
قطبہ بن عامر بن حدیدہ	(بنوسلمہ)
عقبہ بن عامر بن نابی	(بنوحرام)
جابر بن عبداللہ	(بنوعبید)

رسول اللہ ﷺ نے ان سے یثرب کے حالات دریافت کیے۔ خاص طور پر یہ پوچھا کہ یہود کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہمارے حلیف ہیں۔ (آخری جنگ بعاث میں بنوقینقاع خزرج کے ساتھ تھے اور بنونضیر اور بنوقریظہ اوس کے حلیف تھے)

یہ خوش بخت خزرجی واپس یثرب گئے تو انہوں نے اپنے قبائل کو نبی ﷺ کی بعثت اور آپ کی تعلیم سے آگاہ کیا۔ اس کے اندر قبائل کے مابین اتحاد و اتفاق کے جو امکانات ان کو نظر آئے تھے وہ بھی انہوں نے قوم کے سامنے رکھے اور اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں میں اسلام کی تعلیم گھر کر گئی اور انہیں یہ بھی احساس ہوا کہ ہم قبول اسلام میں پہل کر کے یہود پر غلبہ پا سکتے ہیں۔ گویا اہل یثرب میں اسلام کی طرف رجحان کا بڑا سبب وہاں کے معروضی حالات تھے جن کے تناظر میں اولین مسلمانوں نے قبول اسلام کا فیصلہ کیا۔

بیعت عقبہ اولیٰ:

یثرب کے ابتدائی مسلمانوں کی تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد آدمی، جن میں اب قبیلہ اوس کے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے، اسلام قبول کرنے پر تیار ہو گئے اور ۱۲ نبوی کے موسم حج میں بارہ اشخاص نے نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضورؐ نے ان کو بنیادی عقائد کے علاوہ اسلام کے وہ احکام بتائے جن پر انہوں نے عمل کرنا تھا اور وہ چیزیں بھی بتائیں جن سے انہیں رکنا تھا۔ یہ بیعت منیٰ سے ذرا ہٹ کر ایک گھاٹی میں رازدارانہ ہوئی۔ سب لوگوں نے عہد کیا کہ وہ اسلام کے حلال و حرام کا لحاظ رکھیں گے اور آنحضرتؐ کے فرمان کے مطابق زندگی گزاریں گے۔

اس وفد نے یثرب کی صورت حال بیان کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کی دعوت کا چرچا گھر گھر میں ہے۔ لوگوں میں اس دین کو اختیار کرنے اور اس کے متعلق مزید جاننے کا بے حد شوق ہے۔ لیکن کسی آدمی کے پاس اس دین کا علم نہیں۔ لہٰذا اگر کسی قدیم الاسلام آدمی کو معلم بنا کر بھیجا جائے تو دلوں میں اس دعوت کے جلد نفوذ کرنے کے بڑے امکانات ہیں۔ حضورؐ نے معلم بھیجنے کا وعدہ فرمایا اور بعد میں قریشی نوجوان مصعب بن عمیرؓ کو تیار کیا کہ وہ یثرب جائیں، لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں، دین کی تبلیغ کریں اور نماز باجماعت کا اہتمام کر کے خود نمازوں کی امامت کرائیں۔ مصعب بن عمیرؓ یثرب گئے تو اسعد بن زرارہؓ نے ان کو اپنے پاس جگہ دی اور یثرب کے بااثر لوگوں سے ان کی ملاقاتیں کرائیں۔ جن لوگوں کے اندر اسلام کے خلاف جذبات تھے یا وہ اپنے درمیان ایک غیر آدمی کے وجود کو ناپسند کرتے تھے، مصعب بن عمیرؓ نے نہایت حکمت سے ان کے خدشات دور کیے۔ یثرب کی سرزمین اسلام کے لیے فی الواقع نہایت زرخیز ثابت ہوئی۔ اوس اور خزرج دونوں کے سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تو ان کے قبائل کے اسلام لانے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ نبی ﷺ کے لیے مکہ کی گھٹی گھٹی فضا میں یثرب سے آنے والی اس طرح کی خبریں مژدہ جانفزا ہوتیں۔ اس طرح کے مواقع پر قرآن مجید بھی آپ کو تسلی دیتا:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ. وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ. الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَکَ. وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ. فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا. اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا. فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ. وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ. (الم نشرح ۹۴: ۱۔۸)

کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟ اور تمہارا جو بوجھ تمہاری کمر کو توڑے دے رہا تھا اس کو تمہارے اوپر سے اتار نہیں دیا؟ اور تمہارا آوازہ تمہارے لیے بلند نہیں کیا؟ تو ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ پس جب تم فارغ ہو تو کمربستہ ہو اور اپنے رب سے لو لگاؤ۔

بعثت کے ابتدائی ایام میں حضورؐ کا دل احساس ذمہ داری سے نہایت تنگ ہوتا۔ جب آپ کی دعوت کی راہ میں قریش نے روڑے اٹکائے اور آئے دن ان کی وحشت میں اضافہ ہونے لگا تو حضورؐ کو اپنی ذمہ داری اور زیادہ پریشان رکھتی۔ لیکن اب وہ وقت آ گیا تھا کہ ہر مشکل کے بعد آسانی نمودار ہونے لگی۔ قرآن نے بتایا کہ آپ حالات سے گھبرائیں نہیں۔ آئندہ بھی ہر دشواری کے جلو میں فیروزمندی نمودار ہوتی رہے گی۔

اسراء ومعراج:

اسراء ومعراج کے واقعہ کو بالعموم آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ کے عجائبات میں شمار کر لیا گیا ہے اور اس کے حیرت انگیز تجربات کے تذکرہ پر لوگ جھوم لیتے ہیں لیکن قرآن مجید اور حدیث میں اس کا تذکرہ جس انداز سے ہوا ہے اس سے مقصود حضورؐ کے ایک خاص کمال کا اظہار ہے جو آپ کو بارگاہ رب العزت سے خاص طور پر عطا ہوا اور وہ ہے آپ کی ذات بابرکات میں حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی نسل کی دونوں شاخوں -- بنو اسماعیل اور بنو اسرائیل -- کی روحانی امانتوں کی یکجائی۔ اور یہ حضورؐ کی عظیم کامیابی کی بشارت ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ. (بنی اسرائیل ۱:۱۷)

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے (رسول اللہؐ) کو لے گئی ایک شب مسجد حرام سے اس دور والی مسجد تک جس کے اردگرد کو ہم نے برکت بخشی، تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

مسجد حرام سے مراد مکہ کی وہ مسجد ہے جو ابراہیمی مرکز توحید وعبادت بیت اللہ شریف کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ مسجد ملت ابراہیمؑ کے نقوش کی امین ہے۔ اس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی نسل میں ان کے نقش قدم پر چلنے والے صالحین واخیار کے نشانات راہ ثبت ہیں۔ یہاں نماز، عمرہ اور حج کے ذریعے اللہ کی وحدانیت کے اعلان اور تعلق باللہ اور تربیت تقویٰ کا پورا انتظام موجود ہے۔ یہیں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اللہ کے نام پر قربان کرنے کا عزم کیا اور وہ اسلام کی حقیقت کے عملی مظاہرہ کی ایک لافانی مثال پیش کرنے والے بن گئے، جن کے عمل سے قیامت تک نیک لوگ رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

دور والی مسجد سے مراد بیت المقدس ہے جو داؤد وسلیمان علیہما السلام جیسے شاکر بندوں کے خواب کی تعبیر، بنی اسرائیل کے اظہار عبودیت کا نشان، اللہ تعالیٰ کے انوار وتجلیات کا ایک مرکز اور انبیائے بنی اسرائیل کی برکات

کی سرزمین ہے۔

اسراء میں رسول اللہ ﷺ کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے جا کر ان دونوں مقامات کی روحانیت اوران کی عظیم روایات اورنشانیوں کا مشاہدہ کرایا گیا۔ روایات میں ہے کہ مسجد اقصیٰ میں تمام انبیاء ورسل نے رسول اللہؐ کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ نماز کی امامت یہ ظاہر کرتی تھی کہ حضورؐ کو تمام انبیاء ورسل پر فوقیت دے کر امام الانبیاء کا مقام دیا گیا جس سے آپ کی قدر ومنزلت اور کمال رسالت کا اظہار مقصود تھا۔ یہ سیر اس بات کی علامت تھی کہ آنحضرت ﷺ کی شخصیت بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل یعنی اولاد ابراہیمؑ کی دونوں شاخوں کی روحانیت اوراعلیٰ روایات کی جامع ہے۔ لہٰذا آئندہ ان دونوں دھاروں کا سنگم حضورؐ کی ذات بابرکات ہوگی۔ اب نہ یہود انبیائے بنی اسرائیل کی وراثت کے جائز دعویدار ہیں اور نہ بنی اسماعیل موجودہ حالت میں وراثت ابراہیمؑ کی تولیت کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں۔ گویا واقعہ اسرا میں یہ پیغام مضمر تھا کہ رسول اللہؐ فائز المرام ہو چکے۔ اب اولاد ابراہیم اگر اپنی سابقہ حالت پر اڑی رہے گی تو ان کو بقا حاصل نہ ہوگی۔ ان کے لیے فلاح کی واحد راہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لانا اور آپ کی رہنمائی میں چلنا ہے۔

انبیاء ورسل اپنی امتوں کے معلم ہوتے ہیں۔ کامیاب معلم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ حقائق کو محض جانتا ہی نہ ہو بلکہ ان کا مشاہدہ اور تجربہ بھی رکھتا ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ انبیاء ورسل کے لیے وحی کے مختلف طریقے اختیار فرماتا ہے۔ جو امور حقائق کی نوعیت کے ہوں ان کے لیے تو کلام وحی کی رہنمائی کافی ہوتی ہے لیکن جہاں کوئی پورا منظر دکھانا اور بہت سے امور کا مشاہدہ کرانا ہو وہاں محض کلام سے بات سمجھائی جائے تو اس کے لیے نہ معلوم کتنے دفتر درکار ہوں۔ جہاں تک مادی جسم کا تعلق ہے اس کی ہر صلاحیت محدود ہے۔ آنکھ ایک خاص فاصلہ تک دیکھ سکتی ہے۔ روشنی حد سے بڑھ جائے تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ آواز کا شور بڑھ جائے تو کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے وسیع الاطراف امور مادی جسم کی قوتوں اور صلاحیتوں کی مدد سے قابو میں نہیں آتے۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ وحی کے ایک طریقہ مکاشفہ کو ذریعہ بناتا ہے۔ اس میں رسول کی باطنی آنکھ ہر چیز کا مشاہدہ کر لیتی ہے۔ احادیث میں آنحضرت ﷺ کے متعدد مکاشفات کا تذکرہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ خطبہ جمعہ کے موقع پر نبی ﷺ کو جنت اور دوزخ کے بعض احوال کا مشاہدہ کرایا گیا۔ آپ کو خیال ہوا کہ جنت کے خوشوں میں سے ایک خوشہ توڑ کر اپنے ساتھیوں کو دکھاؤں۔ اسی طریقہ وحی کے مطابق حضورؐ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی گئی۔ قرآن

نے اس کے لیے رویا کا لفظ استعمال کیا ہے جو محض خواب کے علاوہ مکاشفہ پر بھی حاوی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں خانہ کعبہ کے پاس سوتے اور جاگتے کے درمیان کی کیفیت میں تھا جب یہ واقعہ پیش آیا۔

حضرت عائشہؓ، حذیفہ بن الیمانؓ، معاویہؓ اور حسن بصریؒ روحانی سفر کے قائل ہیں جبکہ حضرت ابن عباسؓ جسمانی سفر کے قائل ہیں۔ قرآن مجید نے اس کو رویا کہا ہے اور اس کا مقصد قریش کو خوف دلانا بتلایا ہے۔ سورہ اسرا کی آیت ۶۰ میں تین چیزوں کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب ہم نے یہ آیت اتاری کہ ہم مکہ کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں، یا یہ بتایا کہ جہنمیوں کو زقوم کا درخت کھانے کو دیا جائے گا جو جہنم کی تہہ میں اگے گا، یا تمہیں اسرا کی رویا دکھانے کا ذکر کیا، تو ان تینوں کا مقصد قریش کو ان کے دنیاوی اور اخروی برے انجام سے خبردار کرنا تھا۔ لیکن قریش کے لیے یہ تنبیہات فتنہ بن گئیں۔ انہوں نے ان کا مذاق اڑایا اور کوئی سبق حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ابن کثیرؒ کے مطابق اس پر اہل تفسیر کا اجماع ہے کہ اسرا کی آیت ۶۰ میں رویا سے مراد یہی واقعہ اسراء ہے اور ان لوگوں کی بات قابل اعتنا نہیں جو اس سے مراد کوئی دوسری رویا لیتے ہیں۔

روایات میں واقعہ اسرا کے ساتھ معراج کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس کی نوعیت اسرا پر ایک اضافہ کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مسجد اقصیٰ سے حضورؐ کو آسمانوں پر لے جایا گیا جہاں آپ کی ملاقات انبیاء سے کروائی گئی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انبیاء کی اس فہرست میں ان بڑے رسولوں مثلاً حضرات نوح، ھود، صالح، لوط اور شعیب علیہما السلام کے نام شامل نہیں ہیں جن کی زندگی قرآن نے رسول اللہ کے لیے بطور نمونہ پیش کی ہے۔ اس کے برعکس جن انبیاء و رسل سے ملاقات کروائی گئی وہ ہیں حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ اور انبیائے بنی اسرائیل میں سے موسیٰ، ہارون، یوسف، ادریس، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام۔ ان میں حضرت آدمؑ تو تمام انسانوں کے باپ ہیں جن کو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رہنمائی کا امین بنایا گیا اور جن کی اولاد نیک اور بد میں تقسیم ہو گئی۔ حضرت ابراہیمؑ بیت اللہ کے مرکز توحید کے معمار، اسلام کی حقیقت کا عملی مظاہرہ کرنے والے اور بنو اسماعیل کے جد اعلیٰ ہیں جو نبی کریم ﷺ کے مخاطب تھے اور انہی کی ملت پر چلنے کی دعوت حضورؐ ان کو دے رہے تھے۔ باقی تمام انبیاء کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے جو اللہ کی ہدایت کے امین بنائے گئے، ان کو تورات عطا کی گئی، نیز وہ جو بیت المقدس کی اہم عبادت گاہ سے منسلک رہے۔ دوسرے الفاظ میں معراج میں بھی انبیاء و رسل سے حضورؐ کی ملاقاتیں بیت اللہ اور بیت المقدس کے تعلق ہی سے کرائی گئیں۔ ان ملاقاتوں سے حضورؐ کو کون کون سے روحانی تجربات ہوئے اور پیغمبروں نے آپ کو

کیا کیا پیغامات دیے، ان کی تفصیل تو اللہ کو معلوم ہے، البتہ اتنی بات واضح ہے کہ معراج میں حضورؐ کو ایک غیر معمولی شخصیت کے طور پر انبیاء سے ملوایا گیا جس سے آپ کا تفوق اور برتری ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا معراج کے متعلق یہ اضافی بیان حضورؐ کے مقصد اسرا کو نمایاں تر کرنے کا باعث ہے۔ اس سے قریش اور ان کے دوست یہود کو یہ پیغام ملا کہ ان کی تعلیمات اور رسوم ورواج اب فرسودہ ہو چکے اور اب یہ اسلام کی زد میں ہیں۔

اسراء کے اس مقصد کو آپ کے مخاطبوں نے فوراً سمجھ لیا اسی لیے انہوں نے آنحضرتؐ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ یہ شخص بڑی دون کی لیتا ہے۔ اب یہ خواب دیکھنے لگا ہے کہ اس کا اقتدار بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں پر قائم ہو جائے گا۔ اس شخص کے اس طرح کے قیاسات اور خوش فہمیاں ہیں جن کی بنا پر خیال ہوتا ہے کہ اپنی بات سے دیوانگی کی حد تک وابستگی نے اس کو حقائق سے دور کر دیا ہے۔ قریش نے جہاں اس واقعہ کا مذاق اڑایا وہاں آنحضرتؐ کی بیت المقدس کے بارے میں معلومات کا امتحان کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ روایات میں آتا ہے کہ جس ذات پاک نے آپ کو پہلے یہ سیر کرائی تھی اسی نے دوبارہ بیت المقدس آپ کی نظروں کے سامنے کر دیا اور آپ کفار کے ہر سوال کا صحیح جواب اس مشاہدہ کی رو سے دیتے رہے۔

بیت اللہ کی آزادی کی بشارت:

قریش کو نہ صرف اپنے خاندانی شرف پر ناز تھا بلکہ بیت اللہ کی خدمت کی ذمہ داری پر بھی فخر کرتے تھے۔ یہ ابراہیمی وراثت ہونے کے ساتھ ساتھ قریش کی قوت وشوکت کا ذریعہ بھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ان کا خیال یہ تھا کہ یہ شخص خاندان کے ساتھ وابستہ رہ کر اپنی عزت وعظمت میں اضافہ کر سکتا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو تنہا کر لیا اور قطع رحم کا مرتکب ہوا لہٰذا اب اس کی حیثیت ایک کٹی ہوئی شاخ کی ہے جو اپنے تنے سے قوت نہ پانے کے باعث بالآخر سوکھ کر فنا ہو جاتی ہے۔ کعب بن اشرف مدینہ کے یہود کا ایک سردار اور ان کا معروف شاعر تھا۔ وہ مکہ آیا تو قریش نے اس سے کہا تم اہل مدینہ کے سردار ہو۔ اس شخص کو دیکھو جو اپنی قوم سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا ہے اور پھر بھی ہم سے اپنے آپ کو افضل خیال کرتا ہے۔ جبکہ حجاج کی رہنمائی کرنے والے، ان کو پانی مہیا کرنے والے، خانہ کعبہ کے کلید بردار اور متولی ہم ہیں۔ کعب نے جواب دیا تم اس سے یقیناً افضل ہو۔ قریش کی اس سوچ کا جواب سورہ کوثر میں دیا گیا:

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ. فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ. اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ. (الکوثر ۱۰۸: ۱۔۳)

ہم نے تجھے کوثر عطا کر دیا۔ پس اپنے رب ہی کی نماز پڑھ اور اسی کے لیے قربانی کر۔ بلاشبہ تیرا دشمن ہی منقطع

ہونے والا ہے۔

کوثر سے مراد ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؒ، عکرمہؒ، قتادہؒ اور مجاہدؒ نے خیر کثیر کو لیا ہے اور اس میں مفسرین نے حوض محشر، نہر جنت، قرآن، حکمت وغیرہ کو شامل کیا ہے۔ صاحب تفسیر نظام القرآن امام حمید الدین فراہیؒ خیر کثیر میں خانہ کعبہ کو بھی شامل کرتے ہیں کیونکہ لفظ کوثر میں پائے جانے والے کثرت کے مفہوم کا اظہار سب سے زیادہ خانہ کعبہ میں ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> معراج میں جو نہر کوثر آنحضرت ﷺ کو مشاہدہ کرائی گئی تھی اس کی صفات پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ نہر کوثر درحقیقت کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی مثال ہے۔ اس کے متعلق مختلف اسناد سے جو روایات مروی ہیں ان کی مشترک حقیقت یہ ہے کہ کوثر ایک نہر ہے، اس کے کناروں پر مجوف موتیوں کے محل ہیں، اس کی زمین یاقوت و مرجان اور زبرجد کی ہے۔ اس میں ظروف ہیں جو آسمان کے ستاروں کی مانند ہیں۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں، برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔ اس پر پرندے اترتے ہیں جن کی گردنیں قربانی کے جانوروں کی طرح ہیں[2]۔

اس کے بعد صحیح بخاری کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ معراج کے دوران یہ نہر آنحضرتؐ کو جنت کی سیر کے دوران دکھائی گئی۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ میں نے جبریل سے پوچھا یہ کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا 'یہ وہ کوثر ہے جو آپ کو آپ کے رب نے بخشا ہے'۔

امام فراہی معراج کے دوران حوض کوثر کے مشاہدات کو کعبہ، اس کے ماحول، یہاں حاضری دینے والوں کی روحانی پیاس اور ان کے احساسات، اور جانوروں کی قربانی پر منطبق کرتے اور فرماتے ہیں کہ قریشی سرداروں نے خانہ کعبہ کے انتظام میں خیانت کی، حج اور اس کے مناسک میں بگاڑ پیدا کر دیا، حج سے متعلق توحید اور غربا پروری کی سنت کو مٹا کر نماز اور قربانی کی اصل حقیقت باطل کر دی جس کے سبب سے وہ سورہ ماعون میں لعنت کے مستحق قرار دیے گئے۔ اس کے بعد اگلی ہی سورہ کوثر میں نبی ﷺ کو یہ بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کو قریش سے چھین کر تمہارے حوالے کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ ایک عظیم عطیہ الٰہی ہے۔ لہٰذا اب تم نماز اور قربانی کو اللہ کے لیے خالص کرنا۔ باقی رہے تمہارے دشمن تو ان کی جڑ کٹ چکی۔ آپ کے یہ دشمن اب بیت اللہ کی برکات

سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ چونکہ نہر کوثر کا مشاہدہ بھی حضورؐ کو معراج کے سفر میں ہوا لہٰذا اس کا تعلق بھی اسراء و معراج کے اندر مضمر مقاصد کے ساتھ ماننا چاہیے۔

اس بشارت کا اہم تقاضا یہ تھا کہ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں جب

۱۔ خانہ کعبہ آنحضرتؐ کے قبضہ میں دے دیا جائے گا اور مکہ پر آپ کا تسلط ہوگا۔

۲۔ لوگوں کی کثیر تعداد آپ کی امت میں داخل ہوگی۔

۳۔ محرومی و نامرادی اللہ اور رسول کے دشمنوں کے لیے ہوگی۔

دشمنانِ دین کی تباہی کی بشارت:

دین اسلام کی دعوت کے معاملہ میں حضورؐ کے چچا ابولہب کا کردار شروع سے دشمنی پر مبنی رہا تھا۔ عربوں کی اس روایت کو جانتے ہوئے کہ وہ صلہ رحمی کو بڑی اہمیت دیتے اور اس کو نیکی کا سب سے اعلیٰ جذبہ قرار دیتے ہیں اس نے اپنے بھتیجے کے لیے وہ راہ اختیار کی جو ان کا کوئی جانی دشمن ہی اختیار کر سکتا تھا۔ حضورؐ کی بعثت کے ابتدائی دور میں جب آپ نے کوہ صفا پر سے نعرہ لگا کر قریش کو جمع کیا اور ان کو آخرت کے خطرہ سے آگاہ فرمایا تو یہ ابولہب تھا جو آپ کو برا بھلا کہتا ہوا واپس چل کھڑا ہوا۔ جب حضورؐ نے اہل خاندان کی دعوت کی تو اس کے بعد ان کو دین کی کچھ باتیں بتانا چاہتے تھے کہ یہ شخص اٹھ کھڑا ہوا اور حضورؐ کو بات کرنے کا موقع نہ دیا۔ حضورؐ چلتے پھرتے لوگوں کو اللہ کا پیغام سناتے تو یہ آپ کے پیچھے پیچھے اس کا اثر زائل کرنے کے لیے کہتا کہ لات اور عزیٰ کی لاج رکھو اور اس شخص کے کہنے میں نہ آؤ۔ یہ تمہیں بزرگوں کے راستہ سے پھیرنا چاہتا ہے۔ قریش کے کچھ لوگوں نے بنو ہاشم کا مقاطعہ کیا تو ابولہب نے بنو ہاشم کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ان کے مخالفین کی حمایت کرتا رہا۔ ابوطالب کی وفات کے بعد قبیلہ کی سربراہی کا منصب اس کے پاس آیا تو عربوں کی روایات کی نفی کرتے ہوئے اس نے آنحضرت ﷺ کی حفاظت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ رفادہ کا محکمہ اس کے قبضہ میں آیا تو اس میں چوری اور خیانت کا مرتکب ہوا، حالانکہ یہ مال غرباء، مساکین اور زائرین بیت اللہ کی خدمت کے لیے تھا۔ نبی ﷺ سے ابولہب کی دشمنی کا سبب اس کی زر پرستی اور حسد کا جذبہ تھا۔ اس طرح اس کے کردار میں فرعون اور قارون دونوں کی صفات یکجا ہوگئی تھیں۔

اس زمانہ میں جب حضورؐ کے پاس دوسری بشارتیں آئیں وہیں آپ کے دشمنوں کے برباد ہونے کی

بشارت بھی آئی جس میں علامت ابولہب کو بنایا گیا۔ فرمایا:

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ. مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ. سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ. وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ. فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ. (اللھب۱۱۱:۱۔۵)

ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی ڈھے گیا۔ نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ اس کی بیوی بھی، ایندھن ڈھوتی ہوئی، اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی ہوگی۔

یہ ایک پیشین گوئی تھی جو بعد میں اس طرح پوری ہوئی کہ ابولہب کے تمام اعوان وانصار، جو نبی علیہ السلام کی عداوت میں جلتے تھے جنگ بدر میں مارے گئے۔ اس جنگ میں مرنے سے بچاؤ کی خاطر ابولہب نے اپنی جگہ ایک شخص عاص بن ہشام کو بھیجا جو اس سے چار ہزار درہم قرض لے کر ادا نہیں کر سکا تھا، لیکن اس تدبیر سے وہ موت سے نہ بچ سکا۔ اس کو چیچک نکل آئی جس کے نتیجہ میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ چھوت کے خوف سے اس کی اولاد لاش کے قریب نہ جاتی تھی۔ چنانچہ اس کا جسم پھول گیا اور بدبو آنے لگی۔ لوگوں کے غیرت دلانے پر بیٹوں نے تیسرے دن اس کی لاش اٹھوائی۔ اسے ایک دیوار کے ساتھ رکھ کر اوپر سے دیوار گرا دی گئی۔ یہی اس کی قبر تھی۔ اس طرح یہ دشمن خدا اپنے انجام کو پہنچا۔

بدکردار قریشی لیڈر بے نقاب:

قرآن میں آہستہ آہستہ ان لیڈروں کے کردار سے بھی ان کے عوام کو آگاہ کیا گیا جو رسول اللہؐ کی دعوت کی مزاحمت کرتے رہے تھے اور اپنے عوام کو گمراہ کرنے میں جن کا بڑا ہاتھ تھا۔

قرآن نے قریش کی بدکردار لیڈر شپ کی اخلاقیات سے پردہ اٹھایا اور بتایا کہ یہ بدفطرت لوگ خانہ کعبہ کے مناصب پر تو قابض ہیں لیکن ان کا کردار اتنا پست ہے کہ اس ابراہیمی مرکز کے بنیادی مقاصد ہی کو پامال کر رہے ہیں۔ یہ اس لائق نہیں کہ یہ پاکیزہ گھر مزید ان کے کنٹرول میں رہنے دیا جائے۔ اس طرح کے بعض حوالے حسب ذیل ہیں:

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ. وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ. وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ. هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ. مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ. عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ. (القلم۶۸:۸۔۱۲)

پس ان جھٹلانے والوں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ تم ذرا نرم پڑو تو یہ بھی نرم پڑ جائیں گے اور

تم بات نہ سنو ہر جھوٹی قسمیں کھانے والے، ذلیل، اشارہ باز، لترے، خیر سے روکنے والے، حد سے تجاوز کرنے والے، حق مارنے والے، سنگ دل، مزید براں بے نسب کی۔

یہ قریش کی قیادت کا کردار بیان ہوا ہے۔ وہ جھوٹی قسمیں کھا کھا کر عوام کو نبی ﷺ کے قریب جانے سے روکتے، ایمان لانے والوں کو اشاروں اور فقروں سے ہدف بناتے، لگائی بجھائی کر کے بدگمانی پیدا کرتے اور دوسروں کے حقوق پر دست اندازی کرتے۔ وہ سنگ دل اور بے مروت تھے۔ بعض لیڈر بے نسب بھی تھے یعنی وہ اصلاً قریش میں سے نہیں تھے بلکہ دوسرے قبائل سے ان کا تعلق تھا لیکن مفادات حاصل کرنے کے لیے قریش کی روایات کے محافظ بننے میں پیش پیش تھے۔ اخنس بن شریق ایک ایسا ہی شخص تھا جو ثقفی ہونے کے باوجود قریش کی شاخ بنوزہرہ میں سے ہونے کا مدعی تھا۔ یہ قرشی کہلانے کی خاطر قریش سادات کی ہاں میں ہاں ملاتا اور ان کی چاپلوسی کرتا[۳]

نبی ﷺ کو ایسی قیادت کی باتوں میں آنے سے منع فرمایا۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ . الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهُ. يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهُ اَخْلَدَهُ. كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ. وَمَآ اَدْرٰكَ مَاالْحُطَمَةُ. نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِى تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ. اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ. فِى عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ. (الھمزہ ۱۰۴: ۱۔۹)

ہلاکی ہو ہر اشارہ باز، عیب جو کے لیے جس نے مال سمیٹا اور اس کو گنتا رہا گویا اس کے مال نے اس کو زندہ جاوید کر دیا۔ ہرگز نہیں! وہ چور چور کر دینے والی میں ضرور پھینکا جائے گا اور تم کیا سمجھے کہ چور چور کر دینے والی کیا ہے؟ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ، جو دلوں پر جا چڑھے گی۔ بلاشبہ یہ اس میں موندے ہوئے ہوں گے، لمبے ستونوں میں جکڑے ہوئے۔

ان آیات میں قریش کے بخیل سرداروں کا کردار بیان ہوا ہے جو دولت گن گن کر رکھتے اور اس پر خوش ہوتے، جیسے وہ اپنے مال ہی میں حیات جاوداں پا گئے ہوں۔ وہ جب دوسروں کو حقوق ادا کرنے میں سرگرم دیکھتے تو طنز اور تضحیک سے ان کا قافیہ تنگ کر دیتے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ. فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ. وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ. اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ. وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ. (الماعون ۱۰۷: ۱۔۷)

دیکھا تم نے اس کو جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکینوں کو کھانا کھلانے پر نہیں ابھارتا۔ پس ہلاکی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں، اور ادنیٰ چیزوں میں بھی بخالت کرتے ہیں۔

یہاں بیت اللہ کے متولیوں کی نمازوں کی بے حقیقتی کی طرف اشارہ ہے۔ وہ مذہبی رسوم کی نمائش کے لیے نماز ادا کرتے جو روح سے خالی، نری ریاکاری ہوتی۔ پڑوسیوں کے ساتھ ادنیٰ چیزوں کے لین دین میں بھی یہ خسیس تھے۔ یتیموں اور مسکینوں کو دینے دلانے کا معاملہ ہوتا تو یہ ناک بھوں چڑھاتے اور ان کو دھکے دے کر باہر نکلوا دیتے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص بیت اللہ کا متولی ہونے کے لائق نہیں ہو سکتا کیونکہ رب سے تعلق تو بندے کو شکر گزار، فیاض اور کریم بناتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے رب کی نعمتوں میں دوسروں کو بھی شریک کرتا اور ان کو دینا دلانا ان کا حق سمجھتا ہے۔

نبی ﷺ جب اس مضمون کی آیات سناتے تو قریش کے لیڈر غصے سے آگ بگولا ہو جاتے کہ یہ شخص ہمارے اصل کردار کو عوام کے سامنے لا کر ہمیں ان کی نظروں سے گرانا چاہتا ہے۔ چونکہ کسی کا کردار چھپا نہیں رہ سکتا اس لیے یہ لوگ دانت پیسنے کے سوا حضورؐ کے خلاف کچھ کر نہ سکتے تھے۔

ہجرت کے لیے سوچ بچار:

رسول اللہ ﷺ کو رسولوں کے بارے میں اللہ کا یہ قانون بتایا گیا تھا کہ جب قوم پر اتمام حجت ہو چکتا ہے اور وہ رسول کے پیغام کے معاملہ میں ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے تو بالآخر اس پر عذاب آتا ہے اور اس سے پہلے رسول اور اس کے ساتھیوں کو کسی دوسرے مقام پر ہجرت کرنا ہوتی ہے۔ حالات اسی رخ پر جا رہے تھے کہ حضورؐ نے محسوس فرمایا کہ اب بہت جلد مجھے بھی شہر چھوڑنا ہوگا۔ لہٰذا آپ نے برابر غور کرنا شروع کیا کہ اگر مجھے اہل ایمان کو لے کر شہر چھوڑنے کا حکم ہوا تو میں کس طرف نکلوں گا۔ اس مقصد کے لیے حبشہ کی ایک مثال آپ کے سامنے تھی لیکن وہ ملکی ماحول سے بالکل ہٹ کر تھی۔

اسی غور و فکر کے زمانہ میں آپ نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ کو چھوڑ کر ایک شور زدہ علاقہ کی طرف ہجرت کر رہا ہوں جہاں کھجور کے درخت بہت زیادہ ہیں۔ یہ علاقہ کالی پتھریلی زمینوں کے درمیان ہے۔ نبی ﷺ کا خیال ہوا کہ یہ جگہ یمامہ ہو سکتی ہے یا ہجر۔ لیکن واضح طور پر آپ کو اس مرحلہ میں کوئی حکم نہیں ملا اور نہ یہ یقین ہو سکا

کہ اشارہ کس علاقہ کی طرف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں حضورؐ اپنے صحابہ کو بھی ذہنی طور پر تیار کرتے کہ حالات جس ڈگر پر جارہے ہیں اور عذاب کی وعید نازل ہو رہی ہے تو ہمیں بہت جلد یہ شہر چھوڑنا ہوگا۔ صحابہ کرامؓ اپنی اپنی جگہ ہجرت کی تیاری میں بھی مصروف ہو گئے۔

حوالہ جات

۱۔ السیرۃ النبویہ۔ ابن ہشام۔ ج ۱، ص ۴۲۹

۲۔ حمید الدین فراہیؒ۔ مجموعہ تفاسیر فراہی۔ تفسیر سورہ کوثر

۳۔ السیرۃ النبویہ۔ ابن ہشام۔ ج ۱، ص ۳۶۰

باب 21

آخری انذار اور اعلان براءت

مکہ میں قریش کی ستم رانیاں زوروں پر تھیں۔ وہ اپنے ترکش کے سبھی تیر چلا چکے تھے لیکن اس سے ان کی طرف بڑھنے والا طوفان تھمنے میں نہیں آیا۔ ان کی نظروں میں سب سے بڑے مجرم رسول اللہ ﷺ تھے مگر ان پر ہاتھ ڈالنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ دعوت کے اس دور میں قریش حضورؐ سے چھٹکارا حاصل کرنا ناگزیر سمجھتے تھے لیکن اس کی شکل کیا ہو؟ اس بارے میں یکسو نہیں ہو سکے تھے۔ اس معاملہ میں لوگوں کی آرا مختلف تھیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اگر آنحضرتؐ کو منظر سے کسی طرح ہٹا دیا جائے تو اہل مکہ سکھ کا سانس لیں گے۔ دوسرے شقی القلب لوگوں کی رائے یہ تھی کہ جب تک آپ کا وجود باقی ہے وہ قریش کے لیے دردِ سر بنے رہیں گے۔ قریش نے ہر طرح کی تدبیروں پر غور کرنا شروع کر دیا لیکن وہ کسی نتیجہ پر پہنچنے میں ناکام ہو جاتے تھے۔

نبی ﷺ نے اسلام کو پیش کرنے کا ہر طریقہ قریش پر آزما لیا تھا۔ عقلی استدلال ہو یا نفسیاتی ترغیب و تشویق، شفقت آمیز انداز ہو یا دھمکی آمیز اسلوب، قریش پر کوئی چیز کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس معاشرہ کا ہر سلیم الطبع فرد اسلام کا گرویدہ ہو چکا اور باقی بھیڑ میں سے کچھ حاصل ہونے کا اب کوئی امکان نہیں۔ قرآن میں عذاب نازل ہونے کی دھمکیوں کے جواب میں بھی قریش اکڑ جاتے اور کہتے کہ لاؤ اپنا عذاب! اسکا ذکر سنتے سنتے تو ہمارے کان پک گئے لیکن معلوم نہیں یہ بیڑا کہاں لنگر انداز ہے کہ ابھی تک اپنی منزل تک نہیں پہنچ پایا۔

دعوت کے میدان میں تبدیلی:

جوں جوں مکہ کے اندر دعوت پھیلنے کے امکانات کم ہونے لگے رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں تک اپنی بات پہنچانے میں زیادہ انہماک کا فیصلہ کیا جو حج وعمرہ کے موقع پر مکہ آتے تھے۔ حج کے موسم میں سارے جزیرہ

عرب سے لوگ حرم کعبہ میں عبادت کے لیے آتے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنے اپنے علاقہ کا سامان تجارت بھی فروخت کے لیے پیش کرتے اور یہ حاضری ایک عظیم میلے کا سماں پیدا کر دیتی۔ حج سے دو ماہ قبل عکاظ کا میلہ لگتا۔ وہ ختم ہوتا تو ایک مقام مجنہ کو اس کا مرکز بنا لیا جاتا اور عین حج سے قبل منیٰ اور عرفات کے درمیان ذوالمجاز کا میلہ لگتا۔ نبی ﷺ اپنی دعوت پھیلانے کے لیے ان تینوں مواقع سے بھی فائدہ اٹھایا کرتے۔ حج کے دنوں میں اور خاص قیام منیٰ کے ایام میں آپ ہر ہر خیمہ پر دستک دیتے، حجاج سے تعارف حاصل کرتے اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ مناسب موقع دیکھ کر چیدہ قبائل کا جوار بھی طلب کرتے لیکن اس میں کامیابی نہ ہوتی۔ قریش حسب معمول آپ کی دعوت کا توڑ کرنے کے لیے موجود ہوتے اور حجاج کو تلقین کرتے کہ اس دیوانے کی باتوں میں مت آنا۔ یہ تمہیں تمہارے باپ دادا کے طریقہ سے بھٹکا دے گا۔ اکثر قبائل تو حضورؐ کی بات سنتے ہی اس کا انکار کر دیتے۔ بعض اس میں اپنے مفادات کی روشنی میں غور کرتے اور کہتے کہ پہلے آپ کچھ کامیابیاں حاصل کریں اس کے بعد ہم اپنا رویہ متعین کریں گے۔ حج کا موسم ایسا ہوتا کہ جب قریش کے لیے حضورؐ کی جدوجہد پر پابندی عائد کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اس کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ تمام قبائل کو یہ علم ہو گیا کہ مکہ میں ایک قرشی نے نبی ہونے کا دعویٰ کر رکھا ہے لیکن خود قریش اس کی دعوت میں، جو خالص توحید کی دعوت ہے اور شرک کی کسی قسم کو برداشت نہیں کرتی، مزاحم ہیں۔ لہٰذا ان کے سوچنے والے افراد اسلام کی بنیادی تعلیم سے آشنا ہو گئے۔ بعد میں جب مسلمانوں کو کامیابیاں ملنی شروع ہوئیں تو ان افراد کے لیے اسلام میں داخل ہونا آسان ہو گیا۔

آخری انذار:

پیغمبر اور اس کے مخاطبین کے نقطہ ہائے نظر میں جب شدید بُعد واقع ہو جائے تو کہنے سننے کی کوئی اسکیم کامیاب نہیں ہوتی۔ ماضی میں اس طرح کی صورت حال میں اللہ کے رسولوں نے اپنی بے بسی کا اظہار کر دیا اور اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کے لیے فیصلہ کن عذاب کی درخواست کی۔ مثال کے طور پر حضرت نوح علیہ السلام کی الحاح وزاری کو دیکھیے:

قَالَ رَبِّ اِنِّی دَعَوْتُ قَوْمِی لَیْلًا وَّ نَهَارًا. فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَاءِیْ اِلَّا فِرَارًا. وَ اِنِّی کُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ

لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْا اَصَابِعَهُمْ فِيْ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا. ثُمَّ اِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا. ثُمَّ اِنِّي اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا. فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا. يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا. وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا. مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا.
(نوح ۷۱: ۵۔۱۳)

نوح نے اپنے رب سے دعا کی: اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو شب و روز پکارا لیکن میری پکار نے ان کے گریز ہی میں اضافہ کیا۔ اور میں نے جب جب ان کو توبہ کی دعوت دی کہ تو ان کو بخشے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنی چادریں اپنے اوپر لپیٹ لیں اور اپنی ضد پر اڑ گئے اور نہایت گھمنڈ کا اظہار کیا۔ پھر میں نے ان کو ڈنکے کی چوٹ پکارا، پھر میں نے ان کو کھلم کھلا بھی سمجھایا اور چپکے چپکے بھی۔ سو میں نے کہا: اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو، بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر اپنے ابر رحمت کے دونگڑے برسائے گا اور مال و اولاد سے تمہیں فروغ بخشے گا اور تمہارے واسطے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کرے گا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی عظمت کے ظہور کے متوقع نہیں ہو؟......

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا. وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا. وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا وَّ لَا يَغُوْثَ وَ يَعُوْقَ وَ نَسْرًا. وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا. مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا. وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا.

(نوح ۷۱: ۲۱۔۲۶)

نوح نے دعا کی: اے میرے رب! انہوں نے میری نافرمانی کی اور ان لوگوں کی پیروی کی جن کے مال اور جن کی اولاد نے ان کے خسارے ہی میں اضافہ کیا۔ اور انہوں نے بڑی بڑی چالیں چلیں اور کہا کہ ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو، اور ہرگز نہ چھوڑو ود کو، نہ سواع کو، اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو۔ اور انہوں نے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر ڈالا۔ اور اب تو ان گمراہوں کی گمراہی ہی میں اضافہ کر۔ وہ اپنے گناہوں کی پاداش میں غرق کیے گئے (پانی میں) پھر داخل کیے گئے آگ میں۔ پس اللہ کے مقابل میں انہوں نے کسی کو اپنا مددگار

نہیں پایا۔ اور نوح نے دعا کی کہ اے میرے رب! تو زمین پر ان کافروں میں سے ایک متنفس کو بھی نہ چھوڑ۔

یہی کیفیت نبی ﷺ اور آپ کی قوم کی بھی تھی۔ حضورؐ نے بھی دعوت کا ہر انداز اپنایا لیکن قریش نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور آپ کی کوئی بات سننے سے انکار کر دیا۔ آپ نے ڈنکے کی چوٹ بھی سمجھایا اور رازدارانہ بھی، لیکن انہوں نے کوئی بات مان کر نہ دی۔ قوم کے اندر عصبیتیں ابھاریں اور ان کو گمراہی کی راہ پر ڈالا۔ لہٰذا اب وقت آ گیا تھا کہ قریش کا قافیہ تنگ کیا جاتا۔ نبی ﷺ نے اس مرحلہ میں عذاب کے قریب ہونے کی خبر تو نہایت زوردار انداز میں دی لیکن قوم کے لیے عذاب کی بددعا نہیں فرمائی۔

قرآن مجید نے واشگاف الفاظ میں بار بار قریش پر اللہ کا احسان جتایا کہ اس نے بنی اسماعیل کو اپنے پیغام کے لیے چنا لیکن انہوں نے اس احسان کی قدر نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے عذاب نازل ہونے کے بارے میں اپنے قانون کو نہایت دوٹوک انداز میں واضح کیا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا. اِنِ اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ. وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا. وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا. (فاطر ۳۵:۴۲-۴۳)
>
> اور انہوں نے اللہ کی پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نذیر آیا تو وہ ہر امت سے زیادہ ہدایت اختیار کرنے والے بنیں گے۔ پس جب ان کے پاس ایک نذیر (یعنی رسول اللہ ﷺ) آیا تو اس چیز نے، زمین میں ان کے تکبر کے باعث، ان کی بیزاری اور ان کی بری چالوں ہی میں اضافہ کیا۔ اور بری چال تو اسی کو گھیرتی ہے جو بری چال چلتا ہے۔ پس یہ نہیں انتظار کر رہے ہیں مگر اسی سنت الٰہی کا جو اگلوں کے باب میں ظاہر ہوئی۔ تو تم سنت الٰہی میں نہ تو کوئی تبدیلی پاؤ گے اور نہ تم سنت الٰہی کو ٹلتے ہوئے ہی پاؤ گے۔

سنت الٰہی سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ قانون ہے جس کے تحت وہ اس قوم پر دنیا میں عذاب نازل کرتا ہے جو رسول کے اتمام حجت کے باوجود اس کو ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔ فرمایا کہ اب قریش بھی اس قانون کی زد میں آنے والے ہیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ. اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ. اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنْهَا. سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ. هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِىَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِىَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ. يَوْمَ يَاْتِىْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِىْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا. قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ.

(انعام۶:۱۵۶۔۱۵۹)

اور یہ کتاب (یعنی قرآن) ہے جو ہم نے اتاری ہے سراپا خیر و برکت۔ تو اس کی پیروی کرو اور ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ مبادا تم کہو کہ کتاب بس ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے (یعنی یہود و نصاریٰ) اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر رہے۔ یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ سو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح حجت اور ہدایت و رحمت آ گئی۔ تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائیں اور ان سے دوسروں کو پھیریں۔ جو لوگ ہماری آیات سے اعراض کر رہے ہیں ہم ان کو اس اعراض کی پاداش میں عنقریب نہایت برا عذاب دیں گے۔ وہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں، یا تیرا رب آئے، یا تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو۔ جس دن تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہوئی تو کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو یا اس نے اپنے ایمان میں نیکی نہ کمائی ہو۔ کہہ دو تم انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہی ہیں۔

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ. اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِىْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ. اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِىْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ. اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِىْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ.

(زمر۳۹:۵۵۔۵۸)

اور پیروی کرو اس بہترین چیز کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے، قبل اس سے کہ تم

پر اچانک عذاب آ پڑے اور تم کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ مبادا کوئی کہے کہ ہائے افسوس میری اس کوتاہی پر جو اللہ کے باب میں مجھ سے صادر ہوئی اور بے شک میں مذاق اڑانے والوں میں سے بنا رہا۔ یا کوئی یہ کہے کہ اگر اللہ مجھے ہدایت دیتا تو میں بھی ڈرنے والوں میں سے ہوتا۔ یا کوئی یہ کہے جب کہ عذاب کو دیکھے کہ کاش! مجھے دنیا میں پھر جانا ہو کہ میں خوب کاروں میں سے بن جاؤں۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اب قریش کے ایمان لانے کے لیے ٹھہرائی گئی مدت ختم ہونے کے قریب تھی۔ اس لیے ان کو مختلف اسالیب میں یہ بات سمجھائی گئی کہ اب وہ ایمان لانے میں مزید کوتاہی نہ کریں، ورنہ ان کو حسرت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اعلان براءت:

اللہ کے رسول اپنی قوم کے لیے بڑے دردمند ہوتے ہیں۔ قوم کی چیرہ دستیوں کے مقابلہ میں وہ بے حد صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان کو جلد بازی سے فیصلے کرنے سے روکا جاتا ہے تاکہ قوم کے اندر سرکش طبیعت کے لوگ کچھ بدلیں اور دین کی دعوت قبول کرلیں۔ جب ان کی طرف سے برابر سرکشی ہی کا اظہار ہوتا رہتا ہے اور یہ سرکشی آہستہ آہستہ پیغمبر کو قتل کرنے پر قوم کو آمادہ کر دیتی ہے تو رسول کو قوم سے اعلان براءت کرنے کا حکم ہوتا ہے جس کے بعد وہ قوم کو اس کے حال پر چھوڑ کر رخصت ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ عذاب اپنے وقت پر بروئے کار آتا ہے۔ قرآن مجید نے رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے قانون کو کئی مقامات پر واضح فرمایا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا. فَاَوْحٰى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ. وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ. ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَ خَافَ وَعِيْدِ. وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ. (ابراہیم ۱۴:۱۳-۱۵)

اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ یا تو ہم تمھیں اپنی سرزمین سے نکال کر رہیں گے یا تمھیں ہماری ملت میں پھر واپس آنا پڑے گا۔ تو ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں ہی کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تم کو زمین میں بسائیں گے۔ یہ ان کے لیے ہے جو میرے حضور پیشی سے ڈرے اور میری وعید

سے ڈرے۔ اورانہوں نے فیصلہ چاہا اور ہر سرکش ضدی نامراد ہوا۔

رسولوں کی اسی سنت کے مطابق قیامِ مکہ کے آخری سال میں آنحضرت ﷺ نے اللہ کے اذن سے قوم سے اعلان برأت کر دیا۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ زمر میں فرمایا:

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ. مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ. اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ. (زمر ۳۹:۳۹-۴۱)

کہہ دو کہ اے میری قوم کے لوگو! تم اپنے طریقہ پر کام کرو میں اپنے طریقہ پر کام کرتا رہوں گا۔ تو تم جلد جان لوگے کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اس کو رسوا کر دیتا ہے اور کس پر وہ عذاب نازل ہوتا ہے جو ٹک کر رہ جاتا ہے۔ ہم نے لوگوں کی ہدایت کے لیے تم پر کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تو جو ہدایت حاصل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا اور جو گمراہ ہوگا تو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر پڑے گا اور تم ان کے اوپر کوئی داروغہ نہیں مقرر کیے گئے ہو۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ. اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ. لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ. اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ. (شوریٰ ۴۲:۱۵)

پس تم اسی دین کی دعوت دو اور اسی پر جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے۔ اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو۔ اور اعلان کر دو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے یہ حکم ہے کہ میں تمہارے درمیان فیصلہ کر دوں۔ اللہ ہی ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہمارے درمیان کسی بحث کی ضرورت نہیں رہی۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ

إِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ. (یونس ۱۰:۱۰۴۔۱۰۶)

کہہ دو: اے لوگو! اگر میرے دین کے باب میں شک میں ہو تو سن لو کہ میں ان کو نہیں پوجتا جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بلکہ میں اس اللہ کو پوجتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں ایمان والوں میں سے بنوں، اور یہ کہ اپنا رخ یکسو ہو کر اطاعت کی طرف کرو اور ہرگز مشرکوں میں سے نہ بنو۔ اور اللہ کے سوا ان چیزوں کو نہ پکارو جو نہ تم کو نفع پہنچائیں نہ نقصان۔ سو اگر تم ایسا کرو گے تو بے شک تم ظالموں میں سے بن جاؤ گے۔

قُلْ يٰأَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ. لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ. وَلَآ أَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ أَعْبُدُ. وَلَآ أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ. وَلَآ أَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ أَعْبُدُ. لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ. (کافرون ۱۰۹:۱۔۶)

کہہ دو اے کافرو! نہ میں پوجوں گا جن چیزوں کو تم پوجتے ہو، اور نہ تم پوجنے کے جسے میں پوجتا ہوں۔ اور نہ میں پوجنے والا ہوں جن کو تم نے پوجا اور نہ تم پوجنے والے ہوئے جسے میں پوجتا آ رہا ہوں۔ تمہیں تمہارا دین اور مجھے میرا دین!

رسول کے اعلان براءت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے مخاطبوں پر اتمام حجت کر دیا، لہٰذا اب ان کو سمجھانے یا خبردار کرنے کا مرحلہ گزر چکا۔ قوم کے ساتھ اب کسی تعلق کا امکان باقی نہیں رہا اور ان سے اب کوئی امید وابستہ نہیں رہی۔ لہٰذا اب قوم کے لیے دو امکانات ہوتے ہیں۔ یا تو اس پر فوری عذاب آئے یا رسول ہجرت کر جائے تو قوم اس کی دعائے استغفار سے محروم ہو کر اس انجام کی طرف بڑھے جو خدا نے اس کے لیے لکھ دیا ہو۔

باب 22

بیعت عقبہ ثانیہ

نبوت کے تیرھویں سال اہل یثرب میں سے جو لوگ حج کے لیے مکہ آئے ان میں قبیلہ خزرج کے باسٹھ اور قبیلہ اوس کے گیارہ مسلمانوں کا ایک وفد شامل تھا۔ یہ تہتر اشخاص اور ان کے ہمراہ دو خواتین دعوت اسلام کے لیے سرزمین یثرب کی زرخیزی اور موزونیت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ ظاہر ہے کہ اسلام سے متاثر ہر شخص تو حج کے لیے مکہ نہیں آیا تھا۔ لہٰذا وفد کی یہ معقول تعداد اپنے پیچھے ہم خیال لوگوں کی کثیر تعداد میں موجودگی کا پتا دیتی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مکہ میں نبی ﷺ سے قریش کی مخاصمت اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی خبریں اہل یثرب تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ان کے اور حضورؐ کے درمیان واسطہ قدیم الاسلام صحابی مصعب بن عمیرؓ تھے جو اہل یثرب کو قرآن پڑھانے پر مامور کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات اور آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت اور دین سیکھنے کے لیے بھی اکا دکا لوگ یثرب سے مکہ آتے جاتے رہے، جیسا کہ ابن کثیر نے مسند احمد کے حوالہ سے لکھا ہے[1]۔ لہٰذا مکہ کے احوال اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کی مشکلات سے وہ بخوبی آگاہ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حضورؐ کو اپنے خاندان بنو ہاشم تک کا تحفظ بھی حاصل نہیں رہا اور آپ دوسروں کے جوار کی مدد سے مکہ میں رہ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یثرب میں باہم مشورہ کیا کہ رسول اللہؐ آخر کب تک مکہ میں بے یار و مددگار اور خوف و خطرہ کی حالت میں زندگی گزارتے رہیں گے۔ انہوں نے حضورؐ کو اپنی حفاظت میں لینے کا فیصلہ کیا۔ پچھتر افراد کے قافلہ کو اسلام کی دولت پہلے ہی نصیب ہو چکی تھی۔ یہ قبول اسلام کے لیے آنحضرتؐ سے ملنے نہیں گئے تھے بلکہ ملاقات کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضورؐ کو اپنے ہاں تشریف لانے کی پیشکش کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں قبول اسلام کے حوالہ سے وفد کی کوئی کارروائی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس یہ معلوم ہوتا ہے کہ منیٰ کے قیام کے دوران میں حضورؐ سے ملاقات کا وقت طے کیا گیا جسے صیغہ راز میں رکھا گیا۔ مزید احتیاط یہ بتائی گئی کہ رات کے پرسکون لمحات میں لوگ معین گھاٹی میں دو دو تین تین کی تعداد میں پہنچیں گے۔ اگر کوئی سو جائے یا پیچھے رہ جائے تو اس کو نظر انداز کر دیا جائے گا تاکہ قریش کو اس تمام کارروائی کی بھنک نہ پڑنے پائے۔

ابن ہشام کے مطابق عقبہ میں حضورؐ تشریف لائے تو آپ کے ہمراہ آپ کے چچا عباس بن عبدالمطلب تھے جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ انہوں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا 'اے گروہ خزرج! ہمارے اندر محمد (ﷺ) کا جو مقام ہے اس سے تم آگاہ ہو۔ ہم نے ان کو اپنی قوم سے بچائے رکھا ہے کہ جو لوگ ان سے مختلف رائے رکھتے ہیں وہ ان کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اب اگر وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں تو جو دعوت تم ان کو دے رہے ہو اس پر اگر پورے اترو اور ان کے مخالفین سے ان کو بچا سکو تب تو یہ بوجھ اٹھاؤ اور اگر یہ سمجھتے ہو کہ ان کے تمہارے پاس جانے کے بعد تم ان کا ساتھ چھوڑ دو گے تو اس معاملہ کو یہیں ختم کر دو، کیونکہ یہ اپنی قوم اور اپنے شہر میں قوت اور حفاظت سے ہیں'۔ اس پر وفد نے کہا کہ ہم نے آپ کی بات سن لی۔ یا رسول اللہ! آپ خود گفتگو فرمائیں اور اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے جو کچھ پسند فرماتے ہیں وہ اختیار کر لیں۔

ابن کثیرؒ نے امام احمد کے حوالہ سے جابرؓ کی روایت نقل کی ہے جس میں صرف اتنی بات ہے کہ اس موقع پر عباس موجود تھے اور جب حضورؐ بیعت لے رہے تھے تو انہوں نے آپ کا دست مبارک پکڑا ہوا تھا[2]۔ غور کیا جائے تو عباس بن عبدالمطلب کی موجودگی کو صحیح تسلیم کرنے میں بعض اشکالات ہیں۔ مثلاً حضورؐ کی بعثت سے لے کر اس واقعہ تک عباس کا کوئی کردار نظر نہیں آتا کہ کسی موقع پر انہوں نے بھتیجے کے لیے کسی غیرت کا مظاہرہ کیا ہو، جب کہ حضورؐ کے دوسرے چچا حضرت حمزہؓ نے غیرت ہی میں اسلام قبول کر لیا اور دشمنوں کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہے۔ عباس تو اس مجلس میں بھی شامل تھے جس میں قریش نے رسول اللہؐ کے قتل کے فیصلہ پر اتفاق کیا تھا۔ اس کے بعد جنگ بدر ہوئی تو نہ صرف یہ کہ عباس اس میں شریک ہوئے بلکہ پورے لشکر کو ایک روز کھانا کھلانے کا بندوبست بھی کیا۔ وہ نبی ﷺ کے ساتھ قریش کی تمام جنگوں میں شامل رہے اور عین فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ دوسرے، عباس اس وقت غیر مسلم تھے اور یہ بیعت نہایت رازدارانہ ہو رہی تھی۔ آخر ان کو ساتھ رکھنے میں کیا مصلحت تھی؟ اس کام کے لیے موزوں ترین آدمی حضرت حمزہؓ یا ابوبکر صدیقؓ ہو سکتے تھے جو حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کیے ہوئے تھے اور اسلام کے لیے وفادار تھے۔ تیسرے، عباس کا خطاب خزرج سے ہے جبکہ وفد میں شامل اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ تھے۔ اگر عباس تمام اہل یثرب کو خطاب کر رہے تھے تو اوس اور خزرج میں تفریق انہوں نے کیوں کی؟ چوتھے، یہ بات خلاف حقیقت تھی کہ بنوہاشم حضورؐ کو اس زمانہ میں تحفظ مہیا کر رہے تھے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ آنحضرتؐ کو اس دور میں بنوہاشم کا جوار بھی حاصل نہیں رہا تھا بلکہ آپ مطعم بن عدی کے جوار میں مکہ میں قیام پذیر تھے۔ پانچویں، تقریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہجرت کے تمام امور طے پا چکے ہوں اور نبی ﷺ یثرب

جانے پر آمادہ ہو چکے ہوں اور یہ تمام باتیں عباس کے علم میں رہی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی اہل یثرب صرف پیشکش کرنے آئے تھے۔ اس پر بحث بعد میں ہوئی اور حضورؐ نے گفتگو ضرور کی لیکن آخر تک حامی نہیں بھری اور نہ آپ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر ایسا کر سکتے تھے۔ پیغمبر ہجرت کا فیصلہ اللہ کے اذن کے بغیر نہیں کیا کرتا۔ اور نبی علیہ ﷺ کو تو یہ ہدایت بھی جاری کی جا چکی تھی کہ رب کے فیصلہ تک صبر سے انتظار کرنا اور مچھلی والے (حضرت یونس علیہ السلام) کی طرح جلد بازی نہ کرنا۔ ان تمام پہلوؤں سے یہ روایت مشتبہ نظر آتی ہے۔ عباس بن عبدالمطلب نہ بیعت عقبہ کے موقع پر موجود تھے اور نہ انہوں نے کوئی تقریر کی۔ اہل یثرب کے وفد میں ایک صاحب عباس بن عبادہؓ بھی تھے، ہو سکتا ہے یہ ان کی تقریر ہو لیکن غلطی سے اس کو عباس بن عبدالمطلب کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو۔ آگے ان عباس بن عبادہؓ کی تقریر کا ذکر آتا ہے اور وہ مضمون میں اس سے ملتی جلتی ہے۔ یہ عباس قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے اور تقریر میں ان کا خزرج کو خطاب کرنا سمجھ میں آتا ہے۔

بہر حال جب وفد کے ارکان نے رسول اللہؐ سے فرمائش کی کہ آپ خود گفتگو فرمائیں اور بتائیں کہ آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میں تم کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ آپ نے قرآن سنایا اور اسلام کے احکام کی ترغیب دی۔

جب وفد کے ارکان نے حضورؐ کو یثرب آنے کی پیشکش کی تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم میری اور میرے اہل کی اسی طرح حفاظت کرو جس طرح کی حفاظت اپنی بیویوں اور بیٹوں کی کرتے ہو تب میں اس پر تم سے بیعت لے سکتا ہوں۔ یہ موقع ایسا تھا جب دوسرے مہاجر مسلمانوں کا بھی تذکرہ کیا جاتا لیکن روایات اس سے خالی ہیں، حالانکہ انصار نے جس طرح ان کو خوش آمدید کہا وہ ان کے عقبہ ثانیہ کے وعدہ ہی کا ایفا معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا رسول تنہا ہجرت نہیں کرتا بلکہ اپنے تمام صاحب ایمان ساتھیوں کو بھی ساتھ لے کر دوسرے مقام پر منتقل ہوتا ہے۔ براء بن المعرورؓ نے حضورؐ کا ہاتھ تھام کر کہا یا رسول اللہ ہم جنگوں میں پلے بڑھے ہیں، تیر اندازی اور شمشیر زنی ہماری گھٹی میں ہے۔ ہم نے بڑوں سے یہ ہنر سیکھ رکھا ہے لہٰذا ہم آپ کی حفاظت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔

اس موقع پر اوس و خزرج کے یہود کے ساتھ تعلقات بھی زیر بحث آئے۔ ابوالہیثم بن التیہان نے بیان کیا، یا رسول اللہ! ہمارے درمیان اور یہود کے درمیان معاہدے ہیں۔ ہمیں یہ ختم کرنے ہوں گے اور یہود سے قطع تعلق کرنا ہوگا۔ اگر ہم ایسا کر گزریں، پھر اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا فرمائے تو اس بات کا امکان تو نہیں کہ آپ اپنی قوم کے پاس واپس آ جائیں اور ہمیں چھوڑ دیں۔ حضورؐ مسکرائے اور فرمایا، نہیں۔ یہ حلیفانہ معاہدہ ہوگا، خون

کا انتقام لینے یا خون معاف کرنے میں ہم ایک ہوں گے۔ ذمہ داری اکٹھی ہوگی۔ میں تم میں سے ہوں گا اور تم مجھ سے ہو گے۔ جس سے تمہاری لڑائی ہوگی میری بھی اس سے لڑائی ہوگی۔ جس سے تم صلح کرو گے میری بھی اس سے صلح ہوگی۔

اوس اور خزرج کے جن یہود کے ساتھ معاہدات تھے وہ تو بنونضیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع تھے۔ ان سے حلیفانہ معاہدات ختم کرنے پر وہ آمادہ ہو گئے۔ دوسرے یہود وہ تھے جن کا تعلق خود انہی قبائل اوس و خزرج سے تھا۔ یہ ان قبائل کا جزو تھے۔ رسول اللہؐ کا جواب جن الفاظ میں روایات میں نقل ہوا ہے اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اکٹھی ذمہ داری نبھانے کا حوالہ ان دوسرے یہود سے متعلق ہے۔ گویا ان یہود کے بارے میں پالیسی بھی زیر بحث آئی ہو گی اور ان کی جداگانہ حیثیت تسلیم کرنے کی بات ہوئی ہوگی جس پر آنحضرتؐ نے ان کو تسلی دی کہ ان کا شمار اوس و خزرج کے مسلمانوں ہی کے ساتھ ہوگا۔ رواتیوں میں تقریروں کے تمام نکات محفوظ نہیں رہ سکے۔

بنو سالم کے عباس بن عبادہ خزرجی نے اپنی تقریر میں اپنی قوم کو مستقبل کے خدشات سے نہایت دوٹوک انداز میں آگاہ کیا۔ انہوں نے کہا اے گروہ خزرج! جانتے ہو اس بیعت کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں کالے اور گورے ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ تمہیں جنگ کرنا ہوگی۔ اس کشمکش میں اگر تمہارے مال و متاع برباد ہو جائیں اور تمہارے اشراف قتل ہو جائیں تب بھی تم اپنے عہد کو نبھانے کی سکت رکھتے ہو تو یہ قدم اٹھاؤ اور یہ دنیا و آخرت میں تمہارے لیے بھلائی کا باعث ہوگا۔ لیکن اگر تم بعد میں اپنے مال کی بربادی کو مصیبت سمجھنے لگو اور اشراف کا قتل تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو اور آنحضرتؐ کا ساتھ چھوڑنے میں عافیت سمجھو تو بہتر ہوگا کہ آج ہی بیعت کا یہ قدم نہ اٹھاؤ کیونکہ ایسا کرنے میں دنیا اور آخرت دونوں میں رسوائی ہوگی۔

یثرب کے مختلف نمائندوں کی تقاریر اور نبی ﷺ سے وضاحت طلبی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اہل یثرب کی پیشکش کے نتائج و عواقب پر اچھی طرح بحث ہوئی اور وفد کے ارکان نے پورے شرح صدر کے ساتھ اس کو اپنے دل کی آواز قرار دیا۔ حضورؐ کے یثرب جانے کی صورت میں جنگوں کے امکانات بھی سامنے آئے اور اوس اور خزرج دونوں نے پورے عزم و جزم سے یہ عہد کیا کہ وہ حضورؐ کے دفاع میں اپنی جانیں لڑا دیں گے۔ اس موقع پر یہود کے ساتھ تعلقات و معاہدات بھی زیر بحث آئے۔ حضورؐ نے قول دیا کہ ان کا احترام کیا جائے گا اور ان کے بارے میں جو فیصلہ اوس اور خزرج کریں گے وہ آپ کو قبول ہوگا۔ آپ نے اہل یثرب کا ساتھ نہ چھوڑنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ آخر انہوں نے معاملہ حضورؐ پر چھوڑا۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ خوشی ہو یا رنج، راحت ہو یا کلفت، افلاس ہو یا تونگری

ہر حال میں میری اطاعت کرو اور جو کہوں وہ سنو۔ وفد نے کہا اگر ہم ایسا کریں تو ہم کو اس کا کیا صلہ ملے گا۔ آپ نے فرمایا جنت۔ وفد نے کہا، ہمیں یہ شرط منظور ہے۔ بیعت کے لیے ہاتھ بڑھائیے۔ آپ نے ان سے سمع وطاعت کی بیعت لی۔ لیکن ہجرت کا حتمی وعدہ نہیں کیا۔ اس بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد حضورؐ نے اہل یثرب کے امور کو منضبط کرنے کے لیے بارہ افراد کو قوم کا نقیب مقرر فرمایا۔ ان کی ذمہ داری اپنی اپنی قوم کو دین کے حقوق سے آگاہ کرنے، مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح کرنے اور عہد کی پاسداری کی یاد دہانی کرانے کی تھی۔ اس بیعت میں اہل یثرب نے نبی ﷺ کو اپنا دینی ہی نہیں بلکہ سیاسی سربراہ بھی تسلیم کر لیا اور آپ کی اطاعت کا عہد کر کے واپس لوٹے۔

بارہ نقیبوں میں نو قبیلہ خزرج میں سے تھے اور تین اوس میں سے۔ ان کے نام اس طرح ہیں:

قبیلہ خزرج: ۱۔ اسعد بن زرارہؓ ۲۔ سعد بن الربیعؓ ۳۔ عبداللہ بن رواحہؓ
۴۔ رافع بن مالکؓ ۵۔ ابو جابر عبداللہ بن عمروؓ ۶۔ براء بن المعرورؓ
۷۔ سعد بن عبادہؓ ۸۔ منذر بن عمروؓ ۹۔ عبادہ بن الصامتؓ

قبیلہ اوس: ۱۔ اسید بن حضیرؓ ۲۔ سعد بن خیثمہؓ ۳۔ رفاعہ بن عبدالمنذرؓ

بیعت کے بعد تمام لوگ اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔ قریش کو کسی طرح بیعت کی بھنک پڑ گئی تو انہوں نے اوس وخزرج کے خیموں سے معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ جب یہ لوگ یثرب واپس جا رہے تھے تو قریش نے سعد بن عبادہؓ کو پکڑ لیا اور مکہ لے آئے۔ ان کو ڈرانے دھمکانے کے بعد چھوڑا اور ان پر یہ بات واضح کر دی کہ اگر وہ محمد کو پناہ دیں گے تو قریش کی دشمنی مول لیں گے۔ اس کے نتائج پر ان کی نگاہ ہونی چاہیے۔

اس بیعت میں نبی ﷺ اور اہل ایمان کے لیے اطمینان کا ایک بہت بڑا پہلو واضح تھا۔ ایک سرزمین ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار تھی۔ وہاں کے بہت سے باشندے ان کے ہم مسلک وہم مذہب تھے۔ ان سب کی سوچ اور منزل ایک تھی۔ نبی ﷺ کو بظاہر اس طرح کی مخالفت کا سامنا نہ تھا جس طرح کی مخالفت کا تجربہ آپ کو مکہ میں ہو رہا تھا۔ اس لیے دین کی دعوت کے پہنچنے کے آثار وہاں بالکل واضح تھے۔

یثرب کی بستی میں حضورؐ کے ننھیال بھی آباد تھے۔ آپ کو خواب میں جس دار الہجرت کا مشاہدہ کرایا گیا تھا کہ یہ سرزمین شورزدہ اور دو سیاہ پتھریلے قطعات کے درمیان ہوگی اور اس میں کھجور کے درخت بکثرت ہوں گے،

اس کی شرائط یمامہ اور ہجر کی نسبت یہاں زیادہ پوری ہو رہی تھیں۔ لہٰذا بیعت عقبہ میں مکہ کے متبادل مقام کے طور پر یثرب کے انتخاب نے حضورؐ کے دل پر سے بہت سا بوجھ ہلکا کر دیا۔

اہل ایمان کو ہجرت کی اجازت:

بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد قریش نے مسلمانوں پر عرصہ حیات مزید تنگ کر دیا اور وہ پریشان ہو ہو کر رسول اللہؐ کے پاس آتے اور مکہ چھوڑنے کی اجازت طلب کرتے۔ آپ ان کو صبر کی تلقین فرماتے اور اللہ کی طرف سے اجازت ملنے تک انتظار کرنے کی ہدایت فرماتے۔ بالآخر ایک دن حضورؐ خوش خوش صحابہؓ سے ملے اور بتایا کہ میں نے دارالہجرت کے بارے میں جو خواب دیکھا تھا اس کے متعلق اب مجھے متعین طور پر بتایا گیا ہے کہ یہ سرزمین یثرب کی ہے۔ لہٰذا اہل ایمان ہجرت کی تیاری کریں اور جیسے جیسے کوئی انتظام کر پائے وہ ہجرت کر کے اوس و خزرج کے مسلمان بھائیوں سے جا ملے جو ان کے لیے چشم براہ ہوں گے۔ اس ہدایت کے مطابق مسلمان اکا دکا بھی اور گروہوں کی شکل میں بھی یثرب جانے لگے۔ بالعموم قریش نے ہجرت میں رکاوٹ نہیں پیدا کی اور لوگوں کو جانے دیا تا کہ مکہ میں سے وہ کانٹا نکل جائے جو ان کو تکلیف دے رہا تھا۔ کہیں کہیں ایسے واقعات بھی ہوئے کہ اہل مکہ نے غیرت کے جذبہ کے تحت بعض لوگوں کو تنگ کیا۔

سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق یثرب جانے والے پہلے آدمی ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسدؓ مخزومی تھے۔ یہ وہی بطل جلیل ہیں جو پہلے حبشہ کو ہجرت کر گئے تھے۔ وہاں سے واپس مکہ آئے تو اپنے قبیلہ نے قبول نہ کیا۔ لہٰذا جوار کے متلاشی ہوئے تو ابو طالب نے حامی بھری۔ ابولہب کو بھائی پر غصہ آیا کہ انہوں نے دوسرے خاندان کے ایک مسلمان کو کیوں بنو ہاشم کی پناہ میں لے لیا۔ انہوں نے کہا یہ میرا بھانجا ہے۔ ابو طالب کے انتقال کے بعد ابولہب سردار قبیلہ بنا تو حالات میں تغیر رونما ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابوسلمہؓ کے لیے جوار کا مسئلہ پھر سے پیدا ہو گیا۔ جونہی پہلی بیعت عقبہ میں ان کو معلوم ہوا کہ یثرب میں مسلمانوں کے لیے حالات سازگار ہیں، ابوسلمہ نے وہاں جانے کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ سلمہ اور اس کی والدہ ام سلمہؓ کو سوار کر کے نکلے تو بیوی کے خاندان بنو مغیرہ نے راستہ روک لیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنی بیٹی کو نہیں جانے دیں گے۔ بنو مخزوم کو اس واقعہ کا پتا چلا تو وہ بھی آ گئے اور کہا کہ ہم بچے کو تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ چنانچہ ام سلمہؓ کے شوہر یثرب روانہ ہو گئے، بچہ بنو مخزوم لے گئے اور ام

سلمہؓ تنہا رہ گئیں۔ وہ شوہر اور بچے کے فراق میں روتیں اور شوہر کی واپسی کی راہ تکتیں۔ اسی کیفیت میں ایک سال بیت گیا تو ان کے کسی عزیز کو ان کی حالت پر ترس آیا۔ اس نے دونوں خاندانوں کو سمجھا بجھا کر بچہ بھی ماں کے حوالہ کیا اور شہر چھوڑنے کی اجازت بھی دلوادی۔ یہ اونٹ پر سوار ہوئیں اور تن تنہا یثرب کو روانہ ہو گئیں۔ راستہ میں عثمان بن طلحہ ملے۔ انہوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ تم اکیلی سفر کر رہی ہو۔ چنانچہ وہ ساتھ ہو لیے اور یثرب میں ابو سلمہؓ کے پاس ان کو پہنچا کر واپس مکہ گئے۔

حضرت عمرؓ نے ابوجہل کے ماں جائے بھائی عیاش بن ابی ربیعہؓ اور ہشام بن ابی العاصؓ کے ساتھ ہجرت کا پروگرام طے کیا۔ ہشامؓ کو اہل خاندان نے گھر میں بند کر دیا اور وہ موعود مقام پر نہ پہنچ سکے۔ حضرت عمرؓ اور عیاشؓ نے اکٹھے سفر کیا اور یثرب پہنچ گئے۔ ابوجہل اور اس کا بھائی حارث بن ہشام پیچھے جا پہنچے اور عیاشؓ سے کہا کہ تمہاری والدہ نے قسم کھائی ہے کہ وہ سر میں کنگھی نہیں کرے گی اور مستقلاً دھوپ میں بیٹھے گی جب تک عیاش واپس نہیں آتے۔ عیاشؓ کے دل میں ماں کی محبت کا جذبہ موجزن ہو گیا اور وہ بھائیوں کے ہمراہ مکہ جانے پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہ تمہارے لیے ایک جال بچھایا گیا ہے لیکن وہ قائل نہ ہوئے۔ راستہ میں ان کے بھائیوں نے ان کی مشکیں کس دیں اور مکہ لے جا کر ایک مکان میں بند کر دیا۔ ابوجہل نے اہل مکہ سے کہا کہ جو سلوک ہم نے اپنے احمق بھائی کے ساتھ کیا ہے تم لوگ وہی سلوک اپنے احمق گھر والوں سے کرو۔

رسول اللہؐ کی ہجرت کے بعد آپ نے ان دونوں ساتھیوں کا معاملہ صحابہ کے سامنے رکھا کہ کون ان کو قید سے چھڑا کر لائے گا۔ اس پر ولید بن ولید بن مغیرہؓ نے اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ مکہ گئے۔ دونوں ساتھیوں کا سراغ لگایا اور موقع ملتے ہی ان کو قید سے نکال لائے۔

صہیب بن سنانؓ ہجرت کرنے لگے تو انکا راستہ روک لیا گیا۔ کفار نے کہا: تم مکہ آئے تھے تو خالی ہاتھ تھے، اب جا رہے ہو تو اتنا مال تمہارے پاس ہے۔ ہم تمہیں جانے نہیں دیں گے۔ انہوں نے کہا اگر میں سارا مال تمہارے حوالے کر دوں تب؟ انہوں نے کہا پھر تم جا سکتے ہو۔ چنانچہ انہوں نے مال ان کے حوالہ کر دیا اور خالی ہاتھ ہجرت کی۔

اس پورے عرصہ میں رسول اللہ ﷺ مکہ ہی میں رہے۔ آپ برابر دعا مانگتے:

رَبِّ اَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَ اَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِّي مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا۔

(بنی اسرائیل ۱۷:۸۰)

اے میرے رب! مجھے داخل کر عزت کا داخل کرنا اور مجھے نکال عزت کا نکالنا اور مجھے خاص اپنے پاس سے مددگار قوت نصیب کر۔

حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کی اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا، ابھی ٹھہرو، مجھے بھی ہجرت کا اذن مل جانے دو۔ انہوں نے پوچھا کیا آپ میری معیت میں سفر کریں گے؟ آپ نے فرمایا، ہاں۔ چنانچہ وہ سفر کی تیاریوں میں لگ گئے۔

حوالہ جات

1۔ سیرۃ النبیؐ۔ ابن کثیر۔ ج ۱، ص ۴۳۲
2۔ ایضاً، ص ۴۳۳

باب 23

ہجرت مدینہ

رسول اللہؐ کے قتل کا منصوبہ:

نئی صورت حال میں قریش کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اس سے نمٹنے کے لیے انہوں نے سنجیدگی سے اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مسلمانوں کے مکہ سے نکلنے پر بالعموم اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ لیکن قریش نبی ﷺ کے بارے میں کسی فیصلہ کن اقدام کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ دارالندوہ میں تمام سرداروں کی مجلس مشاورت منعقد ہوئی۔ تین متبادل اقدامات پر غور رہوا۔ ایک یہ کہ محمد کو قید کر لیا جائے تا کہ کسی کے ساتھ ان کا رابطہ ممکن نہ ہو سکے۔ دوسرا یہ کہ ان کو مکہ سے نکل جانے کو کہا جائے تا کہ یہ اپنی جڑ بنیاد سے کٹ جائیں اور ان کی دعوت کا خاتمہ ہو جائے۔ تیسرا یہ کہ ان کو قتل کر دیا جائے لیکن قتل کرنے کا انداز ایسا ہو کہ کسی ایک قبیلہ کو اس کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جا سکے بلکہ قتل کی ذمہ داری تقسیم ہو جائے۔ پہلی دو صورتوں کی مخالفت ہوئی کیونکہ قید کی صورت میں حضورؐ کے ساتھی ان کو چھڑانے کی کوشش کر سکتے تھے۔ اس طرح شہر میں خانہ جنگی کا امکان پیدا ہو جاتا۔ جلاوطنی کی صورت میں آپ کے مکہ سے باہر سرگرم عمل ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس طرح وہ پھر سے قوت مجتمع کر سکتے جو قریش کے لیے مصیبت بن سکتی تھی۔ لہٰذا صرف تیسری صورت قابل عمل نظر آئی۔ اس کی مناسب شکل یہ تجویز ہوئی کہ قریش کے ہر خانوادہ کا ایک ایک فرد ایک مخصوص رات میں مسلح ہو کر رسول اللہؐ کے گھر کا محاصرہ کر لے۔ جونہی آپ باہر نکلیں تمام افراد یکبارگی آپ پر حملہ کر کے کام تمام کر دیں۔ چونکہ اس طرح پورے قریش ایک طرف ہو جائیں گے، بنو ہاشم خون بہا یا قصاص کا مطالبہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔ اس منصوبہ پر عمل درآمد کے لیے تمام اہم فیصلے کر لیے گئے۔ جب کوئی قوم پیغمبر کے قتل کا منصوبہ بنانے لگتی ہے تو رسول اور اہل ایمان کی ہجرت کی تمام شرائط پوری ہو جاتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ رسول کو گزند نہیں پہنچنے دیتا، کفار کے منصوبوں کو خاک میں ملا کر اس کو مخالف ماحول سے نکال لیتا ہے۔ کفار کے حصہ میں نامرادی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ جب دارالندوہ کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ

کو ہجرت کا اذن دے دیا۔ آپ عین دوپہر کے وقت ابوبکرؓ کے گھر گئے اور ان کو اس کی اطلاع دی تاکہ وہ تمام امور طے کر لیں۔ سواری کے دو اونٹ انہوں نے پہلے سے خرید لیے تھے اور اپنے ایک ہم راز عبداللہ بن اریقط اللیثی کو بطور گائیڈ ساتھ چلنے کو کہہ رکھا تھا۔ اصحاب کہف کے واقعہ سے یہ سبق مل چکا تھا کہ اہل ایمان نے کفار کے جور و ستم سے بچنے کے لیے ایک غار میں پناہ لی تھی۔ اس وقت عارضی روپوشی کی جو ضرورت درپیش تھی اس کے لیے غار ثور کا انتخاب کر لیا گیا تھا جو مکہ سے جانب جنوب چند میل کے فاصلہ پر واقع جبل ثور کی عین چوٹی پر ہے جہاں آسانی سے پہنچنا بھی محال ہے۔ علیٰ ہذا القیاس غار ثور میں قیام کے دوران ضروریات کی فراہمی اور قریش کے اقدامات کی اطلاع کے لیے بھی انتظامات کر لیے گئے۔

سفر ہجرت:

روایات کے مطابق جس دن قریش نے حملہ کرنے کا پروگرام بنایا اس کی شب آنحضرتؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ آپ نے حضرت علیؓ کو رات آپ کے گھر میں قیام کرنے اور اگلے دن حضورؐ کے معاملات سمیٹنے کی ہدایت فرمائی۔ جب رات تاریک ہو گئی تو آپ نے مٹھی بھر خاک محاصرہ کرنے والوں پر پھینکی اور خود گھر سے نکل گئے۔ ان کفار کو آپ کے نکل جانے کی اطلاع صبح کو ہوئی۔ حضورؐ تو رات کی تاریکی میں غار ثور میں منتقل ہو گئے اور قریش نے آپ کی گرفتاری کے لیے یثرب کی جانب گھوڑے دوڑا دیے۔ جب کوئی سراغ نہ ملا تو مکہ کے گرد و نواح میں آپ کی تلاش شروع ہوئی یہاں تک کہ کچھ لوگ غار ثور کی طرف بھی بڑھنے لگے۔ حضرت ابوبکرؓ گھبرا گئے کہ یہ لوگ ہمیں آ لیں گے تو رسول اللہؐ نے ان کو تسلی دی کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ کفار نے غار کا جائزہ لیا لیکن اس کے دشوار گزار ہونے اور اس میں کسی کے موجود ہونے کے آثار نہ پا کر واپس مڑ گئے۔ ابوبکرؓ کہا کرتے تھے کہ اگر یہ لوگ غار میں دیکھتے تو ہمیں پا سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے فرزند عبداللہ شہر کی صورت حال سے ان کو مطلع کیا کرتے تھے۔ جب تین دن گزر گئے اور قریش تھک ہار کر بیٹھ گئے تو پروگرام کے مطابق نبی ﷺ، ابوبکرؓ، ان کے غلام عامر بن فہیرہؓ اور گائیڈ عبداللہ بن اریقط جبل ثور کے دامن میں اونٹوں پر سوار ہو کر ایک غیر معروف راستہ سے یثرب کو روانہ ہو گئے۔

قریش نے مکہ میں یہ اعلان کیا کہ جو شخص محمد (ﷺ) کا پتا دے گا اس کو سو اونٹ انعام میں دیے جائیں

گے۔ اس لالچ میں کئی لوگوں نے صحرا کی خاک چھانی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ بنو مدلج کے سراقہ بن مالک بن جعشم نے دو اونٹوں کو جاتے ہوئے دیکھا تو ان کا پیچھا کیا۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور اپنے سوار سمیت گر پڑا۔ سراقہ اٹھا، پھر سے گھوڑے پر سوار ہو کر اونٹوں کا پیچھا کیا۔ جب قریب پہنچا تو اس کا گھوڑا ٹخنوں تک زمین میں دھنس گیا۔ اس نے سمجھا کہ میری یہ حرکت اللہ کو ناپسند ہے۔ چنانچہ رسول اللہؐ سے معافی کا خواستگار ہوا اور مکہ کو لوٹ گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کو پہچاننے والے لوگ ملک میں بڑی تعداد میں تھے جبکہ رسول اللہ ﷺ سے کم ہی لوگ واقف تھے۔ جب پہچان کے لوگ ملتے تو حضرت ابوبکر کا حال پوچھتے اور یہ سوال بھی کر دیتے کہ آپ کے ہمراہ یہ اونٹ پر کون سوار ہیں۔ وہ جواب دیتے کہ یہ صاحب مجھے راستہ دکھاتے ہیں۔ اس طرح وہ بات بھی سچی کرتے کیونکہ وہ حضورؐ ہی سے رہنمائی پاتے تھے اور حضورؐ کی شناخت کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔

اسحاق النبی علوی کی تحقیق کے مطابق رسول اللہؐ کا یہ مختصر قافلہ ۵ ربیع الاول بروز پیر مکہ سے روانہ ہوا اور ۱۲ ربیع الاول بروز پیر یثرب کی مضافاتی بستی قبا میں پہنچا۔ یہ ۲۲ نومبر ۶۲۲ء کی تاریخ تھی[1] قبا میں اس روز جشن کا سماں تھا۔ اہل یثرب آنحضرتؐ کے لیے اپنے دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے تھے۔ وہ روزانہ کئی کئی گھنٹے مکہ کی راہ میں ٹکٹکی باندھے بیٹھے رہا کرتے کہ حضورؐ کی سواری کب پہنچتی ہے۔ بڑوں، چھوٹوں، عورتوں اور مردوں سب نے آپ کا شایان شان استقبال کرنے کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ کسی شخص نے ٹیلے پر سے دیکھا کہ دور کچھ مسافر آ رہے ہیں تو وہ بلند آواز سے پکارا، لوگو، تم جن کا انتظار کر رہے تھے وہ آ گئے۔ لوگ خوشی سے بھاگ کر استقبال کے لیے آ گے گئے اور اپنے جلو میں حضورؐ کو قبا لے آئے۔ آپ نے بنو عمرو بن عوف کے سردار کلثوم بن ہدمؓ کے ہاں قیام فرمایا۔

قبا میں عارضی قیام:

روایات میں آیا ہے کہ قبا پہنچنے کے فوراً بعد حضورؐ ایک کھجور کے درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے اور ابوبکرؓ لوگوں سے مخاطب ہوتے اور ان کو ہدایات دیتے رہے۔ دونوں کے کپڑے سفید اجلے تھے اور عمروں میں بھی زیادہ فرق نہ تھا۔ لہٰذا ان لوگوں نے، جن کی ملاقات پہلے رسول اللہؐ سے نہیں ہوئی تھی، ابوبکرؓ ہی کو رسول سمجھا۔ بعد میں جب آنحضرتؐ پر دھوپ پڑی تو ابوبکرؓ نے حضورؐ پر کپڑے سے سایہ کیا۔ تب لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

قبا میں قیام کے دوران نبی ﷺ نے کلثومؓ بن ہدم کی ایک افتادہ زمین کو، جس پر کھجوریں سکھائی جاتی تھیں، تعمیر مسجد کے لیے منتخب کیا اور مسجد قبا کی بنیاد رکھی۔ اسی مسجد کی شان میں قرآن میں کہا گیا کہ یہ وہ مسجد ہے جس کی بنیاد پہلے دن ہی سے تقویٰ پر رکھی گئی۔ یہی اس لائق ہے کہ منافقین کی بنائی ہوئی مسجد کے بجائے اس میں نبی ﷺ نماز ادا کریں۔ منافقین کی مسجد ۹ ھ میں سازش کے تحت تعمیر ہوئی تھی۔ نبی ﷺ نے اس کو منہدم کروادیا۔

یثرب کے یہود بھی اپنے شہر میں آنے والی اس تبدیلی سے غافل تھے اور نہ بے تعلق۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب قبا پہنچے تو جہاں اوس وخزرج کے خاندانوں کے وفود نے آپ کا استقبال کیا وہیں یہودی زعماء بھی ملنے کے لیے پہنچے۔ متعین طور پر روایات میں بنونضیر کے سردار حیی ابن اخطب اور اس کے بھائی ابویاسر کا ذکر آیا ہے کہ وہ ملنے والوں میں شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کی مجلس میں بیٹھ کر انہیں کچھ باتیں کہنے سننے کا موقع ملا ہوگا۔ اب تک وہ جو کچھ غائبانہ سنتے رہے ہوں گے اس کو انہوں نے ملاقات کے دوران جانچنے کی کوشش کی ہوگی۔ قبا سے یثرب کو واپس جاتے ہوئے دونوں بھائیوں نے، جو یہود کے بڑے سرداروں میں شامل تھے، حضورؐ کی شخصیت پر جو تبصرہ کیا وہ روایات میں محفوظ ہے۔ ابویاسر نے جب بھائی کی رائے اور آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں دریافت کیا تو حیی نے کہا کہ یہ رسول تو وہی ہیں جن کا تذکرہ ہماری کتابوں میں ہوا ہے، لیکن ہم انہیں تسلیم نہیں کر سکتے۔ ہمیں ان کی مخالفت کرنا ہوگی۔ یہی وہ مجمل فیصلہ ہے جس کی روشنی میں آگے چل کر یہود کے رویہ کی تشکیل ہوئی اور قرآن پاک نے بتایا کہ یہ لوگ آنحضرتؐ کو اسی طرح پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں لیکن ان پر ایمان نہیں لانا چاہتے۔

تاہم حق شناس یہود بھی تھے جنہوں نے حضورؐ کو دیکھ کر آپ سے عقیدت کا اظہار کیا۔ یہود کے ایک بڑے عالم عبداللہ بن سلام فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو جہاں دوسرے لوگ آپ کی زیارت کے لیے دوڑے، میں بھی اپنا کام چھوڑ کر بھاگا۔ جب میں نے حضورؐ کا چہرہ مبارک دیکھا تو میں نے کہا یہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہوسکتا۔ سب سے پہلا کلام، جو میں نے آپ کی زبان مبارک سے سنا، یہ تھا کہ اے لوگو! اسلام کی اشاعت کرو، غریبوں کو کھانا کھلایا کرو، قرابت داروں کے ساتھ احسان کیا کرو، اس وقت نماز پڑھا کرو جب سب لوگ سوتے ہوں تب تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے[2]۔

قبا میں دو ہفتہ قیام کے بعد جمعہ کے روز نبی ﷺ یثرب کی مرکزی بستی کی طرف روانہ ہوئے اور راستہ

میں بنوسالم کے محلہ میں جمعہ کی نماز پڑھائی۔ اوس وخزرج کے مختلف قبائل نے درخواست کی کہ آپ مستقل قیام کے لیے ان کو شرف بخشیں لیکن حضورؐ نے ایسی پیشکشوں کو قبول کرنے سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میری اونٹنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے۔ یہ جہاں بیٹھ جائے گی وہیں میرا قیام ہوگا۔ یوں بھی دیکھا جائے تو یثرب کے معروضی حالات میں کئی پیشکشوں کی موجودگی میں کسی ایک کے حق میں فیصلہ کر دینا، دوسرے لوگوں کے دلوں میں تکدر اور وسوسے پیدا کرنے کا باعث ہوسکتا تھا۔ آنحضرتؐ کے اس جواب سے آپ کی غیر جانبداری قائم رہی۔ اونٹنی بنو مالک بن النجار کے ہاں جا کر بیٹھ گئی۔ آپ نے قریبی مکان میں، جو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی ملکیت تھا، رہائش اختیار کی۔ حضرت ابوایوبؓ کے ہاں آپ کا قیام تقریباً سات ماہ رہا۔

یثرب میں رسول اللہ ﷺ کی آمد کے بعد اس شہر کو لوگ مدینۃ الرسول (رسول کا شہر) کہنے لگے جو بعد میں صرف مدینہ رہ گیا اور آج تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

ہجرت اور نقل مکانی میں فرق:

اس زمانے میں اہل مغرب نے اسلام کا حلیہ بگاڑنے اور اس کی تعلیمات سے نفرت پیدا کرنے کی جو کوششیں کی ہیں ان کے تحت جس طرح جہاد کا نام دہشت گردی رکھ دیا ہے اسی طرح ہجرت کو بھی اس طرح کی نقل مکانی قرار دیا ہے جس طرح کی نقل مکانی لوگ تعلیم حاصل کرنے یا کسب معاش کے لیے کرتے ہیں۔ وہ اپنی بات کو معتبر بنانے کے لیے مسلمان محققین کو اچھے معاوضے دے کر ان کے منہ سے اپنی بات کہلواتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے یہ نقل مکانی اپنی خوشی سے اپنی سہولت کے لیے اختیار کی۔ لیکن یہ بات جاننی چاہیے کہ ہجرت اس نوع کی نقل مکانی ہرگز نہیں تھی کہ نبی ﷺ اپنی دعوت کا مرکز اپنی مرضی اور خوشی سے مکہ سے مدینہ کو منتقل فرما رہے تھے جہاں کی آب و ہوا زیادہ صحت بخش تھی یا اس شہر کو مکہ سے زیادہ مرکزیت حاصل تھی اور یہاں آپ کی دعوت کے پھیلنے کے امکانات زیادہ تھے، یا آپ کے ساتھی زیادہ خوشحال زندگی کی جستجو میں وہاں جانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ہجرت کوئی آسان بازی بھی نہ تھی جو نئے مذہب کے پیروؤں نے کھیلنے میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔ اہل مغرب حضورؐ کی ہجرت کی تحقیر کے لیے اس کو Flight یعنی 'فرار' سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ گویا پیغمبرؐ حالات سے دلبرداشتہ ہو کر اور حالات کے مقابلہ کی ہمت نہ رکھتے ہوئے موقع سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مذکورہ تمام تعبیرات میں سے ہجرت کی

کوئی بھی تعبیر درست نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہجرت کرنا دین پر استقامت کی خاطر اپنے کنبہ، قبیلہ، مادر وطن اور املاک کو تج دینے اور اپنے آپ کو نہایت پرخطر حالات کے حوالے کر دینے کے ہم معنی تھا۔ مدینہ میں مہاجرین کو زندگی کا آغاز نئے سرے سے کرنا پڑا۔ یہ ہجرت عارضی بھی نہ تھی ورنہ فتح مکہ کے بعد مسلمان وہاں اپنی املاک پر قبضہ کر کے وہیں رہائش رکھ لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ صحابہؓ نہایت دلگیر ہو جاتے جو اتفاق سے مکہ جا کر بیمار پڑ جاتے۔ اس کی مثال سعد بن ابی وقاصؓ ہیں جو مکہ میں بیمار پڑ گئے۔ نبی ﷺ ان کی عیادت کو تشریف لے گئے تو انہوں نے اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا کہ میری موت مکہ ہی میں واقع نہ ہو جائے۔ حضورؐ نے ان کو تسلی دی کہ تم یہاں پیچھے نہیں رہو گے بلکہ اپنے دارالہجرت میں واپس جاؤ گے۔ وہاں ایسے عمل کرو گے جن سے تمہارے درجات بلند ہوں گے۔ کتنی قومیں ہوں گی جو تم سے نفع پائیں گی اور کتنی دوسری قومیں تمہارے ہاتھوں دکھ اٹھائیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں سعدؓ کے ہاتھوں ایرانی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ پس ہجرت ایک اعلیٰ دینی کام تھا جو مہاجرین کے درجات بلند کرنے کا باعث ہوا۔

یوں بھی دیکھا جائے تو حقیقت یہ تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ روسائے مکہ نبی ﷺ کی دعوت کے اس قدر مخالف ہو گئے تھے کہ اس کا نام سننا بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ وہ مسلمان ہو جانے والے ہر شخص پر شدید ظلم و ستم روا رکھتے۔ خدا کا نام لینے پر انتہائی وحشیانہ سزائیں دیتے جن سے معاشرے کے غلام تو کیا، آزاد خاندانی لوگ بھی محفوظ نہ تھے۔ آنے والا ہر دن مسلمانوں کی آزمائشوں میں مزید اضافہ کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ نبی ﷺ نے ابتدا میں مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دیا جہاں کے حکمران کی عدل گستری کی شہرت تھی اور آخری مرحلہ میں یثرب (مدینہ) کو دارالہجرت قرار دیا جہاں کے دو بڑے قبیلوں -- اوس اور خزرج -- میں معتد بہ تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے اہل ایمان کو اپنے شہر میں خوش آمدید کہنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

قرآن مجید نے ہجرت کو جن الفاظ سے تعبیر کیا ہے ان میں کفار کی تعدی اور اہل اسلام کو زبردستی بے گھر کرنے اور وطن چھوڑنے پر مجبور کرنے کا بطور خاص ذکر ہے:

اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ. (حج ۲۲:۴۰)

وہ اپنے گھروں سے ناحق محض اس جرم میں نکالے گئے کہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ اللہ ہمارا رب ہے۔

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ …… (آل عمران ۳:۱۹)

سو جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے اور میری راہ میں ستائے گئے۔

یہ سلوک معاشرے کے بہترین آدمیوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ قریش کے ایک اہم فرد اور مکہ کے متمول لوگوں میں سے تھے۔ وہ بھی حالات سے گھبرا کر حبشہ کو روانہ ہوئے۔ راستے میں ان کی ملاقات اپنے ایک دوست ابن الدغنہ سے ہوئی جو ہجرت کا سبب معلوم کر کے ان کو اپنے ہمراہ واپس مکہ لایا اور اعلان کیا کہ میں ابوبکر کا ذمہ اٹھاتا ہوں، اب وہ میری پناہ میں ہوں گے۔ مغربی دانشوروں کے بقول اگر قریش بڑے روادار تھے تو وہ اس طرح کی آیات نازل ہونے پر احتجاج کر سکتے تھے کہ یہ محض الزام ہے۔ ہم تو کسی مسلمان کو نشانہ ستم نہیں بنا رہے ہیں۔ بلکہ یہ لوگ ہمارے درمیان امن اور چین سے زندگی گزار رہے ہیں۔

جو لوگ بروقت ہجرت نہ کر سکے ان کے اوپر مشرکین نے عرصہ حیات اس قدر تنگ کر رکھا تھا کہ وہ یہ دعا کرتے کہ:

> رَبَّنَـا اَخـرِجنَـا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيرًا.
> (نساء۴:۷۵)
> اے ہمارے رب، ہمیں اس ظالم باشندوں کی بستی سے نکال اور ہمارے لیے اپنے پاس سے ہمدرد پیدا کر اور ہمارے لیے اپنے پاس سے مددگار کھڑے کر۔

اس دعا کے الفاظ ہی سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ ظالم کفار نے اسلام کے نام لیواؤں پر خود ان کے وطن کی زمین اس قدر تنگ کر دی تھی کہ اس کے در و دیوار ان کو کاٹے کھائے جا رہے تھے۔ وہ اس سے اتنے بیزار تھے کہ اپنی بستی ان کو ظالموں کی بستی نظر آتی تھی اور حالات اتنے مایوس کن تھے کہ مظلوم مسلمانوں کو بظاہر نجات کی کوئی راہ سجھائی نہ دے رہی تھی۔ انہیں سارا بھروسہ صرف اللہ پر تھا کہ وہی غیب سے مدد کا کوئی دروازہ کھولے تو کھولے۔ قرآن مجید کے الفاظ میں یہ دعا مانگنے والے صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں اور بچے بھی تھے جن کو ظلم کا نشانہ بنانے سے انسان کا اجتماعی ضمیر ہمیشہ نفرت کرتا رہا ہے۔

اکثر مہاجرین کے لیے یہ بات عملاً ناممکن تھی کہ وہ اپنے قبیلہ کی اشیر باد لے کر اپنی دولت لیے ہوئے وطن چھوڑیں۔ وہ اپنی تمام املاک چھوڑ کر نہایت غربت اور بے سروسامانی کے عالم میں مدینہ پہنچے۔ ان کی آبادکاری آسان نہ تھی۔ یہ تو انصار کا ایثار و قربانی کا جذبہ تھا جس نے مہاجرین کی ایک کثیر تعداد کو اپنی شفقت میں لے لیا اور

ان کو گھر کا سا آرام بہم پہنچایا۔ ورنہ مشرکین تو مسلمانوں کو اس حال میں گھروں سے نکالتے کہ ہجرت کر کے آنے والوں کے پاس صرف اخلاص وایمان ہی کی متاع محفوظ ہوتی۔ یہ اس ہجرت کی ایک جھلک ہے جس کو ہمارے دشمن ایک ایسی نقل مکانی کا نام دیتے ہیں جو خود مسلمانوں نے اپنی سہولت کے لیے اختیار کر لی۔

خود نبی ﷺ کی ذات کو نقصان پہنچانے کے لیے قریش نے جو سازشیں کیں ان کے مقاصد قرآن کے الفاظ میں لِيُثْبِتُوكَ اَوْ يَقْتُلُوكَ اَوْ يُخْرِجُوكَ (تمہیں قید کر لیں یا قتل کر دیں یا شہر سے نکال باہر کریں) تھے۔ دارالندوہ میں بحث کے بعد جس تجویز پر اتفاق رائے پایا گیا وہ قتل کی تجویز تھی۔ چنانچہ اسی پر عمل درآمد کے لیے آنحضرت ﷺ کی خوابگاہ کا محاصرہ کیا گیا اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو بحفاظت وہاں سے نکال لیا تو حضورؐ کے سر کی قیمت لگا کر ہر طرف خونخوار سواروں کو دوڑایا گیا۔ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں یثرب پہنچ گئے ورنہ قریش نے تو اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ حضورؐ نے مکہ برضا ورغبت نہیں چھوڑا بلکہ آپ کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ آپؐ نے تو فتح مکہ کے دن بھی بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا ''اے مکہ، تو کتنا پاکیزہ اور مجھے کتنا محبوب ہے۔ اگر میری قوم نے مجھے یہاں سے نکال نہ دیا ہوتا تو میں تیرے سوا کسی دوسری جگہ سکونت اختیار نہ کرتا''۔ اس جملے سے بھی حضورؐ کی ہجرت کے اسباب واضح ہو رہے ہیں۔ جبکہ اہل مغرب کے مستشرقین کے نزدیک یہ راہ فرار تھی جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے پسند کی اور اس میں قریش کا کوئی قصور نہ تھا۔ معلوم نہیں اہل تحقیق تعصب میں عدل وانصاف کی رائے دینے سے کیوں کتراتے ہیں۔

وہ قریش جنہوں نے حق کی مخالفت میں یہ سرگرمی دکھائی تھی یکا یک اتنے رحم دل نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ نچلے بیٹھ جاتے، مدینہ میں اسلام کے جمتے ہوئے قدموں کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیتے اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرتے۔ انہوں نے یثرب کے سردار عبداللہ بن ابی کو ایک دھمکی آمیز خط لکھا کہ ''تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو پناہ دی ہے۔ ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم خود اس کے ساتھ جنگ کرو یا اس کو نکال باہر کرو ورنہ ہم اپنی پوری قوت کے ساتھ تم پر چڑھائی کریں گے۔ تمہارے قابل جنگ مردوں کو قتل کریں گے اور تمہاری عورتوں کو اپنے لیے حلال کر لیں گے''۔ مستشرقین کا معیار تحقیق یہ ہے کہ ان کے نزدیک جن قریش نے یہ مکتوب لکھا ان کے اندر مسلمانوں کی ہجرت کے بعد ان کے لیے کوئی وجہ مخاصمت موجود نہ تھی اور ہر زیادتی یا جنگوں کا سلسلہ چلانے کے ذمہ دار

صرف مسلمان تھے۔

ہجرت کے بعد قریش پر عذاب کیوں نہ آیا؟

ہجرت کا سبب تو کفار کا مسلمانوں کے ساتھ عناد اور ان کی حق دشمنی ہوتی ہے لیکن اس کے نتائج ظاہر ہونے کے لیے اللہ کا ایک قانون موجود ہے جو ہمارے اہل تحقیق کی نظروں سے بالعموم اوجھل رہتا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، اصحاب مدین، قوم لوط، آل فرعون وغیرہ سب نے اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی۔ جب ان کے تمام باصلاحیت لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو رسولوں کے ہمراہ اہل ایمان نے ہجرت کی اور کوئی صاحب ایمان پیچھے نہیں رہا۔ اس کے بعد کفر پر قائم رہنے والوں کو اللہ کے عذاب نے آ لیا جس کے نتیجہ میں رسولوں کے مکذبین کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔

حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول تھے۔ آپؐ کی بعثت خاص بنی اسماعیل کی طرف ہوئی تھی اور قریش آپ کے اولین مخاطب تھے۔ آپ کی تیرہ سالہ تبلیغ کے نتیجہ میں اہل مکہ کی ایک معتد بہ تعداد مسلمان ہوگئی لیکن یہ تبلیغ قریشی سرداروں کو راہ راست پر نہ لاسکی۔ وہ نہ صرف اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے بلکہ اپنے زور واثر کو انہوں نے اسلام لانے والوں پر ظلم وستم ڈھانے میں استعمال کیا جس کے بعد اہل ایمان کے لیے ہجرت ناگزیر ہوگئی۔ اللہ کے مذکورہ بالا قانون کے تحت اس کے بعد اہل مکہ پر عذاب نازل ہونا چاہیے تھا لیکن ہمیں یہ عذاب نازل ہوتا ہوا کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ قریش کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی وہ سنت بدل گئی ہو جو سابق رسولوں کی قوموں کے معاملہ میں ظاہر ہوئی البتہ اگر ان پر عذاب نازل نہیں ہوا تو اس کے خاص اسباب ہیں جن کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

ہجرت مدینہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ ایک طرف قریش نے اہل ایمان کو شہر سے نکالنے میں خاص سرگرمی دکھائی لیکن دوسری طرف ان کو زچ کرنے اور دکھ دینے کی غرض سے ان کے بعض اعزہ کو مکہ میں روک بھی لیا۔ مثال کے طور پر ابھی اوپر سورہ نساء آیت ۷۵ کا حوالہ دیا گیا ہے کہ مشرکین کے درمیان پھنسے ہوئے لوگ دعائیں کرتے کہ اللہ ان کو ظالموں کی بستی سے نکلنے کا کوئی وسیلہ پیدا کر دے۔ خود نبی ﷺ کی بڑی بیٹی حضرت زینبؓ کو ہجرت نہیں کرنے دی گئی۔ کئی سرداروں نے مسلمانوں کے علانیہ مدینہ روانہ ہونے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور بعد میں ان کو چوری چھپے مکہ سے نکلنا پڑا۔ ابوجہل کے سوتیلے بھائی حضرت عیاشؓ بن ابی ربیعہ ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے تھے کہ

ابوجہل ان کو ورغلا کر واپس مکہ لے آیا اور ان کو ایک غیر آباد گھر میں قید کر دیا۔

ہجرت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہجرت کا حکم اگرچہ دے دیا گیا لیکن مکہ میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو دل سے اسلام کو صحیح دین مانتے تھے، وہ حضورؐ کی دعوت سے متاثر تھے لیکن مشکلات کے باعث ابھی ہجرت کا حوصلہ نہ کر سکتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ بعد میں مدینہ پہنچے۔ مثلاً شوال سن ا ھ میں قریش نے ایک لشکر جحفہ کی جانب بھیجا تو صحابہؓ کی ایک پارٹی بھی حضرت عبیدہ بن الحارثؓ کے تحت وہاں آئی ہوئی تھی۔ قریش کے لشکر میں سے حضرت مقداد بن عمروؓ اور حضرت عتبہ بن غزوانؓ نے موقع غنیمت جانا اور مسلمانوں سے جا ملے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں در پردہ مسلمان ہو چکے تھے لیکن ہجرت نہیں کر پائے تھے۔ سریہ عبداللہ بن جحشؓ کی مہم میں مکہ کے دو آدمی گرفتار کر کے مدینہ لائے گئے تو ان میں سے حضرت حکمؓ بن کیسان نے اسلام قبول کر لیا جو ظاہر کرتا ہے کہ وہ دل سے اس دین کی حقانیت کے پہلے سے قائل ہو چکے تھے اور اب ان کو اعلان کا مناسب موقع ملا تھا۔ خود میدان بدر میں جب حضورؐ نے قریش کے لشکر پر نظر ڈالی تو آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ میں نے ان میں سے بعض چہروں سے یہ پہچانا ہے کہ یہ لوگ مجبور کر کے ہمارے مقابلہ میں لائے گئے ہیں۔ بعد کے دور میں بھی اہل مکہ برابر مسلمان ہو ہو کر مدینہ آتے اور اسلام کی قوت بڑھانے کا ذریعہ بنتے رہے۔ ان اشارات سے معلوم ہوا کہ اہل مکہ میں ابھی صلاحیت ایمان موجود تھی۔ یہ ان کے سرداروں کا بہیمانہ سلوک تھا جو لوگوں کے قبول اسلام میں مانع تھا اور جس نے اہل ایمان کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے فوراً بعد اگر اہل مکہ پر وہی عذاب آ جاتا جو سابق رسولوں کی قوموں پر آیا تھا تو بے شمار مسلمان اور ایمان کی صلاحیت رکھنے والے کفار بھی اس کا لقمہ بن جاتے۔ یہ صورت حال سنت الٰہی کے خلاف ہوتی۔

ہجرت کا تیسرا پہلو یہ تھا کہ نئی جگہ پر مسلمانوں کی تمام تر قوت کو مجتمع ہونے کا موقع ملا اور اس علاقے کے لوگ حضورؐ کی دعوت کے معاملہ میں زیادہ آزادی سے رائے قائم کرنے اور قبول کرنے کی صورت میں اس کا ساتھ دینے کے قابل تھے۔ ان سازگار حالات میں اسلام کی دعوت کے زیادہ تیزی سے پھیلنے کے امکانات روشن تھے اور جلد ہی مسلمانوں کی سیاسی پوزیشن مستحکم ہوگئی۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کے ایک ایسی قوت بننے کا امکان پیدا ہو گیا جو قریش کے ساتھ ٹکرا کر ان کے سر غرور کو کچل سکے اور ان کو اس انجام سے دوچار کر سکے جس کے وہ مستحق تھے۔

یہ تھے وہ عوامل جن کے باعث تکذیب رسول کے باوجود قریش کو اس نوع کا عذاب نہیں دیا گیا جو سابقہ

امتوں کو دیا گیا تھا بلکہ اس کی شکل یہ اختیار کی گئی کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کو دین کی نصرت کے لیے قتال کا حکم دیا گیا اوران پر یہ بات واضح کردی گئی کہ یہ قتال اس وقت تک جاری رکھا جائے گا جب تک دین اسلام عرب کے تمام ادیان پر غالب نہیں آجاتا۔ اس قتال میں اللہ تعالیٰ کی نصرت ومعیت کا خاص طور پر وعدہ فرمایا گیا۔قتال کے ذریعے عذاب کی یہ شکل قریش کے متکبرین اور متمردین کا قلع قمع کرنے والی اوراپنے اندر دوسرے مخالفین کے لیے تنبیہ اور عبرت کا سامان رکھنے والی تھی۔

قتال کی اجازت:

ہجرت سے قبل جب اہل ایمان کفار کے مظالم سے تنگ آ کر رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کرتے کہ ہم اپنے دشمنوں سے لڑ کر کیوں نہ اپنے حقوق حاصل کرلیں جو انہوں نے سلب کر رکھے ہیں، تو آپ ان کو صبر کی تلقین فرماتے۔ ہجرت کی اجازت ملتے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قتال کی راہ کھول دی گئی۔ فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا. إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ. أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا. وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ نِ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ. وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا. وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ. إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ. الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ. وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ.
(حج ۲۲:۳۸-۴۱)

بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدافعت کرے گا جو ایمان لائے۔ اللہ ہرگز بدعہدوں اور ناشکروں کو پسند نہیں کرتا۔ جن سے جنگ کی جائے ان کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی بوجہ اس کے کہ ان پر ظلم ہوا اور بے شک اللہ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے۔ جو مظلوم اپنے گھروں سے بےقصور محض اس جرم پر نکالے گئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ ڈھائے جا چکے ہوتے۔ بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کے لیے اٹھیں گے۔ بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔ یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

ان آیات میں جہاں قتال کی اجازت دی گئی اور اس کی مصلحت واضح کی گئی وہیں یہ اشارہ بھی دے دیا گیا

کہ اہل ایمان کو علاقہ میں اقتدار حاصل ہوگا۔ ان کے اہم فرائض میں نماز کا اہتمام کرنا، زکوٰۃ کا نظام قائم کرنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بندوبست کرنا ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فوری طور پر نماز با جماعت کا اہتمام کیا، اگرچہ اس کے لیے ابھی نہ مسجد تعمیر ہوئی تھی اور نہ کسی معقول جگہ کا بندوبست ہوسکا تھا۔ آپ کسی بھی کھلی جگہ پر، جو کسی بھی مصرف میں لائی جاتی رہی ہوتی، نماز ادا کرتے اور آپ کی اقتدا میں دوسرے مسلمان بھی نماز پڑھتے۔ جوں جوں اقتدار مستحکم ہوتا گیا آپ نے دوسرے احکام کو بھی باقاعدہ شکل دے دی جو مذکورہ بالا آیات میں بیان ہوئے ہیں۔ جہاں تک قتال کی اجازت کا تعلق ہے تو جنگ خود اختیار کرنے کی چیز نہیں بلکہ حالات اس کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ البتہ یہ واضح ہوگیا کہ اگر صورت حال ایسی پیدا ہوجائے جس میں جنگ ناگزیر ہوجائے تو دین اسلام اس میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔

حوالہ جات

۱۔ سیرت نبوی توقیت کی روشنی میں۔ اسحاق النبی علوی

۲۔ الطبقات الکبریٰ۔ ابن سعد۔ ج ۱، ص ۱۵۹

حصہ چہارم

نبوت کا مدنی دور

باب 24

مدینہ میں ابتدائی مصروفیات

مدینہ پہنچ کر قیام کا مسئلہ حل ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ نے زید بن حارثہؓ کو اور ابوبکر صدیقؓ نے اپنے بیٹے عبداللہؓ کو مکہ روانہ کیا کہ وہ اہل خانہ کو لے آئیں۔ ام المومنین سودہؓ حضورؐ کی صاحبزادیوں ام کلثومؓ اور فاطمہؓ کو لے کر آئیں اور عبداللہؓ اپنی والدہ اور بہنوں کو لائے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ بھائی کے ہمراہ آئیں۔ زینبؓ کو ان کے شوہر ابوالعاص بن ربیع نے روک لیا اور ہجرت کی اجازت نہیں دی۔

مسجد نبوی کی تعمیر:

رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی بنو مالک بن النجار کی زمین پر جا کر بیٹھی تھی۔ یہ ایک کشادہ میدان تھا جس میں چند پرانی قبریں اور کچھ درخت کھجور کے تھے۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ملکیت ہے، میں اسے خریدنا چاہتا ہوں۔ بتایا گیا کہ یہ قطعہ دو یتیم بچوں سہل اور سہیل کا ہے۔ ان کو اور ان کے ولی کو بلوایا گیا تو سب نے بلا قیمت زمین دینے کی پیشکش کی جسے حضورؐ نے قبول نہیں فرمایا بلکہ قیمت ادا کر کے زمین خرید لی گئی۔ آپ نے اس کو ہموار کرایا اور اس کے اوپر مسجد کی تعمیر شروع کروائی۔ آپ خود اور دوسرے مسلمان بڑے دینی جذبہ سے تعمیر میں حصہ لیتے رہے۔ آنحضرتؐ کام کے دوران یہ کلمات ادا فرماتے:

اللّٰھُمَّ لَا خَیرَ اِلَّا خَیرُ الأخِرَۃ فَاغفِرِ الأنصَار والمُھَاجِرَۃ

اے اللہ! آخرت کی بھلائی کے سوا کوئی بھلائی نہیں لہٰذا تو انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرمانا

مسجد کچی اینٹوں سے تعمیر ہوئی۔ چھت ڈالنے کے لیے جو ستون کھڑے کیے گئے وہ کھجور کے تنوں پر مشتمل تھے اور چھت کے لیے کھجور کی ٹہنیاں اور پتے استعمال کیے گئے تھے۔ اس کے مشرق کی جانب چھوٹے چھوٹے کمرے بنائے گئے جن میں حضورؐ کی رہائش تھی۔ مسجد کے فرش پر کنکریاں بچھا دی گئی تھیں۔ آنے والے دور میں یہی سادہ سی مسجد تمام دینی سرگرمیوں کا مرکز بننے والی تھی۔ اسی میں نمازیں ہوتیں، یہیں لوگ آ کر حضورؐ سے سوالات

کرتے، اسلام قبول کرتے اور دین سیکھتے۔ یہیں قبائل کے وفود حضورؐ سے مذاکرات کرتے۔ کوئی بھی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تو لوگوں کے جمع ہونے کا اعلان کیا جاتا۔ جب وہ جمع ہو جاتے تو ملی اہمیت کے بڑے فیصلے یہیں ہوتے۔

ابتدا میں کوئی منبر نہ تھا۔ حضورؐ کھجور کے ایک تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر خطبہ دیتے۔ بعد میں ایک صحابیہ نے اپنے بڑھئی غلام سے منبر بنوا کر مسجد میں رکھوایا۔ شروع شروع میں نماز کے لیے لوگوں کو بلانے کا بھی انتظام نہ تھا۔ چونکہ مسلمانوں کے لیے مسجد میں پانچ اوقات میں حاضر ہونا پڑتا اس لیے اس پر غور ہوا کہ لوگوں کو جمع کرنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ لوگوں کا ذہن یہود و نصاریٰ کے اختیار کردہ طریقوں، یعنی ناقوس یا گھنٹیاں بجانے کی طرف جاتا لیکن اس پر اطمینان نہ ہوتا۔ روایات کے مطابق ایک صحابی عبداللہ بن زیدؓ انصاری یا ان کے علاوہ حضرت عمرؓ نے بھی خواب میں اذان کے کلمات سنے اور نبی ﷺ سے ان کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا 'ان شاء اللہ یہ سچا خواب ہے'۔ آپؐ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ پانچوں اوقات میں وہ کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر انہی الفاظ میں اذان دیا کریں۔

رسول اللہ ﷺ قبا پہنچے تھے تو وہاں بنو عمرو بن عوف میں مقیم ہوتے ہی مسجد قبا کی بنا ڈالی۔ پھر مدینہ تشریف لائے تو یہاں بھی پہلا کام یہی کیا کہ مسجد نبوی تعمیر کروائی۔ اس سے مسلمان معاشرہ میں مسجد کی ضرورت و اہمیت روشن ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام بندے کو ایک طرف اللہ رب العزت سے اور دوسری طرف معاشرہ کے افراد سے جوڑنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اسلامی شریعت کے دو بنیادی احکام، اقامت صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی ادائیگی، ہیں۔ اقامت صلوٰۃ میں مسجد کو بے حد اہم مقام حاصل ہے۔ یہ جگہ اللہ کے ذکر، دینی تعلیم و تذکیر، دعوت دین، اور بندوں کے ساتھ وابستگی کے مقاصد کو بدرجہ اولیٰ پورا کرتی ہے۔ اسی لیے حضورؐ نے پہلا کام تعمیر مسجد کا کیا۔ حضورؐ کی متابعت میں بعد کے زمانوں میں بھی امت نئے شہر بساتی تو اس میں مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی۔

حضرت عائشہؓ کی رخصتی:

حضرت عائشہؓ سے حضورؐ کا نکاح مکہ میں ہو چکا تھا۔ ان کے مدینہ آ جانے کے بعد بھی جب کئی ماہ گزر گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ سے رخصتی نہ لینے کا سبب دریافت کیا۔ حضورؐ نے معذرت کی کہ میرے پاس ابھی دینے دلانے کے لیے وسائل نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ کے لیے کچھ رقم بطور قرض مہیا کی گئی تو حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہجرت کے بعد ماہ شوال میں عمل میں آئی۔ مسجد کے ساتھ تعمیر کردہ ایک حجرہ میں ان کو اتارا گیا جبکہ دوسرے حجرہ میں حضرت سودہؓ مقیم تھیں۔

نئے ماحول سے شناسائی:

علاقہ اور اس کے باشندوں سے واقفیت حاصل کرنے کا کام رسول اللہؐ کے لیے سرفہرست تھا۔ یہ کام نہایت وسیع الاطراف تھا اور اس کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز یا ملتوی کرنا حضورؐ کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے ان پارٹیوں کا تذکرہ کافی ہے جو مدینہ یا اس کے اطراف میں موجود تھیں:

۱۔ **مسلمان انصار**: بہت سے لوگ اوس اور خزرج قبائل میں سے ایمان لا چکے تھے۔ اگرچہ مصعب بن عمیرؓ کی محنت سے وہ اسلام سے بخوبی آشنا ہو چکے تھے تاہم رسول اللہؐ کے ساتھ رہنے اور تربیت حاصل کرنے کی تمنا بھی ان میں تھی اور اسکی ضرورت بھی نہایت واضح تھی۔

۲۔ **مہاجرین**: بہت سے مہاجرین مدینہ پہنچ چکے تھے اور ابھی ان کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ ان میں سے بعض تو سروسامان اور اندوختہ ساتھ لاتے لیکن دوسرے بالکل لٹے پٹے بھی آتے۔ ان سب کی آباد کاری نہایت مشکل کام تھا۔

۳۔ **نسلی یہود**: تین یہودی قبائل مدینہ کے مضافات میں اپنی الگ بستیوں میں رہتے تھے۔ ان بستیوں میں ان کی عبادت گاہیں بھی تھیں اور مدرسے بھی۔ ان کا زور واثر پورے علاقہ میں محسوس کیا جاتا تھا۔ اہل کتاب ہونے کے باعث قرآن کے مخاطب وہ بھی تھے۔ ہجرت سے قبل تو وہ بالواسطہ مخاطب تھے لیکن اب نبی ﷺ ان کے پڑوس میں مقیم ہو چکے تھے لہذا اب وہ بلاواسطہ دین کی دعوت کے مخاطب تھے۔ ان سے راہ ورسم رکھنا ضروری ہو چکا تھا۔

۴۔ **اوس و خزرج کے یہود**: اوس وخزرج مشرک قبائل تھے لیکن ان کے بعض لوگوں نے یہودیت اختیار کر لی تھی۔ گویا ان قبائل کے افراد مشرک بھی تھے، یہودی بھی اور مسلمان بھی۔ ان سب کے ساتھ معاملہ ان کے دینی پس منظر ہی میں ہو سکتا تھا جس کے لیے ان سب سے واقفیت ضروری تھی۔

۵۔ **مدینہ کے اطراف کے قبائل**: مدینہ کے اطراف میں جو قبائل آباد تھے ان کے روابط پہلے سے اوس وخزرج کے ساتھ تھے۔ ان سب قبائل سے رابطہ دینی کے علاوہ سیاسی ضرورت بھی تھی۔ قریش نے خزرج کو جو دھمکیاں دی تھیں ان کے باعث ضروری ہو چکا تھا کہ نبی ﷺ ان قبائل کے سرداروں سے رابطہ رکھیں اور ممکن ہو تو ان سے معاہدات کریں۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ نے ہر محاذ پر کام کیا اور قلیل عرصہ میں اس علاقہ اور اس کے حالات سے شناسائی حاصل کر لی اور آئندہ تمام اقدامات اسی واقفیت کی روشنی میں کیے۔ فوری طور پر جو کام حضورؐ نے کیے وہ دو ہیں۔ یہ دونوں کام نہایت بروقت اور دوررس نتائج کے حامل تھے۔ پہلا کام مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات یعنی

بھائی چارے کا تعلق قائم کرنے کا تھا اور دوسرا مختلف قبائل کے حقوق اور ذمہ داریوں کے تعین کے لیے ایک تحریری معاہدہ کرنے کا، جسے عام طور پر ''میثاق مدینہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔

مواخات:

اس وقت تک مدینہ کے دونوں قبیلوں، اوس اور خزرج، کے بکثرت گھرانے مسلمان ہو چکے تھے اور خاص بات یہ تھی کہ ان کے سردار اور با اثر لوگ دین اسلام کے خادم کے طور پر نمایاں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ دوسری طرف مہاجرین کی ایک بڑی تعداد مدینہ پہنچ چکی تھی۔ چونکہ ان کی آمد کا سلسلہ جاری تھا اس لیے ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ہاں باہمی حمایت و نصرت کی بنیاد خاندانی و قبائلی عصبیت پر رکھی گئی تھی۔ مہاجرین اپنے خاندانوں سے کٹ چکے تھے اور نئے ماحول میں انہیں کوئی تحفظ حاصل نہ تھا۔ قرآن مجید نے اسلامی معاشرہ کو منظم کرنے کے لیے نئی اساسات فراہم کیں اور مہاجرین اور انصار کے درمیان ایمان، اسلام اور ہجرت و جہاد کی بنیاد پر رشتہ ولایت قائم کیا۔ چنانچہ سورہ انفال میں فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ. (انفال ۸:۷۲)

وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی، یہی لوگ باہم دگر ایک دوسرے کے ولی ہیں۔

ان اساسات پر نبی ﷺ نے مہاجرین و انصار کو ایک رشتہ میں جس طرح پرو دیا وہ تاریخ انسانی کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے اور مواخات کے نام سے معروف ہے۔

اس دور کی بستیوں میں یہ ممکن نہیں تھا کہ بڑی تعداد میں خالی مکانات میسر ہوں جن میں ہجرت کر کے آنے والوں کو اتارا جا سکے۔ ان لوگوں کو جو پہلے ہی بڑے دگرگوں حالات کا مقابلہ کر کے دین کی خاطر وطن چھوڑ کر چلے آئے تھے، ایک اجنبی ماحول میں بے یار و مددگار چھوڑنا کسی طرح مناسب نہ تھا لیکن وسائل کی کمی اس بات میں مانع تھی کہ فوراً نئی بستیاں ان کے لیے تعمیر کر دی جائیں۔ لہٰذا مسئلہ کے حل کے لیے نبی ﷺ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہر مہاجر کو کسی باحیثیت انصاری کا بھائی بنا دیا کہ وہ اس کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے میں مدد دے اور اس کی پشت پناہی کرے۔ قبائلی نظام میں یہ طریقہ اختیار کرنا بھی ممکن تھا کہ سردار قبیلہ کو مہاجرین کی ایک خاص تعداد کے قیام و طعام کا ذمہ دار بنا دیا جاتا اور وہ اپنی صوابدید پر جیسے چاہتا ان کے ساتھ معاملہ کرتا لیکن آنحضرتؐ کا اختیار

کردہ طریقہ بے مثال اور نہایت پُر حکمت تھا۔ آپ نے مہاجرین کو اوس اور خزرج کی مختلف شاخوں میں پھیلا دیا۔ مواخات کی اس اسکیم کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے اکابر مہاجرین کے انصاری بھائیوں کی فہرست کا جائزہ لینا کافی ہے جو تاریخ نے محفوظ رکھی ہے۔

مہاجر	انصاری	قبیلہ
ابوبکر صدیق	خارجہ بن زہیر	خزرج۔ بنو حارث
عمر بن الخطاب	عتبان بن مالک	خزرج۔ بنو سالم
عثمان بن عفان	اوس بن ثابت	خزرج۔ بنو نجار
ابوعبیدہ بن الجراح	سعد بن معاذ	اوس۔ بنو عبدالاشہل
زبیر بن العوام	سلمہ بن سلامہ	اوس۔ بنو عبدالاشہل
عبدالرحمٰن بن عوف	سعد بن الربیع	خزرج۔ بنو حارث
زید بن حارثہ	اسید بن حضیر	اوس۔ بنو عبدالاشہل
حمزہ بن عبدالمطلب	زید بن ثابت	خزرج۔ بنو نجار
مصعب بن عمیر	ابوایوب	خزرج۔ بنو نجار
طلحہ بن عبیداللہ	کعب بن مالک	خزرج۔ بنو سلمہ
ابوحذیفہ بن عتبہ	عباد بن بشر	اوس۔ بنو عبدالاشہل
بلال بن رباح	ابورویحہ	بنو خثعم
ابوذر غفاری	منذر بن عمرو	خزرج۔ بنو ساعدہ
سلمان الفارسی	ابوالدرداء	خزرج۔ بنو حارث
حاطب بن ابی بلتعہ	عویمر بن ساعدہ	خزرج۔ بنو عمرو بن عوف

رضوان اللہ علیہم اجمعین

اہل تحقیق نے رجال کی کتابوں کی مدد سے پچاس یا اس سے بھی زیادہ مہاجرین کے انصاری بھائیوں کے نام جمع کر لیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نام اس سے کہیں زیادہ ہوں گے لیکن ان کا ریکارڈ نہیں رکھا گیا اور نہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت تھی۔ یہ کام ہجرت کے فوراً بعد ہی نہیں ہوا بلکہ جوں جوں لوگ ہجرت کر کے آتے گئے ان کو

اس وضع کردہ نظام سے متمتع ہونے کا موقع دیا گیا۔ چنانچہ معاویہ بن ابی سفیانؓ کی مواخات حتات بن یزیدؓ سے اس وقت قائم کی گئی جب وہ صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔ ہجرت کا سلسلہ فتح مکہ پر موقوف کر دیا گیا۔ اس موقع پر جن لوگوں نے مدینہ کو ہجرت کی اجازت طلب کی تو حضورؐ نے فرمایا **لا هجرة بعدالفتح**۔ فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں ہے۔ لہذا مواخات کی آخری حد فتح مکہ کو ماننا چاہیے۔

دین کی نصرت وحمایت کے اس کام میں انصار کس قدر دل و جان کے ساتھ شریک ہوئے اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے ساتھ اس وقت پیش آیا جب ان کو سعد بن الربیعؓ کے ہاں بھائی بنا کر بھیجا گیا۔ سعدؓ نے پیش کش کی کہ میں اپنی جائیداد، زمین اور مال کو دو حصوں میں بانٹ دیتا ہوں۔ ایک حصہ میرا ہوگا دوسرا آپ کا۔ میری دو بیویاں ہیں ان میں سے جس کو آپ پسند کریں میں اس کو نکاح سے آزاد کر دوں گا۔ عدت گزرنے کے بعد آپ اس کو اپنے نکاح میں لے لیں۔ عبدالرحمٰنؓ نے اس پیشکش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا کہ آپ کو اپنی ہر چیز مبارک ہو، آپ مجھے بازار لے چلیے۔ میں وہاں جائزہ لے کر تجارت کروں گا اور آپ پر بار نہیں بنوں گا۔ چنانچہ سعدؓ ان کو بنو قینقاع کے بازار میں لے گئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے قلیل مدت میں اپنا کاروبار قائم کر لیا اور اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے۔

بعض انصار نے اپنے باغات کا کچھ حصہ مہاجر بھائیوں کو دینا چاہا تاکہ وہ اس کی پیداوار حاصل کر کے گزر بسر کریں۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے انصار کو ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ مہاجرین نے یہ پیش کش کی کہ املاک انصار ہی کی رہیں ہم ان پر محنت کریں گے اور جو حق الخدمت ہاتھ آئے گا اسی پر اکتفا کریں گے۔ یہ پیش کش معقول تھی لہٰذا اسی پر معاملات طے ہوئے۔ حضرت جابرؓ کی ایک روایت کے مطابق مواخات کے بعد انصار مہاجرین کو زندگی بھر استعمال کے لیے مکان اور زمینیں دینا چاہتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو روکا کہ اپنی جائیدادیں اپنے پاس ہی رکھو کیونکہ اس طرح جائیداد ہبہ کرنے سے اس میں جائیداد پانے والے کی میراث قائم ہو جائے گی[1]۔

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ مہاجرین انصار پر خواہ مخواہ کا بوجھ ڈالنے والے نہیں بنے بلکہ انہوں نے محنت سے مدنی معاشرہ میں اپنا مقام بنایا۔ لیکن جہاں تک مواخات کا تعلق ہے تو یہ رابطہ زندگی بھر قائم رہا اور اسے بڑی اہمیت دی گئی۔ چنانچہ حضرت بلالؓ کے متعلق آتا ہے کہ عہد فاروقی میں حکومت سے ملنے والے وظیفہ کا اندراج انہوں نے اپنے اسلامی بھائی بنو خثعم کے ابو رویحہؓ کے ساتھ کرایا۔

انس بن مالکؓ کی والدہ ام سلیمؓ نے رسول اللہؐ کو ایک نخلستان استعمال کے لیے دیا۔ آپ نے وہ نخلستان اسامہ بن زیدؓ کی والدہ ام ایمنؓ کو عطا کر دیا۔ فتح خیبر کے بعد مہاجرین کی حالت بہتر ہوئی تو انہوں نے انصار کے عطیے ان کو واپس کر دیے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی نخلستان ام سلیم کو واپس کر دیا اور ام ایمن کو ایک اور باغ کے کچھ درخت استعمال کے لیے دے دیے[2]۔

انصار کی فیاضی، فراخ دلی اور سیر چشمی کی تعریف قرآن مجید نے بھی کی ہے اور اس طرح انصار کے کردار کو رہتی دنیا تک ایک نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ. وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (الحشر ۵۹:۹)

اور جو لوگ پہلے سے ٹھکانے بنائے ہوئے اور ایمان استوار کیے ہوئے ہیں وہ ان لوگوں کو دوست رکھتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کی طرف آ رہے ہیں اور جو کچھ ان کو دیا جا رہا ہے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی خلش نہیں محسوس کر رہے ہیں۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر ترجیح دے رہے ہیں اگر چہ انہیں خود احتیاج ہو۔ اور جو خود غرضی سے محفوظ رکھے گئے تو در حقیقت وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انصار اتنے سیر چشم اور مہاجرین سے محبت کرنے والے تھے کہ ان کے دل اس بات سے تنگ نہیں ہوئے تھے کہ مہاجرین کی مدینہ کو ہجرت کا سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا ہے اور ہر نیا آنے والا ان کے مال میں شریک ہو رہا ہے۔ وہ ہر مہاجر کا خیر مقدم کرتے اور اس کی ضروریات پر اپنی ضرورتوں کو قربان کر دیتے۔ وہ حرص و طمع سے بالکل پاک اور اسلامی اخوت کے تقاضوں کو صدق دل سے پورا کرنے والے تھے۔ اس بارے میں نبی ﷺ کی پند و نصیحت ہمیشہ ان کے لیے مشعل راہ ہوتی جب آپ فرماتے:

لا تباغضوا ولا تحاسدوا لا تدابروا و كونوا عباد الله اخوانا

ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، باہم حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ پھیرنے کی روش اختیار نہ کرو۔ اللہ کے بندو بھائی بھائی بن کے رہو۔

کوئی اچھا جذبہ بھی جب حد سے بڑھ جاتا ہے اور آدمی اعتدال کا دامن چھوڑ بیٹھتا ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ اس پر قدغن لگا دی جائے۔ مواخات کے لیے انصار کے جذبات کا اندازہ اوپر بیان کردہ حضرت سعد بن الربیعؓ کے قول سے لگایا جا سکتا ہے۔ علی ہذا القیاس معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے اس تعلق کو فوقیت دیتے ہوئے قرابتداروں

کے حقوق کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ہمارے سیرت نگار بیان کرتے ہیں کہ انصار نے وراثت میں ان بھائیوں کے حق کو فائق سمجھا اور حقیقی اعزہ کو نظر انداز کرنے لگے۔ اس پر قرآن مجید میں یہ وضاحت نازل ہوئی:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ. (انفال ۸:۷۵)

اللہ کے قانون میں رشتہ دار ایک دوسرے سے زیادہ حق دار ہیں۔

یعنی وراثت کا حق قرابت داروں ہی کا ہے نہ کہ اس طرح بننے والے اسلامی بھائیوں کا۔ لہٰذا اخوت و نصرت کا تعلق ان قوانین اور حقوق کو متاثر نہیں کرے گا جو رحمی رشتوں اور قرابت داری کی بنا پر قائم ہوتے ہیں اور جن کی تعلیم شریعت نے دی ہے۔ یہ ہدایت مفرط جذبات کو قابو میں اور حدود کے اندر رکھنے کے لیے تھی۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ اب مواخات کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مواخات عند الضرورت فتح مکہ تک ہوتی رہی۔

مواخات کے مقاصد:

مواخات کی اسکیم میں مہاجرین کی آبادکاری اور معاشی کفالت ملحوظ رہی لیکن یہ اس کا مقصد وحید نہیں تھا۔ مہاجرین سب کے سب لٹے پٹے نہیں آئے تھے۔ اکثر و بیشتر کے مال و منال ان کے ساتھ تھے۔ انہیں وقتی سہارے کی ضرورت تو محسوس ہو سکتی تھی لیکن مستقل سہارے سے وہ بے نیاز تھے۔ ہجرت کا سلسلہ بھی نبی ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا۔ لہٰذا یہ مسئلہ ایسا شدید ہوتا تو اس کا دباؤ ہجرت سے قبل ہی یا اس کے بعد ابتدائی دنوں میں زیادہ محسوس ہونا چاہیے تھا اور یہ اسکیم بالکل آغاز ہی میں شروع کر دی جاتی۔ اس کے برعکس معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہجرت کے چند ماہ بعد رائج کیا گیا جبکہ اس وقت تک مہاجرین معاشرہ میں اپنی جگہ بنا چکے تھے یا کم از کم ان کی طرف سے کسی شدید دباؤ کا سامنا نہ تھا۔ لہٰذا ہمارے نزدیک اس کی ضرورت معاشی سے زیادہ معاشرتی استحکام کے نقطہ نظر سے تھی۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کسی جگہ دوسرے علاقوں سے لوگ آ کر کافی تعداد میں بس جائیں اور وہ اس جگہ کی سوسائٹی میں، اس کے بازاروں میں، اس کے کاروبار میں بھرپور حصہ لینے کے قابل ہوں تو جلد یا بدیر پہلے سے رہنے والے لوگوں کے اندر ان کے لیے بیزاری اور نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان جذبات کو بھڑکا کر قدیم اور جدید باشندوں کو آپس میں لڑا دینا اس وقت بہت آسان ہوتا ہے جب سازشی عناصر بھی اس جگہ موجود ہوں۔ مدینہ میں یہود ماضی میں اوس و خزرج کے درمیان پھوٹ ڈالنے میں بے حد کامیاب رہے تھے اور ان کے

سازشی عناصر سے یہ بعید نہ تھا کہ وہ آہستہ آہستہ انصاری نوجوانوں کو مہاجرین کے بالمقابل لا کھڑا کریں۔ اس خطرہ کی پیش بندی اسی طرح ہو سکتی تھی کہ قدیم الاسلام مہاجرین کو متفرق قبائل اور مختلف محلوں میں پھیلا دیا جائے تا کہ وہ ایک طرف انصار کے اندر دین کا حقیقی فہم پیدا کریں اور ان کی تربیت کریں اور دوسری طرف اپنے طرز عمل سے وہ اس بات کو واضح کرتے رہیں کہ وہ انصار کے قدر دان ہیں اور مہاجرین و انصار دونوں صرف حق کے علمبردار ہیں۔ ان کی کوئی حقیر دنیاوی اغراض نہیں ہیں جن کے باعث وہ عارضی طور پر یکجا ہوئے ہوں بلکہ یہ دونوں اللہ کے دین کے سپاہی ہیں اور ان کا جینا مرنا ایک ساتھ ہوگا۔ مواخات کی اسکیم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مفاہمت کی فضا قائم کرنے میں بڑی مدد دی۔ بعد میں یہود کے ایجنٹوں نے مختلف مواقع پر انصار کے جذبات کو مہاجرین کے خلاف بھڑکانے کی کوشش بھی کی لیکن ان کی وحدت فکر اور یک جہتی کی اسپرٹ نے ان کی کوئی تدبیر نہ چلنے دی۔ ہر قبیلہ میں ایسے مہاجرین موجود تھے جن کا اثر اس قبیلہ میں محسوس کیا جاتا تھا اور اہل قبیلہ ان کی نصیحت کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ ایسے مواقع پر وہ فوراً اپنا فرض ادا کرتے اور مہاجر اور انصاری کے فرق کو نمایاں نہ ہونے دیتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نہایت اہم مواقع پر مواخات نے مدنی معاشرہ کو بحران کا شکار ہونے سے بچا لیا۔ حتیٰ کہ نبی ﷺ کی رحلت کے بعد خلافت کے قیام کا مرحلہ بھی خوشگوار انداز میں طے ہو گیا اور قرشی خلافت کے خلاف اٹھنے والی آواز دب کر رہ گئی۔ اگر نبی ﷺ نے ہجرت کے فوراً بعد ہی مواخات کا یہ انتظام نہ کر دیا ہوتا تو اسلام دشمن قوتیں علاقائی اور قبائلی تعصبات کو ہوا دے کر امت مسلمہ کی یک جہتی کو پارہ پارہ کرنے میں کامیاب ہو جاتیں۔

میثاق مدینہ:

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر نبی ﷺ نے اوس و خزرج کے وفد پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ یثرب کو ہجرت کے بعد قریش نچلے نہیں بیٹھیں گے بلکہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ اور ان کے حلیف جنگ کی صورت حال پیدا کر دیں۔ لہٰذا مسلمانوں کی ہجرت کے بعد اہل یثرب کو ہر گورے اور کالے سے لڑنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ یہ راستہ دشوار گزار ہوگا۔ اس میں بڑے نقصانات ہو سکتے ہیں۔ جان و مال کی قربانی دینی ہو گی اور شہر کا امن و سکون غارت ہو سکتا ہے۔ لہذا اہل یثرب اگر اپنے ہاں ہجرت کی دعوت دیتے ہیں تو انہیں تمام خطرات پیش نظر رکھنے ہوں گے۔ اگر وہ ان سنگین حالات میں بھی اپنا وعدہ ایفا کرنے کی طاقت رکھتے ہوں تو وہ میزبانی کی پیشکش کریں ورنہ ابھی

حالات کا جائزہ لیں۔ ارکان وفد نے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد اپنی پیشکش پر جب اصرار کیا تب آنحضرت ﷺ نے ان سے سمع وطاعت کی بیعت لی۔

قریش کو جونہی اوس وخزرج کے وفد کی بیعت کی خبر ملی انہوں نے ایام حج ہی میں ان کو دھمکیاں دیں کہ انہوں نے اپنے اس عمل سے قریش سے مخاصمت مول لے لی ہے اور یہ ان کو مہنگی پڑے گی۔ انہوں نے بیعت کرنے والے ایک معزز سردار سعد بن عبادہؓ کو یثرب جاتے ہوئے گرفتار بھی کر لیا اور ان کو مکہ واپس لے آئے تا کہ خوفزدہ کریں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے ملک میں ایک قبیلہ کا کسی کو جوار (پناہ) دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ قبائل جب کسی شخص کو جوار دے دیتے تو وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان لڑا دیا کرتے۔ اس کو دشمن کے حوالے کرنے کا ان کے ہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قریش کو معلوم تھا کہ اوس وخزرج نبی ﷺ کے معاملہ میں سخت جانی کا مظاہرہ کریں گے اور قریش کے لیے ان قبائل کی دشمنی آگے چل کر خطرناک نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے باوجود قریشی سرداروں، ابوسفیان اور ابی بن خلف، نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور نبی ﷺ کے ہجرت کر جانے کے بعد یثرب کے سرداروں کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ آپ کے قبائل کے لیے ہمارے اندر دشمنی پیدا ہو جانا دوسرے تمام قبائل کی نسبت ہمیں زیادہ ناپسند ہے۔ تاہم یہ بات تمہارے لیے بڑے شرم کی ہے کہ تم نے ہمارے ایک معزز فرد کو پناہ دے دی ہے اور تم اس کا دفاع کرنا چاہتے ہو۔ وہ اچھا ہے یا برا، دونوں صورتوں میں ہم اس کے ولی اور اس کو واپس مانگنے کے حق دار ہیں، لہٰذا تم ہمارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔

اس خط کے مضمون میں قریش کی رعونت اور قبائل عرب میں اپنی حیثیت کا احساس پورے طور پر جھلک رہا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے مکہ سے بخیر وعافیت نکل جانے کو اپنی شکست سمجھ رہے ہیں اور جو قبیلہ ان کی پشت پناہی کرے گا اس سے وہ جنگ کرنے سے دریغ کرنے والے نہیں ہیں۔ یہی وہ بات تھی جس کا اندیشہ نبی ﷺ کو پہلے سے تھا اور بیعت عقبہ کے موقع پر آپ نے بے کم وکاست اس کا اظہار کر دیا تھا۔ ہجرت کے بعد نبی ﷺ نے یثرب اور اس کے نواح کی آبادیوں اور ان کے باشندوں سے خود واقفیت حاصل کی اور وہاں کے زمینی حقائق کی روشنی میں قریش کے خطرہ کے پیش نظر تمام ضروری معاملات اور مختلف لوگوں کی ذمہ داریوں اور حقوق وفرائض کو ضبط تحریر میں لانے کا فیصلہ کیا۔ یہ تحریر ''میثاق مدینہ'' کہلاتی ہے[3]۔ قریش کا خط اس تحریر سے پہلے آیا

یا بعد میں، کتب سیرت اس بارہ میں خاموش ہیں لیکن چونکہ اس خط کی توقع پہلے سے تھی اس لیے ہمارے نزدیک میثاق کی تحریر پہلے سے ہو چکی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس خط کی اہمیت ختم ہو گئی اور اس بات کا تذکرہ تک بھی کہیں نہیں ملتا کہ خط کا جواب قریش کو دیا گیا یا نہیں۔

میثاق کے بنیادی امور حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ یہ تحریر محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بطور پیغمبر صادر ہوئی جو اصلاً مہاجرین قریش کے مومنین و مسلمین اور یثرب کے مومنین و مسلمین کے درمیان تھی۔ لیکن اس میں یہ گنجائش رکھی گئی کہ ان دونوں موجود فریقوں کے ساتھ بعد میں آ ملنے والے، ان کا ساتھ دینے والے اور ان کے ہمراہ جہاد کرنے والے بھی اس معاہدہ میں شریک کیے گئے۔ گویا مکہ سے بعد میں ہجرت کر کے آنے والوں، نیز اہل یثرب میں نئے اسلام قبول کرنے والوں، پر بھی اس معاہدہ کا اطلاق مانا گیا۔ معاہدہ کے فریقین کو امة واحدة من دون الناس یعنی :سارے تمام لوگوں سے الگ ایک امت قرار دیا گیا۔ گویا اس معاہدہ نے مہاجرین و انصار کو یک جان و دو قالب قرار دیا۔

۲۔ اس تحریر کے ذریعہ سے قریش کے مہاجرین کو پابند کیا گیا کہ وہ دیت اور خون بہا کی ادائیگی اپنے خاندانی رواج کے مطابق خود کریں گے اور اپنے اسیروں کو فدیہ دے کر خود چھڑائیں گے۔ یہ معاملہ دستور کے مطابق اور اہل ایمان کے ساتھ عدل و انصاف کے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے ہو گا۔ اہل یثرب کے تمام بڑے خاندان بنو عوف، بنو حارث، بنو ساعدہ، بنو النجار، بنو عمرو بن عوف، بنو النبیت، بنو اوس اور بنو جشم بھی اپنے اپنے رواج کے مطابق دیت اور خون بہا یا اپنے اسیروں کا فدیہ ادا کرنے کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ دیت اور فدیہ پر کثیر اخراجات اٹھتے ہیں جو معمول کی زندگی کو شدید طور پر متاثر کرتے ہیں۔ تحریر کی اس شق کا تقاضا یہ تھا کہ مہاجرین اور انصار کے درمیان جو مواخات کرائی گئی اس کے تحت دیت اور خوں بہا جیسے بڑے معاملات شامل نہیں تھے۔ انصار پر اگر ان معاملات کی ذمہ داری بھی ڈال دی جاتی تو یہ ایک ناروا بوجھ ہوتا جس کو اٹھانے کو تو وہ اٹھا لیتے لیکن بعد میں اس کے باعث دلوں میں کدورت پیدا ہو سکتی تھی اور اسلام کے بد اندیش اس سے فائدہ اٹھا کر کسی مرحلہ پر مہاجرین اور انصار میں پھوٹ ڈال کر ان کو آپس میں لڑا سکتے تھے۔

۳۔ اس تحریر کے ذریعہ سے ظلم و زیادتی کی راہ روکی گئی اور قبائلی زندگی کے رواجوں سے بالاتر ہو کر معاہد

پارٹیوں کو اہل ایمان کے تحفظ کا پابند کیا گیا۔ طے کیا گیا کہ کسی بھی پارٹی کا کوئی شخص اگر ظلم، زیادتی، گناہ یا فساد پھیلانے کا مرتکب ہوگا تو تمام مسلمانوں کا اجتماعی ہاتھ اس کے خلاف ہوگا۔ کسی مسلمان کا ناحق قتل رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔ تمام اہل ایمان ایک دوسرے کے حمایتی اور امن وامان قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ وہ کسی کافر کی خاطر کسی مومن کو قتل کریں گے نہ ایسا کرنے میں کافر کو مدد مہیا کریں گے۔ اس طرح کی ہدایات اہل ایمان میں وحدت پیدا کرنے، ان کو تحفظ فراہم کرنے اور شہر میں اندرونی استحکام قائم رکھنے کے لیے تھیں تاکہ کفار شہر میں اپنے آلہ کار پیدا کر کے اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکیں۔ دوسرے الفاظ میں انصار نے بیعت عقبہ میں جوار مہیا کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کو میثاق میں الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا تاکہ کوئی گروپ جو جوار کو تسلیم نہ کرتا ہو مہاجرین کے قتل و غارت کا بازار گرم نہ کر سکے۔ اسے یہ اندیشہ ہو کہ اس صورت میں تمام انصار کا اجتماعی ہاتھ اس کے خلاف اٹھے گا۔

۴۔ خود شہر یثرب کے متعلق بھی دستاویز میں یہ واضح کیا گیا کہ وادی یثرب کو مامون حرم سمجھا جائے گا جہاں شرارتی لوگوں کو پنپنے کا موقع نہیں دیا جائے گا اور باشندے ایک دوسرے کی مرضی کے خلاف حلف اور جوار کا تعلق قائم کر کے دشمنی کا بیج نہیں بوئیں گے۔ ان ہدایات سے اوس وخزرج کی حریفانہ چشمک کا سد باب مقصود تھا جس کو اسلام نے بڑی حد تک ختم کر دیا تھا لیکن دشمن اس کو کسی بھی وقت ابھار سکتے تھے۔

۵۔ اس دستاویز میں میثاق کی دو پارٹیوں میں سے یثرب کی پارٹی کے یہود افراد کی ذمہ داریوں کا تعین بھی کیا گیا۔ ان کو اہل ایمان کے ساتھ کا ایک ایسا گروہ تسلیم کیا گیا جو اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے بھی مشترکہ مفادات کے لیے مسلمانوں کے ساتھ کام کرے گا۔ ان کے وہی حقوق تسلیم کیے گئے جو اوس وخزرج کے مسلمانوں کے تھے۔ یہ نبی ﷺ کے اس وعدہ کا ایفا تھا جو بیعت عقبہ ثانیہ میں کیا گیا تھا۔ حضورؐ نے اوس اور خزرج سے فرمایا تھا کہ میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ جن سے تمہاری جنگ ہوگی میری بھی ان سے جنگ ہوگی اور جن سے تمہاری صلح ہے میری بھی ان سے صلح ہوگی۔ قبائلی نظام میں ان یہود کو نہ قبیلہ سے کاٹ پھینکا جا سکتا تھا نہ اس کے تحفظ سے محروم کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا التحریر میں یہ واضح کر دیا گیا کہ بنو عوف، بنو الحارث، بنو ساعدہ، بنو جشم، بنو النجار، بنو ثعلبہ، بنو الاوس وغیرہ خاندانوں کے یہودی عناصر اپنے قبائل کے ساتھ ہوں گے۔ انہی کی مانند یہ بھی مصارف برداشت کریں گے اور نصرت وتعاون فراہم کریں گے۔ البتہ جنگ میں ساتھ دینے کے لیے انہیں رسول اللہ ﷺ سے پیشگی اجازت

لینی ہوگی۔ یہود کو یقین دہانی کرائی گئی کہ جب تک وہ اہل ایمان کے تابع رہیں گے ان کی مدد کی جائے گی۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا، نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔ اس ضمن میں بنوعوف، بنوالحارث وغیرہ کے جو نام آئے ہیں یہ اوس اور خزرج کے ذیلی خاندانوں کے نام ہیں۔ بنی اسرائیل کے یہود قبائل بنونضیر، بنوقریظہ، بنوقینقاع الگ تھے اور ان کے نام اس تحریر میں نہیں آئے۔ گویا میثاق کی تحریر ان کے لیے نہیں تھی۔

۶۔ قریش مکہ کی شرارتوں کے سدباب اور ان کے متوقع حملہ کے مقابلہ کے لیے پالیسی بھی اس دستاویز میں طے کر دی گئی۔ اس کے اہم نکات یہ تھے کہ کوئی شخص قریش کے کسی شخص یا سامان کو پناہ مہیا نہیں کرے گا۔ کسی خاتون کو اس کے اولیا کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی۔ قریش کے معاونین کو پناہ نہیں دی جائے گی۔ پناہ حاصل کرنے والا کوئی بھی شخص اسی وقت تک مامون ہوگا جب تک وہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اور غداری نہیں کرتا۔ یثرب پر حملہ کرنے والے ہر شخص کے خلاف اس معاہدہ میں شامل تمام طبقات معاونت کے پابند ہوں گے۔ مذہبی جنگ کی صورت میں ہر گروہ کی وفاداری اپنے اہل مذہب کے لیے ہوگی۔ کوئی مسلمان اپنے طور پر صلح کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ صلح اجتماعی ہوگی۔ جب اس کا فیصلہ ہوگا تو ہر شخص اسے قبول کرے گا۔

۷۔ اس تحریر کے بارے میں اگر بعد میں کوئی قضیہ پیدا ہو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹایا جائے گا اور ان کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ گویا قبائل اور ان کی ذیلی شاخیں اس تحریر کی رو سے نبی ﷺ کی ماتحتی میں آ گئیں اور ان کے سرداروں کا کردار اس دستاویز میں طے کردہ حدود کے اندر ضمنی رہ گیا، البتہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کے داخلی معاملات میں پہلے کی حیثیت کے حامل تھے۔

میثاق کی اہمیت:

میثاق مدینہ نے ایک طرف انصار پر مواخات کی ذمہ داریوں کو محدود کیا، دوسری طرف اہل یثرب اور مہاجرین میں باہمی مفاہمت پیدا کرنے، انہیں ایک مقصد کے لیے مجتمع کرنے اور مربوط معاشرہ قائم کرنے میں مدد دی، اور تیسری جانب قریش کی طرف سے متوقع جنگی کارروائیوں کے مقابلہ کے لیے پہلے سے پالیسی طے کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقت آنے پر افراتفری میں کوئی فیصلے نہیں کرنے پڑے بلکہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہر شخص اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

قریش کی جانب سے دھمکی آمیز خط کے بعد جب ان کے علم میں یہ بات آئی ہو گی کہ اہل یثرب مکہ کے مہاجرین کی حمایت میں یک جان ہو چکے ہیں تو ان کی توقعات پر جو اوس پڑی ہو گی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ اب انہیں کوئی اقدام کرنے سے پہلے سو بار سوچنا ضروری ہو گیا تھا کیونکہ یثرب کے باحیثیت قبائل، جن کے روابط اپنے پڑوس کے قبائل کے ساتھ بھی حلیفانہ تھے، ان کے لیے تر لقمہ نہیں بن سکتے تھے۔

میثاق مدینہ کی دستاویز میں زیر بحث آنے والے نکات ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مہاجرین و انصار کے قبائل کے درمیان ذمہ داریوں کے تعین اور قریش کی جانب سے متوقع حالت جنگ کے مقابلہ کے لیے فرائض کی تقسیم کا ایک معاہدہ تھا۔ وقت کے حالات نے ان امور کو ضبط تحریر میں لانا ضروری کر دیا تھا۔ لیکن یہ نکات اتنے جامع و مانع نہیں ہیں کہ ان کو اسلامی ریاست کا دستور و آئین قرار دیا جا سکے۔ دستور اور آئین میں طے کیے جانے والے امور کا تعلق بہت سی مختلف جہات سے ہوتا ہے اور ان میں تمام وظائف حکومت کے بارے میں پالیسی درج کی جاتی ہے۔ ایسے امور قرآن مجید میں طے ہو رہے تھے اور ہر شخص جانتا ہے کہ اسلامی حکومت کے بارے میں رہنمائی اگلے کئی سالوں میں وحی کی صورت میں نازل ہوئی۔ لہٰذا میثاق مدینہ کو ایک وقتی معاہدہ سمجھنا چاہیے اور یہی اس کی اہمیت ہے۔ جن لوگوں نے اس کو اسلامی حکومت کا آئین ثابت کرنے پر محنت صرف کی ہے، ہمارے نزدیک انہوں نے ایک غلط موقف اختیار کیا ہے۔

ایک اور غلط فہمی، جس کا شکار ہمارے سیرت نگار ہوئے ہیں، یہ ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل یعنی قبائل بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع کو بھی از خود اس معاہدہ میں شامل سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک یہ گروہ بھی اسلامی حکومت کے تحت ایک امت کے اندر شامل اور نبی ﷺ کی فوقیت کو تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ حقیقت حال یہ نہیں ہے۔ معاہدہ جن پارٹیوں کے مابین ہے وہ مومنین قریش اور مومنین یثرب ہیں، جن کے لواحقین واتباع بھی اس میں شامل ہیں۔ جب معاہدہ کے سرنامہ میں فریقین معاہدہ کا ذکر کر دیا گیا تو آگے جہاں لفظ یہود آئے گا تو اس کا مصداق ہر یہودی قبیلہ نہیں ہو سکتا بلکہ وہی یہودی مراد ہوں گے جو کسی فریق کے لواحقین واتباع میں شمار کیے جا سکتے ہوں۔ اس دستاویز میں تو آگے چل کر قبیلوں کے ان بطون کا نام بھی لے لیا گیا جن کے یہود کے حقوق و فرائض یہاں بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں قبائل بنی اسرائیل کا نام شامل نہیں اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ بیعت عقبہ اولیٰ

وخزرج کے ساتھ ہوئی تھی نہ کہ بنی اسرائیل کے ساتھ، اور قریش کی دشمنی بھی اوس وخزرج کے ساتھ تھی نہ کہ یہودی قبائل کے ساتھ، جن کی وفاداریاں مشرکین قریش کے ساتھ تھیں۔

جہاں تک ان اسرائیلی قبائل کے ساتھ معاہدات کا تعلق ہے تو وہ بھی ایک حقیقت ہیں۔ لیکن وہ الگ سے ہوئے اور انہی کی خلاف ورزیوں کے نتائج ان کو وقتاً فوقتاً بھگتنے پڑے۔ سیرت کی ابتدائی کتابوں میں ان معاہدات کا حوالہ ملتا ہے۔ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بنوقینقاع کو جب معاہدہ کی شرائط پورا نہ کرنے پر جلا وطن کیا گیا تو دوسرے اسرائیلی قبائل نے اپنے معاہدوں کی پھر سے تجدید کی۔

ہمارے اہل تحقیق نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ میثاق مدینہ کے تحت مسلمان، یہود اور مشرکین جو بھی وادی یثرب میں آباد تھے وہ ایک امت قرار دیے گئے اور ان کو مذہبی تحفظ فراہم کیا گیا[42]۔ حقیقت یہ ہے کہ معاہدہ میں یہود کا نام قبیلوں کے تعین کے ساتھ آیا ہے جبکہ مشرکین کا اس میں تذکرہ بھی نہیں ہوا۔ معاہدہ جب مومنین یثرب اور مومنین قریش کے مابین تھا تو مشرکین از خود اس سے باہر ہو جاتے ہیں اور وہ امت واحدہ میں شامل قرار نہیں پاتے۔ اس طرح کا موقف بیان کرنے والے اہل تحقیق یہ بات بھول جاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا کار رسالت ابھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچا تھا۔ نیز آپ لوگوں کے غلط ادیان کو تحفظ مہیا کرنے کے لیے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ یہ غلط فہمی اس صورت میں رفع ہو جاتی ہے جب یہ مانا جائے کہ میثاق مدینہ کوئی ابدی دستاویز نہیں تھی بلکہ ذمہ داریوں کا وقتی تعین تھا۔ معاہدہ میں شامل یہود و مشرکین کو اسلام کی دعوت دینے میں کوئی چیز مانع تھی اور نہ ان کے اسلام قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ تھی۔ یوں بھی تمام انسانوں سے جو مطالبہ تھا وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا تھا۔ لیکن یہ کام بلا جبر و اکراہ ہونا مقصود تھا، جب تک کہ لوگوں پر اتمام حجت نہ ہو جاتا۔ لہٰذا ہجرت کے فوراً بعد نئے ماحول میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ لوگ فی الفور اسلام لے آئیں گے۔ ان کو سوچنے سمجھنے کا وقت دیا گیا اور کئی سال بعد وہ مرحلہ آیا جب مشرکین سے اسلام لانے اور یہود سے اسلام قبول کرنے یا بصورت دیگر جزیہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے میثاق کو دو حصوں پر مشتمل دستاویز گردانا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں یہود کے لیے آنحضرت ﷺ کا سیاسی اقتدار تسلیم کر لینا قرین قیاس نہیں۔ لہٰذا وہ یہ مانتے ہیں کہ غزوہ بدر میں قریش کی شکست کے بعد یہود خوفزدہ ہو گئے تو انہوں نے بھی معاہدہ میں شمولیت اختیار کر لی اور اس کے لیے میثاق کا

دوسرا حصہ تحریر ہوا جس میں یہود کا حوالہ ہے

وہ دوسرا حصہ تحریر ہوا جس میں یہود کا حوالہ ہے[5]۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ قیاس اس صورت میں شاید قابل فہم ہوتا اگر یہود کے خاندانوں کے نام معاہدہ میں نہ دیے گئے ہوتے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا یہ تمام نام اوس اور خزرج کے بطون کے ہیں اور ان عرب قبائل کے یہود پہلے روز ہی سے شریک معاہدہ تھے کیونکہ وہ اپنے قبائل میں نہ تو زیادہ بااثر تھے اور نہ تعداد کے لحاظ سے فوقیت رکھتے تھے۔ قبائل کے سرداروں تک کے ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے کے بعد اصل قوت انہی لوگوں کی تھی جو میثاق میں پارٹی بنے۔ لہٰذا ان یہود کے معاملہ کو غزوہ بدر کے نتائج تک موخر کرنے کی کوئی بنیاد نہ تھی۔

حوالہ جات

1. صحیح مسلم۔ کتاب الفرائض باب العمری۔ ج ۲، ص ۱۰
2. صحیح مسلم۔ کتاب الجہاد۔ باب رد المہاجرین الی الانصار منائحہم۔ ج ۲، ص ۸۹
3. اس تحریر کا پورا متن ابن ہشام میں موجود ہے۔
4. پروفیسر محمد صدیق قریشی۔ رسول اکرمؐ کی سیاست خارجہ
5. ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔ ج ۱، ص ۷۶

باب 25

یہود سے خطاب اور مباحثہ

نبی کریم ﷺ کی رسالت کے مکی دور میں اہل کتاب بالعموم اور یثرب کے یہود بالخصوص در پردہ رہ کر قریش کو اسلام کی دعوت کے مقابلہ کے گر بتاتے رہے تھے۔ اگر کبھی خود سامنے آئے بھی تو سوالات اور اعتراضات پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہا کہ نئی نبوت کا دعویٰ کسی بنیاد پر قائم نہیں اور محمد (ﷺ) میں وہ علامات نہیں پائی جاتیں جو آسمانی صحیفوں کی رو سے اللہ کے رسولوں میں پائی جانی ضروری ہیں۔ نیز یہ کہ آسمانی دین کے اصل حامل کی حیثیت سے ان کی پہلی پوزیشن علیٰ حالہ قائم ہے۔ وہ بدستور اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ قوم کے طور پر لوگوں کی ہدایت پر مامور ہیں۔ انہی کے پاس وہ آسمانی شریعت ہے جس کی روشنی میں لوگوں کے درمیان معاملات کے صحیح فیصلے کیے جا سکتے ہیں۔ آنحضرتؐ کی تعلیم میں یہ بات تسلیم کی گئی تھی کہ اہل کتاب ماضی میں یقیناً آسمانی شریعت کے حامل رہے ہیں لیکن اس وقت ان کے معتقدات اور طور طریقے آسمانی دین کے منافی ہیں۔ حقیقت میں وہ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں ناکام رہے ہیں جو ان پر شریعت کے نفاذ کے لیے ڈالی گئی تھیں اور جن کے باب میں ان سے پرسش ہونے والی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی دعوت کو خالص دین توحید کا تسلسل قرار دیا اور یہود و نصاریٰ دونوں پر یہ واضح کیا کہ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ آسمانی ہدایت کی حامل امت کی حیثیت سے اپنا فرض پہچانیں اور آگے بڑھ کر اللہ کی اتاری ہوئی نئی ہدایت کو اختیار کریں۔ نیز نبی ﷺ پر ایمان لا کر ان کے ساتھ خداوندی پیغام کو دنیا میں پھیلانے میں اپنی کوشش صرف کریں۔ وہ اپنی کتابوں کے ذریعے پہلے سے آئندہ زمانہ میں ایک عظیم المرتبت رسول کی بعثت کا علم رکھتے ہیں اور وہ اپنے رسولوں سے یہ عہد بھی کر چکے ہیں کہ جب وہ رسول مبعوث ہوں گے تو وہ ان پر ایمان لائیں گے اور ان کے مشن کی تکمیل میں ان کی معاونت کریں گے۔ لہٰذا اس وقت اگر اہل کتاب اسلام کی دعوت کے خلاف محاذ آرائی کریں گے تو یہ اس عہد کی خلاف ورزی کے مرتکب ٹھہریں گے۔

مکہ میں اہل کتاب قرآن مجید کے اصل مخاطب نہیں تھے۔ قرآن کا خطاب وہاں مشرکین عرب اور

بالخصوص قریش سے تھا جو اہل عرب کے سردار تھے۔ نبی ﷺ کی ہجرت کے بعد صورت حال بدل گئی۔ دعوت کے اسلوب میں بڑی تبدیلیاں آئیں اور اہل کتاب سے راست خطاب بھی ہوا۔

علامہ شبلی نعمانی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنونضیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع اصلاً عرب تھے جنہوں نے یہودیت اختیار کر لی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید یہود لیڈروں سے 'یا بنی اسرائیل' کے الفاظ سے خطاب نہ کرتا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے نسلی یہودیوں کو 'یا بنی اسرائیل' سے اور غیر نسلی یہودیوں کو یا مجموعی طور پر تمام یہود کو 'یا اھل الکتاب' سے خطاب کیا ہے۔ ابن کثیر نے طبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ تینوں قبائل نبوخذ نصر کے حملہ کے بعد اس علاقہ میں آباد ہوئے تھے۔

اسلام کی اصل مخالف قوت نسلی یہود تھے۔ یہ سیاسی اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ شمالی حجاز میں اپنے ہم مسلک قبائل کے ساتھ ان کے مضبوط روابط تھے۔ عرب قبائل ان کی علمی فضیلت سے مرعوب تھے۔ قریش کی ان کے ساتھ دوستیاں تھیں، وہ انہی سے دعوت اسلامی کی مخالفت میں مشورے لیا کرتے اور نبی ﷺ کو زچ کرنے کے گر سیکھا کرتے۔

بنی اسرائیل (یعنی نسلی یہود) ہمیشہ سے اپنے بارے میں خوش فہمیوں میں مبتلا رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ:

☆ وہ اللہ کی اولاد، اس کے محبوب اور اس کا پسندیدہ گروہ ہیں۔ خدا کے محبوبوں کے ساتھ نسبت کے باعث وہ ہمیشہ سے اس کے انعامات کے حق دار رہے ہیں اور رہیں گے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے ان کو لوگوں کی پیشوائی کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ اس کا یہ عہد ان کے ساتھ قیامت تک کے لیے ہے، لہٰذا کوئی رسول بنی اسرائیل کے باہر سے نہیں آ سکتا۔

☆ بزرگوں کی اولاد ہونے کے باعث ان کے لیے جہنم کی سزا نہیں ہے۔ اگر کسی یہودی کے غیر معمولی جرائم کے سبب سے اس کو سزا دینا ضروری ہوا تو اسے چند روزہ سزا دے کر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔

مدینہ کے یہود ان تمام خوش فہمیوں میں مبتلا تھے اور ان کا چرچا کر کے عربوں پر اپنی برتری کا سکہ جماتے تھے۔ دوسری طرف پچھلے صحیفوں میں دی گئی بشارتوں کی بنا پر وہ ایک عظیم رسول کی بعثت کے منتظر رہے تھے۔ ان کے ربّی یہ رائے ظاہر کرتے رہتے تھے کہ اس رسول کی آمد کا زمانہ قریب آ چکا ہے، وہ آئے گا تو اس کے جلو میں ان کے لیے کامرانیاں ہی کامرانیاں ہوں گی۔ رسول کی آمد کے بارے میں وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اس کی بعثت بنی اسرائیل میں سے ہوگی۔ جب ہجرت کے بعد یہود نے نبی ﷺ کی شخصیت کو اپنے درمیان پایا اور ان کے مواعظ سنے تو ان کو

اپنی نامرادی کا احساس ہوا کیونکہ آنحضرت ﷺ کا تعلق بنی اسماعیل سے تھا جن کو یہود ہمیشہ تحقیر سے دیکھتے رہے تھے۔ لہذا انہیں اپنی کم مائیگی کا شدید احساس ہوا۔ حضورؐ کا بنی اسرائیل میں سے نہ ہونا یہود کے اسلام لانے میں حجاب بن گیا اور وہ حسد کی آگ میں جلنے لگے۔

ان حالات میں مدینہ پہنچ کر نبی ﷺ کا پہلا کام نسلی یہود کے حوالہ سے یہ تھا کہ آپ ان کو خوش فہمیوں کی دلدل سے نکالیں تا کہ ان کے دل و دماغ اسلام کے لیے کھلیں۔ چونکہ ہر مسئلہ میں من پسند تاویلیں کر کے یہود نے خوش فہمیوں کا تانا بانا بنا ہوا تھا اس لیے اصل حقائق کو اجاگر کرنے کے لیے مفصل بحث و تمحیص کی ضرورت تھی جس نے یہود کے ساتھ ایک بڑے معارضہ و مباحثہ کی راہ ہموار کر دی۔ اس کے نتیجہ میں بہت کم علمائے یہود نے اسلام کی توفیق پائی۔ ان کی عظیم اکثریت کی ذہنیت نہ اس وقت بدلی اور نہ بعد میں اس میں کوئی تبدیلی آئی۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کی دعوت اور آپ کے معارضہ کی اساسات یہاں واضح کر دی جائیں۔

فضیلت یہود:

اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو نعمتوں سے نوازتا ہے تو اصل میں وہ چاہتا ہے کہ اس قوم کے اندر خداوند کے لیے شکرگزاری کا جذبہ پیدا ہو، وہ خلوص نیت کے ساتھ اس کے حضور جھک جائے اور اس کی ہدایت کو اپنائے۔ یہود کو دعوت دی گئی کہ وہ سوچیں کہ فرعون کی غلامی میں وہ کس صورت حال سے دوچار تھے۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیا جاتا اور بیٹیوں کو زندہ رہنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہود پر یہ احسان کیا کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کو سمندر میں غرق کر دیا اور بنی اسرائیل کو ان کے مال و متاع سمیت نجات بخشی۔ آزادی پانے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ رب کے شکرگزار بندے بن کر رہتے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں بچھڑے کی ایک خود ساختہ مورت کی پوجا شروع کر کے اللہ کے غضب کو دعوت دی لیکن ان کے کچھ لوگوں کے اظہار ندامت پر اللہ نے ان کا گناہ معاف کر دیا تا کہ ان کے اندر احسان مندی کا جذبہ پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ہدایت کی کتاب تورات نازل فرما کر ان پر بہت بڑا احسان کیا تو انہوں نے اپنے رسول کی بات کا یقین کرنے کے بجائے اللہ سے خود ہم کلام ہونے اور اس کا دیدار کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ اس پر بھی اللہ تعالیٰ نے ان پر گرفت نہ فرمائی تا کہ وہ شکرگزار ہوں۔ عبور دریا کے بعد جب بنی اسرائیل ایک صحرائی علاقہ میں سفر کر رہے تھے تو ان کی مشکلات کا مداوا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے خصوصی انعام فرمایا کہ دھوپ سے بچاؤ کے لیے بادلوں کا سایہ مہیا کیا۔ بیابان میں پانی کی تنگی محسوس ہوئی تو چٹان میں سے بارہ چشمے جاری کر دیے۔ غذا کی کمی لاحق ہوئی تو من و سلویٰ کی

نعمتیں عطا کیں۔ اس قدر انعام واکرام کی بارش کسی بھی احسان شناس انسان کے اندر شکر گزاری کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کافی تھی لیکن بنی اسرائیل کے بنجر دل ودماغ اس سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے۔ وہ برابر حرف شکایت زبان پر لاتے رہے اور اپنے رسول، حضرت موسیٰ علیہ السلام، کو انہوں نے زچ کیے رکھا۔ وہ خدا کی نعمتوں کو اپنا استحقاق سمجھتے رہے حالانکہ نعمتیں بطور استحقاق کسی کو حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ تو اللہ کا فضل واحسان ہوتا ہے کہ وہ جس کو چاہے نواز دے اور پھر امتحان کرے کہ نعمت پانے والے کے اندر شکر گزاری کی کوئی رمق ہے یا نہیں۔ بنی اسرائیل کو بتایا گیا کہ نعمتیں پاکر جب انہوں نے انابت کی بجائے تکبر کا رویہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی۔ چنانچہ جب ان کو حکم دیا گیا کہ بستی میں استغفار کرتے ہوئے داخل ہوں اور انہوں نے اس ہدایت کا مذاق اڑایا تو ان پر آسمانی آفت نازل ہوئی۔ جب انہوں نے من وسلویٰ کی ضیافت کی بے قدری کرتے ہوئے مصر کی سبزیوں اور دالوں کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت مسلط کر دی۔ علاوہ ازیں انہوں نے جب جب کوئی نافرمانی کی تو ان پر عذاب آیا۔ بنی اسرائیل کی یہ تاریخ خود بتاتی ہے کہ ان پر انعام واکرام بزرگوں کی اولاد ہونے کا نتیجہ تھا اور نہ ان کی کسی ذاتی فضیلت کا، بلکہ یہ محض اللہ کا فضل تھا۔ وہ اپنا فضل کسی خاندان کا فرد ہونے پر یا کسی گروہ کے ساتھ وابستگی پر نہیں کیا کرتا۔ وہ تو صرف بندے کے ایمان، عمل صالح اور آخرت پر یقین کی قدر کرتا ہے اور وہی لوگ مستحق اجر ٹھہرتے ہیں جو ان شرائط پر پورا اترتے ہوں۔

بنی اسرائیل ماضی میں بھی احسان ناشناس قوم رہے۔ یہ بات اسی طرح کے الفاظ میں صحیفہ زبور میں کہی گئی، حالانکہ معلوم ہے کہ یہ کتاب تورات کے نزول کے کئی سو سال بعد نازل ہوئی:

> اس نے سمندر کے دو حصے کر کے ان کو پار اتارا اور پانی کو تودہ کی طرح کھڑا کر دیا۔ اس نے دن کو بادل سے ان کی رہبری کی اور رات بھر آگ کی روشنی سے۔ اس نے بیابان میں چٹانوں کو چیرا اور ان کو گویا بحر سے خوب پلایا۔ اس نے چٹان میں سے ندیاں جاری کیں اور دریاؤں کی طرح پانی بہایا۔ تو بھی وہ اس کے خلاف گناہ کرتے ہی گئے اور بیابان میں حق تعالیٰ سے سرکشی کرتے رہے۔ اور انہوں نے اپنی خواہش کے مطابق کھانا مانگ کر اپنے دل میں خدا کو آزمایا بلکہ وہ خدا کے خلاف بکنے لگے اور کہا کیا خدا بیابان میں دستر خوان بچھا سکتا ہے؟ دیکھو اس نے چٹان کو مارا تو پانی پھوٹ نکلا اور ندیاں بہنے لگیں۔ کیا وہ روٹی بھی دے سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے لوگوں کے لیے گوشت مہیا کرے گا؟ پس خداوند سن کر غضبناک ہوا اور یعقوب کے خلاف آگ بھڑک اٹھی اور اسرائیل پر قہر ٹوٹ پڑا۔ اس لیے کہ وہ خدا پر ایمان نہ لائے اور اس کی نجات پر بھروسہ نہ کیا تو بھی اس نے افلاک کو حکم دیا اور آسمان کے دروازے کھولے اور کھانے کے لیے ان پر من

برسایا اوران کو آسمانی خوراک بخشی۔ انسانوں نے فرشتوں کی غذا کھائی۔اس نے کھانا بھیج کران کو آسودہ کیا ----باوجودان سب باتوں کے وہ گناہ کرتے ہی رہے اوراس کے عجیب وغریب کاموں پرایمان نہ لائے اس لیےاس نے ان کے دنوں کو بطالت سے اوران کے سالوں کو دہشت سے تمام کردیا------انہوں نے اپنے منہ سے اس کی خوشامد کی اوراپنی زبان سے اس سے جھوٹ بولا کیونکہ ان کا دل اس کے حضور درست نہ تھا اوروہ اس کے عہد میں وفادار نہ نکلے۔ (عہد نامہ عتیق۔زبور باب ۷۸)

اللہ کا عہد و پیمان:

بنی اسرائیل کی دوسری بڑی خوش فہمی جس میں مدینہ کے لوگ مبتلا تھے اور یہود کا آج تک عقیدہ چلی آرہی ہے، یہ ہے کہ خداوند نے ان کے ساتھ عہد و پیمان کر رکھا ہے کہ وہ رہتی دنیا تک ان کو امتوں کا پیشوا بنائے گا اور انہیں ایک منتخب گروہ ہونے کا شرف ہمیشہ حاصل رہے گا۔عہد و پیمان کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ دو پارٹیوں کے درمیان ہوتا ہے، یک طرفہ نہیں ہوتا۔لہٰذا اس کے تحت حقوق وفرائض صرف ایک پارٹی کے لیے نہیں ہوتے بلکہ فریقین پر یکساں عائد ہوتے ہیں۔یہود کو اس عہد کے تحت حاصل ہونے والا درجہ اور مرتبہ تو یاد رہ گیا لیکن وہ یہ بھول گئے کہ انہیں جو کچھ حاصل ہونا ہے وہ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے بعد حاصل ہونا ہے جو عہد کے تحت ان پر عائد ہوتی ہیں۔ورنہ یہ عہد ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔

یہود کو آگاہ کیا گیا کہ ان پر عہد کی ذمہ داری یہ تھی کہ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے پکڑیں اور زندگی میں اس سے رہنمائی حاصل کریں، لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے احکام سے بچنے کے لیے حیلے تراشے۔وہ اپنے رسول کو سوال و جواب کے چکر میں ڈال کر احکام سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے۔اس کی ہر بات میں مین میکھ نکالتے۔کلام اللہ کی تحریف کرتے اوراس کو اپنے مطلب کے معنی پہناتے۔ فتوے خود لکھتے لیکن منسوب ان کو اللہ کی طرف کردیتے۔ ان کے علماء نے عوام الناس کو دین کے اصل حقائق سے آگاہ کرنے کے بجائے دین کی ایسی غلط تصویر پیش کی کہ وہ اپنی نجات کے خواب دیکھیں اور خوش فہمیوں میں مبتلا رہیں۔ان کو یہ عقیدہ دے دیا کہ ان کے گناہ جو کچھ بھی ہوں یہودی ہونے کے باعث دوزخ کی آگ ان کو بس چند روز ہی برداشت کرنی ہوگی، جبکہ اس عقیدہ کی کوئی بنیاد نہیں۔خدا نے کسی صحیفہ آسمانی میں لوگوں کو ایسی کھلی چھٹی نہیں دی اور نہ وہ اس غلط توقع کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس نے جو عقیدہ دے رکھا ہے، اور وہ سب امتوں کے لیے ہے، یہ ہے کہ کوئی شخص جب گناہ کی زندگی اختیار کرلے اور وہ گناہ اس کا اوڑھنا بچھونا بن جائے تو ایسے شخص کو دوزخ میں ڈالا جائے گا اور یہ داخلہ چند روزہ نہیں، بلکہ ہمیشہ

کے لیے ہوگا۔

یہی نہیں بلکہ بعض خاص معاہدوں کی نشان دہی بھی کی گئی اور بتایا گیا کہ یہود ان کو پورا کرنے میں ناکام رہے۔ مثال کے طور پر ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے، والدین کے ساتھ حسن سلوک کریں گے، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے اچھا برتاؤ کریں گے۔ نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کریں گے تو انہوں نے ان احکام کی خلاف ورزی کو اپنا وطیرہ بنا لیا۔ ان سے عہد لیا گیا کہ نہ وہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کریں گے اور نہ ان کو گھروں سے نکالیں گے۔ یہود نے اس عہد سے جان چھڑانے کا طریقہ یہ نکالا کہ وہ اپنے مخالف یہود کو قتل اور ان کے گھروں کو اجاڑنے کے لیے دوسرے لوگوں کو آلہ کار بناتے۔ جب انتقامی کارروائی مکمل ہو جاتی اور لوگ اسیر اور بے گھر ہو جاتے تو یہود دینداری کا مظاہرہ کرنے کے لیے اسیروں کا فدیہ دے کر ان کو آزاد کروا دیتے۔ پھر اللہ نے ان سے میثاق لے رکھا تھا کہ وہ احکام شریعت کو لوگوں کے سامنے واضح کرتے رہیں گے اور ان کو چھپانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن ان کا وطیرہ یہ رہا کہ تورات کے حصے بخرے کر دیے اور کسی کو اس کی ہوا تک نہ لگنے دیتے۔ ان کے ساتھ خاص میثاق کی ایک شق یہ تھی کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کرتے رہیں گے، اللہ کے رسولوں پر ایمان لائیں گے، ان کی مدد کریں گے اور دین کی جدوجہد میں مالی اعانت کریں گے۔ لیکن یہود نے اس میثاق کی ہر بات کی مخالفت کی اور میثاق کو توڑنے کے مجرم ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک میثاق خاص آخری رسول کی بابت ہوا۔ ان سے کہا گیا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو کتاب اور حکمت دے کر سرفراز فرمایا ہے تو جب خدا کا وہ عظیم رسول تمہارے پاس آئے جس کی علامات تمہیں بتا دی گئی ہیں تو تم لوگوں کو لازماً اس رسول پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی نصرت کے لیے اٹھنا ہوگا۔ جب یہ میثاق ہوا تو بنی اسرائیل سے خاص طور پر پوچھا گیا کہ اس عہد کو پورا کرو گے اور اس کی ذمہ داری کو نبھاؤ گے تو سب نے بے کم و کاست اس کا اقرار کر لیا۔ لیکن آخری رسول کی آمد پر ان کا رویہ ڈھکا چھپا نہیں ہے کہ وہ اس رسول کے سب سے پہلے انکار کرنے والے بنے اور اس کی مخالفت میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔

وحی آسمانی پر ایمان:

نبیوں کے بارے میں بنی اسرائیل سے جو عہد لیا گیا اس کا تقاضا یہ تھا کہ اپنی تاریخ کے ہر دور میں یہود تمام انبیاء و مصلحین پر ایمان لاتے اور ان کے شانہ بشانہ دین کی نصرت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے لیکن ان کی تاریخ جس بات کی گواہی دیتی تھی وہ یہ تھی کہ ہر دور میں جو لوگ دین کی دعوت لے کر اٹھے اور یہود کو ان کے مواعظ و تنقیدات پسند نہیں آئیں تو انہوں نے ایسے انبیاء و مصلحین کو قتل کر دیا۔ آخری دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے

جلیل القدر رسول ان میں مبعوث ہوئے تو یہود نے ان کے خلاف ریشہ دوانیاں کیں اور ان کو مشرک حکمرانوں کے ہاتھوں گرفتار کرانے کا باعث بنے۔ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے جن کے بارے میں خصوصی میثاق ان سے لیا گیا تھا اور ان کی علامات تک سے ان کو آگاہ کیا گیا تھا، تو انہوں نے جانتے ہوئے ان کی رسالت کا انکار کیا اور مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔

آنحضرتؐ کی دعوت کے مقابلہ میں یہود وقتاً فوقتاً اپنا موقف بدلتے بھی رہے۔ ایک مرحلہ پر ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارے پاس ہماری کتاب موجود ہے۔ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارے دل ادھر ادھر کی غیر ضروری باتیں سننے کے لیے کھلتے ہی نہیں۔ اللہ نے ان میں گمراہی کا داخلہ بند کر رکھا ہے۔ اس دعویٰ پر یہ معارضہ کیا گیا کہ ایمان کی یہ کون سی قسم ہے جس میں انبیاء و مصلحین کو قتل کرنا جائز ہو، شرک کی حدود واضح ہونے کے بعد لوگ خود تراشیدہ مورتی کی پوجا کو بھی دین سمجھ کر اختیار کر لیتے ہوں، کتاب الٰہی موجود ہو لیکن علماء کی اصل دلچسپی سحر، تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے کے ساتھ ہو۔ کیا کتاب اللہ پڑھنے کے بعد اس کا تقاضا تم نے یہی سمجھا کہ دنیا کی محبت تمہارے دلوں میں گھر کر گئی اور موت کا خوف تمہاری نیندیں حرام کر رہا ہے۔ صاحب ایمان لوگ تو موت سے ڈرا نہیں کرتے لیکن تم لوگ ہو کہ موت کی آرزو کی ہمت تو کبھی کر نہیں سکتے البتہ ہزاروں سال جینے کی خواہش تمہارے دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے۔

ایک مرحلہ پر یہود کا کہنا یہ تھا کہ قرآن کے وحی آسمانی ہونے پر ہمارا دل مطمئن نہیں ہوتا۔ انہیں بتایا گیا کہ اس کتاب کے سوا کسی دوسری کتاب میں وہ علامتیں نہیں پائی جاتیں جن سے تمہیں تمہاری کتابوں میں آگاہ کیا جا چکا ہے۔ یہی واحد کتاب ہے جو ان علامتوں کا صحیح مصداق بن کر آئی ہے۔ اہل کتاب کی ایک تعداد کا اس کو پہچان لینا اور اس پر ایمان لے آنا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ بنی اسرائیل جانتے بوجھتے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جن لوگوں کو شبہ ہے کہ یہ وحی آسمانی نہیں ہے تو وہ اس کی مانند ایک ہی سورہ تصنیف کر کے دکھا دیں۔ معلوم ہو گا کہ انسانی کاوش سے اس کا مثل تیار کرنا ممکن نہیں۔

پھر یہود لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لیے یہ کہتے کہ قرآن کے احکام تورات کے شرعی احکام سے مختلف ہیں۔ اگر یہ دونوں کتابیں ایک ہی منبع سے نازل ہوئی ہوتیں اور ان کو اتارنے والا ایک ہی اللہ ہوتا تو دونوں کتابوں میں فرق کیوں ہوتا۔ کیا اللہ تعالیٰ کی سوچ بدلتی رہتی ہے یا اس کے معیارات بدل جاتے ہیں۔ اس کا جواب رب کائنات کی جانب سے یہ آیا کہ کیا یہود کو اس بارے میں کوئی شبہ ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور کیا یہود یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور وہ کامل اختیار رکھتا ہے کہ بندوں کو کون سا حکم دے اور کون سا نہ دے۔ رب کائنات کی طرف سے اگر کسی حکم کو ختم کیا جاتا یا بدلا جاتا ہے تو بندوں کو اس سے بہتر اور پر حکمت حکم دیا

جاتا ہے۔ یہود نے ماضی میں اپنی شریر طبیعت کے باعث متعدد احکام شریعت کو اپنے لیے سخت بنالیا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ان کو منسوخ کر کے فطرت انسانی کے مطابق سیدھے سادے احکام دیے جائیں تاکہ آئندہ ہر دور کا انسان ان پر عمل کرنے میں دقت محسوس نہ کرے۔ یہود کو قرآن تورات سے اسی لیے مختلف نظر آتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ سے تعلق:

نبی علیہ السلام کی بعثت ملت ابراہیم پر ہوئی تھی جن کا پیش کردہ دین خالص توحید پر مبنی اور فطرت انسانی سے قریب تھا۔ ابراہیمؑ کائنات کی نشانیوں سے استدلال کرتے اور رب کائنات کی صفات تک رسائی پاتے۔ یہود کی طبیعت اس کے برعکس مشکل پسند تھی۔ وہ احکام میں مین میکھ نکالتے اور فقیہانہ موشگافیوں سے دین کو اپنے لیے مشکل بنالیتے۔ قرآن مجید میں استدلال کی بنیادیں کائنات کے مشاہدہ اور فطرت انسانی کے ادراکات اور طبعی تقاضوں پر استوار کی گئی تھیں جو ملت ابراہیم کا معروف طریقہ تھا۔ بنی اسرائیل کا نسبی تعلق اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ تھا لیکن وہ حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام کے ساتھ اپنی نسبت کو زیادہ نمایاں کرتے اور اس پر فخر کرتے۔ نبی علیہ السلام کا تعلق بنی اسماعیل سے تھا جو پورے عرب میں پھیلے ہوئے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کو اپنا جد امجد اور رہنما تسلیم کرتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ یہود مدینہ نے جب یہ صورت حال دیکھی تو یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ حضرت ابراہیمؑ کا کوئی تعلق مکہ سے نہ تھا۔ وہ تو یہودی تھے اور نجات اگر ہے تو یہودی بننے ہی میں ہے۔ یہ بات تاریخی طور پر غلط تھی۔ لہٰذا یہود کو بتایا گیا کہ ان کا موقف ایک کھلا جھوٹ اور تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

تاریخی طور پر حضرت ابراہیمؑ کے پوتے اور پڑپوتے کنعان سے مصر کو منتقل ہوئے۔ وہاں کئی نسلیں گزر جانے کے بعد بنی اسرائیل ایک قوم بنے۔ ان پر قبطی قوم نے سختیاں شروع کر دیں اور ان کو غلام کا درجہ دے دیا۔ اسی دور غلامی میں ان کے اندر حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے جن کی تبلیغ کے نتیجہ میں بنی اسرائیل میں دین سے تعلق کچھ مضبوط ہوا اور وہ ان کو مصر سے نکال لائے۔ اس مرحلہ پر تورات نازل ہوئی۔ اس پر مزید کئی صدیاں گزریں تو یہودیت بطور ایک مذہب معروف ہوئی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ حضرت ابراہیمؑ یہودی تھے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔

یہود اور دوسرے اہل کتاب، نیز مشرکین عرب، کو حضرت ابراہیمؑ کی اصل تاریخ سے بھی آگاہ کیا گیا۔ یہ بتایا گیا کہ اولاً جس طرح وہ دین حنیف کے علمبردار تھے اسی طرح ان کی اولاد اس دین کے بارے میں کسی اشتباہ میں گرفتار نہ تھی اور وہ اپنی اولادوں کو وصیت کرتے تھے کہ دین فطرت میں کوئی رخنہ نہ ڈالیں۔ ثانیاً، حضرت ابراہیمؑ کے تمام آثار مکہ میں پائے جاتے ہیں۔ تمام بنی اسماعیل بالعموم اور قریش بالخصوص ان کو اپنا جد امجد مانتے ہیں اور یہ عرب میں مقیم ہیں۔ ان کی تعمیر کردہ عبادت گاہ ''خانہ کعبہ'' مکہ میں موجود ہے، قربانی اور حج کی عظیم عبادات جوان

کے زمانے میں مقرر ہوئیں اسی معبد کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کے زمانہ سے لے کر اب تک ان پر عمل ہو رہا ہے۔ انہوں نے اس معبد کے حوالہ سے امن کی جو دعائیں کی تھیں وہ قبول ہوئیں اور اللہ کا یہ گھر آج بھی گہوارہ امن ہے۔ یہود کے کسی متبرک مقام میں حضرت ابراہیمؑ کے ایسے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ ثالثاً تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ کے واحد بیٹے حضرت اسماعیلؑ ان کے ہمراہ تھے۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی نسل میں ایک عظیم رسول کی بعثت کی دعا کی جو قوم کو اللہ کی آیات سنائے، ان کو احکام شریعت اور فلسفہ دین کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق سنوارے۔ لہٰذا یہ دعا اصلاً اولاد اسماعیل کے اندر رسول کی بعثت کے لیے تھی جو قبول ہوئی اور محمد رسول اللہ ﷺ اسی دعا کے نتیجہ میں مبعوث ہوئے۔ ان کے فرائض بھی وہی ہیں جن کا تذکرہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں ہے۔

ان اساسات کو واضح کرنے کے بعد یہود کو دعوت دی گئی کہ وہ اگر حق کے ساتھ ذرا برابر بھی لگاؤ رکھتے ہیں تو اپنی عصبیت کے خول سے نکلیں، محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں جو اللہ کے ساتھ کیے گئے میثاق کا تقاضا ہے۔ اس مدلل معارضہ کا جواب، ظاہر ہے کہ یہود کے پاس نہ تھا۔ وہ حسد کی آگ میں جل رہے تھے کہ رسالت کا تاج ان کو نظر انداز کر کے بنی اسماعیل کے ایک فرد کے سر پر کیوں سجا دیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے نبی ﷺ کی دعوت کو ناکام بنانے کے منصوبے بنانے شروع کیے اور اس کام میں اپنے گماشتوں اور ایجنٹوں کو خوب استعمال کیا۔

آنحضرت ﷺ کے خلاف یہود کی ریشہ دوانیاں:

یہود ہمیشہ سے ایک سازشی قوم کی حیثیت سے معروف رہے ہیں۔ دوسری قوموں کے بالمقابل اپنی برتری کے احساس نے ان کو اپنے حریفوں کے خلاف ہر زیادتی کے لیے جری کر دیا ہے۔ چونکہ ان کی عددی قوت کم ہے اس لیے انہیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے سازش اور حیلہ جوئی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر ان کی منصوبہ بندی کے نتیجہ میں مقاصد پورے ہو جائیں تو ٹھیک، ورنہ وہ حریفوں کو زک پہنچانے حتیٰ کہ ان کو قتل کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خود اپنی صفوں میں اٹھنے والے مصلحین کی دعوت اصلاح کو چٹکیوں میں اڑا دیا اور انبیاء تک کی بھی تکذیب اور ان کے قتل کی سازشیں کیں۔ یہود کی ملی تاریخ کے اس پس منظر میں نبی اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھی مسلمان یہود کو چیلنج کر کے ان کی معاندانہ کارروائیوں سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔ یہود نے اپنے صدیوں کے آزمودہ حربے پے در پے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر آزمائے۔

دینداری کا پروپیگنڈا:

نبی اکرم ﷺ کی مدینہ آمد سے پہلے سے یہود نے اہل کتاب ہونے کے باعث عربوں پر اپنی دینداری کا

رعب جما رکھا تھا- وہ اس کی نمائش کرتے- تعویذ گنڈے اور جادوٹونے میں مہارت کی بدولت وہ عربوں کی عقیدت کا مرکز بھی تھے- چنانچہ نبی ﷺ کی دعوت کے مقابلہ میں انہوں نے اپنی دینداری کو سب سے پہلے کیش کرانے کی کوشش کی- وہ ظاہر کرتے کہ ہمارے لیے اس دعوت میں کوئی نئی بات نہیں- ہم تو خود اللہ پر، آسمانی کتابوں پر اور آخرت پر ایمان رکھنے والے لوگ ہیں- لہذا ہم اس دعوت کے مخاطب نہیں ہیں- اس پر ایمان لانا ہو تو وہ لوگ ایمان لے آئیں جو ان چیزوں کو پہلے سے نہ مانتے ہوں- عام آدمی جب یہ دیکھتا کہ فی الواقع اسلام اور یہودیت کے بنیادی عقائد میں کوئی فرق نہیں تو وہ یہود کی بات سے متاثر ہوتا اور سمجھتا کہ ان سے ایمان کا مطالبہ واقعتاً ایک غیر مطلوب بات ہے- یہود اس سے آگے بڑھ کر یہ موقف اختیار کرتے کہ اہل کتاب کے ہوتے ہوئے انہی بنیادوں پر ایک نئی دعوت معاشرہ میں خلفشار کا باعث ہے اور مسلمان لوگوں کے درمیان منافرت پیدا کر رہے ہیں- جبکہ ہم یہود صلح جو لوگ ہیں اور امن چین قائم رکھنے کے خواہش مند ہیں- لوگوں کے درمیان ایمان اور کفر کی بنا پر تفریق نہیں ہونی چاہیے- اس کے نتیجہ میں عداوتیں پیدا ہوں گی- لہذا ہم سب کو مل جل کر معاشرہ کو اس صورت حال سے بچانے کی سعی کرنی چاہیے- ان یہود کو جب یہ کہا جاتا کہ جب یہ دعوت نئی نہیں تو وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح اسلام کیوں قبول نہیں کرتے تو ان کا عناد ظاہر ہو جاتا اور وہ اسلام قبول کرنے والوں کے لیے نہایت تحقیر آمیز الفاظ استعمال کرتے کہ ان لوگوں کی احمقانہ روش ہی نے یہ دن دکھائے ہیں کہ معاملات بگڑتے چلے جا رہے ہیں- اگر وہ یہ حماقت نہ کرتے تو آج صورت حال مختلف ہوتی-

یہود کے بعض نمایاں افراد ظاہری طور پر مسلمانوں میں اس طرح گھل مل جاتے اور اپنے ایمان و اسلام کا ذکر کچھ ایسے انداز سے کرتے کہ خود ان کے یہودی ساتھیوں کو شبہ ہونے لگتا کہ ان لوگوں نے دل سے اسلام قبول نہ کر رکھا ہو- لیکن حقیقت میں یہ ایک دام ہم رنگ زمین ہوتا جس کا مقصد مسلمانوں کے اندر شامل ہو کر ان کے معاملات میں نقب لگانا ہوتا- اسی لیے جب وہ اپنی نجی محفلوں میں ہوتے تو اپنے طریقہ کار کا دفاع کرتے اور ساتھیوں کو بتاتے کہ ان کا یہ طرز عمل مسلمانوں کو خوش فہمی میں مبتلا کر کے بیوقوف بنانے کے لیے ہے- یہ لوگ بظاہر علم دوستی کے اظہار کے لیے، لیکن فی الحقیقت نبی ﷺ کو زچ کرنے کے لیے، عجیب وغریب سوالات کرتے جس کی مثالیں ہمیں احادیث میں ملتی ہیں- سیرت کی کتابوں میں ان ربّیوں کے نام دیے گئے ہیں جو بظاہر اسلام کے وفادار بن کر نبی ﷺ کی مجالس میں شریک ہوتے لیکن ساتھ ہی مسلمانوں کی دل شکنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے- یہ طرز عمل وقتی طور پر مؤثر ہوتا ہے- حالات میں اگر تبدیلی واقع نہ ہو تو طویل عرصہ تک اس منافقت کو نبھایا

جا سکتا ہے۔لیکن ہجرت کے بعد کے آئے دن بدلتے ہوئے حالات میں، جبکہ حق و باطل کی کشمکش اپنے عروج پر تھی، کسی شخص کے لیے طویل مدت تک اپنے حقیقی خیالات اور ارادوں پر پردہ ڈالے رکھنا ممکن نہ تھا۔اجتماعی طور پر پیش آنے والے واقعات کے ضمن میں اگر کبھی ان یہود کے دلوں کی خباثت ان کی زبانوں پر آ جاتی تو وہ اپنے طرز عمل کی کوئی توجیہ نہ کر پاتے۔یہ زمانہ ایسا تھا جیسے ایک طوفانی بارش ہو رہی ہو، گھٹاؤں نے ماحول کو تاریک کر رکھا ہو، کسی کسی وقت بجلی کوندتی ہو اور اس کے ساتھ بادل کی زوردار گرج سنائی دیتی ہو۔ان حالات میں ایک گروہ محو سفر ہو۔ تاریکی کے باعث وہ اپنی راہ کا تعین نہ کر پا رہا ہو۔بجلی کے کوندنے سے دو چار قدم روشنی میں چل لیتا ہو لیکن پھر تاریکی میں ٹھٹک کر رہ جاتا ہو۔بادلوں کی گرج اس کے لیے موت کا پیغام لاتی ہو اور ہر مرتبہ وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے پر مجبور ہو جاتا ہو۔ان یہود کی کیفیت ایسے ہی گم کردہ راہ گروہ کی تھی۔نبی ﷺ کی کامیابیاں ان کی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔اسلام قبول کرنا اپنے مفادات پر لات مارنے کا تقاضا کرتا تھا اور اس قربانی میں یہود کو اپنی موت نظر آتی تھی۔جھوٹ بول کر یا فریب دے کر وہ اپنا کام کسی حد تک نکالتے لیکن پھر ششدر رہ جاتے کیونکہ آگے بڑھنے کی راہ مسدود نظر آتی۔وقت گزرنے کے ساتھ ان یہود کے لیے ناگزیر ہو گیا کہ یا تو وہ سیدھے طریقہ سے اسلام قبول کریں یا دشمنان اسلام کی صفوں میں جا شامل ہوں۔

اسلام اور کفر کا کھیل:

بعض یہودی علماء نے لوگوں کو نبی ﷺ کی دعوت سے بدظن کرنے کے لیے یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا کہ وہ اپنے گماشتوں کو آنحضرتؐ کے پاس ایمان لانے کی غرض سے بھیجتے۔یہ لوگ جا کر اسلام قبول کرتے۔ مسلمانوں میں چرچا ہو جاتا کہ فلاں فلاں یہودی مسلمان ہو گئے ہیں۔جب وہ سمجھتے کہ اب ان کا اسلام ہر شخص کے علم میں آ چکا ہے تو یک لخت اعلان کر دیتے کہ انہوں نے اسلام میں داخل ہو کر اس کی خامیوں سے آگاہی حاصل کی ہے جن کے باعث وہ مسلمان رہ کر اپنے ایمان کو خطرہ سے دوچار نہیں کر سکتے۔لہذا وہ اس نئے دین سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔یہ باتیں جب کسی ایسے شخص کے منہ سے نکلیں جو لوگوں کے اندر دینداری کے اعتبار سے فضیلت رکھتا ہو اور لوگ یہ تاثر لیں کہ کوئی عامی آدمی نہیں بلکہ دین کے ایک پیشوا نئے دین کو اختیار کرنے کے بعد اس سے متنفر ہوئے ہیں تو اس تبدیلی مذہب کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نئے دین کی طرف بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں اور نئے نئے دین قبول کرنے والوں کے دلوں میں شکوک و شبہات کا بیج بویا جاتا ہے۔وہ سوچنے لگتے ہیں کہ ان سے ایک غلط فیصلہ تو نہیں ہو گیا کہ چھان پھٹک کے بغیر انہوں نے نیا دین قبول کر لیا ہو۔یہودی علماء اپنی اس حرکت سے اپنے عوام کو یہ غلط سبق دیتے کہ کم علم لوگ اسلام کی طرف بڑھ کر اپنا ایمان برباد کر رہے ہیں۔تم لوگ یہ غلطی نہ کرنا۔اپنے علماء کو

چھوڑ کر کسی کی بات ماننا ہمارے لیے جائز نہیں ہے-

باطل کے لیے دل بند ہونے کا دعویٰ:

یہودی علماء سے جب عوام الناس یہ سوال کرتے کہ آپ لوگ تو ہمیشہ سے دین کے علمبردار رہے ہیں- آپ اس نئی دعوت اصلاح کو کیوں قبول نہیں کر رہے ہیں حالانکہ یہ برابر مقبول ہو رہی ہے تو اس کا جواب وہ یہ دیتے کہ ایمان تو ہمارے رگ و پے میں رچا بسا ہوا ہے- ہم خداوند تعالیٰ کا محبوب گروہ ہیں اس لیے اس نے ہمارے ایمان کو غیر ضروری اور نئی باتوں سے اپنی حفاظت میں لے رکھا ہے- چنانچہ ہمارے دل ایمان سے سرشار گویا ایک غلاف میں بند کر دیے گئے ہیں- لہذا یہ نئی دعوت ہمیں متاثر نہیں کر سکتی- دوسرے لوگوں کے دل چونکہ محفوظ نہیں اس لیے وہ ہر کس و ناکس کی بات سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اس طرح گمراہ ہوتے ہیں- یہ جواب عوام کو مطمئن کر دیتا- قرآن مجید نے یہ حقیقت واضح کی کہ کسی حقیقت کے لیے ایک شخص کے دل بند ہونے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ جب آدمی اللہ کی نافرمانی کا بار بار مرتکب ہوتا ہو تو ایک وقت آتا ہے جب اللہ تعالیٰ اس کے دل کو سربمہر کر کے حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم کر دیتا ہے- یہ کیفیت اس شخص کو خدا کی رحمت سے محروم کرنے کی ہوتی ہے اور انتہائی بدبخت آدمی اس سے دوچار ہوتا ہے- ان یہودی علماء نے چونکہ اللہ کے رسول کی علامات پہچاننے کے بعد اس کی تکذیب کی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی رحمت کے دروازے بند کر دیے ہیں اور یہ اس لعنت کو اپنے ایمان کی حفاظت قرار دے رہے ہیں-

نبی ﷺ کی تحقیر:

ہجرت کے بعد اوس اور خزرج کے قبول اسلام اور تائید کی بدولت آنحضرت ﷺ کی سیاسی قوت کمزور نہیں رہ گئی تھی- آپ کی برملا تحقیر کرنا تو مسلمانوں کو جنگ پر اکسانے کے مترادف ہوتا- لہذا اپنے بغض کا اظہار یہود اس طرح کرتے کہ شرارت کی غرض سے حضورؐ کی مجالس میں شریک ہو کر بار بار آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتے تاکہ سننے والوں پر یہ اثر پڑے کہ یہ لوگ بڑے علم دوست ہیں اور بات کو خوب ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں- آنحضرت ﷺ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ عربوں کے معروف مجلسی الفاظ ہی استعمال کرتے- لیکن الفاظ کو کسی قدر دبا کر یا زبان کو قدرے مروڑ کر الفاظ کو ایسی شکل دے دیتے کہ ان میں آنحضرت ﷺ کے لیے تحقیر کے معانی پیدا ہو جاتے- ایسا کر کے وہ آپ کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے- اگر کوئی ان کی اس حرکت پر معترض ہوتا تو اسے کہہ دیتے کہ ہم نے تو فلاں معروف لفظ ہی بولا- شاید آپ نے ٹھیک سے سنا نہیں- کبھی وہ ذومعانی الفاظ بولتے جن کو عرب اچھے مفہوم میں بولتے لیکن یہ بدطینت گروہ تحقیر آمیز معانی میں استعمال کرتا- الفاظ کی طرز ادا خود

بتا دیتی کہ پیغمبر ﷺ کا تمسخر اڑانا مقصود ہے۔مجلسی الفاظ ہر مہذب قوم میں رائج ہوتے ہیں اور بالعموم ان کے اندر مخاطب کے لیے احترام کا جذبہ ملحوظ ہوتا ہے۔لیکن یہود کی شیطنت تھی کہ انہوں نے مہذب الفاظ کو گھٹیا معانی پہنائے اور ان کو دل کی بھڑاس نکالنے کا ذریعہ بنایا۔

ان مجلسی الفاظ میں ایک لفظ رَاعِنَــا تھا جس کے معنی ہیں 'ذرا ہمارا خیال رکھیے'۔یہ اس موقع پر بولا جاتا جب مخاطب سے یہ درخواست کرنی ہوتی کہ ان کی بات پوری طرح گرفت میں نہیں آئی۔ذرا دوبارہ ارشاد فرما دیں۔یہود راعنا کے حرف عین کی زیر کو کھینچ کر ادا کرتے تو لفظ رَاعِیــنــا کی آواز پیدا ہوتی جس کا معنی ہے 'اے ہمارے چرواہے'۔اللہ تعالیٰ نے یہود کی اس شرارت سے اپنے رسول کو اس طرح محفوظ کیا کہ مسلمانوں کو یہ لفظ ترک کرنے اور اس کے بجائے اس کا ہم معنی لفظ اُنْظُرنَا استعمال کرنے کا حکم دیا۔

دوسرا لفظ سَمِعنَا وَ اَطَعنَا تھا جس کے لفظی معنی ہیں 'ہم نے سنا اور اطاعت کی'۔عوام الناس اپنے امیر یا سردار کے ارشاد پر اپنی وفاداری اور تعمیل حکم پر آمادگی کے اظہار کے لیے یہ الفاظ بولتے کہ ہم نے آپ کا فرمان دل و جان سے قبول کر لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔یہودی اشرار کی نیت چونکہ کھوٹی تھی اس لیے وہ لب ولہجہ کے تصرف سے اور زبان کو توڑ مروڑ کر اَطَعنَا کی جگہ عَصَینا بولتے جس سے معنی میں یہ تبدیلی پیدا ہو جاتی کہ ہم نے سن تو لیا لیکن مانیں گے نہیں۔

تیسرا مجلسی لفظ جسے یہود اپنے مقصد کے لیے بولتے وہ اِسْمَع غَیرَ مُسمَعَ تھا۔جب کوئی بڑا آدمی تقریر کر رہا ہو تو اس کو داد دینے کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ سامعین ایک دوسرے کو تقریر کے عمدہ نکات کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ واہ واہ! سنو، یہ ایک ایسا نکتہ ہے جو پہلے کسی سے نہیں سنا۔نئی چیز ہے اس کی قدر کرو۔عربوں کے ہاں یہ الفاظ اسی معنی میں مستعمل تھے لیکن یہودی اشرار ان کو طنزیہ انداز میں بولتے۔مقصد یہ کہنا ہوتا کہ سنو، کیسی بے پر کی اڑائی جا رہی ہے۔ایسی بات کبھی سنی نہیں گئی۔آنحضرت کو بدطینت یہود کی تنقیص سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جملے کا ذو معنی حصہ غیر مسمع مسلمانوں کے لیے ممنوع قرار دے دیا۔

شعائر اسلام کا مذاق:

یہود کو صرف نبی ﷺ کی تحقیر مطلوب نہ تھی بلکہ وہ شعائر اسلام کا مذاق بھی اڑاتے۔جب نماز باجماعت کے لیے مسلمانوں کو اطلاع دینے کا طریق کار زیر غور آیا تو اہل کتاب کے گھنٹیاں بجانے کے طریقہ کے برعکس اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذان دینے کے طریقہ کی طرف رہنمائی آئی۔جب اس ہدایت پر عمل ہوا اور مساجد میں اذان دی جانے لگی تو یہود نہایت بھونڈے طریقہ سے مؤذن کی نقلیں اتارتے اور اس پر ہنستے ہنساتے حالانکہ اذان کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی

وحدانیت، اس کی کبریائی اور عظمت کے اظہار کا ذریعہ اور رب کی بندگی کی دعوت کے حامل ہیں- ان کا مذاق اڑانا گویا خود اللہ جل شانہٗ کی عظمت و کبریائی کا مذاق اڑانا ہے- لیکن یہود کی بدبختی انہیں اس سے بھی باز نہ رکھ سکی-

یہود کے معاندانہ رویہ کے نتیجہ میں نبی ﷺ اور اسلام کی دعوت کو تو کیا نقصان پہنچتا البتہ ان کے طرز عمل کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا اس تک رسائی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی- اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود اس کی پردہ دری کر دی- وہ یہ کہ یہود کسی غیر اسرائیلی نبی کے دعوائے نبوت کو سچا سمجھنے میں اپنی دینی سیادت و پیشوائی کی شکست محسوس کرتے ہیں- ان کے دلوں کا حسد ان کو طرح طرح کی حرکتیں کرنے اور عجیب و غریب نقطہ ہائے نظر پیش کرنے پر مجبور کرتا ہے- چنانچہ قرآن نے واضح کیا کہ بنی اسماعیل سے یہود کی نفرت کا عالم تو یہ ہے کہ وہ ان کی رکھی ہوئی درہم و دینار کی امانت میں خیانت کرنا بھی روا سمجھتے ہیں- یہاں تو معاملہ پوری امت کی پیشوائی کی امانت کا ہے جو یہود سے واپس لے کر بنی اسماعیل کو عطا کی جا رہی ہے- اتنا بڑا صدمہ ان سے برداشت نہیں ہو رہا ہے-

قرآن کے منزّل من اللہ ہونے کا انکار:

یہود کا ایک موقف یہ تھا کہ قرآن مجید جو آسمانی صحیفہ کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے کسی الہام پر مبنی نہیں بلکہ ایک انسانی کاوش ہے اور اس کو اسی حیثیت سے لینا چاہیے- اولاً، قرآن میں جو تمثیلات بیان ہوئی ہیں وہ مکھی، مچھر، مکڑی جیسی حقیر چیزوں کی ہیں جو ایک ایسی کتاب سے مطابقت نہیں رکھتیں جس کا منبع خدائے بلند و برتر کی ذات بتائی گئی ہے- ثانیاً، قرآن کو محمد (ﷺ) کے پاس لانے والا فرشتہ جبریل بتایا جاتا ہے- اگر ایسا ہے تو اس فرشتہ کو ہمیشہ بنی اسرائیل سے کد رہی ہے- اس کی وہی طبع پھر رنگ لائی ہے اور اس نے بنی اسرائیل کی مخالفت میں محمد (ﷺ) کو لا کھڑا کیا ہے اور ظاہر یہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات کی جگہ نئی کتاب نازل کر دی ہے- ثالثاً، قرآن اگر واقعۃً وحی الٰہی ہے تو جب نازل کرنے والی ذات ایک ہی ہے تو قرآن اور تورات کے احکام میں فرق کیسے واقع ہو گیا- رابعاً، ایک طرف اس شخص کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کا پیش کردہ دین ملت ابراہیم پر مبنی ہے اور دوسری طرف ابراہیمی شریعت میں جو چیزیں حرام تھیں، مثلاً اونٹ، ان کو حلال کیسے کر دیا گیا- خامساً، اگر محمد (ﷺ) واقعی اللہ کے رسول ہیں تو یہ اپنی کتاب آسمان سے اترتی ہوئی دکھا دیں تاکہ ہر شخص اس کا نازل ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے-

یہود کے یہ اعتراضات ایسے تھے جو معمولی عقل و فہم کے سادہ دل آدمی کو متاثر کر سکتے تھے- نئی کتاب کی اصلیت کے مشتبہ ہونے کا تصور یہودی عوام کے لیے یہ پیغام دیتا تھا کہ وہ اپنی کتاب --تورات-- پر ایمان کو متزلزل نہ ہونے دیں جس کے نزول کا مظاہرہ بنی اسرائیل کے اکابر کی پوری جماعت نے دیکھا- یہود کے ان اعتراضات کے جوابات اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو تعلیم کیے اور اس تعلیم کی روشنی میں آنحضرتؐ نے صورت حال کی

وضاحت فرمائی۔

قرآنی تمثیلات کی وضاحت:

تمثیل کا مقصد اعلیٰ حقائق اور اہم مضامین کو عقل عام کی گرفت میں لانا ہوتا ہے۔ لہذا ایک حقیقت کو نگاہوں کے سامنے مصور کرنے کے لیے جو چیز بھی مفید مطلب ہوسکتی ہو اس سے تمثیل میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے خواہ وہ مکھی ہو یا مچھر، اور خواہ وہ مکڑی ہو یا اس سے بھی کمتر کوئی چیز۔ خداوند تعالیٰ کے ساتھ جو شریک ٹھہرائے جاتے ہیں ان کے اوپر اعتماد کرنے کو اگر مکڑی کے جالے کی طرح بودا کہا جائے تو حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بتوں کے بے اثر ہونے کو اگر یوں سمجھایا جائے کہ ان کے چڑھاوے میں سے اگر ایک مکھی کھانے کی کوئی چیز لے کر اڑ جائے تو وہ اسے مکھی سے چھڑانے پر بھی قادر نہیں ہوتے تو ہر عامی بھی اس بات کو سمجھ جاتا ہے۔ ایسی حقیقت افروز تمثیلات پر اعتراض ادب کی اس اہم صنف کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اسے قرآن کے وحی و الہام کی تحقیر کے لیے استعمال کرنا خود ایسا کرنے والے کی نالائقی کا ثبوت ہے۔

جبریل امینؑ پر طعن:

جبریل علیہ السلام کے متعلق واضح کیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مکرم فرشتے ہیں۔ وہ اللہ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے۔ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں اذن ملتا ہے۔ اگر وہ محمد ﷺ کے دل پر قرآن نازل کر رہے ہیں تو اس میں ان کی اپنی مرضی کو کوئی دخل نہیں۔ لہذا ان پر معترض ہونا یا ان کے کسی عمل کا شاکی ہونا خود اللہ جل شانہ کی ذات کا شاکی ہونا ہے۔ پس اگر یہود جبریلؑ کے دشمن ہیں تو وہ اللہ رب العزت اور اس کے تمام ملائکہ کی دشمنی مول لے رہے ہیں۔ اور اس دشمنی میں وہ فرشتے بھی شامل ہیں جن کو وہ اپنا ہمدرد سمجھتے ہیں۔ یہود کو اگر اپنا یہ انجام گوارا ہے تو پھر اپنی یاوہ گوئی پر اصرار کریں ورنہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں جو اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے فراہم کیا ہے اور جس کی خبر انہیں پچھلے صحیفوں میں دی جا چکی ہے۔

تورات کے احکام کی منسوخی:

تورات کے احکام میں تبدیلی کے اعتراض کو وحی کے ذریعہ سے یوں رفع کیا گیا کہ تورات کا جو قانون منسوخ کیا جاتا ہے اس کی جگہ اس سے بہتر قانون دیا جا رہا ہے۔ اسی طرح یہود کے فراموش کردہ بعض احکام کو قرآن نے ان سے ملتے جلتے دوسرے احکام سے بدل دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب سے خوب تر شریعت عطا فرما رہا ہے۔ نیز احکام کو یہود کی پست ذہنیت کی تنگ نائے سے نکال کر اتنی وسعت دی جا رہی ہے کہ شریعت دنیا بھر کے انسانوں کی فطری ضرورتوں کو پورا کرنے والی بن جائے اور اس پر عمل کرنا ان کے لیے سہل ہو۔ چنانچہ یہود

کے مذہب کی غیر فطری پابندیوں کو اس دین میں ختم کیا جا رہا ہے- اللہ تعالیٰ بادشاہ ارض وسما ہے- اسے کلی اختیار حاصل ہے کہ جو حکم دینا چاہے دے اور جس حکم کو منسوخ کرنا چاہے منسوخ کر دے- یہود کے سر پیٹنے سے وہ اپنی شریعت میں ترمیم و تنسیخ کے حق سے دستبردار ہو سکتا اور نہ اس کا پیغمبر اس معاملہ میں کسی کوتاہی کا روادار ہو سکتا ہے-

ملت ابراھیمؑ میں تبدیلی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دیے ہوئے حلت وحرمت کے ضابطوں میں تبدیلی کے الزام کا جواب یوں دیا گیا کہ یہود تاریخی حقائق سے نابلد ہیں اور یہ الزام ان کی بے خبری کی دلیل ہے- ان کے ہاں اگر اونٹ حرام جانور ہے تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ ابراہیمی شریعت میں بھی حرام تھا- حقیقت حال یہ ہے کہ اونٹ حلال جانور قرار دیا گیا تھا- حضرت ابراہیمؑ کے بعد ان کے پوتے حضرت یعقوبؑ کسی بیماری یا ذاتی وجوہ کی بناء پر اس کا گوشت کھانے سے اجتناب کرتے تھے- یہود نے ان کی اتباع میں اونٹ کا گوشت کھانے سے گریز کیا جسے بعد میں ان کے فقیہوں نے حرام قرار دے دیا- اسلام کی تعلیم چونکہ ملت ابراہیم کے مطابق ہے لہذا اس میں اونٹ کو حرام جانور قرار دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا-

آسمان سے کتاب کا نزول:

ان تمام نکات کی وضاحت ہو جانے کے بعد جب یہود کا اصرار اس بات پر ہوا کہ وہ اس وقت ایمان لائیں گے جب قرآن کو آسمان سے اترتا ہوا خود دیکھ لیں گے تو نبی ﷺ سخت دلگیر ہوئے- اس پر آپ کو تسلی دی گئی کہ حق بیزاری یہود کی سرشت میں ہے- اس بدطینت قوم کے لیے آپ تو غیر ہیں، انہوں نے تو موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا کہ اگر واقعی اللہ تعالیٰ ان سے ہمکلام ہوتا ہے تو اس کے ثبوت کے لیے اللہ کی زیارت ان کو بھی کرائیں- اس مطالبہ نے اس قدر زور پکڑا کہ موسیٰ مجبور ہو کر بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو کوہ طور پر لے گئے- جب اللہ تعالیٰ نے اپنی جلالت کا اظہار فرمایا تو بنی اسرائیل کا یہ وفد جلال خداوندی کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گیا- پس رسولوں کی نافرمانی اس قوم کی عادت ثانیہ بن چکی ہے- یہ اللہ کی پکڑ میں آئے ہوئے لوگ ہیں- ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ ہدایت کے دروازے بند کر دیتا ہے- لہذا آپ ان کے رویہ سے دلگیر نہ ہوں-

یہود کے ساتھ اس مباحثہ کا نتیجہ واضح کر دیا کہ یہود بنی اسرائیل ایک بگڑی ہوئی قوم ہیں جن کا دین کے ساتھ تعلق برائے نام ہے۔ یہ کسی کے وفادار نہیں۔ ان کا خدا کے دین کا حامل ہونے کا استحقاق محض خوش فہمی پر مبنی ہے۔ تاریخ میں ان کو کئی مواقع دیے گئے لیکن یہ اپنی انانیت کے خول سے باہر نہیں نکلے۔ پیغمبر موعود، جن کا تذکرہ ان کی زبانوں پر رہا ہے، جب فی الحقیقت ان کے اندر آ چکے تو بجائے ان پر ایمان لانے کے یہ حسد میں مبتلا ہو گئے۔ اس حسد اور تکبر نے ان کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ اب ان کو حامل کتاب ہونے کی عزت دی جائے۔ لہٰذا اس بگڑے ہوئے گروہ کو اب بس واجبی سی اہمیت دی جائے اور ان کے شر سے محفوظ رہنے کی تدابیر کی جائیں۔

باب 26

امت مسلمہ کا قیام

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے فوراً بعد وہاں کے یہود کے ساتھ بحثوں کا مقصد ان کو آسمانی ہدایت کے نظام میں ان کا فراموش کردہ مقام یاد دلانا تھا تا کہ وہ آگے بڑھیں اور ہدایت کی مشعل کو پھر سے تھام لیں۔ وہ اس لائق تھے کہ آنحضرتؐ کے دست و بازو بن کر خدا کی برگزیدہ قوم کی حیثیت پھر سے حاصل کر لیتے لیکن سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چند علمائے یہود کے سوا فی الجملہ بنی اسرائیل نے اور ان کی پیروی میں کثیر تعداد میں غیر نسلی یہودیوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ چنانچہ قرآن نے ان کی غلط فہمیوں کو مدلل طریقہ سے دور کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ اگر وہ رسول اللہؐ پر ایمان نہیں لائیں گے تو ہمیشہ کے لیے ملعون اور راندۂ درگاہ قرار پائیں گے۔ یہ ان کے لیے سنبھلنے اور صحیح فیصلہ کرنے کا آخری موقع ہے۔ اگر ان کے دماغوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لیے رسالت کا منصب پانا ان کا خاندانی حق ہے تو وہ اس غلط فہمی کو جتنا جلد دور کر لیں ان کے حق میں بہتر ہوگا۔

امت مسلمہ کا قیام:

اگر یہود کے ساتھ معارضہ کے نتائج کو دیکھا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن نے یہود کا یہ دعویٰ مسترد کر دیا کہ دنیا کی امامت کے مستحق وہی ہیں اور نبوت و رسالت ان کا خاندانی استحقاق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں محمد ﷺ کی رسالت کا اثبات کیا وہیں یہ بات واضح کر دی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا اسماعیلؑ کی اولاد کے حق میں کی تھی اب اس کی قبولیت کا وقت آ گیا اور ان کی اولاد نے فی الواقع امت مسلمہ کا منصب سنبھال لیا ہے۔ مکہ میں تو یہ امت اپنا وجود قائم رکھنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی تقویت کا سامان کر دیا۔ ایک ایسا خطہ اس کو مل گیا جہاں یہ امن اور چین کی فضا میں سانس لے سکتی، خدا کے دین کو قائم کر سکتی، اجتماعی نوعیت کے احکام نافذ کر سکتی اور معاشرت کو اللہ کی رضا کے مطابق ڈھالنے کا اہتمام کر سکتی تھی۔ چنانچہ مدینہ کو ہجرت کے چند ماہ بعد ہی سے یہ کیفیت نمایاں ہو گئی کہ جیسے ایک نئی ریاست وجود میں آ رہی ہے جس کا اپنا نظام اور

اپنی قوت نافذہ ہے، جس کے باشندے پرعزم اور حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اب اس ریاست میں انہی کی رائے فیصلہ کن ہوگی اور اس کی مخالفت کرنے والے ٹکنے نہیں پائیں گے۔

ہجرت کو ابھی ایک ہی سال گزرا تھا کہ امت مسلمہ کو نماز کے بعد روزہ اور حج کے احکام دے دیے گئے۔ ابراہیمی تصور حلال وحرام کو نمایاں کیا گیا۔ نیکی کی ان اقدار کو روشناس کرایا گیا جن کا رواج اس نئے معاشرہ میں ضروری گردانا گیا۔ کردار کی وہ اساسات بتائی گئیں جو اس امت کے استحکام کے لیے ضروری تھیں اور جن کو اختیار کر کے یہ دنیا کی امامت کے منصب کے تقاضے پورے کر سکتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ محض نازل شدہ احکام سنانے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان احکام پر عمل درآمد کی راہیں بھی متعین کرتے۔ صحابہ کرامؓ پر نظر رکھتے کہ وہ ان پر کس طرح عمل کر رہے ہیں۔ جہاں غلطی یا کوتاہی نظر آتی وہیں اس کی اصلاح فرماتے اور درست طریقہ کی وضاحت فرماتے۔ قرآن کے اساسی احکام میں اگر کچھ تفصیلات مضمر ہوتیں تو آپ ان کو نمایاں کرتے کیونکہ احکام شریعت دینے کا یہ کام بھی آپ کے منصب کا تقاضا تھا۔ اس طریقہ سے نیا دین لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور اہل ایمان اس کا خوب خوب چرچا کر رہے تھے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو رہنمائی کے منصب پر مامور کیا تھا انہوں نے خدا کے ساتھ کیے گئے عہد کو توڑا، صراط مستقیم گم کر دی اور اللہ کی شریعت میں من مانی تحریف کر دی۔ اب عالم انسانیت کی ضرورت یہ تھی کہ آخری نبی کی لائی ہوئی تعلیم ایسے لوگوں کے حوالہ کی جائے جو اس کی حفاظت اپنی جان سے بھی بڑھ کر کریں۔ وہ ہر دور، ہر ملک، ہر زبان میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دیں اور اپنی اس ذمہ داری کو کبھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ یہ ذمہ داری صحابہ کرامؓ بطریق احسن ادا کر رہے تھے۔ اس ذمہ داری کا تذکرہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں ہوا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا. (بقرہ ۲:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔

یہ کام بے حد مشکل تھا اور مسلمان جن خطرات میں گھرے ہوئے تھے ان میں ایک ایک فرد کی بڑی اہمیت تھی۔ اس لیے ان تمام اہل ایمان کو، جو مختلف قبائل میں مقیم تھے اور ملک بھر میں بکھرے ہوئے تھے، یہ حکم دیا گیا کہ وہ فی الفور ہجرت کر کے مدینہ آ جائیں تاکہ اہل ایمان کی نفری میں اضافہ ہو اور وہ لوگ نبی ﷺ کی صحبت میں تربیت پا

کر دین کے نئے تقاضوں کو سمجھیں۔ یہ حکم کئی سالوں تک نافذ رہا۔ جو لوگ وسائل رکھنے کے باوجود ہجرت نہیں کر سکے ان پر منافقت کا الزام لگا۔ فتح مکہ تک اہل ایمان کا مدینہ پہنچنا ہجرت کے زمرہ میں آیا۔ اس کے بعد جن لوگوں نے مدینہ میں آباد ہونے کی خواہش کی ان کو نقل مکانی سے روک دیا گیا۔

امت مسلمہ کی خصوصی حیثیت کو نمایاں کرنے اور اس کا تعلق ملت ابراہیمؑ کے ساتھ ثابت کرنے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اس کو اپنی نمازوں میں حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ بیت اللہ ہی کو قبلہ قرار دینے کا حکم دیا جائے اور رسول اللہؐ کو ہدایت دی جائے کہ اب وہ بیت المقدس کی طرف سے رخ موڑ لیں۔

تحویل قبلہ کا حکم:

رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے تو، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، نماز کے لیے آپ اس طرح کھڑے ہوتے کہ بیت اللہ اور اس کے عین شمال میں بیت المقدس دونوں آپ کے سامنے ایک ہی رخ پر ہوتے۔ اہل ایمان کی اجتماعی عبادت کے لیے آپ نے دار ارقم کا انتخاب کیا۔ اس کی خصوصیت بھی یہی تھی کہ وہاں سے ان دونوں مقدس مقامات کو سامنے رکھنا ممکن تھا۔ آپ نے یہ عمل اس لیے شروع کیا کہ ابھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبلہ کا تعین آپ کے لیے نہیں کیا گیا تھا۔ اس طرح کی صورت حال میں آپ اہل کتاب کا طریقہ اختیار کر لیتے تھے۔ چونکہ ان کا قبلہ بیت المقدس تھا لہٰذا آپ مکہ میں دونوں مسجدوں کو سامنے رکھنے کا اہتمام کرتے۔ ہجرت کے بعد آپ مدینہ گئے تو وہاں سے مکہ جنوب کو اور بیت المقدس شمال کو تھا لہٰذا اب دونوں مقامات کو نماز میں سامنے جمع کرنا ممکن نہ رہا۔ ادھر سورہ بقرہ نازل ہوئی تو اس میں ابراہیمی قبلہ کی تاریخ بیان کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ حضرات ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی تعمیر بیت اللہ کے وقت کی دعا اب قبول کی گئی ہے۔ آپ ملت ابراہیم پر ہیں اور آپ کو آسمانی ہدایت اسی ملت کے مطابق دی جائے گی۔ نیز آپ کی امت وہی امت مسلمہ ہے جس کے لیے اللہ کے ان دو مخلص بندوں نے تمنا ظاہر کی تھی۔ ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہؐ کو شدت سے انتظار رہنے لگا کہ اصل قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم کب نازل ہوتا ہے۔ لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ ابھی کچھ عرصہ مزید آپ نمازیں بیت المقدس کے رخ پر ادا کریں۔

آپ مکہ میں رہے تو آپ کے اردگرد ماحول خانہ کعبہ سے انس رکھنے والوں کا تھا۔ یہ سب لوگ بنو اسماعیل میں سے تھے۔ مدینہ میں اسلام پھیلا تو اس نے پہلے اوس و خزرج کو متاثر کیا۔ ان کا تعلق بھی بنو اسماعیل سے تھا۔ یہ بھی خانہ کعبہ کے ساتھ وابستہ تھے جو ان کا مرکز عقیدت تھا۔ بیت المقدس بنی اسرائیل کا قبلہ تھا۔ لہٰذا نبی ﷺ کا اس

کو قبلہ بنانا بنو اسماعیل پر نہایت شاق تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کڑے امتحان میں کامیاب رہے۔ مدینہ میں یہود بکثرت آباد اور اثر و رسوخ رکھنے والے تھے۔ ان کو اپنے قبلہ بیت المقدس سے انس تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ قبلہ مشترک ہونے کے باعث وہ لپک کر نئے دین کو قبول کرتے جس کو علامات سے وہ پہچانتے تھے اور جس کا قبلہ وہی تھا جو ان یہود کا قبلہ تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہود نے بے رخی دکھائی اور بالعموم مخالفت پر اتر آئے۔ جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم ہوا تو اب یہود کے لیے نئے قبلہ کو تسلیم کرنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ پس سمت قبلہ کا حکم ایک ایسا امتحان تھا جس میں سے اسلام کے ابتدائی پندرہ سالوں میں ہر اس شخص کو گزرنا پڑا جو اسلام کی طرف مائل ہوتا اور جس کا تعلق بنو اسماعیل سے ہوتا۔ اس کے بعد یہ ہر اس شخص کے لیے سوہان روح ہو گیا جس کی وفاداریاں پہلے اہل کتاب کے ساتھ رہی تھیں۔

مدینہ میں حضورؐ کو تشریف لائے جب تقریباً سترہ ماہ ہو گئے تو اس وقت ابراہیمی قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ نے تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد اس کے رخ پر پہلی نماز عصر کی ادا کی۔ ایک مقتدی دوسری مسجد میں گئے تو وہاں نماز شمال کی طرف رخ کر کے پڑھی جا رہی تھی۔ انہوں نے بہ آواز بلند حلفاً یہ کہا کہ قبلہ بدل دیا گیا اور میں بیت اللہ کے رخ پر حضورؐ کی اقتدا میں نماز ادا کر کے آ رہا ہوں۔ یہ آواز سن کر تمام نمازی مڑ گئے اور بقیہ نماز بیت اللہ کے رخ پر ادا کی۔ اسی واقعہ کی یادگار مدینہ منورہ کی مسجد قبلتین ہے۔ اس حکم سے پہلے یہود اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اسلام بھی انہی کے دین کے تابع ایک دین ہے کیونکہ ان دونوں میں قبلہ مشترک ہے۔ اگر کوئی آدمی اسلام قبول کرتا ہے تو اپنے قبلہ پر ہی رہتا ہے۔ تحویل قبلہ کے حکم کے بعد یہودیوں نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ یہ دین کیسا ہے جس نے ایمان لانے والوں کو ابتدائی قبلہ ہی سے ہٹا دیا ہے۔ کیا قبلہ بھی روز روز تبدیل کرنے کی چیز ہے۔ اس طرح اہل کتاب میں سے جو خام قسم کے عناصر مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے ان کے کھرے اور کھوٹے میں تمیز ہو گئی۔

قبلہ کسی امت کا روحانی مرکز ہوتا ہے۔ ہم نماز میں کھڑے ہو کر جب قبلہ رو ہوتے ہیں تو اس بات کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں کہ ہم تمام دنیا سے رخ پھیر کر اپنی روح کی جلا کے لیے اپنے مرکز سے وابستہ ہو رہے ہیں تا کہ ہمیں وہاں کے فیوض و برکات میں سے حصہ ملے۔ جن لوگوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول نہیں ہوتی وہ حیران ہوتے ہیں کہ آخر مکہ مکرمہ میں چھوٹے بڑے پتھروں سے تعمیر کیے ہوئے اس کمرہ کی وہ کیا خصوصیت ہے کہ لوگ

والہانہ اس کا طواف کرتے اور سفر و حضر میں اس کی سمت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ اصل میں ان لوگوں کی نظر اس اخلاص وللّٰہیت پر نہیں ہوتی جس کے ساتھ اللہ کے دو مقبول بندوں نے اس کے حکم کے تحت اسے تعمیر کیا، پھر اسے اپنی جبینوں سے بسایا۔ اس کے پاس قربانیاں پیش کیں۔ اس کو مرکز نگاہ بنائے رکھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کر دی اور اسے اپنا گھر قرار دیا۔ اب اللہ کے گھر سے بڑھ کر کون سا مقام مقدس و محترم ہو سکتا ہے کہ اس کو ایک امت اپنا مرکز عقیدت بنائے۔ اس گھر سے اتنے نیک لوگ ہر زمانہ میں وابستہ رہے ہیں اور اس کی روایات اتنی عظیم ہیں کہ امت مسلمہ کے نظام اجتماعی میں اس کو وہی اہمیت حاصل ہے جو جسم میں قلب کو حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح قلب کے بغیر جسم کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا اسی طرح قبلہ کے بغیر ملت اسلامیہ کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے۔

قبلہ کی تبدیلی کا حکم کچھ راویوں کے بقول رجب ۲ھ میں اور کچھ راویوں کے نزدیک شعبان ۲ھ میں نازل ہوا۔ اس حکم میں قریش کے لیے یہ پیغام تھا کہ وہ اللہ کے جس گھر پر قابض ہیں اب وہ رسول اللہؐ اور ان کے ساتھیوں کا قبلہ ہے جس پر اب ان لوگوں کا قبضہ باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں جو اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں بدعہد اور خائن ثابت ہو چکے ہیں۔ لہٰذا مسلمان اب اپنے قبلہ کی بازیافت میں قتال سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ ہمارے نزدیک تحویل قبلہ کا یہ حکم غزوہ بدر کے اسباب میں سے ایک سبب تھا۔ چونکہ غزوہ بدر کی تیاری اوائل رمضان میں شروع ہو گئی تھی لہٰذا تحویل قبلہ کے حکم کا نزول رجب میں ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔

قتال کے اساسی احکام:

تحویل قبلہ کے بعد امت مسلمہ ملت ابراہیم کے وارث کی حیثیت سے اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ممتاز ہو کر سامنے آ گئی تو اہل کتاب کے حسد اور غیظ و غضب میں اضافہ ہو گیا۔ ادھر قریش کو اس کی خبر ہوئی تو انہیں اپنی توقعات ختم ہوتی نظر آئیں جو وہ اجنبی ماحول میں رسول اللہؐ کے ناکام ہونے کی باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اسلام کا پودا مدینہ کی سرزمین میں جڑ پکڑ چکا ہے اور عنقریب تن آور درخت بنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ابھی سے اس کا سدباب کرنا ضروری ہے۔ یہود اور قریش دونوں نے مل کر اس کے لیے جنگی حکمت عملی کا منصوبہ تیار کرنا شروع کیا۔

ادھر نبی ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کو بتایا گیا کہ تحویل قبلہ کے بعد یہ امت ممتاز ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ لہٰذا مخالفین اب جنگوں کے ذریعے اس کو دبانے اور ختم کرنے کی کوشش کریں گے اس لیے خوف، مالی و جانی نقصان اور

خوراک کی کمی کے مسائل پیدا ہوں گے۔ ان آزمائشوں کا مقابلہ عزم واستقلال اور جرأت سے کرنا ہوگا جس کے پیدا کرنے کا ذریعہ نمازوں کی کثرت اور صبر کی صفت ہے۔ دشمنوں کے حملوں کے حوالہ سے ایک پلان قرآن مجید نے دے دیا تا کہ جیسے جیسے حالات کا تقاضا ہو اس پلان کے مطابق ضروری اقدامات کر لیے جائیں۔ وہ پلان حسب ذیل ہے:

وَقَاتِلُوْا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا. اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ. وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ. كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ. فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ. فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ. اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ. فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَااعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ.

(بقرہ ۲: ۱۹۰۔۱۹۴)

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کریں اور حد سے بڑھنے والے نہ بنو۔ بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور ان کو جہاں کہیں تم پاؤ قتل کرو اور ان کو وہاں سے نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس خود پہل کر کے جنگ نہ کرو جب تک وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں۔ پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان کو قتل کرو۔ یہی کافروں کا بدلہ ہے۔ پس اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ اور اگر یہ باز آ جائیں تو پھر اقدام صرف ان کے خلاف جائز ہے جو ظالم ہیں۔ شہر حرام شہر حرام کا بدلہ ہے اور اسی طرح دوسری محترم چیزوں کا بھی قصاص ہے تو جو تم پر زیادتی کریں تم بھی ان کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر ان کو جواب دو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ اللہ حدود الٰہی کا احترام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ان آیات میں جو لائحہ عمل مسلمانوں کو دیا گیا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

۱۔ کفار قریش اگر جنگ چھیڑتے ہیں تو مسلمان بھی میدان میں آ جائیں۔ ان کی جنگ اللہ کی راہ میں جنگ ہوگی۔ کیونکہ کفار کے پیش نظر اللہ کے دین اور اس کے علمبرداروں کا قلع قمع کرنا ہے۔

۲۔ جنگ اگر محترم مہینوں میں چھیڑی جائے تب بھی جوابی کارروائی کی جائے، لیکن ضرورت سے زیادہ اس کو طول دینا جائز نہیں ہوگا۔ اس جنگ میں مہینوں کا احترام اہل ایمان یک طرفہ طور پر ملحوظ نہیں رکھیں گے۔

۳۔ مسجد حرام کی حدود میں جنگ کرنے میں پہل نہ کی جائے۔ لیکن اگر کفار باز نہ آئیں تو وہاں بھی ان سے لڑا جائے۔

۴۔ اب قتال واجب ہو چکا ہے اور یہ اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک اسلام بحیثیت دین ملک میں غلبہ حاصل نہیں کر لیتا اور کفار اس کی راہ میں رکاوٹ بننے سے باز نہیں آتے۔

۵۔ غلبہ پا کر کفار کو مکہ سے بے دخل کر دیا جائے۔ اس کے لیے پالیسی یہ رہے گی کہ ان کو کہیں بھی امان حاصل نہ ہو۔ وہ جہاں پائے جائیں قتل کر دیے جائیں۔

۶۔ اگر کفار باز آ کر راہ راست اختیار کرتے ہیں تو ان کے لیے عام معافی ہوگی۔ باز نہ آنے والوں کے خلاف اقدام کیا جائے گا۔

آگے کے تمام مراحل میں اسی نقشۂ کار کے مطابق عمل ہوا اور نبی ﷺ نے قریش کے ساتھ جنگ اور صلح میں انہی رہنما اصولوں کو ملحوظ رکھا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

ہمارے بعض کرم فرما اپنا سارا زور قلم یہ ثابت کرنے پر صرف کرتے ہیں کہ اسلام صلح و آشتی کا مذہب ہے، اس کو جنگ و جدل سے کیا تعلق! لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اگر کبھی تلوار اٹھائی تو وہ محض اپنے دفاع میں اٹھائی ہے، آپؐ کے تمام غزوات دفاعی لڑائیاں ہیں جو قریش نے مسلمانوں پر مسلط کر دی تھیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو حضورؐ کو ہتھیار اٹھانے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ دوسری طرف ہمارے دشمنوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں نے رہزنی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ وہ معروف گزرگاہوں پر قریش کے تجارتی قافلوں کی تاک میں رہتے اور حملہ آور ہو کر ان کا مال لوٹتے۔ اس کے جواب میں قریش کو مجبوراً ان کو سبق سکھانے کے لیے مدینہ پر حملہ آور ہونا پڑتا۔ اگر مسلمان چین کے ساتھ مدینہ میں رہتے تو قریش کے لیے ان کے ساتھ کوئی وجہ مخاصمت نہ تھی۔ یہ دونوں موقف قرآن سے ثابت ہوتے ہیں اور نہ ان واقعات سے جن کو قدیم سیرت نگاروں نے قلم بند کیا ہے۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ دین کی تعلیم اگر یہ ہوتی کہ ظالموں کو ظلم و زیادتی کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے اور نیک لوگوں کو جنگ لڑنے سے روک کر ان کے ہاتھ باندھ دیے جائیں تو یہ زمین برے لوگوں کے فساد سے بھر جاتی۔ تب اللہ کا نام لینے والوں کی عبادت گاہیں ڈھا دی گئی ہوتیں۔ نہ عیسائیوں

کے گرجے باقی ہوتے، نہ یہودیوں کے کنیسے اور نہ مسلمانوں کی مسجدیں۔ اس صورت حال سے دنیا کو بچانے کے لیے یہ ضروری ہوا کہ اہل ایمان کو بھی جہاد وقتال کی اجازت ہو۔ وہ مفسدوں کے مقابلہ پر آئیں۔ جنگی سروسامان تیار کر کے دشمنوں پر اپنا رعب قائم کریں تاکہ وہ کسی پر ظلم و زیادتی کرنے کا حوصلہ نہ کریں۔ خاص رسول اللہ ﷺ کے معاملہ میں یہ وضاحت اوپر گزر چکی ہے کہ آپ کو مکہ ہی میں بتا دیا گیا تھا کہ اہل مکہ پر عذاب نازل ہونے کی ابتدائی شکل یہ ہوگی کہ ان کی جمعیت کو شکست سے دوچار کیا جائے گا اور وہ پیٹھ دکھا کر بھاگے گی۔ عین ہجرت کے وقت اہل ایمان کو قتال کا اذن ہوا۔ یعنی جب موقع پیش آجائے تو وہ جنگ سے گریز نہ کریں بلکہ قریش سے ان کے ظلم کا بدلہ لیں۔

باب 27

مدینہ کی حفاظت کی تدابیر

بالعموم اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے، اور یہ صحیح بھی ہے، کہ ہجرت سے پہلے اہل ایمان کو قتال کی اجازت نہیں تھی۔ مشرکین کے ظلم وتعدی کے ستائے ہوئے مسلمان اگر ہتھیار اٹھانے کا مطالبہ کرتے تو ان کو صبر کرنے، اپنے ہاتھ روکنے، کثرت سے ذکر الٰہی کرنے اور خدا پر بھروسہ کرنے کی ہدایت کی جاتی۔ قتال کا حکم ہجرت کے قریب دیا گیا اور، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا، اس قتال کو ملک بھر میں تمام ادیان پر دین اسلام کے غلبہ پانے تک جاری رہنا تھا۔ قریش اہل ایمان اور رسول اللہؐ کے ہجرت کر جانے سے اپنے طور پر مطمئن تھے کہ وہ اپنے اندر سے مسلمانوں کو نکال کر اہم کامیابی حاصل کر چکے ہیں، اس صورت حال میں وہ ایسی تدبیریں کرنے لگے جن سے مسلمانوں کی قوت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ ان تدبیروں کے مقابلہ کے لیے نبی ﷺ نے بھی ایسے اقدامات کیے جن سے قریش کی اسکیموں کا توڑ کیا جا سکتا تھا۔ اب ہم حضورؐ کے ان اقدامات کا جائزہ لیتے ہیں جو آپ نے قریش کے خطرہ کو دیکھتے ہوئے کیے۔

احتیاطی تدابیر:

۱۔ نبی ﷺ مدینہ کے اطراف میں برابر اپنے مخبر بھیجتے رہتے۔ اگر کسی جانب سے کوئی ایسی اطلاع موصول ہوتی جس میں دشمن کی آمد کا پتہ چلتا تو آپ راتوں کو جاگ کر پہرہ کا انتظام کرتے تاکہ دشمن بے خبری میں حملہ کر کے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ اس کے باوجود ہجرت کے ایک سال بعد مکہ کے کرز بن جابر فہری نے اہل مدینہ کی ایک چراگاہ پر، جو شہر سے تین میل کے فاصلے پر واقع تھی، حملہ کیا اور کئی جانوروں کو ہانک کر لے گیا۔ آنحضرتؐ نے اس کا تعاقب کیا لیکن اس کو پا نہ سکے۔

۲۔ حضورؐ نے مدینہ کے تمام باشندوں، جن میں اوس وخزرج کے یہود خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کے ساتھ

وہ معاہدہ کیا جو میثاق مدینہ کے نام سے معروف ہے۔ اس میں بطور خاص حسب ذیل شرائط رکھی گئیں:

(الف) کوئی شخص قریش مکہ اور ان کے کسی حلیف کو پناہ نہیں دے گا۔

(ب) اگر یثرب پر کوئی حملہ ہوا تو مسلمان اور یہود مل کر دفاع کریں گے۔

(ج) اگر مسلمان کسی سے صلح کریں گے تو یہود بھی اس صلح کے پابند ہوں گے اور اگر یہود کسی سے صلح کریں گے تو مسلمانوں پر بھی لازم ہوگا کہ یہود کے ساتھ ایسا ہی تعاون کریں۔ البتہ کسی فریق کی مذہبی جنگ میں دوسرے فریق پر تعاون کی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

(د) اگر کسی فریق یا جماعت کو کسی جنگی ضرورت سے مدینہ سے باہر جانا پڑا تو وہ امن و حفاظت کا حق رکھے گی اور جو مدینہ میں رہے گا اس کے لیے بھی امن ہوگا۔ نہ کسی پر ظلم کیا جائے گا اور نہ کسی کے لیے عہد شکنی جائز ہوگی۔

معاہدہ کی ان شقوں پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی ﷺ کو قریش کی مخاصمت اور اس کے نتیجہ میں ان کی طرف سے مدینہ پر حملہ کا اندیشہ تھا۔ اسی کے تدارک کے لیے میثاق مدینہ تحریر کیا گیا۔

۳۔ حضورؐ نے اطراف مدینہ میں آباد یہودی قبائل بنونضیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع سے بھی غیر جانبدار رہنے کے معاہدے کیے تاکہ وہ قریش کے آلۂ کار بن کر عین مسلمانوں کے مرکز میں رہتے ہوئے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اوس اور خزرج کے قبائل نے پہلے سے ان کے ساتھ حمایت و نصرت کے معاہدے کر رکھے تھے اس لیے حضورؐ کو بھی ان سے معاہدہ کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

۴۔ مکہ کے راستے میں پڑنے والے قبائل کے ساتھ آپ نے حلیفانہ معاہدے کر لیے۔ ان قبائل میں جہینہ، بنوضمرہ اور بنومدلج شامل ہیں۔ یہ قبائل پہلے مدینہ کے قبائل اوس و خزرج کے حلیف تھے۔ اہل مدینہ میں اسلام کے نفوذ نے ان قبائل کے ساتھ معاہدات کی راہ ہموار کر دی جن میں حسب ذیل شقیں رکھی گئیں:

(الف) اہل قبیلہ کا جان و مال محفوظ و مامون ہوگا۔

(ب) ان پر اگر کوئی زیادتی کرے گا یا حملہ آور ہوگا تو اس کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی۔

(ج) جو زیادتی یا جنگ ان کے اپنے لوگوں کے درمیان یا ان کے مذہبی معاملات سے متعلق ہو

گی اس میں امداد دینا لازم نہ ہوگا۔

مذکورہ تینوں قبائل کے ساتھ یہ معاہدے ہجرت کے پہلے سال کے دوران غزوہ بدر سے کئی ماہ پہلے طے پائے۔ ان کی تکمیل کے لیے حضورؐ صحابہ کی ڈیڑھ دو سو تعداد کے ساتھ ان قبائل کے پاس تشریف لے گئے۔ اگرچہ بعض راوی یہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ بدر سے قبل کسی مہم میں انصار شامل نہیں تھے لیکن حضورؐ کی ان مہمات کی تعداد اور اوس و خزرج کی ان قبائل کے ساتھ تعلقات کی نوعیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انصار ان مہمات میں حضورؐ کے ساتھ رہے ہوں۔ سیرت نگاروں نے ان سفروں کو غزوہ کا نام دیا ہے اور یہ غزوہ بواط، غزوہ ابوا اور غزوہ ذوالعشیرہ سے موسوم ہیں حالانکہ نہ ان کے لیے وہ تیاری کی گئی جو کسی جنگی مہم کے لیے ضروری ہوتی ہے اور نہ حضورؐ نے ان میں کوئی جنگی اقدام کیا۔ جب آپ بواط پہنچے تو قریش کا ایک تجارتی کارواں امیہ بن خلف کی سربراہی میں وہاں سے گزر رہا تھا۔ اسی طرح جب ذوالعشیرہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ کچھ ہی دیر پہلے ایک قریشی کاروان ابوسفیان کی سربراہی میں وہاں سے گزرا ہے۔ مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں نے رہزنی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اگر یہ بات تھی تو آخر نبی ﷺ نے ان دونوں مواقع سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا جبکہ آپ کے ہمراہ جاں نثاروں کی اچھی خاصی تعداد اس مقصد کے لیے بڑی کامیابی سے کارروائی کر سکتی تھی۔ تجارتی کاروانوں کو پالینا اور پھر ان پر ہاتھ نہ اٹھانا تو یہ ثابت کرتا ہے جیسے یہ واقعات مستشرقین کے الزام کی تردید ہی کے لیے پیش آئے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں سفر سیاسی نوعیت کے تھے جن میں ایسے قبائل کے ساتھ دوستی کے معاہدے کرنا مقصود تھا جن کے علاقے قریش کے مدینہ پر حملہ آور ہونے کی صورت میں راستہ میں پڑتے تھے۔ اگر یہ بات فرض کر لی جائے کہ حضورؐ قریش کے تجارتی کاروانوں کی نقل و حرکت سے باخبر رہتے تھے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ قبائل کے ساتھ معاہدہ کے لیے حضورؐ نے وقت کا جو انتخاب کیا اس سے قریش کو اپنی بیداری کا احساس دلانا اور مسلمانوں کی قوت سے مرعوب کرنا بھی مقصود تھا۔ ان سفروں میں صحابہ کی بڑی بڑی جمعیتوں کو ساتھ لے کر چلنے کا ایک مقصد ان کو علاقہ سے واقف کرانا اور آئندہ مراحل میں پیش آنے والے جنگی سفروں کے لیے تربیت دینا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ وہی مقصد ہے جس کے لیے اس زمانہ میں فوجی مشقیں کی جاتی ہیں۔

۵۔ غزوہ بدر سے پہلے حضورؐ نے وقتاً فوقتاً صحابہ کی مختصر پارٹیوں کو بھی مختلف جہات میں بھیجا۔ ان مہمات کو

سریہ کا نام دیا گیا ہے۔

ہجرت کے ساتویں ماہ آپ نے اپنے چچا حضرت حمزہؓ کی سرکردگی میں تیس افراد کی ایک پارٹی ساحل سمندر کی طرف قبیلہ جہینہ کے علاقہ میں روانہ کی۔ وہاں اس کا سامنا قریش کے تین سو سواروں سے ہو گیا۔ اس بات کا امکان پیدا ہو گیا کہ دونوں فریقوں میں تلوار چل جائے مگر جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ نبی ﷺ کو اس کی خبر ملی تو آپ نے مجدی کی کوششوں کی تحسین فرمائی۔ اس موقع پر تین سو سواروں پر مشتمل قرشی دستے کا مقصد سیاسی یا فوجی تو ہو سکتا ہے، تجارتی نہیں ہو سکتا۔ نیز سریہ کا مقصد اگر قریش کے ساتھ چھیڑ خانی ہوتا تو حضورؐ مجدی کی کوششوں کی تعریف نہ کرتے۔

شوال ۱ھ میں حضورؐ نے ساٹھ افراد کی ایک پارٹی اپنے چچازاد بھائی حضرت عبیدہؓ بن الحارث بن عبدالمطلب کے تحت جحفہ کی جانب بھیجی جو مکہ اور بدر کے درمیان ایک مقام ہے۔ اس کا سامنا قریش کے ایک لشکر سے ہوا جو دو سو افراد پر مشتمل تھا، لیکن جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ قریش کی بڑی تعداد یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ کسی تجارتی مقصد سے سفر نہیں کر رہے تھے ورنہ اتنی نفری نہ ہوتی۔ تجارتی قافلوں میں بالعموم باربرداری کے جانور زیادہ ہوتے اور ساتھ چالیس پچاس افراد پر مشتمل محافظوں کا دستہ چلا کرتا تھا۔

ذی قعدہ ۱ھ میں بیس صحابہ پر مشتمل ایک جماعت حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی کمان میں جحفہ کے قریب خرار کے مقام تک آئی اور پھر واپس مدینہ چلی گئی۔

ان مہمات کا مقصد اگر تجارتی قافلوں کو لوٹنا ہوتا، جیسا کہ مورخین الزام دیتے ہیں، تو آخر اس طرح کی کوئی ایک کارروائی تو سامنے آتی۔ صحابہ کیسے رہزن تھے کہ اتنے طویل سفر کرتے، قریش سے سامنا بھی ہو جاتا پھر بھی ان پر ہاتھ نہ اٹھاتے۔ اصل میں ان مہمات کا مقصد رہزنی تھا ہی نہیں۔ یہ مہمات قریش کی شرارتوں کا کھوج لگانے اور ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے تھیں۔ نیز قریش کو یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ مسلمان اپنے دفاع سے غافل نہیں ہیں۔

سریہ عبداللہ بن جحشؓ:

رجب ۲ھ میں پہلا سریہ ایسا پیش آیا جس میں کشت و خون ہوا۔ اس سریہ پر نبی ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو مقرر کیا جو آپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کے تحت آٹھ مہاجرین تھے۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ حرم

اہل مکہ کے ساتھ جھڑپ کا یہ واقعہ رجب کی آخری تاریخ کو پیش آیا۔ ابن کثیر کی تحقیق کے مطابق تحویل قبلہ کا حکم بھی رجب ہی میں نازل ہوا تھا۔ اس حکم میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ اس اعلان کے بعد ان کی مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ حالات ان سے بڑی قربانیوں کا تقاضا کریں گے اور خدا کے گھر کو مشرکوں کے قبضہ سے چھڑانے کے لیے جنگیں ناگزیر ہوں گی۔ عین ممکن ہے کہ قبلہ کے بارے میں اس اعلان سے پیدا شدہ صورت حال پر قریش کا ردعمل معلوم کرنے کے لیے نبی ﷺ نے سریہ عبداللہ بن جحش کے شرکاء کو حرم مکہ کے بالکل پاس جا کر کیمپ لگانے کا حکم دیا ہو۔ وہ ابھی اس کا انتظام کر ہی رہے ہوں کہ دشمن کے ایک تجارتی قافلہ کی اچانک آمد نے ان کو ایک مختلف صورت حال سے دوچار کر دیا ہو اور وہ واقعات پیش آئے ہوں جن کا تذکرہ اوپر ہوا۔

اہل مکہ کے ساتھ جھڑپ کا یہ واقعہ رجب کی آخری تاریخ کو پیش آیا۔ ابن کثیر کی تحقیق کے مطابق تحویل قبلہ کا حکم بھی رجب ہی میں نازل ہوا تھا۔ اس حکم میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ اس اعلان کے بعد ان کی مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ حالات ان سے بڑی قربانیوں کا تقاضا کریں گے اور خدا کے گھر کو مشرکوں کے قبضہ سے چھڑانے کے لیے جنگیں ناگزیر ہوں گی۔ عین ممکن ہے کہ قبلہ کے بارے میں اس اعلان سے پیدا شدہ صورت حال پر قریش کا ردعمل معلوم کرنے کے لیے نبی ﷺ نے سریہ عبداللہ بن جحش کے شرکاء کو حرم مکہ کے بالکل پاس جا کر کیمپ لگانے کا حکم دیا ہو۔ وہ ابھی اس کا انتظام کر ہی رہے ہوں کہ دشمن کے ایک تجارتی قافلہ کی اچانک آمد نے ان کو ایک مختلف صورت حال سے دوچار کر دیا ہو اور وہ واقعات پیش آئے ہوں جن کا تذکرہ اوپر ہوا۔

باب 28

غزوہ بدر: اسباب و واقعات پر ایک نظر

قریش کے ساتھ نبی ﷺ کی پہلی باقاعدہ جنگ غزوہ بدر ہے۔ یہ معرکہ ۱۷ رمضان ۲ھ کو بدر کے مقام پر پیش آیا جس میں ستر مشرکین مارے گئے اور اسی کے بقدر قیدی بنا لیے گئے۔ اس معرکہ نے قریش کی قوت اور حیثیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور کفر کے بڑے بڑے سرغنہ قتل ہو گئے۔ قرآن مجید نے اس جنگ کو یوم الفرقان یعنی حق اور باطل میں امتیاز کر دینے والی جنگ قرار دیا۔ حیرت کا مقام ہے کہ ایسے اہم معرکہ کو تاریخ نے کچھ ایسے پردوں میں لپیٹ دیا ہے کہ حقائق تک رسائی مشکل ہو گئی ہے اور ایسے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب نہیں ملتا۔

غزوہ کے اسباب:

مورخین نے غزوہ بدر کے اسباب میں حسب ذیل امور کا ذکر کیا ہے:

۱۔ سریہ عبداللہؓ بن جحش میں عمرو بن الحضرمی کے قتل اور عثمان اور الحکم کی اسیری نے قریش کو غضبناک کر دیا۔ قریش اس توہین کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ قتل کا انتقام لینا یوں بھی عربوں کی سرشت میں داخل تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس انتقام کے لیے تیاری شروع کر دی جس کے نتیجہ میں غزوہ بدر پیش آیا۔

۲۔ مدینہ اس گزرگاہ پر واقع ہے جو مکہ سے شام کو جاتی ہے۔ قریش کے تجارتی قافلے اسی راستے سے شام کو جاتے تھے۔ مسلمانوں نے مدینہ کے گرد و نواح کے قبائل سے حلیفانہ معاہدے کر کے اس بات کا امکان پیدا کر دیا تھا کہ قریش اس گزرگاہ کو استعمال کرنے کے لیے پروانہ راہداری حاصل نہ کر سکیں۔ یہ ان کی معیشت کی شاہ رگ کاٹنے کے ہم پلہ بات تھی جس پر جنگ ناگزیر ہو گئی۔

۳۔ نخلہ سے حاصل ہونے والے مال غنیمت نے مسلمانوں کے اندر حصول مال کی مزید حرص پیدا کر دی۔ چنانچہ انہوں نے ایک بڑے کارواں کو تاکا جو شام سے مال تجارت لے کر مکہ کو لوٹنے والا تھا۔ اس ارادے کو قریش نے بھانپ لیا اور اپنے کارواں کی حفاظت کے لیے نکل پڑے۔

غزوہ بدر کے اسباب اگر یہی ہیں تو اس کو عام جنگوں سے ممیز کرنے والی وہ چیز کیا ہے جس کے باعث قرآن نے اس کو یوم الفرقان کا نام دیا ہے۔ دنیاداروں کی ہر جنگ کے عوامل سیاسی یا معاشی ہوتے ہیں۔ افراد کے قتل پر کئی جنگیں شروع ہوئی ہیں۔ کسی قوم کی معیشت کو خطرہ لاحق ہوا ہے تو اس نے ہتھیار اٹھا لیے ہیں۔ کیا اللہ کے رسول بھی ایسے محرکات کے تحت لڑا کرتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے معقول جوابات سیرت نگاروں کے ہاں نہیں ملتے اور ضرورت ہے کہ غزوہ کے اصل محرکات کا پتہ چلایا جائے۔

ہمارے نزدیک بیان کردہ یہ اسباب غزوہ بدر کے اصل اسباب نہیں ہیں۔ اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ عمرو بن الحضرمی کا قتل اور عثمان اور الحکم کی گرفتاری قریش کے لیے توہین آمیز ضرور تھی اور اس کو لوگوں کے جذبات بھڑکانے میں بھی یقیناً استعمال کیا گیا لیکن اسکا انتقام لینے کے لیے ایک ہزار سپاہ تیار کرنا اور مدینہ پر فوج کشی کرنا بالکل غیر ضروری کارروائی تھی۔ عربوں کے دستور کے مطابق قصاص کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا۔ اگر نبی ﷺ اس معاملے میں تعاون نہ کرتے تو مکہ میں رہ جانے والے بنی ہاشم سے خوں بہا طلب کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ نبی ﷺ کے اہل خاندان تھے اور عربوں کے دستور کے مطابق افراد کے افعال کا ذمہ داران کا قبیلہ گردانا جاتا تھا۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے معاملہ کو ختم کرنے کے لیے خوں بہا ادا کرنے کی پیش کش بھی کی جس کو قریش نے قبول نہ کیا۔ جنگ بدر سے پہلے قریشی سردار حکیم بن حزام نے رئیس مکہ عتبہ بن ربیعہ کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ خود عمرو کا خون بہا ادا کردے اور جنگ سے گریز کرے۔ اس نے اس مشورہ کو قبول کر لیا لیکن دوسرے سرداروں نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمرو کے قصاص کی واحد شکل جنگ ہی نہ تھی اور یہ کہ قریشی سرداروں نے قصاص کے مسئلہ کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ اس کے امکانات پر غور کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔

۲۔ شام کی گزرگاہ کے خطرہ میں ہونے کا سبب بھی غیر حقیقی اور محض واہمہ کی پیداوار ہے۔ جہینہ، بنو ضمرہ اور بنو مدلج کے معاہدوں اور جنگ بدر کے مابین ایک سال کا عرصہ حائل ہے۔ اول تو ان معاہدوں کے الفاظ محفوظ ہیں اور ان میں قریش کے قافلوں کو روکنے کا کوئی ذکر نہیں۔ دوسرے، ایک سال کے عرصہ میں نہ تو قریش کو اس راستہ کے استعمال کے لیے کسی پروانہ راہداری کے حاصل کرنے کی ہدایت کی گئی اور نہ اس کے کسی قافلہ کو رہ گزر کے استعمال کے حق سے روکا گیا۔ ان کے قافلے برابر اس شاہراہ سے گزرتے رہے۔ اگر مقصد گزرگاہ کے استعمال سے روکنا ہی ہوتا تو ایک سال کے عرصہ میں رکاوٹ کا اکا دکا واقعہ تو پیش آ ہی سکتا تھا۔ تیسرے، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس دوران میں مسلمان ابھی اتنے قوی نہیں تھے کہ اس طرح کا کوئی نوٹس دے سکتے تو غزوہ بدر میں کامیابی کے بعد جب ان کے حوصلے بے حد بلند ہو چکے تھے وہ یہ کارروائی کر سکتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعد کے سالوں میں

بھی کسی تجارتی قدغن کا سراغ نہیں دیا جاسکتا۔ لہٰذا مذکورہ سبب غزوہ محض واہمہ کی اختراع ہے۔

۳۔ نخلہ کے مال غنیمت سے مسلمانوں میں حرص تب پیدا ہوتی اگر نبی ﷺ نے اس کارروائی کی تحسین کی ہوتی اور اہل سریہ کی پیٹھ ٹھونکی ہوتی۔ اس کے برعکس سیرت نگاروں کا بیان یہ ہے کہ آپ اس کارروائی سے ناخوش ہوئے اور مال غنیمت کو بھی ایک طرف ڈلوادیا۔ اس کی تقسیم کی نوبت غزوہ بدر کے بعد پیش آئی۔ حضورؐ کا یہ طرز عمل تجارتی قافلوں پر حملہ کی حوصلہ شکنی کرنے والا تھا نہ کہ اس پر اکسانے والا۔

روایات کے مطابق ابوسفیان کو سریہ عبداللہ بن جحش کی خبر ہوئی تو وہ اس وقت شام میں تھا۔ اسے خطرہ محسوس ہوا کہ واپسی کے سفر میں مدینہ کے پاس سے گزرتے ہوئے مسلمان کہیں قافلہ پر حملہ نہ کردیں۔ لہٰذا اس نے ایک شخص ضمضم بن عمرو کو مکہ روانہ کیا کہ وہ اہل مکہ کو خطرہ سے آگاہ کر کے قافلہ کی حفاظت کے لیے کچھ نفری بھجوائے۔ یہ شخص مکہ آیا اور قریش میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ اس کے نتیجہ میں انہوں نے لشکر ترتیب دیا اور مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ یہ روایات اس لیے صحیح نہیں کہ سریہ اور جنگ بدر کے درمیان کی ڈیڑھ ماہ کی قلیل مدت میں ایک خبر کا مکہ سے شام پہنچنا، پھر وہاں سے کسی کا مکہ آنا، پھر اہل مکہ کا جنگ کی بھرپور تیاری کر کے ایک ہفتہ کی مسافت پر واقع بدر کے مقام تک پہنچنا اس زمانہ کے لحاظ سے ناممکن تھا۔ اس مقصد کے لیے کم از کم اڑھائی تین ماہ درکار تھے۔ ڈیڑھ ماہ کی مدت میں یہ کام تب ہوسکتے تھے جب سریہ کی خبر شام پہنچانے کا سفر اس میں شامل نہ ہو۔ ایک روایت کے مطابق ضمضم کو شام سے نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ اس وقت آگے روانہ کیا گیا جب قافلہ مدینہ سے چند منزل کی مسافت پر تھا۔ اس پر بھی وہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں سفر کرنے کی جو رفتار تھی اس کے لحاظ سے یہ سفر بعید از قیاس ہے۔ اس صورت میں تو قافلہ بدر سے بہت کم فاصلہ پر ہوتا جبکہ قاصد کا سفر خاصا طویل تھا۔ (اس زمانہ میں سفر کی رفتار کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مکہ اور مدینہ کے مابین مسافت دس یوم کی تھی۔ غزوہ تبوک کے لیے نبی ﷺ عرب کی شمالی سرحد پر مدینہ سے چوبیس دنوں میں پہنچے تھے) پس جس بات کا امکان ہے وہ یہ ہے کہ پہلے سے قریش نے جنگ کا منصوبہ تیار اور سامان جنگ فراہم کر رکھا ہو اور وہ تجارتی کاروان کی حفاظت کو بہانہ بنانا چاہتے ہوں۔ اس کے لیے یہ اسکیم بنائی گئی ہو کہ ایک آدمی ابوسفیان کا نمائندہ بن کر آئے اور عین اس وقت قریش حرکت کریں جب کاروان مدینہ کے قرب ونواح میں ہو۔ چنانچہ اس آدمی نے فی الواقع وقت کی اسی مناسبت سے مکہ پہنچ کر ڈرامہ رچایا۔ اس نے اپنے کپڑے پھاڑے، اونٹ کا کجاوہ الٹ دیا اور دہائی دینے لگا کہ اے قریش، تجارتی قافلے کی فکر کرو، محمد اور اس کے ساتھی اس کے آڑے آ گئے ہیں۔ اس سے اہل مکہ میں غم وغصہ پیدا ہوا اور انہوں نے سرداران قریش کی اسکیم کے مطابق جنگ میں حصہ لیا۔ یہ شکل تسلیم کرلی جائے تب بھی کاروان تجارت پر حملہ کے خطرہ

کے بارے میں سوالات باقی رہتے ہیں۔

اولاً، سریہ عبداللہ بن جحش سے قبل قافلہ لوٹنے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ قریش کے تجارتی قافلے بلا روک ٹوک شام آیا جایا کرتے تھے۔ اس لیے کسی سابقہ تلخ تجربہ کے بغیر ابوسفیان قافلے کی سلامتی کے لیے متفکر نہیں ہوسکتا تھا۔ نخلہ میں پیش آنے والے واقعہ کی خبر بھی ابوسفیان کو شام میں ایسے وقت میں نہیں مل سکتی تھی کہ وہاں سے وہ بروقت قریش کی مدد حاصل کرنے کے لیے آدمی بھیج سکتا۔ ماننا پڑتا ہے کہ ضمضم بن عمرو کو مکہ بھیجنے کی کارروائی کسی دوسرے منصوبے کا حصہ تھی جس کا تعلق سریہ عبداللہ بن جحش کی خبر سے نہ تھا۔

ثانیاً، قافلہ کی حفاظت اگر قریش کا مقصود ہوتی تو اس کے لیے چند سو افراد کا بھیجنا کافی ہوتا لیکن قریش نے بہت بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاری کی اور اس میں ہر شخص کی شرکت کو یقینی بنایا۔ یہ اہتمام محض قافلے کی حفاظت کے مقصد سے کہیں زیادہ بڑھ کر اور بہت زیادہ غیر متناسب تھا۔

ثالثاً، اگر مسلمانوں کا ارادہ ابوسفیان کے قافلے کو لوٹنے ہی کا ہوتا تو وہ یہ کارروائی مدینہ سے شمال مغرب کی جانب کرتے جہاں قافلہ تک قریش کی کمک کے پہنچنے سے پہلے پہلے وہ اپنا مقصد حاصل کر لیتے۔ بدر کی جانب نکلنے سے پہلے آپ نے اپنے دو جاسوس اسی جانب بھیجے تھے۔ تمام سیرت نگاروں کا متفقہ بیان یہ ہے کہ حضورؐ نے لشکر تیار کیا تو اسے بدر کی جانب متحرک کیا۔ بدر مدینہ سے جانب مکہ ۸۰ میل کی مسافت پر ہے۔ قافلہ لوٹنے کے لیے مکہ کی جانب بڑھنا حکمت عملی کے اعتبار سے سخت خطرناک تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے اس طرح کی فنی غلطی ناقابل تصور ہے۔

رابعاً، مورخین کے مطابق بدر پہنچنے سے پہلے مشرکین کو معلوم ہو چکا تھا کہ ابوسفیان قافلے کو ساحل سمندر کے راستے سے بحفاظت نکال کر مکہ کی طرف رواں دواں ہے اور اس کو مزید کسی تحفظ کی ضرورت نہیں۔ اگر قریش قافلے کو بچانے کی خاطر آئے تھے تو اس اطلاع کے باوجود ان کا بدر جانے پر اصرار بلا جواز تھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے مقاصد کچھ اور تھے۔

ان نکات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ غزوہ بدر کی منصوبہ بندی میں شام سے آنے والا تجارتی قافلہ اصلی عامل نہ تھا، اگرچہ سیرت نگاروں نے اسی کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

غزوہ بدر کا اصلی سبب:

غزوہ بدر فی الحقیقت حق اور باطل کی قوتوں کا ٹکراؤ تھا جس کا مقصد رسول اللہؐ کی تکذیب کرنے والی قوم کو اس حرکت کی سزا دینا اور اس کے سرکردہ دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر کافروں کی جڑ کاٹنا تھا۔ تکذیب رسول کے نتیجہ میں قریش کے لیے کامل تباہی اللہ کی اسکیم میں نہ تھی جس کے وجوہ پر اوپر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ لیکن ان کی

صف اول کی قیادت اس جنگ میں ختم ہوگئی۔قریش کے قائدین اپنے زعم میں حق کی آواز کو ہمیشہ کے لیے کچلنے کے مقصد سے مکہ سے نکلے تھے لیکن اللہ ہی کی تدبیر کامیاب ہوئی اور حق کا بول بالا ہوا۔اس بات کے شواہد کہ قریش مذہبی جوش وجذبہ کے ساتھ اللہ کے دین کو شکست دینے اور مسلمانوں کی قوت کو توڑنے کے عزم کے ساتھ مکہ سے نکلے تھے اور مسلمان اس دین کو سربلند اور باطل کو نابود کرنے کے لیے میدان میں آئے تھے،تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ پہلے قریش کے ہاں صورت حال دیکھیے۔

۱۔ جنگ کی تیاری میں قریش نے مکہ کے ہر کنبے کو حکماً شریک کیا اور لشکر کو اسلحہ سے لیس کرنے کے لیے ان سے ہتھیار، مال، جنس ہر قسم کا تعاون حاصل کیا۔اس مہم میں گویا پوری قوم شریک ہوئی۔

۲۔ یہ اہتمام کیا گیا کہ کوئی قابل ذکر آدمی جنگ سے پیچھے نہ رہے۔ایسی نفسیاتی کیفیت پیدا کردی گئی کہ پیچھے رہ جانے والوں کو سخت بدنامی کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔سردار قریش عتبہ بن ربیعہ کا ارادہ جنگ میں شامل ہونے کا نہ تھا لیکن اس کو اس قدر مطعون کیا گیا کہ اس کے بیٹے شیبہ نے کہا۔ان فارقنا قومنا کان ذلک سبة علینا ''اگر آج ہم اپنی قوم سے علیحدہ رہے تو یہ چیز ہمیشہ کے لیے ہماری بدنامی کا باعث بن جائے گی''۔ابولہب جنگ میں شرکت سے گریزاں تھا۔ابوجہل اس کے پاس گیا اور کہا قم ابا عتبة فواللہ ما خرجنا الا غضبا لدینک و دین ابائک ''ابوعتبہ اٹھو، اللہ کی قسم ہم صرف تمہارے اور تمہارے آباء کے دین کی حمیت میں نکل رہے ہیں''۔ اس پر ابولہب نے اپنی جگہ العاص بن ہشام بن المغیرۃ کو نامزد کیا اور اس خدمت کے بدلے اپنا وہ قرض معاف کر دیا جو العاص کے ذمہ تھا۔امیہ بن خلف بھاری جسم کا آدمی تھا۔اس نے جنگ کے لیے نکلنے سے معذوری ظاہر کی لیکن ابوجہل نے اس کو غیرت دلائی کہ اے ابوصفوان، آپ تو اس وادی کے باشندوں کے سردار ہیں۔جب لوگ دیکھیں گے کہ آپ نے گھر پر رہنا ہے تو دوسرے لوگ بھی نہیں نکلیں گے۔ابوجہل برابر اس کے پیچھے پڑا رہا یہاں تک کہ امیہ نے کہا اچھا اگر تم مجھے الزام دیتے ہو تو اللہ کی قسم میں مکہ کا اصیل ترین اونٹ خرید کر اس پر تمہارے ساتھ چلوں گا۔

۳۔ قریش سرداروں نے اس قومی مہم کے دوران پورے لشکر کی ایک ایک دن کی ضیافت کا ذمہ اٹھایا۔اس سلسلہ میں ابوجہل، امیہ بن خلف، سہیل بن عمرو، شیبہ، عتبہ، عباس بن عبدالمطلب، ابوالبختری، نبیہ بن الحجاج اور منبہ بن الحجاج کے نام نقل ہوئے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ کو ایک قومی جنگ کا درجہ حاصل تھا۔لشکر کے ہمراہ دف بجا بجا کر گانے والیاں بھی تھیں جو مسلمانوں کی ہجو کے گانے گاتیں اور مشرکین کو خوش رکھتی تھیں۔

۴۔ قریش کی بنوبکر کے ساتھ ان بن تھی۔انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ بدر جاتے ہوئے یہ قبیلہ ان کے عقب سے حملہ آور نہ ہوجائے۔چنانچہ سفارتی ذرائع سے اس بات کو یقینی بنایا گیا کہ وہ اس مرحلے پر کوئی معاندانہ کارروائی نہیں

کریں گے۔ ظاہر ہے کہ قریش اگر صرف قافلے کی حفاظت کے لیے جا رہے تھے تو ان کو ایسی فکر لاحق نہ ہوتی۔

۵۔ مکہ سے نکلتے ہوئے مشرکین نے کعبہ کے پردے پکڑ کر یہ دعا کی کہ ''اے اللہ، دونوں لشکروں میں سے جو برتر ہے، دونوں گروہوں میں سے جو زیادہ معزز ہے اور دونوں قبیلوں میں سے جو بہتر ہے، اس کی نصرت فرمانا''۔ یہ دعا انہوں نے اس یقین کی بنا پر کی کہ وہ مسلمانوں کے بالمقابل اپنی حیثیت کو بہر حال افضل و برتر مانتے تھے اور اس وقت وہ اہل ایمان سے باقاعدہ جنگ کے لیے نکل رہے تھے۔

٦۔ جنگ بدر سے پہلے کی رات ابوجہل نے یہ دعا کی کہ ''اے اللہ، اس شخص (نبی ﷺ) نے ہمارے رشتوں کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ ہمیں وہ پیغام دیتا ہے جس سے ہم ناواقف ہیں۔ اے اللہ! کل تو اس کو ہلاک کر''۔ ابوجہل کی یہ دعا بھی اس جوش و جذبہ کی عکاسی کرتی ہے جس کے ساتھ قریش میدان میں اترے تھے۔

۷۔ بدر سے پہلے جب قریش جحفہ پہنچے تو ان کو معلوم ہو گیا کہ تجارتی قافلہ وادی بدر کے راستہ کو چھوڑ کر ساحل سمندر کی طرف سے مکہ کی جانب بڑھ رہا ہے اور اب وہ مسلمانوں کے حملہ سے محفوظ ہو چکا ہے۔ یہ خبر سن کر بنوزہرہ اور بنوعدی نے کہا کہ ہماری دلچسپی اپنے مال اور افراد کی حفاظت تک محدود تھی۔ لہٰذا ہم اب واپس مکہ جائیں گے۔ ابوجہل کا اصرار تھا کہ ہم مڑنے والے نہیں اور بدر میں جا کر قیام کریں گے۔ چنانچہ بنوزہرہ اور بنوعدی کی پروا کیے بغیر لشکر آگے بڑھ گیا اور یہ دو خاندان جنگ میں شامل نہ ہوئے۔

۸۔ بدر میں پہنچنے کے بعد جب اہل ایمان بھی وادی میں پہنچ گئے تو بعض صلح پسند لوگوں نے، جن میں حکیم بن حزام پیش پیش تھا، عتبہ کو جنگ سے بچنے کا مشورہ دیا۔ لیکن قرشی عمائدین اڑ گئے کہ اب ہم ان لوگوں کو کچلے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔

ان تمام واقعات میں قافلۂ تجارت کے تحفظ یا جنگ کے کسی دوسرے سبب کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ قافلے کے حوالے سے یہ باتیں بالکل بے جوڑ ہیں۔ حقیقت میں قریش اپنے آبائی دین کی نصرت کے جذبہ سے سرشار ہو کر مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے کے ارادہ ہی سے گھر سے نکل رہے تھے اور اسی مقصد کے لیے دعائیں ان کے لبوں پر تھیں۔ اگر بعض لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ قافلہ بالکل محفوظ مکہ کو روانہ ہو چکا ہے لہٰذا اب جنگ سے بچنا چاہیے، تو اس رائے کو قریش کے عمائدین نے کوئی وقعت نہیں دی اور مصر رہے کہ مسلمانوں کا قلع قمع کیے بغیر اب وہ نہیں ٹلیں گے۔

جہاں تک مسلمانوں کے کیمپ کا تعلق ہے ہمارے ابتدائی سیرت نگاروں نے ان کے مدینہ سے نکلنے کا مقصد تجارتی قافلے پر حملہ آور ہونا ہی بیان کیا ہے۔ یہی بات متاخرین نے اس کثرت سے دہرائی ہے کہ اسی کو حقیقت سمجھا جانے لگا ہے۔ حالانکہ متعدد شواہد اس بات کے حق میں ہیں کہ حضورؐ کے مدینہ سے نکلنے میں بھی قریش

کے لشکر کے ساتھ جنگ ہی پیش نظر تھی۔ مندرجہ ذیل حقائق پر غور کیجیے۔

۱۔ روایات کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے بدر کے لیے اپنی روانگی سے دس دن قبل دو صحابہ طلحہؓ بن عبید اللہ اور سعیدؓ بن زید کو تجارتی کاروان کی خبر لانے کے لیے مدینہ کے مغرب میں تجارتی شاہراہ کی طرف بھیجا تو ضرور، لیکن ان کی واپسی یا ان کی جانب سے کسی اطلاع یا کاروان کی خبر لانے کا متبادل انتظام کیے بغیر آپ نے لشکر کو بدر کی جانب کوچ کا حکم دے دیا۔ طلحہؓ اور سعیدؓ جب مہم سے واپس مدینہ آئے تو حضورؐ بدر کو جا چکے تھے۔

۲۔ مورخین کہتے ہیں کہ ابتدائی مہمات میں کبھی انصار کو ساتھ نہیں لیا گیا تھا لیکن اس مہم میں مہاجرین وانصار کی پوری جمعیت ساتھ تھی۔ اس میں چھیاسی مہاجرین، اکسٹھ قبیلہ اوس اور ایک سو ستر قبیلہ خزرج کے انصار شامل تھے۔ نیز نوعمر بچے تک لشکر میں شامل ہوئے، اگرچہ ان کو ساتھ جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قریش نے اپنی پوری نفری کو ساتھ لے کر چلنے کا اہتمام کیا اسی طرح نبی ﷺ نے بھی تمام قابل جنگ مسلمانوں کو ساتھ لیا۔ سیرت نگاروں کا ایک بیان اگرچہ یہ بھی ہے کہ جنگ بدر کے لیے نفیر عام نہ تھی اور جو لوگ پیچھے رہ گئے ان پر کوئی نکیر نہ کی گئی لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ پیچھے رہ جانے والے لوگ کون سے تھے۔ جن آٹھ آدمیوں کے نام وہ لیتے ہیں ان کو مختلف ذمہ داریوں کے باعث حضورؐ نے خود مدینہ میں رہنے کی ہدایت فرمائی تھی اور مال غنیمت میں سے ان کو حصہ دیا تھا۔ لہٰذا سیرت نگاروں کا مذکورہ قول قابل قبول نہیں۔

۳۔ مدینہ سے نکلتے وقت لوگوں میں جہاد اور شوق شہادت کا جذبہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ لشکر سے مقابلہ کو پیش نظر رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ بچوں تک کی کوشش رہی کہ انہیں جنگ میں شرکت کا موقع ملے۔ مثلاً عمیرؓ بن ابی وقاص نے نوعمری کے باوجود شرکت کی اور شہید ہوئے۔ اسی طرح خیثمہؓ اور ان کے بیٹے سعد بن خیثمہؓ میں سے ایک کا گھر پر موجود رہنا ناگزیر تھا۔ باپ نے بیٹے کو روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے کہا، اگر حصول جنت کا معاملہ نہ ہوتا تو میں اپنے اوپر آپ کو ترجیح دیتا۔ اب میں شہادت کی توقع لے کر جا رہا ہوں، مجھے جانے دیجئے۔

۴۔ نبی ﷺ نے مدینہ سے باہر نکل کر بیئر ابی عنبہ کے مقام پر لشکر کا معائنہ کیا اور چند بچوں، عبداللہ بن عمر، اسامہ بن زید، رافع بن خدیج، براء بن عازب، زید بن ثابت، اسید بن حضیر اور زید بن ارقم کو ان کی کم عمری کے باعث مدینہ واپس کر دیا۔ ظاہر ہے کہ آپ مشرکین کے ساتھ جنگ کو ناگزیر دیکھ رہے تھے اور صرف جنگ کے لیے موزوں افراد کو ساتھ لینا چاہتے تھے۔

۵۔ ذوالعشیرہ کی مہم کے دوران آپ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ابوسفیان کے قافلہ کا محافظ دستہ صرف تیس یا چالیس گھوڑ سواروں پر مشتمل ہے۔ اس کے مقابلے کے لیے اول تو گھوڑ سوار ہی موزوں ہو سکتے تھے اور معلوم ہے کہ

مسلمانوں کے لشکر میں صرف دو صحابہ کے پاس گھوڑے تھے۔ دوسرے، غزوہ بدر میں پیدل فوج کی تین سو سے زیادہ نفری تھی جبکہ قافلہ سے مقابلہ کے لیے اس قدر نفری کی ضرورت نہ تھی۔ دوسرے الفاظ میں جس طرح قریش کی فوج محض قافلہ کی حفاظت کے نقطہ نظر سے بہت زیادہ غیر متناسب تھی اسی طرح نبی ﷺ کی فوج قافلہ لوٹنے کے مقصد کے لحاظ سے بہت زیادہ تعداد میں تھی۔

۶۔ عرب میں رواج تھا کہ بعض لوگ مال غنیمت کے لالچ میں دوسروں کی جنگوں میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ اسی رواج کے تحت دو مشرک بہادروں، خبیب بن سیاف اور قیس بن محرث نے جنگ میں شرکت چاہی تو حضورؐ نے فرمایا کہ ہمارے ساتھ کوئی ایسا شخص نہیں جائے گا جو ہمارے دین پر نہ ہو۔ اس ممانعت کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ آپ کفر اور اسلام کے اس معرکے کو عام جنگوں پر قیاس نہیں کر رہے تھے۔

۷۔ جنگ سے قبل حضورؐ کی یہ دعا تمام مورخین نے نقل کی ہے کہ ''اے اللہ، اگر تو نے آج اہل اسلام کے اس مختصر گروہ کو ہلاک ہونے دیا تو زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا''۔ اس دعا کے الفاظ سے بھی یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنا تمام سرمایہ پیش کر دیا تھا ورنہ یہ دعا موزوں نہ ہوتی۔ اس وقت آپ کے پیش نظر تجارتی قافلہ نہیں بلکہ قریش کا مسلح لشکر ہی تھا۔

۸۔ سورہ انفال میں بطور مقصد جنگ ارشاد فرمایا ہے کہ لِيُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ''تا کہ اللہ اپنے کلمات سے حق کا بول بالا کرے اور کافروں کی جڑ کاٹے''۔ کسی طاقتور گروہ کی جڑ کاٹنے کا مقصد اس کے ایک قافلہ کا مال لوٹ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کا امکان اگر ہو سکتا ہے تو اس کے مسلح لشکر کی ہزیمت سے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں لشکر کی ہزیمت اور قریش کی لیڈر شپ کا استیصال مدنظر تھا۔

تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ شام سے قریش کے کاروان کی واپسی کے وقت نے مسلمانوں اور مشرکین دونوں میں سخت جذباتی و نفسیاتی کیفیات پیدا کیں اور دونوں گروہوں کو بالمقابل لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے وقت ہی نے غلط فہمیوں کو بھی جنم دیا جس کے باعث بدر میں حق و باطل کے اس عظیم معرکہ کی نوعیت کو سمجھنے میں لوگوں سے بے حد کوتاہی ہوئی۔

ممکنہ اصل ترتیب واقعات:

قرائن اور قافلوں کے سفر میں درکار وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے معاملہ کی صحیح نوعیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب ابوسفیان نے یہ سنا کہ مکہ سے شام کو جاتے ہوئے ذوالعشیرہ سے اس کے گزرنے کے جلد بعد مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت وہاں پہنچی تو اس کو یہ وہم ہوا کہ ہو نہ ہو اس کے پیش نظر مقصد اس کے کاروان کو لوٹنا تھا اور اب اگر

وہ بچ کر آ گیا ہے تو ممکن ہے واپسی پر پھر مسلمان گھات میں ہوں اور کاروان کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ اس نے اس خطرے کی پیش بندی کے لیے اسی وقت ایک شخص ضمضم بن عمرو کو قریش کے لیے اس پیغام کے ساتھ مکہ بھیجا کہ واپسی پر کاروان کی حفاظت کا خاص اہتمام کریں۔ یہ پیغام مکہ بھیج کر وہ خود شام کو روانہ ہو گیا۔ ضمضم جب مکہ پہنچا تو اس وقت سریہ عبداللہ بن جحش کا واقعہ نیا نیا پیش آ چکا تھا لہٰذا قریش کو یہ موہوم خطرہ ایک حقیقت نظر آنے لگا۔ چنانچہ بعض کفار نے یہ کہا بھی کہ مسلمانوں کو غلط فہمی ہے کہ وہ نخلہ کا واقعہ پھر دہرا سکیں گے۔ قریشی سرداروں نے اس خطرہ کو لوگوں میں غیرت بیدار کرنے کے لیے استعمال کیا لیکن اسکیم انہوں نے یہ بنائی کہ کاروان کی حفاظت کو بہانہ بنا کر مسلمانوں کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے۔ لہٰذا انہوں نے تیاری بڑے پیمانے پر کی جو ان کے اصل مقصد جنگ سے مطابقت رکھتی تھی۔ اس تیاری کے لیے ان کے پاس وقت کافی تھا کیونکہ شام سے واپسی میں قافلے کو خاصا وقت درکار تھا۔ ادھر کاروان کی واپسی قریب ہوئی، ادھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو رویا میں یہ دکھایا کہ ایک طرف سے تجارتی کاروان آ رہا ہے اور دوسری طرف سے قریش کا لشکر۔ مسلمانوں کو نکلنے کا حکم دو۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ مشرکین کے ان دو گروہوں میں سے ایک پر مسلمانوں کو غلبہ عطا کیا جائے گا۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو جمع کر کے تقریر کی جس میں اپنی رویا کی روشنی میں دونوں احتمالات ان کے سامنے رکھے اور جنگ کی تیاری کا حکم دیا۔ چونکہ لشکر کے ساتھ مقابلہ سخت تر تھا اس لیے آپ نے تیاری میں اسی کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ مسلمان سخت مصیبت زدہ اور غریب و محتاج تو تھے ہی، ان میں سے بعض کی خواہش ہوئی کہ انہیں اس بے سروسامانی میں لشکر سے پنجہ آزمائی نہ کرنی پڑے اور کاروان تجارت ان کے قبضہ میں کر دیا جائے۔ دوسرے صحابہ کو اس اطلاع میں کفر و اسلام کا معرکہ نظر آیا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب باطل کی شکست کا وعدہ پورا ہونے کے دن آ گئے۔ سیرت نگار اسی صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> فانتدب الناس فخف بعضهم و ثقل بعضهم و ذلك لانهم لن يظنوا ان رسول الله ﷺ يلقى حربا[1]
>
> پھر نبی ﷺ نے لوگوں کو جنگ پر ابھارا تو ان میں سے بعض نے اس کو معمولی سمجھا لیکن دوسروں نے اس کی گرانی محسوس کی۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ لوگوں کا گمان یہ نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو جنگ کی نوبت پیش آئے گی۔

ہمارے نزدیک یہ مسلمانوں کے دو گروہوں کی نفسیاتی کیفیت کا بیان ہے۔ ایک گروہ نے معاملے کی سنگینی کو سمجھا اور سنجیدگی سے اس کی تیاری کی۔ دوسرے لوگ قافلے سے مڈبھیڑ کی خوش فہمی میں مبتلا رہے اور انہوں نے جنگ کے

امکان کو بعید از قیاس سمجھا۔ اتفاق سے قدیم ترین سیرت نگاروں نے جو روایات جمع کی ہیں وہ موخر الذکر گروہ کے نقطہ نظر کی نمائندہ روایات ہیں، اس لیے پہلے نقطہ نظر کو مورخین کے ہاں زیادہ پذیرائی نہیں ہوئی حالانکہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نقطہ نظر کے حامل لوگوں کی اکثریت تھی۔

مسلح لشکر سے جنگ کا امکان:

رسول اللہ ﷺ نے رویا کی روشنی میں احتمالات تو دونوں لوگوں کے سامنے رکھے لیکن اپنے تمام اقدامات سے یہ ظاہر کیا کہ آپ لشکر کے ساتھ مقابلہ کو پیش نظر رکھ رہے ہیں۔ یہی بات آپ کے منصب کے مطابق تھی کہ آپ زیادہ مشکل صورت حال کو مدنظر رکھتے۔ چنانچہ آپ نے لڑائی کی تیاری کا حکم دیا۔ اس پر وہ لوگ جو قافلے کے ساتھ مڈبھیڑ کے خواہش مند تھے سخت پریشان ہوئے اور حضورؐ کے ساتھ تکرار کرنے لگے کہ یہ وقت کسی بڑے مقابلے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اسی گروہ کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا:

> كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ. يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ. (انفال ۸:۵۔۶)
>
> اسی طرح کی بات اس وقت ظاہر ہوئی جب تمہارے رب نے ایک مقصد کے ساتھ تم کو گھر سے نکلنے کا حکم دیا اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو یہ بات ناگوار تھی۔ وہ تم سے امر حق میں جھگڑتے رہے باوجودیکہ حق ان پر اچھی طرح واضح تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جارہے ہیں اور وہ اس کو دیکھ رہے ہیں۔

یہ جو کچھ بیان ہو رہا ہے، یہ مدینہ سے روانگی کے وقت کا معاملہ ہے۔ اگر حضورؐ کا ارادہ قافلے پر حملے کا ہوتا تو اس میں مسلمانوں کے لیے ناگواری کی کوئی بات نہ تھی۔ آنحضرتؐ کے سامنے مقصد بالکل واضح تھا اور وہ مسلح لشکر سے مقابلہ تھا۔ اسی لیے کچھ لوگ مارے باندھے گھروں سے نکلے۔ روایات کے مطابق حضورؐ لشکر کو لے کر مدینہ سے نکلے تو مدینہ کے باہر ایک مقام بئر ابی عنبہ پر لشکر کی تیاری کا معائنہ فرمایا۔ اسی معائنہ میں چند بچوں کو آپ نے دیکھا کہ وہ بھی کفار سے جنگ کے جذبہ سے سرشار ہو کر نکل آئے ہیں۔ آپ نے ان کو اجازت نہیں دی۔ بعض لڑکوں کو اپنی جنگی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے پر حضورؐ نے سفر کی اجازت بھی دی۔

لشکر کے جائزہ کے بعد آپ نے بدر کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا کیونکہ یہی وہ مقام تھا جہاں پر شام اور مکہ کا راستہ یکجا ہوتا تھا اور قریش کے دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کا سامنا ہو سکتا تھا۔ آپ نے یہ سفر نہایت تیزی سے طے کیا اور راستے میں جو شخص ملتا اس سے قافلے اور لشکر دونوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ چونکہ ابھی تک صورت حال واضح نہیں تھی اس لیے مسلمانوں میں سے بعض اسی خیال سے سفر کر رہے

تھے کہ ان کی مڈبھیڑ تجارتی قافلہ سے ہوگی جبکہ دوسرے یہ توقع رکھتے تھے کہ مقابلہ لشکر سے ہوگا۔

اہل ایمان کے جذبہ جہاد کا امتحان:

آنحضرت ﷺ نے دوصحابہ بسبس بن عمرو جہنیؓ اور عدی بن ابی الزغباءؓ کو دشمن کے بارے میں خبر لانے کے لیے آگے بھیجا۔ آپ نے جب راستے میں پڑنے والی وادی ذفران کے قریب منزل کی تو آپ کو قریش کے لشکر کی آمد کی پہلی اطلاعات ملیں جن کے بعد صحابہ کو اعتماد میں لینا ضروری ہوگیا۔ آپ نے لشکر کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد ان سے مشورہ طلب کیا۔ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ نے تقریریں کیں اور لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ نبی ﷺ نے دونوں کے جذبہ جہاد کی تحسین فرمائی اور اس پر مسرت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد آپ نے لوگوں کو مخاطب کر کے پھر مشورہ طلب کیا۔ اس پر مقداد بن الاسود نے عرض کی، یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس کام کا حکم دیا ہے اس کی تکمیل کیجئے۔ ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ کی قسم ہم آپ کو وہ جواب نہ دیں گے جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کو دیا تھا کہ تم اور تمہارا رب جا کر لڑو، ہم یہاں بیٹھتے ہیں۔ حضورؐ نے ان کی بھی تحسین فرمائی۔ پھر فرمایا لوگو! مجھے مشورہ دو۔ اس پر انصار میں سے سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور کہا ''حضور، شاید آپ کا اشارہ ہماری جانب ہے۔ ہم آپ کی رسالت پر ایمان لائے، آپ کی ہر بات کی تصدیق کی۔ ہم نے شہادت دی کہ آپ جو دین لائے وہ برحق ہے۔ ہم نے آپ کی ہر بات کو تسلیم کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ یا رسول اللہ! آپ کا جو ارادہ ہے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایئے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ اقدام فرمایئے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، اگر آپ ہمیں لیے ہوئے سمندر میں جا داخل ہوں تو ہم آپ کے ہمراہ اس میں بھی کود جائیں گے، اور ایک شخص بھی ہم میں سے پیچھے رہنے والا نہیں ہوگا۔ ہم اس بات سے قطعاً کوئی ناگواری محسوس نہیں کر رہے ہیں کہ کل دشمن کے ساتھ آپ کی مڈبھیڑ ہونے والی ہے۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہنے والے، مقابلہ کے موقع پر مضبوط اور کھرے لوگ ہیں۔ کیا عجب اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے آپ کو وہ چیز دکھائے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ آپ اللہ کی برکت سے ہمیں ہم رکابی کا شرف بخشیے''۔ یہ تقریر سن کر نبی ﷺ نے اطمینان کا اظہار فرمایا اور کہا ''لوگو، بشارت حاصل کرو کیونکہ اللہ نے مجھ سے دو میں سے ایک گروہ کو مغلوب کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اللہ کی قسم، میں دشمن کی قتل گاہوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں''۔ اس طرح تمام ساتھیوں کو یکسو اور جہاد فی سبیل اللہ کے جذبہ سے سرشار کرنے کے بعد نبی ﷺ وادی ذفران سے آگے چلے۔

عین بدر کے قریب پہنچے تو ایک ساتھ دو اطلاعیں ملیں۔ ایک یہ کہ تجارتی قافلہ بدر کے پہاڑوں کے پیچھے سے ساحل سمندر کی طرف ہوتا ہوا مکہ کی جانب بڑھ گیا ہے اور دوسری یہ کہ قریش کا لشکر وادی بدر کے پرلے کنارے

پر پہاڑوں کے پیچھے پہنچ چکا ہے۔ یہ ایک خدا ساز بات تھی کہ تینوں زیر بحث گروہ بغیر کسی باہمی رابطے اور اطلاع کے ایک ہی وقت میں وادی بدر کے اڑوس پڑوس میں آ موجود ہوئے۔ اب فیصلہ کن پوزیشن یہ سامنے آ گئی کہ دو موعود گروہوں میں سے ایک یعنی قافلہ سے مقابلہ کا امکان ختم اور دوسرے سے لڑائی کا امکان یقینی ہو گیا۔ اسی صورت حال کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے:

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ وَ لٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ. وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. (انفال ۸:۴۲)

خیال کرو جب تم وادی کے قریبی کنارے پر تھے اور وہ دور کے کنارے پر اور قافلہ تم سے نیچے تھا اور اگر تم باہم میعاد ٹھہرا کر نکلتے تو میعاد پر پہنچنے میں ضرور تم مختلف ہو جاتے لیکن اللہ نے فرق نہ ہونے دیا تا کہ اللہ اس امر کا فیصلہ فرما دے جس کا ہونا طے ہو چکا تھا۔ تا کہ جسے ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے۔ بے شک اللہ سمیع و علیم ہے۔

یہ وہ مرحلہ تھا جب بغیر لڑے قریش کے مڑ جانے کا کوئی مشورہ ان کے لیے قابل قبول نہ ہو سکتا تھا۔ قریش سرداروں کے ارادے واضح تھے کہ مسلمانوں کو تہس نہس کرنا ان کا اصل مشن تھا۔ چنانچہ حکیم بن حزام اور بعض دوسرے لوگوں نے جب مڑ جانے اور جنگ سے اجتناب کا مشورہ دیا تو اس تجویز کی مخالفت ہوئی۔ مسلمانوں کے لیے بھی اب لشکر سے لڑے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اس مرحلہ پر قافلے کا تعاقب کرتے تو قریش کے دونوں گروہوں میں گھر جاتے اور یہ بات یقینی نہ تھی کہ قافلے کا مال قبضے میں آئے گا یا نہیں۔ اگر مسلح لشکر کے مقابلہ پر آنے میں کمزوری دکھاتے تو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیے جاتے اور قریش آگے بڑھ کر مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ ان میں سے جو لوگ کاروان سے لڑنے کی خوش فہمی میں مبتلا تھے اب ان کی خوش فہمی رفع ہو چکی تھی اور ایمان کا یہ تقاضا سامنے آ گیا تھا کہ اپنی پوری طاقت سے حق کا دفاع کر کے باطل کو سرنگوں کریں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے قافلے کو قریش اور مسلمانوں دونوں کو میدان میں لانے کا ذریعہ بنایا اور جب وہ آ گئے تو قافلے کو جیسے بیچ میں سے اٹھا لیا اور دونوں قوتوں کو اپنے اپنے اصل موقف کے دفاع کے لیے نبرد آزما کر دیا۔

حوالہ جات

1۔ السیرۃ النبویہ۔ ابن ہشام۔ ج ۱، ص ۶۰۷

باب 29

حق و باطل کے درمیان پہلا معرکہ

بدر کے قریب پہنچ کر حضورؐ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت زبیرؓ بن العوام اور حضرت علیؓ کو دشمن کے احوال کی سن گن حاصل کرنے کے لیے آگے بھیجا۔ قریش کے سقے ان کے ہاتھ لگ گئے اور وہ ان کو پکڑ کر حضورؐ کے پاس لے آئے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ لشکر میں قریش کے کون کون سے سردار شامل ہیں۔ جب معلوم ہوا کہ عتبہ، شیبہ، ولید، ابوالبختری، امیہ بن خلف، ابوجہل، نضر بن حارث، سہیل بن عمرو، عمرو بن عبدود، زمعہ بن اسود، حکیم بن حزام، نبیہ بن الحجاج اور منبہ بن الحجاج لشکر کے ساتھ ہیں تو آپ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا **ھذہ مکۃ قد القت الیکم افلاذ کبدھا** ''یہ مکہ نے تو اپنے جگر گوشے تمہارے آگے ڈال دیئے ہیں''۔

حضورؐ نے پوچھا قریش اس وقت کہاں ہیں۔ سقوں نے بتایا کہ وادی کے پرلے کنارے پر ٹیلے کے پیچھے فروکش ہیں۔ حضورؐ نے نفری معلوم کرنا چاہی تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حضورؐ نے پوچھا روزانہ کتنے اونٹ ذبح ہوتے ہیں۔ جواب ملا، نو یا دس۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ قریش کی نفری نو سو اور ہزار کے درمیان ہے۔

دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد آپ وادی میں داخل ہوئے اور ایک جگہ اترنے کا حکم دیا۔ ایک صحابی حباب بن المنذر بولے۔ یا رسول اللہ! یہاں اللہ کے حکم سے پڑاؤ ڈال رہے ہیں یا یہ ذاتی رائے سے تدبیر جنگ کا حصہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا تعلق تدبیر سے ہے۔ اس پر ان صحابی نے عرض کی کہ میں اس علاقے کا شناسا ہوں۔ آپ آگے بڑھیں اور دشمن کے مورچوں کے قریب کے کنویں کے پاس فروکش ہوں۔ یہاں پانی کی کمیابی ہمارے لیے مشکلات پیدا کر سکتی ہے۔ نبی ﷺ نے یہ مشورہ قبول فرمایا اور آگے بڑھ کر کنویں کے پاس اترے۔ اس کے ساتھ پانی جمع کرنے کے لیے ایک حوض سا بنا لیا گیا تا کہ لوگ آسانی سے وضو کر سکیں اور پانی لے سکیں۔

حق اور باطل کے درمیان معرکہ درپیش ہو اور اہل حق سر دھڑ کی بازی لگا کر میدان میں نکل آئے ہوں تو

اللہ تعالیٰ بھی اپنی نصرت کی شانیں دکھایا کرتا ہے اور زمین و آسمان کی ہر چیز اہل حق کا ساتھ دینے کے لیے آموجود ہوتی ہے۔ میدان بدر میں بھی یہی کچھ ہوا۔ میدان میں پانی کمیاب تھا۔ مسلمانوں نے حوض میں پانی ذخیرہ کرنے کی تدبیر کی۔ میدان ریتلا تھا جس میں قدم اچھی طرح نہیں جمتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرما کر یہ دونوں پریشانیاں ختم کر دیں۔ بارش سے ریت جم گئی اور اس پر چلنا آسان ہو گیا۔ پانی بھی وافر مقدار میں دستیاب ہو گیا اور حوض بھر گیا۔ رات ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے پریشان ہونے کے بجائے ایسی نیند کا مزہ لیا جس نے ان کی ساری کلفت دور کر دی۔ خدا کی نازل کردہ اس پرسکون نیند کے بعد وہ صبح کو تازہ دم ہو کر اٹھے اور پوری دلجمعی کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا۔ خدا کی نصرت کی انہی نشانیوں کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن مجید میں آیا ہے:

> اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَ يُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ. (انفال ۸:۱۱)
>
> یاد کرو جب کہ تم کو چین دینے کے لیے اپنی طرف سے وہ تم پر نیند طاری کر دیتا ہے اور تم پر آسمان سے پانی برسا دیتا ہے تاکہ اس سے تم کو پاکیزگی بخشے اور تم سے شیطان کے وسوسے کو دفع کرے اور تاکہ اس سے تمہارے دلوں کو مضبوط کرے اور قدموں کو جمائے۔

نبی ﷺ کے لیے صحابہؓ نے ایک چھپر تعمیر کر دیا اس میں آپ کے ہمراہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے اور سعد بن معاذؓ چند انصاریوں کے ساتھ پہرہ دے رہے تھے۔ حضورؐ رات کو اس چھپر کے نیچے دعا و مناجات میں مصروف رہے۔ آپ دعا کرتے "اے اللہ، اگر تو نے اہل اسلام کے اس مختصر گروہ کو آج ہلاک ہونے دیا تو زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی شخص باقی نہ رہے گا۔ پروردگار، تو نے مجھ سے جو وعدہ کر رکھا ہے اس کو پورا فرما"۔ آپ ہاتھ پھیلائے ہوئے برابر یہی دعا کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کی چادر کندھوں سے گر پڑی۔ حضرت ابوبکرؓ نے آگے بڑھ کر عرض کی "یارسول اللہ، اب بس کیجیے اللہ آپ کے ساتھ اپنے وعدہ کو نبھائے گا"۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت نازل ہوئی کہ کفار کی ایک ہزار کی نفری سے خوف نہ کھاؤ۔ اس کے مقابلہ میں اللہ تمہارے لیے ایک ہزار فرشتے اتار دے گا جن کے پرے کے بعد پرے نمودار ہوں گے۔ اس خبر سے اطمینان قلب حاصل کرو اور دشمن کے مقابلہ میں ڈٹ جاؤ۔

جنگ کا آغاز:

صبح نماز سے فارغ ہوتے ہی حضورؐ نے اس غزوہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ رب کی عنایات کا حوالہ دیا اور

مجاہدین کے درجات کی بلندی کی خبر دی۔ اس کے بعد صحابہ کرام کو صف بندی کی ہدایت فرمائی۔ آپ نے نہایت اہتمام سے اپنی فوج کی صفیں درست کیں۔ تلوار اور نیزہ رکھنے والوں کو بیچ میں رکھا اور تیر اندازوں کو دونوں اطراف پر مقرر فرمایا اور ساتھ ساتھ جنگ کے بارے میں ہدایات دیتے رہے۔ اسی دوران میں قریش نے ایک شخص عمیر بن وھب کو میدان جنگ کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا۔ اس نے جا کر رپورٹ دی کہ مسلمانوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ نہ کوئی حصہ ریزرو میں ہے نہ گھات میں، ساری قوت میدان میں آ چکی ہے اور مسلمانوں کی صفوں میں کامل خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن ان کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ اپنے مدمقابل لشکری کو مار کر ہی خود مریں گے۔ جب وہ کثیر تعداد میں لوگوں کو قتل کر دیں گے تو پھر زندگی میں کیا لطف رہ جائے گا۔ یہ سن کر حکیم بن حزام نے سردار قوم عتبہ بن ربیعہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے لشکر کو واپس لے چلیں۔ عتبہ نے لشکر کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میری رائے میں اس لڑائی میں ہر شخص اپنے ہی کسی عزیز کا قاتل ہوگا۔ واپس لوٹ چلو۔ محمد اور اہل عرب کو باہم مقابلہ کرنے دو۔ اگر وہ اس کا کام تمام کر دیں گے تو تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ ابوجہل کو اس کارروائی کا علم ہوا تو اس نے عتبہ کو سخت سست کہا اور کم ہمتی کا طعنہ دیا۔ رسول اللہؐ عتبہ کی لشکر میں چلت پھرت کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ آپ کی زبان مبارک سے نکلا کہ قریش اگر اس سرخ اونٹ والے کی بات مان لیں تو فائدہ میں رہیں گے۔ لیکن ابوجہل نے اس قدر عار دلائی کہ عتبہ جنگ کے لیے تیار ہو گیا[1]۔

عمیر بن وھب نے قریش کو تسلی دی کہ میں نے اچھی طرح جائزہ لے کر دیکھ لیا ہے کہ مسلمانوں کے پاس اپنی تلواروں اور نیزوں کے سوا کوئی پناہ گاہ یا حفاظت کا سامان نہیں۔ اس رپورٹ نے کفار کو مسلمان لشکر کی بے مائیگی اور کم حیثیتی کا تاثر دیا اور وہ بڑے تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقابلہ پر آئے۔ ان کو دیکھ کر نبی ﷺ کی زبان سے نکلا ''اے اللہ، یہ قریش اتراتے ہوئے اور اپنی قوت پر فخر کرتے ہوئے کیل کانٹے سے لیس ہو کر تیری دشمنی اور تیرے رسول کی دشمنی میں یہاں آئے ہیں۔ اے اللہ، اپنی وہ نصرت عطا فرما جس کا تو نے وعدہ کیا ہے۔ اے اللہ، ان کو ہلاک کر''۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی دعا کو اس طرح قبول فرمایا کہ مسلمانوں کو دشمن کی تعداد معمولی نظر آئی۔ قریش کی قوت کا جو رعب ان پر تھا وہ اس موقع پر یک دم دل سے نکل گیا اور وہ بڑے حوصلہ کے ساتھ ان کا سامنا کرنے پر تیار ہو گئے۔ قریش تو پہلے ہی مسلمانوں کو حقارت کے ساتھ دیکھ رہے تھے اس لیے مقابلہ پر اتر آئے۔ دونوں لشکروں کی انہی کیفیات کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے:

اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا۔

(انفال ۸:۴۴)

یاد کرو جب وہ تمہاری مڈبھیڑ کے وقت ان کو تمہاری نظروں میں کم دکھاتا ہے اور تم کو ان کی نظروں میں کم دکھاتا ہے تاکہ اس امر کا فیصلہ فرمادے جس کا ہونا طے شدہ تھا۔

جنگ کے آغاز میں جب قریش کے تین سرداروں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ نے مبارزت طلبی کی تو فوراً تین انصاری نوجوان آگے بڑھے۔ قریشی مبارزوں نے ان کو شناخت کرنے کے بعد اپنے ہم پلہ نہیں سمجھا اور اپنے ہم قوموں کو مقابلہ پر بھیجنے کا مطالبہ کیا۔ اس پر نبی ﷺ نے بنی ہاشم کے تین معززین عبیدہؓ بن الحارث بن عبدالمطلب، حمزہؓ بن عبدالمطلب اور علیؓ بن ابی طالب، جو رشتہ میں آپ کے چچا اور چچازاد بھائی تھے، کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تینوں قریشی سرداروں کو موت کے گھاٹ اتار کر دشمن کو پہلی زک پہنچائی۔ ان میں حضرت عبیدہؓ زخمی ہو گئے۔ ان کی پنڈلی پر اپنے مقابل عتبہ کی تلوار لگی تو خون بہہ گیا۔ جنگ کے ختم ہونے پر مدینہ واپسی کے سفر کے دوران انتقال کر گئے۔ اس کے بعد باقاعدہ جنگ شروع ہوئی تو حضورؐ مسلمانوں کو یہ کہہ کر حوصلہ دیتے رہے کہ ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے، آج جو شخص دشمن کے ساتھ ثابت قدمی اور حسن نیت کے ساتھ لڑے گا، وہ آگے بڑھے گا اور پیٹھ نہیں پھیرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا''۔ اس بشارت نے ممولے کو شہباز سے لڑ جانے کا حوصلہ دیا۔ جب بندے خدا کی راہ میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں تو وہ بھی اپنے فرشتوں کو ان کی مدد کے لیے بھیج دیتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی فرشتوں کی یہ کمک آئی۔ ان فرشتوں کو حکم الٰہی ملا ہوا تھا کہ کفر کے سرغنوں کو تاک تاک کر ان کی گردنیں مارو اور ان کی ہڈیوں کا پور پور توڑ دو۔ فرشتوں نے یہ کام مجاہدین کی آستینوں میں سے کیا۔ مجاہدینؓ نے کامل ایمان اور توکل کا مظاہرہ کرتے ہوئے قریش کی صفیں الٹ دیں۔ ان کے حوصلے کا یہ عالم تھا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بیان کرتے تھے کہ میں نے جنگ کی صف میں اپنے دائیں بائیں نظر ڈالی تو خود کو دو نوخیز انصاریوں کے درمیان پایا۔ مجھے احساس ہوا کہ کاش! کوئی جہاں دیدہ تجربہ کار آدمی میرے ہمراہ ہوتے۔ لڑائی جاری تھی تو ان دونوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں، تو انہوں نے کہا جب نظر آئے تو ہمیں بتایئے۔ ہم اللہ و رسول کے اس دشمن کو واصل جہنم کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ابوجہل نظر آیا تو میں نے ان کو بتایا۔ وہ لپک کر اس کی طرف بڑھے اور تلوار کے وار سے اس کو بے دم کر دیا۔ وہ گر گیا۔ کچھ دیر کے بعد عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کو دیکھا تو ابھی اس کی جان باقی تھی۔ انہوں نے آخری وار کر کے اس کو ختم کر دیا۔ ابوجہل کے قاتل لڑکوں کے ناموں میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ معاذ اور معوذ تھے۔ بعض دونوں کا نام معاذ بتاتے ہیں۔ ایک معاذ بن عمرو اور دوسرا معاذ بن عفراء۔ وقت گزرنے کے

ساتھ قریش کا حوصلہ پست ہونے لگا اور ان پر مسلمانوں کی ہیبت طاری ہوگئی۔

گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا کہ نبی ﷺ نے زمین سے ایک مٹھی ریت اٹھائی اور شَاھَتِ الْوُجُوہ (ان کے چہروں کا ناس ہو!) کی بددعا دیتے ہوئے اس کو دشمن کی طرف پھینکا اور صحابہؓ سے کہا کہ اب ان پر دھاوا کرو۔ دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کے قدم اکھڑ گئے اور وہ اپنے بچاؤ کے لیے بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے تعاقب کر کے ان کو تہ تیغ کرنا شروع کیا اور بعضوں کو گرفتار کرلیا۔

امیہ بن خلف اور اس کا بیٹا بھاگ رہے تھے کہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف کچھ زرہیں لیے نظر آئے جو انہوں نے کفار کے مقتولین سے اتاری تھیں۔ امیہ نے کہا ان زرہوں سے میں زیادہ قیمتی ہوں۔ عبدالرحمٰنؓ کی امیہ سے دوستی تھی۔ انہوں نے زرہیں پھینکیں اور باپ بیٹے کو میدان سے لے کر چلے۔ بلالؓ کی ان پر نظر پڑ گئی تو انہوں نے شور مچا دیا۔ عبدالرحمٰنؓ نے بتایا کہ میں نے ان کو اسیر بنالیا ہے، لیکن بلال کہتے رہے کہ اگر یہ کافر زندہ رہا تو میری زندگی کسی کام کی نہیں۔ کچھ انصاری جمع ہو گئے تو بلال نے بتایا کہ یہ کفر کا امام ہے۔ اسے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ عبدالرحمٰنؓ کی کوشش کے باوجود انصار نے باپ بیٹے کو قتل کر دیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ بلال نے میری زرہوں کو بھی ضائع کروایا اور میرے قیدیوں کو بھی۔ یاد رہے کہ مکہ میں بلالؓ اسی امیہ بن خلف کے غلام رہے تھے اور وہ ان پر سخت ظلم ڈھاتا تھا[2]۔

مشہور روایت کے مطابق ستر آدمی مقتول اور اسی کے بقدر اسیر ہوئے۔ مسلمانوں میں سے صرف چودہ صحابہ کرام نے شہادت پائی۔ ان میں آٹھ انصاری اور چھ مہاجر تھے۔ نبی ﷺ نے ابوالبختری کے بعض احسانات کا حوالہ دیتے ہوئے ہدایت دی کہ اگر وہ زندہ ملے تو اس کو قتل نہ کیا جائے۔ ایک صحابی مجذرؓ کا اس کے ساتھ آمنا سامنا ہوا تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کا حوالہ دے کر اس کو چھوڑ دیا لیکن وہ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ تھا۔ اس کو بچاتے بچاتے وہ خود بھی ہلاک ہوگیا۔

قرآن مجید نے خبر دی کہ دوران جنگ جو بھی اقدامات ہوئے یہ اللہ کے فیصلے کے مطابق تھے اور ان کی تاثیر اللہ کی جانب سے تھی۔ فرمایا:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. (انفال ۸:۱۷)

پس تم لوگوں نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور جب تو نے ان پر خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی

بلکہ اللہ نے پھینکی (کہ اللہ اپنی شانیں دکھائے) اور اپنی طرف سے اہل ایمان کے جوہر نمایاں کرے۔ بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

جنگ ختم ہوئی اور صف اول کے قریشی سرداروں کے کھیت رہنے کی خبر نبی ﷺ کو ملی تو آپ نے شکرانے کے دو نفل ادا کیے اور کہا "اللہ اکبر اَلحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی صَدَقَ وَعدَہٗ وَ نَصرَ عبدَہٗ و ھَزَمَ الْاَحزابَ وَحدَہٗ" اللہ اکبر، خدا کا شکر ہے جس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی نصرت فرمائی اور تنہا دشمن فوجوں کو ہزیمت سے دوچار کیا۔ گویا جس حقیقت کی طرف قرآن مجید نے توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق کو غالب اور باطل کو زیر کرنے کے لیے خاص اپنی نصرت کی شانیں دکھائیں اور غزوہ بدر قریش کے لیے عذاب بن گیا، اسی حقیقت کا نبی ﷺ نے اس موقع پر برملا اعتراف کیا اور کوئی کریڈٹ خود نہیں لیا۔ اس کے بعد آپ نے قریش کی لاشیں میدان بدر ہی کے ایک گڑھے میں دفن کرائیں اور ان کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اے گڑھے والو! تم اپنے نبی کے حق میں بدترین خاندان ثابت ہوئے۔ تم نے میری تکذیب کی جبکہ دوسرے لوگوں نے میری تصدیق کی۔ تم نے اپنے شہر سے نکالا جبکہ دوسروں نے مجھے جگہ دی۔ تم نے مجھ سے جنگ کی جبکہ دوسروں نے میری مدد کی۔ اے عتبہ، اے شیبہ، اے امیہ، اے ابوجہل، ہے نا یہ حقیقت کہ تمہارے رب نے تم سے جو وعدہ کیا تھا تم نے اس کو سچ پایا۔ مجھ سے میرے رب نے جو وعدہ کیا تھا میں نے تو اس کو بالکل سچ پایا ہے"۔[3]

حضورؐ کے اس خطاب میں قریش کے اس جرم کو نمایاں کیا گیا ہے، جس کے وہ دعوت حق کی تکذیب کر کے مرتکب ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے آپ کو عذاب الٰہی کا مستحق بنا لیا تھا لیکن اللہ چونکہ اپنے رسول کو کامرانی عطا فرماتا ہے اس لیے اسباب و وسائل نہ رکھتے ہوئے بھی نبی ﷺ اور آپ کے ساتھیوں ہی کے لیے فتح مقدر ہوئی اور یوں خدا کا وعدہ سچا ثابت ہوا۔

غزوہ بدر مسلمانوں کی پہلی منظم جنگ تھی۔ اس میں کافی مال غنیمت ہاتھ لگا۔ چونکہ جنگی قیدیوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی، بہت سے مسلمان ان کی گرفتاری کے انتظامات میں مصروف رہے۔ کچھ صحابہ نبی ﷺ کی حفاظت کے نقطہ نظر سے آپ کے پاس رہے۔ باقی صحابہ نے مال غنیمت جمع کیا۔ اب لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا کہ اس مال پر کس کا حق ہے۔ جمع کرنے والے مدعی تھے کہ اس کے حقدار وہی ہیں۔ جو لوگ مشرکین کو قیدی بنا رہے تھے انہوں

نے کہا کہ یہ ہمارا حق ہے۔ اگر ہم دشمن کے مقابل میں نہ ہوتے تو یہ مال کہاں سے آتا۔ نبی ﷺ کے محافظوں نے اس میں اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ بحث نے جو شکل اختیار کی اس سے یہ بات نمایاں ہوئی کہ تقویٰ، باہمی خیر خواہی اور اللہ ورسول کی اطاعت کی وہ روح جو سچے ایمان کا تقاضا ہے ایک گروہ کے اندر ابھی پختہ نہیں ہوئی۔ اس موقع پر اسلام میں مال غنیمت کے اجتماعی ملکیت ہونے کا تصور دیا گیا اور قرآن مجید نے بتایا کہ اس کا پانچواں حصہ حکومت کو اجتماعی بہبود کے کاموں میں خرچ کرنے کے لیے دیا جائے گا اور باقی مال شرکائے جنگ میں بانٹا جائے گا۔ چنانچہ نبی ﷺ نے تمام مال یکجا کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے حکومت کا حصہ الگ کر کے باقی مجاہدین میں تقسیم کیا۔ آپ نے ان آٹھ صحابہ کو بھی حصہ دیا جو مدینہ میں بطور عامل مقرر تھے یا کوئی دوسری ذمہ داری ادا کر رہے تھے۔

مال غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بعض لوگوں سے جو کمزوری ظاہر ہوئی اس کے پیش نظر اہل ایمان کی تربیت کے لیے قرآن مجید نے ان کے سامنے سچے اہل ایمان کی خصوصیات واضح کیں۔ فرمایا کہ سچے اہل ایمان وہ ہوتے ہیں جن کے اندر خدا کی عظمت و کبریائی اور اس کی جلالت کا شعور ہوتا ہے اور یہ شعور ان کو صحیح طرز عمل سے غافل نہیں ہونے دیتا۔ جب ان کو کوئی حکم دیا جاتا ہے یا ان پر شریعت کی پابندیاں لگائی جاتی ہیں تو وہ ان کو خوش دلی سے قبول کرتے ہیں اور ان سے ان کا ایمان تقویت پاتا اور مزید ترقی کرتا ہے۔ ان کا اعتماد اپنے رب پر ہوتا ہے۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے رب نے ان کو جو حکم بھی دیا ہے اسی میں ان کی فلاح ہے اور جن حالات سے دوچار کیا ہے انہی میں ان کی مصلحت ہے۔ سچے اہل ایمان اپنے رب کے وفادار رہتے ہیں۔ آپس میں صلح وصفائی کا معاملہ رکھتے ہیں اور ان تمام اعلیٰ صفات سے متصف رہنے کے لیے نماز اور انفاق کی پابندی کرتے ہیں۔ ان کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔

بدر سے واپسی:

رسول اللہ ﷺ نے اسیران جنگ اور مال غنیمت کو لیے ہوئے اب مدینہ کا رخ کیا۔ اسیران جنگ ان صحابہ کے پاس تھے جنہوں نے ان کو گرفتار کیا تھا اور مال غنیمت عبداللہ بن کعبؓ کی تحویل میں دیا گیا جن کا تعلق بنو نجار سے تھا۔ راستہ میں ایک درہ میں منزل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے مال غنیمت شرکائے جنگ میں تقسیم فرما دیا اور ان لوگوں کا حصہ الگ کر لیا جو مدینہ میں آپ کی اجازت سے مقیم رہے تھے۔ جب آپ ایک مقام الروحاء میں

پہنچے تو مدینہ سے مسلمان آپ کو اور صحابہ کو مبارک باد دینے کے لیے آ پہنچے۔ سلمہ بن سلامہ انصاریؓ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ''ہمیں کس چیز کی مبارک باد دے رہے ہو۔ ہمارا مقابلہ تو بڑی بوڑھیوں سے ہوا جو گھروں سے باہر نکل آئی تھیں۔ ان کی حالت بندھے ہوئے اونٹوں جیسی تھی جن کو ہم ذبح کر رہے تھے''۔ یہ سن کر نبی ﷺ نے تبسم فرمایا اور کہا ''بھتیجے۔ ایسا نہ کہو، وہ تو قریش کے سردار تھے''۔

جب قیدی مدینہ پہنچے تو اتفاق سے ام المومنین سودہؓ کی نظر سہیل بن عمرو پر پڑ گئی جس کے ہاتھ گردن کے ساتھ بندھے تھے اور وہ کمرے کے ایک گوشہ میں بیٹھا تھا۔ ام المومنین کی زبان سے نکلا، ابو یزید، شریفوں کے طریقہ سے مر کیوں نہ گئے؟ حضورؐ نے یہ بات سن لی تو فرمایا، اے سودہ! کیا تم اس کو اللہ اور رسول کے خلاف اکسا رہی ہو؟ انہوں نے جواب دیا یا رسول اللہ، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، میں نے جب ابو یزید کو اس حال میں دیکھا کہ اس کے ہاتھ گردن کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں، تو بے اختیار میرے منہ سے یہ بات نکل گئی۔

رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو جن کے پاس قیدی تھے نصیحت فرمائی کہ ان کے ساتھ بھلا سلوک کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر والے خود کھجور پر گزارا کرتے لیکن قیدی کو روٹی مہیا کرتے، مصعب بن عمیرؓ کے بھائی ابو عزیز کا بیان ہے کہ اس صورت حال میں میں روٹی گھر کے کسی فرد کو لوٹانے کی کوشش کرتا لیکن وہ اس کو ہاتھ نہ لگاتا اور مجھے واپس کر دیتا۔

مکہ میں شکست کی اطلاع:

پہلا شخص جو مکہ میں شکست کی خبر لے کر پہنچا وہ حیثمان بن عبداللہ خزاعی تھا۔ اس کو لوگوں نے گھیر لیا۔ جب اس نے بہت سے اشراف کے قتل ہونے کی اطلاع دی تو لوگوں کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ صفوان بن امیہ خانہ کعبہ کے پاس حطیم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سنا تو کہا کہ اس شخص کا دماغ چل گیا ہے، اس کو جانچنے کے لیے میرے بارے میں اس سے سوال کرو۔ لوگوں نے اس سے پوچھا اس وقت صفوان کیا کر رہا ہے۔ اس نے جواب دیا اس وقت وہ حطیم میں بیٹھا ہے اور اللہ کی قسم میں نے اس کے باپ اور بھائی کو قتل ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ابولہب کو بتایا گیا کہ تمہارا بھتیجا مغیرہ بن حارث میدان جنگ سے لوٹا ہے۔ اس نے کہا اسے میرے پاس

لاؤ۔ وہ آیا تو دوسرے لوگ بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ابولہب نے پوچھا بھتیجے کیا معاملہ ہوا۔ اس نے جواب دیا اللہ کی قسم، بس اتنا ہوا کہ مڈ بھیڑ ہوئی اور ہم نے اپنی گردنیں جھکا دیں۔ وہ جس طرح چاہتے ہماری گردنیں اڑاتے اور جس طرح چاہتے ہمیں قیدی بنا لیتے رہے[46]۔

ابولہب نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنی جگہ ایک شخص جنگ میں شرکت کے لیے بھیج دیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ خدا کے عذاب سے بچ نہ سکا۔ جنگ کے چند دن بعد ہی اس کو چیچک نکل آئی جس سے اس کا پورا جسم پھوڑوں سے بھر گیا۔ بیماری کی چھوت سے بچنے کے لیے اس کا کوئی عزیز اس کے پاس نہ جاتا تھا۔ سخت اذیت برداشت کرنے کے بعد وہ مرا۔ اب اس کی اولاد اس کی لاش دفن کرنے سے ڈرتی تھی۔ چنانچہ وہ لاش دو تین روز پڑی رہی جس سے تعفن پیدا ہو گیا۔ کچھ حبشیوں نے اس کو گھسیٹ کر ایک دیوار کے ساتھ رکھا اور اوپر سے دیوار گرا دی۔ یہی ڈھیری اس کی قبر بن گئی۔

مقتولین کی بڑی تعداد کے باعث پورے مکہ میں صف ماتم بچھ گئی۔ عورتوں نے اپنے بال نوچے اور نوحہ کیا۔ مردوں نے جھنجھلاہٹ میں کئی جانوروں کو زخمی کر دیا۔ قریش کے لیڈروں نے محسوس کیا کہ اس طرز عمل سے ملک بھر میں ان کی سبکی ہوگی اور مسلمانوں کو ان پر ہنسنے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ انہوں نے اعلان کرا دیا کہ کوئی شخص نوحہ نہ کرے۔ قیدیوں کی واپسی کے معاملے میں بھی جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔ ورنہ محمد اور اس کے ساتھی بھاری فدیہ کا مطالبہ کریں گے۔

یوم فرقان:

غزوہ بدر کو قرآن مجید میں یوم الفرقان کہا گیا ہے جس کا صاف مفہوم ہے حق کو باطل سے ممیز کر دینے والی جنگ۔ اس جنگ نے فی الحقیقت یہ بات واضح کر دی کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون؟ اللہ کی تائید کس کو حاصل ہے کس کو نہیں؟ کس گروہ کا کیا انجام ہونے والا ہے اور کیوں؟ نیز اس جنگ نے اہل ایمان کے ایمان کو بھی اچھی طرح جانچا۔ جنگ بدر کے فرقان ہونے کی متعدد شہادتیں موجود ہیں:

۱۔ یہ معلوم ہے کہ مسلمانوں کا لشکر دشمن کے مقابل میں ہر لحاظ سے قلیل، کمزور اور کم مایہ تھا۔ اسی بنا پر ایک گروہ نے شروع میں کمزوری دکھائی اور تجارتی قافلہ سے مقابلہ کرنے کا مشورہ دیتا رہا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسباب ایسے پیدا کر

دیے کہ ہر مسلمان کو پوری یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا اور مسلمان اس میں کامیاب رہے۔

۲۔ اس غزوہ میں نہایت قریبی اعزہ ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئے اور بلاشبہ مسلمانوں نے ثابت کیا کہ ان کے لیے خون کا نہیں بلکہ ایمان کا رشتہ زیادہ عزیز ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بیٹا ابھی مسلمان نہ ہوا تھا اور وہ بدر میں لڑنے آیا۔ مسلمان ہونے کے بعد اس نے کہا کہ ابا جان، ایک مرحلہ پر آپ میری تلوار کی زد میں آ چکے تھے لیکن میں نے آپ کا لحاظ کرتے ہوئے آپ پر وار نہ کیا۔ سیدنا ابوبکرؓ نے جواب دیا بیٹے، اگر تم میری تلوار کی زد میں آ گئے ہوتے تو میں تمہیں ہرگز نہ چھوڑتا۔ العاص بن ہشام حضرت عمرؓ کا ماموں تھا اور وہ ان کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ابوحذیفہؓ عتبہ کے بیٹے تھے۔ جب عتبہ کی لاش گڑھے میں ڈالی جا رہی تھی تو نبی ﷺ کی نظر اچانک ابوحذیفہؓ کے چہرے پر پڑی جو متغیر ہو رہا تھا۔ آپ نے پوچھا ''ابوحذیفہ، شائد تم باپ کے بارے میں کچھ محسوس کر رہے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا ''نہیں یارسول اللہ، اللہ کی قسم، میری رائے اپنے باپ یا اس کے قتل سے ڈانواڈول نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے والد کو صحیح رائے رکھنے والا اور حلم و فضل والا جانتا رہا ہوں۔ مجھے توقع تھی کہ اس کی یہ خصوصیات اس کو اسلام کی طرف راغب کریں گی۔ اس توقع کے بعد میں نے اس کا جو انجام دیکھا ہے اور جب میں کفر کی اس حالت کو یاد کرتا ہوں جس پر وہ مرا تو یہ چیز مجھے غمزدہ کرتی ہے''۔ یہ سن کر نبی ﷺ نے ابوحذیفہؓ کو دعا دی۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ ایک انصاری کے پاس سے گزرے جو ان کے بھائی کو اسیر بنا رہا تھا۔ انہوں نے اس سے کہا، اس کو اچھی طرح کس کر باندھنا۔ اس کی ماں بڑی مالدار ہے، اچھا فدیہ ادا کرے گی۔ اس نے کہا بھائی جان، آپ میرے خلاف اس کو مشورہ دے رہے ہیں؟ حضرت مصعبؓ نے کہا ''تم میرے بھائی نہیں ہو، وہ انصاری میرا بھائی ہے''۔ اس جنگ کے اسیروں میں خود نبی ﷺ کے چچا عباس، دو چچازاد بھائی عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن الحارث اور ایک داماد ابوالعاص بن ربیع شامل تھے جن کو دوسرے اسیران جنگ کی طرح زر فدیہ دے کر رہائی حاصل کرنی پڑی اور ان کے ساتھ دوسرے اسیروں سے الگ معاملہ نہیں کیا گیا۔ غزوہ بدر نے یہ سبق اچھی طرح دے دیا کہ اہل ایمان کے کسی کے ساتھ جڑنے یا کسی سے الگ ہونے کا معیار لوگوں کا عقیدہ ہے نہ کہ خون یا وطن۔

۳۔ غزوہ بدر میں قریش اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے اور نبی ﷺ کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ اس شخص نے ہمارے قبیلہ میں خونی رشتوں کو توڑ کر بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اسی لیے وہ یہ دعا کر کے جنگ میں شامل

ہوئے کہ'اے اللہ! جو شخص قطع رحم کرنے والا اور ہمارے دین میں نئی نئی باتیں داخل کرنے والا ہے اس کو ہلاک کر'۔ وہ اپنے حق پر ہونے کے زعم میں جنگ کے نتیجہ کو خود بڑی اہمیت دیتے رہے اور یہ اعلان کرتے رہے کہ اس میں فتح یاب ہونے والا گروہ حق پر سمجھا جائے گا۔ جب یہ جنگ فیصلہ کن ہوگئی تو قرآن نے ان سے ان کے اپنے اعلان کی روشنی میں جنگ کے فیصلہ کو قبول کرنے کا مطالبہ کیا۔ فرمایا:

> اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ وَ لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ. (انفال ۸:۱۹)
>
> اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو تمہارے سامنے فیصلہ آ گیا۔ اور اگر تم باز آ جاؤ تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم پھر یہی کرو گے تو ہم بھی یہی کریں گے اور تمہاری جمعیت تمہارے کچھ کام نہ آئے گی خواہ کتنی ہی زیادہ ہو۔ اور بے شک اللہ مومنین کے ساتھ ہے''۔

۴۔ غزوہ کے ہر ہر مرحلہ پر اللہ تعالیٰ کی نصرت کی وہ شانیں ظاہر ہوئیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اہل ایمان نے اپنے ساتھ فرشتوں کی مدد محسوس کی اور اس سے حوصلہ پایا۔ مشرکین نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان کا مقابلہ کچھ غیر مرئی طاقتوں سے بھی ہے۔ اسی لیے ان کے اعصاب جواب دے گئے اور طاقت کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ مسلمان جس طرح چاہتے ان کو قتل کرتے اور جس کو چاہتے اسیر بنا لیتے۔ سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ دارالندوہ میں جن قریشی سرداروں نے نبی ﷺ کو قتل کرنے کی اسکیم تیار کی تھی ان میں سے تین کو چھوڑ کر باقی سب جنگ بدر میں مارے گئے۔ ان تین کو بعد کے مراحل میں اسلام کی توفیق ملی۔

۵۔ قرآن مجید نے برملا یہ بات قریش سے کہی کہ تم رسول اللہ سے عذاب نازل کرنے کا مطالبہ کیا کرتے تھے اور وہ پورا نہیں ہوتا تھا۔ تم دعا کرتے تھے کہ اے اللہ! اگر تیرے پاس سے یہی حق ہے (اور ہم اس کا انکار کر رہے ہیں) تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا، یا کوئی اور دردناک سزا بھیج۔ لیکن اس کے جواب میں نہ پتھروں کی بارش ہوئی نہ کوئی عذاب آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تمہارے درمیان اللہ کا رسول اور اس کے ساتھی موجود تھے۔ یہ سب برابر استغفار کرتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی دعاؤں اور التجاؤں کا لحاظ تھا، چنانچہ تم بھی عذابوں سے محفوظ رہے۔ اب وہ رکاوٹ باقی نہیں ہے۔ آخر اللہ تم کو عذاب سے کیوں محفوظ رکھے گا جبکہ تم مسجد حرام سے لوگوں کو روکتے ہو اور اس کے متولی ہونے کے بھی اہل نہیں ہو۔ تمہارا یہ گناہ اتنا بڑا ہے کہ آئندہ تم اہل ایمان سے

ٹکرا ٹکرا کر اپنا ہی سر پھوڑتے رہو گے۔ تم اپنی جمع پونجی اسی مد میں لگاتے رہو گے لیکن اس نقصان کی حسرت تمہارے دل کا کانٹا بن جائے گی۔ اس کے باوجود تم غلبہ نہ پاسکو گے۔ شکست تمہارا مقدر بننے والی ہے۔

اسیران جنگ:

جنگ بدر میں قریش کے ستر آدمی اسیر ہو گئے تھے۔ جنگ کے بعد ان کی رہائی کا معاملہ قریش کے لیے ایک ذلت آمیز کام تھا۔ اسیران جنگ کے عزیزوں نے مدینہ آ کر نبی ﷺ سے ان کی رہائی کی درخواست کی۔ سورہ محمد میں آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ اگر کفار کے ساتھ جنگ ہو تو اس کے خاتمہ پر دشمن کو قیدی بناؤ۔ پھر خواہ ان کو احسان کر کے چھوڑ و، خواہ ان سے فدیہ قبول کرو، دونوں رویے درست ہوں گے۔ اس حکم کی روشنی میں آپ نے قیدیوں کی مالی حیثیت کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ چار ہزار درہم اور کم سے کم ایک ہزار درہم فی کس فدیہ وصول کیا۔ جن اسیروں کے پاس مال نہ تھا ان سے مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی خدمت لی گئی اور بعض کو غیر جانبداری کے وعدہ پر چھوڑا بھی گیا۔ اسیروں میں نبی ﷺ کے قریبی عزیزوں میں سے آپ کے چچا عباس اور داماد ابوالعاص بھی تھے۔ عباس مالدار آدمی تھے۔ حضورؐ نے ان سے ان کے دو بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن الحارث اور ایک حلیف عتبہ بن عمرو کا فدیہ بھی وصول کیا۔ ابوالعاص کی رہائی کے لیے حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے مکہ سے اپنا وہ طلائی ہار بطور فدیہ بھیجا جو ان کی شادی کے موقع پر حضرت خدیجہؓ نے ان کو دیا تھا۔ اس کو دیکھ کر نبی ﷺ کی طبیعت بھر آئی۔ آپؐ نے عام مسلمانوں کی اجازت سے ہار لوٹا دیا اور ابوالعاص کو اس شرط پر رہا کیا کہ وہ مکہ جاتے ہی حضرت زینبؓ کو ہجرت کی اجازت دے کر مدینہ پہنچا ئیں گے۔

قریش کو اس بات کا ملال تو تھا ہی کہ رسول اللہؐ کے ساتھ پہلی ہی جنگ میں ان کو ایسی شکست ہوگئی جو ان کو پورے عرب میں رسوا کر دے گی، اب انہوں نے پھر پروپیگنڈا مہم چلانے کا فیصلہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے پیچھے یہود کا دماغ کام کر رہا تھا۔ انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ فی الحقیقت جو اللہ کے رسول ہوتے ہیں وہ لوگوں کی اصلاح کرتے ہیں، ان کو حق کی تلقین کرتے ہیں، خود نیکی کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اسی کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں۔ ان کو دنیاوی کاموں سے کوئی رغبت نہیں ہوتی۔ لڑائی بھڑائی کے کام ان کے منصب کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے۔ بھلا وہ لوگوں کو قتل کر کے اور قیدی بنا کر کیوں خوش ہوں گے۔ اہل کتاب کے نبیوں نے نیکی کی تعلیم دی، عبادات پر توجہ مرکوز

رکھی اور لوگوں کو رہبانیت کے طریقے سکھائے۔ انہوں نے اپنے مخالفین کو قیدی بنایا اور نہ قتل کیا۔

یہ پروپیگنڈا اتنا زہریلا تھا کہ اس سے عوام الناس پر برا اثر پڑ سکتا تھا، بالخصوص اس صورت میں کہ وہ عیسائی راہبوں کی خانقاہوں کو جانتے اور ان کے عبادت کے طریقوں کو دیکھتے تھے۔ لہٰذا اس کا توڑ خود قرآن نے کیا اور فرمایا کہ اگر دنیا میں دین کا نام باقی ہے اور اس کے مظاہر و آثار نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے اہل ایمان کو فساد پھیلانے والوں سے نمٹنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ خاص اہل کتاب کے لیے ان کی تاریخ کی ایک ایسی جنگ کا حوالہ دیا جو غزوہ بدر سے بڑی حد تک مشابہت رکھتی تھی۔ اس میں اللہ کے نبی کے حکم سے اہل ایمان کافروں سے ٹکرا گئے اور فتح پائی۔ فرمایا:

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ. وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ.

(بقرہ۲:۲۵۰۔۲۵۱)

اور جب جالوت اور اس کی فوجوں سے ان کا سامنا ہوا تو انہوں نے دعا کی: اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر انڈیل دے، ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافر قوم پر ہمیں غلبہ عطا فرما۔ تو اللہ کے حکم سے انہوں نے ان کو شکست دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اس کو بادشاہی اور حکمت بخشی اور اس علم سے اس کو سکھایا جس میں سے وہ چاہتا تھا۔ اور اگر اللہ ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

خاص غزوہ بدر کے حوالہ سے، جس میں ستر کفار مقتول اور اتنے ہی اسیر ہوئے اور بہت سا مال غنیمت بھی ہاتھ آیا جسے سپاہ میں تقسیم کیا گیا، کفار کے پروپیگنڈے کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ نبی تو ایسے حالات پیدا کرنے سے اجتناب کرتا ہے جن کے نتیجہ میں جنگ کی نوبت آئے، اس میں لوگ قتل اور قید ہوں۔ لیکن بدر کے موقع پر جنگ کی ذمہ داری نبی پر نہیں ڈالی جا سکتی بلکہ قریش خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ دنیا طلبی پیغمبر کا شیوہ نہیں، یہ قریش جیسے دنیا داروں ہی کا شیوہ ہے۔ رسول اللہ کے ساتھ انہوں نے جو رویہ رکھا اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان پر عذاب عظیم نازل ہوتا لیکن اللہ نے ان کو مزید وقت دینے کا فیصلہ کیا۔ پھر اہل ایمان کو تسلی دی کہ مال غنیمت کا حصول اور اس کو برتنا ایک حلال و طیب کام ہے۔ وہ کفار کے پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں اور اس کو حلال و طیب ہی کے طور پر

استعمال کریں۔ فرمایا:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ۚ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّمَنْ فِىْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (انفال ۸: ۶۷-۷۱)

کوئی نبی اس بات کا روادار نہیں ہوتا کہ اس کو قیدی ہاتھ آئیں یہاں تک کہ وہ اس کے لیے ملک میں خونریزی برپا کردے۔ یہ تم (کفار) ہو جو دنیا کے سروسامان کے طالب ہو، اللہ تو آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو روش تم نے اختیار کی اس کے باعث تم پر ایک عذاب عظیم آ دھمکتا۔ پس (اے مسلمانو) جو مال غنیمت تم نے حاصل کیا اس کو حلال و طیب سمجھ کر کھاؤ برتو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اے نبی! تمہارے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی پائے گا تو جو کچھ تم سے لیا گیا اس سے بہتر تم کو وہ عطا فرمائے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اگر یہ تم سے بدعہدی کریں گے تو اس سے پہلے انہوں نے خدا سے بدعہدی کی تو خدا نے تم کو ان پر قابو دے دیا۔ اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔

اللہ کے جس نوشتہ کا یہاں حوالہ ہے اس کے تحت، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ بات تھی کہ قریش کو سنبھلنے اور اپنی اصلاح کرنے کے لیے مزید مہلت دی جائے گی۔ لیکن اگر وہ شرارت سے باز نہ آئے تو دوبارہ منہ کی کھائیں گے۔

سورہ انفال کی ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ زرفدیہ کی یہ تمام کارروائی نہ اسلامی تعلیمات کے خلاف تھی نہ مصالح کے خلاف۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوئی اور اس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ لہٰذا اس کارروائی کو جن روایات کی رو سے آنحضرت ﷺ پر عتاب کا باعث سمجھا گیا ہے وہ لائق اعتناء نہیں ہیں۔ ان روایات کی رو سے حضورؐ کا اسیروں کے بارے میں فیصلہ غلط تھا اور دنیا طلبی میں آپ نے ان سے فدیہ قبول کر لیا تھا۔ اس پر آپ کو معاذ اللہ عذاب عظیم کی دھمکی دی گئی۔ لوگ یہ بات کہتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ رسول معصوم ہوتا ہے۔ اس کا ہر فعل اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں انجام پاتا ہے۔ اگر اس سے کسی غلط فیصلہ کا امکان ہو تو فوراً اس کو روک دیا جاتا ہے۔ جنگ بدر میں تو آپ کی پھینکی ہوئی مٹھی بھر ریت کو بھی اپنی طرف منسوب کیا گیا لیکن تعجب ہے کہ ستر قیدیوں سے فدیہ کا

معاملہ ہو جانے کے بعد حضورؐ پر عتاب تو کر دیا گیا لیکن معاملہ کو بدلا نہیں گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سورہ محمد میں پہلے ہی یہ احکام نازل ہو چکے تھے کہ اسیران جنگ کو زرفدیہ لے کر یا ان پر احسان کر کے بغیر فدیہ لیے چھوڑا جا سکتا ہے۔ فرمایا:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ. حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ذَٰلِكَ. وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُم بِبَعْضٍ. وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ. (محمد ۴:۴۷)

پس جب ان کافروں سے تمہارے مقابلہ کی نوبت آئے تو ان کی گردنیں اڑاؤ، یہاں تک کہ جب ان کو اچھی طرح چور کر دو تو ان کو مضبوط باندھ لو۔ پھر یا تو احسان کر کے چھوڑنا ہے یا فدیہ لے کر، یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ خود ہی ان سے انتقام لے لیتا لیکن وہ چاہتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے اللہ ان کے اعمال ہرگز رائیگاں نہیں کرے گا۔

ان آیات میں 'جب مقابلہ کی نوبت آئے' کے الفاظ ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ یہ ہدایات غزوہ بدر سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اور اس جنگ میں ان پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا گیا۔ دشمن کا اتنا خون بہا کہ اور کسی جنگ میں مقتولین کی اتنی بڑی تعداد نظر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ بکثرت قیدی بنائے گئے، ان سے زرفدیہ لیا گیا۔ جو بے وسیلہ تھے ان سے خدمات لی گئیں، تب ان کو چھوڑا گیا۔

اسیران جنگ کو مدینہ منورہ کی معاشرت، مسلمانوں کا اخلاق، اسلام کے لیے قربانی کا جذبہ اور اسلام کا پیدا کردہ انقلاب احوال دیکھنے کا موقع ملا جس نے یقیناً ان کو متاثر کیا۔ رہائی کے وقت ان کو یہ احساس دلایا گیا کہ مسلمانوں کو ان کے زرفدیہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اصل مطالبہ ان سے قبول ہدایت کا ہے۔ ان کو اس توقع پر چھوڑا جا رہا ہے کہ وہ جلد اسلام کی حقانیت کے قائل ہو کر اس کے حلقہ بگوش ہو جائیں گے اور آئندہ کفر کی جانب سے اسلام کے خلاف صف آرا نہیں ہوں گے۔ اگر انہوں نے اپنی جان بخشی کی قدر نہ کی تو یقین رکھیں کہ اللہ پھر ان کو مسلمانوں کے قابو میں دے دے گا۔

غزوہ بدر کے بعد مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل:

جنگ بدر قریش کے لیے ایک تازیانہ عذاب تھی جو اللہ کے رسول کی تکذیب کے نتیجہ میں ان پر برسا تھا۔ البتہ اس کی نوعیت ایسی نہیں بنائی گئی کہ تمام مشرکین تباہ ہو جاتے بلکہ اس کو ان کی آنکھیں کھولنے کا ذریعہ بنایا گیا

تا کہ ان کے تمام باصلاحیت لوگ دین اسلام کی طرف آ سکیں۔ چنانچہ فرمایا گیا:

قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ.

(انفال ۸:۳۸)

ان کفر کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر یہ باز آ جائیں تو جو کچھ ہو چکا ہے وہ معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہ پھر بھی کریں گے تو اگلوں کے باب میں سنت الٰہی گزر چکی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر قریش اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو یاد رکھیں کہ وہ بالآخر اس سنت الٰہی سے دوچار ہوں گے جو رسولوں کی تکذیب کرنے والی پچھلی قوموں -- عاد، ثمود، مدین اور قوم لوط وغیرہ -- پر تباہ کن عذاب کی صورت میں ظاہر ہو چکی ہے۔ رسول کسی ناہنجار قوم پر اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جو قوم رسول کی تکذیب کر دیتی ہے خدا کی زمین پر اس کا وجود برداشت نہیں کیا جاتا۔

جنگ بدر کے بعد مسلمانوں کو جو لائحہ عمل دیا گیا وہ یہ تھا کہ وہ قریش اور ان کے اعوان و انصار سے جنگ جاری رکھیں یہاں تک کہ سرزمین عرب سے مسلمانوں کو بجبر وظلم دین حق سے روکنے کے فتنہ کا کلی استیصال ہو جائے اور کسی کے لیے اس کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے کہ وہ کسی مسلمان کو اسلام لانے کی بنا پر ستا سکے یا کسی کے قبول اسلام میں رکاوٹ بن سکے۔ اس جدوجہد کا مقصود یہ تھا کہ سرزمین حرم پر اللہ کے دین اسلام کے سوا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین تھا، کوئی دوسرا دین باقی نہ رہ جائے اور اللہ کے گھر سے اس کے ان متولیوں کو بے دخل کر دیا جائے جنھوں نے اس گھر کے تمام مقاصد برباد کر کے اس کو ایک بت خانہ بنا رکھا تھا۔ چنانچہ فرمایا:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ.

(انفال ۸:۳۹)

ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ کا قلع قمع ہو جائے اور سارا دین اللہ کا ہو جائے۔ پس اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کو دیکھ رہا ہے۔

اس آیت سے اس بات کا صاف اشارہ نکلتا ہے کہ اگر مشرکین نے اپنی روش کی اصلاح کر لی تو اللہ تعالیٰ ان کی ماضی کی غلطیوں کو نہیں دیکھے گا بلکہ ان کے مستقبل کے اعمال کو دیکھے گا۔ لیکن اگر یہ اپنی ضد اور ہٹ پر جمے رہے تو ان کی کثرت تعداد اور سرو سامان کی بہتات ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گی۔ خدا نے جس طرح اس جنگ میں اپنی شانیں دکھائی ہیں اسی طرح آئندہ بھی وہ اپنی شانیں دکھائے گا۔

اس لائحہ عمل پر کامیابی سے گامزن رکھنے کے لیے ضروری ہوا کہ مسلمانوں کو ضروری ہدایات بھی دی جائیں۔ چنانچہ جنگ بدر کے بعد حسب ذیل احکام نازل ہوئے۔

۱۔ آئندہ کے لیے قابل جنگ مسلمانوں کو منظم اور گھوڑوں کی تربیت کی جائے تاکہ ان کی مدد سے موثر جنگ لڑی جاسکے۔ مسلمانوں کی فوجی قوت ایسی ہو کہ دشمن ان کو نرم چارہ سمجھ کر حملہ کی جرأت نہ کریں۔

۲۔ مسلمانوں کو اپنی قلت تعداد سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ اپنے اندر صبر کی صفت پیدا کرلیں گے تو اپنے سے دس گنا بڑے لشکروں کے مقابلہ میں بھی یہی فتح یاب ہوں گے۔

۳۔ جب دشمن سے مقابلہ منظم فوج کشی کی صورت میں ہو تو میدان جنگ سے پیٹھ پھیرنے کا جرم کفر وارتداد کی مانند سنگین ہوتا ہے۔ پیٹھ دکھانے والے خدا کے غضب کے مستحق ہوتے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

۴۔ مسلمان دنیا میں خدا کی بندگی و اطاعت کی رسم قائم کرنے کے لیے اٹھے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ بندگی کی تواضع اور عبدیت کی فروتنی ان پر ہر حال میں نمایاں رہے۔ جنگ کے لیے نکلنے میں بھی یہ بدمست اور مغرور ہو کر اپنی قوت کی نمائش کرتے ہوئے میدان جنگ میں نہ آئیں۔ انہیں کبھی اپنی کثرت تعداد اور وسائل پر ناز نہ ہو۔ اصل قوت سروسامان میں نہیں بلکہ خدا کی کارسازی اور اس کی معیت میں ہے۔

۵۔ جنگ میں مقابلہ کے وقت ثابت قدمی اللہ کی نصرت حاصل کرنے کے لیے شرط ضروری ہے، اس لیے کہ جب بندے اپنی پوری صلاحیت لڑائی میں جھونک دیتے ہیں تو اللہ کی نصرت اس کے پردے میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنا فرض ادا نہ کریں تو اللہ کی نصرت بھی حاصل نہیں ہوتی۔

۶۔ جنگ کے دوران اللہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہ میدان میں ثابت قدمی حاصل کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ مومن کے اندر عزم اور حوصلہ کا سرچشمہ ذکر الٰہی ہے۔ اسی سے وہ ایمان پیدا ہوتا ہے جو دل کی مضبوطی کا باعث ہے۔

۷۔ احکام پر عمل کرنے میں اختلاف رائے بے حد نقصان وہ چیز ہے۔ اس سے جماعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں فوج کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور ہوا اکھڑ جاتی ہے۔

۸۔ مومن کا بھروسہ اپنی قوت بازو پر نہیں بلکہ خدا پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قوت ناقابل شکست ہے۔ اس کی تدبیر کے مقابل میں کسی کی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ لہٰذا اہل ایمان اسی پر اعتماد رکھتے ہیں اور وہ بھی اپنے اوپر بھروسہ

کرنے والوں کا ساتھی بن جاتا ہے۔

۹ کسی مرحلہ میں قریش اگر صلح کے خواہاں ہوں تو ان کی پیشکش ٹھکرائی نہ جائے۔ اگر وہ صلح دھوکہ دہی یا شرارت کی غرض سے کریں گے تو یاد رکھیں کہ اللہ مسلمانوں کے ساتھ ہے اور وہ ان کی مکاریوں کا توڑ کرنے کے لیے کافی ہے۔

یہ تمام ہدایات سورہ انفال میں دی گئیں۔ ان میں اسلامی قانون جنگ کی ضروری دفعات آ گئی ہیں۔ ان میں اگر کوئی کسر رہ گئی تو بعد میں پیش آنے والی جنگوں میں مسلمانوں کی کارکردگی پر تبصرہ میں اس کو بھی پورا کر دیا گیا۔

حوالہ جات

۱۔ سیرۃ النبیؐ۔ ابن کثیر۔ ج ۱، ص ۵۵۶

۲۔ صحیح بخاری۔ کتاب الوکالہ۔ باب اذا وکل المسلم حربیا فی دار الحرب۔ ج ۳، ص ۱۲۹

۳۔ سیرۃ النبیؐ۔ ابن کثیر۔ ج ۱، ص ۵۸۴

۴۔ ایضاً، ص ۶۰۲۔۶۰۳

باب 30

دشمنان اسلام کی محاذ آرائیاں

مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے پیش نظر مدینہ اور اس کے مضافات کے بکثرت لوگوں نے اسلام قبول کرنے میں عافیت سمجھی تا کہ جب مسلمانوں کو ملک میں کامل اقتدار حاصل ہو جائے تو یہ اس کے فوائد سے محروم نہ رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بدر اور احد کی جنگوں کے مابین اگرچہ صرف ایک سال کا فاصلہ ہے لیکن جنگ احد کے لیے نکلنے والے مسلمانوں کی تعداد بدر جانے والوں کے مقابلہ میں تین گنا تھی۔ یہود میں سے بعض لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ صلح جویانہ روش اختیار کر لی اور دل میں وہ ان کے ساتھ کتنا ہی عناد رکھتے رہے ہوں لیکن بظاہر انہوں نے معاہدات کو توڑنے کی جرأت نہ کی۔ یہود میں سے بہت سے لوگ مسلمان بھی ہو گئے۔ طاقت سے مرعوب ہو کر اسلام لانے میں مصلحتیں زیادہ ملحوظ ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس دور میں خاصی تعداد ایسے مسلمانوں کی تھی جو اسلام لانے میں مخلص نہیں تھے۔ یہ منافقین کہلائے اور انہوں نے آگے چل کر قدم قدم پر مسلمانوں کو زک پہنچانے کی کوشش کی۔

قریش مکہ اور مسلمانوں کے دیگر معاندین، مثلاً نسلی یہود، کو بدر کے نتائج نے پریشان کر دیا۔ انہوں نے شکست میں اپنی ذلت ہی نہیں دیکھی بلکہ حقیقی معنوں میں اسلام کے خطرہ کو محسوس کیا۔ مسلمانوں نے جب ہجرت کی تھی تو قریش نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اپنے مرکز سے کٹ کر مسلمان اپنی جمعیت کھو بیٹھیں گے اور اجنبی ماحول ان کو راس نہیں آئے گا۔ بدر کے نتیجہ سے ظاہر ہوا کہ یہ رائے حقیقت سے بعید تھی اور اسلام کو اکھاڑنے کے لیے اب پہلے سے کہیں زیادہ زور و قوت درکار تھی۔ ان اندیشوں کے پیش نظر انہوں نے کئی محاذوں کو آزمایا۔

رسول اللہؐ کے قتل کا منصوبہ:

جنگ بدر میں سرداران قریش کے بڑی تعداد میں قتل ہو جانے سے قریشی نوجوانوں پر بے حد جھلاہٹ طاری ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے اپنی سی تدبیریں کیں۔ امیہ بن خلف کے بیٹے صفوان نے عمیر بن وہب الجمحی کو تیار کیا کہ وہ مدینہ جا کر نبی ﷺ کو قتل کرے۔ اس کے بدلے میں وہ اس کے ذمہ کا تمام

قرض ادا کر دے گا اور اس کی اولاد کی تمام ذمہ داریاں اپنی اولاد کی طرح پوری کرے گا۔ عمیر نے یہ شرط مان لی، اپنی تلوار کو زہر میں بجھایا اور مدینہ کا رخ کیا۔ مسجد نبوی کے دروازے پر پہنچا تو حضرت عمرؓ نے روکا۔ نبی ﷺ کی نظر پڑی تو آپ نے اس کو خوش آمدید کہا اور پوچھا کیسے آئے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک قیدی کا فدیہ لے کر آیا ہوں۔ آپ نے پوچھا، اس کے لیے تلوار لٹکانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے جواب دیا، ان تلواروں کا ستیاناس ہو، یہ پہلے ہمارے کس کام آئی ہیں؟ آپؐ نے دریافت کیا تو پھر اس قول و قرار کی کیا حقیقت ہے جو تم نے صفوان بن امیہ سے کیا ہے؟ عمیر نے کہا، اس معاملے کی خبر صفوان اور میرے سوا کسی تیسرے آدمی کو نہ تھی۔ اگر آپ اس کا حوالہ دے رہے ہیں تو بلاشبہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں اسلام لاتا ہوں۔ صفوان مکہ میں بڑی بے تابی سے کسی بڑی خبر کا انتظار کرتا رہا اور عمیر کی وفاداری نبی ﷺ نے جیت لی۔

غزوہ سویق:

بدر میں صف اول کی قریشی قیادت کے قتل ہو جانے کے بعد سیادت کا منصب ابوسفیان کے حصہ میں آیا تو اس نے حلف اٹھایا کہ وہ انتقامی کارروائی کرنے تک غسل نہیں کرے گا۔ جنگ بدر کے دو ماہ بعد وہ دو سو افراد کی جمعیت کے ہمراہ نکلا اور مدینہ سے چند میل دور پڑاؤ کیا۔ خودرات کی تاریکی میں مدینہ کی مضافاتی بستیوں میں پہنچا جہاں یہود آباد تھے۔ اپنے یہودی دوست حیی بن اخطب کا دروازہ کھٹکھٹایا جو بنونضیر کا سردار تھا۔ اس نے مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی کے خوف سے دروازہ نہ کھولا۔ اس سے مایوس ہو کر دوسرے سردار سلام بن مشکم کے ہاں گیا۔ اس نے ابوسفیان کو خیر مقدم کہا، اس کی آؤ بھگت کی لیکن علانیہ کوئی مدد فراہم کرنے کو خلاف مصلحت پا کر گریز کی راہ اختیار کی۔ ابوسفیان کو یہود کا تعاون نہ ملا تو کسی بڑی کارروائی کی ہمت نہ ہوئی۔ مدینہ کے بیرون میں کسی جگہ دو مسلمان کھیت میں کام کرتے نظر آئے تو ان کے کھیت تباہ کیے، دو گھروں کو نذر آتش کیا اور دونوں کسانوں کو قتل کر دیا۔ اس طرح اس نے اپنی قسم پوری کی اور مکہ کو واپس ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے فی الفور تعاقب کیا۔ ابوسفیان نے پکڑے جانے کے اندیشہ سے سواریوں کا بوجھ کم کرنے کی خاطر زادراہ کے طور پر لائے ہوئے ستو راستہ میں گرا دیے اور تیزی سے مکہ کو نکل گیا۔ اسی مناسبت سے رسول اللہؐ کی اس جنگی مہم کو غزوہ سویق کا نام دیا گیا۔ سویق ستو کو کہتے ہیں۔

بنوقینقاع کی بدعہدی:

نبی ﷺ نے یہودی قبائل کے ساتھ ناطرفداری کے معاہدے کر رکھے تھے لیکن وہ چونکہ پہلے سے قریش کے ساتھ ربط وضبط رکھتے تھے اوران کی ہمدردیاں قریش کے ساتھ تھیں اس لیے وہ درپردہ ان کو مشورے دیتے کہ مسلمانوں کو قدم جمانے کا موقع نہ دیں۔ جنگ بدر کی آگ بھڑکانے میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ ان کی کوشش ہوتی کہ دوسروں سے مسلمانوں کو زک پہنچوائیں اور اپنے اوپر الزام بھی نہ آنے دیں۔ چنانچہ جنگ بدر میں وہ خود سامنے نہیں آئے۔ قرآن مجید نے ان کے شیطانی رول کی خبر دی اور یہ ہدایت دی کہ اگر وہ معاہدہ کی پاسداری نہیں کرتے تو تم بھی معاہدہ ان کے منہ پر پھینک دو۔ فرمایا:

> اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّ هُمْ لَا يَتَّقُوْنَ. فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ. وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ. اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ. (انفال ۸:۵۶۔۵۸)
>
> وہ لوگ جن سے تم نے عہد لیا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور (اس بدعہدی سے) وہ ڈرتے نہیں۔ اگر تم ان کو جنگ میں پاجاؤ تو انہیں ایسی مار مارو کہ جو ان کے پیچھے ہیں ان کو بھی تتر بتر کر دو تا کہ ان کے ہوش ٹھکانے ہوں۔ اور اگر تمہیں کسی قوم سے بدعہدی کا خطرہ ہو تو تم بھی اسی طرح ان کا عہد ان پر پھینک مارو۔ اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ بدر کے معاملہ میں بنوقینقاع کا ہاتھ نبی ﷺ کو نظر آیا۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ بنوقینقاع پہلے یہود تھے جنہوں نے اس معاہدہ کو، جو ان کے اور آنحضرتؐ کے درمیان تھا، توڑ ڈالا۔ حضورؐ ان کو ان کا عہد یاد دلانے کے لیے ان کی بستی میں تشریف لے گئے اور ان کو خبردار کیا کہ وہ قریش کے انجام سے اپنے کو بچائیں۔ آپ نے واضح فرمایا کہ تم جس رسول کا ذکر اپنے صحیفوں میں پاتے ہو وہ میں ہوں۔ اس رسول کے بارے میں خدا کے ساتھ تمہارا یہ عہد ہے کہ تم اس کی نصرت کرو گے اور اس پر ایمان لاؤ گے۔ ظاہر ہے کہ قریش کے انجام سے یہود کو ڈرانا اسی صورت میں معقول ہوگا جب حضورؐ کے علم میں بنوقینقاع کی کوئی ایسی حرکت رہی ہو جو نبی ﷺ کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کے منافی ہو اور وہ عہد شکنی کے مرتکب ٹھہرے ہوں۔ تاہم یہودیوں نے حضورؐ کی تقریر کے جواب میں بڑی رعونت دکھائی اور کہا، 'اے محمد، تم ہمیں اپنے ماتحت سمجھتے ہو۔ کسی بھول میں نہ رہو۔ تمہارا مقابلہ ایک

ایسی قوم سے ہوا جو یہ نہیں جانتے تھے کہ جنگ کیسے لڑی جاتی ہے۔تم نے ان کو تو نقصان پہنچا لیا لیکن جب ہم تمہارے ساتھ جنگ کریں گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ جنگجو لوگ کیسے ہوتے ہیں'۔ جواب میں جنگ بدر کے حوالہ سے بات کرنا بھی ظاہر کرتا ہے کہ ان کی کچھ توقعات قریش کے ساتھ وابستہ تھیں جو پوری نہ ہوئیں اور قریش کی شکست میں انہوں نے اپنی بھی رسوائی دیکھی۔ نبی ﷺ نے ان کے بدلے ہوئے تیور دیکھے لیکن ان کو نظر انداز کر دیا۔اس کے باوجود بنوقینقاع نے دشمنانہ رویہ نہیں بدلا بلکہ جلد ہی ایک مسلمان خاتون زیورات کے معاملہ کے لیے ان کے کسی سنار کے پاس گئی تو وہاں موجود یہود نے اس کی نقاب الٹنے کی کوشش کی۔ جب اس میں ناکامی ہوئی تو بدبختوں نے اس کی چادر کا ایک کونہ اس کے پیچھے کی جانب باندھ دیا۔ جب وہ اٹھنے لگی تو اس کی چادر کھل گئی۔ یہودی اس عفیفہ کا مذاق اڑانے لگے تو اس نے شور مچا دیا۔ ایک مسلمان نے اس کی چیخیں سنیں تو سنار پر حملہ آور ہوا اور اس کو قتل کر دیا۔ دوسرے یہودی بپھر گئے اور انہوں نے مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس کے قبیلہ نے مسلمانوں کو پکارا۔ بنوقینقاع جنگ بدر کے موقع پر بدعہدی کے مرتکب تو تھے ہی، اس طرح ان کے خلاف اقدام کا موقع پیدا ہو گیا۔ نبی ﷺ نے ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ روز کے بعد انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ منافقین کا سردار عبداللہ بن ابی ان کو بچانے کے لیے سرگرم ہو گیا۔ کہنے لگا 'یہ سات سو بہادر ہیں جنہوں نے ہر کالے اور گورے کی دشمنی سے مجھے محفوظ رکھا ہے۔ میں زمانہ کے تغیرات سے اندیشہ ناک ہوں۔ آپ ان کو کیسے مروا سکتے ہیں، اس کے اصرار پر حضورؐ نے ان کی جان بخشی تو کر دی لیکن ان کو مدینہ چھوڑنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ شام کی جانب چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد حضورؐ نے باقی دونوں قبیلوں سے ناطرفداری کے معاہدہ کی تجدید کروائی۔

کعب بن الاشرف کی بدعہدی:

کعب بن الاشرف کا باپ بنو طے سے لیکن اس کی ماں بنونضیر میں سے تھی۔ یہود کی نسل چونکہ ماں کی طرف سے چلتی ہے اس لیے یہ بھی نسلی یہودی اور بنونضیر کے بااثر لوگوں میں شامل تھا۔ جنگ بدر کے خاتمہ پر جب مسلمان مدینہ کو لوٹے اور اس نے سنا کہ قریشی سردار بڑی تعداد میں قتل ہو گئے ہیں تو اس کو خبر کے سچا ہونے کا یقین نہیں آتا تھا۔ اس کا تبصرہ یہ تھا کہ اگر محمدؐ نے وہ تمام لوگ فی الواقع قتل کر دیے ہیں، جن کے نام عبداللہ بن رواحہ اور زید بن حارثہ کی زبان پر ہیں، تو سطح زمین پر رہنے کی بجائے زمین کے اندر سما جانا بہتر ہے۔ کیونکہ یہ لوگ تو عوام کے

بادشاہ اور ملک کے اشراف تھے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ یہ خبر ایک حقیقت ہے تو یہ مکہ گیا۔ وہاں قریش کو حوصلہ دیتا اور انتقام پر اکساتا رہا۔ اس نے مقتولین کے مرثیے کہے اور ان کے ورثا کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ مکہ سے لوٹا تو نبی ﷺ سے دشمنی کا برملا اظہار کیا۔ آپ کی ہجو میں اشعار کہتا اور لوگوں کو آپ کے خلاف ابھارتا۔ تاریخ یعقوبی کے مطابق اس نے آنحضرتؐ کو دھوکے سے قتل کرنے کی بھی تدبیر کی جو کامیاب نہ ہوئی[1]۔ اس نے مسلمان خواتین کے نام لے لے کر سوقیانہ غزلیں کہنی شروع کر دیں۔ جب اس کے اللہ کے دین کا کھلا دشمن ہونے کے متعدد ثبوت مل گئے تو رسول اللہؐ نے صحابہ سے پوچھا کہ اس موذی سے میری جان کون چھڑائے گا۔ بنوعبدالاشہل کے چند لوگوں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ کعب کے پاس گئے اور حیلے سے اس کو گھر سے باہر لے آئے جہاں وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ کارروائی شب میں ہوئی۔ علی الصبح یہودیوں کو اس کا علم ہوا تو ان کے دلوں میں خوف پیدا ہو گیا۔ بنونضیر اس قتل کا شکوہ کرنے آئے تو رسول اللہؐ نے کعب کی وہ معاندانہ کارروائیاں بیان کیں جن کو بنونضیر روکنے پر قادر نہ ہوئے تھے۔

ظاہر ہے کہ کعب رسول اللہؐ کی عملداری میں نہیں تھا کہ آپ اس کو اپنے ہاں سزا دے سکتے۔ وہ ایک ایسے قبیلہ کا فرد تھا جس نے ناطرفداری کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ عملاً کعب نے ذاتی حیثیت میں اس معاہدہ کی دھجیاں اڑا دیں اور مسلمانوں کی علانیہ مخالفت کرتا اور ان کے لیے مشکلات پیدا کرتا رہا۔ اس کا یہ رویہ ہر شخص کے علم میں تھا اور بنونضیر کے اکابر بھی اس سے آگاہ تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سے اغماض برتا۔ لہٰذا رسول اللہؐ نے اس دشمن اسلام کا خاتمہ کروا دیا۔

منافقین کا کردار:

رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں جس طرح مشرکین اور یہود بحیثیت گروہ ایک جزو لاینفک بن کر سامنے آتے ہیں اسی طرح مدینہ میں منافقین کا عمل دخل بھی آپ کے احوال کے ساتھ اس قدر پیوست ہے کہ اس گروہ کی کارستانیوں کا جائزہ لیے بغیر آپ کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ منافقین ظاہری طور پر آنحضرتؐ کے لائے ہوئے حق کا ساتھ دینے والے لوگ تھے لیکن عملاً یہ اس حق سے بے پروا، اس کے تقاضوں سے بچ بچ کے رہنے والے، حقیقی مومنین اور خود رسول اللہ ﷺ کے لیے مصیبتیں کھڑی کرنے والے تھے۔ مسلمانوں کو ان کی معیت ضرور حاصل تھی لیکن ان کے مخصوص کردار کے باعث ان کی رفاقت و حمایت پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مدینہ میں نبی ﷺ کی آمد کے ساتھ ہی نفاق کا بیج بویا گیا تھا۔ ہوا یہ کہ اوس اور خزرج کے قبائل کے درمیان طویل خونریزی کے بعد ان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ دونوں قبائل بے مقصد جنگ میں نقصان پہ نقصان اٹھا رہے ہیں تو کیوں نہ صلح و آشتی کی فضا پیدا کریں۔ اس کے لیے ضروری ہوا کہ دونوں قبیلے کسی ایک شخصیت پر اعتماد کریں، اس کو اپنا سربراہ تسلیم کر لیں اور اس کی رہنمائی میں کامل یک جہتی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ جس شخصیت پر دونوں قبیلوں نے اتفاق کیا وہ عبداللہ بن ابی بن سلول کی شخصیت تھی جس کا تعلق بنوالحبلی سے تھا۔ عبداللہ بن ابی کو سربراہ بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اوس وخزرج نے نبی ﷺ کو اپنا سربراہ مان کر مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کی کوششوں کے نتیجہ میں دیگر کئی گھرانے بھی مسلمان ہو گئے اور یہ تبدیلی اتنی تیزی سے آئی کہ عبداللہ بن ابی کی سربراہی کا معاملہ سرد خانے میں چلا گیا جس کا اسے بے حد قلق ہوا۔ وہ مدینہ میں صورت حالات کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس نے جب دیکھا کہ یہاں اب اس کی دال گلنے والی نہیں ہے تو بادل ناخواستہ مسلمان ہو گیا۔ جو قلق اسے تھا اس کے باعث وہ دل سے نبی ﷺ سے عناد رکھتا اور ہر اہم موقع پر نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی متاثر کن شخصیت کی بدولت ایک بڑی تعداد اس کی رایوں پر بعد میں بھی اعتماد کرتی رہی اور وہ ان کے اندر نفاق کے بیج بوتا رہا۔

عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے پیش نظر ہر معاملہ میں اپنا مفاد ہوتا، مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کو انہوں نے کبھی اہمیت نہ دی۔ ذاتی مصالح کو یہ اپنی سعی و تدبیر پر منحصر سمجھتے۔ اللہ کے وعدوں پر بھروسہ کرنا اور ان کے سہارے جینا ایک خطرناک کام سمجھتے۔ اسی لیے تمام اجتماعی معاملات میں یہ اسی حد تک دلچسپی لیتے جس حد تک مسلمانوں میں اعتبار قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوتا۔ اجتماعی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرنا گویا ان کی سرشت میں داخل تھا۔

جس طرح عبداللہ بن ابی کا ایک ذاتی رنج منافقین کی ایک جماعت تیار کرنے کا باعث بن گیا اسی طرح مدینہ کے یہود اول روز ہی سے اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے اور اس منصوبے پر عمل کرنے میں جہاں انہوں نے دوسرے سازشی اقدامات کیے وہیں اسلام کا لبادہ اوڑھا کر کچھ لوگوں کو اسلام میں داخل کر دیا۔ اس میں ایک سہولت جو انہیں حاصل ہوئی وہ اوس اور خزرج میں یہودیت اختیار کرنے والے لوگوں کی موجودگی

تھی۔ ان کو نبی ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ میل جول میں کوئی دشواری نہ تھی کیونکہ وہ میثاق مدینہ کی رو سے مسلمانوں ہی کی طرح کے حقوق رکھتے تھے۔ جب ان کے بعض لوگوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تو اب ان کو حضورؐ کی خاص مجالس میں رسائی بھی حاصل ہوگئی۔ ان حالات میں ان کو اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کرنے کا پورا پورا موقع ملا۔ ان کو جو گائیڈ لائن یہودی سرداروں اور علماء وفقہاء سے ملتی اس پر یہ پوری وفاداری سے عمل کرتے اور نہ صرف اسلام کے مستقبل کے بارے میں لوگوں میں شبہات پیدا کرتے بلکہ قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر بھی اعتراضات اٹھاتے۔ یہ فی الحقیقت نبی ﷺ اور مسلمانوں کا معاند گروہ تھا جس نے ظاہری طور پر اسلام کی عبا پہن رکھی تھی۔

یہ منافقین آئے بھی یہود میں سے تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد بھی انہی کے وفادار اور آلۂ کار رہے۔ یہ انہی کے مقاصد کو پورا کرتے اور انہی کی رہنمائی میں چلتے۔ لیکن مسلمان ہونے کے تقاضا سے انہیں مسلمانوں کی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی اور ان کی عبادات میں بھی شامل ہونا پڑتا۔ نماز میں مارے باندھے مجبورانہ شامل ہوتے۔ اس میں یاد الٰہی تو برائے نام ہوتی، دکھاوا زیادہ ہوتا۔ بعض اجتماعی معاملات میں یہ بظاہر مسلمانوں کا ساتھ دیتے تو اس کے فوراً بعد بھاگے ہوئے اپنے آقاؤں کے پاس جا کر وضاحتیں پیش کرتے اور ان کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے۔ یہ اسلام کی خاطر اسلام کے دشمنوں سے دوستیاں ختم کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ برابر انہیں تسلی دیتے کہ ہم نے آپ لوگوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ضرورت پڑنے پر ہم آپ لوگوں ہی کے ساتھ آملیں گے۔ جب مسلمان ان کے رویہ کے بارے میں کوئی وضاحت طلب کرتے تو ان کا جواب یہ ہوتا کہ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ امن اور صلح وآشتی کی راہ اختیار کریں، لہٰذا ہم دونوں پارٹیوں کے درمیان اختلاف کی خلیج پاٹنا چاہتے ہیں۔ قرآن نے واضح کیا کہ یہ اس قدیم جاہلی نظام کو برقرار رکھنے کی ایک کوشش ہے جس میں معاشرہ صدیوں سے مبتلا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ فساد فی الارض، قطع رحم اور برادر کشی کی لعنت ختم ہو لیکن یہ لوگ اس کو سہارا دینا چاہتے ہیں۔

جب ان منافقین کے درمیان کوئی قضیہ پیدا ہوتا تو یہ دوسرے مسلمانوں کی طرح ثالثی کروانے یا فیصلہ لینے کے لیے آنحضرتؐ کی خدمت میں نہ آتے کہ وہ حق کے مطابق معاملہ کو طے کردیں بلکہ وہ یہود کے سرداروں اور فقیہوں کی طرف رجوع کرتے۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ رسول اللہؐ ان کے ساتھ ناانصافی کریں

گے جبکہ یہود منصفانہ فیصلہ دیں گے۔ ان کا یہ رویہ اس کے باوجود تھا کہ اسلام نے ایمان کے بعد طاغوت کا انکار لازم قرار دے رکھا تھا۔

بعض لوگ یہودی سرداروں کی ہدایت کے مطابق اس کھیل میں بھی شریک ہو گئے کہ کچھ دنوں تک اسلام کا اقرار کرتے۔ اس کے بعد یہ کہہ کر مذہب تبدیل کر لیتے کہ ہمیں اس میں وہ حق نظر نہیں آیا جو انبیاء لاتے رہے ہیں۔ اس حرکت سے وہ کمزور مسلمانوں میں اضطراب پیدا کرنا اور اسلام کی طرف میلان رکھنے والے یہودی ساتھیوں کو راہ حق سے پھیرنا چاہتے۔ اس ذہنیت کے منافقین کو قرآن نے خبردار کیا کہ یہ دین سے ارتداد کی روش ہے۔ اگر تمام منافقین بھی اس دین سے پھر جائیں تو اللہ تعالیٰ کو ان کی کوئی پروانہ ہوگی۔ وہ اپنے دین کے لیے ایسے لوگوں کو چن لے گا جو اس سے محبت رکھتے ہوں گے اور یہ محبت کسی مصلحت آمیزی پر مبنی نہیں ہوگی۔ وہ ان منافقوں کی طرح نہیں ہوں گے جو مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے بڑے ہوشیار لیکن یہود ومشرکین کے ہاتھوں میں پتلیوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔

اسلام پر یہود جن جن طریقوں سے حملے کرتے یہ ان کو اختیار کر کے ان کی تقویت کا باعث بنتے۔ اس کے لیے با قاعدہ ان کی در پردہ ملاقاتیں ہوتیں، سازشوں کے تانے بانے بنے جاتے اور ان پر عمل درآمد کے لیے لائحہ عمل طے ہوتا۔ انہی ملاقاتوں کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ یہ ظلم، تعدی اور اللہ و رسول کی نافرمانی کے پروگرام طے کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ یہ لوگ انسانوں سے تو چھپ سکتے ہیں لیکن اللہ ان غداروں اور بے وفاؤں کی تمام حرکتوں کو دیکھتا ہے۔ آج تو کچھ لوگ ان کی حمایت میں زبان کھول لیتے ہیں لیکن کل خدائے علیم وخبیر کی عدالت میں ان کی مدافعت کون کرے گا۔

منافقین سے نمٹنے کے لیے ہدایات:

جن لوگوں کی طرف سے کمزوری ایمان یا نفاق کا مظاہرہ ہوا ان میں سے ہر ایک کی نفسیاتی یا معاشرتی الجھنیں الگ الگ تھیں۔ ان کے اثرات سے عامۃ المسلمین کو بچانا ضروری تھا۔ لہٰذا قرآن مجید میں حسب حال ہدایات دی جاتی رہیں اور یہ سلسلہ تقریباً نبی ﷺ کے پورے مدنی دور کے آخر تک محیط رہا۔

جن لوگوں کا ضعف ایمانی مختلف شکلوں میں سامنے آیا ان کی تربیت کے لیے قرآن مجید کے طویل حصے

نازل ہوئے جن میں ان کی ہر ہر غلط فہمی کو رفع کیا گیا۔ ان کو بتایا گیا کہ انہوں نے اسلام قبول کر کے گھاٹے کا سودا نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کی لازوال نعمتوں کا اپنے کو مستحق بنالیا ہے۔ اس راہ میں جو قربانیاں وہ دیں گے وہ ان کے درجات کو بلند کرنے والی ہوں گی۔ جہاں تک آزمائشوں کا تعلق ہے ان سے ہر مسلمان کو بہر حال دوچار ہونا ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے کہ وہ جماعت جو تمام دنیا کی صلاح و فلاح کا ذریعہ بننے والی ہو، صالح و فاسد عناصر کا ملغوبہ بنی رہے۔ اسے اپنے کھرے اور کھوٹے بندوں میں امتیاز کرنا ہے تاکہ مخلص بندوں کی شناخت بھی ہو جائے اور وہ لوگ بھی نمایاں ہو جائیں جو اعتماد کے لائق نہیں۔ ان کمزور مسلمانوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ اللہ اور رسول کی بتائی ہوئی سیدھی راہ پر استوار رہیں۔ آیات الٰہی کو حرز جان بنائیں اور ان لوگوں سے ہوشیار رہیں جو اپنے پروپیگنڈا اور سازشوں کے ذریعے ان کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

وہ منافقین جو اسلام کے مستقبل کے بارے میں غیر مطمئن تھے اور یہود کے ساتھ بھی تعلق قائم رکھنا چاہتے تھے ان کو بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو بالآخر غلبہ عطا فرماتا ہے۔ رسولوں کی شکست ناممکنات میں سے ہے۔ لہذا اب رسول اللہؐ کے مخالفوں سے دوستی گانٹھنا اجڑے گھر کی دربانی ہے۔ اگر یہ ان کے آلہ کار بن جائیں گے تو یاد رکھیں کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ شیطان نے ان پر اپنا تسلط جمالیا ہے اور یہ خدا کی یاد سے غافل ہو کر اس کی پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔ لہذا ذلت ان لوگوں کا مقدر بنے گی۔ حقیقی ایمان انہی لوگوں کا ہوتا ہے جو اللہ اور رسول کے ساتھ نبرد آزمائی کرنے والوں کو اپنا دوست اور محرم راز نہ بنائیں۔ اگر باپ، بیٹے، بھائی اور رشتہ دار بھی ان کے ایمان سے متصادم ہوں تو ان کو بھی دل میں جگہ نہ دیں۔ اسی صورت میں یہ اللہ کی پارٹی میں شامل ہونے کے دعویدار ہو سکیں گے۔

ان منافقین کو اس بات سے آگاہ کیا گیا کہ ان کا موجودہ رویہ شرک سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ ایک مشرک خدائے واحد کا مخلص نہیں ہوتا۔ وہ اس کے ساتھ بے وفائی کرتا ہے اور اس کے حقوق میں دوسروں کو شریک کرتا ہے۔ یہ منافقین بھی دم تو خدا اور رسول پر ایمان کا بھرتے ہیں لیکن ان کی مصلحتیں آڑے آجاتی ہیں اور یہ اس ایمان کے تقاضے یکسو ہو کر پورے نہیں کرتے بلکہ وفادار دوسروں کے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے خدا کے ہاں آخرت میں ان کا انجام وہی ہوگا جو مشرکین کا ہوگا اور یہ جہنم کے نچلے حصہ میں جھونکے جائیں گے۔ ان پر یہ بات بھی واضح

کی گئی کہ آخرت میں یہ اپنے ظاہری ایمان کی بدولت مخلص مومنین کے ہمراہ چلنے کی کوشش کریں گے لیکن مومنین کے پاس تو نور ہوگا جس میں وہ اپنی شاندار منزل کی طرف رواں دواں ہوں گے، ان منافقین کو نور سے محروم رکھا جائے گا اوران کے اور مخلص مسلمانوں کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔ یہ فریاد کر کے روشنی کے طالب ہوں گے تو جواب ملے گا کہ تمہارے دل مومنین کے ساتھ نہ تھے، تم انہی فتنوں میں مبتلا رہے جن سے خدا نے تمہیں نکالنا چاہا۔ تم نے حق کا ساتھ نہ دیا بلکہ اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دی، تم مومنین کے لیے آفتوں اور گردشوں کے منتظر رہے، تم نے کفر اور اسلام دونوں سے اپنا ناتا جوڑے رکھا، تمہیں ڈھیل دی گئی تو تم باطل کے لیے جری ہو گئے۔ تم سمجھے کہ تمہاری یہ دورخی پالیسی کامیاب ہے۔ شیطان تمہیں فریب دیتا رہا کہ تم اس پالیسی کے بل بوتے پر اپنے مفادات کا تحفظ کرلو گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمہارے دلوں پر وہی قساوت چھا گئی جو یہود کے دلوں پر چھا گئی تھی۔

ان منافقین کو بتایا کہ اگر اپنی اصلاح عزیز ہے تو اللہ اور رسول کی مخالفت سے باز آ جائیں، ایسی مجالس کا بائیکاٹ کریں جن میں اللہ اور رسول کا تمسخر ہوتا اور شعائر اسلام کا مذاق اڑایا جاتا ہو۔ صحابہ کرام کے طریقہ اور رویہ کو اپنائیں اور فتنہ وفساد کی سازشوں سے اجتناب کریں۔ مجالس میں اپنی گفتگوؤں کو گناہ، حق تلفی اور ظلم کے منفی اغراض ومقاصد کے بجائے معروف، صدقہ اور اصلاح معاشرہ کے مثبت کاموں پر مرکوز کریں۔ یہود ومشرکین کے ہاتھوں میں پتلیوں کی طرح ناچنے کی بجائے جہاد فی سبیل اللہ کو اپنا شعار بنائیں، اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے دل وجان سے حصہ لیں اور نام نہاد ناصحوں اور ملامت گروں کی پست ہمت کرنے کی کوششوں کو ناکام بنا دیں۔ ان لوگوں کا رول بالکل شیطانی ہے۔

مسلمانوں میں منافقین کے بارے میں دو رائیں پائی جاتی تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ہمیں ان کے ساتھ میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ اس طرح یہ آہستہ آہستہ عام مسلمانوں میں شامل ہو جائیں گے۔ دوسرے لوگ ان کی کرتوتوں کے باعث ان سے نفرت کرتے اور سمجھتے تھے کہ ان کے ساتھ معاملہ سخت گیری کا ہوگا تو یہ درست ہوں گے۔ قرآن مجید نے آغاز میں یہ ہدایت فرمائی کہ زیادہ سختی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ معقول اور معتدل رویہ اختیار کرنا ہی مناسب ہے۔ ان لوگوں کا خیال بھی صحیح نہیں جو میل ملاپ بڑھانے کے نتیجہ میں منافقین کی اصلاح کی توقع رکھے ہوئے ہیں۔ البتہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر ان کی وابستگیاں ان منافقین کے ساتھ رہیں تو یہ اتنے کایاں لوگ ہیں

کہ ان سادہ لوح مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے۔ قرآن نے ان منافقین کے بارے میں زیادہ بحث و مباحثہ کی اجازت بھی نہیں دی، اور بتایا کہ جب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے کردار کو ناپسند کرتا ہے تو مومنین کا ایک گروہ کیوں ان کے ساتھ تعلقات بڑھانے اور ان کو اہمیت دینے پر تلا ہوا ہے۔ قرآن نے واضح کیا کہ کوئی مسلمان اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ کفر صریح کے بالمقابل ان منافقین کا یہ متذبذب ایمان بھی بہر حال کچھ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ فرمایا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان کا کردار واضح کفر کے مقابل میں اسلام کے لیے زیادہ نقصان دہ ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے منافقین کا ٹھکانا جہنم کے نچلے طبقہ میں رکھا ہے۔

نبی ﷺ طبعاً نہایت نرم خو اور عفو و درگزر سے کام لینے والے تھے۔ منافقین کے معاملہ میں ان کی کمزوریاں اور شرارتیں سامنے آ جانے کے باوجود آپ نے اپنی کریم النفسی کی روش تبدیل نہیں کی۔ قرآن مجید نے اس رویہ کی تعریف کی اور فرمایا کہ ان لوگوں پر اللہ کا یہ احسان ہے کہ تم جیسا شفیق و ہمدرد و ہمدم پیغمبر ہم نے ان کی طرف بھیجا ہے۔ اگر تمہارا رویہ سخت گیری کا ہوتا تو لوگ تمہارے پاس آتے ہوئے ڈرتے۔ منافقین سے بھی عفو و درگزر کی پالیسی مناسب ہے۔ ان کو اعتماد دو اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو تا کہ یہ اپنی اہمیت محسوس کریں۔ ان ہدایات کی روشنی میں اور اپنی طبع مبارک کے تقاضا سے نبی ﷺ کا معاملہ منافقین کے ساتھ نہایت کریمانہ ہوتا۔ اگر آپ ان کو کسی غلطی پر بھی متنبہ کرنا چاہتے تو نرم انداز ہی میں گرفت کرتے تا کہ رسوائی نہ ہو۔ آپ اگر کسی کی غلطی کی نشان دہی فرمانا چاہتے تو اس کے لیے بھی متعین طور پر غلطی کرنے والے کا نام نہ لیتے بلکہ یوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ ایسا ویسا کام کرتے ہیں۔ اس رویہ کے باعث منافقین دلیر ہوتے گئے کہ شاید ان کا فریب کامیاب ہو رہا ہے۔ چنانچہ اگلے مراحل میں آہستہ آہستہ پالیسی بدلنے کا حکم ہوا۔ ہدایت فرمائی گئی کہ ان کی حرکتوں سے اغماض برتو لیکن نیک و بد سمجھاتے رہو اور دل نشین پیرایہ میں ان کو نصیحت کرتے رہو کہ یہ اس روش کو اپنائیں جو ان کے لیے حقیقی طور پر نفع بخش ہے۔ اگر یہ درست نہیں ہوتے تو پھر ان کے ساتھ سخت معاملہ کیا جائے تا کہ ان کے پاس بچنے کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔

مدینہ سے باہر آباد مسلمانوں سے ہجرت کا مطالبہ:

مکہ کے گرد و نواح ہی نہیں بلکہ فاصلے پر آباد متعدد قبائل میں اسلام کی دعوت پہنچ چکی تھی اور اچھی خاصی تعداد میں وہاں لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ ادھر مدینہ میں مسلمانوں کی نفری کم تھی اور آئے دن خطرات میں اضافہ ہو

رہا تھا۔قرآن واضح طور پر ہدایات دے رہا تھا کہ اہل ایمان اپنی قوت کو مجتمع کریں۔ لہٰذا نبی ﷺ نے قبائل میں پیغامات بھیجے کہ تمام اہل ایمان مدینہ کو ہجرت کر آئیں تا کہ وہ اسلام کی قوت کا باعث بنیں۔ ہجرت کی عظیم قربانی کا آغاز اور انجام دونوں ان کے لیے خیر ہی خیر ہوں گے۔

رسول اللہؐ کے حکم پر بالعموم عمل ہوا اور اہل ایمان اپنے اعزہ و اقربا اور گھر بار چھوڑ کر مدینہ آنے لگے لیکن یہی حکم بعض لوگوں کے لیے بڑی آزمائش بن گیا۔ وہ کسی معقول عذر کے بغیر اپنے رشتوں، قرابتوں یا املاک کی محبت میں ہجرت سے گریزاں رہے۔ ان کو گویا اسلام کو درپیش خطرات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دین کے اجتماعی مسائل سے الگ تھلگ رہ کر وہ آزمائشوں سے محفوظ رہنا چاہتے تھے۔ قرآن نے ہجرت سے گریزاں ان لوگوں کو بھی منافقین کی فہرست میں شمار کیا اور حقیقی اہل ایمان کو اس وقت تک دشمنوں کا ساتھی سمجھنے کا حکم دیا جب تک وہ ہجرت کر کے ان کے ساتھ نہیں آ ملتے۔ ہاں اگر وہ مدینہ آ جاتے ہیں تو یہ چیز ان کے اخلاص کی دلیل اور ان کے کھرے کھوٹے میں امتیاز کے لیے کسوٹی ٹھہرے گی۔

قبائل میں کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جو اپنے قبائل کے اندر پھنس کر رہ گئے تھے۔ وہ ہجرت کے آرزومند تھے لیکن اہل قبیلہ نے ان کو دبا کر رکھا ہوا تھا۔ ان مسلمانوں کو خبردار کیا گیا کہ اگر اسی حال میں ان کو موت آ گئی تو ان کا یہ جواب اللہ کے ہاں معذرت کے لیے کافی نہ ہو گا کہ وہ زمین میں دبا لیے گئے ہیں۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ مسلمانوں سے طالب مدد ہوں تو ان کی مدد کی جائے تاہم معاہد قبائل کے اندر اگر ایسے لوگ موجود ہوں تو وہ مدد کے مستحق نہیں۔ ان کے ساتھ معاملہ معاہدہ کی شرائط کے اندر ہی ہو سکتا ہے۔

حوالہ جات

1. تاریخ الیعقوبی، احمد بن ابی یعقوب۔ دار اصادر بیروت، واقعہ بنی النضیر، ص ۴۹

بنو قینقاع پر لشکر کشی کے عوامل اور کعب بن الاشرف کے قتل جیسے واقعات کی زیادہ تفصیل اہل سیرت کے ہاں نہیں ملتی۔ اس لیے لوگوں کو نبی ﷺ پر زبان طعن دراز کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ان دونوں واقعات کو سورہ انفال کی آیات ۵۶۔۵۸ (دیکھیے صفحہ 351) کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان آیات میں کمین گاہوں میں چھپے ہوئے ان لوگوں کا قلع قمع کرنے کا حکم ہے جو قریش کو برانگیختہ کر رہے تھے اور ان کو ہر قسم کا تعاون پیش کر رہے تھے۔ اگر جنگ بدر کے تذکرہ میں قرآن نے ان چھپے ہوئے دشمنوں سے نمٹنے کی ہدایت کی ہے تو یہ بلاوجہ نہیں اور اگر حضورؐ نے یہ دو کارروائیاں جنگ کے فوراً بعد کی ہیں تو یقیناً آپ نے ان لوگوں کا ہاتھ قریش کے حملہ کے پیچھے دیکھا۔

باب 31

اصلاحات کا دور اور یہود کا طرزِ عمل

اللہ کے رسول کا ایک کام تو دین کی عقائدی بنیادوں کو واضح کرنا اور ان کو مضبوط بنانا ہوتا ہے، اس کا دوسرا کام معاشرے کی اصلاح کے لیے ضروری احکام وقوانین سے روشناس کرانا اور ان کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مکہ میں توحید وآخرت کے بارے میں مشرکین کے خیالات ومزعومات پر جو ضرب لگائی اس نے جہاں نیک طبائع کو اپنی طرف متوجہ اور توحید خالص پر پختہ کر دیا وہیں بدطینت مشرکین کو رسول اللہؐ اور آپ کے دین کا کٹر دشمن بنا دیا۔ مدینہ میں جب دین اسلام کی اساس پر نیا معاشرہ قائم ہوا تو ایک تدریج سے اجتماعی معاملات میں دین کی رہنمائی عطا ہونے لگی اور حضورؐ نے اس کو ننھی منی اسلامی ریاست کا قانون بنانا شروع کیا۔ ابتدا میں عبادات کا نظام نافذ ہوا، پھر گھریلو معاشرت کو درست بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے نکاح وطلاق کا نظام روشناس کرایا گیا، جنسی بے راہ روی پر قدغن لگائی گئی۔ مال وجان کے تحفظ کے لیے احکام دیے گئے۔ جوئے اور شراب پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ وقت کے مخدوش حالات کے پیش نظر وضو اور نماز میں رخصتیں دی گئیں۔ جنگوں میں شہادت پانے والوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے بیواؤں اور یتیموں کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔ وفات پانے والوں کے ترکہ کی تقسیم اور ان کی بیواؤں کے معاملات کی اصلاح کے قوانین دیے گئے۔ خاندان کی تنظیم کے لیے حق پر مبنی اصلاحات کی گئیں اور کنبہ، قبیلہ اور معاشرہ سب کے حقوق واضح کیے گئے۔ جاہلی معاشرہ قبائلی طرز کا تھا لہٰذا اختیارات کا ارتکاز سردار قبیلہ کی ذات میں تھا۔ اب حکومت کا نیا نظام روشناس کرایا گیا جس میں اللہ ورسول کی کامل اطاعت اور صاحب امر لوگوں کی مشروط اطاعت کا تصور دیا گیا، معاشرے میں برائیوں کے خاتمہ اور نیکیوں کی ترویج کے لیے اجتماعی کاوش کی تلقین کی گئی۔ مدینہ کی اس ریاست کے سربراہ رسول اللہؐ خود تھے۔ جنگوں میں سپہ سالار بھی آپ ہی ہوتے اور مقدمات کے فیصلے بھی حضورؐ ہی کرتے۔ آپ کی یہ حیثیت اللہ رب العزت کی عطا کردہ تو تھی ہی، میثاق مدینہ کی رو سے بھی آپ اس کے حق دار تسلیم کیے گئے تھے۔

ان احکام شریعت کے سلسلہ میں جہاں اہل ایمان اطمینان حاصل کرتے اور ان پر عمل کو اپنے لیے سعادت سمجھتے، نیز ایک کے بعد دوسرے حکم کے نزول کے منتظر رہتے، وہیں منافقین اور ان کے سرپرست یہود کے دلوں پر آرے چل جاتے۔ مفاد پرست لوگوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ وہ ان اصلاحات کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں جن سے ان کے مفادات پر ضرب پڑتی ہو، ان کی بے لگام آزادیوں پر پابندیاں لگتی ہوں اور جن کے باعث عوام الناس ان کے چنگل سے نکلنے کا امکان دیکھتے ہوں۔

چونکہ اسلامی شریعت یہودی شریعت کی جگہ لے رہی تھی اس لیے یہود کو اس کی ترویج میں اپنی خودساختہ شریعت کا خاتمہ نظر آتا تھا۔ اب تک ان کو عزت کا جو مقام حاصل رہا تھا اور مشرکین عرب ان کا جو علمی تفوق تسلیم کرتے تھے، ان کو وہ ختم ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ مشرکین کے تمام رسوم و رواج تو ہوتے ہی بے بنیاد ہیں ان کو اسلامی احکام کے نفاذ میں اپنی موت نظر آتی تھی۔ لہٰذا اسلام کی معاشرتی اصلاحات نے تمام متاثرہ طبقات میں ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ اس کے جواب میں قرآن نے یہ ہدایت دی کہ اہل ایمان اس مخالفت سے گھبرائیں نہیں بلکہ اس کا مقابلہ ہمت و حوصلہ کے ساتھ کریں۔ پچھلے انبیاء کی اصل وراثت یہی ہے جو اب تم کو منتقل کی جا رہی ہے۔ یہ مفسدین ہاتھ پیر مار رہے ہیں کہ اس اصلاح کے پروگرام کو سبوتاژ کریں لیکن اللہ تعالیٰ اس کو پایہ تکمیل تک پہنچائے گا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان تمام پابندیوں کو ہٹا دے جن میں ان مفاد پرست ٹولوں نے عوام کو جکڑ رکھا ہے۔

احکام پر یہود کے اعتراضات:

یہود اسلام کی مخالفت میں اس قدر اندھے ہو گئے تھے کہ قرآن میں جو احکام نازل ہوتے یا سابقہ شریعت میں کچھ اصلاحات کی جاتیں یا مسلمانوں کو نیکی پر ابھارنے کے لیے نصیحت کا کوئی اسلوب اختیار کیا جاتا تو وہ ان چیزوں میں اعتراض کے لیے نکات پیدا کر لیتے اور ان کو فتنہ انگیزی کا ذریعہ بناتے۔ اس سلسلہ کی بعض نمایاں مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ حدث اور جنابت کی حالت میں پانی میسر نہ آنے کی صورتوں میں اسلام نے تیمم کی اجازت دی۔ اس کو یہود نے اپنی شریعت کے تشددات کے خلاف پایا تو یہ کہنا شروع کر دیا کہ بھلا جو مذہب جنابت جیسی ناپاکی کی حالت میں زمین پر ہاتھ مار کر نماز پڑھ لینے کی اجازت دیتا ہو وہ بھی کوئی خدائی مذہب ہو سکتا ہے؟ اس سے زیادہ اچھا مذہب تو بت پرستوں کا ہے جو مسلمانوں پر ترجیح دیے جانے کے قابل ہیں۔

۲۔ معاشرہ کے کمزور طبقات مثلاً یتیموں، عورتوں اور کمزوروں کے حقوق متعین فرمائے گئے اور معاشرہ کے

طاقتور عناصر کے ظلم وزیادتی کی راہیں قانون سازی کے ذریعے مسدود کی گئیں تو یہود نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ معاشرہ میں ان اصلاحات کے نافذ ہونے کے بعد یہود کی بے لگام آزادیوں اور بے قید شہوت پرستیوں پر بھی زد پڑتی تھی۔ یہود کی پوری کوشش یہ رہی کہ وہ ان اصلاحات کو ناکام بنادیں اور خلق خدا کو پھر اسی تاریکی کے گڑھے میں دھکیل دیں جس سے نجات دینے کے لیے اسلام نے یہ روشنی دکھائی تھی۔

۳۔ جب تحویل قبلہ کا حکم ہوا اور مسلمانوں کو سفر وحضر میں خانہ کعبہ اور مسجد حرام کی جانب رخ کرنے کی ہدایت دی گئی تو یہ چیز یہود کو مخالفت پر اکسانے کا بہانہ بن گئی۔ انہوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ مسلمان بھی کیا عجیب لوگ ہیں کہ بیٹھے بٹھائے انہوں نے اپنے قبلہ ہی سے منہ پھیر لیا۔ گویا ان لوگوں کا دین ومذہب بھی آئے دن تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہود کا یہ پروپیگنڈا اس کے باوجود تھا کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ رسول اللہؐ کی بعثت جب ملت ابراہیم پر ہوئی ہے تو لازم ہے کہ ان کے لیے قبلہ بھی وہی مقرر ہو جس کو حضرت ابراہیمؑ نے مرکز توحید کے طور پر اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا اور ان کی نسل کی ایک بڑی شاخ اسی کو قبلہ مانتی چلی آ رہی ہے۔

۴۔ مشرکین مکہ نے اسلام کی بیخ کنی کے لیے مدینہ پر پے در پے حملے شروع کیے تو مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ مقابلہ کے لیے بھرپور تیاری کریں اور اس پر مال خرچ کرنے سے بالکل دریغ نہ کریں۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی اس دعوت کے لیے قرآن مجید نے یہ مؤثر اسلوب اختیار کیا کہ کون ہے جو آج اللہ کو قرض حسن دے تاکہ وہ کل اس کو بڑھا چڑھا کر عظیم صلہ کی صورت میں لوٹائے۔ یہود نے اس دعوت انفاق کا بھی مذاق اڑایا۔ وہ کہتے کہ مسلمانوں کے اللہ میاں غریب اور ہم بندے امیر ہیں۔ ان کا ہاتھ آج کل بہت تنگ ہے اور غربت اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ وہ بندوں سے قرض مانگنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ نبی ﷺ اور مسلمانوں کی مخالفت میں اس خداشناس گروہ کو اللہ رب العزت کی شان میں گستاخی کرنے میں بھی کوئی باک نہیں تھا۔

تحریف:

ایک قوم جب خوف خدا سے خالی ہو جائے تو اس کے دلوں کی زندگی بھی قائم نہیں رہتی اور دل پتھر ہو کر خشیت الٰہی کی نشوونما کے لیے بالکل بنجر ہو جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں وہ قوم اگر کسی میثاق الٰہی کی حامل ہوتی ہے تو وہ اس کی خلاف ورزی پر بھی جری ہو جاتی ہے۔ جب ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ اس میثاق کو اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کے لیے اس کے الفاظ وکلمات میں تحریف کرنے لگتی ہے۔ یہود کی قساوت قلبی کا ذکر قرآن مجید نے

نمایاں طور پر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ گروہ حقائق کے واضح ہو جانے کے باوجود بھی اپنے اپنے مفادات کے لیے اللہ کے احکام پر تحریف کی قینچی چلانے سے نہیں چوکتا۔ یہ الفاظ و کلمات کو اس کے موقع و محل سے ایسی مہارت کے ساتھ ہٹاتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں حکم کا مقصد ہی فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ جہاں تک قرآن کا تعلق تھا، چونکہ یہ یہود کی دسترس میں نہ تھا اس لیے وہ اس کے احکام میں الٹ پھیر کے لیے منافقین کو آلہ کار بناتے اور کوشش کرتے کہ اس کی تعلیمات اپنی پوری قوت کے ساتھ عوام کے سامنے نہ آ سکیں۔ بلکہ ان کے بارے میں کچھ شکوک اور اعتراضات بھی پھیلا دیے جائیں تاکہ لوگوں کا ایمان خراب ہو۔

آتشیں قربانی کے معجزہ کا مطالبہ:

یہود کے صحیفوں میں ان سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جب ان ان صفات کا حامل پیغمبر خدا کا آخری اور کامل صحیفہ لے کر آئے تو تم اس پر ایمان لانا، اس کی پیروی کرنا، اس کی مدد کرنا اور اس کے لائے ہوئے حق کی گواہی دینا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد یہود نے ان کی ذات میں اس موعود پیغمبر اور ان کے لائے ہوئے حق کو پہچان لیا لیکن ان کے حوالہ سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ جب ان کو خداوند سے باندھا ہوا عہد یاد دلایا جاتا تو وہ یہ جواب دیتے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہے کہ ہم کسی شخص کے دعوائے رسالت کی اس وقت تک تصدیق نہ کریں جب تک وہ ایسی قربانی پیش نہ کرے جس کی قبولیت کی نشانی کے طور پر آسمان سے آگ اتر کر اسے کھا نہ لے۔ یہود یہ بات محض شرارت کے لیے کہتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے صحیفوں میں یہ معجزہ نبوت کے شرائط و لوازم میں بیان نہیں ہوا کہ جب تک کوئی نبی یہ معجزہ نہ دکھائے اس کا دعوائے نبوت ہی قابل توجہ نہ سمجھا جائے۔ کتاب سلاطین ۱۸: ۳۷ اور تواریخ ۷: ۱ میں الیاہ نبی اور سلیمان سے اس معجزہ کے صادر ہونے کا ذکر ہوا ہے لیکن یہ بطور لوازم نبوت کے بیان نہیں ہوا۔ اس لیے نبی ﷺ کے معاملہ میں یہود کا اس معجزہ کے دیکھنے پر اصرار محض آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے سے گریز کی راہ اختیار کرنے کے لیے تھا۔

شرارت سے آنحضرتؐ کی ثالثی قبول کرنا:

میثاق مدینہ کی تحریر کے بعد چونکہ نبی ﷺ کی پوزیشن ایسی ہو چکی تھی کہ فیصلہ کے لیے مقدمات آپ کے پاس لائے جاتے اور اوس و خزرج آپ کے فیصلہ کو ماننے کے پابند تھے۔ پھر اس میثاق کا اطلاق اوس و خزرج کے یہودیوں پر بھی ہوتا تھا جنہیں اپنے دینی معاملات میں کسی قدر آزادی بھی حاصل تھی۔ اس صورت حال میں یہود اپنی مفاد پرستی کی نفسیات کے تحت یہ حرکت کرنے لگے کہ وہ اپنے مقدمات کے فیصلہ کے لیے پہلے یہ دیکھتے کہ

آیا ان کو یہود کی عدالتوں میں جانا مفید رہے گا یا رسول اللہؐ کی عدالت میں۔ وہ قضیہ کو آنحضرتؐ کے سامنے اس طرح پیش کرتے کہ اگر فیصلہ ان کے حق میں ہونے والا ہو تو قبول کر لیں اور اگر ان کے خلاف ہونے کا امکان ہو تو دامن چھڑا کر یہود کے مفتیوں کے ہاں چلے جائیں جہاں وہ رشوت دے دلا کر اپنے حق میں فیصلے بآسانی لے سکتے تھے۔ اس طرح کے مقدمات میں یہود کی کوئی نہ کوئی فاسد غرض پوشیدہ ہوتی اور حضورؐ کے خلاف سیاسی فائدہ اٹھانا بھی مطلوب ہوتا۔

طبری نے ایک روایت یوں بیان کی ہے کہ یہود ایک بااثر زانی اور زانیہ کو زنا کی کڑی سزا سے بچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ مقدمہ محمد ﷺ کے پاس بھیجا جائے کہ وہ ان کے بارے میں حکم لگائیں۔ لیکنؐ یہ احتیاط کی جائے کہ اگر تو وہ ان کے منہ کالے کر کے گدھے پر بٹھانے یا کوڑے لگانے کا حکم دیں تو اس پر عمل کیا جائے لیکن اگر وہ رجم کی سزا تجویز کریں تو اپنے آدمیوں کو ان کے حوالہ نہ کرنا۔ چنانچہ لوگ نبی ﷺ کے پاس آئے اور فیصلہ چاہا۔ آپ اٹھے اور یہود کی دینی درس گاہ مدراش میں جا پہنچے۔ وہاں موجود علماء سے آپ نے سوال کیا کہ تمہارے اندر سب سے بڑا عالم کون ہے۔ لوگوں نے ابن صوریا کو آگے کیا۔ آپ نے اس کو اللہ کی قسم دے کر پوچھا کہ کیا زنا کی سزا کا وہ حکم تمہیں معلوم ہے جو تورات میں ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ ہمارے ہاں ایسے مجرموں کو سنگسار کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے یہی سزا زنا کے ان مجرموں کو سنائی۔

دوسری روایت کے مطابق ابن صوریا نے یہ وضاحت بھی کی کہ اگر آپ مجھ سے اللہ کی قسم کے ساتھ یہ سوال نہ کرتے تو آپ کو کبھی یہ نہ بتاتا کہ ہماری کتابوں میں زنا کی سزا رجم ہے۔ ہوا یوں کہ ہمارے اشراف جب کثرت سے اس جرم کا ارتکاب کرنے لگے تو سزا کا نفاذ صرف کمزوروں پر ہونے لگا۔ پھر علماء نے سوچا کہ بجائے اس کے کہ اشراف کو کھلی چھٹی دے دی جائے، کیوں نہ ایسے مجرموں کے منہ پر کالک مل کر انہیں گدھے پر بٹھا کر رسوا کیا جائے یا کچھ کوڑے لگائے جائیں۔

اسی طرح کا ایک قضیہ بنونضیر اور بنوقریظہ کے درمیان پیدا ہوا۔ ان دونوں قبیلوں میں چشمک تھی۔ بنونضیر اپنے خاندان کو زیادہ اشرف قرار دیتے اور بنوقریظہ کے مقتولین کی دیت ادا کرنے کی نوبت آتی تو اپنے معیار سے نصف دیت ادا کرتے۔ نبی ﷺ کی مدینہ آمد کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بنوقریظہ کے ایک شخص نے ایک نضری کو قتل کر دیا۔ بنونضیر نے حسب روایت دوگنا دیت طلب کی۔ بنوقریظہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ ایک ہی دین کے ماننے والوں اور ایک ہی علاقہ میں رہنے والوں کی دیت میں تفاوت ناروا ہے۔ ہم اس قضیہ کا فیصلہ محمد ﷺ سے کرواتے

ہیں۔ بنو نضیر نے اس پر پہلے نبی ﷺ کی رائے معلوم کرنا چاہی تا کہ فیصلہ اگر ان کے حق میں ہونے کی توقع ہو تو آپ کو ثالث مان لیں ورنہ انکار کر دیں۔

یہود کی اس بدنیتی کے پیشِ نظر نبی ﷺ کو ان کے بارے میں یہ اختیار دیا گیا تھا کہ آپ چاہیں تو ان کے مقدمات کی ذمہ داری قبول کریں اور چاہیں تو اس سے انکار کر دیا کریں۔ فرمایا:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ. فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا. وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ. اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ.

(المائدہ ۵:۴۲)

یہ جھوٹ کے رسیا اور حرام خور ہیں۔ پس اگر یہ تمہارے پاس آئیں تو ان کے درمیان ثالثی کرو یا ان سے بے رخی اختیار کرو۔ اگر ان سے بے رخی اختیار کرو گے تو یہ تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اور اگر ثالثی کرو تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرنا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

باب 32

قریش کی نئی مہم جوئی۔غزوہ احد

نجد کی شاہراہوں کی نگرانی:

جنگ بدر کے بعد قریش کی نقل وحرکت مدینہ کی جانب کم ہو گئی اور انہوں نے تجارت وغیرہ کے لیے وہ متبادل راستہ اختیار کیا جو نجد سے گزر کر شام کو جاتا تھا۔اب ضروری ہوا کہ مسلمان ان علاقوں پر بھی نظر رکھیں۔

ربیع الاول ۳ھ میں خبر ملی کہ بنوثعلبہ اور بنومحارب مہم جوئی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نبی علیہ ﷺ چندسو کی نفری کے ساتھ ان کے علاقہ میں گئے۔ مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ملنے پر یہ قبائل پہاڑوں پر چلے گئے اور مقابلہ نہیں کیا۔اسی موقع پر یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ بارش ہوئی اور حضورؐ سمیت مجاہدین کے کپڑے گیلے ہو گئے۔ نبیؐ نے کپڑے خشک کرنے کے لیے ایک درخت پر پھیلا دیے اور خود آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔اتنے میں ایک کافر دعثور تلوار سونتے ہوئے آپ کے سر پر آ پہنچا اور پوچھنے لگا، آج آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ حضورؐ نے فرمایا 'اللہ'۔ آپ کے جواب ہی سے اس پر کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی کہ تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ حضورؐ نے لپک کر تلوار اٹھا لی اور دعثور سے پوچھا، بتاؤ اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ اس نے کہا کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں معافی مانگتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے کلمہ شہادت پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ اس واقعہ سے حضورؐ کی شجاعت، اعتماد علی اللہ اور توکل کی شان نہایت نمایاں ہو کر نظر آتی ہے۔

جمادی الثانی میں اسی علاقہ میں القردہ کے مقام پر زید بن حارثہؓ کی قیادت میں جانے والے سو سواروں کا آمنا سامنا قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ ہوا جو سونا چاندی لیے ہوئے جا رہا تھا۔ مسلمانوں کی نفری دیکھ کر ان لوگوں نے مال چھوڑا اور بھاگ نکلے۔مسلمانوں نے اس مال پر قبضہ کر لیا اور مدینہ لے گئے۔

قریش کی نئی منصوبہ بندی:

جنگ بدر میں شکست کے بعد قریش کی قیادت نے یہ فیصلہ کیا کہ شام سے لوٹنے والے تجارتی کاروان نے جو منافع کمایا تھا وہ لوگوں میں تقسیم نہیں ہوگا بلکہ اس کو آئندہ جنگ کی تیاری کے لیے وقف کر دیا جائے گا۔

ابوسفیان نے سیاسی طور پر انصار مدینہ کے دونوں قبائل --اوس اور خزرج-- کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ غیر جانب دار ہو جائیں اور قریش کو اپنے ان رشتہ داروں سے نمٹ لینے دیں جو مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر آئے ہیں۔ ان دونوں قبائل کی بڑی تعداد مسلمان ہو کر رسول اللہؐ کے ساتھ وفاداری کا دم بھر چکی تھی لہٰذا ان کے غیر مسلم افراد اب اتنے با اثر نہ تھے کہ وہ کسی کو حضورؐ کی حمایت سے دستکش ہونے پر آمادہ کر سکتے۔ چنانچہ ابوسفیان کی مہم ناکام رہی۔

مدینہ پر حملہ کی تیاری:

قرشی قیادت کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ تنہا ان کی قوت مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے ناکافی ہوگی۔ لہٰذا غیر قرشی قبائل کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بااثر لوگوں کی خدمات حاصل کیں۔ جنگ بدر میں ایک شخص ابوعزہ کی غربت پر ترس کھا کر حضورؐ نے احسان کر کے اسے اس شرط پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ آئندہ جنگوں میں حصہ نہیں لے گا۔ یہ ایک شاعر تھا۔ صفوان بن امیہ نے اس کو تیار کیا کہ وہ تہامہ کے علاقہ کے قبائل میں جائے اور ان کو مسلمانوں کے خلاف ابھارے تاکہ وہ قریش کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو جائیں۔ اس کے بدلے میں صفوان اس کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لینے کو تیار ہے۔ اسی طرح ایک شخص مسافع بن عبد مناف کو بنو کنانہ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ یہ لوگ آئندہ جنگ میں بنو کنانہ، بنو مالک، اہل تہامہ اور احابیش کو شریک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ابوسفیان نے اوس کے سردار ابو عامر کو، جو مکہ میں مقیم تھا، ساتھ ملایا اور آئندہ جنگ میں اس کے اثر و رسوخ کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

کیل کانٹے سے لیس اہل مکہ اور ان کے حلیف قبائل کے لشکر میں تین ہزار افراد شامل تھے جن میں سات سو زرہ بند اور دو سو گھوڑ سوار تھے۔ ان کے ہمراہ بدر کے مقتول سرداروں کی بہو بیٹیاں بطور خاص فوج کو غیرت دلانے کے لیے آئیں۔ نبیؐ کو قریش کی تیاری اور آمد کی خبر آپ کے تین صحابہ نے پہنچائی جو مکہ کی راہ کی نگرانی کر رہے تھے۔ قریش کا لشکر ذوالحلیفہ میں اترا تو شہر میں پہرہ کا انتظام کر دیا گیا۔ تین معزز انصاری لیڈر مسجد نبوی کے دروازہ پر پہرہ دیتے رہے۔

حضورؐ کا خواب اور صحابہ سے مشاورت:

جس طرح رسول اللہؐ کو جنگ بدر سے پہلے پیش آنے والے واقعات کی ایک جھلک خواب میں دکھا دی گئی تھی، آپ کو دو گروہوں میں سے ایک پر غلبہ دینے کی خوشخبری دی گئی اور قریش کی جمعیت کو معمولی دکھایا گیا، اسی

طرح احد کی جنگ سے پہلے بھی آپ نے خواب میں کچھ مشاہدات کیے۔ خواب کے مشاہدات تاویل کے محتاج ہوتے ہیں۔ بدر میں قریش کی جمعیت تعداد میں اہل ایمان سے تین گنا تھی لیکن اپنی حقیقی قوت کے اعتبار سے معمولی تھی کہ مسلمانوں نے ان کو گاجر مولی کی طرح کاٹا اور یہی حقیقت حضورؐ نے رویا میں دیکھی۔

روایات میں خواب مختلف طور پر بیان ہوا ہے۔ ابن ہشام کے مطابق حضورؐ نے خواب کو اچھا بتایا۔ آپ نے دیکھا کہ ایک گائے ذبح کی جارہی ہے، میری تلوار کی دھار میں دندانہ پڑ گیا ہے اور میں نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط زرہ کے اندر داخل کر لیا ہے۔ ابن سعد کے مطابق آپ نے دیکھا کہ میں مضبوط زرہ پہنے ہوئے ہوں۔ میری تلوار کی دھار میں دندانہ ہے۔ ایک گائے ذبح کی جارہی ہے اور اس کے پیچھے ایک مینڈھا ہے۔ زرہ سے آپ نے مدینہ کو مراد لیا اور مینڈھے سے لشکر کفار کو۔ گائے سے مراد لشکر اسلام تھا اور تلوار کی دھار میں دندانہ پڑنے سے ذات نبوی کو نقصان پہنچنا مراد تھا۔ ہماری رائے میں اس خواب میں پیش آنے والے واقعات کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی تھی۔ حضورؐ کو یہ اشارہ دیا گیا تھا کہ اس دفعہ دشمن کے ساتھ مقابلہ سخت ہوگا لہٰذا جنگ کو معمولی نہ سمجھیں۔ اہل ایمان بڑی تعداد میں شہید ہوں گے اور بڑی خونریزی ہوگی۔ خود حضورؐ کا اپنا دفاع ناکافی ہوگا اور دشمن آپ کی ذات کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ دشمن بڑے نقصان سے بچ جائے گا لیکن مدینہ میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرے گا۔ آپ اپنے صحابہ سمیت خود ہی اس میں داخل ہوں گے۔

خواب کے ان اشارات کی روشنی میں آپ نے صحابہؓ کو شریک مشورہ کیا کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے کون سی حکمت عملی اپنائی جائے۔ ایسا کرنے کا فائدہ یہ ہوتا کہ لشکر کا اجتماعی ذہن سامنے آ جاتا، مفید مشورے مل جاتے جن کی روشنی میں منصوبہ بندی کر لی جاتی، اس کے علاوہ وہ لوگ جو اقلیت میں ہوتے اور مختلف رائے کا اظہار کرتے ان کی قوت بھی معلوم ہو جاتی۔ اس طرح کے مواقع پر رسول اللہؐ صورت حال تو صحابہ کے سامنے رکھ دیتے لیکن اپنی رائے ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ جنگ بدر سے پہلے آپ نے معاملہ صحابہ کے سامنے رکھا اور ان سے مشورہ طلب کیا تو وہ لوگ نمایاں ہو گئے جو قریش کے مسلح لشکر کے مقابل آنے سے گریز چاہتے تھے۔ لیکن تمام دلائل سننے کے بعد آپ نے بدر کا رخ کرنے کا حکم دے دیا اور اسی کے لحاظ سے تیاری بھی کی۔

اپنے اسی طریق کار کے مطابق حضورؐ نے قریش کی آمد کی خبر دی اور جنگی حکمت عملی پر تبادلہ خیال کا موقع دیا لیکن اپنی رائے ظاہر نہیں فرمائی۔ اگر آپ اپنی رائے پیش کر دیتے تو پھر کس مسلمان کا حوصلہ تھا کہ وہ آپ کی رائے کے برعکس رائے دے کر اپنے ایمان سے فارغ ہو جاتا۔ ہمارے نزدیک وہ روایات غلط فہمی پر مبنی ہیں جن میں

یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ مدینہ کے اندر رہ کر جنگ کرنے کی خواہش رکھتے تھے لیکن بعض صحابہ کے اصرار پر شہر سے باہر دشمن کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب معاملہ صحابہ کرام کے سامنے رکھا تو منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی نے مدینہ کے اندر رہ کر مقابلہ کا مشورہ دیا۔ اس نے کہا، شہر سے مت نکلیے۔ جب کبھی ہم باہر نکلے ہیں تو دشمن سے نقصان اٹھایا ہے لیکن جب جب دشمن نے شہر میں داخل ہونے کی کوشش کی تو اس نے نقصان اٹھایا کیوں کہ اس صورت میں مرد سامنے سے مقابلہ کرتے ہیں اور عورتیں اور بچے چھتوں سے دشمن پر سنگ باری کر سکتے ہیں۔ مخلص صحابہ کی رائے اس کے برعکس تھی۔ بعض صحابہ جن کی شہادت کی تمنا غزوہ بدر میں پوری نہ ہو سکی تھی، کہنے لگے' یا رسول اللہ! آپ ہمیں دشمن کی طرف لے کر نکلیے۔ شہر میں رہ کر دفاع کرنے سے تو وہ شیر ہو جائیں گے اور سمجھیں گے کہ ہم کمزور ہیں اور بزدلی دکھا رہے ہیں۔ ہم تو اس دن کے آنے کے آرزومند رہے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے ان کو ہمارے قریب بھیج دیا ہے اور ہماری مسافت کو کم کر دیا ہے، ایک صحابی نے کہا زمانہ جاہلیت میں تو کسی کو ہمارے شہر کے اندر داخل ہونے کی جرأت نہ ہوئی، اب اسلام میں کون یہاں آ گھسے گا۔ ایک انصاری نے کہا، حضور ہم دشمن کا مقابلہ اپنے شہر کی گھاٹیوں میں نہیں کریں گے تو پھر کہاں کریں گے۔ بنی سالم کے نعیم بن مالکؓ نے کہا، اے اللہ کے نبی! ہمیں جنت سے محروم نہ رکھیے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں ضرور جنت میں جاؤں گا۔ کسی نے پوچھا وہ کیسے؟ کہنے لگے، اس لیے کہ میں اللہ اور اس کے رسول کو محبوب رکھتا ہوں اور میدان جنگ سے بھاگنا میرا شیوہ نہیں۔ حضرت حمزہؓ نے کہا، اس ذات کی قسم جس نے آپؐ پر کتاب اتاری، ہم میدان ہی میں دشمن سے دو دو ہاتھ کریں گے۔ مسلمانوں نے اپنی تقریروں میں شہادت کی آرزو کی اور شہر کے اندر محصور ہو کر لڑنے کو اس آرزو کے بر آنے میں ایک رکاوٹ بتایا۔ اس طرح منافقین و مخلصین کی تعداد کا اندازہ کرنے کے بعد نبی ﷺ نے شہر سے باہر دشمن کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

احد کی جانب روانگی:

یہ جمعہ کا دن تھا۔ حضورؐ نے جمعہ کے خطبہ میں یہ تلقین فرمائی کہ لوگ تقویٰ اور خوف خدا کو شعار بنائیں۔ جنگ کے دوران صبر و ثبات سے کام لیں اور جو حکم دیا جائے اس کو بجا لائیں اور تیار ہو کر عصر کی نماز کے بعد احد کی جانب چلیں جہاں دشمن مورچہ بند ہو چکا ہے۔ خود حضورؐ گھر میں تشریف لے گئے اور خواب کے اشارے کی روشنی میں ایک کے بجائے دو زرہیں زیب تن فرمائیں اور اسلحہ سنبھالا۔ جب باہر تشریف لائے تو کچھ لوگوں نے اس احساس کے تحت کہ شاید ہم نے بہت اصرار کر کے حضورؐ کو شہر سے باہر جنگ پر مجبور کر دیا، یہ عرض کی کہ اگر حضورؐ

کا اپنا ارادہ شہر میں دفاع کرنے کا ہو تو آپ اس پر عمل کریں۔ آپ نے فرمایا کہ جب رسول اسلحہ زیب تن کر لیتا ہے تو پھر اتارا نہیں کرتا۔ ایسا کرنا اس کے منصب کے لائق نہیں۔

ایک ہزار افراد پر مشتمل لشکر عصر کے بعد روانہ ہوا تو رسول اللہؐ نے احد پہنچنے کا ایک غیر معروف راستہ اختیار فرمایا۔ راستے میں ایک مسلح گروہ نظر آیا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ معلوم ہوا کہ عبداللہ بن ابی کے یہودی حلیف ہیں۔ آپ نے ان کو لشکر میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی۔ یاد رہے کہ میثاق مدینہ میں ایک شق یہ تھی کہ دینی جنگیں اپنے بل بوتے پر لڑی جائیں گی اور یہود نبی کی اجازت کے بغیر ان میں شامل نہیں ہو سکیں گے۔ شب میں حضورؐ نے ایک مقام الشوط میں منزل کی۔ محمد بن مسلمہؓ اور ان کی پارٹی نے پہرہ دیا۔

اگلی صبح جب نبی ﷺ نے کوچ کا حکم دیا تو عبداللہ بن ابی تین سو ساتھیوں کو لے کر لشکر سے علیحدہ ہو گیا اور مسلمانوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ مسلمانوں کے با اثر لوگوں نے اس کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اسے یہ پیشکش بھی کی گئی کہ وہ لڑائی میں حصہ نہیں لینا چاہتا تو نہ لے، صرف دفاعی مورچہ سنبھالے رکھے۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ جب جنگی حکمت عملی طے کرتے وقت ہماری رائے کو کوئی وقعت نہیں دی گئی تو اب ہم ایک غلط فیصلہ پر عمل کرنے میں کیوں ساتھ دیں۔ بنو سلمہ کے عبداللہ بن عمرو بن حرامؓ نے لوگوں کو سمجھایا کہ اپنے نبی اور اپنی قوم کو اس مشکل مرحلہ میں بے یار و مددگار نہ چھوڑیں لیکن ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اس پر عبداللہ بن عمروؓ نے کہا، اے اللہ کے دشمنو! اللہ تمہیں دفع کرے۔ نبی کو تم جیسے لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ بعض روایات کی رو سے اس موقع پر انصار نے اجازت طلب کی کہ ہم اپنے حلیف یہود کو مدد کرنے پر آمادہ کریں تو حضورؐ نے منع فرما دیا۔

عبداللہ بن ابی کی یہ حرکت لشکر کا حوصلہ پست کرنے کا باعث بنی اور قبیلہ اوس کے بنو حارثہ اور قبیلہ خزرج کے بنو سلمہ کو بھی ترغیب ہوئی کہ وہ بھی جنگ سے پہلو تہی کریں لیکن لوگوں کے سمجھانے پر وہ سنبھل گئے۔ اس موقع پر نبی ﷺ نے تقریر فرمائی کہ اہل ایمان کا اعتماد تعداد اور وسائل پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی نصرت پر ہوتا ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ ان تین سو افراد کی جگہ اللہ تعالیٰ تین ہزار فرشتوں کی کمک فراہم کر دے۔ بلکہ اگر تم استقامت دکھاؤ اور دشمن کے کسی ہنگامی حملے کا تقاضا ہو تو تین ہزار کیا، اللہ تعالیٰ پانچ ہزار فرشتوں کو بھی محاذ جنگ پر بھیج دے گا۔ اس موقع پر حضورؐ نے لشکر کا معائنہ کیا اور پندرہ سال سے کم عمر کے لڑکوں کو، جو جذبہ جہاد سے سرشار مدینہ سے نکل پڑے تھے، واپس شہر کو بھیج دیا۔ سات سو مسلمان اللہ کی نصرت کے بھروسہ پر آگے بڑھے۔ نبی ﷺ نے کوہ احد کو دائیں ہاتھ اور

پشت پر رکھ کر ایک نیم دائرہ میدان میں اپنی فوج کی صف بندی کی۔ بائیں ہاتھ کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی تھی۔ اس پر آپؐ نے پچاس تیراندازوں کو متعین فرمایا اور ان کے افسر عبداللہ بن جبیرؓ کو ہدایت فرمائی کہ لشکر پر بائیں جانب اور پشت سے حملہ کا دفاع کرنا اور میدان جنگ میں صورت حال خواہ کوئی بھی رخ اختیار کر جائے تم اپنی مفوضہ ڈیوٹی ہی سر انجام دینا اور جنگ کے خاتمہ تک اس پہاڑی مورچے کو نہ چھوڑنا۔ آپ نے رسالے کی کمان زبیر بن العوامؓ کے اور پیدل غیر زرہ پوش لشکر کی کمان حمزہ بن عبدالمطلبؓ کے سپرد کی۔ قبیلہ اوس کا علم اسید بن حضیرؓ کو اور خزرج کا علم حباب بن منذرؓ کو عطا فرمایا۔ قریش نے کوہ احد کو بائیں پہلو پر رکھ کر کھلے میدان میں صف بندی کی۔ وسط میں ان کی پیدل فوج تھی اور میمنہ و میسرہ پر گھوڑ سوار دستے تھے جن کے افسر خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل تھے۔

مراحل جنگ:

اس جنگ کے چار مراحل نہایت نمایاں تھے۔

پہلا مرحلہ:

جنگ کا آغاز ہوا تو پہلے ابو عامر عبد عمرو بن صیفی اپنے پچاس ساتھیوں کے ساتھ قریش کی جانب سے نکلا۔ اس نے قریش کو یقین دلا رکھا تھا کہ قبیلہ اوس میرا معتقد ہے اور مجھے دیکھتے ہی محمد کو چھوڑ کر میری طرف آ جائے گا۔ اسی خوش فہمی میں اس نے دونوں لشکروں کے بیچ میں آ کر اوس کو مخاطب کیا کہ میں ہوں تمہارا ابو عامر راہب، تم لوگ میرا ساتھ دو۔ انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے لیے اب کوئی خوش آمدید نہیں۔ خدا تمہاری آرزو پوری نہ کرے اے فاسق۔ اوس کا جواب سن کر کہنے لگا، میرے جانے کے بعد میری قوم بگڑ گئی ہے۔

نبی ﷺ نے ایک تلوار لہرائی اور پوچھا کہ اس کا حق کون ادا کرے گا۔ صحابہ نے پوچھا اس کا حق کیا ہے۔ آپ نے فرمایا اس کا حق یہ ہے کہ یہ دشمن کا مقابلہ کرتے کرتے ٹیڑھی ہو جائے۔ بنو ساعدہ کے ابو دجانہ سماک بن خرشہؓ آگے بڑھے اور عرض کی کہ میں اس کا حق ادا کروں گا۔ تلوار حاصل کرنے کے بعد انہوں نے سرخ رومال سر پر باندھا اور میدان جنگ میں بڑے فخر سے گھومنے لگے۔ حضورؐ نے دیکھا تو فرمایا کہ خدا کو یہ چال ناپسند ہے لیکن اس وقت یہ پسندیدہ فعل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد دشمن کو مرعوب کرنا تھا[1]۔

رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ قریش نے اپنا علم کس کے حوالہ کیا ہے۔ بتایا گیا کہ بنو عبدالدار کے طلحہ بن ابی طلحہ کے پاس علم ہے۔ آپ نے فرمایا ہم بھی اپنا علم بنو عبدالدار ہی کے حوالہ کریں گے۔ آپ نے مصعب بن عمیرؓ کو بلا کر علم ان کے حوالہ کیا۔ طلحہ بن ابی طلحہ نے مبارزت کی دعوت دی تو حضرت علیؓ نکلے۔ مقابلہ ہوا تو

حضرت علیؓ نے ایسی ضرب لگائی کہ طلحہ کی کھوپڑی پھٹ گئی۔ طلحہ کے بھائی عثمان نے علم سنبھالا۔ حضرت حمزہؓ نے اس کو بھی واصل جہنم کیا۔ اس کے بعد جنگ شروع ہوگئی۔

مسلمانوں نے شجاعت کے خوب جوہر دکھائے اور دشمن کی ہر پیش قدمی کا نہایت دنداں شکن جواب دیا۔ خدا کی نصرت ان کے ہمرکاب تھی۔ لہٰذا بڑھ چڑھ کر انہوں نے دشمن پر حملے کیے یہاں تک کہ قریش کا کوئی بھی علمبردار ان کے آگے نہ ٹک سکا۔ یکے بعد دیگرے آٹھ علمبردار مارے گئے۔ قرشی خواتین رجز گا گا کر اپنے لوگوں کے حوصلے بڑھاتی اور ان کی غیرت کو بیدار کرتی رہیں لیکن جنگ کی شدت نے ان کو بھی بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ابودجانہؓ جس طرف جاتے دشمن کو گھائل کرتے جاتے۔ حضرت حمزہؓ کی شجاعت بھی دیدنی تھی۔ جس طرف بڑھتے صفیں الٹ کر رکھ دیتے۔ بنوعبدالدار کے ارطاۃ بن عبد شرجیل کے ہاتھ میں قریش کا علم تھا کہ اس کو جالیا اور وہ خون میں تڑپ رہا تھا۔ اس کے بعد ایک شخص سباع بن عبدالعزی کو للکارا اور اس کو قتل کر دیا۔ اس سے فارغ ہوئے تو جبیر بن مطعم کے حبشی غلام وحشی کا پھینکا ہوا چھوٹا نیزا ان کی ناف میں آ لگا۔ انہوں نے جوابی حملہ کرنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور جان جان آفریں کے حوالہ کر دی۔ جبیر کے چچا طعیمہ بن عدی کو جنگ بدر میں حمزہؓ نے قتل کیا تھا۔ اس نے وحشی سے یہ عہد کیا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کر دے گا تو اسے آزاد کر دیا جائے گا۔ وحشی نے یہ کارروائی اسی قول و قرار کے نتیجہ میں کی۔

اہل ایمان بڑے جوش و جذبہ سے لڑے تو قریش نے پسپائی اختیار کی۔ وہ میدان چھوڑ کر بھاگے۔ مسلمانوں نے آگے بڑھ کر مال غنیمت سمیٹنا شروع کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقدام ابھی قبل از وقت تھا اور قریش کی قوت کو پوری طرح کچلے بغیر ہی یہ کارروائی کی گئی تھی حالانکہ ان کا دم خم ابھی باقی تھا۔ پہاڑی پر تعینات تیراندازوں نے جب دیکھا کہ دشمن کے قدم اکھڑ چکے ہیں اور مسلمان اب مال غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے ہیں تو ان کا خیال ہوا کہ لڑائی ختم ہو چکی اور اب وہ نگرانی کے فریضہ سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ ان کے سالار حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے ان کو حکم دیا کہ وہ اپنے مورچے سے نہ ٹلیں لیکن انہوں نے اس حکم کو نا روا سمجھا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اب جنگ ختم ہو چکی ہے۔ قریش میدان چھوڑ گئے ہیں اور مسلمان اس کو جنگ کا خاتمہ قرار دے رہے ہیں۔ لہٰذا ہمارے مورچہ چھوڑنے کا وقت آ چکا ہے۔ عبداللہ بن جبیرؓ کا کہنا یہ تھا کہ میدان جنگ کا نقشہ خواہ کچھ ہو، مسلمان فتح یاب ہوں یا شکست سے دوچار ہو رہے ہوں، ہمیں یہ مورچہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ اکثر تیرانداز ان کے موقف سے متفق نہ ہوئے اور دس بارہ لوگوں کے سوا باقی سب مورچہ چھوڑ کر مال غنیمت سمیٹنے والوں میں شامل ہو گئے۔

دوسرا مرحلہ:

خالد بن ولید قریش کے میمنہ کے انچارج تھے۔ انہوں نے اس نئی صورت حال کو غنیمت جانا اور اپنے دستہ

کو لے کر پہاڑی کا رخ کیا۔ تھوڑے سے تیر اندازوں کو ختم کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ آگے میدان صاف تھا۔ مسلمانوں کی صفیں پہلے ہی تتر بتر ہو چکی تھیں۔ خالد بن ولید نے ان پر پشت سے حملہ کر کے ان کو گھیرے میں لے لیا۔ اس ناگہانی آفت نے اہل ایمان کو ایک بڑی آزمائش سے دوچار کر دیا۔ موقع جنگ سے نکل بھاگنے کی کوشش میں کسی نے پہاڑ کا رخ کیا کسی نے شہر کا۔ بدنظمی میں اپنے پرائے کی تمیز بھی نہ رہی۔ چنانچہ ایک صحابی یمانؓ سامنے آئے تو مسلمان ان پر پل پڑے۔ ان کے بیٹے حذیفہ بن الیمان روکتے رہے کہ یہ میرے والد ہیں لیکن کسی نے ان کی آواز پر کان نہ دھرے اور ان کے والد کو شہید کر دیا۔ ہر مسلمان اپنی اپنی جگہ داد شجاعت دے رہا تھا اور دشمن کا مقابلہ کر رہا تھا لیکن صف بندی ختم ہو جانے کے باعث یہ شجاعت کسی کام نہ آ رہی تھی۔ اس مرحلہ میں رسول اللہؐ کی حفاظت میں اہل ایمان نے غیر معمولی انہماک سے کام لیا۔ انہوں نے حضورؐ کو گھیرے میں لے لیا تا کہ کوئی بدبخت آپ کے اوپر حملہ آور نہ ہونے پائے۔ آنحضرتؐ نے اپنے لشکر کی دوبارہ صف بندی کی کوشش کی اور آوازیں دیں کہ اللہ کے بندو! میری جانب آؤ۔ لیکن کسی کو دائیں بائیں دیکھنے کا ہوش نہ تھا۔ بہت کم تعداد میں مسلمان آنحضرتؐ کے گرد جمع ہوئے اور بڑی شجاعت سے کفار کا مقابلہ کیا۔ قریش نے حضورؐ کے گرد اس حصار کو توڑنے کی بے حد کوشش کی لیکن آپ کے جاں نثار ساتھیوں نے اس کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ایک مرحلہ میں جب ہجوم کا رخ حضورؐ کی طرف ہو گیا اور محافظوں پر دباؤ بڑھ گیا تو حضورؐ نے آواز دی ''کون مجھ پر جان نچھاور کرے گا؟'' زیاد بن سکنؓ انصاری پانچ ساتھی لے کر آپ کے پاس پہنچ گئے اور ان میں سے ہر شخص نے اپنی جان آپ کے اوپر نچھاور کر دی۔ جب آخر میں زیاد بھی گر پڑے اور جان لبوں پر آ گئی تو حضورؐ نے حکم دیا کہ ان کو میرے پاس ڈال دو۔ ابھی ان کے کچھ سانس باقی تھے۔ انہوں نے حضورؐ کے قدموں میں سر رکھ دیا اور اسی حالت میں ان کی روح پرواز کر گئی۔

مصعب بن عمیرؓ آنحضرت ﷺ کے سامنے سپر بن کر کھڑے ہو گئے۔ وہ نہایت بہادری سے لڑتے رہے یہاں تک کہ ابن قمئہ اللیثی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اس پر حضورؐ نے حضرت علیؓ کو بلوایا اور مہاجرین کا علم ان کے حوالہ کیا۔ کفار کی کوشش یہ تھی کہ نبی ﷺ کی ذات کو نقصان پہنچایا جائے۔ ان کی ایک ٹکڑی حملہ آور ہوئی تو عتبہ بن ابی وقاص کے پھینکے ہوئے پتھر سے آپ زخمی ہو گئے۔ آپ کے سامنے کے دانت گر گئے، پیشانی پر زخم آیا اور آپ اپنے پہلو پر گر پڑے۔ حضرت علیؓ نے آپ کا ہاتھ پکڑا، طلحہ بن عبیداللہؓ نے اٹھایا اور مالک بن سنانؓ نے آپ کے چہرہ مبارک سے خون چوس لیا۔ حضورؐ نے بشارت دی کہ جو شخص زمین پر چلتا پھرتا شہید دیکھنا چاہے وہ طلحہ بن عبیداللہؓ کو دیکھ لے۔ نیز جس شخص کے خون میں میرا خون شامل ہو گیا اس کو آگ نہیں چھوئے گی۔ اس موقع پر ابن قمئہ نے نعرہ لگا دیا کہ رسول اللہ کو اس نے قتل کر دیا ہے۔

انہی مراحل جنگ کی طرف قرآن مجید نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰٮكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ. مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ. وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ. اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِىْۤ اُخْرٰٮكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ لِّـكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ. وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ.

(آل عمران ۳:۱۵۲-۱۵۳)

’’اور اللہ نے تو تم سے جو وعدہ کیا وہ سچ کر دکھایا جب کہ تم ان کو اللہ کے حکم سے تہ تیغ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تم خود ڈھیلے پر گئے اور حکم میں تم نے اختلاف کیا اور رسول کی نافرمانی کی جب کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھا دی تھی جس کے تم تمنائی تھے۔ تم میں کچھ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کے۔ پھر خدا نے تمہارا رخ ان سے پھیر دیا تا کہ تمہیں آزمائش میں ڈالے اور اللہ مسلمانوں پر فضل فرمانے والا ہے۔ یاد کرو جب کہ تم منہ اٹھائے بھاگے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور خدا کا رسولؐ تم کو تمہارے پیچھے سے پکار رہا تھا تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا تا کہ تم دل شکستہ نہ ہوا کرو۔ نہ کسی نقصان پر اور نہ کسی مصیبت پر۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے‘۔

مسلمان جس چیز کے تمنائی تھے وہ فتح تھی جو پہلے مرحلہ میں ان کو حاصل ہو گئی۔ غم پر غم سے مراد یہ ہے کہ ان کی فتح پہلے شکست میں بدلی اور اس غم کے اوپر رسول اللہؐ کے شہید ہو جانے کی افواہ نے غم پہنچایا۔ مسلمان انتہائی پریشان کن حالات سے تو دوچار تھے ہی اور دشمن کے گھیرے میں آ جانے کے باعث ان کا بے حد جانی نقصان ہوا، اس کے ساتھ یہ افواہ ان پر مصیبت بن کر نازل ہوئی۔ یہ افواہ نہایت سرعت کے ساتھ مسلمانوں میں پھیلی اور ان کو بالعموم سخت مایوسی سے دوچار کر گئی۔ کئی مسلمان ہتھیار پھینک کر بیٹھ گئے کہ اب لڑنے کا کیا فائدہ؟ بعضوں نے ابوسفیان سے جان کی امان پانے کی تجویز پر غور کرنا شروع کر دیا۔ بعضوں نے اپنے قبیلوں کی طرف لوٹ جانے میں دانش مندی دیکھی۔ لیکن ایک گروہ وہ بھی تھا جس کے اندر دشمن کو زیر کرنے کا جذبہ دوچند ہو گیا۔ انہوں نے عزم کیا کہ ہم اسی حق کے لیے اپنی جان لڑا دیں گے جس حق پر نبی ﷺ نے اپنی جان قربان کر دی۔ انس بن نضرؓ ایک ایسے ہی صحابی تھے جو مسلمانوں کی ایک جمعیت کو غیرت دلا کر واپس لے آئے۔ اور خود اس قدر بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے کہ ان کے جسم پر اسی کے قریب زخم تھے اور چہرہ پہچاننا ممکن نہ تھا۔ ان کی بہن نے انگلی کے کسی نشان سے ان کو پہچانا۔ بالآخر یہی گروہ تھا جس کی حوصلہ مندی نے میدان جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔

تیسرا مرحلہ:

نبی ﷺ کے گرد جان نثاروں نے اپنے جسموں سے ڈھال کا کام لیا۔ روایات کے مطابق ایک انصاری کعب بن مالکؓ نے سب سے پہلے حضورؐ کو جنگی لباس میں پہچانا اور مسلمانوں کو آوازیں دے دے کر مطلع کیا کہ آنحضرتؐ زندہ اور محفوظ ہیں، لہٰذا وہ حضورؐ کے گرد جمع ہو جائیں۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ ابوطلحہ انصاریؓ نے آ کر اس قدر تیر برسائے کہ دو یا تین کمانیں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ گئیں۔ انہوں نے اپنی ڈھال سے حضورؐ کو ڈھانپ لیا تا کہ تیر اس پر برسیں۔ ابودجانہ نے اپنے جسم سے ڈھال کا کام لیا۔ وہ اپنی پیٹھ پر تیر کھاتے رہے۔ سعد بن ابی وقاصؓ آئے تو حضورؐ نے اپنا ترکش ان کے حوالہ کر دیا اور فرمایا تم پر میرے ماں باپ قربان، تیر چلاتے جاؤ۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی ٹانگ میں زخم آئے اور وہ عمر بھر کے لیے لنگڑے ہو گئے۔ ان کارروائیوں کے نتیجہ میں مسلمانوں کی نفری پھر سے بڑھ گئی اور حضورؐ کے زندہ موجود ہونے سے جذبے پھر سے جاگے اور قریش کا دباؤ کم ہونے لگا۔ آنحضرتؐ نے تیر اندازی کرواتے ہوئے پہاڑ کی جانب ہٹنا شروع کیا یہاں تک کہ آپ کوہ احد کے دامن میں جا پہنچے۔ وہاں آپؐ نے مسلمانوں کو از سر نو منظم کیا اور پہاڑ کی ڈھلوان پر مورچہ لگایا۔ خود حضورؐ چونکہ زخمی تھے آپ کو احد کے اندر کچھ بلندی پر واقع ایک کھوہ میں پہنچایا گیا۔ وہاں آپ کے زخم دھوئے گئے۔ آپ کے چہرہ مبارک میں مغفر (خود) کی کڑیاں چبھ گئی تھیں۔ ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے ان کو دانتوں سے نکالا تو ان کے دو دانت نکل گئے۔

قریش نے پہاڑ کے اوپر چڑھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار مسلمانوں کی سنگ باری کے باعث اس میں ناکام ہوئے۔ بلندی پر ہونے کے باعث مسلمانوں کو ایک گونہ برتری حاصل ہو گئی تھی اور قریش کے گھوڑ سوار دستے بھی وہاں بیکار ہو چکے تھے۔ اس صورت حال میں قریش نے خود ہی تھک ہار کر مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوشش ترک کر دی۔

اس موقع پر دونوں لشکروں کی جانب سے نعرہ بازی ہوئی جس کا تذکرہ تاریخوں میں ہوا ہے۔ ابوسفیان نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر پوچھا، کیا تم لوگوں میں ابن ابی کبشہ (حضرت محمد ﷺ) ہیں؟ اس سوال پر حضورؐ نے ہدایت فرمائی کہ لوگ خاموش رہیں۔ پھر ابوسفیان نے پوچھا، تم لوگوں میں ابن ابی قحافہ (حضرت ابوبکر صدیقؓ) ہیں؟ کیا تم میں ابن الخطاب (حضرت عمرؓ) ہیں؟ جب اس کو کوئی جواب نہیں ملا تو بولا، معلوم ہوتا ہے سب مر گئے۔ اس پر حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا۔ انہوں نے کہا اے اللہ کے دشمن، تو جھوٹ بول رہا ہے۔ اللہ نے تجھے غمگین کرنے کا سامان باقی رکھا ہے۔ اس کے بعد ابوسفیان نے نعرہ لگایا اُعلُ ھبل (ہبل کی جے) آنحضرت ﷺ کے حکم سے حضرت عمرؓ نے نعرہ لگایا۔ اللّٰہ اعلیٰ و اجلّ (اللہ سب سے اونچا اور بلند مرتبہ ہے) ابوسفیان نے پھر ایک دیوی کے نام کا نعرہ لگایا۔ لنا عُزّٰی ولا عُزّٰی لکم (ہمارے پاس عزیٰ دیوی ہے جو تمہارے پاس نہیں) حضرت

عمرؓ نے جواب دیا **الله مولانا و لا مولیٰ لکم** (اللہ ہمارا حامی ہے اور تمہارا حامی کوئی نہیں) اس پر ابوسفیان نے کہا، آج بدر کے انتقام کا دن تھا۔ فتح باری باری سے آتی ہے۔ آج ہم برابر ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا، برابر نہیں ہوئے۔ ہمارے شہداء جنت میں گئے اور تمہارے مقتولین جہنم میں۔ اس کے بعد ابوسفیان نے حضرت عمرؓ کو اپنے قریب بلایا۔ جب وہ گئے تو کہا، میں خدا کی قسم دے کر تم سے پوچھتا ہوں کہ ہم نے محمدؐ کو قتل کر دیا نا؟ انہوں نے جواب دیا خدا کی قسم تم ایسا نہیں کر سکے۔ وہ اس وقت بھی موجود اور تمہاری گفتگو سن رہے ہیں۔ اس پر ابوسفیان نے کہا، عمر! میں تمہیں ابن قمیہ سے زیادہ سچا اور زیادہ قابل اعتماد سمجھتا ہوں۔ (ابن قمیہ نے، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، افواہ پھیلائی تھی کہ رسول اللہ کو قتل کر دیا گیا ہے)۔ اچھا تو اگلے سال انہی دنوں میں پھر بدر میں دو دو ہاتھ ہوں گے۔ ہاں تم اپنے مقتولوں میں بعض لاشوں کا مثلہ دیکھو گے۔ معلوم رہے کہ میں نے اس کا نہ حکم دیا نہ اس سے روکا، میں نہ اس سے راضی تھا نہ اس پر ناراض ہوا۔ ابوسفیان نے یہ کہا اور اپنی فوج کو مکہ واپسی کا حکم دے دیا۔

جب احد میں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا تو کچھ غیر معمولی واقعات پیش آئے جن کا تذکرہ مفید ہوگا:

۱۔ قریش کے سردار ابی بن خلف جمحی نے میدان بدر میں رسول اللہؐ سے کہا تھا کہ میں آپ کو قتل کروں گا اور اس مقصد کے لیے ایک گھوڑا خاص طور پر پال رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا 'نہیں، بلکہ میں تمہیں قتل کروں گا'۔ احد کے دن وہ اسی گھوڑے کو دوڑاتا ہوا حضورؐ کے پاس آ پہنچا۔ مسلمانوں نے اسے روکنا چاہا تو آپ نے فرمایا 'اس کو آنے دو'۔ قریب پہنچا تو رسول اللہؐ نے اس کو نیزا مارا۔ وہ زخمی ہو کر پلٹ گیا۔ اپنے لوگوں میں پہنچ کر اس نے زخم دکھایا۔ وہ سخت تکلیف میں تھا۔ لوگوں نے تسلی دی کہ زخم معمولی ہے اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ چیختا رہا کہ محمد نے مجھے قتل کر دیا۔ اسی زخم سے وہ مرا۔[2]

۲۔ بنو ثعلبہ کے ایک یہودی عالم مخیریق نے یہودیوں سے کہا کہ محمد کے ساتھ ہمارا معاہدہ ہے اور ان کی نصرت ہم پر فرض ہے۔ چلو ہم بھی حق ادا کرنے کے لیے احد چلیں۔ یہود کہنے لگے آج تو سبت کا دن ہے ہم کسی کارروائی میں حصہ نہیں لے سکتے۔ مخیریق نے کہا، سبت کچھ نہیں، وہ اس کام میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ یہ کہا اور سامان جنگ لے کر احد پہنچا اور لڑتا ہوا مارا گیا۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ وہ یہود کا بہترین آدمی تھا۔

۳۔ ایک شخص قزمان بڑی بہادری سے لڑا اور بعض کفار کو اس نے قتل کیا۔ حضورؐ سے اس کا تذکرہ کیا گیا تو فرمایا 'وہ اہل دوزخ میں سے ہے'۔ قزمان زخمی ہوا تو اٹھا کر اس کو ایک بستی میں پہنچایا گیا۔ لوگوں نے تعریف کی کہ آج تم نے بڑے جوہر دکھائے، جنت کی بشارت پاؤ۔ وہ کہنے لگا، بشارت کیسی؟ اللہ کی قسم، میں تو اپنی قوم کے وقار کے لیے لڑا ہوں۔ اگر وہ یہاں نہ آتی تو میں بھی نہ آتا۔ بعد میں زخموں کی تکلیف کا احساس جب زیادہ ہونے لگا تو

اس نے اپنے تیر سے خودکشی کر لی۔

۴۔ جنگ کے بعد بنو عبدالاشہل اپنے مقتولین کو تلاش کر رہے تھے تو انہیں عمرو بن ثابت اصیرم مقتولین میں پڑا ہوا نظر آیا۔ وہ حیران ہوئے کہ یہ شخص کیسے یہاں پہنچا۔ یہ تو اسلام کا دشمن تھا۔ وہ شدید زخمی تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ قوم کا ساتھ دینے آئے تھے یا اسلام کی رغبت کھینچ لائی۔ کہنے لگا میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا، اسلام قبول کیا اور پھر اسلام کے دفاع میں تلوار اٹھالی یہاں تک کہ مجروح ہو کر گر پڑا۔ یہی بیان دیتے دیتے اس نے لوگوں کے ہاتھوں میں جان دے دی۔ حضورؐ کے پاس اس کا ذکر کیا گیا تو فرمایا کہ وہ جنت میں جائے گا۔ لوگ کہا کرتے کہ اصیرم وہ شخص ہے جس نے ایک نماز بھی نہیں پڑھی لیکن جنت میں پہنچ گیا۔

۵۔ عمرو بن الجموعؓ بوڑھے اور لنگڑے تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے جو حضورؐ کے ساتھ جنگی مہموں میں حاضر ہوا کرتے۔ احد میں بیٹوں نے باپ کو گھر میں پابند کرنا چاہا۔ انہوں نے آ کر حضورؐ سے شکوہ کیا اور اپنی یہ آرزو بیان کی کہ میں لنگڑا پن کے ساتھ جنت میں جانا چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم معذور ہو، قتال تم پر فرض نہیں۔ ادھر بیٹوں سے فرمایا کہ تم اس کو روکو نہیں۔ شاید اللہ نے اس کے لیے شہادت مقدر کی ہو۔ چنانچہ عمرو بن الجموعؓ احد کے لیے نکلے اور جنگ میں شہید ہو گئے۔

چوتھا مرحلہ:

کفار جب میدان چھوڑ چکے تو نبی ﷺ پہاڑ سے اترے۔ میدان جنگ میں مقتولین کی پہچان کروائی اور ان کی تدفین کا بندوبست کیا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ لاشوں کو شہر نہ لے جایا جائے بلکہ ان کو میدان جنگ ہی میں دفن کیا جائے۔ روایات میں مسلمانوں کے شہداء کی کم سے کم تعداد چالیس اور زیادہ سے زیادہ ستر بیان ہوئی ہے۔ قریش کے مقتولین کی تعداد کم سے کم چودہ اور زیادہ سے زیادہ بائیس بتائی گئی ہے۔

اس موقع پر رسول اللہؐ نے اہل ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا 'مشرکین آج کی طرح کی کامیابیاں ہم پر آئندہ حاصل نہیں کر سکیں گے، یہاں تک کہ ہم رکن (حجر اسود) کو بوسہ دیں[۳]۔ حضورؐ کے اس تبصرہ میں اس بات کی پیشینگوئی تھی کہ اب ہمارے مکہ میں فتحیاب ہو کر داخل ہونے تک قریش ہمیں ایسی صورت حال سے دوچار نہیں کرنے پائیں گے جس کا سامنا جنگ احد میں کرنا پڑا تھا۔

رات آپؐ نے کوہ احد کے دامن ہی میں گزاری۔ دن بھر کے تھکے ہوئے مسلمان بڑے اطمینان کی نیند سوئے جبکہ ایک گروہ پر دشمن کا خوف اس قدر مسلط ہو چکا تھا کہ وہ رات بھر ہر آہٹ سے پریشان ہو ہو جاتے رہے کہ کہیں دشمن پھر سے حملہ آور نہ ہو رہا ہو۔ علی الصبح یہ افواہ پھیل گئی کہ قریش کو یہ احساس ہوا ہے کہ انہوں نے مکہ کو واپس

روانہ ہو کر دانشمندی نہیں کی اور لڑائی کا نتیجہ مبہم رہا ہے۔ لہٰذا وہ دوبارہ مدینہ پر حملہ آور ہونے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اس افواہ کو پھیلانے میں منافقین نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس خبر سے مسلمان بددل اور پست ہمت ہو جائیں گے لیکن ہوا یہ کہ جاں نثاروں نے یہ خبر سن کر حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل (اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے) کا نعرہ لگایا اور پہلے سے زیادہ جرأت کے ساتھ کفار کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ نبی ﷺ نے حکم دیا کہ کل جو لوگ ثابت قدم رہے تھے وہ آج دشمن کا تعاقب کریں۔ چنانچہ مسلمان پورے جوش و جذبہ کے ساتھ اس نئی مہم پر روانہ ہو گئے۔ آپؐ نے مدینہ سے آٹھ میل دور حمراء الاسد کے مقام پر پڑاؤ کیا اور قریش کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ مکہ کو روانہ ہو گئے ہیں تو آپ نے لشکر کو واپسی کا حکم دیا۔

اسی مرحلہ کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوا ہے:

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ". اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ڰ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ. فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ" وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ. (آل عمران ۳:۱۷۲-۱۷۴)

(ان اہل ایمان کے اجر کو اللہ ضائع نہیں کرے گا) جنہوں نے چوٹ کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسولؐ کی پکار پر لبیک کہی۔ ان میں سے جنہوں نے بھی خوبی کے ساتھ کام کیے اور جو تقویٰ کی راہ چلے ہیں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ یہ وہ ہیں کہ جن کو لوگوں نے سنایا کہ دشمن نے تمہارے لیے بڑی طاقت اکٹھی کی ہے تو اس سے ڈرو تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بولے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ سو یہ لوگ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کے ساتھ واپس آئے۔ ان کو ذرا گزند نہ پہنچا۔ اور یہ اللہ کی خوشنودی کے طالب ہوئے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

ابن اسحاق کے مطابق احد کی جنگ ۱۵ شوال کو ہوئی، یہ اتوار کا دن تھا۔

غزوہ بدر ایک فیصلہ کن جنگ تھی جس نے حق اور باطل میں امتیاز کر دیا اور مسلمانوں کو کافروں پر ایسا غلبہ دیا جو ہر کسی کو نظر آنے والا تھا۔ اس کے برعکس غزوہ احد کی حیثیت آیات متشابہات کی سی تھی۔ آیات متشابہات میں جو حقیقت بیان ہوتی ہے وہ مخفی ہوتی ہے۔ اہل نظر تو اس کو دیکھ رہے ہوتے ہیں لیکن دوسرے لوگوں پر وہ ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لیے اس میں قیاس آرائیوں کو راہ مل جاتی ہے اور یہ چیز فتنہ کا سامان پیدا کر دیتی ہے۔ جب کوئی واقعہ متشابہ نوعیت کا ہو تو اس کی حکمتوں پر بھی کچھ ایسی دبیز تہیں چڑھ جاتی ہیں کہ ہر شخص کی نگاہ ان تک نہیں پہنچتی، لہٰذا لوگ اس کے معاملہ میں فتنہ میں پڑ جاتے ہیں۔ جنگ احد مسلمانوں کے لیے ایک بڑی آزمائش تھی۔ اس کے نقصانات

اتنے ہوش ربا تھے کہ ہر شخص کو بغیر توجہ دلائے بھی نظر آتے تھے۔مدینہ کا کم وبیش ہر خاندان ان سے متاثر ہوا تھا۔اس جنگ کے بارے میں یہی فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ مسلمانوں کی فتح تھی یا شکست۔اس سے حاصل ہونے والے فوائد اور اس کی حکمتوں کی طرف نگاہ نہ جاتی تھی۔اس صورت حال میں جہاں بعض پختہ فکر اور پختہ ایمان رکھنے والے مسلمانوں نے صحیح سبق حاصل کیے، وہیں ایک بڑے طبقہ نے، جن کے دلوں میں کجی اور دماغوں میں فتنہ جوئی کی خواہش تھی، اس کو پروپیگنڈا کے لیے نہایت موزوں پایا۔حکمت الٰہی کا تقاضا ہوا کہ اس جنگ کے احوال کو اہل ایمان کی تعلیم وتذکیر کا ذریعہ بنایا جائے۔چنانچہ سورہ آل عمران میں اس پر نہایت مفصل اور بے لاگ تبصرہ کیا گیا۔

معاندین کا پروپیگنڈا:

فتنہ پردازوں نے خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کی ذات کو نشانہ بنایا۔نیز انہوں نے اہل ایمان کے لیے خدا کی نصرت کے اس وعدہ کا مذاق اڑایا جس کا حوالہ قرآن نے جنگ بدر کے بعد سورہ انفال میں دیا تھا۔انہوں نے اسلام کے مستقبل کو اس قدر غیر یقینی بنا کر پیش کیا کہ بہت سے لوگ فی الواقع شبہات میں پڑ گئے۔ان کی کوشش ایک ایسی فضا پیدا کرنا تھا جس میں مسلمانوں کو اعتماد سے محروم کیا جا سکے۔

معترضین نے نبی اکرم ﷺ کو یہ الزام دیا کہ وہ من مانی کرنے والے آدمی ہیں۔کسی کے مشورہ کو خاطر میں نہیں لاتے۔وہ اپنی ذاتی امنگیں رکھتے ہیں جن کی خاطر وہ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے جان و مال کو تباہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔اگر وہ مسلمانوں کے خیر خواہ ہوتے تو کفار کا مقابلہ مدینہ کے اندر رہ کر کرنے کا مشورہ مان لیتے اور یوں مسلمانوں کا خون رائیگاں نہ جاتا۔

معترضین نے اس تصور پر پھبتیاں کسیں کہ اللہ اہل ایمان کے ساتھ ہے اور ان کی نصرت فرماتا ہے۔انہوں نے کہا کہ احد میں نصرت کی وہ شانیں کیوں نظر نہ آئیں جو بدر میں نظر آئی تھیں۔یہ کیسی نصرت ہے جو کبھی جلوہ دکھاتی ہے اور کبھی غائب ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ لڑنا تدابیر اور وسائل کا ایک کھیل ہے۔جب وسائل فراہم ہو جائیں اور معقول تدابیر اختیار کر لی جائیں تو فتح حاصل ہو جاتی ہے اور اگر ان کے بارے میں کچھ کوتاہی ہو جائے تو شکست مقدر بن جاتی ہے۔اہل ایمان بھی اسی کلیہ کے تحت آتے ہیں۔ان کے ساتھ خدا کا کوئی خاص معاملہ نہیں ہے۔قرآن میں نصرت کا وعدہ محض مسلمانوں کا دل رکھنے کے لیے ہے۔

یہی لے جب زیادہ بڑھی تو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسلام کا مستقبل بے حد مخدوش ہے۔یہ دعویٰ کہ غلبہ اسلام کے لیے مقدر ہے محض ایک ڈھونس ہے۔قریش نے ذرا سی منظم جدوجہد کی تو مسلمانوں کو اپنی پڑ گئی۔

لہٰذا اگر وہ مزید کوشش کر کے وسائل جنگ زیادہ فراہم کر لیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کی بیخ کنی میں کامیاب نہ ہوں۔ اسلام اگر سچا دین تھا تو اس کو ایسی افتاد ہی کیوں پیش آئی جس نے مسلمانوں کے ہر گھر میں صف ماتم بچھا دی۔

یہ تھے معترضین کے پروپیگنڈے کے بنیادی نکات جن کا قرآن نے مفصل جواب دیا۔ اس نے بتایا کہ رسول ﷺ کا مزاج ہرگز آمرانہ نہیں۔ ان کی تو خوبی ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ نہایت نرمی کا معاملہ کرنے والے، ان کی عزت افزائی کرنے والے، اور ان کی خیرخواہی چاہنے والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چاروں جانب سے لوگ اس شمع کے دیوانے بن کر جمع ہو رہے ہیں۔ اگر ان کے اندر بدخوئی اور درشتی و سخت گیری کی صفات ہوتیں تو کوئی شخص ان کے قریب ہونا گوارا نہ کرتا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے بدخواہ کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ وہ خدا سے بے حد ڈرنے والے ہیں۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اگر وہ اپنی امت کے ساتھ بدخواہی کا کوئی معاملہ کریں گے تو قیامت کے روز اس کی جواب دہی کرنا ہو گی۔ ان کا تو ہر قدم اللہ کی رضا کی طلب میں اٹھتا ہے۔ وہ براہ راست خدا کی رہنمائی میں کام کرتے ہیں اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ان کی کوئی تدبیر غلط ہو جائے۔ البتہ دوسرے تمام انسانوں کی طرح وہ بھی خدا کی تقدیر کے تحت ہیں۔ اگر تقدیر میں کوئی بات لکھی ہو تو اس سے پہلو بچا کر نکل جانا ان کے بس میں نہیں۔

جہاں تک خدا کی نصرت کا تعلق ہے قرآن نے آگاہ کیا کہ نصرت کا تصور یہ نہیں کہ جہاں جس میدان میں کچھ کلمہ گو کود جائیں تو لازم ہو جائے کہ فرشتوں کی ایک فوج بھی ان کے ہمراہ وہاں اتار دی جائے۔ نصرت خداوندی بعض شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ مثلاً یہ کہ مسلمان پورے خلوص اور بے لوثی کے ساتھ دین کی سربلندی کے لیے میدان میں نکلے ہوں۔ انہوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہو، وہ ادائے فرض میں ڈھیلے نہ پڑیں، اللہ اور اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کریں، ان کو جو حکم دیا جائے اس میں اختلاف رائے پیدا نہ کریں، میدان جنگ میں دنیا طلبی ان پر مسلط نہ ہو بلکہ ہر کام آخرت کو مدنظر رکھ کر کریں۔ جب وہ ان شرائط کو پورا کریں گے تو ان کی مہم میں اللہ کی نصرت ان کے ہم رکاب ہو گی۔ جنگ احد کے پہلے مرحلہ میں انہوں نے شرائط کو ملحوظ رکھا تو نصرت ان کو حاصل رہی اور اسی کے باعث انہوں نے کفار کو تہ تیغ کیا۔ اس کے بعد دنیا طلبی ان پر حاوی ہو گئی۔ اس کے تحت انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور ان کے مقرر کیے ہوئے امیر کے احکام کی خلاف ورزی کی تو نصرت ان سے روک لی گئی اور ان کو پے در پے غموں کے حوالہ کر دیا گیا۔ لہٰذا جو کچھ ہوا اس میں مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کو دخل تھا۔ آئندہ کی مہمات میں اگر وہ کمزوریوں پر قابو پا لیں گے تو اللہ کی نصرت کو شامل حال پائیں گے۔

غلبہ اسلام کے وعدہ کو پھر سے موثق کیا گیا۔ بتایا گیا کہ اس وعدہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ اللہ تعالیٰ کو

کفر کے ساتھ کوئی ہمدردی ہو گئی ہے کہ وہ کفار کو مسلمانوں پر ترجیح دینے لگے۔ اہل ایمان کو چاہیے کہ اپنی اصلاح کریں اور اپنی ان خامیوں سے نجات حاصل کریں جن کے باعث انہوں نے زک اٹھائی۔ اگر وہ اپنا رویہ درست کر لیں گے تو غلبہ انہی کو حاصل ہوگا۔ جنگ احد میں جو کچھ ہوا اس میں بھی کفر کے نیست و نابود ہونے کا پیغام چھپا ہوا ہے بشرطیکہ لوگ معاملہ کو صرف ظاہری طور پر ہی نہ دیکھیں بلکہ سطح کے نیچے چھپے ہوئے حقائق کا ادراک بھی کریں۔

بعض فتنہ پردازوں نے جنگ کے مسلمان مقتولین کی بڑی تعداد کو موضوع بحث بنایا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ کھلے میدان میں مقابلہ کا نتیجہ تھا۔ جانوں کے اس ضیاع سے بچا جا سکتا تھا بشرطیکہ ہماری احتیاطی تدابیر کو نظرانداز نہ کیا جاتا۔ جن لوگوں نے جنگ سے قبل اپنے آپ کو لشکر سے علیحدہ کر لیا تھا انہی کا طرز عمل درست تھا۔ فروگزاشت نبی علیہ السلام سے ہوئی۔ قرآن نے اس کا یہ جواب دیا کہ معترضین اس حقیقت کو نہیں سمجھے کہ زندگی اور موت دونوں اللہ کے اختیار میں ہیں اور بہتر سے بہتر تدبیروں سے موت کو نہیں ٹالا جا سکتا۔ مسلمان اگر قلعہ بند ہو کر بھی لڑتے تو جن لوگوں کا مرنا مقدر تھا وہ ضرور مرتے اور قلعہ بندی ان کے کسی کام نہ آ سکتی۔ معترضین یہ نہیں سوچتے کہ زندگی کی وہ مہلت کس کام کی جو فرائض کی ادائیگی سے فرار اختیار کر کے حاصل کی جائے۔ بزدلی کے ساتھ زندہ رہنا مردوں کا شیوہ نہیں جبکہ فرض ادا کرتے ہوئے جان کا نذرانہ پیش کر دینا وفاداری کا سب سے اونچا مقام ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں جان دی ان پر ترس کھانے کی ضرورت ہے اور نہ ان کی موت پر غم کے اظہار کی۔ انہوں نے تو وہ سرفرازی حاصل کر لی جو تمام دنیاوی ذخیروں سے بہتر ہے۔ ان شہید ہونے والوں کا حال تو یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے جوار رحمت میں اس کی نعمتوں سے محظوظ ہو رہے ہیں اور اپنے اخلاف کے بارے میں بھی آرزومند ہیں کہ وہ بھی ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان سے آ ملیں۔ معترضین یونہی ان کے غم میں دبلے ہوئے جا رہے ہیں۔

اہل ایمان کی کوتاہیوں پر تبصرہ:

جنگ احد میں سچے اہل ایمان سے جو کوتاہیاں ہوئیں قرآن نے ان کو بھی بے نقاب کیا تاکہ لوگ اپنی اصلاح کر سکیں اور آئندہ کے مراحل میں کسی ایسی تکلیف دہ صورت حال سے دوبارہ دوچار نہ ہو جائیں۔

قرآن مجید نے بتایا کہ جنگ کے پہلے مرحلہ میں فتح کے بعد جس چیز نے شکست کے آثار پیدا کر دیئے وہ بعض لوگوں میں نظم و ضبط کا فقدان اور دنیاوی مفادات کا غلبہ تھا۔ چنانچہ ہدایت دی گئی کہ مسلمان جب بھی جنگ کے لیے نکلیں اللہ کے رسولؐ اور اپنے امیر کے احکام کو بطور خاص نگاہ میں رکھیں اور ان کی بجا آوری میں ہرگز کوتاہی نہ کریں۔ مال غنیمت کو سمیٹنے کے لیے اہم مورچوں کو چھوڑ دینا بالکل ناروا حرکت تھی۔ دنیاوی مفادات کا حصول کسی

شخص کی سعی وتدبیر پر منحصر نہیں بلکہ یہ اللہ کا فضل ہوتا ہے۔ وہ جس کو جتنا کچھ دینا چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ آخرت ہی کو اپنا ہدف قرار دیں۔ اللہ تعالیٰ آخرت کے طلب گاروں کو دنیا کے فضل سے محروم نہیں کیا کرتا۔ ایسے لوگ دنیا کی عزت بھی پاتے ہیں اور آخرت میں بھی سرخرو ہوتے ہیں۔

جن مسلمانوں نے شکست کے آثار دیکھ کر ناگفتنی خدشات کا اظہار کیا اور اپنی جان کی امان پانے کی تدبیریں سوچنے لگے تھے ان کو بتایا گیا کہ کردار کی یہ خامی کسی صاحب ایمان کو زیب نہیں دیتی۔ ذراسی آزمائش سے ہمت ہار بیٹھنا، تھڑدلا پن دکھانا اور دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک دینا اللہ والوں کا کام نہیں ہوتا۔ انبیاء کے ساتھیوں کی تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ اول تو انہوں نے کبھی یہ کمزوری نہیں دکھائی اور اگر کبھی انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا تو انہوں نے اس حادثہ کو اپنے تجاوز پر محمول کیا اور خدا سے اپنے قصوروں کی معافی مانگی۔ دگرگوں حالات میں اہل ایمان پر اس درجہ کی مایوسی طاری نہیں ہونی چاہیے کہ ان کا عزم وحوصلہ ہی جواب دے دے اور وہ باطل کے آگے جھک جانے کا خیال دل میں لائیں۔

رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ نے بہت سے لوگوں کو اس قدر ملول کر دیا تھا کہ وہ اپنی زندگی ہی سے بیزار ہو کر بیٹھ رہے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ غلط فہمی تمہیں کیسے لاحق ہوگئی کہ وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ان کو ایک دن اللہ کے پاس جانا ہے۔ تو کیا اسلام کے ساتھ تمہاری وفاداری بس ان کی زندگی تک ہی رہے گی۔ تم خدا پر ایمان لائے ہو۔ اس کے دین کے حامل ہو۔ اپنی اس حیثیت کو پہچانو۔ اگر تم حادثات سے دلبرداشتہ ہو کر دین سے منہ موڑ گئے تو اس سے خدا کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن تم اپنا بہت بڑا نقصان کرلو گے۔

جنگ احد کی اہمیت:

جنگ احد پر قرآن مجید کے طویل تبصرہ کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں یہ جنگ بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس کو اہل ایمان کی صلاحیتوں کو صیقل کرنے اور بعض مخلصین کی قدر افزائی کرتے ہوئے ان کو بلند درجات سے نوازنے کا ذریعہ بنایا گیا۔

دیکھا گیا ہے کہ کوئی قوم جب تک کسی ارتعاش سے دوچار نہیں ہوتی اس کی صلاحیتیں خوابیدہ رہتی ہیں۔ حالات کی یک رنگی اس میں بعض اجتماعی کمزوریاں پیدا کر دیتی ہے۔ ان کمزوریوں سے نجات پانے کا موقع وہ ہوتا ہے جب خدا اس قوم کو کسی طوفان سے آشنا کر دیتا ہے۔ اس میں اس کی صلاحیتیں بروئے کار آتی اور اس کی قوت میں اضافہ کرتی ہیں۔ جنگ احد میں اہل ایمان کا امتحان ہوگیا جس سے ان کی فکری وعملی کمزوریاں سامنے آگئیں

اور یہ ممکن ہوگیا کہ وہ ان پر مطلع ہو کر قابو پالیں اور آئندہ کے کٹھن مراحل میں زیادہ مضبوطی سے جدوجہد کر سکیں۔

اس جنگ نے مسلمانوں کی صفوں کی تطہیر بھی کر دی۔ جنگ بدر کی کامیابی کے بعد جو شرارتی عناصر ان کی صفوں میں گھس آئے تھے اس جنگ نے ان کو بے نقاب کر دیا۔ اس کے بعد اہل ایمان متنبہ ہو گئے کہ اگلے مراحل میں جہاں انہوں نے بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرنا ہے وہیں گھر کے بھیدی ان اندرونی بدخواہوں کی حرکتوں پر بھی نگاہ رکھنی ہے۔ اس مرحلہ پر اگران کو بے نقاب نہ کیا جاتا تو آئندہ زیادہ مشکل مقابلوں میں یہ عناصر بہت بڑا خطرہ پیدا کر سکتے تھے۔

اس جنگ نے ایمان کے ہر دعویدار کے دعویٰ کو جانچنے کے لیے ایک کسوٹی فراہم کر دی۔ وہ لوگ بھی متعین ہو گئے جو مشکل مراحل میں اپنا حوصلہ برقرار نہ رکھ سکے تھے اور وہ لوگ بھی ممیز ہو گئے جنہوں نے سرفروشی کے جوہر دکھائے اور دین کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ وہ اپنے بعض مخلص بندوں کی قدر افزائی کرے اور ان کی بلندی درجات کے لیے ان کو خلعت شہادت سے نوازے۔ معلوم نہیں کتنے مسلمان اس قدر افزائی کے دل سے متمنی تھے اور دعائیں کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو شہادت کا شرف نصیب فرمائے۔ ان کے حسن انجام کو دیکھ کر مزید کتنے مسلمانوں کے شوق شہادت کو جلا ملی ہوگی۔ آج اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

کچھ کمزور مسلمانوں کے اندر اگر یہ تاثر ابھرا کہ آئندہ کے مراحل میں بہتر منصوبہ بندی کر کے قریش مسلمانوں کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو قرآن مجید نے اس امکان کو قطعاً مسترد کر دیا اور مسلمانوں کو تسلی دی کہ کفار اس جنگ سے پیدا ہونے والی صورت حالات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ ان کا فتح کا نشہ وقتی اور عارضی ہے۔ ان کے حوصلے بہت جلد پست ہو جائیں گے اور بالآخر کامیابی مسلمانوں کو حاصل ہونے والی ہے۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ معاملات نے آگے چل کر وہی رخ اختیار کیا جس کی پیشینگوئی قرآن مجید نے کر دی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ سیرۃ النبیؐ۔ ابن کثیر۔ ج ۲، ص ۳۲

۲۔ السیرۃ النبویہ۔ ابن سعد۔ ج ا، ص ۳۷۸

۳۔ ایضاً، ج ا، ص ۳۷۶

باب 33

یہود بنی نضیر کی سرکوبی

جنگ احد کے بعد قریش اور یہود متحرک ہو گئے کہ وہ مزید قبائل کو ساتھ ملائیں اور آئندہ جنگ میں احد کی نسبت سے زیادہ نفری میدان میں لے آئیں۔ اگر نبی ﷺ کو اس طرح کی کوئی اطلاع ملتی تو آپ صحابہ کی جماعت کو ضروری کارروائی کے لیے بھیج دیتے تاکہ قریش جان لیں کہ مسلمان غافل نہیں ہیں، نیز ان کے میزبان قبائل کو بھی اندازہ ہو جائے کہ ہمارے کسی جنگی منصوبہ میں شامل ہونے کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔

ابو سلمہ بن عبد الاسد مخزومیؓ کو ڈیڑھ سو صحابہ کی نفری دے کر قطن کے علاقہ میں بھیجا گیا جہاں خویلد کے بیٹے طلیحہ اور سلمہ بنو اسد کو قریش کا ساتھ دینے کی دعوت لے کر آئے تھے۔ جونہی اس قبیلہ کو حملہ کی اطلاع ملی وہ پہاڑوں میں منتشر ہو گئے اور مزاحمت نہیں کی۔

عرنہ کے علاقہ میں سفیان بن خالد الہذلی کی آمد اور مسلمانوں کے خلاف جمعیت فراہم کرنے کی خبر سن کر حضورؐ نے عبداللہ بن انیسؓ کو بھیجا۔ انہوں نے سفیان کو قتل کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ انہی دنوں میں یہ سازش بھی تیار کی گئی کہ بعض قبائل مسلمانوں کو دین سیکھنے کے لیے اپنے ہاں بلائیں اور جب وہ آ جائیں تو ان کو مکر و فریب سے قتل کر دیا جائے۔ یہ انداز خالص یہودی ذہنیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہود مصلحین کو ماضی میں بھی قتل کرتے رہے اور آج بھی اپنے مخالفین کو رستے سے ہٹانے کے لیے ان کو حیلے بہانے سے قتل کروانا ان کے معروف طریق کار میں شامل ہے۔ غزوہ احد کے بعد مسلمان مبلغین کے قتل کے جو واقعات پیش آئے ان میں اس بات کا امکان ہے کہ یہ یہود ہی کے زرخیز ذہن کی پیداوار ہوں۔ اس سلسلہ کی سب سے نمایاں مثال بئر معونہ کا حادثہ ہے۔

حادثہ بئر معونہ والرجیع:

ماہ صفر ۴ھ میں یہودی قبیلہ بنونضیر کے حلیف قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ کے ایک سردار ابو براء عامر بن مالک نے نبی ﷺ سے آ کر ملاقات کی۔ آپ نے اس کو اسلام کی دعوت دی۔ اس نے یہ کہا کہ میرے قبیلہ میں آپ کی تعلیمات جاننے کا اشتیاق ہے۔ اگر آپ تبلیغ کے لیے کچھ لوگوں کو نجد روانہ کریں تو قبیلہ یقیناً اس سے متاثر ہوگا اور اسلام قبول کر لے گا۔ آپ نے اردگرد کے بعض دشمن قبائل کا حوالہ دے کر فرمایا کہ مجھے ان کی جانب سے اپنے آدمیوں پر حملہ کا خطرہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے یقین دلایا کہ میرا پورا قبیلہ ان کی حفاظت کا ذمہ دار ہوگا۔ میں خود سب کا ذمہ لیتا ہوں کہ ان کی حفاظت کروں گا۔

نبی ﷺ نے چالیس مبلغین کی ایک جماعت اس کے ساتھ کر دی جس کے امیر المنذر بن عمرو الساعدیؓ تھے۔ بنو عامر کے پڑوس میں بنو سلیم کا علاقہ تھا۔ انہوں نے دوسرے قبائل بنو لحیان، عصیہ، ذکوان اور رعل کو ساتھ ملا کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ بنو عامر نے ان کے تحفظ کے لیے کوئی کارروائی نہ کی یہاں تک کہ ان قبائل کی مجموعی طاقت کے سامنے مجاہدین بے بس ہو گئے اور پوری جماعت مقابلہ میں شہید ہو گئی۔ صرف عمرو بن امیہ الضمریؓ بچے جو باقی لوگوں سے پیچھے تھے۔ مدینہ لوٹتے ہوئے ان کو بنو عامر کے دو آدمی ملے تو انہوں نے مسلمان مقتولین کے بدلے میں ان کو قتل کر ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ کو حادثہ کی خبر ملی تو آپ کو بے حد رنج ہوا اور اس کا ذمہ دار ابو براء کو ٹھہرایا۔ آپ نے ایک ماہ تک ظالم قبائل کے خلاف قنوت نازلہ (مصیبت میں ظالموں کے خلاف دعا) پڑھی۔

انہی دنوں میں ٹھیک اسی طرح کا واقعہ الرجیع کا پیش آیا۔ عضل اور قارہ قبائل حضورؐ کی خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ ہمارے اندر لوگ مسلمان ہو گئے ہیں لیکن ان کو دین سکھانے والا کوئی نہیں۔ آپ نے چھ صحابہ کی جماعت ان کے ساتھ کر دی۔ الرجیع کے مقام پر انہوں نے بنو ہذیل کی نفری کے ساتھ ان صحابہ پر حملہ کر دیا۔ بعض کو قتل کر دیا اور بعض کو گرفتار کر کے مکہ لے گئے تاکہ وہاں کے اشراف ان کو قتل کر سکیں۔

ان واقعات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس میں خاص ذہن کی منصوبہ بندی پائی جاتی ہے، اور وہ یہود کا ہو سکتا ہے۔ ابو براء کا خود اسلام قبول نہ کرنا، مہمانوں کی حفاظت کا پرزور وعدہ کرنا اور پھر دشمنوں کو بلا کر ان پر حملہ کرانا اور قتل عام کا اہتمام کرنا عرب معاشرہ میں صرف سازش کے تحت ممکن تھا۔ ابو براء کا قبیلہ بنونضیر کا حلیف تھا۔ اس لیے اس بات کا امکان موجود ہے کہ یہ قبیلہ یہودیوں کا آلۂ کار بن گیا ہو۔

غزوہ بنی نضیر کے اسباب:

غزوہ احد کے ظاہری نتائج سے اسلام کے دشمنوں کو اس بات کا حوصلہ ملا کہ وہ مسلمانوں کو ناقابل تسخیر نہ سمجھیں، اپنی قوت کو پھر سے مجتمع کریں اور بہتر منصوبہ بندی کر کے اسلام کی بیخ کنی کا اقدام کریں۔ مدینہ کے یہودی قبائل اگرچہ نبی ﷺ کے ساتھ معاہدہ کئے ہوئے تھے کہ وہ مدینہ پر حملہ آور ہونے والوں کے خلاف مسلمانوں کی جنگ میں غیر جانب دار رہیں گے لیکن جنگ احد میں انہوں نے عملاً ایسا کرنے سے گریز کیا۔ در پردہ اس جنگ کی آگ انہی کی بھڑکائی ہوئی تھی۔ بنو نضیر کے سردار کعب بن الاشرف کا قتل اسی بنا پر ہوا تھا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ اس کی عداوت ڈھکی چھپی نہ تھی اور اس نے قریش کی جنگی منصوبہ بندی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ جنگ احد کے نتائج نے بنو نضیر کو جری کر دیا۔ انہوں نے کئی شکلوں میں معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ نبی ﷺ نے آپس کی بے اعتمادی دور کرنے کی خاطر بنو نضیر اور بنو قریظہ دونوں سے کہا کہ وہ معاہدہ کی تجدید کریں۔ بنو قریظہ نے یہ بات مان کر اس تجویز کے مطابق نیا معاہدہ کر لیا لیکن بنو نضیر نے لیت و لعل سے کام لیا[1]۔ الٹا انہوں نے اسکیم بنائی کہ آنحضرتؐ کو بلا کر عیاری سے آپ کو قتل کر دیا جائے۔ بالآخر جنگ احد کے چھ ماہ بعد ربیع الاول ۴ھ میں نبی ﷺ نے اس قبیلہ کی سرکوبی کا فیصلہ کر لیا۔

بنو عامر بن صعصعہ کا واقعہ اوپر بیان ہوا ہے۔ عمرو بن امیہ الضمریؓ قتل ہونے سے بچ گئے تھے۔ وہ مدینہ کو روانہ ہوئے تو راستہ میں ان کو بنو عامر کے دو آدمی ملے۔ عمرو نے مسلمان مقتولین کے انتقام میں ان کو قتل کر دیا۔ حقیقت میں یہ دونوں شخص نبی ﷺ سے جان کی امان پا چکے تھے۔ اس لیے جب عمرو نے مدینہ پہنچ کر حادثہ کی روداد بیان کی تو حضورؐ آزردہ خاطر ہوئے اور ان دو عامریوں کی دیت ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔

سیرت نگاروں نے بنو عامر کی دیت کے مسئلہ کو بنو نضیر کے ساتھ جنگ کا فوری سبب بتایا ہے۔ ان کے مطابق یہود نبی ﷺ کے ساتھ اپنے معاہدوں کی رو سے عامریوں کی دیت میں اپنا حصہ ادا کرنے کے ذمہ دار تھے۔ اس لیے دیت کی ادائیگی پر بنو نضیر کو آمادہ کرنے کے لیے حضورؐ چند اکابر صحابہ کے ہمراہ ان کی بستی میں گئے اور لیڈروں کے سامنے اپنا مطالبہ رکھا۔ انہوں نے دیت کی ادائیگی کی حامی بھر لی اور آپ کو اور آپ کے صحابہ کو ایک دیوار کے سایہ میں انتظار کرنے کو کہا۔ اسی دوران میں انہوں نے آنحضرتؐ کو قتل کرنے کی اسکیم بنالی اور ایک شخص حضورؐ پر بھاری پتھر گرانے کے ارادہ سے چھت پر چڑھ گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے یہود کی سازش سے آپ کو مطلع کر دیا۔ چنانچہ آپ فی الفور مدینہ واپس تشریف لے گئے۔ آپ اتنی جلدی میں تھے کہ آپ نے اپنے ساتھیوں کو بھی اعتماد میں نہیں لیا۔ چنانچہ وہ کافی انتظار کے

بعد خود ہی آپ کی تلاش میں مدینہ پہنچے۔ آنحضرتؐ نے محمد بن مسلمہ انصاریؓ کے ذریعے بنو نضیر کو ان کی سازش کے باعث مدینہ کا علاقہ خالی کرنے کا حکم بھیجا۔ انہوں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا لیکن مدینہ کے منافقین نے ان کی پیٹھ ٹھونکی اور مقابلہ کا مشورہ دیا۔ چنانچہ یہود اپنے قلعوں میں داخل ہو گئے اور نبی ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ تین ہفتے کے بعد انہوں نے اس شرط پر مدینہ چھوڑنے کی پیشکش کی کہ وہ اپنا مال و اسباب ساتھ لے جا سکیں۔ ان کی یہ پیشکش تسلیم کر لی گئی اور وہ اپنا مال و اسباب اونٹوں پر لاد کر خیبر کو چلے گئے۔

غزوہ بنی نضیر کے اسباب و واقعات کی مشہور روایت اگرچہ یہی ہے لیکن اس میں کئی باتیں محل نظر ہیں:

۱۔ کوئی ایسا معاہدہ معلوم نہیں ہے جو مسلمانوں اور بنو نضیر کے درمیان ہوا ہو جس میں وہ دیت ادا کرنے میں ساجھی ٹھہرائے گئے ہوں۔ لہٰذا دیت کے مسئلہ کی بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے۔

۲۔ یہ بات اگر مان لی جائے کہ کوئی ایسا معاہدہ تھا تو عامریوں کی دیت ادا کرنے سے جب بنو نضیر نے اتفاق کر لیا اور بظاہر اس کے انتظام میں مصروف ہو گئے تو یہ مسئلہ نزاعی نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے اس کو کسی جنگ کا سبب قرار دینا ایک غیر معقول سی بات ہے۔ بالفرض یہود نے دیت کی ادائیگی سے معذوری بھی ظاہر کر دی ہوتی تو اس مسئلہ کو پورے قبیلہ کے ساتھ جنگ کا عنوان نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ حضورؐ نے تو جنگ سے گریز کی خاطر قریش کو بھی نخلہ کے مقتولین کی دیت ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہود کے معاملہ میں کیا آپ ایسا نہیں کر سکتے تھے؟

۳۔ جب آنحضرتؐ کو یہود کی سازش سے آگاہی حاصل ہو چکی تھی تو آپ نے اس سے اپنے صحابہ کو کیوں مطلع نہ فرمایا۔ ان کو قتل کے خطرے میں چھوڑ کر بلا اطلاع مدینہ چلے آنا آپ کے معروف کردار کے منافی ہے۔ آپ نے تو جنگ احد کے اس مرحلہ میں بھی استقامت دکھائی جب آپ کے بہت سے ساتھی میدان چھوڑ گئے تھے۔ پھر اپنے جانبازوں کو لیے ہوئے آپ کوہ احد کے اوپر ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں دشمن ان کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا تھا۔

۴۔ انتہائی مخدوش حالات میں آنحضرتؐ کا تنہا مدینہ روانہ ہونا کسی طرح قرین مصلحت نہیں تھا۔ اس طرح آپ اس سازش کی تکمیل کا موقع خود فراہم کر رہے تھے جس سے بچنے کے لیے آپ بنو نضیر کی بستی سے نکلے تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب آپ کی حفاظت کے لیے کچھ صحابہ ہمیشہ ساتھ رہتے تھے، ایسے پرخطر

حالات میں آپ کا تنہا مدینہ کو روانہ ہو جانا نا قابل تصور ہے۔

۵۔ بنونضیر کا قبیلہ ایک طاقتور قبیلہ تھا جو برابر دشمنی کا اظہار کر رہا تھا اور کل تک وہ معاہدہ کی تجدید سے انکاری تھا۔ محمد بن مسلمہ کے ذریعے آنحضرتؐ کا پیغام ملنے پر ان کا سامان سمیٹنے لگ جانا اور بے چون و چرا مدینہ چھوڑنے پر تیار ہو جانا ایک بالکل غیر فطری ردعمل ہے۔ فطری ردعمل یہ ہوتا کہ وہ اس حکم پر احتجاج کرتے یا گفت وشنید کا ڈول ڈالتے یا اس کا انکار کرتے ہوئے مقابلہ کا اعلان کرتے۔

ہمارے نزدیک غزوہ بنی نضیر کے اسباب بیان کرنے میں سیرت نگاروں سے ضرور تسامح ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ان کا واقعہ پڑھیے تو صورت حال بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ وہاں فرمایا ہے:

لَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ. ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ وَ مَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ. (الحشر۵۹:۳۔۴)

اور اگر اللہ نے ان کے لیے جلاوطنی نہ مقدر کر رکھی ہوتی تو ان کو دنیا میں عذاب دیتا اور ان کے لیے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہے۔ یہ اس جرم میں کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی اور جو اللہ کا مقابلہ کرتے ہیں تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

اس آیت کی رو سے بنونضیر پر جو گرفت ہوئی اور اس کے نتیجہ میں انہیں جلاوطن ہونا پڑا اس کا سبب اللہ و رسول کے ساتھ 'مشاقہ' تھا۔ 'مشاقہ' کا لفظ پارٹی بازی، مخالفت اور کھلی دشمنی کے لیے آتا ہے۔ گویا بنونضیر یہود کا وہ قبیلہ تھا جس کو اللہ کے دین کے ساتھ اور اللہ کے رسول کے ساتھ شدید عداوت تھی اور ان کا یہ رویہ ڈھکا چھپا نہ تھا۔ قرآن مجید نے تمام مشرکین عرب میں صرف قریش کے رویہ کو مشاقہ سے تعبیر کیا ہے۔ جنگ بدر میں ان کی بے چارگی اور بدانجامی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ.

(الانفال ۸:۱۳)

یہ اس سبب سے ہوا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ کو اٹھے اور جو اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ کو اٹھتے ہیں تو اللہ ان کے لیے سخت سزا دینے والا ہے۔

سورہ حشر اور سورہ انفال کی آیات کا تیور اور ان کے الفاظ ایک جیسے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اللہ اور رسول سے دشمنی کے معاملہ میں جو پوزیشن دوسرے کفار میں قریش کی تھی قبائل یہود میں وہی پوزیشن بنونضیر کی

تھی۔ اس لیے یہ دونوں اللہ کے غضب کے مستحق ٹھہرے۔ جنگ بدر میں قریش کے اکابر تہ تیغ ہو گئے اور ان کی سیادت کا جنازہ نکل گیا۔ بنونضیر کو اپنے ہم چشموں کے سامنے انتہائی ذلت کے ساتھ اپنے مرکز سیادت سے دستبردار ہو کر یثرب کے علاقہ کو خالی کر دینا پڑا، اگر چہ یہ بھی مستحق قریش ہی کے انجام کے تھے۔

قرآن مجید کی یہ بات ایسی نہیں ہے جس کے ثبوت سے تاریخ بالکل تہی دامن ہو۔ مثلاً

۱۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ رسول اللہؐ کی ہجرت کے پہلے ہی دن بنونضیر کے سردار حیی بن اخطب نے یہ پالیسی وضع کر لی تھی کہ اگر چہ یہ رسول فی الواقع وہی ہیں جن کی خبر ہمارے صحیفوں میں دی گئی ہے لیکن ہم ان پر ایمان نہیں لائیں گے اور ان کی سر توڑ مخالفت کریں گے۔

۲۔ بنونضیر کو دوسرے یہودی قبائل پر تفوق حاصل تھا چنانچہ کسی دوسرے یہودی قبیلہ کا کوئی آدمی اگر بنونضیر کے ہاتھوں قتل ہو جاتا تو یہ اپنے مقابل میں ان کو نصف دیت ادا کرتے۔

۳۔ جلاوطنی کے بعد جب یہ خیبر پہنچے تو وہاں کے یہود نے ان کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور سرداری کا منصب ان کے حوالہ کر دیا۔ گویا پالیسیاں یہی وضع کرتے اور دوسرے یہود ان کو بروئے کار لاتے۔

۴۔ مسلمانوں کے خلاف مشرکین اور یہود کو بھڑکانے اور صف آرا کرنے میں ان کی تگ و دو راز دارانہ نہیں تھی۔ جنگ احد کی منصوبہ بندی میں کعب بن الاشرف اور دوسرے نضری سرداروں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اور قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے لیے قریش کو جنگ پر ابھارنے میں انہوں نے بالکل شیطان کا رول ادا کیا کہ قریش کو آمادہ جنگ کر کے خود منظر سے غائب ہو گئے تاکہ رسول اللہؐ کی گرفت میں نہ آئیں۔

۵۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ رسول اللہؐ کے قتل کے کئی منصوبے بنونضیر نے بنائے، البتہ وہ بروئے کار نہ آ سکے یا ناکام ہو گئے۔

۶۔ ہمارے نزدیک بئر معونہ اور الرجیع کے واقعات بھی یہودی سازش کا نتیجہ تھے جن میں متعدد مسلمان شہید کر دیے گئے۔ یہ سازش بنونضیر کی ہو سکتی ہے کیونکہ بنو عامر ان کے حلیف تھے۔

۷۔ جلاوطنی کے بعد جنگ احزاب کو منظم کرنے میں بنونضیر کا کردار کلیدی تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ان شواہد کی بنا پر بنونضیر کے خلاف جو اقدام ہوا اس کا اصل سبب ان کی کھلی عداوت تھی۔ باقی رہے اس

کے فوری اسباب تو وہ حسب ذیل ہو سکتے ہیں:۔

اولاً، بعض روایات اس بات پر شاہد ہیں کہ یہود کی وعدہ خلافیوں کے باعث جنگ احد کے بعد نبی ﷺ نے بنو نضیر اور بنو قریظہ دونوں یہودی قبائل سے سابقہ معاہدہ کی تجدید کا مطالبہ کیا۔ بنو قریظہ نے تجدید کر دی لیکن بنو نضیر نے انکار کر دیا جو اس بات کی دلیل تھا کہ اب وہ حلیفانہ معاہدہ سے نکل رہے ہیں۔

ثانیاً، ہو سکتا ہے کہ بنو نضیر نے کعب بن الاشرف کے قتل کا انتقام لینے کی غرض سے نبی ﷺ پر قاتلانہ حملہ کی کوئی سازش تیار کی ہو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی حفاظت فرماتا ہے اس لیے نبی ﷺ یہود کی سازش سے بچ نکلے ہوں۔ اس طرح ان کی معاندانہ کارروائی پر کوئی اقدام ضروری ہو گیا ہو۔

ثالثاً، ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس بات کا احتمال ظاہر کیا ہے کہ بنو نضیر بنو عامر کے حلیف ہونے کے باعث اس ذمہ داری میں شریک بنتے تھے جو بئر معونہ کے حادثہ کے نتیجہ میں بنو عامر پر پڑتی تھی۔ آنحضرتؐ نے معاملہ کو رفع دفع کرنے کے لیے یہ چاہا ہوگا کہ مسلمان عمرو بن امیہ الضمریؓ کے ہاتھوں قتل ہونے والے دو عامریوں کا خون بہا ادا کریں اور بنو عامر شہدائے بئر معونہ کا۔ چونکہ بنو نضیر فریقین کے حلیف ہونے کے باعث گفت و شنید میں مابین کا کام کرنے کے لیے موزوں تھے اس لیے حضورؐ ان کی بستی میں تشریف لے گئے ہوں لیکن انہوں نے نہ صرف ٹال مٹول سے کام لیا ہو بلکہ حضورؐ کے قتل کی سازش کی ہو[2]۔

ہمارے نزدیک بنو نضیر کی اسلام دشمنی سے یہ بات ہرگز بعید نہیں کہ بئر معونہ کے حادثہ میں بنو عامر ان کے آلہ کار بنے ہوں۔ یہود ہمیشہ سے سازش کر کے دوسروں کے ذریعہ سے اپنا کام نکالتے ہیں۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ نبی ﷺ دو عامریوں کی دیت میں حصہ وصول کرنے ان کے ہاں نہ گئے ہوں بلکہ ان متعدد صحابہ کے قصاص کا مطالبہ لے کر گئے ہوں جن کو بنو نضیر کے حلیفوں نے شہید کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں یہود نے جو رویہ اختیار کیا اس نے ان کے خلاف اقدام کا جواز پیدا کر دیا ہو۔ اتنی بڑی جنگی کارروائی کسی بڑے جرم ہی کے نتیجہ میں کی گئی ہوگی، محض دو آدمیوں کی دیت کا مسئلہ اس کا جواز پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس کے لیے 'مشاقہ' جیسی کھلی دشمنی ہی کو جنگ کا اصل سبب قرار دینا چاہیے۔

بنو نضیر کے خلاف کارروائی:

بنو نضیر کے خلاف کارروائی کا فوری سبب جو بھی رہا، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے محمد بن مسلمہ انصاریؓ کے ذریعے ان کو یہ پیغام بھیجا کہ چونکہ وہ معاہدہ امن سے نکل گئے ہیں لہٰذا ان کے لیے یہ ضروری ہے

کہ وہ از خود مدینہ کے نواح سے نکل جائیں۔ بنونضیر کے لیے یہ نوٹس ایک بلائے ناگہانی تھا جس کی انہیں کوئی توقع نہ تھی۔ یوں بھی وہ اپنے آپ کو کافی مضبوط خیال کرتے تھے۔ انہیں اپنے قلعوں اور گڑھیوں پر بڑا ناز تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ قلعہ بند ہو کر اپنا دفاع بخوبی کر لیں گے اور محاصرہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو ان کے بے پناہ وسائل انہیں کسی مشکل سے دوچار نہیں ہونے دیں گے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ خود مسلمانوں کی صفوں میں ان کے بہی خواہ موجود ہیں جنہوں نے پہلے بنوقینقاع کے حق میں سفارش کی اور پھر جنگ احد میں یہود کی ہدایات کے تحت وہ لشکر اسلام سے عین جنگ سے پہلے جدا ہو کر مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کا باعث بنے تھے۔ انہیں توقع تھی کہ وہ لوگ ان کے مقاصد کے لیے بھی کام کریں گے۔ مزید براں بنونضیر کے ہم مذہب قبیلہ بنوقریظہ کی بستی بنونضیر کے جوار ہی میں تھی۔ وقت آنے پر وہ ان کی حمایت کی امید رکھتے تھے۔ روایات کے مطابق عبداللہ بن ابی کی طرف سے ان کو حمایت کے کچھ اشارے بھی ملے جن کی بناء پر ان کا خیال یہی ہوا کہ نبی ﷺ ان کے خلاف کوئی مؤثر کارروائی نہیں کر پائیں گے۔ ان اسباب کی بناء پر بنونضیر ربیع الاول ۴ھ میں قلعہ بند ہو گئے اور نبی ﷺ کی افواج نے ان کی بستیوں کا محاصرہ کر لیا۔ آنحضرتؐ نے ان کے دیار کے چاروں جانب تمام کلیدی مقامات کی ناکہ بندی کر لی۔ نگران چوکیاں قائم کیں تاکہ بنونضیر بنوقریظہ یا منافقین کے ساتھ کوئی رابطہ نہ کر سکیں۔ خود آپ نے اپنا کیمپ بنونضیر اور بنوقریظہ کی بستیوں کے عین وسط میں لگایا۔ یہ جگہ کھجوروں کے باغات سے گھری ہوئی تھی۔ آنحضرتؐ نے دشمن کے محاذ پر نظر رکھنے کے لیے رکاوٹ بننے والے درختوں کو کاٹنے اور جلانے کا حکم دیا۔ یہ درخت بنونضیر کی دولت مندی کا اہم ذریعہ تھے۔ اپنے وسائل کا یہ حشر دیکھ کر ان کے دلوں کو سخت ٹھیس لگی۔

اسلامی لشکر کے لیے یہ مہم بے حد آسان تھی۔ وہ اپنے گھروں سے دو تین میل دور گویا اپنے گھروں ہی میں مقیم تھے۔ رسد کی فراہمی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھی۔ منافقین اور بنوقریظہ کے لیے بنونضیر کو کوئی امداد پہنچانا انہوں نے ناممکن بنا دیا تھا۔ قریش کی طرف سے کسی اقدام کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہر گزرنے والا دن بنونضیر کی قلعہ بندی کی مصیبتوں میں اضافہ کا باعث بننے لگا۔ قلعوں کے مضبوط ہونے کے باوجود پیش آمدہ صورت حال میں ان کا ناخن تدبیر کوئی عقدہ حل نہ کر سکا۔ اب مسلمانوں کی ماضی کی فتوحات کی روشنی میں ان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں مسلمانوں کی دہشت ڈال دی اور دہشت وہ چیز ہے جو بڑے بڑوں کا پتہ پانی کر دیتی ہے۔ اس میں اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ حوصلہ ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ جنگ بدر میں اسی مرعوبیت اور دہشت زدگی

نے قریش کے اکابر کو مسلمانوں کے لیے تر نوالہ بنا دیا تھا اور اب اس نے بنو نضیر کو اسی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ انہوں نے مصالحت میں عافیت سمجھی۔ تقریباً تین ہفتے قلعہ بند رہنے کے بعد انہوں نے جلاوطنی قبول کر لی بشرطیکہ ان کو تمام سرو سامان ساتھ لے جانے دیا جائے۔ آنحضرتؐ نے ان کے ساتھ کریمانہ معاملہ کیا اور حکم دیا کہ وہ مدینہ کے علاقہ سے نکل جائیں۔ وہ اسلحہ ساتھ نہیں لے جا سکیں گے، باقی ہر قسم کا سامان جو وہ اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے ہوں لے جائیں۔ اس کے علاوہ اموال و املاک پر ان کا کوئی دعویٰ نہیں ہوگا۔ نیز ان کا سردار حیی بن اخطب آئندہ مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ کی آگ نہیں بھڑکائے گا۔ یہود کی مال و اسباب کے ساتھ محبت ضرب المثل ہے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ اسباب ساتھ لے جانے کی طمع میں اپنے گھروں کی بھی توڑ پھوڑ شروع کر لی تاکہ ان میں استعمال شدہ لکڑی تک بھی ساتھ لے جائیں۔ اس کام کے لیے انہوں نے مسلمانوں سے بھی تعاون حاصل کیا اور دنیا نے یہ عبرت انگیز منظر دیکھا کہ یہود نے وہ مکانات جو بڑی تمناؤں اور شوق سے بنوائے تھے خود اپنے ہاتھوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں اجاڑے۔ اس تمام صورت حال کا تذکرہ قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَ اَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ. (حشر ۵۹:۲)

تمہارا گمان نہ تھا کہ وہ کبھی اپنے گھروں سے نکلیں گے اور ان کا گھمنڈ یہ تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ کی پکڑ سے بچائے رکھیں گے تو اللہ کا قہر ان پر وہاں سے آ دھمکا جہاں سے ان کو گمان بھی نہیں ہوا اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ وہ اپنے گھروں کو اجاڑ رہے تھے خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی۔ پس عبرت حاصل کرو اے آنکھیں رکھنے والو!

روایات میں آتا ہے کہ بنو نضیر بڑے طمطراق سے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ان کے نکلنے پر ایک جشن کا گمان ہوتا تھا۔ حقیقت میں یہ فتح مندی کا جذبہ نہ تھا کیونکہ اس کا کوئی موقع نہ تھا، بلکہ یہ مرعوبیت اور اپنی ذلت پر پردہ ڈالنے کی ایک ناکام تدبیر تھی۔ اس طرح وہ اپنی شکست کا غم غلط کر رہے تھے اور دنیا کو یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ اس کارروائی سے گویا ان کا کچھ نہیں بگڑا حالانکہ جو بستیاں، شاندار مکانات، مضبوط قلعے، زرخیز زمینیں، ثمر آور باغات اور اپنی سیادت کا مرکز وہ چھوڑ کر جا رہے تھے اس کا قلق محض اظہار شوکت اور طمطراق سے دور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ اب ہمیشہ کے لیے ان کے دل کا روگ بن چکا تھا۔

بنونضیر کا قافلہ جب مدینہ سے اسی میل دور یہود کی آبادی خیبر میں پہنچا تو وہاں کے یہود نے نضری علماء کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور ان کو اپنا سردار مان لیا۔ اہل مدینہ ان کو اپنے ہاں سے نکال کر مدینہ کے پڑوس میں سازش و عداوت کے ایک بڑے اڈے کو اکھاڑنے میں کامیاب ہوئے۔ اب بنونضیر کے مار آستین ہونے کا خطرہ ٹل گیا۔

غزوہ بدر ثانی:

جنگ احد کے خاتمہ پر مکہ کو لوٹتے ہوئے ابوسفیان نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اگلے سال انہی دنوں میں میدان بدر میں اپنی فوج لے کر آئے گا اور غزوہ بدر کا انتقام لے گا۔ مسلمانوں نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ اس طے شدہ جنگ کے لیے نبی ﷺ نے شعبان ۴ھ میں بدر کا رخ کیا۔ آپ وہاں ابوسفیان کے انتظار میں آٹھ دن مقیم رہے۔ ابوسفیان اپنی فوج لے کر نکلا اور مقام عسفان تک آیا۔ وہاں آ کر فوج کو مخاطب کر کے کہا کہ اس طرح کی مہم ایسے زمانہ میں مناسب ہوتی ہے جب ہر طرف ہریالی ہو، تم اپنے جانور شاداب جھاڑیوں میں چرا سکو اور ان کا دودھ پی سکو۔ یہ سال قحط کا ہے۔ اس لیے میں نے مکہ کو لوٹنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر ملی تو آپ نے بھی اپنے ساتھیوں کو مدینہ چلنے کا حکم دے دیا۔

حوالہ جات

۱۔ سنن ابی داؤد۔ باب خبر النضیر

۲۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ ص ۲۵۹۔۲۶۰

باب 34

غزوہ احزاب

خیبر میں قیام کی ابتدائی مشکلات پر قابو پاتے ہی نضری سردار اسلام کے خلاف نئی سازش تیار کرنے میں مصروف ہوگئے۔ حیی بن اخطب نے نبی ﷺ کے ساتھ اپنے اس عہد کو پس پشت ڈالا کہ وہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ نہیں بھڑکائے گا۔ اس نے دوسرے نضری اکابر...... سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ربیع، سلام بن مشکم ...... وغیرہ کو ساتھ لیا اور مکہ میں قریش کے پاس جا پہنچا۔ اس نے ان کو بتایا کہ اب یہود اور مشرکین مکہ کا ہدف ایک ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کا مقابلہ اگر مختلف گروہ الگ الگ رہ کر کریں گے تو شکست کھائیں گے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان کی مخالف تمام قوتیں مجتمع کر لی جائیں اور وہ سب مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوں تاکہ ہمیشہ کے لیے اس خطرہ کا قلع قمع کیا جا سکے۔ یہودیوں نے اس حکمت عملی پر عمل درآمد کے لیے اپنے ہر تعاون کی پیش کش کی۔ قریش کو یہ مشورہ پسند آیا اور طے پایا کہ فریقین اپنے اپنے دائرہ اثر میں قبائل کو جنگ پر آمادہ کریں گے اور اس جنگ میں پورے جزیرہ عرب کو شریک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس منصوبہ کے تحت قریش نے ہوازن، بنو مصطلق، بنو سلیم اور احابیش کو جنگ میں شرکت کے لیے تیار کیا اور یہود نے بنو غطفان کو خیبر کی کھجوروں کی کچھ مقدار کا لالچ دے کر آمادہ کیا۔ وہ اپنے حلیفوں بنو اسد اور بنو سعد کو ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے علاوہ مزید کئی مشرک قبائل مثلاً بنو اشجع، بنو مرہ اور بنو فزارہ بھی مذہبی تحفظ کی اس جنگ میں شرکت پر آمادہ ہوگئے۔ خود یہود نے انتقام کی غرض سے شریک جنگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ نبی ﷺ یہود اور قریش کی ملی بھگت سے غافل نہیں تھے۔ آپ نے ان قبائل پر محدود پیمانے کی فوج کشی بھی کی جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ متحدہ محاذ میں شامل ہو رہے ہیں۔ اس فوج کشی کا مقصد ان کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا اور ان کو مرعوب کرنا تھا۔

مدینہ میں دفاع کی تیاری:

جب نبی ﷺ کو خبر ملی کہ جنگ کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے تو آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا۔ آپ نے ان کو بتایا کہ سارا عرب ہمارے دین کے استیصال کے لیے کمر بستہ ہو چکا ہے۔ ان کی مجموعی قوت کے مقابل میں ہمارے وسائل بہت کم ہیں۔ عنقریب ان کا حملہ متوقع ہے۔ مدینہ کے دفاع کی کیا صورت اختیار کی جائے۔ جنگ احد کے تجربہ کی روشنی میں بحث وتمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ ایک لشکر جرار کے ساتھ کھلے میدان میں مقابلہ مشکل ہوگا۔ لہٰذا شہر کے اندر محصور ہو کر اپنا دفاع کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس مرحلہ پر ایک صحابی سلمان فارسیؓ نے رائے دی کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہونے کی صورت میں شہر کے اندر محصور ہونا کافی نہیں ہوتا۔ ایسی صورت حال میں ہمارے دیار میں شہر کے گرداگرد خندق کھود لی جاتی ہے جس کو عبور کرنا دشمن کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ مدینہ کے گرد بھی ایک خندق کھود لی جائے۔ سلمان فارسیؓ کا یہ مشورہ پسند کیا گیا۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نبی ﷺ اور اکابر صحابہ نے شہر کے گردونواح کا جائزہ لے کر خندق کے مقام کا تعین کیا۔ یہ طے ہوا کہ فن حرب کے لحاظ سے دشمن کا حملہ شمال اور مغرب کی جانب سے ممکن ہے۔ دوسری اطراف مضبوط مکانات، باغات اور سنگلاخ زمین کے باعث حملہ کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ لہٰذا خندق شمال اور مغرب کی جانب بنائی جائے۔ روایات کے مطابق خندق کی کل لمبائی ساڑھے تین میل، چوڑائی پندرہ فٹ اور گہرائی آٹھ فٹ تھی۔ نبی ﷺ نے کھدائی کے لیے قطعات زمین مسلمانوں پر تقسیم کر دیے تھے اور یہ کام بیس دن میں ختم ہوا۔ اس میں نبی ﷺ خود بنفس نفیس شریک ہوئے۔ آپ رجزیہ اشعار پڑھتے اور مسلمانوں کو جوش دلاتے۔ آپ نے ان کو بشارت دی کہ ان کی قربانیوں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ ان کو ایسی کامیابی عطا فرمائے گا کہ عرب کے علاوہ یمن، فارس اور روم کے علاقے ان کے زیر نگیں ہو جائیں گے۔

شوال ۵ ھ میں جونہی خندق کی کھدائی کا کام تکمیل کو پہنچا دشمن افق پر نمودار ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے فوری طور پر خندق کے مختلف حصوں پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تعینات کیا، شہر کے مضبوط مکانات میں خواتین اور بچوں کو جمع کر دیا، جنگی اہمیت کے مقامات پر خاص طور پر مضبوط جماعتیں مقرر کیں، بنو قریظہ کے یہودی قبیلہ پر نگاہ رکھنے کے لیے دو سو آدمی سلمہ بن اسلمؓ کی افسری میں تعینات کیے اور اپنا مرکز مدینہ کے نواحی پہاڑ جبل سلع پر قائم کیا تا کہ پورا میدان

جنگ نظر میں رہے۔ قرآن مجید سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اہل ایمان سے اس مرحلہ میں خاص عہد لیا کہ وہ میدان سے پیٹھ نہیں پھیریں گے اور دشمن کا مقابلہ ثابت قدمی سے کریں گے۔

مدینہ کا محاصرہ:

کوہ احد اور ذوالحلیفہ کے نشیبی اور بالائی علاقوں کی جانب سے دشمن کی مختلف ٹکڑیاں، جن کو قرآن نے احزاب (یعنی مختلف جماعتیں) کا نام دیا ہے، کچھ ایسی آن بان کے ساتھ اور اس طرح پے در پے وارد ہوئیں کہ یہ تاثر ابھرتا تھا جیسے پورا عرب امڈا چلا آ رہا ہے۔ ان کی تعداد، جو دس ہزار سے متجاوز بیان کی گئی ہے، اور جنگی سروسامان ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ مسلمان کوہ احد اور مدینہ کے درمیان جنگ بازوں کے اس سمندر کو دیکھتے تو کلیجہ منہ کو آتا۔ کمزور مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے اندیشے راہ پانے لگے۔ ان کو معاملہ کی سنگینی کا احساس ہوا تو ہمت اور حوصلہ جواب دینے لگا۔ البتہ سچے مومنین نے استقامت دکھائی۔ ان کو یقین تھا کہ جس خدا نے ان کے لیے اتنا مشکل امتحان مقرر فرمایا ہے وہی اس سے عہدہ برآ ہونے کے اسباب بھی فراہم کرے گا۔ انہیں اللہ اور رسول کے وعدوں پر اعتماد تھا۔ انہیں یقین تھا کہ نصرت خداوندی حاصل ہوگی اور دشمن نامراد ہوگا۔ لہٰذا ان کا عزم تھا کہ ہم رسول اللہؐ کی اطاعت کریں گے اور پوری جانفشانی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں گے۔ تاہم سارے عرب کی طاقت کے بالمقابل کھڑا ہونا ایک ایسی آزمائش تھی جس میں مسلمانوں کو ڈال کر بری طرح جھنجھوڑ دیا گیا۔ جن لوگوں کے اندر نفاق کے جراثیم تھے وہ کھل کر سامنے آ گئے اور مسلمان اپنے اندر کی کمزوریوں سے واقف ہو گئے۔ آزمائش کی شدت کا تذکرہ خود قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

> إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا. هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا. (الاحزاب ۳۳:۱۰۔۱۱)
>
> یاد کرو جب کہ وہ تم پر آ چڑھے، تمہارے اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی، اور جب کہ نگاہیں کج ہو گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے باب میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت اہل ایمان امتحان میں ڈالے گئے اور بالکل ہلا دیے گئے۔

لشکروں کی آمد جس قدر زہرہ گداز تھی مدینہ کا دفاع اتنا ہی مضبوط تھا۔ دشمن کا جو دستہ اقدام کرتا خندق پر آ کر رک جاتا کیونکہ اس کی چوڑائی اور گہرائی ناقابل عبور تھی۔ عرب جنگ باز دست بدست جنگوں کے ماہر تھے۔

مقابل فوجوں کو گھیرے میں لینا، ان کے خلاف چالیں چلنا اور دادِ شجاعت دینا ان کو خوب آتا تھا لیکن یہاں جس صورت حال سے ان کو سابقہ پیش آیا وہ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ خندق کی رکاوٹ ایسی تھی جس کا توڑ ان کے پاس نہ تھا۔ جن لوگوں نے گھوڑوں کو کدا کر اس کو عبور کرنے کا حوصلہ کیا وہ اس کے اندر گر کر ڈھیر ہو گئے۔ اگر کوئی جتھا اس کو پاٹنے کی غرض سے قریب ہوتا تو مسلمان اس کو تیروں کی باڑھ پر رکھ لیتے۔ لہٰذا عملاً جنگ کی صورت یہی تھی کہ احزاب کے لشکر خندق کے پار وسیع میدان میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ فریقین ایک دوسرے پر تیراندازی کرتے رہتے جس سے اکادکا اموات ہو جاتیں لیکن بڑے حملہ کی کوئی صورت دشمن کے لیے ممکن نہ تھی۔

بنوقریظہ کی عہد شکنی:

محاصرہ کے ابتدائی دنوں میں بنوقریظہ مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کے سبب سے جنگ سے کنارہ کش رہے۔ مسلمانوں کو ان کی جانب سے کسی حملہ کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس لیے ان کی ساری توجہ محاذ جنگ پر مرکوز تھی۔ اس صورت حال میں حیی بن اخطب نے مسلمانوں کی قوت کو تقسیم کرنے کی غرض سے یہ چال چلی کہ بنوقریظہ کو عہد شکنی پر آمادہ کیا۔ یہ قرظی سردار کعب بن اسد کے پاس گیا اور کہا کہ میں قریش اور غطفان کی پوری قوت مدینہ پر چڑھا لایا ہوں۔ تم ہتھیاروں کا بڑا ذخیرہ رکھتے ہو۔ تم بھی معرکہ میں شریک ہو جاؤ تو محمد سے پیچھا چھڑانا ممکن ہو جائے گا۔ کعب نے کہا۔ تم جو گھٹا چڑھا لائے ہو اس کا پانی نچڑ چکا ہے اگرچہ اس میں بجلی کی چمک اور گھن گرج ابھی باقی ہے۔ حیی نے اس کو احساس دلایا کہ تمام عرب قبائل روز روز اکٹھے نہیں ہوں گے اس لیے اسلام کی بیخ کنی کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں ملے گا۔ اگر بنوقریظہ متحرک نہ ہوئے تو ان پر مسلمانوں کا اقتدار ہمیشہ کے لیے مسلط ہو جائے گا اور وہ پھر کبھی ان سے جان نہیں چھڑا سکیں گے۔ حیی نے یہ پیشکش بھی کی کہ اگر احزاب کو شکست ہوئی تو وہ انہی کے قلعہ میں قیام کرے گا اور اپنا مستقبل ان کے ساتھ وابستہ کرلے گا۔ اس طرح کی باتوں سے حیی بنوقریظہ کو احزاب میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

نبی ﷺ کو بنوقریظہ کی اس بدعہدی کی خبر ہوئی تو آپ نے انصار کے چند سرداروں سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ وغیرہ کو تحقیق کے لیے ان کی بستی میں بھیجا اور یہ ہدایت بھی فرمائی کہ اگر معاملہ واقعی نقض عہد کا ہو تو واپس آ کر اشاروں میں بتا دینا تا کہ لشکر کے مورال پر برا اثر نہ پڑے۔ یہ لوگ کعب بن اسد قرظی کے ہاں پہنچے تو جتنا سن رکھا

تھا اس سے زیادہ مخالفت پر آمادہ پایا۔ ان لوگوں نے رسول اللہؐ کا معاہدہ یاد دلایا تو کہنے لگا میں کسی محمد کو جانتا ہوں اور نہ اس کے ساتھ کسی معاہدہ کو۔ سعد بن معاذؓ کے ساتھ گالم گلوچ ہونے لگا تو سعد بن عبادہؓ نے کہا، معاملہ گالم گلوچ کی حد سے کہیں آگے نکل چکا ہے اس لیے بس کرو۔ چنانچہ سب لوگ واپس میدان جنگ میں آئے اور رسول اللہؐ کو اشاروں میں بتایا کہ عضل اور قارہ کا معاملہ ہے (یعنی وہی بے وفائی نظر آتی ہے جس کا مظاہرہ عضل اور قارہ قبائل نے الرجیع والوں کے ساتھ کیا تھا) اس پر رسول اللہؐ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہیں خوشخبری ہو۔ آپ کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ یہود کے واحد باقی ماندہ قبیلے نے بدعہدی کر کے ازخود اس بات کے اسباب فراہم کر دیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے وجود سے مدینہ کی سرزمین کو پاک کر دے۔ بنو قریظہ کے نقض عہد کا فوری نقصان یہ ہوا کہ لشکر اسلام کو اب اپنی پشت کی جانب بھی بھرپور دفاع کا اہتمام کرنا پڑا۔ چنانچہ نبی ﷺ نے زید بن حارثہؓ کی قیادت میں تین سو صحابہ کا ایک دستہ یہودی بستیوں کی جانب تعینات کر دیا۔

منافقین کا کردار:

اس نئی صورت حال نے ضعیف الایمان مسلمانوں کے اندر بڑا اضطراب پیدا کیا۔ انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اللہ اور رسول نے ہم سے جو وعدے کیے تھے وہ محض سراب تھے۔ ہم روز بروز بد سے بدتر پوزیشن کی طرف جا رہے ہیں۔ بعض شریر لوگوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ ہمیں بشارتیں تو روم و فارس پر قبضہ کی سنائی جا رہی تھیں اور حالت یہ ہے کہ قضائے حاجت کے لیے نکلنا دشوار ہو رہا ہے۔ مدینہ کے مضافات سے تعلق رکھنے والے منافقین نے مسلمانوں کا مورال گرانے کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ اہل یثرب عرب کی اس دل بادل فوج کے مقابل میں نہیں ٹک سکیں گے لہٰذا یہ محاذ آرائی بالکل بے سود ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ جنگ کا خیال دل سے نکال کر دشمن سے معاملہ کرنے کی فکر کریں۔ بعض منافقین یہ شوشہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ نئی صورت حال میں ہمارے گھر غیر محفوظ ہو گئے ہیں۔ ہمیں ان کی حفاظت کا سامان کرنا ہے۔ وہ یہی بہانہ پیش کر کے نبی ﷺ سے محاذ جنگ چھوڑنے کی اجازت طلب کرتے حالانکہ شروع ہی میں آنحضرتؐ نے مسلمانوں سے خصوصی عہد لیا تھا کہ وہ میدان جنگ کو نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن یہ لوگ عذرات تراشنے کے بڑے ماہر تھے۔

منافقین کا ایک گروہ اس بات کے لیے بھی کوشاں رہا کہ وہ جنگ میں عملی حصہ نہ لے اور اپنی اس بیماری کو

دوسرے مسلمانوں تک بھی متعدی کر دے۔ ساڑھے تین میل لمبی دفاعی لائن پر ہر جگہ جنگ کی گرم بازاری یکساں نہیں تھی۔ کام چور لوگوں کے لیے ممکن تھا کہ وہ اپنی کمین گاہوں میں پڑے آرام کرتے رہیں۔ چنانچہ یہ منافقین مستعد مسلمانوں کو دعوت دیتے کہ وہ ان کے محاذ پر آ جائیں اور خطرات سے محفوظ رہیں۔ یہ منافقین بڑے چرب زبان تھے۔ جب موقع ملتا تو لوگوں کے سامنے اپنی مفروضہ جانبازیوں کا خوب خوب چرچا کرتے اور ان کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے۔ لیکن حقیقت میں یہ اسلام سے کینہ رکھنے والے تھے۔

محاصرہ کے طویل ہونے سے مسلمانوں میں فاقے ہونے لگے۔ اسی موقع پر معجزات بھی ظہور میں آئے۔ بشیر بن سعدؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ محاذ جنگ پر تھے۔ عمرہ بنت رواحہؓ نے اپنی بچی کو تھوڑی سی کھجوریں کپڑے میں باندھ کر دیں کہ یہ اپنے والد اور ماموں کو کھانے کے لیے دے آؤ۔ بچی ان کو تلاش کرتی ہوئی رسول اللہؐ کے پاس سے گزری تو آپ نے پوچھا کہ تمہاری پوٹلی میں کیا ہے۔ اس نے بتایا، یہ کھجوریں ہیں جو میں والد اور ماموں کے لیے لائی ہوں۔ حضورؐ نے وہ پوٹلی اس سے لے لی، ایک چادر منگوا کر بچھائی اور کھجوریں اس پر پھیلا دیں۔ پھر ایک آدمی سے کہا کہ لوگوں کو آواز دو کہ کھانے پر آ جائیں۔ لشکر آتا، کھجوریں کھا کر چلا جاتا یہاں تک کہ سب کا پیٹ بھر گیا اور کھجوریں ابھی چادر میں سما نہیں پا رہی تھیں۔

سردار لشکر ابوسفیان اور قریش کے شہ سواروں خالد بن الولید، عمرو بن العاص، نیز ضرار بن الخطاب نے اپنی اپنی جمعیتوں کے ساتھ کئی مقامات سے خندق کو عبور کرنا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوتی۔ صرف تیر اندازی کا مقابلہ ہوتا اور دونوں جانب سے کچھ لوگ زخمی ہوتے یا قتل ہوتے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح فیصلہ کن جنگ نہ ہو سکتی تھی۔

یہود جنگ میں شامل ہوئے تو انہوں نے ان مکانوں پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا جن میں خواتین اور بچے مقیم تھے۔ شام کے دھندلکے میں انہوں نے اپنا آدمی معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ رسول اللہؐ کی پھوپھی صفیہؓ کی اس پر نظر پڑ گئی تو انہوں نے خیمہ کی ایک چوب اس کے سر پر دے ماری۔ وہ گرا تو اس کا سر کاٹ کر باہر پھنکوا دیا۔ یہودیوں کو خیال ہوا کہ مسلمان ان مکانات کے دفاع سے غافل نہیں ہیں۔ چنانچہ انہوں نے پشت کی طرف سے حملے کا خیال ترک کر دیا اور احزاب کو دوسری نوعیت کی مدد بہم پہنچائی۔

انصار کی ثابت قدمی کا امتحان:

روایات میں آتا ہے کہ محاصرہ کی شدت کے دوران میں نبی ﷺ نے بنوغطفان سے یہ معاملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا کہ وہ مدینہ کی کھجوروں کی پیداوار کا ایک تہائی لے لیں اور متحدہ محاذ سے الگ ہوکر محاصرہ اٹھالیں۔ آپ نے اس معاہدہ کی ایک تحریر بھی لکھوالی لیکن انصار نے اس تجویز کو نہ مانا۔ ہمارے نزدیک یہ روایت محل نظر ہے کیونکہ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ صحابہ کرام تو بڑے حوصلہ سے صورت حال کا مقابلہ کررہے تھے لیکن نعوذ باللہ نبی ﷺ کی ہمت جواب دے رہی تھی کہ آپ نے یہ تدبیر اختیار کر کے جنگ سے جان چھڑانی چاہی۔ روایات میں بھی یہ کارروائی بالکل یک طرفہ سی نظر آتی ہے۔ اتنے بڑے اقدام سے پہلے نبی ﷺ کا کسی ساتھی سے مشورہ لینا یا جماعت کے اکابر کو اعتماد میں لینا ثابت نہیں اور یہ بات آنحضرتؐ کے طریق کار سے بالکل ہٹ کر ہے۔ غطفان کے ساتھ اس سلسلے میں مذاکرات بھی کہیں نظر نہیں آتے اور بظاہر ایسے مذاکرات کا وہاں امکان بھی نہیں تھا۔ فوجوں کے سمندر میں کسی ایسی کارروائی کا راز فوراً افشا ہوجاتا۔ اصل واقعہ یہ ہوسکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے انصار کا حوصلہ جانچنے کے لیے یہ تدبیر کی ہو۔ ایسا آپ اکثر کرتے تھے۔ اس کی مثالیں غزوہ بدر اور غزوہ احد کے واقعات میں موجود ہیں۔ غزوہ احزاب کے آخری دنوں میں جب جنگ میں شدت آگئی تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے محض امتحان کے لیے انصار کے سرداروں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ غطفان کو جنگ سے علیحدہ کرنے کی تدبیر کی جائے اور ان کو مدینہ کی کھجوروں کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ اس علیحدگی کے عوض ادا کردیا جائے۔ اس پر سعد بن معاذؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ، آپ یہ بات وحی الٰہی کی روشنی میں فرمارہے ہیں یا اپنی رائے سے۔ آنحضرتؐ نے جواب دیا، میں محسوس کرتا ہوں کہ کفار عرب مجتمع ہوکر انصار پر پل پڑے ہیں، تو انصار کے تحفظ کی خاطر میں اپنی رائے سے یہ تجویز دے رہا ہوں۔ سعدؓ نے عرض کی، یارسول اللہ! غطفان کو ہم نے اس طرح کی شرائط پر اپنے باغوں کی ایک کھجور بھی ان وقتوں میں نہیں کھانے دی جب ہم کافر تھے، وہ اسے خرید کر یا بطور مہمان ہی کھا سکتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے ہماری عزت افزائی فرمائی ہے، اسلام کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے، ہم نے آپ کے باعث شہرت پائی ہے، تو ہم اب اپنی املاک غطفان کے حوالہ کرنا کیوں گوارا کریں گے؟ اس گفتگو سے آنحضرتؐ کو اطمینان ہوگیا کہ انصار جنگ کی سختیوں سے گھبرائے نہیں اور وہ ثابت قدم رہیں گے۔

نصرت الٰہی کا ظہور:

وقت گزرنے کے ساتھ محاصرہ کی طوالت اور بے مقصدیت سے کفار تنگ آ گئے۔ ان کے کئی سالاروں نے خندق کے کمزور حصوں پر جتنے انفرادی حملے ترتیب دیئے ان میں کامیابی نہ ہوئی۔ بنو قریظہ کی جانب سے شہر کی آبادی کو بھی دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن آنحضرتؐ پہلے ہی اس طرف کے دفاع کو مضبوط بنا چکے تھے، لہٰذا یہود کو ناکامی ہوئی۔ کفار کی جانب سے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر خندق کے کسی حصہ کو پاٹنے کی تدبیر ہوئی لیکن مسلمانوں کا پہرہ سخت تھا۔ بالآخر کفار نے یکبارگی بہت بڑی قوت کے ساتھ حملہ کرنے کا سامان کیا۔ اس میں کئی بہادر شہ سواروں نے اپنی اپنی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا۔ خندق کا ایک ایسا مقام منتخب کیا گیا جہاں پاٹ قدرے کم تھا۔ ایک بہادر شخص عمرو بن عبدود گھوڑا پار لے جانے میں کامیاب ہو گیا اور مبارزت طلب کی۔ حضرت علیؓ اس کے بالمقابل آئے۔ اس کا وار اپنی ڈھال پر برداشت کیا جو کٹ گئی۔ اس کے بعد خود حملہ کیا تو ان کی تلوار اس کے جسم میں اتر گئی۔ اس کا یہ انجام دیکھتے ہی دوسرے سواروں نے واپسی کی ٹھانی۔ عکرمہ بن ابی جہل نے مسلمانوں کے ہجوم سے بچنے کے لیے اپنا نیزہ پھینک دیا اور واپس بھاگا۔ ایک سوار خندق میں گر گیا اور وہیں مقتول ہوا۔ بہر حال دونوں جانب سے دن بھر شدت کی تیر اندازی ہوئی۔ یہ مقام جبل سلع پر آنحضرتؐ کے مورچہ کے قریب تھا اس لیے حضورؐ کی نمازیں قضا ہو گئیں۔ کفار کو نامراد لوٹنا پڑا۔ اس بڑے حملہ سے بھی وہ مقصد حاصل نہ ہوا جس کے لیے یہ حملہ کیا گیا تھا۔ الٹا ان کے بعض جوانمرد مارے گئے۔

اہل ایمان کا اپنے اندرونی دشمنوں اور بیرونی حملہ آوروں سے یہ مقابلہ تین ہفتے سے زیادہ عرصہ جاری رہا اور انہوں نے عزیمت و استقامت کا حق ادا کر دیا۔ اس جہاد میں اللہ کے کتنے وفادار بندوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں اور دوسرے اس انتظار میں رہے کہ کب موقع ملے اور وہ بھی یہ سرفرازی پائیں۔ انصار کے قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذؓ کو بازو میں تیر لگا جس سے ان کی شریان پھٹ گئی اور ان کو علاج کی غرض سے مسجد نبوی میں منتقل کر دیا گیا۔ جنگ کی شدت میں نبی ﷺ کی زبان پر برابر یہ دعا رہی اَللّٰھُمَّ مُنزِلَ الکتابِ سریعَ الحسابِ اَھزِمِ الاَحزَابَ اللھم اَھزِمْھم و زَلزِلْھم (اے اللہ، قرآن نازل کرنے والے، جلد حساب چکانے والے، احزاب کو شکست سے دوچار کر۔ اے اللہ، ان کو شکست دے اور ان کو ڈگمگا دے) یہ دعا قبول ہوئی اور خداوند تعالیٰ کی

اسی نصرت کا اظہار ہوا جس کا وعدہ اس نے اہل ایمان سے کر رکھا ہے اور جس کا اظہار سابقہ جنگوں میں ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے غیر مرئی لشکر حرکت میں آئے اور کفار کو ذلت سے دوچار کر دیا۔ یہ موسم سردی کا تھا۔ کھلے میدان میں کفار کا ٹھہرنا پہلے ہی کچھ آسان نہ تھا۔ اب ان کے اوپر بادِ صرصر چلی جس میں شدت کی سردی تھی۔ ہوا کی تیزی کا یہ عالم تھا کہ کفار کے خیمے اور شامیانے اکھڑ گئے۔ آگ جلانا اور کھانا تیار کرنا ناممکن ہو گیا۔ جانور تتر بتر ہو کر بھاگنے لگے۔ یہ آندھی کفار پر ایسا عذاب بن کر مسلط ہوئی کہ انہوں نے محاصرہ چھوڑ کر بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اس طرح قریش، غطفان، یہود اور مشرکین عرب کی یہ مشترکہ اسکیم اللہ تعالیٰ کی افواج قاہرہ کے سامنے ناکام ہو گئی۔ مشرکین نے کچھ ایسی بدحواسی میں راتوں رات محاصرہ اٹھایا کہ مسلمانوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ دشمن جا چکا ہے۔ منافقین نے تو باقاعدہ یہ پروپیگنڈا کیا کہ فوجیں واپس نہیں ہوئیں بلکہ کہیں اڑوس پڑوس میں کسی نئی منصوبہ بندی میں مصروف ہیں۔ نبی ﷺ نے حذیفہؓ کے ہمراہ آدمی بھیج کر یہ تسلی کر لی کہ احزاب بے نیل مرام اپنے گھروں کو لوٹ چکے ہیں۔

اس جنگ کے لیے قریش نے یہود کی بھرپور مدد سے جو قوت فراہم کی تھی اور بکثرت قبائل کا تعاون حاصل کر لیا تھا اس سے ان کی توقع یہ تھی کہ وہ مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور نبی ﷺ اور اہل ایمان کے لیے کہیں پناہ لینا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس شاندار اسکیم کو بالکل بے مصرف اور بے نتیجہ بنا دیا۔ اس نے ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا اور ان کے حوصلہ پر کاری ضرب لگائی۔ ظاہر ہے کہ روز روز اتنے بڑے پیمانے پر قبائل یکجا نہیں ہوا کرتے اس لیے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ معرکہ کفار کی جانب سے اسلام کی مخالفت کا آخری نقطہ تھا اور اس عمل کو دہرانا ممکن نہ تھا۔ اسی لیے جنگ کے خاتمہ پر نبی ﷺ نے مسلمانوں کو یہ خوشخبری سنائی کہ **الآن نغزوھم ولا یغزوننا نحن نسیر الیھم** (اب ہم ان کے ساتھ لڑیں گے، وہ ہمارے ساتھ نہیں لڑیں گے۔ ہمیں ان کی طرف اقدام کرنا ہوگا) یہ اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ قریش ازخود کسی جنگی کارروائی سے گریز کریں گے۔ جو کارروائی ہوگی وہ ہم اپنی مصلحت کے تحت خود کریں گے[1]۔

یہودی سردار حیی بن اخطب بھی اس حقیقت سے آگاہ تھا چنانچہ قرظی سردار کعب بن اسد کو نقض عہد پر آمادہ کرنے میں اس نے اسی دلیل سے کام لیا تھا کہ روز روز اتنی قوت فراہم نہ ہو سکے گی اور اگر ہماری یہ مہم ناکام ہوئی تو تم ہمیشہ کے لیے محمد کے آگے سرنگوں رہو گے۔

اکابر صحابہ جن کی نظر حالات و واقعات پر تھی، وہ بھی جنگ خندق کو کفر کی آخری جدوجہد قرار دیتے تھے۔
چنانچہ حضرت سعد بن معاذؓ کا زخم مندمل ہونے میں جب تاخیر ہوئی تو انہوں نے ان الفاظ میں دعا کی:

اے اللہ، تو جانتا ہے کہ مجھے کوئی چیز اس سے زیادہ محبوب نہیں کہ میں تیری راہ میں اس قوم سے جہاد کروں جس نے تیرے رسول کو جھٹلایا اور اس کو وطن سے نکالا۔ اے اللہ، میرا گمان ہے کہ اب تو نے ہمارے اور ان کے درمیان جنگ کا کوئی موقع باقی نہیں چھوڑا۔ اگر کچھ جنگ باقی ہے تو اس کے لیے مجھے زندہ رکھ تاکہ میں تیری راہ میں جہاد کروں اور اگر جنگ ختم ہو چکی ہے تو میرے زخم سے خون جاری کر دے اور اسی میں میری موت مقدر فرما۔[1]

روایات میں آتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد سعدؓ کا زخم جس پر کھرنڈ آ چکا تھا پھر سے ہرا ہو گیا اور اس میں سے اتنا خون بہا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

غزوہ بنی قریظہ:

بنو قریظہ مسلمانوں کے ساتھ جس معاہدہ میں شریک تھے اس کے مطابق وہ اس بات کے پابند تھے کہ بیرونی حملہ آوروں کا ساتھ نہ دیں اور مسلمانوں کے ساتھ پرامن رہیں۔ جنگ خندق کے دوران انہوں نے معاہدہ توڑ کر مسلمانوں کو شدید خطرے سے دوچار کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف حملہ آوروں کی مدد کی بلکہ خود بھی دہشت گردی کی کوشش کی۔ انصار کا جو وفد ان کے پاس بھیجا گیا تھا اس کے ساتھ ان کا سلوک نہایت تحقیر آمیز تھا۔ جب احزاب محاصرہ اٹھا کر واپس چلے تو بنو قریظہ کی آنکھیں کھلیں۔ اب انہیں بنو نضیر کا انجام یاد آیا۔ انہوں نے منافقین سے رابطہ کر کے ان کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ عبداللہ بن ابی نے ان کو تسلی دی کہ آپ لوگ اطمینان رکھیں، ہم تمہارے ساتھ وہ معاملہ نہیں ہونے دیں گے جو بنو نضیر کے ساتھ ہوا۔ اگر آپ لوگوں کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکل جانا گوارا کر لیں گے لیکن آپ لوگوں کے معاملہ میں کسی کے حکم یا مشورہ کی ہرگز کوئی پروا نہیں کریں گے۔ اگر تمہارے ساتھ جنگ کی گئی تو ہم تمہارے طرفدار ہوں گے۔

نبی ﷺ نے قبل اس کے کہ بنو قریظہ اپنے تحفظ کے لیے کہیں سے کمک حاصل کر سکیں جنگ خندق سے فارغ ہوتے ہی ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا۔ یہود کا منصوبہ ساز اور سازشی لیڈر حیی بن اخطب بنو قریظہ کے ہاں مقیم تھا اس لیے وہ بھی کسی دوڑ دھوپ کے لیے آزاد نہ تھا۔ محاصرہ جوں جوں طویل ہوتا گیا اور کہیں سے مدد ملنے کی راہیں مسدود ہو گئیں

تو بنو قریظہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دہشت زدہ ہو کر وہ لگے تدبیریں سوچنے کہ اس مخمصے میں سے کیسے نکلیں۔ ان کے سردار کعب بن اسد نے تجاویز پیش کیں کہ وہ اسلام قبول کر لیں یا اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنے ہاتھوں قتل کر کے ایک فیصلہ کن جنگ لڑیں یا پھر ہتھیار ڈال دیں۔ لیکن یہود ان میں سے کوئی تجویز ماننے پر آمادہ نہ ہوئے۔

جب محاصرہ کی مدت پچیس دن تک طول پکڑ گئی تو یہود کی ہمت جواب دے گئی۔ اب وہ نبی ﷺ سے درخواست گزار ہوئے کہ ان کے ساتھ مہربانی کا معاملہ کیا جائے۔ قبیلہ اوس نے، جو ان کا حلیف قبیلہ تھا، ان کے حق میں سفارش کی اور آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ جس طرح بنو قینقاع کے حق میں خزرج کے سردار عبداللہ بن ابی کی سفارش مان لی گئی تھی اسی طرح بنو قریظہ کے حق میں اوس کی بات مانی جائے۔ نبی ﷺ نے اس درخواست کو قبول فرماتے ہوئے اوس کے سردار سعد بن معاذؓ کی رائے لینے اور اس کے مطابق فیصلہ کرنے کا اعلان کیا۔ بنو قریظہ نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ سعد بن معاذؓ کو جو، مدینہ میں زیر علاج تھے، موقع جنگ پر لایا گیا۔ سفر کے دوران اہل قبیلہ نے ان سے سفارش کی کہ اپنے حلیفوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا۔ وہ خاموش رہے۔ جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو فرمایا کہ اب سعد کے لیے وقت آ گیا ہے کہ وہ اللہ کے معاملہ میں کسی کی ملامت سے نہ ڈرے۔ موقع پر پہنچ کر انہوں نے بنو قریظہ سے پوچھا کہ کیا وہ ان کے فیصلہ کو تسلیم کریں گے۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر انہوں نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ کیا میرے فیصلہ کو فی الواقع عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ آپ نے بھی اثبات میں جواب دیا۔ اس پر سعدؓ نے یہ فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کی عہد شکنی اور رسول اللہؐ کے ساتھ جنگ کی پاداش میں قبیلہ کے تمام مردوں کو قتل اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کی املاک پر قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ اسی فیصلہ کو نافذ کیا گیا۔

اس فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سعد، تم نے سات آسمان اوپر خداوند کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔ اصل میں یہ فیصلہ یہود کی شریعت کے عین مطابق تھا۔ تورات میں ہے:

> جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا.......... اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو تو اس کا محاصرہ کرنا اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا لیکن عورتوں اور بال بچوں اور چوپایوں اور اس کے شہر کے سب مال اور لوٹ کو اپنے لیے رکھ لینا۔[1]

اس طرح نبی ﷺ کی اس خوشخبری کے حقیقت بننے کا موقع پیدا ہو گیا جو آپ نے بنو قریظہ کی عہد شکنی پر کی

تھی۔اللہ تعالیٰ نے مدینہ کی سرزمین کو مار آستین بنے ہوئے یہود سے پاک کردیا۔

غزوہ احزاب پر قریش کے جنگی اقدامات کا خاتمہ ہوگیا۔ نبی ﷺ نے پیشینگوئی فرمادی کہ قریش کی قوت ختم ہوچکی ہے۔غزوہ بدر، احد اور احزاب کے بعد یہود کی مزاحمت بھی ختم ہوگئی اور وہ جلاوطن کردیے۔اس موقع پر ہم باب 4 میں بیان کردہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی وہ خبر یاد دلانا چاہتے ہیں کہ جس نبی موعود کی میں منادی کررہا ہوں ''وہ تم کو روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا۔ اس کا چھاج اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا اور اپنے گیہوں کو تو کھتے میں جمع کرے گا مگر بھوسی کو اس آگ میں جلائے گا جو بجھنے کی نہیں''۔ (متی ۳:۱۱۔۱۲)

یہاں روح القدس سے مراد وحی الٰہی اور آگ سے مراد جنگ ہے۔یہ پیشینگوئی نبی ﷺ کے سوا کسی پر پوری نہیں ہوتی۔ حضورؐ کے ہاں قرآن اور جنگ کا امتزاج موجود ہے۔انبیائے بنی اسرائیل کی مزید کئی پیشینگوئیاں آپ کی اس حیثیت کو نمایاں کرتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ صحیح بخاری۔کتاب المغازی،غزوہ احزاب

۲۔ صحیح بخاری۔کتاب المغازی۔باب مرجع النبیؐ من الاحزاب ومخرجہ الی بنی قریظہ

۳۔ عہد نامہ قدیم۔استثنا۔باب ۲۰:۱۰۔۱۲

باب 35

اہل ایمان کی کردار کشی کی کوششیں

بنونضیر نے اسلام کے استیصال کے لیے سردھڑ کی بازی لگادی اور پورے ملک سے اسلام کے دشمنوں کو جمع کر کے مدینہ پر حملہ بھی کر دیکھا لیکن اس کے باوجود وہ کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے، الٹا ان کے حصہ میں نامرادی اور ذلت آئی۔ اب انہوں نے اپنے گماشتوں یعنی منافقین کو آلہ کار بنا کر پوری توجہ رسول اللہؐ اور مسلمانوں کی کردار کشی اور اخلاقی برتری اور پاکیزگی کی ساکھ ختم کرنے کی کوششوں پر مرکوز کر دی۔ ان کا خیال یہ ہوا کہ مسلمانوں پر اس قدر حملے کیے جائیں کہ وہ اپنی عزت بچانے ہی میں لگ جائیں اور دوسرے محاذوں پر توجہ نہ دے سکیں۔ اس پالیسی کا آغاز تو کعب بن الاشرف نے اس وقت کر دیا تھا جب اس نے مسلمان خواتین کے نام لے لے کر سوقیانہ غزلیں کہیں۔ اب اس پالیسی کو اگلے مراحل تک بڑھایا گیا۔ جہاں تک منافقین کا تعلق ہے وہ نہ صرف یہود کے زیر اثر تھے بلکہ ان کے مفاد کے لیے وقت آنے پر اپنی خدمات پیش کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ اس طریق کار سے رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کے لیے سخت پریشانیاں پیدا کی گئیں۔

ا۔ مسلمان خواتین پر تہمت:

پہلے تو منافقین کے ذریعے مسلمان خواتین کے بارے میں سوقیانہ اشعار پھیلائے جاتے تھے، اب ان پر باقاعدہ تہمتیں لگائی جاتیں اور ان کے بارے میں بے سروپا ناگفتنی باتیں پھیلائی جاتیں۔ منافقین اور منافقات ان بے بنیاد باتوں کو معاشرے میں پھیلانے کے لیے متحرک ہو جاتے۔

زمانہ جاہلیت میں گھروں میں داخلہ یا خواتین کے غیروں کے سامنے نہ آنے کے بارے میں کوئی خاص پابندیاں نہ تھیں۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ نبی ﷺ بھی کسی کو گھر میں بلا لیتے تو اہل بیت نبی سمٹ کر کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھ جاتے۔ اسی طرح خواتین جب کسی ضرورت سے گھروں سے باہر نکلتیں تو اجنبیوں سے پردہ کرنا ان کے لیے لازم نہیں تھا۔ منافقین نے جب یہ طرز عمل بطور پالیسی اپنا لیا کہ مسلمان خواتین کو مطعون کرنا ہے تو

انہوں نے یہ بھی کیا کہ کسی تقریب سے رسول اللہؐ کے گھروں میں چلے جاتے اور ازواج نبی سے رودررو ہو کر باتیں کرنے کی کوشش کرتے۔ اسی طرح خواتین کو کہیں آتے جاتے دیکھتے تو ان پر آوازے کستے اور جب ٹوکا جاتا تو یہ معذرت کر دیتے کہ ہم نے پہچانا نہیں تھا۔ ہم سمجھے یہ فلاں شخص کی لونڈی ہیں۔ یہ مسئلہ جب حدود سے بڑھ گیا اور یہود و منافقین مسلمان خواتین کی کردار کشی سے باز نہیں آئے تو قرآن میں معاشرے کو بگاڑ سے بچانے کے لیے کئی معاشرتی اصلاحات نازل ہوئیں۔ مثلاً:

۱۔ گھروں میں اجنبی مردوں اور اجنبی عورتوں کے داخلہ کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ یہ حکم دیا گیا کہ گھروں میں وہی لوگ داخل ہوں جن سے رشتہ داری یا خانگی تعلقات کی بنا پر اہل خانہ مانوس ہوں۔ یہ لوگ بھی داخلہ سے قبل اہل خانہ سے داخلہ کی باقاعدہ اجازت لیں۔ اگر اجازت نہ ملے تو گھروں میں زبردستی داخل ہونے کی کوشش نہ کریں۔

۲۔ گھروں میں داخلہ کی اجازت مل جانے پر گھر کی خواتین نامحرم مردوں سے یا اجنبی عورتوں سے اپنی زیب و زینت کو چھپائیں، اپنے جسموں کو سمیٹ کر رکھیں اور ان سے نظریں نہ ملائیں۔ شرم و حیا کا یہی رویہ گھروں میں آنے والے مرد بھی اختیار کریں۔

۳۔ گھر والوں کے آرام کرنے کے اوقات میں لوگ گھروں میں آمد و رفت سے اجتناب کریں۔

۴۔ اگر رسول اللہؐ اپنے گھر میں کسی کو بلائیں تو وہ کام کی بات کرے اور نشست کو طول دینے کی کوشش نہ کرے۔

۵۔ رسول اللہؐ کے گھروں میں لوگ بے محابا داخل نہ ہوا کریں۔ پردے کی اوٹ سے اپنا مدعا بیان کریں۔

۶۔ مسلمان خواتین گھروں سے باہر نکلیں تو اپنے لباس پر ایک بڑی چادر بھی اوڑھ لیا کریں۔ نیز اس چادر کا گھونگٹ نکالیں تا کہ کسی شرارتی آدمی کو ان پر آوازہ کسنے کا موقع ہاتھ نہ آئے۔

۷۔ منافقین کو خبردار کیا گیا کہ اگر وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو شہر میں رہنے کا حق کھو دیں گے۔ فرمایا:

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ. ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ. وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا. مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا. (احزاب ۳۳:۵۹۔۶۱)

اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کر دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگٹ لٹکا لیا کریں۔ یہ اس بات کے قرین ہے کہ ان کا امتیاز ہو جائے، پس ان کو کوئی ایذا نہ پہنچائی

جائے اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ یہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے، اور جو مدینہ میں سنسنی پھیلانے والے ہیں اگر باز نہ آئے تو ہم تم کو ان پر اکسادیں گے، پھر وہ تمہارے ساتھ رہنے کا بہت ہی کم موقع پائیں گے۔ان پر پھٹکار ہوگی۔ جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے اور بے دریغ قتل کیے جائیں گے۔

۸۔ اگر کوئی شخص خواتین پر تہمت زنا لگائے تو اس سے چار گواہ پیش کرنے کو کہا جائے گا۔ اگر وہ اپنا الزام ثابت نہ کر سکا تو خاتون کو رسوا کرنے کی سزا کے طور پر اس کو اسی کوڑے لگائے جائیں گے۔ چنانچہ غزوہ بنی المصطلق سے واپسی پر جب بعض لوگوں نے نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ کے بارے میں نازیبا باتیں بغیر کسی ثبوت کے پھیلائیں تو ان کو یہی سزا دی گئی۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہود و منافقین کے پیش نظر اصل میں رسول اللہؐ کی ذات اور آپ کی حیثیت کو نقصان پہنچانا ہوتا تھا۔

۲۔ ایلاء و تخییر کا واقعہ:

اس زمانہ میں منافق مردوں کے علاوہ منافق عورتیں بھی سرگرم ہو گئیں۔ انہوں نے رسول اللہؐ کے اہل خانہ کے اندر بے اطمینانی پیدا کرنے کی خاطر ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا دیا۔ وہ ان کے دلوں میں یہ بات ڈالتیں کہ آپ معزز خاندان کی بیٹیاں ہیں۔ جہاں بھی ہوتیں بڑے بڑے سردار آپ لوگوں کا ہاتھ تھامنے کو تیار ہوتے اور نہایت عزت و وقار سے آپ کو رکھتے۔ دنیاوی آسائشوں سے بھرپور آرام کی زندگی ان کے ہاں حاصل ہوتی۔ یہاں آ کر آپ لوگوں نے کیا پایا؟ ناداری کی زندگی جو چاروں طرف سے خطرات سے گھری ہوئی ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ کو وہ سہولتیں بھی حاصل نہیں جو ہمارے معمولی سرداروں کی بیویوں کو حاصل ہیں۔ رسول اللہؐ کو یہ تو کرنا چاہیے کہ گھر کے اخراجات میں ذرا کشادہ دستی کا مظاہرہ کریں۔ بار بار کی ملاقاتوں اور اس انداز کی گفتگو سے ازواج نبی کا متاثر ہو جانا کچھ تعجب خیز نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نہج پر سوچ کر انہوں نے فی الواقع نبی ﷺ سے کچھ مطالبہ کر بھی دیا جس سے آپ نہایت آزردہ خاطر ہوئے۔ آپ نے ان کو احساس دلانے کے لیے یہ فرمایا کہ میں ایک ماہ تک تم لوگوں سے نہیں ملوں گا۔ اس ارادہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے آپ نے ازواج کے ہاں جانا ترک کر دیا اور اپنی رہائش کے لیے ایک بالا خانہ حاصل کر لیا۔ حضرت عمرؓ کو ان کے پڑوسی صحابی نے اس حادثہ کی خبر دی تو انہوں نے ازواج نبی کو مورد الزام ٹھہرایا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ انصار بیویوں کو اپنے کنٹرول میں نہیں رکھتے اور وہ مقابلہ کے انداز میں شوہروں کے سامنے باتیں کرتی ہیں۔ ازواج نبی نے بھی انصاری خواتین کا طریقہ اختیار کر کے حضورؐ کو آزردہ کیا ہے۔ وہ معاملہ کی تحقیق کے لیے اپنی بیٹی سیدہ حفصہؓ کے ہاں گئے اور ان کو

برا بھلا کہا کہ تم نے ضرور رسول اللہ ﷺ کا دل دکھایا ہے۔ اپنی حیثیت پہچانو اور اسی کے مطابق بات کیا کرو۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ حضورؐ کے بالا خانے پر گئے۔ وہاں ایک حبشی غلام کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ حضرت عمرؓ کے بار بار کہنے پر اس نے حضورؐ سے اجازت طلب کی جو آپ نے مرحمت فرمادی۔ دوسری باتیں کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے پوچھ لیا کہ کیا آپ نے ازواج کو طلاق دے دی۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے بتایا کہ لوگ اس صورت حال پر بے حد ملول اور فکر مند ہیں۔ بالا خانے میں قیام کے دنوں میں حضورؐ کو حکم ہوا کہ آپ ازواج کو اختیار دے دیں کہ اگر وہ آپ کا ساتھ دے سکتی ہیں تو ٹھیک، ورنہ ان کو دے دلا کر رخصت کر دیا جائے گا۔ وہ جو راہ چاہتی ہیں اختیار کر لیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا. وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا. (احزاب ۳۳: ۲۸۔۲۹)

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ، میں تمہیں دے دلا کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طالب ہو تو اطمینان رکھو کہ اللہ نے تم میں سے خوبی کے ساتھ نباہ کرنے والیوں کے لیے ایک اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

ایک ماہ گزرا تو نبی ﷺ سب سے پہلے سیدہ عائشہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ انہوں نے سوال کیا کہ آپ قبل از وقت تشریف لے آئے۔ آج ۲۹ دن ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے سیدہ عائشہؓ کے سامنے یہ سوال رکھا کہ اگر تمہیں دنیا کی زندگی اور زیب و زینت کی خواہش ہے تو میں یہ چیزیں فراہم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں تمہیں کچھ دے دلا کر رخصت کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اگر اللہ و رسول اور دار آخرت کو چاہتی ہو تو میرے گھر میں رہ سکتی ہو۔ اس بات کا فوری جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ اپنے والدین سے مشورہ کر لو اور اس کی روشنی میں سوچ کر جواب دو۔ حضرت عائشہؓ نے کہا مجھے اس کا جواب دینے کے لیے کسی سے مشورہ کی حاجت نہیں۔ میں اللہ، رسول اور دار آخرت کو اختیار کرتی ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا، پھر اس گفتگو اور اپنے جواب سے کسی کو مطلع نہ کرنا۔ اس کے بعد آپ دوسری ازواج کے ہاں تشریف لے گئے اور فرداً فرداً ہر ایک کو یہی اختیار دیا۔ ہر ایک نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہؓ نے دیا تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے حضورؐ نے منافق عورتوں کی وسوسہ اندازی کا کامیاب تدارک کیا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ حضورؐ کی ازواج اپنی زندگی سے پوری طرح مطمئن ہیں اور وہ امیروں کی بیگمات کے طور طریقوں کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت دینے کو تیار نہیں۔

ازواج سے حضورؐ ایک ماہ جو علیحدہ رہے اس کو ایلاء کا اور ان کو علیحدگی کا اختیار دینے کو تخییر کا نام دیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے منافق مردوں اور عورتوں کی ہرزہ سرائیوں اور شرارتوں سے ازواج نبی کو محفوظ کرنے کے لیے ان کو ان کی حیثیت کا شعور دلایا کہ وہ نبی کی بیویاں ہونے کے باعث دوسری عورتوں سے مختلف ذمہ داریاں رکھتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ان سے بالاتر سمجھیں اور اس بات کا احساس کریں کہ ان کے مونہوں سے نکلی ہوئی باتیں نبیؐ کے لیے پریشانی پیدا کرسکتی ہیں۔ لہٰذا وہ منافقوں سے بات کرتے وقت حد درجہ احتیاط سے کام لیں۔ مروت میں ان کے لیے نرم گوشہ رکھنا بہت نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ فرمایا:

يٰنِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا. (احزاب ۳۳:۳۲)

اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو، تو تم لہجہ میں نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ کسی طمع خام میں مبتلا ہوجائے، اور بات معروف کے مطابق کہو۔

۴۔ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کا مسئلہ:

اسی طرح کا ایک معاملہ، جس میں منافقین نے رسول اللہ ﷺ کو مطعون کیا، حضرت زینبؓ بنت جحش کے ساتھ نبی ﷺ کے نکاح کے وقت پیش آیا۔ حضورؐ نے جب خدیجہؓ سے شادی کی تو انہوں نے اپنا غلام لڑکا زید بن حارثہ آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ نبی ﷺ نے اس کو باصلاحیت پایا اور آزاد کرکے اس کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا۔ چنانچہ یہ لڑکا زید بن حارثہ کے بجائے زید بن محمد کہلانے لگا۔ زید حضورؐ کے مشفقانہ رویہ سے بے حد متاثر تھے۔ حضورؐ کی بعثت ہوئی تو بالکل آغاز ہی میں اسلام لانے کی سعادت زید کے حصہ میں آئی۔ بعد میں یہ اسلام کی خدمت میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

زیدؓ سے غیر معمولی محبت کے باعث اور اسلام میں انسانی مساوات کا عملی مظاہرہ کرنے کی خاطر رسول اللہؐ نے ان کی شادی اپنی پھوپھی زاد زینب بنت جحشؓ سے کروادی۔ زینب کا تعلق عرب کے سردار قبیلہ قریش سے تھا۔ انہوں نے رسول اللہؐ کے حکم کی تعمیل تو کردی لیکن اس رشتہ کو اپنی حیثیت سے فروتر پایا اس لیے زیدؓ کے ساتھ ان کی کبھی بن نہیں آئی۔ زیدؓ اس صورت حال سے بے حد پریشان ہوئے اور اس کا شکوہ حضورؐ سے کیا۔ لیکن آپ نے ان کو تعلق نبھانے کی ہدایت فرمائی اور زینبؓ کو طلاق دینے کی مخالفت اس لیے کی کہ زینب جو پہلے ہی ان سے رشتہ ہونے پر ملول ہیں، طلاق یافتہ ہونے کا صدمہ برداشت نہیں کرسکیں گی۔ زیدؓ نے طلاق کا فیصلہ موخر کیا لیکن نباہ پھر

بھی ممکن نہ ہوا۔ بالآخر انہوں نے اپنے فیصلہ پر عمل کر دیا اور زینبؓ کو طلاق ہو گئی۔

ادھر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ زینب کے معاملہ کو ایک اہم معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس لیے رسول اللہؐ کو ہدایت ہوئی کہ اگر زید بیوی کو طلاق دے دیں تو زینب کو آپ اپنے حبالۂ عقد میں لے لیں۔ حضورؐ کو خدشہ ہوا کہ ایسا کرنے سے منافقین کو پروپیگنڈا کا ایک طوفان کھڑا کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں میں یہ تصور رائج تھا کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے کی مانند اور اس کی بیوی حقیقی بہو کی طرح ہوتی ہے۔ اگر اس بیٹے کا باپ اس بہو کو اپنے نکاح میں لے آئے تو وہ گویا اپنی حقیقی بہو سے نکاح کرنے کے گناہ کا مرتکب ہوگا۔ یہ ایک غیر فطری اور غیر عقلی تصور ہے کیونکہ صلبی اولاد میں خون اور نسل کا جو اشتراک ہوتا ہے وہ منہ بولی اولاد میں نہیں ہوتا۔ اسلام ایک فطری دین ہونے کے باعث محض رسم و رواج پر مبنی چیزوں کو کوئی وقعت نہیں دیتا۔ اللہ کا رسول ہر طرح کے غیر فطری رسوم و رواج کو معاشرہ سے مٹاتا ہے۔ اس کے منصب کا تقاضا ہوتا ہے کہ لوگوں کی مخالفت کے باوجود حالات کا مقابلہ کرے۔ قرآن مجید میں آپ کو یہی یاد دہانی کرائی گئی۔ فرمایا:

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ. سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ. وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا. نِ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ. وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا.　(احزاب ۳۳: ۳۸-۳۹)

اور نبی کے لیے اللہ نے جو کچھ فرض کیا اس میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ یہی اللہ کی سنت رہی ہے ان لوگوں کے معاملہ میں بھی جو پہلے گزرے ہیں، اور اللہ کے فیصلہ کے لیے ایک وقت مقرر تھا۔ وہ جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے تھے اور اسی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ حساب کے لیے کافی ہے۔

زیدؓ کے حتمی فیصلہ کے بعد اب آسمانی ہدایت کو عملی جامہ پہنانے کے سوا آپ کے لیے کوئی چارا نہ تھا۔ جونہی آپ نے زینبؓ سے نکاح کیا تو منافقین نے پروپیگنڈا شروع کیا کہ اس شخص نے بہو سے نکاح کر لیا ہے۔ بعضوں نے ناروا افسانے تراش لیے جن کے بقایا ہماری کتابوں میں موجود ہیں اور آج بھی حضورؐ کی ذات پاک پر کیچڑ اچھالنے کے خواہش مند انہی کو اپنی تحریروں میں نقل کر کے آپ کی کردار کشی کرتے ہیں۔ یہ بے سروپا افسانے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زینبؓ آپ کی پھوپھی زاد ہونے کے ناطے کبھی آپ کے لیے اجنبی نہ تھیں۔ ان سے زید کا نکاح حضورؐ ہی نے اپنی مرضی سے کروایا تھا اور آپ دل سے چاہتے تھے کہ زیدؓ بیوی کو طلاق نہ دیں۔ زینبؓ نہایت قدیم الاسلام صحابیہ بھی تھیں۔ اس اعتبار سے بھی حضورؐ ان کو عرصہ دراز سے جانتے تھے۔ آپ کو جو فکر تھی وہ یہ تھی کہ زینب نے پہلے اس رشتہ کو، جو حضورؐ نے خود کروایا، اپنے مرتبہ سے فروتر پایا اور وہ ناکام رہا۔ پھر زید کو یہ گوارا نہ ہوا

کہ وہ رشتہ کو قائم رہنے دیتے چنانچہ زینب کو طلاق کی ذلت بھی سہنی پڑی۔ اب زینبؓ کی دلداری اور ان کے نقصان کی تلافی کی بہترین صورت یہی ہو سکتی تھی کہ حضورؐ خود ان کو اپنی زوجیت میں لیں۔ یہی ہدایت آپ کے لیے آسمان سے نازل ہوئی:۔

منافقین کے ہنگامے کو فرو کرنے کے لیے متبنیٰ یعنی منہ بولے بیٹے کے بارے میں یہ احکام آئے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰئِي تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَاءَكُمْ. ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ. وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ. اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآءِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَاللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ.

(احزاب ۳۳: ۴۔۵)

اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں رکھے اور نہ تمہاری ان بیویوں کو، جن سے تم ظہار کر بیٹھتے ہو، تمہاری مائیں بنایا اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے بیٹے بنایا۔ یہ سب تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں اور اللہ حق کہتا ہے اور وہ صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت کے ساتھ پکارو۔ یہی اللہ کے نزدیک قرین عدل ہے۔ اور اگر تم کو ان کے باپوں کا پتا نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے شریک قبیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ منہ سے ایک بات کہہ دینے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ نہ بیویوں کو ماں کہہ دینے سے وہ ماں بن سکتیں اور نہ منہ بولے بیٹے ایک قول سے حقیقی بیٹے بن جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے بیٹوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارا کرو۔ چنانچہ زید بن محمد پھر سے زید بن حارثہ کہلانے لگے۔

حضرت زینبؓ کے معاملہ میں فرمایا:

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ. وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاءِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا. وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا.

(احزاب ۳۳: ۳۷)

اور جب کہ تم اس سے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا (یعنی زید سے) یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو۔ اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔ اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو۔ پس جب زید نے اس سے اپنا رشتہ کاٹ لیا تو ہم نے اس کو تم سے بیاہ دیا کہ مومنوں کے لیے ان کے منہ

بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں، جبکہ وہ ان سے اپنا تعلق بالکل کاٹ لیں، کوئی تنگی باقی نہ رہے اور اللہ کا فیصلہ پورا ہونے والا ہے۔

۴۔ حضورؐ کے لیے رفع زحمت کا ایک حکم:

سیدہ زینبؓ کے ساتھ نکاح میں رسول اللہؐ کو ایک زحمت اور پیش آئی۔ جنگ احد میں کثیر تعداد میں مسلمانوں کے شہید ہونے کے نتیجہ میں بیوگان کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ گئی اور ان کی یتیم اولاد کی پرورش کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ قرآن مجید میں یہ حکم نازل ہوا کہ اہل ایمان یتیموں کی پرورش کے لیے اپنی خدمات پیش کریں اور اگر یہ ذمہ داری ان کو گراں گزرتی ہو تو ان کی بیوہ ماؤں کو اپنے نکاح میں لے آئیں تاکہ وہ خواتین اپنے بچوں کی خبر گیری اور پرورش میں اپنا حصہ بٹا سکیں۔ جو لوگ وسائل کے مالک ہوں اور بیویوں کے درمیان انصاف کرنے پر قادر ہوں وہ دو دو، تین تین، چار چار نکاح کریں اور عرب میں رائج کثرت ازدواج کے رواج سے فائدہ اٹھائیں لیکن اب یہ اجازت ماضی کے طور طریقوں کے برعکس چار بیویوں تک محدود ہوگی۔

رسول اللہؐ کی دو بیویاں، حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ، مکہ سے آپ کے ساتھ ہجرت کر کے آئی تھیں۔ آپ کی دو بیویاں شہدا کی بیوگان تھیں، یعنی حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ۔ حفصہؓ حضرت عمر بن خطاب کی بیٹی تھیں۔ ان کے شوہر خنیس بن حذافہؓ جنگ احد میں زخمی ہو کر انتقال کر گئے تھے۔ حضرت ام سلمہؓ بنو مخزوم سے تھیں۔ ان کے شوہر ابو سلمہؓ حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ یہ بھی جنگ احد میں زخمی ہو کر بعد میں انتقال کر گئے۔ حضورؐ کو جب زینبؓ بنت جحش سے نکاح کا حکم ہوا تو اس وقت چار بیویاں آپ کے نکاح میں تھیں۔ چنانچہ منافقین کو پروپیگنڈا کے لیے یہ نکتہ بھی ہاتھ آیا کہ محمد کیسے لیڈر ہیں کہ جو لوگوں کے لیے جس شریعت کو نافذ کرتے ہیں خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ دوسروں کو تو چار بیویوں تک پابند کر دیا ہے لیکن اپنے لیے یہ پابندی گوارا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی براءت کے لیے قرآن میں اس مسئلہ میں یہ ہدایت نازل ہوئی:۔

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ. قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ. وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (احزاب ۳۳:۵۰)

اے نبی! ہم نے تمہاری ان بیویوں کو تمہارے لیے جائز کیا جن کے مہر تم دے چکے ہو، اور تمہاری ان

مملوکات کو بھی تمہارے لیے حلال کیا جو اللہ نے تم کو بطور غنیمت عطا فرمائیں۔ اور تمہارے چچا کی بیٹیوں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیوں اور تمہارے ماموں کی بیٹیوں اور تمہاری خالاؤں کی بیٹیوں میں سے ان کو حلال ٹھہرایا جنھوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی ہے۔ اور اس مومنہ کو بھی جو اپنے تئیں نبی کو ہبہ کر دے بشرطیکہ پیغمبر اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں۔ یہ اجازت خاص تمہارے لیے ہے، مسلمانوں سے الگ۔ ہم کو اچھی طرح معلوم ہے جو کچھ ہم نے ان پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے باب میں فرض کیا ہے۔ (یہ اجازت اس لیے دی ہے) تاکہ تم پر کوئی تنگی نہ رہے۔ اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نہ صرف یہ کہ آپ کے پانچویں نکاح میں جو رکاوٹ حائل تھی وہ دور ہوگئی بلکہ آپ کے لیے ایسی حدود بھی متعین کر دی گئیں جن کے اندر رہتے ہوئے آپ مزید نکاح بھی کر سکتے تھے۔

اس کے ساتھ آنحضرت ﷺ پر خانگی معاملات میں کچھ ایسی پابندیاں بھی عائد کر دی گئیں جو دوسرے مسلمانوں پر نہیں تھیں۔ ایک تو آپ کو اپنی ازواج کو طلاق دینے کی ممانعت کر دی اور ان کو اہل ایمان کی ماؤں کا درجہ دیا۔ لہٰذا وہ پابند ہوگئیں کہ رسول اللہؐ کے بعد وہ کسی اور سے نکاح نہ کر سکتی تھیں۔ دوسرے آپ کو سورہ احزاب کی آیت ۵۰ میں دی گئی فہرست سے باہر کسی بھی عورت کو نکاح میں لانے سے روک دیا گیا۔ آپ کی ازواج کو یہ بتا دیا گیا کہ حضورؐ رسالت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کو اولیت دیں گے۔ لہٰذا وہ ان کی توجہ کے کم و بیش ہونے کا شکوہ نہ کریں۔

۵۔ مہاجرین و انصار کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش:

یہود اس امر سے واقف تھے کہ مسلمانوں کی قوت ان کے اتحاد اور یک جہتی میں مضمر ہے۔ نبی ﷺ نے نہ صرف اوس اور خزرج کے مابین قدیم دشمنی کو محکم دوستی میں بدل دیا تھا بلکہ انصار اور مہاجرین کے درمیان بھی ولاء کا رشتہ قائم کر دیا تھا۔ مواخات نے اس رشتہ کو مضبوط تر کر دیا۔ یہود اور ان کے ایجنٹ منافقین برابر اس کوشش میں رہتے کہ پرانی دشمنیوں کو پھر سے زندہ کریں اور انصار اور مہاجرین کے درمیان پھوٹ ڈالیں۔ غزوہ احزاب کے بعد رسول اللہؐ کو خبریں پہنچیں کہ بعض قبائل شکست کے غصے میں پھر سے کوئی شرارت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ نے ان کی سرکوبی کا فیصلہ کیا۔ آپ نے بنولحیان پر حملہ کیا جو مکہ کے راستہ میں آباد تھے۔ یہ لوگ پہاڑوں میں تتر بتر ہو گئے۔ اس کے بعد غطفان کے کچھ لوگوں نے حضورؐ کی چراگاہ پر حملہ کر کے آپ کے اونٹ ہانک لیے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور رسول اللہؐ بھی ایک دستے کے ساتھ نکلے اور جانور چھڑائے۔ اسی طرح مکہ کے راستے میں بنو مصطلق آباد تھے۔ ان کے بارے میں جنگ کی تیاری کی اطلاعات حضورؐ کو پہنچیں تو آپ نے کچھ

نفری کے ساتھ ان پر حملہ کیا۔ بنو مصطلق نے جو لوگ مختلف قبائل سے جمع کیے ہوئے تھے وہ حملہ کی خبر سن کر بھاگ نکلے اور بنو مصطلق تنہا رہ گئے۔ مقابلہ ہوا جس میں دشمن کو شکست ہوئی۔ ان کے لوگ اسیر ہوئے اور مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اسی موقع پر مریسیع کے چشمہ پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ وہاں پانی لینے میں ایک مہاجر اور ایک انصاری کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ مہاجر نے انصاری کو تھپڑ رسید کر دیا جس کے نتیجہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان تو تکار شروع ہو گئی۔ عبداللہ بن ابی نے اس موقع پر انصار کے جذبات بھڑکانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس نے کہا کہ "یہ ہمارے گھر میں پناہ پا کر اب ہمیں پر غرانے لگے ہیں۔ سچ کہا ہے جس نے کہا ہے کہ کتے کو موٹا کرو تو بالآخر تمہی کو کاٹے گا۔ خدا کی قسم! اب ہم مدینہ کو پلٹے تو جو باعزت ہیں وہ رذیلوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے"۔ اس نے انصار کو مخاطب کر کے یہ بھی کہا کہ "یہ تمہاری اپنی غلطی کا خمیازہ ہے جو تمہیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ تم نے اپنے گھر میں ان کو اتارا اور اپنے مال میں ان کو حصہ دار بنایا۔ خدا کی قسم! اگر تم ان کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیتے تو یہ کب کے یہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے"۔

عبداللہ بن ابی کا اشارہ باعزت لوگوں سے انصار کی طرف اور رذیلوں سے مہاجرین کی طرف تھا۔ اور اس کی اپیل جاہلیت کے زمانہ کے اہل عرب کی سی تھی کہ اس سرزمین پر ہم ہمیشہ عزت و اقتدار والے رہے ہیں اور یہ ہمارا حق ہے۔ ہم یہ کس طرح گوارا کر سکتے ہیں کہ جو ہمارے ہاں پناہ لینے آئیں وہ ہمارے آدمیوں کو آنکھیں دکھائیں۔ سورہ منافقون میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

> هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا. وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ. يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ. وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ. (المنافقون۶۳: ۷۔۸)
>
> یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر تم لوگ اپنے مال خرچ نہ کرو جو رسول اللہ کے ساتھ ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جائیں۔ اور اللہ ہی کے ہیں آسمانوں اور زمین کے خزانے لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ کو لوٹے تو جو غالب ہیں وہ وہاں سے ان کو نکال باہر کریں گے جو بے حیثیت ہیں۔ حالانکہ غلبہ اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے لیکن یہ منافقین نہیں جانتے۔

اس غزوہ میں جو قیدی ہاتھ آئے ان میں سردار قبیلہ حارث بن ابی ضرار کی بیٹی جویریہ بھی تھیں۔ یہ ایک صحابی ثابت بن قیسؓ کے حصہ میں آئیں تو ان سے کہا کہ تم زرفدیہ کا تعین کر لو اور مجھے آزاد کر دو۔ انہوں نے اس بات سے اتفاق کر لیا۔ جویریہ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنا تعارف کرایا کہ میں سردار قوم کی بیٹی ہوں۔ مجھے جن صاحب کی غلامی میں دیا گیا ہے میں نے ان سے اتنے زرفدیہ پر مکاتبت کر لی ہے۔ اس معاملہ میں

آپ سے امداد چاہتی ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارے ساتھ اگر اس سے بہتر برتاؤ کیا جائے تو قبول کر لو گی۔ انہوں نے پوچھا، وہ کیا برتاؤ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تمہارا زرِ فدیہ ادا کر کے تمہیں آزاد کر دیتا ہوں اور تمہیں اپنی زوجیت میں لے لیتا ہوں۔ جویریہ نے یہ فیصلہ منظور کر لیا۔ یہ خبر صحابہ تک پہنچی تو انہوں نے بنو مصطلق کے حضورؐ کے سسرال بن جانے کی رعایت سے سب غلام آزاد کر دیے۔

یہود کے جرائم:

آنحضرتؐ کے خلاف یہود کی ریشہ دوانیاں اتفاقی یا عارضی نہ تھیں بلکہ ان کی اس عادت کا مظہر تھیں جس کا مظاہرہ زمانہ قدیم سے وہ کرتے رہے تھے اور جس کے باعث یہود کو انبیائے بنی اسرائیل نے ہمیشہ لعنت کا مستحق قرار دیا۔ قرآن مجید نے خاص طور پر یہود پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لعنت کا حوالہ دیا ہے۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھنے اور فرعون کی ہلاکت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے باوجود ایک بچھڑے کو معبود بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔ کوہ طور کو ان کے سروں پر لٹکا کر اللہ تعالیٰ نے ان سے میثاق لیا اور ان کو عاجزی و فروتنی اختیار کرنے کی ہدایت کی لیکن انہوں نے کسی عہد و پیمان کی پروا نہ کی۔ انہوں نے ہر عہد کو توڑا، اللہ کے احکام کو نظر انداز کیا، انبیاء و مصلحین کو بے گناہ قتل کیا اور ان کی دعوت کی طرف سے اپنے دل بند کر لیے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کے خانوادے کی عفیفہ خاتون مریم علیہا السلام پر بدکاری کی تہمت لگائی اور حضرت مسیح علیہ السلام کی رسالت سے واقف ہونے کے باوجود ان کے قتل کی نہ صرف تدبیریں کیں بلکہ انکے قتل کے مدعی بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے نفس پر جو ظلم ڈھائے ان کی بدولت شریعت میں حلال کردہ چیزوں کو اپنے لیے حرام کروا لیا۔ ہر دور میں یہ لوگوں کو حق سے روکنے کی تدبیریں کرتے رہے اور اس سلسلہ میں ان کی ریشہ دوانیاں ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ سود سے ان کو واضح الفاظ میں منع کر دیا گیا تھا لیکن یہ اس سے باز نہ آئے اور دنیا کی حرص کی بدولت اس کی بدسے بدترین شکلیں رائج کیں۔ مال و دولت سمیٹنے کے یہ اتنے رسیا رہے کہ ان کے ہاں حرام اور حلال میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ یہ ناجائز طریقوں سے لوگوں کے مال ہڑپ کرنے میں کوئی قباحت نہ سمجھتے۔ جن لوگوں کا سابقہ ریکارڈ اس قدر گھناؤنا ہو ان سے کیسے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اسلام کو آگے بڑھ کر قبول کر لیں گے اور قرآن پر ایمان لائیں گے۔

تاہم قرآن مجید نے نبی ﷺ کو یہ ہدایت دی کہ وہ یہود و نصاریٰ دونوں گروہوں تک یہ پیغام پہنچائیں کہ یہ دونوں گروہ جب تک تورات اور انجیل کی تعلیمات کو زندگی کے معاملات میں دخیل ہونے کا موقع نہیں دیں

گے اور اپنی انفرادی واجتماعی زندگی ان کے احکام وقوانین کے مطابق بسر نہیں کریں گے، بالخصوص نبی آخرالزماں کے بارے میں پیشینگوئیوں کے تقاضے پورے نہیں کریں گے تو ان کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔ خدا کے ساتھ کسی کو نسبت کسی گروہ سے تعلق کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایمان کے تقاضے پورے کرنے اور نیک عمل کرنے کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے اور اس سے یہ دونوں گروہ محروم ہو چکے ہیں۔

چونکہ مدینہ کے یہودی قبائل اپنے صحیفوں کی تعلیم کی ذمہ داریاں ادا کرنے سے قاصر رہے اور فساد سے باز نہیں آتے تھے اس لیے نبی ﷺ نے ان کو اللہ اور رسول کے خلاف نبرد آزما ہو جانے والوں اور ملک میں فساد پھیلانے والوں، یعنی محاربین کی صف میں شمار کرتے ہوئے ان کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا۔ بعد ازاں اہل کتاب کے بارے میں قرآن نے ایک مستقل پالیسی دے دی جس کے تحت وہ جزیہ ادا کر کے ذمیوں کی حیثیت سے اسلامی حکومت میں رہ سکتے تھے۔ فرمایا:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ. (توبہ۹:۲۹)

ان اہل کتاب سے، جو نہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے، نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام ٹھہرائے ہوئے کو حرام ٹھہراتے اور نہ دین حق کی پیروی کرتے، جنگ کرو تا آنکہ وہ مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں اور ماتحت بن کر زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں۔

باب 36

فتح مبین (معاہدہ حدیبیہ)

یہود اور قریش کی اجتماعی منصوبہ بندی سے ہونے والی جنگ احزاب کا بالکل لا حاصل رہنا ان دونوں طاقتوں کے لیے بڑی خفت کا باعث ہوا۔ قریش اب مسلمانوں کو زیر کرنے کے امکانات معدوم پاتے تھے۔ وہ پورے عرب کو متحرک کر کے جن وسائل کی مدد سے مدینہ پر حملہ آور ہو کر ہزیمت اٹھا چکے تھے ان وسائل کو دوبارہ فراہم کرنا آسان نہ تھا۔ اگر ایسا کرنا ممکن بھی ہوتا تو ایک مرتبہ ناکام ہونے کے بعد بالکل ویسی ہی دوسری کارروائی کے لیے کوئی عزم و حوصلہ کہاں سے لاتا جبکہ اس کے ثمر آور ہونے کا کسی کو یقین نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ احزاب کے بعد کے عرصہ میں قریش کچھ غیر متحرک نظر آتے ہیں۔

قریش کے برعکس مسلمانوں نے اس جنگ سے مثبت نتائج حاصل کیے اور یہ مہم ان کے لیے ایک نعمت ثابت ہوئی۔ اس کی بدولت مدینہ کے نواح میں مقیم واحد یہودی قبیلہ بنو قریظہ کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ منافقین کے اس گروہ کی منافقت ہر کسی پر عیاں ہو گئی جس نے جنگ کے دوران پانچویں کالم کا کردار ادا کر کے مسلمانوں کو زک پہنچانے کی کوشش کی تھی اور اس مہم کے احوال و نتائج نے حقیقی اہل ایمان کے اندر اسلام کے ساتھ وابستگی اور نصرت خداوندی پر اعتماد میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔

خیبر کے یہود ابھی حالات سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔ وہ برابر سازشوں کا تانا بانا بننے میں مصروف رہے اگرچہ اس میں ان کو کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

نبی ﷺ کا عزم عمرہ:

جنگ احزاب کے ایک سال بعد حالات نے یکا یک ایک غیر معمولی رخ اختیار کر لیا جس کی توقع نہ مسلمانوں کو تھی، نہ قریش کو اور نہ یہود کو۔ ہوا یوں کہ نبی ﷺ نے ایک رویا دیکھی کہ آپ اپنے صحابہ کے ہمراہ مسجد حرام میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے بعد سر کے بال منڈواتے ہیں۔ مسجد حرام کے تعلق سے سر کے بال

منڈوانا عمرہ کی ادائیگی کا قرینہ ہے۔ لہٰذا نبی ﷺ نے اس رویا سے اس بات کی بشارت حاصل کی کہ آپ اپنے صحابہ کے ہمراہ عمرہ ادا کریں گے اور مناسک کی تکمیل کریں گے۔ اگر چہ قریش نے مسلمانوں پر بیت اللہ کے دروازے بند کر رکھے تھے، اور ان کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات کی نوعیت بھی ایسی نہ تھی کہ مکہ کے لیے رخت سفر باندھا جاتا لیکن رویا کو اشارہ خداوندی سمجھتے ہوئے آنحضرتؐ نے مدینہ اور اطراف مدینہ کے مسلمانوں میں منادی کرادی کہ آپ آئندہ محترم مہینہ ذی قعدہ میں عمرہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں لہٰذا تمام مسلمان اس سفر میں آپ کا ساتھ دیں۔

رویا کی روشنی میں آنحضرتؐ کا یہ فیصلہ جذباتی تھا نہ عاجلانہ، بلکہ اس سے حکم خداوندی کی تعمیل مقصود تھی۔ پیغمبر کی رویا وحی کی ایک شکل ہوتی ہے اگر چہ اس طریقہ وحی میں بعض تفصیلات مبہم ہوتی ہیں جن کی مراد بعد میں ظاہر ہوتی ہے۔ تاہم پیغمبر رویا کو اشارہ غیبی سمجھنے اور اس کے مطابق اقدام کرنے پر مامور ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رویا میں یہ دیکھا کہ اپنے فرزند کو خدا کی راہ میں ذبح کر رہے ہیں تو انہوں نے اس کو اشارہ غیبی اور حکم خداوندی سمجھتے ہوئے اس پر عمل درآمد کرنا چاہا لیکن عین وقت پر جب وہ بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے آستین چڑھا چکے تھے ان کو روک دیا گیا۔ وحی کے ذریعہ سے رویا کی حقیقت یہ کھلی کہ اس حکم سے مقصود امتحان تھا نہ کہ حقیقی ذبح۔ رویا کے اشارہ کی صحیح تعبیر فرزند کو بیت اللہ کی خدمت کے لیے وقف کر دینا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حرم کعبہ کی پاسبانی پر مامور کر دیا۔ ٹھیک اسی طرح نبی ﷺ کا مکہ جانے کے لیے تیار ہو جانا حکم خداوندی کی تعمیل میں تھا اور اس کا کوئی سیاسی مقصد نہ تھا۔

مستشرقین جب سیرت نبوی پر قلم اٹھاتے ہیں تو دور کی کوڑیاں لاتے ہیں۔ مشہور مستشرق منٹگمری واٹ اپنی کتاب "محمد مدینہ میں" (Muhammad At Medina) کے مبحث حدیبیہ میں لکھتا ہے کہ عمرہ کے اس سفر کا مقصد عربوں پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ اسلام کوئی بیرونی مذہب نہیں جس کی جڑیں عرب میں نہ ہوں۔ اس کی جڑیں مکہ میں ہیں اور مسلمان حج وعمرہ کی عبادات میں اسی طرح دلچسپی رکھتے ہیں جس طرح دوسرے عرب۔ لہٰذا اسلام اگر غالب آ گیا تو اس سے مکہ کی مرکزیت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ واٹ کی اس قیاس آرائی کا جواز اس صورت میں تسلیم کیا جا سکتا تھا جب اسلام میں حج وعمرہ کی عبادات یا مکہ کی مرکزیت کے بارے میں اسلام کی پالیسی پہلی مرتبہ نبی ﷺ کے اس سفر ہی سے اخذ کی جا رہی ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے کئی سال پہلے مکی دور کی سورتوں ہی میں قریش کو اس بات کا مجرم

ٹھہرایا تھا کہ انہوں نے اپنے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قائم کردہ مرکز توحید کو شرک کا گڑھ بنا رکھا ہے اور بیت اللہ کی عبادات کا حلیہ بگاڑ کر ان کو رسوم کی حیثیت دے دی ہے۔ لہٰذا قریش کی حیثیت ایک خائن گروہ کی ہے جو بیت اللہ کے وسائل پر قابض ہو بیٹھا ہے۔ اس کے بعد ہجرت کے پہلے سال ہی میں بیت اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دے کر اس کو ملت اسلامیہ کا مرکز بنا دیا گیا تھا اور اس سے متعلق عبادات میں مناسب اصلاحات بھی کر دی گئیں۔ نیز اس کو خائنوں کے تسلط سے آزاد کرنے کی غرض سے مسلح جدوجہد کا حکم دیا گیا۔ یہ تمام امور سورہ بقرہ میں زیر بحث آئے ہیں جس کا نزول ہجرت کے فوراً بعد ہوا۔ بدر، احد اور خندق کے معرکے اس کے بعد پیش آئے۔ لہٰذا اوات پر یہ بات واضح ہو یا نہ ہو، عربوں پر بالکل واضح تھی کہ مسلمانوں کا مرکز بیت اللہ ہے اور وہ ملت ابراہیمؑ کا احیاء چاہتے ہیں۔

بعض سیرت نگاروں، مثلاً مصر کے حسین ہیکل، نے نبی ﷺ کے سفر کا مقصد حج کرنا بتایا ہے۔ یہ قیاس آرائی بھی کئی اعتبار سے غلط ہے۔ اولاً، یہ معلوم ہے کہ ذی قعدہ شروع ہوتے ہی آنحضرتؐ مکہ کو روانہ ہو گئے۔ اگر حج کے لیے روانگی مقصود ہوتی تو اس کا وقت ذی قعدہ کا اخیر ہوتا تاکہ اڑھائی تین ہفتہ میں سفر سے واپسی ممکن ہو جائے۔ حجۃ الوداع میں حضورؐ نے ایسا ہی نظام الاوقات اختیار کیا۔ ذی قعدہ کے آغاز میں روانہ ہونے سے حج کی صورت میں مرکز سے آنحضرتؐ کی غیر حاضری پچاس پچپن دن کے لگ بھگ ہوتی جو اس پر آشوب زمانہ میں قرین مصلحت نہیں تھی۔ ثانیاً، روایات کے مطابق حدیبیہ میں ہونے والے مذاکرات میں آنحضرتؐ نے اپنا مقصد عمرہ کرنا ہی بیان فرمایا۔ ثالثاً، مقصد سفر کے پورا نہ ہو سکنے کی جو قضا آپ نے آئندہ سال ادا کی وہ عمرہ کی تھی۔ اگر حج کا سفر نا تمام رہا ہوتا تو اس کی قضا بھی حج ہی سے ادا ہوتی۔ لہٰذا صحیح یہی ہے کہ آنحضرتؐ کا نکلنا عمرہ کے لیے تھا نہ کہ حج کے لیے۔

رویا کی روشنی میں آنحضرتؐ کے اعلان اور عزم سفر سے جہاں مخلص مسلمان فرحت و انبساط سے جھوم اٹھے اور عمرہ کی تیاریوں میں لگ گئے وہیں منافقین اور کمزور مسلمان طرح طرح کے اندیشوں میں گرفتار ہو گئے اور حیلے بہانوں سے زحمت سفر سے بچنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ اطراف مدینہ کے منافقین نے تو اس سفر کو خودکشی قرار دیا۔ دستور کے مطابق احرام کی حالت میں ایک زائر سفر کے دوران اپنے دفاع کے لیے ایک تلوار، نیام میں، اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ قریش کی مخاصمت کی پوری تاریخ منافقین کی نظروں کے سامنے تھی۔ وہ جانتے تھے کہ قریش نبی ﷺ کے خون کے پیاسے ہیں اور اپنے مرکز میں نہتے پہنچ جانے والے مسلمانوں کو وہ لقمہ تر سمجھیں گے۔ لہٰذا انہیں یقین نہیں آتا تھا

کہ مسلمان جنگجو قریش کے ہاتھوں موت کے منہ میں جانے سے اپنے آپ کو بچا سکیں گے۔ ان کی پختہ رائے یہی قائم ہوئی کہ مکہ جانے والوں کو گھر پلٹنا نصیب نہیں ہوگا۔ منافقین کی اس بداندیشی کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا. (الفتح ۴۸:۱۲)

بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ رسول اور ان کے ساتھیوں کو اب کبھی اپنے گھر والوں کی طرف لوٹنا نصیب نہ ہوگا اور یہ بات تمہارے دلوں میں رچ بس گئی اور تم نے برے برے گمان کیے اور بالآخر ہلاک ہونے والے بنے۔

بعض مسلمانوں نے اس مہم کو مالی فوائد کے لحاظ سے جانچا۔ ان کا خیال تھا کہ عام جنگوں میں حصہ لینے والوں کو مال غنیمت حاصل ہونے کی توقع ہوتی ہے لیکن یہ سفر پرخطر ہونے کے ساتھ ساتھ مالی فوائد سے بالکل تہی دامن ہے۔ لہٰذا ایسی روکھی پھیکی مہم میں شامل ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ منافقین اور یہ مسلمان سفر سے گریز کی راہ اختیار کر کے اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔

مکہ کے لیے روانگی:

ذی قعدہ ۶ ھ کا محترم مہینہ شروع ہوتے ہی نبی ﷺ نے کوچ کا حکم دیا تو چودہ یا پندرہ سو مخلص مسلمانوں نے آپ کی معیت اختیار کی۔ بیت اللہ کے پاس قربان کرنے کے لیے ستر اونٹ ساتھ تھے۔ ان کی گردنوں میں، دستور کے مطابق، پٹے ڈال دیے گئے جو اس بات کی علامت تھے کہ یہ جانور نذر کے ہیں۔ ذوالحلیفہ کی میقات پر پوری جمعیت نے عمرہ کا احرام باندھا اور یہ قافلہ مکہ کو روانہ ہوا۔ بسر بن سفیان کعبیؓ کو جاسوسی کے لیے آگے روانہ کر دیا گیا تاکہ دشمن کی طرف سے کوئی قابل ذکر اقدام ہو تو بروقت اس کی خبر دیں۔ دستور کے مطابق ہر زائر کے پاس ایک تلوار نیام میں موجود تھی۔ اس کے سوا کوئی اسلحہ جنگ نہ تھا۔

مکہ سے دو منزل پہلے عسفان کے مقام پر مخبر نے اطلاع دی کہ قریش نے مسلمانوں کے بارے میں بدگمانی سے کام لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمان عمرہ کے بہانے مکہ پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ چونکہ مسلمان اور قریش حالت جنگ میں ہیں لہٰذا قریش نے حلف اٹھایا ہے کہ وہ مسلمانوں کو کسی قیمت پر مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ وہ خود بھی جنگ کے لیے تیار ہیں اور انہوں نے اپنے حلیف قبائل کے جنگجو لشکر --احابیش-- کو بھی طلب کر لیا

ہے۔ ابتدائی اقدام کے طور پر خالد بن ولید کی زیر کمان دو سو گھڑ سواروں کا ایک دستہ ذوطویٰ میں متعین کر دیا گیا ہے۔ روایات کے مطابق یہ خبر سن کر نبی ﷺ نے نہایت غم ویاس کے ساتھ فرمایا۔ ''قریش پر افسوس ہے۔ جنگی جنون نے ان کو برباد کر دیا۔ پھر بھی انہوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ میرے درمیان اور عربوں کے درمیان حائل نہ ہوتے۔ اس سے ان کا کچھ نہ بگڑتا۔ اگر عرب مجھے قتل کر دیتے تو قریش کی مراد پوری ہو جاتی۔ اگر اللہ تعالیٰ مجھے عربوں پر غلبہ عطا فرما دیتا تو قریش اسلام میں جوق در جوق داخل ہو جاتے۔ اور اگر اسلام قبول نہ کرنا چاہتے تو جنگ کی راہ اختیار کر لیتے جس کی طاقت وہ رکھتے ہیں۔ میرے بارے میں انہیں سخت بدگمانی ہے۔ بخدا میں اس پیغام کے ساتھ جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے، ان سے برابر کشمکش کرتا رہوں گا یہاں تک کہ اللہ اس کو غالب کر دے یا میری گردن کٹ جائے''۔[11]

آنحضرتؐ کے یہ جملے شدید تاثر لیے ہوئے ہیں۔ آپ کے اندر اپنی قوم کے لیے جو شفقت اور قرابت داری کی محبت موجزن تھی ان جملوں میں اس کا اظہار بھی ہے اور قریش کی نادانی اور مصلحت نا اندیشی پر گہرا افسوس بھی۔ اس کے باوجود آپ نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے لیے عزم بالجزم کا برملا اظہار فرمایا ہے، کیونکہ اس پر کوئی سمجھوتہ ممکن نہ تھا۔

حدود حرم میں داخلہ:

مخبر کی اطلاع کی روشنی میں نبی ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ رائے یہ ہوئی کہ آگے جانے کے لیے شاہراہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیا جائے۔ ایک واقف کار ساتھی کی رہنمائی میں آپ شاہراہ کے دائیں طرف مڑ گئے اور دشوار گزار پہاڑیوں اور سنگلاخ علاقے سے گزرتے ہوئے راتوں رات حدیبیہ کے میدان میں جا پہنچے جو مکہ کی وادی میں شہر سے صرف نو میل دور ہے اور جہاں سے حدود حرم کا آغاز ہوتا ہے (آج کل یہ مقام شمیسیہ کہلاتا ہے۔ مکہ میں داخلہ سے پہلے زائرین کے کاغذات یہاں چیک کیے جاتے ہیں) یہ ایک خدا ساز بات ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اگر قافلہ شاہراہ کو نہ چھوڑتا تو مکہ سے دو منزل دور ہی اسے روک دیا جاتا، مڈبھیڑ بھی عین متوقع تھی اور حرم میں حاضری کی حسرت دلوں ہی میں رہ جاتی۔ قافلے کا رخ تبدیل کر کے اللہ تعالیٰ نے قریش کے ساتھ مڈبھیڑ کا خطرہ ٹال دیا اور قافلے کو بے روک ٹوک ایک ایسی جگہ پہنچا دیا جو حدود حرم میں شامل تھی۔ یہاں پہنچ کر اہل ایمان کو ایک گونہ تسکین میسر آ گئی کہ اگر وہ عین حرم میں نہیں پہنچے تو کم از کم حرم کی حدود میں ہیں۔ اس مقام میں جنگ کا خطرہ

بھی کم ہو گیا کیونکہ عرب دستور کے مطابق حدود حرم میں جنگ جائز نہ تھی۔ اگر قریش اس دستور کی خلاف ورزی کرتے تو سارے عرب میں مطعون ہو جاتے۔ لہٰذا یہاں مسلمانوں کو دوہرا تحفظ حاصل تھا۔ ایک محترم مہینہ کا اور دوسرا حدود حرم میں ہونے کا۔ اب وہ قریش کے حملوں سے محفوظ و مامون تھے۔

روایات کے مطابق حدیبیہ پہنچ کر نبی ﷺ کی اونٹنی القصواء رک گئی اور کوشش کے باوجود اس نے قدم آگے نہیں بڑھائے۔ لوگوں نے اس کو ایک اڑیل جانور کی ضد پر محمول کیا لیکن آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ضد کرنا القصواء کی فطرت میں نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے جس خدا نے ہاتھیوں کے قدم روک دیے تھے اسی خدا نے اونٹنی کے قدم بھی روک دیئے ہیں۔ لہٰذا تمام لوگ یہیں منزل کریں۔ اللہ کی قسم آج یہ لوگ مجھ سے جو مطالبہ بھی کریں گے جس سے اللہ کی محترم ٹھہرائی ہوئی کسی چیز کی تعظیم مقصود ہو تو میں اس سے دریغ نہیں کروں گا[1]۔ حضورؐ کا اشارہ اصحاب الفیل کے واقعہ کی طرف تھا جو تقریباً ساٹھ سال قبل پیش آیا تھا۔ اس وقت یمن کے حکمران ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کی۔ اس کا لشکر پیش قدمی کرتا ہوا جب منیٰ میں پہنچا تو فوج میں شامل ہاتھی وادی محسر میں بیٹھ گئے اور کوشش کے باوجود اٹھنے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کے تقدس کی پامالی کی راہ روکنے کے لیے ان کے قدم روک دیے تھے۔ القصواء کے رکنے سے آنحضرتؐ نے یہ نتیجہ اخذ فرمایا کہ حدیبیہ سے مسلمانوں کی پیش قدمی کی صورت میں قریش آمادہ جنگ ہو جائیں گے اور بیت اللہ کی حرمت کو پامال کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ لہٰذا خدا کے گھر کے تقدس کی خاطر آپ نے وہیں پڑاؤ کا حکم دیا۔ بعد کے حالات سے معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ کا اندیشہ سو فی صد درست تھا۔

ادھر عسفان کی طرف بڑھنے والے قریشی دستہ کے علم میں جب یہ بات آئی کہ مسلمانوں کا قافلہ راستہ تبدیل کر کے دائیں جانب کو مڑ گیا ہے تو وہ فی الفور شہر کے دفاع کے لیے مکہ کو لوٹے۔ جب معلوم ہوا کہ مسلمان حدیبیہ پہنچ چکے ہیں تو وہ بھی حدیبیہ کی طرف منتقل ہو گئے۔ ان کی ایک جمعیت نگرانی کے لیے مسلمان کیمپ کے اردگرد برابر موجود رہی۔ القصواء کے قدم رکنے کے غیبی اشارے اور قریش کی جانب سے مزاحمت کے واضح امکان کو دیکھتے ہوئے نبی ﷺ نے قریش کے معاندانہ رویہ اور سخت موقف کے جواب میں اپنے موقف میں لچک پیدا کرنے کا عندیہ دیا۔ اس کی بنیادی وجہ کمزوری نہ تھی بلکہ اللہ کے شعائر کی تعظیم کا وہ جذبہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے ایمان وتقویٰ کا تقاضا بتایا ہے:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ. (حج ۲۲:۳۲)

اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یاد رکھے کہ یہ چیز دل کے تقویٰ سے تعلق رکھنے والی ہے۔

یہ آیت بیت اللہ اور حج و عمرہ کے حقوق ہی کے سلسلہ میں پہلے نازل ہو چکی تھی۔

قریش کے ساتھ رابطے:

حدیبیہ میں مسلمانوں کے بعض خیر خواہوں نے بنوخزاعہ کے سردار بدیل بن ورقاء کی قیادت میں نبی ﷺ سے ملاقات کی تا کہ آپ کو قریش کے ارادوں سے مطلع کریں اور آنحضرتؐ کا عندیہ معلوم کریں۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارا ارادہ محض عمرہ ادا کرنے کا ہے۔ ہم اس کے مناسک سے فارغ ہوتے ہی مدینہ کو لوٹ جائیں گے۔ بدیل نے بتایا کہ قریش نے اس بات کا حلف اٹھا رکھا ہے کہ وہ مسلمانوں کو حرم میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اس کے لیے وہ لڑنے مرنے کو تیار ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میرا ارادہ جنگ بازی کا نہیں ہے۔ قریش کو محاذ آرائی کی پالیسی نے اب تک بہت نقصان پہنچایا ہے۔ وہ اگر میرے اور عرب کے درمیان حائل نہ ہونے کی کوئی مدت ٹھہرا لیں تو قرابت داری کی محبت کے تحت میں ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اگر وہ ہم پر جنگ مسلط کریں گے تو چاروناچار ہمیں بھی تلوار بے نیام کرنی پڑے گی اور وہ ہمیں اس کے لیے بھی تیار پائیں گے۔

بدیل قریش کے اکابر کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے مکہ گیا۔ ابھی وہ ملاقات کی روداد بتانا ہی چاہتا تھا کہ ان کے جذباتی لیڈر عکرمہ بن ابی جہل اور حکم بن العاص سیخ پا ہو کر کہنے لگے۔ ہمیں یہ سننے کی ضرورت نہیں کہ تم ان کی کیا خبر لائے ہو، البتہ ان کو ہمارا پیغام پہنچا دو کہ جب تک ہمارا ایک فرد بھی موجود ہے مسلمان مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس پر ثقیف کے ایک سردار عروہ بن مسعود نے ان کو سخت سست کہا اور بتایا کہ اس طرح کے جذباتی فیصلے کرنے والی قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بدیل کی بات تو سنو۔ پسند آئے تو قبول کرنا ورنہ رد کر دینا۔ اس پر دوسرے لیڈروں نے بدیل کی ملاقات کی تفصیل معلوم کی۔ اس پر عروہ کا تبصرہ یہ تھا کہ محمدؐ نے اچھی پیشکش کی ہے جس کو قبول کر لینا چاہیے۔ قریش کے لیڈروں نے سمجھوتہ کی بات کو مسلمانوں کی کمزوری پر محمول کیا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مسلمانوں پر دباؤ بڑھانے اور ان کو خوفزدہ کرنے کی پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، جیسا کہ بعد کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے۔

اس صورت حالات کا صحیح جائزہ خود لینے کے لیے قریش کے بازوئے شمشیر زن --- احابیش --- کے سردار

حلیس بن علقمہ نے حدیبیہ کا قصد کیا۔ اس نے تمام مسلمانوں کو حالت احرام میں پایا۔ قربانی کے جانور علامتی پٹے پہنے ہوئے قطار در قطار کھڑے تھے۔ پورے کیمپ میں جنگی عزائم کا کوئی ادنیٰ ثبوت بھی نہیں ملتا تھا۔ حلیس کو مسلمانوں کے ارادہ عمرہ کے سچے ہونے کا یقین آ گیا۔ اس کی مذہبیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ ڈیڑھ ہزار انسانوں کو مناسک سے اور کثیر تعداد میں ہدی کے جانوروں کو بیت اللہ کی نذر ہونے سے روک دیا جائے۔ اس نے مکہ واپس آ کر قریشی لیڈروں کو اپنے تاثر سے آگاہ کیا تو انہوں نے اس کو حلیس کی سادہ لوحی پر محمول کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔ اس نے بپھر کر کہا کہ ہم نے تمہارے ساتھ ہو کر لڑنے کا معاہدہ اس لیے نہیں کیا کہ کوئی شخص اگر بیت اللہ کی تعظیم کے ارادہ سے بھی آئے تو تم اس کی راہ میں مزاحم ہو جاؤ۔ بخدا، تمہیں محمدؐ کو عمرہ کی اجازت دینی ہوگی ورنہ میں اپنا ایک ایک سپاہی لے کر تم سے علیحدہ ہو جاؤں گا۔ قریش اپنی صفوں میں اختلاف پیدا ہوتے دیکھ کر متفکر ہوئے، حلیس کو ٹھنڈا کیا اور وعدہ کیا کہ ہم محمدؐ سے مذاکرات کی راہ نکالیں گے اور قابل قبول شرائط پر اس سے معاہدہ کی کوشش کریں گے۔

نبی ﷺ سے گفت وشنید کا آغاز کرنے کے لیے عروہ بن مسعود ثقفی کا انتخاب ہوا۔ اس نے مذاکرات شروع کیے تو قریش کی طے کردہ پالیسی کے مطابق اس نے مسلمانوں کی تحقیر اور ان کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے قریش کی جنگی تیاریوں اور یکجہتی کے ساتھ آمادۂ جنگ ہونے کا ذکر کیا۔ صحابہ کرامؓ پر یہ بھی پھبتی کسی کہ یہ بھانت بھانت کے لوگ مشکل صورت حال میں تمہارا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ عروہ نے قریش کے ساتھ نبی ﷺ کے قوی و خاندانی روابط کا حوالہ دیا اور یہ مشورہ دیا کہ اپنی آمد کے پرامن ہونے کا یقین دلانے کے لیے قریش کے پاس اپنا کوئی نمائندہ بھیجو۔[3]

عروہ کے انداز گفتگو سے صحابہ کرامؓ بے حد برافروختہ ہوئے اور انہوں نے اس کو تحقیر کے ساتھ جواب دیا۔ نبی ﷺ نے عروہ پر اپنا وہی موقف واضح کیا جو بدیل کے سامنے پیش کر چکے تھے۔ عروہ پر صحابہؓ کی آنحضرتؐ کے لیے غیر معمولی تعظیم اور جاں نثاری کا خاص طور پر اثر پڑا۔ اس نے مشورہ دیا کہ رسول اللہؐ اپنا نمائندہ مکہ بھیجیں جو ان کا نقطہ نظر قریش کے سامنے پیش کرے۔ مکہ جا کر اس نے تمام کوائف بیان کیے اور مشورہ دیا کہ قریش معاملے کو سہل انگاری کے ساتھ نہ لیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ٹکر لینے کے نتائج و عواقب پر اچھی طرح غور کر لیں۔ محمدؐ نے صلح کی جو پیشکش کی ہے وہ لائق توجہ ہے۔ اس کو رد کرنا مناسب نہ ہوگا۔

عروہ کے مشورہ کے مطابق نبی ﷺ نے خراش بن امیہ الخزاعی کو اپنا نمائندہ بنا کر قریش کے پاس بھیجا۔ وہ مکہ گئے تو جذباتی نوجوانوں نے ان کی اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں اور خود ان پر بھی حملہ کیا گیا۔ احابیش نے مداخلت کرکے ان کو بچایا اور وہ اپنے کیمپ کو لوٹ آئے۔ نبی ﷺ نے محسوس کیا کہ قریش کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے سفارت قریش ہی کے کسی فرد کے سپرد کرنا مناسب ہوگا۔ قریش کی قدیم اور روایتی تقسیم کار کے لحاظ سے منصب سفارت کے لیے بنوعدی کا انتخاب ہوتا تھا۔ اس روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو، جن کا تعلق بنوعدی سے تھا، مکہ جانے کا حکم دیا۔ انہوں نے یہ رائے دی کہ قریش کو خاص ان کی ذات سے بڑی شکایات ہیں لہٰذا وہ ان کے ساتھ بات کرنے میں تعصب سے کام لیں گے۔ نیز قریش کے مشتعل جذبات کو دیکھتے ہوئے مذاکرات کے لیے ایسا آدمی بھیجنا چاہیے جس کے ہم قبیلہ وہاں اس کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے موجود ہوں۔ اس وقت مکہ میں بنوعدی کا کوئی مضبوط آدمی نہیں ہے جو ان کو پناہ فراہم کر سکتا ہو۔ یہ مشورہ نہایت صائب تھا۔ چنانچہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہوا۔ ان کا تعلق بنوامیہ سے تھا اور قریش کی سرداری اسی قبیلہ کے پاس تھی۔ حضرت عثمانؓ مکہ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ان کی ملاقات اپنے ایک خیر خواہ و ہم قبیلہ ابان بن سعید بن العاص سے ہو گئی۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ کو اپنی پناہ میں لے لیا اور قریش کے لیڈروں سے ان کی ملاقات کرائی۔ قریش نے اپنے فیصلہ کے مطابق جواب دیا کہ وہ اس سال کسی قیمت پر مسلمانوں کو عمرہ کی اجازت نہیں دیں گے لیکن حضرت عثمانؓ کے لیے ایسی کوئی قدغن نہیں ہے، وہ اپنے مناسک ادا کر سکتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ جب پیغمبر ﷺ کو عمرہ سے روکا جا رہا ہے تو وہ ان کے بغیر عمرہ نہیں کریں گے۔

بیعت رضوان:

عروہ کی دھمکی آمیز گفتگو اور خراشؓ کی اونٹنی اور خود ان پر حملہ سے قریش نے مسلمانوں کو مرعوب و خوفزدہ کرنے کی جو کوشش کی تھی اس کو مزید سنجیدہ بنانے کے لیے انہوں نے حضرت عثمانؓ کی آمد سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ انہوں نے ان کے ساتھ مذاکرات کو غیر ضروری طور پر طول دیا اور ساتھ ہی مسلمان کیمپ میں یہ افواہ پھیلا دی کہ عثمانؓ کو مکہ میں قتل کر دیا گیا ہے۔ سیرت نگاروں نے اگرچہ متعین طور پر یہ نہیں بتایا کہ یہ افواہ کس نے پھیلائی لیکن قرائن اس کا ذمہ دار قریش کو ٹھہراتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے کیمپ میں از خود یہ بات نہیں پھیل سکتی تھی۔ کیونکہ اولاً، وہ تو ایک طرح محاصرہ کی حالت میں تھے۔ وہ اپنی مرضی سے گھوم پھر بھی نہیں سکتے تھے چہ جائیکہ مکہ کے

حالات سے باخبر ہوتے۔ نیز اہل ایمان کی تربیت جس طرز پر ہوئی تھی اس میں ہر شخص نہایت ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرتا اور ہر معاملے میں نبی ﷺ سے رہنمائی لیتا تھا۔ ثانیاً، افواہ سازی کا فن جن منافقین کو آتا تھا وہ اس سفر میں شریک نہ ہوئے تھے اور یہ جمعیت خالص و مخلص مسلمانوں کی تھی۔ ثالثاً، قریش کی طرف سے متعین کردہ لوگ مسلمان کیمپ کی نگرانی اور ان سے چھیڑ چھاڑ کے لیے برابر ان کے پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ ان کے ذریعے کوئی بھی افواہ پھیلانا نہایت آسان کام تھا اور قریش کے اب تک کے معاندانہ رویہ کے تسلسل میں ایسی کارروائی بالکل متوقع تھی۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ قریش ہی کے منصوبہ سازوں نے یہ افواہ پھیلائی۔ جونہی یہ خبر مسلمانوں میں پھیلی اس کے درست ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہوا۔

قریش نے تو یہ افواہ مسلمانوں کو مزید خوفزدہ کرنے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے پھیلائی لیکن اس کا اثر ان کی توقع کے برعکس ظاہر ہوا۔ بجائے اس کے کہ مسلمان خطرہ کے علاقہ سے بھاگنے کی تدبیریں کرتے، ہر شخص غصہ سے آگ بگولا ہو گیا اور انتقام انتقام پکارنے لگا۔ صحابہ کرامؓ کے اشتعال کو قابو میں رکھنے کے لیے نبی ﷺ کیکر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور اس بات پر مسلمانوں سے بیعت لینی شروع کی کہ وہ دشمن سے قتل عثمان کا انتقام لیے بغیر نہیں ٹلیں گے اور اس کے لیے اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ صحابہؓ نے نہایت جوش و خروش اور حمیت دین کے جذبہ سے سرشار ہو کر یہ بیعت کی۔ صورت حال میں اس تبدیلی نے قریش کو معقول رویہ اپنانے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے مذاکرات کو مزید طول دینے کے بجائے حضرت عثمانؓ کو واپس مسلمانوں کے کیمپ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا اور ان سے یہ وعدہ کیا کہ رسول اللہؐ کے ساتھ گفت وشنید اور معاہدہ کرنے کے لیے وہ اپنا نمائندہ بھیجیں گے۔

بیعت کی کارروائی ختم ہونے کے بعد حضرت عثمانؓ صحیح و سالم واپس کیمپ میں پہنچ گئے تو معلوم ہوا کہ یہ افواہ غلط تھی۔ لہٰذا بیعت کے عہد کے تحت اب کسی کارروائی کی ضرورت نہ رہی۔ بہر حال صحابہ کرامؓ کو جو سرخروئی حاصل ہوئی تھی وہ ہمیشہ کے لیے ان کا امتیازی نشان بن چکی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ میں جو بیعت لی اس کا منفرد پہلو یہ تھا کہ یہ غربت و مسافرت میں عین دشمن کے مرکز میں ایسے حالات میں ہوئی جب مسلمان احرام کی پابندیاں اپنے اوپر عاید کیے ہوئے تھے۔ ان کے پاس

صرف تلواریں تھیں۔ نہ زرہیں تھیں، نہ تیر تفنگ اور نہ نیزے بھالے۔ ادھر دشمن پے در پے ایسے اشارے دے رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہر زیادتی روا رکھے گا۔ بیعت کرتے ہوئے اہلِ ایمان کے پاس طاقت کا جو سرمایہ تھا وہ اللہ کی طرف توجہ و انابت، ایمان و یقین، حمیتِ دین اور اللہ کی نصرت پر بھروسہ کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو شرفِ قبول بخشا، حضرات صحابہؓ کے دلوں پر سکینت و طمانیت نازل فرمائی، ان کو اپنی خوشنودی کی سند عطا فرمائی اور مستقبل قریب میں پے در پے کامیابیوں کی بشارت دی۔ قرآن نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَ كَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَ يَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا وَ اُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا۔ (الفتح ۴۸:۱۸۔۲۱)

اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب کہ وہ تم سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے، تو اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا تو اتاری ان پر طمانیت، اور ان کو ایک عنقریب ظاہر ہونے والی فتح سے نوازا، اور بہت سی غنیموں سے بھی جن کو وہ حاصل کریں گے اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ اللہ نے تم سے بہت سی غنیموں کا وعدہ کیا ہے جن کو تم پاؤ گے۔ پس یہ اس نے تم کو فوری طور پر دے دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے کہ یہ (موجب طمانیت) اور مسلمانوں کے لیے نشانی ہو اور تمہیں سیدھی راہ کی ہدایت بخشے۔ اور ایک دوسری فتح کا بھی وعدہ کیا جس پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے لیکن اللہ نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اسلام کی تاریخ میں یہ بیعت، بیعتِ رضوان سے موسوم ہوئی اور مسلم معاشرہ میں ان تمام صحابہؓ کا ہمیشہ کے لیے ایک خاص مقام تسلیم کیا گیا جنہوں نے دین کے لیے جاں نثاری کا یہ عظیم الشان مظاہرہ کیا تھا۔ آیت میں بیان ہوا ہے کہ ان صحابہ کی خود اللہ تعالیٰ نے حوصلہ افزائی فرمائی اور یہی حوصلہ افزائی وہ اصل قوت ہے جس کو کوئی طاقتور سے طاقتور دشمن بھی شکست نہیں دے سکتا۔ بیعت کے نتیجہ میں اہلِ ایمان کو کئی فتوحات سے نوازا گیا جو اگرچہ ابھی درپردہ تھیں لیکن بارگاہِ ایزدی میں ان کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ عنقریب فتح سے اشارہ فتح خیبر کی طرف ہے جو حدیبیہ سے واپسی کے جلد بعد مسلمانوں کو حاصل ہوئی اور وہیں بکثرت مالِ غنیمت بھی ان کے ہاتھ آیا۔ وہ فتح جس کا احاطہ ہو جانے کی بشارت ہوئی، فتح مکہ ہے، جس کا موقع دو سال بعد پیدا ہوا۔

معاہدہ صلح:

بیعت سے پہلے قریش اپنے طور پر مطمئن تھے کہ انہوں نے دھمکیوں سے مسلمانوں کو مرعوب کر کے ان کے قدم مکہ کی جانب بڑھنے سے روک رکھے ہیں اور ان کی پالیسی توقع کے عین مطابق کامیاب رہی ہے۔ اسی لیے ان کے اشارات اور پیغامات سخت سے سخت تر ہوتے گئے۔ اب یکا یک مسلم کیمپ میں انتقام کی فضا اور مرمٹنے پر بیعت کے جوش وخروش سے پیدا ہونے والی ناگہانی صورت حال میں ان کو اپنا کھیل بگڑتا ہوا نظر آیا۔ اس مرحلہ پر اس انتقامی کارروائی کے نتائج خود قریش کے لیے تباہ کن ہو سکتے تھے۔ اس سے عین حدود حرم میں ایک ایسی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا جس میں عمرہ کی نیت سے آنے اور اس کے آداب ملحوظ رکھنے والے ایک فریق ہوتے اور خانہ کعبہ کے متولی اور ان کے حلیف دوسرا فریق ہوتے۔ اس جنگ کے برپا ہونے کا تمام تر الزام قریش پر ہوتا کیونکہ احابیش، بنوخزاعہ اور بنوثقیف تین بڑی سیاسی قوتوں کے سردار اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے یہ رائے قائم کر چکے تھے کہ مسلمانوں کے کوئی جنگی عزائم نہیں ہیں، وہ صرف شعائر اللہ کی تعظیم کے جذبہ سے آئے ہیں، انہوں نے قریش کو معقولیت کی راہ اختیار کرنے پر راضی کرنے کے لیے مصالحت تک کی پیشکش کی ہے لیکن قریش ہیں کہ کسی طرح معقول رویہ اپنانے کو تیار ہی نہیں۔ اگر یہ جنگ ہوتی تو یہ واقعہ قریش کی انانیت، ہٹ دھرمی اور اپنی حیثیت کے ناجائز استعمال کی ایک ایسی دلیل بن جاتا جس سے قریش کی حیثیت عرفی مجروح ہوتی اور ان کے پاس اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ یکسر بدلی ہوئی اس صورت حال میں اب قریش کے لیے اس کے سوا کوئی چارا نہ رہا کہ وہ مشتعل مسلمانوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے صلح کا ہاتھ بڑھائیں تا کہ ان کے سر پر سے جنگ کا خطرہ ٹل جائے اور اگر ممکن ہو تو ان کی بات بھی رہ جائے۔ یہ وہی بات تھی جس کی پیشکش نبی ﷺ پہلے ہی کر چکے تھے۔ قریش نے اب اس کو قبول کیا لیکن بعد از خرابی بسیار۔ صلح کے مذاکرات کے لیے انہوں نے ایک سردار سہیل بن عمرو کو مسلم کیمپ میں بھیجا۔ اس کو آتا دیکھ کر نبی ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے معاملہ آسان کر دیا ہے۔ یہ اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ قریش نے اب اپنی ہٹ چھوڑ کر وہی راہ اپنائی ہے جس کی دعوت آپ کئی روز سے ان کو دے رہے تھے اور اب صلح کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قریش نبی ﷺ کی تکذیب کر رہے تھے اور ان کے ساتھ اب تک کا محاذ آرائی کا رویہ اسی بنا پر تھا کہ رسول کے مکذب ہونے کے باعث قریش کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ممکن نہ تھا تو اس

موقع پر یکایک رویے کی یہ تبدیلی کیسے ممکن ہوگئی۔ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے قریش کی لیڈر شپ کو مطعون کرنے اور ان کو عذاب الٰہی کا مستحق قرار دینے کے باوجود کسی مرحلہ پر ان کے عوام کی اصلاح کی مہلت کو ختم کرنے کا اعلان نہیں کیا۔ حتیٰ کہ سورہ انفال میں، غزوہ بدر پر تبصرہ کرنے کے بعد، جہاں قریش کے خلاف نہایت تند و تیز زبان استعمال کی گئی ہے وہیں ان کو اصلاح کے لیے مزید وقت بھی دیا ہے اور اس ضمن میں یہ ہدایت بھی دی ہے کہ:

وَ اِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ. (انفال ۸:۶۱)

اور اگر وہ مصالحت کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کے لیے جھک جائیو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔

اسی ہدایت کی روشنی میں نبی ﷺ نے صلح کی طرف توجہ دلائی لیکن قریش نے اس کو غلط معنی پہنائے اور سوچ کی تبدیلی کو مسلمانوں کی کمزوری پر محمول کیا۔ وہ محاذ آرائی پر مصر رہے لیکن بیعت رضوان ان کے لیے چشم کشا ثابت ہوئی۔ اب اپنے آپ کو مخمصہ سے نکالنے کے لیے صلح کی پیشکش کو قبول کرنا ان کی مجبوری تھی۔ جب وہ اس کی طرف مائل ہوئے تو نبی ﷺ تو مذکورہ بالا حکم کے تحت مامور ہی تھے کہ وہ اللہ کے بھروسہ پر صلح کر لیں۔ چنانچہ آپ نے سہیل بن عمرو کا خیر مقدم کیا اور سمجھوتہ کے لیے مذاکرات شروع ہو گئے۔

معاہدہ کی شرائط طے کرنے میں قریش کے وفد نے بلاضرورت الجھنیں پیدا کیں اور کوشش کی کہ اپنی بات اونچی رکھیں۔ اس سے ان کی انا کو وقتی طور پر تو تسکین ہوگئی لیکن آگے چل کر وہ اس طرح منوائی جانے والی شرائط سے کوئی سیاسی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ سیرت کی کتابوں اور روایات حدیث کی روشنی میں معاہدہ کے الفاظ کچھ یوں تھے:

''یہ وہ امور ہیں جن پر محمد بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی ہے۔

☆ یہ کہ دونوں نے دس برس کے لیے لوگوں پر سے جنگ کو ہٹانے پر اتفاق کیا ہے۔ اس دوران میں لوگ امن سے رہیں گے اور دونوں فریق ایک دوسرے پر دست درازی سے رک جائیں گے۔

☆ یہ کہ قریش میں سے جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد کے پاس جائے گا وہ اس کو واپس کر دیں گے اور محمدؐ کے ساتھیوں میں سے جو شخص قریش کے پاس جائے گا اس کو واپس نہیں کیا جائے گا۔

☆ یہ کہ ہمارے درمیان ہر طرح کی معاندانہ کارروائیاں بند رہیں گی۔ چوری چھپے یا علانیہ بدعہدی نہیں کی جائے گی۔

☆ یہ کہ جو کوئی محمدؐ کا ساتھ دینے کے لیے معاہدہ میں شامل ہونا چاہے گا ہو سکے گا اور جو کوئی قریش کا ساتھ دینے کے لیے معاہدہ میں داخل ہونا چاہے گا داخل ہو سکے گا۔

☆ یہ کہ تم (رسول اللہ) ہمارے ہاں سے اس سال لوٹ جاؤ گے اور مکہ میں داخل نہ ہو گے لیکن آئندہ سال ہم (قریش) تمہارے آگے سے ہٹ جائیں گے، تم مکہ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ داخل ہو سکو گے، وہاں تین دن قیام کرو گے اور تمہارے ساتھ سوار کا اسلحہ "یعنی تلواریں نیام میں" ہو گا۔ اس کے سوا کسی اسلحہ کے ساتھ تم شہر میں داخل نہیں ہو گے"۔

اس معاہدہ کے گواہان مسلمانوں کی طرف سے حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، سعدؓ بن ابی وقاص اور محمدؓ بن مسلمہ اور قریش کی طرف سے حویطب بن عبدالعزی اور مکرز بن حفص تھے۔

شرائط صلح پر مسلمانوں کی آزردگی:

صلح کی شرائط طے کرنے کے مرحلہ میں مسلم کیمپ میں عدم اطمینان کی کیفیت رہی۔ اس کی وجہ قریش کا بعض ایسی شرائط پر اصرار تھا جن سے ان کی فوقیت کا اظہار ہوتا تھا اور مسلمان محسوس کرتے تھے کہ وہ قریش کے دباؤ میں ان شرائط کو تسلیم کر رہے ہیں۔ ان شرائط سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے تاب ہو گئے اور نبی ﷺ سے استفسار کیا کہ یا رسول اللہ، کیا ہم حق پر اور قریش باطل پر نہیں ہیں! آپ نے فرمایا کیوں نہیں۔ انہوں نے پھر پوچھا، کیا جنگ ہونے کی صورت میں ہمارے مقتولین جنت میں اور قریش کے مقتولین جہنم میں نہ جائیں گے؟ آپ نے فرمایا، بلاشبہ ایسا ہی ہو گا۔ حضرت عمرؓ نے کہا تو پھر ہم اپنے دین کے معاملہ میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں کہ لوٹ جائیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ابھی ہمارے درمیان اور ان کے درمیان فیصلہ نہیں کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا، ابن خطاب: میں اللہ کا رسول ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے ضائع نہیں کرے گا[1]۔

اس مکالمہ میں حضرت عمرؓ جس ذہن کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں وہ عمرہ ادا کیے بغیر لوٹ جانے کو باعث ذلت محسوس کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ بیعت رضوان کے تقاضا کو اس کے حتمی انجام تک پہنچانے کے لیے قتال کی راہ اختیار کی جائے۔ نبی ﷺ نے ان کو تسلی دی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اللہ کا رسول براہ راست اللہ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو حق کے لیے باعث ندامت ہو۔

مکہ سے مدینہ جانے والے مسلمانوں کو قریش کے حوالہ کرنے کی شرط میں فریقین میں جو نابرابری تسلیم کر

لی گئی تھی اس پر بھی بعض صحابہؓ نے نبی ﷺ سے وضاحت چاہی تو آپ نے فرمایا، جو شخص ہمیں چھوڑ کر قریش کے پاس چلا جائے گا اس کو اللہ نے رد کر دیا۔ وہ شخص ہمارے کام کا نہیں۔ رہا وہ شخص جو ہمارے پاس مدینہ آئے گا تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ عنقریب کوئی سبیل پیدا کرے گا۔ اس شرط کا فوری اطلاق عین معاہدہ کی تحریر کے وقت خود سہیل بن عمرو کے بیٹے ابوجندلؓ پر ہوا۔ وہ مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے۔ انہوں نے بھاگ کر مسلم کیمپ میں شامل ہونا چاہا۔ ابوجندل رو رو کر التجا کر رہے تھے کہ وہ مکہ میں سخت مشکل میں ہیں۔ ان پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ لہٰذا ان کو اس کیفیت سے نجات دلائی جائے۔ سہیل نے مطالبہ کر دیا کہ معاہدہ کے مطابق میرے لڑکے کو میرے حوالہ کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو معاہدہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ نبی ﷺ نے ابوجندلؓ کو تسلی دی کہ حوصلہ رکھو، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کشائش پیدا فرمائے گا، اور ان کو قریش کے حوالہ کر دیا۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا اور ان میں معاہدہ کے یک طرفہ ہونے کا احساس پیدا ہوا۔ نبی ﷺ نے معاہدہ کی متعلقہ دفعہ کی جو وضاحت فرمائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس مسئلہ کو ہدایت و ضلالت کے بارے میں سنت الٰہیہ کی روشنی میں دیکھا۔ جو شخص اسلام کی روشنی دیکھنے کے بعد پھر سے گمراہی کی تاریکی میں جانا چاہتا ہے تو فی الواقع اللہ ہی نے اس کو قبول حق کی توفیق سے محروم کر دیا۔ ایسا شخص مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کیوں وابستہ رکھا جائے گا۔ ایسے شخص کو قریش سے واپس لینے کا فائدہ؟ اسی طرح مکہ کے مسلمانوں کے لیے کشائش کی امید اس بنا پر تھی کہ معاہدہ اللہ تعالیٰ کی براہ راست نگرانی میں نبی کے ہاتھوں طے پا رہا تھا۔ اس کے نتائج اللہ کے اختیار میں تھے۔

صلح نامہ تحریر ہو چکا تو اب حدیبیہ میں قیام کو طول دینے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ ایسی صورت حال کے لیے جس میں حج یا عمرہ کی نیت کر لینے کے بعد کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے اور حج یا عمرہ کرنا ممکن نہ ہو رہا ہو تو سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۶ میں یہ ہدایت نازل ہو چکی تھی کہ ہدی کے جانور رکاوٹ کے مقام پر ہی قربان کر کے احرام کھول دیا جائے۔ اس ہدایت کی روشنی میں نبی ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ قربانی کریں، سر منڈوائیں اور احرام کھول دیں۔ صحابہؓ بیعت رضوان کی کارروائی کے بعد معاہدہ صلح کی شرائط پر اس قدر ملول اور دل گرفتہ تھے کہ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور کوئی شخص تعمیل حکم کے لیے نہ اٹھا۔ آنحضرتؐ نہایت پریشانی کے عالم میں اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے چہرہ مبارک کو متفکر دیکھا تو وجہ دریافت کی۔ آپ نے مسلمانوں کے رویہ کا

ذکر کیا تو ام المومنین نے مشورہ دیا کہ حضور، آپ خود اپنی طرف سے قربانی کر دیں۔ لوگ آپ کو دیکھیں گے تو پیچھے نہیں رہیں گے۔ آپ نے ایسا ہی کیا تو پورے کیمپ میں حرکت پیدا ہوئی اور لوگ اتباع پیغمبر میں جانور ذبح کرنے اور بال منڈوانے لگے۔ احرام کھولنے کے بعد آنحضرتؐ نے مدینہ واپسی کا حکم دیا۔

حدیبیہ سے واپسی کے سفر کے دوران مسلمان نہایت مضمحل اور افسردہ تھے۔ ہر شخص سوچوں میں گم تھا۔ جو سوالات لوگوں کو پریشان کر رہے تھے اور ان کا کوئی جواب سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ حسب ذیل تھے۔

۱۔ ایسے سفر کا کیا فائدہ تھا جس سے مسلمانوں کو بے نیل مرام گھروں کو لوٹنا پڑ رہا ہے اور دشمن خوشی کے شادیانے بجا رہا ہے۔

۲۔ بیعت قتال ہو جانے کے بعد صلح کی ضرورت کیا تھی جبکہ ہمارا اصلی ہدف تو فتح مکہ تھا۔

۳۔ نبی کی رویا سچی ہوتی ہے۔ آخر پیغمبر ﷺ کی رویا کیوں غلط ثابت ہوئی۔

نبی ﷺ نے لوگوں کو تسلی دی کہ وہ صحت و سلامتی کے ساتھ واپس لوٹ آئے ہیں۔ دشمن کے مرکز میں جانے کے باوجود کشت و خون کی نوبت نہیں آئی۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا اجر، جہاد اور عمرہ دونوں کا، بالکل محفوظ ہے۔ اس طرح کا لوٹنا بے نیل مرام لوٹنا نہیں ہے۔ جہاں تک رویا کا تعلق ہے وہ بھی برحق ہے لیکن اس میں وقت کا تعین تو نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے عمرہ اگر ایک سال کے لیے موخر ہو گیا ہے تو یہی اس کا مناسب اور مبنی بر مصلحت وقت تھا۔ تم یہ عبادات اگلے سال کر سکو گے۔ لیکن صحابہ کو واپسی کا اتنا شدید صدمہ تھا کہ ذہن کسی طرح اطمینان نہیں پاتے تھے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر نظر کرم فرمائی اور سفر کے دوران ہی میں سورہ فتح نازل ہوئی۔ نزول وحی کے بعد آنحضرتؐ نے صحابہ کو بتایا کہ آج رات مجھ پر وہ سورہ اتری ہے جو مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ آپ نے سورہ سنانے کے لیے حضرت عمرؓ کو خاص طور پر بلوایا کیونکہ وہ اپنی بے اطمینانی کا برملا اظہار کر چکے تھے۔ اس سورہ میں ان سوالوں کا شافی جواب دیا گیا جو صحابہؓ کے ذہنوں کو پریشان کر رہے تھے۔

سورہ فتح میں اہل ایمان کے اس رویہ کی بھرپور انداز میں تعریف کی گئی جو انہوں نے اس مہم میں اپنایا۔ فرمایا کہ یہ رویہ اس سکینت کی بدولت ممکن ہوا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر نازل فرمائی۔ اس سورہ میں مشرکین مکہ

کے رویہ کی تنقیص کی گئی جس کا باعث ان کی حمیت جاہلیت بنی۔ یہ بات قدرے وضاحت طلب ہے:

سکینت:

سکینت سے مراد صبر و سکون، حلم و وقار اور حکمت و تدبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس سفر میں سکینت کی صفت سے خوب خوب نوازا۔ حریف کی اوچھی حرکتوں سے متاثر ہو کر انہوں نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو اللہ کی رضا اور دین کے مصالح کے خلاف ہو، حالانکہ ایسے اشتعال انگیز حالات میں جماعتیں کوئی عاجلانہ قدم اٹھا کر اپنے مقصد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچالیتی ہیں۔ سکینت کا مظاہرہ جن مواقع پر ہوا ان کی نمایاں مثالیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔　مسلمان آنحضرتؐ کی ہم رکابی کی دعوت پر دشمن کے مرکز میں نہتے جانے سے خوف زدہ نہیں ہوئے۔ انہیں نبی کی رویا کے حق ہونے کا یقین اور اس بات پر اعتماد رہا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے ساتھ ہے لہٰذا یہ سفر ان کے لیے ایمان میں اضافہ کا باعث بنا۔

۲۔　مسلمان مدینہ سے عمرہ کی نیت سے روانہ ہوئے تھے۔ پورے سفر میں انہوں نے اپنے اس مقصد کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا اور نہ احرام کی پابندیوں سے غافل ہوئے۔ قریش کی اوچھی حرکتیں انہیں اپنے مقصد سے منحرف نہ کر سکیں۔

۳۔　قریش کے نمائندوں کے ہتک آمیز رویہ اور طعن و تشنیع کے باوجود انہوں نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔

۴۔　معاہدہ کی بعض دفعات پر رنج اور شدید جذباتی کیفیات پیدا ہونے کے باوجود انہوں نے کوئی باغیانہ اقدام نہیں کیا بلکہ اللہ کے رسول کے حکم پر استقامت دکھائی اور معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا۔

۵۔　قتل عثمانؓ کی افواہ پر انہوں نے نہایت جوش و جذبہ کے ساتھ بیعت کی حالانکہ وہ باقاعدہ جنگ کے لیے تیار ہو کر نہیں آئے تھے۔ ان کا تمام تر بھروسہ اللہ کی نصرت پر تھا۔

حمیت جاہلیت:

حمیت جاہلیت سے مراد قریش کا حق و عدل کے بالکل خلاف محض اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے اپنے غلط موقف پر بضد ہونا ہے۔ اس کے بھی متعدد مواقع پیدا ہوئے۔

۱۔　مسلمانوں کی آمد کی خبر ملتے ہی انہوں نے، آمد کے مقصد کی تحقیق کیے بغیر، یہ مفروضہ قائم کر کے کہ مسلمان بیت اللہ پر قابض ہونا چاہتے ہیں اس بات کا حلف اٹھالیا کہ وہ ان کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ یہ محض ایک

جذباتی فیصلہ تھا۔

۲۔ متعدد ذریعوں سے یہ اطلاع ملنے کے باوجود کہ مسلمان عمرہ کرنے میں مخلص ہیں، قریش اپنے فیصلہ میں ترمیم پر آمادہ نہیں ہوئے اور یہ رویہ ان کی صفوں میں انتشار کا باعث بھی بن گیا۔

۳۔ بین الاقوامی دستور کے خلاف قریش نے نبی ﷺ کے سفیروں کا احترام نہیں کیا حالانکہ اگر وہ یہ حرکت نہ کرتے تو اپنے منصب کے وقار میں اضافہ کرتے اور نتائج بھی ان کے حق میں بہتر نکلتے۔

۴۔ معاہدہ کی شرائط طے کرتے وقت انہوں نے بلاوجہ الجھنیں پیدا کیں جس سے محض انا کی تسکین مقصود تھی ورنہ ان سے سیاسی فائدہ اٹھانا ممکن نہ تھا، جیسا کہ بعد کے حالات نے ثابت کیا۔

۵۔ اس مسئلہ میں انہوں نے جو طرزِ عمل اپنایا اس نے پورے عرب پر واضح کر دیا کہ قریش بیت اللہ سے متعلق اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں جاہلی نخوت کو روا رکھتے ہیں اور تعظیم بیت اللہ کی ان کو اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی فکر اپنی بات اونچی رکھنے کی ہوتی ہے۔ یہ وہی بات تھی جو پیغمبر ﷺ مدتوں سے فرما رہے تھے۔ قریش نے اس کا عملی ثبوت پیش کر دیا۔

معاہدہ کی حکمتیں:

سورہ فتح میں ان حکمتوں کو بھی ظاہر کیا گیا جو معاہدہ صلح میں مضمر تھیں:

۱۔ عمرہ کی تاخیر:

سورہ فتح میں نبی ﷺ کی رویا کے حوالہ سے فرمایا ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ. (الفتح ۴۸:۲۷)

اللہ نے اپنے رسول کو مبنی برحقیقت رویا دکھائی۔ بے شک اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے، امن کے ساتھ، اپنے سر منڈائے اور کترائے ہوئے، تمہیں کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔

یعنی عمرہ کرنے کا موقع ضرور آئے گا۔ اور وہ عمرہ اس شان کے ساتھ ہوگا کہ مسلمانوں کو کسی جانب سے کوئی خطرہ یا فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہوگا۔ گویا عمرہ کو مامون و محفوظ کرنے کے لیے اس کو ایک سال کے لیے موخر کر دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں اگر قریش کے موجودہ رویہ کے باوجود مسلمانوں کا عمرہ کرنے پر اصرار ہوتا تو قریش اپنے حلف

کے مطابق جنگ سے گریز نہ کرتے اور مکہ کی گلیاں خون سے رنگین ہو جاتیں۔ اس صورت میں بالفرض مسلمانوں کو مناسک ادا کرنے کا موقع ملتا بھی تو وہ نہایت پرخطر حالات میں ملتا جبکہ ان کی تمام تر توجہ عبادات کی بجائے دشمن کے عزائم اور حرکات کی طرف ہوتی۔ معاہدہ کی رو سے عمرہ میں ایک سال کی تاخیر تو ضرور ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق عمرہ بغیر ایک قطرہ خون بہائے نہایت بے خوفی کی حالت میں ممکن ہوا۔

۲۔ جنگ سے بچاؤ:

قتال پر بیعت ہو جانے کے باوجود صلح کی راہ اختیار کرنے میں کئی حکمتیں تھیں جن پر سورہ فتح نے پردہ اٹھایا۔ فرمایا:

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْىَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ. وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَ نِسَاءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا.

(الفتح ۴۸:۲۵)

وہی ٹھہرے ایسے لوگ کہ جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی روکے رکھا کہ وہ اپنی جگہ پر نہ پہنچنے پائیں۔ اور اگر ایسے مومن مرد اور مومنہ عورتیں نہ ہوتے جن کو تم لاعلمی میں روند ڈالتے، پس ان کے باعث تم پر لاعلمی میں الزام آتا (تو ہم جنگ کی اجازت دے دیتے لیکن اللہ نے یہ اجازت اس لیے نہ دی) کہ جن کو وہ چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اور اگر وہ لوگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم ان میں سے ان لوگوں کو دردناک عذاب دیتے جنھوں نے کفر کیا۔

اس آیت میں جنگ نہ ہونے کی تین حکمتیں بتائی گئی ہیں:۔

۱۔　حدود حرم میں جنگ ہو جانے کی صورت میں قریش کی طرف سے سارے عرب میں زہریلا پروپیگنڈا کیا جاتا کہ نئے مذہب کے ماننے والے اشہر حرم کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں نہ بیت اللہ کا۔ یہ عربوں کی روایات کو کچل کر ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اس پروپیگنڈا کے نتیجہ میں پورے عرب میں اسلام کے خلاف بدظنی کا بیج بو دیا جاتا اور مسلمان ہر جگہ ایک مجرم کی طرح اپنے کردار کا دفاع کرنے پر مجبور ہوتے۔ جنگ کی بجائے صلح کی راہ اختیار کرنے میں مجرم قریش بن گئے۔ ہر عرب نے الزام دیا کہ ان لوگوں نے اپنے منصب سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے عمرہ کے لیے آنے والوں اور ھدی کے جانوروں کو بیت اللہ کے پاس آنے سے روکا۔ لہٰذا عرب کی اس قیادت کی نااہلی کے

بارے میں اسلام کا تبصرہ درست ہے۔ قریش کے اس رویہ کے برعکس مسلمانوں نے بیت اللہ اور حدود حرم کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا جس کا ہر شخص مداح ہو گیا۔

۲۔ مکہ میں بہت سے مرد اور عورتیں مسلمان ہو چکے تھے لیکن ان کے بارے میں کامل معلومات ابھی مسلمانوں کو نہیں پہنچی تھیں۔ اگر اس مرحلہ پر مکہ میں جنگ ہو جاتی تو یہ مسلمان اپنے ہی ہم مسلک بھائیوں کے ہاتھوں بے خبری میں نقصان اٹھاتے۔ اللہ نے یہ چاہا کہ اسلام اپنے ان جانثاروں سے محروم نہ ہو۔ ان اہل ایمان میں سے بعض نام محفوظ ہو گئے۔ مثلاً ابوجندل، ابوبصیر عتبہ اور ام کلثوم بنت عقبہ۔

۳۔ مکہ میں متعدد ایسے لوگ بھی تھے جو اگر چہ ابھی ایمان نہیں لائے تھے لیکن وہ اپنے اور اپنے لیڈروں کے رویہ سے مطمئن نہ تھے۔ ان کے دل و دماغ اسلام کی حقانیت کے قائل ہو چکے تھے۔ اللہ نے چاہا کہ یہ لوگ ضائع نہ ہوں اور وہ ان کو اپنے دامن رحمت میں لے لے۔ یہی لوگ تھے جو صلح کی فضا میں بڑی تیزی سے اسلام کی طرف بڑھے۔ قریش کے بڑے لوگوں میں سے خالد بن ولیدؓ، عمرو بن العاصؓ اور معاویہ بن ابی سفیانؓ کے نام بڑے نمایاں ہیں۔ انہوں نے صلح کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر لیا۔

۴۔ فتح مبین:

قریش کے اشتعال انگیز رویہ اور مسلمانوں کی جذباتی کیفیت کی بدولت معاہدہ کے مضمرات ہر شخص پر فوراً روشن نہ ہوئے جس کی وجہ سے قریش میں بالعموم برتری کا احساس اور مسلم کیمپ میں مایوسی اور افسردگی طاری رہی۔ سورہ فتح نے اس تاثر کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا. (فتح ۱:۴۸)

بے شک ہم نے تمہیں ایک کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی۔

اس بشارت کی روشنی میں لوگوں نے جب معاہدہ کی دفعات کو گہری نظر سے دیکھا تو مان گئے کہ فی الواقع یہ معاہدہ فتح مکہ کی کلید ہے۔ اس معاہدہ کو فتح مبین قرار دینے کے متعدد پہلو بالکل واضح ہیں:۔

۱۔ قریش کا دس سال کے لیے جنگ بندی قبول کرنا اس بات کا اعتراف تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کی جنگی صلاحیت کا لوہا مان لیا ہے، وہ مسلسل حالت جنگ کو اپنے لیے نقصان دہ سمجھ رہے ہیں اور جنگ کے بل بوتے پر وہ مسئلہ کے حل کی کوئی امید نہیں رکھتے۔ جب اس حقیقت کو ذہن میں رکھا جائے کہ اب تک لڑی جانے والی تینوں

جنگیں --بدر، احد اور خندق-- خود قریش نے مسلمانوں پر مسلط کی تھیں تو یہ نفسیاتی تبدیلی نہایت معنی خیز اور ان کی شکست خوردگی کی غماز نظر آتی ہے۔ کسی حریف کا شکست خوردگی کا مظاہرہ کر دینا اس کے مفتوح ہونے کی پہلی علامت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں ایسی کوئی بات ظاہر نہیں ہوئی جو ان کی کمزوری پر دلالت کرتی ہو۔

۲۔ معاہدہ کی رو سے پہلی بار قریش نے بیت اللہ پر مسلمانوں کا حق تسلیم کر لیا ورنہ اب تک وہ ان کو معاشرے کی روایات کا باغی گروہ قرار دے کر اس کی زیارت سے محروم کرتے رہے تھے۔

۳۔ قریش جب تک مکہ پر مسلط تھے اس وقت تک وہ بہر حال ایک طاقت تھے۔ معاہدہ نے ان کی یہ طاقت متزلزل کر دی جس کو عرب کے ہر قبیلہ نے فوراً محسوس کر لیا اور اس کے اندر مسلمانوں کے قریب ہونے اور ان کے ہاں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا۔ صلح کی فضا میں رابطے قائم ہونے سے بے اعتمادی اور مخاصمت کی وہ دیوار منہدم ہو گئی جو قریش نے تعمیر کر رکھی تھی۔ اب عربوں کو مسلمانوں کی معاشرت، حسن معاملہ اور عفت و طہارت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اب اس انقلاب کا مشاہدہ ممکن ہوا جو اسلام نے مسلمانوں کی زندگیوں میں پیدا کر دیا تھا۔ لہٰذا صلح کے اس دور میں اسلام غیر معمولی تیزی سے پھیلا۔

۴۔ معاہدہ کی رو سے قریش نے مسلمانوں کو ملک میں مساوی درجے کی سیاسی قوت تسلیم کر لیا اور ان کو حق دیا کہ وہ عرب قبائل کو حلیف بنا سکتے ہیں۔ اب تک یہ قبائل قریش کی سیادت تسلیم کرتے تھے۔ اطراف مدینہ کے بعض قبائل نے مسلمانوں کے ساتھ غیر جانبداری کے معاہدے تو کیے لیکن وہ برملا طرف دار بننے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔ معاہدہ کے بعد ایسے قبائل کے باقاعدہ حلیف بننے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ چنانچہ معاہدہ کی تکمیل کے فوراً بعد بنو خزاعہ نے مسلمانوں کے ساتھ حلیفانہ معاہدہ کر لیا اور بعد میں دوسرے قبائل کے ساتھ روابط بڑھے۔ بنو خزاعہ کے دشمن قبیلہ بنو بکر نے قریش کی طرف داری کی اور وہ ان کے حلیف کے طور پر معاہدہ میں شامل ہو گئے۔ یہ دونوں قبائل مکہ کے قریب کی وادیوں میں آباد تھے۔

۵۔ جنگ بندی نے قریش کے ہاتھ باندھ دیے تو مسلمانوں کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنے ان ازلی و ابدی دشمنوں کے خلاف اقدام کر سکیں جو ان کو نقصان پہنچانے کی سازشیں کرتے رہتے تھے۔ اب ان سازشیوں کو قریش کے تعاون کے بغیر مسلمانوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس اقدام کا پہلا نشانہ یہود خیبر بنے جنھوں نے جنگ احزاب کی آگ بھڑکائی تھی اور ان دنوں وہ غطفان کو مدینہ پر چڑھا لانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ یہود کو جنگ خیبر میں شکست

ہوئی جو باقی تمام قبائل کے لیے چشم کشا تھی کہ اب وہ مسلمانوں سے مخاصمت کا رویہ رکھ کر مامون نہیں ہو سکتے۔

معاہدہ کے ان اثرات کے ہوتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہ تھا کہ عنقریب قریش کے قدموں کے نیچے سے زمین کھسکنا شروع ہو جائے گی، مسلمانوں کی طاقت میں بہت جلد زبردست اضافہ ہو جائے گا اور مکہ کی فتح بہ آسانی ممکن ہو جائے گی۔ قرآن نے اس معاہدہ کو فتح مبین قرار دیا کیونکہ اس معاہدہ صلح کے بطن ہی سے فتح مکہ نمودار ہونے والی تھی۔

۴۔ بلا اجازت ولی مدینہ جانے والوں کا معاملہ:

معاہدہ کی جس دفعہ نے مسلمانوں کو سخت رنجیدہ کیا اور قریش کو ایک گونہ برتری کا احساس دلایا وہ بلا اجازت ولی مدینہ جانے والے مسلمانوں کو واپس مکہ بھیجنے کی دفعہ تھی۔ یہ دفعہ ایسی ہی صورت میں مدینہ سے مکہ آنے والے کو واپس مسلمانوں کے حوالے کرنے کا پابند نہیں کرتی تھی جس سے معاہدہ میں فریقین میں نابرابری کا احساس پیدا ہوتا تھا۔

اس دفعہ کو شامل معاہدہ کر کے قریش نے اپنے لوگوں کے قبول اسلام میں ایک رکاوٹ کھڑی کرنا چاہی۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک شخص مسلمان ہونے کے بعد مدینہ میں پناہ حاصل نہیں کر سکتا تھا تو وہ اپنے آپ کو مسلمان ہونے کی مصیبت میں ڈالتا ہی کیوں؟ لیکن قریش کی نظر جس حقیقت پر نہیں گئی وہ یہ تھی کہ اسلام تو ایک عقیدہ اور فکر کا نام ہے۔ انسان کی سوچ پر کوئی پہرہ نہیں بٹھایا جا سکتا۔ اس لیے جو لوگ مسلمان ہوتے وہ مکہ میں رہتے ہوئے بھی مسلمان رہ سکتے اور دوسروں کو اپنا ہم عقیدہ بنا سکتے تھے۔ آخر اس سے قبل مصائب کا مقابلہ کر کے قریش کے کتنے فرزند مسلمان ہوئے جنھوں نے بعد ازاں ہجرت کی۔ نیز یہ دفعہ اس صورت میں بھی قریش کے لیے مفید نہ تھی جب کوئی مسلمان ہونے والا مکہ سے نکل کر مدینہ کی بجائے کسی دوسری جگہ پناہ حاصل کر لیتا یا اس کو اپنی قیام گاہ بنا لیتا۔

دوسری طرف جو لوگ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تھے وہ دین کے لیے عظیم قربانیاں دے کر سرفرازی کے ایک اعلیٰ مقام کو پا چکے تھے۔ ان کو اللہ اور اس کے رسول سے حسن انجام کی خوشخبری مل رہی تھی۔ ان میں سے کسی کی شامت آئی ہوئی تھی کہ وہ ترک اسلام کر کے قریش کی گرتی ہوئی دیوار کے سایہ میں پناہ لے۔ یہی وجہ ہے کہ معاہدہ کے بعد ہمیں بیسیوں مثالیں ان لوگوں کی ملتی ہیں جو مسلمان ہو کر مکہ سے نکل گئے لیکن اس بات کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ کسی مسلمان نے مدینہ چھوڑ کر مکہ جا کر پناہ لی ہو۔

کچھ مدت گزرنے کے بعد یہ دفعہ خود قریش کے لیے مصیبت بن گئی۔ ہوا یوں کہ مکہ کے ایک مسلمان ابو بصیر عتبہ بن اسیدؓ مدینہ پہنچ گئے۔ ان کے ولی نے معاہدہ کے تحت ان کو واپس لینے کے لیے بنو عامر کے ایک شخص اور ایک آزاد کردہ غلام کو مدینہ بھیجا۔ نبی ﷺ نے ابو بصیرؓ کو ان کے حوالہ کر دیا۔ یہ لوگ ان کو لیے ہوئے مدینہ کی حدود سے نکلے ہی تھے کہ ابو بصیرؓ نے عامری کی تلوار لے کر اس کے ساتھی کا خاتمہ کر دیا۔ مقتول کا ساتھی شکایت لے کر آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچا۔ پیچھے پیچھے ابو بصیرؓ بھی آ گئے اور عرض کی، یا رسول اللہ، معاہدہ کے تحت اپنی ذمہ داری آپ نے پوری کر دی۔ خدا کے ہاں اب آپ مسئول نہیں ہیں۔ اپنے دین کی حفاظت کرنا میری ذمہ داری ہے۔ وہ میں جس طرح بہتر سمجھوں گا کر لوں گا۔ یہ کہہ کر ابو بصیرؓ مدینہ سے نکل گئے اور تجارتی شاہراہ پر واقع ایک مقام العیص کے پہاڑوں میں اپنا مستقر بنا لیا۔ قریش کا کوئی قافلہ گزرتا تو چھینا جھپٹی کر کے اس سے کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتے۔ ان کی مثال مکہ میں رکے ہوئے دوسرے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ بنی اور وہ بھی ان کے ساتھ ملتے گئے یہاں تک کہ روایات کے مطابق، ان لوگوں کی تعداد ستر تک پہنچ گئی اور ان کا وجود قریش کے لیے دردِ سر بن گیا۔ قریش نے اس پریشانی کے خاتمہ کے لیے ایک وفد مدینہ بھیجا تو آنحضرتؐ نے معذرت کر دی کہ یہ لوگ میری عملداری میں نہیں ہیں کہ ان پر کوئی دباؤ ڈال سکوں۔ جب قریش نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے تجویز پیش کی کہ اگر معاہدہ کی متعلقہ دفعہ قلم زد کر دی جائے تو یہ لوگ خود بخود مدینہ آ جائیں گے اور قریش کے لیے مسئلہ نہیں بنیں گے۔ قریش کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور اس طرح متعلقہ دفعہ فریقین کی باہمی رضامندی سے ختم کر دی گئی۔

معاہدہ کی اس دفعہ کے بارے میں یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ اس کا اطلاق عورتوں پر ہوتا ہے یا نہیں۔ معاہدہ طے پانے کے بعد ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں تو ان کے دو بھائی عمارہ اور ولید ان کی واپسی کا مطالبہ لے کر مدینہ پہنچے۔ نبی ﷺ نے ان کا مطالبہ یہ کہہ کر رد کر دیا کہ معاہدہ کا اطلاق صرف مردوں پر ہے، عورتوں پر نہیں۔ قریش کو اصرار تھا کہ معاہدہ عورتوں اور مردوں سب کو شامل ہے۔ روایات میں متعلقہ دفعہ کے جو الفاظ نقل ہوئے ہیں وہ یوں ہیں: من اتی منهم بغیر اذن ولیه رده الیهم ۔ اس جملہ میں تمام ضمیریں مذکر استعمال ہوئی ہیں اس لیے نبی ﷺ کا موقف حقیقت پر مبنی تھا۔ اس قضیہ کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے سورہ الممتحنہ میں خود صادر فرمایا اور بیچ کی ایک راہ نکال دی۔ فرمایا کہ مدینہ آنے والی خواتین کے بارے میں پہلے یہ تحقیق کرو کہ وہ صدق دل سے مسلمان ہو چکی ہیں اور محض دین کی خاطر ہجرت کر کے آئی ہیں۔ اگر وہ اپنا مسلمان ہونا ثابت نہ کر

سکیں تو ان کو لوٹا دو لیکن اگر وہ مسلمان ہوں تب ان کو ان کے اولیا کے حوالے کرنا جائز نہیں۔ اس صورت میں اگر وہ شادی شدہ ہوں تو شریعت کی رو سے کافر شوہروں کے حبالہ عقد میں نہیں رہ سکتیں۔ ان کو مدینہ میں روک لیا جائے اوران کے کافر شوہروں نے جو حق مہران کو ادا کیا ہو وہ واپس کر دیا جائے۔

اس طرح قریش کو برتری دلانے والی دفعہ نے خود قریش کے لیے زیادہ مشکلات کھڑی کیں اور خود انہی کی درخواست پر بالآخر اس کو معاہدہ سے نکال دیا گیا۔

حوالہ جات

۱۔ سیرۃ النبیؐ۔ ابن کثیر۔ ج ۴، ص ۲۲۵

۲۔ السیرۃ النبویہ۔ ابن سعد۔ ج ۱، ص ۳۱۳

۳۔ سیرۃ النبیؐ۔ ابن کثیر۔ ج ۲، ص ۲۲۸

۴۔ صحیح مسلم۔ باب صلح الحدیبیہ فی الحدیبیہ۔ ج ۲، ص ۹۹

باب 37

معاہدہ صلح کے ثمرات

ا۔ خیبر کی فتح:

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ان کے صبر و تحمل اور حلم و تدبر کا یہ انعام عطا فرمایا کہ سورہ فتح میں ان سے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ عنقریب ان کو ایک شاندار فتح سے ہمکنار کرے گا جس سے بکثرت مال غنیمت بھی حاصل ہوگا۔ اس فتح کی نوبت حدیبیہ سے واپسی کے دو ماہ بعد آئی۔ یہ یہودیوں کے سب سے بڑے مرکز خیبر کی فتح تھی۔

خیبر اور اس کے نواح فدک اور وادی القریٰ میں بکثرت یہود آباد تھے۔ مدینہ سے جب بنونضیر کو جلاوطن کیا گیا تو وہ خیبر میں آباد ہو گئے تھے۔ جنگ احزاب کی منصوبہ بندی میں یہاں کے لوگوں کا ہاتھ سب سے زیادہ تھا۔ اس جنگ میں ناکامی کے بعد بھی یہودیوں کی سازشیں ختم نہ ہوئیں بلکہ انہوں نے شمالی عرب کے مشرک قبائل غطفان اور بنوسعد وغیرہ کے ساتھ ساز باز کی اور پھر سے کوئی بڑی جمعیت تیار کر کے مدینہ پر حملہ کے امکانات کا جائزہ لیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ احزاب کے بعد حضورؐ کو کئی قبائل کی طرف سریے بھیجنے پڑے تاکہ ان کو مرعوب کر کے کسی سازش میں آلۂ کار بننے سے روکا جا سکے۔

حدیبیہ کے سفر سے واپسی کے دوران حضورؐ کو حکم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جلد ایک نئی مہم کا حکم دے گا۔ اس میں صرف انہی لوگوں کو شامل کرنا ہوگا جنہوں نے بیعت رضوان کی ہے۔ عمرہ کے سفر سے پیچھے رہ جانے والے مال غنیمت کی طمع میں ساتھ دینا چاہیں گے لیکن ان کو اس مہم میں شامل نہ کیا جائے بلکہ صاف الفاظ میں کہہ دیا جائے کہ چونکہ تم نے پہلے ہمارا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا لہٰذا اب تمہیں ساتھ لے جانے کی ممانعت نازل ہوئی ہے:

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ. قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا. بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا. (الفتح ۴۸:۱۵)

جب تم غنیمتیں لینے کے لیے چلو گے تو پیچھے چھوڑے ہوئے لوگ کہیں گے کہ ہمیں بھی اجازت دی جائے کہ ہم

آپ لوگوں کے ساتھ چلیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی بات کو بدل دیں۔ کہہ دو، تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے۔ یہ ہدایت اللہ نے پہلے سے دے رکھی ہے، تو وہ کہیں گے بلکہ تم لوگ ہم پر حسد کرتے ہو۔ بلکہ یہی لوگ بہت کم سمجھتے ہیں۔

محرم ۷ھ میں رسول اللہؐ نے یہود کا زور ختم کرنے کے لیے خیبر پر حملہ کا فیصلہ کیا۔ مذکورہ ہدایات کے مطابق آپ نے صرف بیعت رضوان کرنے والے صحابہ کو ساتھ لیا اور دوسروں نے اگر شرکت کی درخواست بھی کی تو اس کو منظور نہیں فرمایا۔ سیرت نگاروں نے یہ بات تو نقل کی ہے کہ حضورؐ کی ہدایت یہ تھی کہ لا یخرج معنا الا راغب فی الجھاد (ہمارے ساتھ جہاد کی رغبت رکھنے والوں کے سوا کوئی نہ نکلے) لیکن اس سے وہ مضمون سامنے نہیں آتا جو سورہ فتح کی آیت میں ہے۔ راویوں نے مضمون ٹھیک سے ادا نہیں کیا۔ آپ کا ارشاد یہی رہا ہوگا کہ جن لوگوں نے پہلے شوق سے جہاد پر بیعت کی تھی اس سفر میں بھی وہی نکلیں، دوسروں کو ساتھ چلنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فوج کی تعداد ٹھیک وہی چودہ یا پندرہ سو تھی جو عمرہ کے لیے جانے والوں کی تھی۔ قریش ہمیشہ یہود کی خیر خواہی کرتے تھے لیکن اس مرتبہ معاہدہ حدیبیہ طے پانے کے باعث وہ کسی طرح کی مدد پہنچانے سے قاصر تھے۔ یہود کو اپنی لڑائی خود لڑنی پڑی۔

چونکہ غطفان اور یہود کی ملی بھگت تھی اور اس بات کا امکان تھا کہ غطفان اپنے حلیفوں کی مدد کو آئیں گے لہٰذا حضورؐ نے ایک مقام الرجیع پر فوج اتاری جو غطفان کے علاقہ اور خیبر کے سنگم پر تھا۔ غطفان یہود کی مدد کو نکلے لیکن پھر اپنے مال اور اہل وعیال کو لاحق خطرہ کو بھانپ کر انہوں نے اپنے دیار کی حفاظت کو ترجیح دی۔

رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر علی الصبح حملہ کیا۔ اہل خیبر اپنی زمینوں پر کام کاج کے لیے پھاوڑے اور کسیاں لے کر باہر آئے تو سامنے لشکر کو پایا۔ وہ الٹے پاؤں بھاگ کر قلعہ ناعم میں داخل ہو گئے اور دروازے بند کر دیے۔ قلعہ والوں کو بتایا اللہ کی قسم، محمد پورے لشکر سمیت باہر موجود ہیں۔ حضورؐ نے پیشگوئی فرمائی 'اللہ سب سے بڑا ہے۔ خیبر برباد ہو جائے گا'۔ قلعہ ناعم میں رئیس یہود سلام بن مشکم مقیم تھا اور قابل جنگ افراد اس کے ہمراہ تھے۔ یہاں محاصرہ کے دوران مشہور صحابی محمود بن مسلمہؓ قلعہ کی دیوار کے نیچے کھڑے تھے کہ اوپر سے ان پر چکی کا پاٹ گرایا گیا جس سے وہ جاں بحق ہو گئے۔ دونوں لشکر تیر اندازی کرتے رہے۔ بالآخر مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔

مسلمان فوج میں سے بنو سہم نے نبی ﷺ سے سوال کیا کہ ہمارے پاس کھانے پینے کا سامان نہیں ہے، لہٰذا ہماری کچھ مدد کی جائے۔ اتفاق سے حضورؐ کے پاس بھی راشن کی تنگی تھی۔ آپ نے دعا کی کہ پروردگار، تو اپنے

ان بندوں کے احوال جانتا ہے۔ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں۔ میں بھی ان کو کچھ مہیا نہیں کر سکتا۔تو کوئی ایسا قلعہ ہمارے قبضہ میں دے جس سے ہم کھانے کی ضروریات پوری کر سکیں۔ چنانچہ قلعہ صعب بن معاذ فتح ہوا تو اس میں بہت بڑی مقدار میں خوراک کا ذخیرہ ہاتھ آیا۔ ایک مشکل قلعہ قموص تھا۔ یہ بنونضیر کے سردار ابوالحقیق کے بیٹوں کی ملکیت تھا۔ بیس دن کے محاصرہ کے بعد یہ فتح ہوا۔ یہاں سے جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں بنونضیر کے سردار حیی بن اخطب کی بیٹی صفیہ بھی تھیں جو کنانہ ابن ابی الحقیق کے نکاح میں تھیں۔اب یہود پہاڑ پر واقع قلعہ الزبیر میں جمع ہوئے۔محاصرہ نے طول پکڑا لیکن قلعہ فتح نہ ہوا۔ بالآخر یہ بات مسلمانوں کے علم میں آئی کہ قلعہ کے اندر پانی کی کمی ہے۔ یہود رات کی تاریکی میں اتر کر کسی چشمے سے پانی لے کر اوپر جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے چشمہ کا سراغ لگا کر پانی روک دیا تو یہود قلعہ سے باہر نکلے۔ معمولی مقابلہ کے بعد قلعہ فتح ہو گیا۔

اب یہودیوں کی بڑی تعداد دو قلعوں الوطیح اور السلالم میں جمع ہو گئی۔ دو ہفتے تک ان کا محاصرہ رہا۔ بالآخر یہود کا نہایت بہادر شخص مرحب نکلا اور مبارزت طلب کی۔ حضورؐ نے پوچھا کون اس کا مقابلہ کرے گا۔ محمد بن مسلمہؓ اٹھے اور کہا یارسول اللہ، ان لوگوں نے میرے بھائی محمود کو قتل کیا ہے، اس کا انتقام لینے کے لیے میں نکلوں گا۔ حضورؐ نے ان کو کامیابی کی دعا دی۔ وہ بڑھے تو مرحب نے ان پر تلوار کا وار کیا۔ وہ خود پر پڑا اور تلوار اس میں پھنس گئی۔ اس کو نکالنے کی کوشش کے دوران محمد بن مسلمہؓ نے دشمن کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد مرحب کا بھائی یاسر نکلا اور مبارزت کی دعوت دی۔ اس کا مقابلہ زبیر بن العوامؓ نے کیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ بعض روایات میں مرحب کا قاتل حضرت علیؓ کو بتایا گیا ہے۔ بالآخر یہ قلعے بھی فتح ہو گئے۔

کنانہ بن ابی الحقیق کی تحویل میں بنونضیر کا خزانہ تھا جو وہ مدینہ سے لائے تھے۔ حضورؐ نے کنانہ کو طلب کیا اور اس خزانہ کے بارے میں پوچھا۔ پہلے اس سے حلفاً یہ بات کہلوائی کہ وہ ہر بات سچ سچ بتائے گا اور کسی چیز کو چھپائے گا نہیں۔ کنانہ نے خزانہ کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ حضورؐ کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ فلاں اجاڑ جگہ پر کنانہ کو آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ آپ نے اس جگہ کی کھدائی کا حکم دے دیا۔ وہاں سے خزانہ برآمد ہو گیا۔ اس پر حضورؐ نے کنانہ کو محمد بن مسلمہؓ کے حوالے کیا۔ انہوں نے سختی بھی کی تاکہ وہ بقیہ خزانہ کی خبر دے لیکن ان کا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہوا۔ بالآخر کنانہ کو قتل کر دیا گیا۔

جب یہودیوں میں مقابلہ کی سکت نہ رہی تو انہوں نے صلح کی درخواست پیش کی۔ محیصہ بن مسعود نے مذاکرات کر کے ان کا نقطہ نظر معلوم کیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ تمام املاک مسلمانوں کے قبضہ میں ہوں گی لیکن زراعت کا کام

یہود فی الوقت جاری رکھیں گے۔ نصف پیداوار ان کی ہوگی اور نصف نئے مالکوں کی۔ نیز یہ بندوبست مستقل نہیں ہوگا۔ مسلمان حکومت جب چاہے گی یہود کو بے دخل کر سکے گی۔

جب یہود کے ساتھ تمام امور طے پا گئے تو سلام بن مشکم کی بیوی زینب نے بھنی ہوئی بکری حضورؐ کی خدمت میں بھجوائی۔ اس نے اس کو اچھی طرح زہر آلود کر دیا تھا۔ جونہی نبی ﷺ نے لقمہ منہ میں ڈالا آپ کو اس کے زہریلا ہونے کا احساس ہوگیا اور آپ نے اس کو منہ سے نکال دیا۔ بشر بن براء بن المعرورؓ نے لقمہ نگل لیا تھا۔ اس سے ان کی حالت بگڑ گئی جس سے ان کا انتقال ہوگیا۔ رسول اللہ نے زینب کو طلب کیا۔ اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا لیکن حضورؐ نے درگزر سے کام لیا۔

خیبر کے حالات کو دیکھتے ہوئے نواح کی یہودی آبادیوں، فدک اور وادی القریٰ وغیرہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے ادھر رخ کرنے سے پہلے انہی شرائط پر صلح کر لی جن شرائط پر خیبر میں معاملہ ہوا تھا۔

جنگ سے فارغ ہو کر حضورؐ نے قیدیوں کو سپاہ میں تقسیم کیا تو معلوم ہوا کہ صفیہ سردار یہود حیی بن اخطب کی بیٹی ہے۔ آپ نے اس کو آزاد کر کے اس سے خود نکاح کر لیا۔

۲۔ عمرۃ القضاء:

معاہدہ کی دفعہ کے مطابق نبی ﷺ اپنے سفر میں عمرہ ادا نہیں کر سکتے تھے لیکن آئندہ سال کے لیے اس کی اجازت مل چکی تھی۔ اس کے لیے آپ نے سفر ٹھیک انہی دنوں میں ذی قعدہ ۷ھ میں کیا۔ اس سفر میں شرکاء کی تعداد پچھلے عمرہ کی قضا کرنے والوں سے کچھ بڑھ گئی جس کا سبب معاہدہ صلح کے تحت قائم فضا رہی ہوگی۔ احتیاط کے طور پر اسلحہ جنگ ساتھ لے لیا گیا لیکن اس کو حدود حرم سے باہر ایک وادی میں چھوڑ کر اس کی نگرانی کے لیے دو سو گھوڑ سواروں کا ایک دستہ مقرر کر دیا گیا۔ معاہدہ کے مطابق تین دن کے لیے قریشی سردار مکہ سے نکل گئے لیکن شہر کی باقی آبادی نے گلیوں میں اور گھروں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کی آمد کا نظارہ کیا۔ مناسک عمرہ کی ادائیگی اور ہدی کے جانوروں کی قربانی کے بعد تیسرے روز آپ نے حکم دیا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے تمام مسلمان مکہ سے نکل جائیں۔ یہ اس رویا کی تکمیل تھی جو حضورؐ نے سال بھر پہلے دیکھی تھی۔ وعدہ خداوندی کے مطابق یہ پورا سفر نہایت بے خوفی کے ساتھ طے ہوا اور کسی طرف سے کوئی شرارت نہیں کی گئی۔

۳۔ فرزندان قریش کا قبول اسلام:

صلح حدیبیہ اور اس کے بعد مسلمانوں کی کامیابیوں نے قریش کے بعض اہم فرزندوں کو صورت حال پر

حقیقت پسندانہ غور پر ابھارا اور وہ اسلام کی حقانیت کے معترف ہو گئے۔ چنانچہ خالد بن ولید جو قریش کی طرف سے لڑائیوں میں بھرپور حصہ لے چکے تھے اب اسلام کے حملہ سے گھائل ہو گئے۔ وہ مکہ سے نکلے تا کہ مدینہ جا کر اسلام قبول کریں، راستہ میں عمرو بن العاص ملے۔ پوچھا کہاں کا ارادہ ہے۔ انہوں نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا کہ اب حقیقت کو کہاں تک جھٹلاتا ہے۔ اسلام قبول کرنے جا رہا ہوں۔ عمرو بن العاص نے کہا، میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ چنانچہ دونوں ایک ساتھ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ ان دونوں کی خدمات تاریخ اسلام کا ایک روشن باب ہیں۔ عثمان بن طلحہ کی دوستی خالد بن ولید کے ساتھ تھی۔ خالد کے بتانے پر کہ وہ مدینہ جا رہے ہیں عثمان بھی تیار ہو گئے اور خالد ہی کے ہمراہ اکٹھے بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ صلح ہی کے زمانہ میں معاویہ بن ابی سفیان بھی مدینہ آ کر مسلمان ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے وہ نہایت غربت کے عالم میں آئے کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے اپنی بیٹی کے رشتہ کے لیے حضورؐ سے مشورہ مانگا تو آپ نے فرمایا، معاویہ نادار آدمی ہیں۔ ظاہر ہے کہ سردار قریش ابوسفیان کے بیٹے مدینہ میں اگر نادار تھے تو وہ ہجرت کے باعث تھے۔ ان کے لیے مکہ سے مال و اسباب ساتھ لانا ممکن نہیں ہوا ہوگا اور مدینہ میں ابھی تک ان کے حالات دگرگوں رہے ہوں گے، اس لیے حضورؐ نے مشورہ مانگنے والے کو ان کی ناداری کی خبر دی۔

۴۔ صلح کے ماحول میں دعوت دین:

قریش کے معاہدہ صلح پا جانے کے بعد اہل ایمان کو ملک میں پھیل جانے اور اسلام کی تبلیغ کرنے کا موقع ملا جس سے پورے عرب میں نئے دین کا چرچا ہوا اور بکثرت لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ تاہم اس کی تفصیلات سے تاریخ و سیرت کی کتابیں تہی دامن ہیں۔ علامہ شبلی سیرت النبی میں لکھتے ہیں کہ معاہدہ کے بعد نبی ﷺ نے اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے تلقین فرمائی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی طرح ملک میں پھیل جاؤ اور لوگوں کو دین کی دعوت دو۔ نئے حالات میں ہر مسلمان نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق تبلیغ کا کام کیا، کیونکہ اب کسی جانب سے مخالفت متوقع نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ اس حکم پر ہر مسلمان نے مقدور بھر عمل کیا ہوگا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں قبائل نے از خود بھی اپنے آدمی حقیقت حال کو سمجھنے کے لیے مدینہ بھیجے یا اپنے کچھ نوجوانوں کو دین سیکھنے کے لیے بھیجا۔ اس طرح آنے والوں کے سوال و جواب حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ اسی دور میں اصحاب صفہ کا تذکرہ بھی ملتا ہے جن کے لیے مسجد نبوی کے قریب ایک چبوترا بنا دیا گیا تھا۔ وہ ان کی درس گاہ تھی، بعض صحابہ ان کو دین سکھاتے اور وہ نبی ﷺ سے فیض یاب ہو کر اپنے قبیلہ میں تبلیغ کے لیے واپس

چلے جاتے۔ اسی دور میں قبیلہ دوس سے مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہؓ دین سیکھنے کے لیے آئے۔

فتح مکہ کے موقع پر جن قبائل نے مسلمانوں کا ساتھ دیا اور سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں کی تعداد میں اپنے افراد فوج میں شامل کرنے کے لیے بھیجے ان میں بعض نام ایسے ہیں جن کا معاہدہ حدیبیہ سے پہلے کبھی ایسا نمایاں ذکر نہیں ہوا۔ مثلاً بنولیث، بنوسلیم، بنوالحسین وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان تک صلح کے ماحول میں دین کی دعوت پہنچی، ان کو اس کے جانچنے پرکھنے کا موقع ملا اور بعد ازاں انہوں نے ایمان کی توفیق پا کر دین کی سربلندی کے لیے جہاد میں حصہ لیا۔ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار مسلمان شریک جہاد تھے۔ ایسا ہونا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ مسلمانوں نے صلح کے ماحول سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے دین کی دعوت کو عرب کے کونے کونے تک پہنچانے کی سعی کی ہو اور کفار نے مسلمانوں کے ساتھ میل جول میں ان کی زندگیوں کا مطالعہ کر کے اسلام کی حقانیت کا اقرار کر لیا ہو۔

صلح حدیبیہ کے بعد کے دور میں متعدد جماعتیں بھی مختلف قبائل کی طرف بھیجی گئیں جن کو یہ حکم تھا کہ وہ ان قبائل کو اسلام کی دعوت دیں اور مزاحمت ہو تو مقابلہ کریں۔ ان جماعتوں کے ارکان کی تعداد بہت ہی محدود ہوتی تھی۔ بعض قبائل تو اسلام کی طرف میلان ظاہر کرتے، بعض تتر بتر ہو جاتے اور بعض خم ٹھونک کر مقابلہ پر آ جاتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ان قبائل کے افراد نے کلمہ شہادت پڑھ دیا یا السلام علیکم کے الفاظ سے استقبال کیا لیکن جماعت کے لوگ یہ سمجھے کہ یہ لوگ قتل کے خوف سے ایسا کہہ رہے ہیں، حقیقت میں یہ مسلمان نہیں ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے ان کے ساتھ سختی کا معاملہ کیا۔ ایسے مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا۔ معاہدہ صلح نے جو فضا پیدا کر دی تھی اس کا یہ قدرتی اثر تھا کہ عرب قبائل میں اسلام کی بابت جاننے کا شوق پیدا ہوا اور لوگوں نے تعصبات سے بالاتر ہو کر سوچا تو اسلام کی تعلیم ہی میں فلاح نظر آئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اسلام سے وابستہ ہونے والوں کی تعداد میں غیر معمولی تیزی سے اضافہ ہوا۔

نبی ﷺ نے بعض قبیلوں کی طرف اپنے سفیر بھی بھیجے۔ ابن سعد کے مطابق ایک سفارت کے نتیجہ میں بنو جذام کے سردار فروہ بن عمرو نے اسلام قبول کر لیا۔ قبیلہ ازد کے سرداروں جیفر اور عبد نے بھی نئے دین میں شمولیت اختیار کی۔ غسان، قضاعہ اور بنوعذرہ بھی اسی دور میں مسلمان ہوئے۔ بنوحنیفہ کی ایک بڑی تعداد مدینہ آ کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔

فتح مکہ سے پہلے جن قبائل نے حضورؐ کے ساتھ اظہار وفاداری کیا، ان میں نمایاں قبائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ بنو سعد بن بکر:

اس قبیلہ کے سردار ضمام بن ثعلبہ مدینہ آئے۔ اونٹ مسجد کے دروازہ پر باندھا، مسجد میں داخل ہوئے تو رسول اللہؐ صحابہ کے درمیان تشریف فرما تھے۔ ضمام نے کھڑے کھڑے پوچھا، آپ لوگوں میں عبدالمطلب کا پوتا کون ہے؟ حضورؐ نے فرمایا 'وہ میں ہوں' کہنے لگے 'آپ ہی محمد ہیں'۔ حضورؐ نے فرمایا 'ہاں'۔ انہوں نے کہا 'اے ابن عبدالمطلب! میں آپ سے کچھ سوال کروں گا، لیکن کروں گا ذرا تیکھے انداز میں، اس لیے برا نہ منانا۔ حضورؐ نے فرمایا، جو چاہو پوچھو، میں برا نہیں مناؤں گا۔ ضمام نے کہا 'میں آپ کو آپ کے معبود، آپ سے پہلوں کے معبود اور بعد میں آنے والوں کے معبود کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی آپ کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا 'ہاں، اللہ گواہ ہے'۔ ضمام نے پھر اسی طرح اللہ کا واسطہ دے کر پوچھا کہ کیا آپ کو اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ ہم اسی کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے بزرگ کرتے رہے'۔ آپ نے فرمایا 'ہاں، اس پر اللہ گواہ ہے'۔ انہوں نے پھر پوچھا 'کیا اللہ نے پانچ نمازیں ادا کرنے کا حکم دیا ہے'۔ حضورؐ نے فرمایا 'ہاں، اللہ گواہ ہے'۔ ضمام نے اسی طرح دوسرے فرائض -- زکوٰۃ، روزہ، حج اور دوسرے احکام کے بارے میں سوال کیا اور حضورؐ نے اللہ کو گواہ ٹھہرا کر جوابات دیے۔ تب ضمام نے توحید و رسالت کی گواہی دی اور وعدہ کیا کہ میں آپ کے بتائے ہوئے فرائض پر عمل کروں گا اور ان میں کوئی کمی بیشی نہ کروں گا۔ اس کے بعد وہ مڑے اور اپنے اونٹ پر سوار ہو کر چل دیے۔ قبیلہ میں جا کر روداد بیان کی اور پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔[1]

۲۔ مزینہ:

اس قبیلہ کے چار سو افراد مدینہ آئے اور اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد ہجرت پر آمادگی کا اظہار کیا لیکن ان کا وطن مدینہ سے زیادہ دور نہیں تھا اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کے وطن ہی کو ان کے لیے دار ہجرت قرار دیا۔ یہ لوگ تبلیغ دین میں سرگرم عمل رہے اور بعد کے مراحل میں اسلام کے لیے جنگوں میں حصہ لیا۔

۳۔ عبدالقیس:

چودہ سواروں پر مشتمل اس قبیلہ کا وفد اسلام قبول کرنے اور احکام سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ انہوں نے شکوہ کیا کہ ہمارے راستے میں مُضَر کفار پڑتے ہیں، لہٰذا ہمارا مدینہ آنا جانا صرف اشہر حرم میں ممکن ہوتا ہے۔ وفد کی سربراہی ایک روایت کے مطابق منذر بن عائذ کے پاس تھی لیکن ابن ہشام کے بیان کے مطابق جارود بن عمرو سربراہ تھے۔ یہ عیسائی تھے۔ اس حوالہ سے سوال کیا کہ اے محمد، میں نے پہلے ہی ایک آسمانی

دین اختیار کر رکھا ہے۔ اب آپ کے دین کی خاطر میں اس کو چھوڑوں گا تو کیا آپ ضامن بنتے ہیں کہ آپ ہی کا دین صحیح ہے۔ حضورؐ نے فرمایا 'ہاں، میں ضمانت دیتا ہوں کہ اللہ نے تمہارے دین سے بہتر دین کی ہدایت تمہیں نصیب کی ہے۔ چنانچہ جارود مسلمان ہو گئے۔ قبیلہ عبدالقیس خاص قسم کے برتنوں میں خمیر اٹھا کر شراب کشید کرنے کی شہرت رکھتا تھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! ہم آپ پر قربان، پینے کی چیزوں میں سے کون سی چیزیں جائز ہیں۔ آپ نے فرمایا، نقیر میں تیار شدہ مشروب نہ پیا کرو۔ وہ لوگ حیران ہو کر پوچھنے لگے، اے اللہ کے نبی! آپ کو نقیر کے بارے میں علم ہے؟ آپ نے فرمایا 'ہاں، تم درخت کے تنے کو درمیان سے خالی کر لیتے ہو، وہ نقیر ہوتا ہے۔ حضورؐ نے دبا (کدو) اور مزفت (برتن جس کے مسام بند کر لیے جاتے تھے) میں تیار شدہ مشروب سے بھی منع فرمایا اور ان برتنوں کے استعمال سے روک دیا تا کہ یہ لوگ اپنا پیشہ بدلیں۔ پھر آپ نے دین کی اساسات ۔۔ شہادت، نماز، زکوٰۃ اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے حوالے کرنے ۔۔ کی تعلیم دی۔[2]

۴۔ طَیّء:

یہ مشہور فیاض عرب سردار حاتم طائی کا قبیلہ تھا۔ اس کا بیٹا عدی بن حاتم اس کا بادشاہ اور ایک با اثر آدمی تھا۔ اس نے نصرانیت اختیار کر لی تھی اس لیے اپنے تئیں وہ صحیح مذہب پر سمجھتا تھا۔ نبی ﷺ کی فتوحات کی خبریں سن کر اسے بڑی وحشت ہوئی اور جب مسلمانوں کی توجہ شمالی عرب کی طرف ہوئی تو وہ شام کی جانب چلا گیا۔ جب اس کے علاقہ پر مسلمان حملہ آور ہوئے تو حاتم کی بیٹی قیدیوں میں شامل تھی۔ اس نے اپنا تعارف کرا کر جان بخشی کی درخواست کی تو حضورؐ نے اس کو آزاد کر دیا اور زادراہ، پوشاک اور سواری دے کر رخصت کیا۔ وہ اپنے بھائی کے پاس شام پہنچی تو اسے سخت سست کہا اور بتایا کہ محمدؐ اگر نبی ہیں تو جلد ان کا ساتھ دینے میں خیر ہے۔ اگر بادشاہ ہیں تب بھی اطاعت قبول کرنے میں ذلت کی کوئی بات نہیں۔ عدی نے مدینہ جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں پہنچا اور تعارف کرایا تو رسول اللہؐ نے گھر چلنے کو کہا۔ جا رہے تھے کہ ایک بڑھیا نے حضورؐ کا راستہ روک لیا اور اپنی حاجت بیان کی۔ یہ معاملہ خاصا طویل ہو گیا۔ عدی نے دل میں کہا کہ جو شخص ایک بے حیثیت بڑھیا کو اتنا وقت دے سکتا ہے وہ بادشاہ تو نہیں ہو سکتا۔ گھر میں داخل ہوئے تو حضورؐ نے اپنا گدا بچھا کر عدی سے کہا کہ تم یہاں بیٹھو اور خود فرش پر تشریف فرما ہو گئے۔ اس کردار نے پھر عدی کو متاثر کیا۔ حضورؐ نے پوچھا 'عدی! تم عیسائیوں کے کورکوسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہو نا!' عدی نے اثبات میں جواب دیا۔ حضورؐ نے پوچھا 'تم سردار قوم کی حیثیت سے مال غنیمت کا ایک چوتھائی بھی اپنی قوم سے وصول کرتے ہو نا!' عدی نے پھر اثبات میں جواب دیا۔ حضورؐ نے فرمایا 'ایسا کرنا تمہارے دین میں تو جائز

نہیں"۔ عدی نے کہا حضورؐ ٹھیک فرماتے ہیں۔ پھر دل میں سوچا کہ یہ واقعی اللہ کے رسول ہیں ورنہ اس بات کو عام لوگ تو جان نہیں سکتے۔ پھر حضورؐ نے فرمایا "شاید میرے ساتھیوں کی ناداری، ان کے دشمنوں کی کثرت اور ان کی کم تعداد تمہیں میرے دین میں داخل ہونے سے روک رہی ہے۔ یاد رکھو کہ عنقریب ان لوگوں کے پاس اتنا وافر مال ہو گا کہ وہ اس کو دینا چاہیں گے لیکن قبول کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ تم سمجھتے ہو گے کہ حکومت غیروں کی رہے گی تو یاد رکھو کہ وہ وقت آیا چاہتا ہے جب بابل کے قصر ابیض مسلمانوں کے قبضہ میں ہوں گے۔ یہ گفتگو سن کر عدی نے اسلام قبول کر لیا۔[۳]

قبیلہ طے کی طرف سے ایک وفد زید الخیل کی سربراہی میں مدینہ پہنچا۔ حضورؐ نے ان کے سامنے دین کی تعلیم پیش کی تو سب لوگوں نے نیا دین قبول کر لیا۔ حضورؐ نے سردار کا نام بدل کر زید الخیر کر دیا۔

۵۔ بنو تمیم:

اس قبیلہ کے وفد میں اقرع بن حابس، عطارد اور زبرقان بن بدر شامل تھے۔ مدینہ پہنچ کر انہوں نے عرب کے قدیم رواج کے مطابق اپنے قبیلہ اور سرداروں کی شان میں شعر پڑھے۔ نبی ﷺ نے حسان بن ثابتؓ کو ان کا جواب دینے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ان کے کسی زباں آور خطیب نے تقریر کی تو نبی ﷺ نے اپنے ایک صحابی کو اس کا جواب دینے کا حکم دیا۔ وفد نے تسلیم کیا کہ رسول اللہ کے خطیب اور شاعر ہمارے خطیب اور شاعر سے بہتر رہے۔ اس برتری کو مان لینے کے بعد وفد کے لوگ مسلمان ہو گئے اور حضورؐ نے ان کو تحائف دے کر رخصت کیا۔

۶۔ بنو ازد:

اس قبیلہ کا وفد صرد بن عبداللہ کی قیادت میں مدینہ آیا اور اسلام قبول کیا۔ حضورؐ نے صردؓ کو امیر مقرر کر کے حکم دیا کہ وہ یمن میں اسلام کی تعلیم کو عام کریں اور ارد گرد کے قبائل کو مطیع کریں۔ اس حکم کے مطابق وہ ایک مقام جرش میں گئے تو اہل شہر نے مقابلہ کیا جس میں شہر والوں کو شکست ہوئی۔ اس پر اہل جرش نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا وفد مدینہ بھیجا۔

۷۔ بنو کندہ:

اس قبیلہ کے اسی افراد اشعث بن قیس کی سربراہی میں مدینہ پہنچے۔ یہ مسجد نبوی میں اس حال میں داخل ہوئے کہ انہوں نے بال سنوارے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سرمہ لگایا ہوا تھا۔ انہوں نے ریشمی کام کے حلّے زیب

تن کرر کھے تھے۔ حضورؐ نے پوچھا آپ لوگ ایمان نہیں لائے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اسلام تو ہم قبول کر چکے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا پھر میں تمہارے جسموں پر ریشمی لباس کیوں دیکھ رہا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اسلام کی اس تعلیم سے ناواقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے حلوں کا ریشمی حصہ پھاڑ کر پھینک دیا۔

حوالہ جات

۱۔ السیرۃ النبویہ۔ ابن ہشام۔ ج ۲، ص ۵۷۴

۲۔ صحیح مسلم۔ باب الامر بالایمان باللہ و رسولہ۔ ج ۱، ص ۲۷

۳۔ السیرۃ النبویہ۔ ابن ہشام۔ ج ۲، ص ۵۸۰۔۵۸۱

باب 38

رسول اللہؐ کی بعثت عام

رسول اللہؐ کی بعثت اگرچہ قریش میں ہوئی، آپ کے پاس جو کلام الٰہی تھا وہ بھی قریش کی زبان میں تھا، اور انہی کے اندر آپ نے تبلیغ دین کا فریضہ ادا کیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ صرف قریش کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اپنی قوم کی اصلاح آپ کا اولین فریضہ ضرور تھا جیسا کہ آیت وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کا تقاضا تھا لیکن آپ پر یہ بات بھی واضح تھی کہ آپ کا کام قریش کو تبلیغ پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ آپ کے مخاطب دوسرے قبائل اور دوسری اقوام بھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس لیے مبعوث کیا ہے کہ آپ کے ہاتھوں دین اسلام دوسرے تمام ادیان پر غالب آ جائے، خواہ مشرکین آپ کی راہ روکنے کے لیے کتنے ہی جتن کریں۔ اس بات کو یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ کی بعثت کے دو پہلو تھے۔ آپ کی بعثت خاص قریش اور قبائل بنو اسماعیل کی طرف تھی اور بعثت عام ساری دنیا کے لوگوں کی طرف تھی۔ بعثت خاص کے تقاضا سے آپ نے ہر ہر میدان میں مشرکین عرب اور اہل کتاب کا مقابلہ کیا۔ نیز صحابہ کرام کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھا دی کہ ملک عرب میں اب دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔ خیبر کو فتح کرنے کے موقع پر جب آپ نے یہودیوں کو ان کی زمینوں کی کاشت پر مقرر کیا تو ان پر یہ بات واضح کر دی کہ یہ بندوبست عارضی ہے اور جب اسلامی حکومت چاہے گی ان کو زمینیں خالی کرنا ہوں گی۔ چنانچہ مناسب وقت پر ان کو زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا۔

بعثت عام کے تقاضے:

یہ حقیقت حضورؐ کے بارے میں سابق انبیاء کی پیشینگوئیوں سے بھی واضح تھی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ فرمایا اس کے الفاظ یوں نقل ہوئے ہیں:

> ابراہیم کی اولاد دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور ان کی نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی۔
> (عہد نامہ قدیم، پیدائش۔۲۲:۱۸)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قوموں کے برکت پانے کی شرط حضور نبی

کریم ﷺ سے پہلے کبھی پوری نہیں ہوئی۔ عیسائیت کو اقوام عالم میں ضرور فروغ حاصل ہوا لیکن اس کا واسطہ نسل ابراہیم نہ بنی بلکہ دوسرے لوگ بنے۔

یوحنا کی انجیل میں حضورؐ کو دنیا کا سردار کہا گیا۔ (یوحنا ۱۴:۳۰) جو آ کر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ (یوحنا۔۱۶:۸) وہ سچائی کا روح ہوگا جو کامل سچائی کی راہ دکھائے گا۔ (۱۶:۱۳) وہ ایک ایسا مددگار ہوگا جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا۔ (۱۴:۱۶۔۱۷)

تاریخ عالم میں ان پیشینگوئیوں کا مصداق حضورؐ کے سوا کوئی نہیں۔

ان پیشینگوئیوں میں تین باتیں نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ اس رسول کے پاس کامل سچائی یا مکمل حق ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں پچھلے انبیاء کے پاس جو دین تھا وہ ان کی قومی یا زمانی ضروریات کے لحاظ سے تھا اور نا تمام تھا لیکن حضورؐ کامل دین کو پیش کریں گے اور آپ کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہو جائے گی۔ دوسری یہ کہ اس رسول کی رسالت ابد تک کے لیے ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ابد تک ساتھ رہنے سے مراد شخصی حیثیت سے رہنا نہیں کیونکہ اس دنیا میں بقائے دوام کسی کو حاصل نہیں۔ مراد اس رسول کی لائی ہوئی ہدایت کا باقی رہنا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید واحد آسمانی کتاب ہے جو محفوظ شکل میں دنیا میں موجود ہے اور موجود رہے گی۔ لہٰذا حضورؐ کی بعثت کے بعد رہتی دنیا تک کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ آپ آخری نبی ہوں گے۔ تیسری یہ کہ وہ پوری دنیا کے لیے رسول ہوگا اور تمام اقوام عالم اس سے فیض پائیں گی۔ اس کی نبوت کسی خاص قوم کے لیے نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کے لیے ہوگی اور اس میں مجموعی طور پر انسان کی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہوگا۔ یہ شرط بھی کسی سابق رسول کی ذات میں پوری نہیں ہوتی۔ مسیح علیہ السلام بہت بڑے رسول تھے لیکن وہ صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے۔ انہوں نے اس بات کو دوٹوک انداز میں بیان کیا اور قرآن نے بھی ان کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوں۔ پیشینگوئیوں کا یہ حصہ بھی رسول اللہ ﷺ کی قامت پر پورا اترتا ہے۔ قرآن مجید نے یہ تمام باتیں نبی ﷺ کے بارے میں خود بیان کی ہیں۔ فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ. (انبیاء ۲۱:۱۰۷)

اور ہم نے تم کو بس اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ. (سبا ۳۴:۲۸)

اور ہم نے تم کو سب لوگوں کے واسطے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جان رہے ہیں۔

چونکہ عملاً یہ ایک ناممکن بات تھی کہ حضورؐ پوری دنیا کے لوگوں تک پہنچتے اور ان کو دین حق سے آگاہ کرتے، اس کو ماننے والوں کو حسن انجام کی نوید سناتے اور انکار کرنے والوں کو بدانجامی سے خبردار کرتے۔ لہذا قرآن نے یہ بات واضح کر دی کہ رسول اللہؐ کی ذمہ داری اپنے سامنے والے لوگوں کو ہدایت پہنچا دینے تک محدود ہو گی، دوسرے لوگوں پر اس ہدایت کی گواہی وہ لوگ دیں گے جو آپ پر ایمان لائیں گے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

(بقرہ۲:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے ہو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔

ملوک عجم کو دعوت اسلام:

حدیبیہ کا معاہدہ ہو جانے کے بعد جب ملکی حالات پرسکون ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے قبائل عرب میں بالعموم اور گرد و پیش کی ریاستوں کے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی طرف بالخصوص اپنے سفیر بھیجے اور مکاتیب لکھ کر ان کو دعوت اسلام دی۔ یہ آپ کی اس حیثیت کا تقاضا تھا جس کے مطابق آپ کو سب اقوام کی طرف نبی مبعوث کیا گیا تھا۔ اس طرح آپ نے ایک آغاز کر دیا جس کو پایہ تکمیل تک پہنچانا آپ کی اس امت کی ذمہ داری تھی جس کو آپ تیار کر رہے تھے۔

مکاتیب شاہ حبشہ، شاہ روم، شاہ ایران، پاپائے روم، شاہ دمشق اور متعدد گورنروں کے نام لکھے گئے۔ ان کا مختصر تذکرہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ شاہ حبشہ کے نام مکتوب:

شاہ حبشہ اصحمہ نے مکہ کے حالات سے دلبرداشتہ مسلمانوں کو اپنے ملک میں رہنے کی سہولت دی اور ان کو پورا تحفظ فراہم کیا۔ یہ مہاجرین ہجرت مدینہ کے بعد واپس مدینہ پہنچے۔ جعفر بن ابی طالبؓ تو اس وقت پہنچے جب خیبر فتح ہوا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا، میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے زیادہ خوشی خیبر کے فتح ہونے کی ہے یا جعفر کے حبشہ سے لوٹنے کی۔

اصحمہ کو حضورؐ نے پہلے ایک نامہ مبارک بھیجا اور اس کو اسلام لانے کی دعوت دی تھی لیکن اس نے دعوت سے متاثر ہونے کے باوجود اسلام قبول کرنے سے معذرت کر دی کہ حکومت میں میرے حامی کم ہیں۔ میں کوشش کر

رہا ہوں کہ اپنے مزید حمایتی پیدا کرلوں تا کہ اسلام کے لیے زمین ہموار ہو جائے۔ اب کافی وقت گزر چکا تھا لٰہذا حضورؐ نے دوسرا نامہء مبارک بھیجا جو یوں تھا:

''خدائے رحمان و رحیم کے نام سے۔ محمد رسول اللہ کی جانب سے حبشہ کے حکمران نجاشی کے نام۔

سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کو اختیار کرے۔ اس کے بعد میں تمہارے سامنے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، جو بادشاہ حقیقی، پاک ذات، سراپا سلامتی، امن دینے والا، تحفظ دینے والا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریم اللہ کا امر اور اس کا وہ کلمہ ہیں جس کو اس نے کنواری، پاکباز اور پاک دامن مریم پر القاء کیا تو وہ اس کے امر اور پھونک سے حاملہ ہو گئیں۔ یہ اسی طرح ہوا جس طرح اللہ نے آدم کو اپنی قدرت سے تخلیق کیا۔

میں آپ کو اللہ واحد لاشریک لہٗ کی طرف بلاتا ہوں اور اس کی اطاعت پر باہم تعلق کی دعوت دیتا ہوں۔ میں دعوت دیتا ہوں کہ آپ میری پیروی کریں اور اس پیغام پر ایمان لائیں جو میرے پاس آیا ہے۔ کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں آپ کو اور آپ کے تمام لشکروں کو اللہ عزوجل کی طرف بلاتا ہوں۔ میں نے اپنا پیغام پہنچا دیا اور حق نصیحت ادا کر دیا پس آپ اس نصیحت کو قبول کریں۔ سلامتی اسی پر ہے جو ہدایت پر چلے''۔

محمد رسول اللہ

اس نامۂ مبارک کو عمرو بن امیہ الضمری ؓ لے گئے۔ نجاشی نے مضمون سنا تو بے حد متاثر ہوا۔ اس نے نامہ مبارک کو بوسہ دیا اور سر پر رکھ لیا۔ اس کے بعد جواب میں لکھا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ میں نے آپ کے چچازاد بھائی (جعفرؓ بن ابی طالب) کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے اور اسلام میں داخل ہو گیا ہوں۔ میں آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے کو بھیج رہا ہوں۔ اگر حکم ہو گا تو خود بھی حاضر ہو جاؤں گا[1]۔

حضورؐ کا یہ نامۂ مبارک ابھی تک محفوظ ہے اور مکتوبات نبوی پر مشتمل کتب میں اس کا عکس دیکھا جا سکتا ہے[2]۔

انہی نجاشی کو حضورؐ نے پیغام بھیجا کہ ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان کا نکاح آپ سے کر دیں۔ ام حبیبہ رملہؓ اپنے شوہر عبیداللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کر گئی تھیں۔ عبیداللہ نے وہاں کے ماحول سے متاثر ہو کر نصرانیت اختیار

کر لی اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ام حبیبہؓ خاندانی مرتبہ کے اعتبار سے رئیس مکہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں اور غیر ملک میں ان کو بیوگی کا حادثہ پیش آ گیا۔ نبی ﷺ کو معلوم ہوا تو نجاشیؓ کو اپنا نمائندہ بنا کر عقد کی تجویز دی۔ نجاشیؓ نے ام حبیبہؓ کے عزیز خالد بن سعید بن العاصؓ کو پیغام دیا۔ ام حبیبہؓ نے قبول کر لیا تو نجاشی نے اپنے پاس سے چار سو دینار حق مہر ادا کر کے نکاح کروادیا۔ ام حبیبہؓ مسلمانوں کے قافلہ کے ہمراہ مدینہ تشریف لائیں۔

۲۔شاہ روم کے نام مکتوب:

سلطنت روما اس زمانہ میں دو حصوں میں منقسم تھی۔ مشرقی حصہ کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا اور مغربی حصہ کا روم۔ مشرقی حصہ میں موجودہ ترکیہ، شام اور فلسطین شامل تھے۔ اس کا حکمران قیصر کہلاتا تھا۔ نبی ﷺ کے زمانہ میں ہرقل (Heraclius) اس حصہ میں شاہ روم تھا۔ آپ نے دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ کو نامۂ مبارک دے کر ہرقل کے پاس بھیجا۔ دحیہ اسے لے کر بصریٰ کے گورنر کے پاس پہنچے اور اس کی وساطت سے ہرقل کے پاس گئے۔ ہرقل نے حکم دیا کہ معلوم کیا جائے کہ اس مدعی نبوت کی قوم کا کوئی فرد یہاں ہے یا نہیں۔ لوگوں نے جستجو کی تو معلوم ہوا کہ ابوسفیان قریش کے ایک گروپ کے ہمراہ تجارت کی غرض سے آئے ہوئے ہیں۔ ان سب کو بلوایا اور ہرقل کی نشست کے سامنے بٹھایا گیا۔ ہرقل نے دریافت کیا کہ نبوت کے اس دعویدار کے ساتھ نسب کے لحاظ سے جس شخص کا قریبی تعلق ہے وہ میرے پاس آئے۔ ابوسفیان کو قریب کیا گیا تو شاہ نے باقی ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں ابوسفیان سے کچھ سوالات کروں گا۔ اگر یہ جھوٹ بولیں تو تم لوگ ان کو جھٹلا دینا۔ ابوسفیان کہتے تھے کہ اللہ کی قسم، اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میں جھوٹا مشہور ہو جاؤں گا تو میں جوابات میں کچھ جھوٹ ملا لیتا۔ اب ترجمان کی مدد سے حسب ذیل گفتگو ہوئی:

ہرقل: تمہارے اندر اس شخص کا حسب کیسا ہے؟

ابوسفیان: وہ ہمارے اندر صاحب حسب ہے۔ (یعنی اونچے خاندان کا ہے)

ہرقل: اس کے آباء و اجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں

ہرقل: نبوت کے دعویٰ سے پہلے تم اس پر جھوٹ کی تہمت لگاتے رہے ہو؟

ابوسفیان: نہیں

ہرقل: اس کے پیروؤں میں کمزور لوگ ہیں یا سرداران قوم؟

ابوسفیان: وہ کمزور لوگ ہیں۔

ہرقل: ان کی تعداد بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟

ابوسفیان: یہ لوگ بڑھ رہے ہیں۔

ہرقل: کوئی شخص اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد اس سے ناراض ہو کر دین سے پھر گیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں

ہرقل: کیا اس کے ساتھ تمہاری کوئی جنگ ہوئی ہے؟

ابوسفیان: جی ہاں

ہرقل: جنگ کا نتیجہ کیا رہا؟

ابوسفیان: جنگ برابر کی چوٹ رہی ہے۔ اس نے ہمیں نقصان پہنچایا ہے اور ہم نے اس کو۔

ہرقل: کیا وہ عہد شکنی کرتا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔ اس وقت ہم صلح کی مدت میں ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس مدت میں وہ کیا کرتا ہے۔

ہرقل: اس سے قبل کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

اس کے بعد ہرقل نے ترجمان سے کہا کہ ابوسفیان کو بتاؤ کہ تمہارے کہنے کے مطابق وہ شخص صاحب حسب ہے تو رسول اپنی قوم کے بھلے لوگوں میں سے اٹھتے ہیں۔ اس کے بزرگوں میں کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔ اگر کوئی بادشاہ ہوا ہوتا تو میں کہتا کہ یہ شخص اپنے بزرگوں کی مملکت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے پیرو کمزور لوگ ہیں تو رسولوں کے پیرو ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا تو میں کہتا ہوں کہ جو شخص لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ آگے بڑھ کر اللہ کے اوپر کیوں بہتان لگائے گا۔ اس پر ایمان لانے کے بعد لوگ منحرف نہیں ہوتے تو ایمان کی حلاوت جب دل میں رچ بس جائے تو یہی کیفیت ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کے پیرو تعداد میں بڑھ رہے ہیں۔ جنگوں میں مقابلہ برابر رہا ہے تو رسول آزمائشوں کے مراحل سے گزر کر ہی بالآخر کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ اگر وہ عہد شکنی نہیں کرتا تو رسولوں کا کردار ایسا ہی ہوتا ہے۔

پھر ہرقل نے حضورؐ کی تعلیم کے بارے میں سوال کیا تو ابوسفیان نے بتایا کہ وہ ہمیں ایک اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانے کی ہدایت کرتا ہے۔ وہ ہمیں نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے، صلہ رحمی کرنے اور

پاک دامنی کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

اس کے بعد ہرقل نے کہا کہ سنو، اگر تمہارے جوابات درست ہیں تو یہ سچے نبی ہیں اور عنقریب وہ میرے قدموں کی جگہ پر قابض ہو جائیں گے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کا ظہور ہونے والا ہے مگر یہ معلوم نہ تھا کہ وہ تم لوگوں میں اٹھیں گے۔ اگر میں ان کے پاس ہوتا تو ان کے پاؤں دھوتا۔ یہ کہہ کر ہرقل نے مکتوب نبوی پڑھنے کا حکم دیا۔ اس کا مضمون یوں تھا:

> ''اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے۔ محمد بن عبداللہ، اللہ کے رسول، کی طرف سے سلطنت روما کے سربراہ ہرقل کے نام۔ اس پر سلامتی ہو جو اللہ کی ہدایت کی پیروی کرے۔ اس کے بعد میں آپ کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام قبول کرلیں تو محفوظ ہو جائیں گے، اللہ آپ کو دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔ اگر آپ نے منہ موڑا تو پوری رعایا کا گناہ آپ کے کندھوں پر ہوگا۔
>
> اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے علاوہ اپنے رب نہ بنالے۔ اگر وہ منہ پھیرلیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں''۔
>
> محمد رسول اللہ

یہ سنتے ہی ہرقل کے درباری مشتعل ہو گئے۔ جب جھگڑا بڑھ گیا تو ہرقل نے معذرت کی کہ میں جو باتیں کر رہا تھا وہ عیسائیت پر تمہاری استقامت دیکھنے کے لیے کر رہا تھا۔ یہ سن کر درباریوں اور پادریوں کا غصہ فرو ہوا لیکن ہرقل کو اسلام قبول کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔[3]

ابوسفیان کے ساتھ گفتگو میں ہرقل ایک ایسا حکمران نظر آتا ہے جو بہت بڑی سیاسی بصیرت رکھنے والا، انبیاء ورسل کی تاریخ پر نگاہ رکھنے والا، نبیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت سے واقف، نبی آخر الزماں کے بارے میں پیشینگوئیوں سے آگاہ اور عظیم دانشور تھا۔ اس نے اپنے سوالات میں دعوائے نبوت کرنے والے کسی بھی شخص کی صداقت کو پرکھنے کے لیے ایسے عقلی معیار قائم کیے ہیں جو بہت بڑا دانشور ہی قائم کرسکتا ہے۔ وہ دل سے یہ بات تسلیم کر چکا تھا کہ صاحب مکتوب سچے نبی ہیں، ان کی کامیابی روز روشن کی طرح واضح ہے اور بالآخر وہ اس کے

تخت حکومت کو بھی آ لیں گے لیکن درباریوں اور پادریوں کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کی اس کے اندر ہمت نہ تھی، اور تخت حکومت کی قربانی دینے کا وہ حوصلہ نہ کر سکا اس لیے ایمان سے محروم رہا۔

حضورؐ کا یہ مکتوب مبارک ابھی تک محفوظ ہے اور اس کا عکس کتابوں میں دستیاب ہے۔

۳۔ مصر کے حاکم کے نام:

سلطنت روما کا مشرقی حصہ ہرقل کے زیر اقتدار تھا لیکن مغربی حصہ، جس کا دار الحکومت روم تھا، اس سے بالکل الگ تھا۔ اس کا اقتدار مصر پر تھا اور نائب السلطنت مقوقس مصر کا حکمران تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے مقوقس کے نام بعینہٖ انہی الفاظ پر مشتمل مکتوب لکھوایا جو ہرقل کے نام مکتوب میں تھے۔ اگر فرق تھا تو صرف یہ کہ ہرقل کے نام مکتوب میں 'رعایا کا گناہ' کے الفاظ تھے اور مقوقس کے نام مکتوب میں 'قبطیوں کا گناہ' کے الفاظ لکھے گئے تھے۔ یہ مکتوب گرامی استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں محفوظ ہے۔

نامۂ مبارک کو حاطب بن ابی بلتعہؓ نے اسکندریہ میں مقوقس کو پہنچایا۔ اس نے جواب میں لکھا کہ مجھے یہ بات معلوم تھی کہ ایک نبی کی بعثت ہونے والی ہے لیکن میرا خیال تھا کہ وہ شام میں پیدا ہوں گے۔ میں نے آپ کے قاصد کو عزت و احترام کے ساتھ رکھا ہے۔ اس کے ہمراہ یہاں کے معزز خاندان کی دو لڑکیاں، آپ کے لیے پوشاک اور ایک عمدہ خچر بطور ہدیہ بھیج رہا ہوں۔ یہ لڑکیاں ماریہ اور سیرین تھیں جو حقیقی بہنیں تھیں۔ ماریہ سے حضورؐ نے نکاح کر لیا اور سیرین حسان بن ثابتؓ کو عطا کر دی۔ ماریہ کے بطن سے حضورؐ کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے جو ڈیڑھ سال کی عمر ہی میں انتقال کر گئے۔

مقوقس نے نہ اسلام لانے کی خواہش کا اظہار کیا اور نہ اسلام قبول کیا۔ حضور نے ہدایا تو قبول کر لیے لیکن مقوقس کے خط پر یہ تبصرہ فرمایا کہ مقوقس کو سلطنت کے اقتدار نے اسلام سے محروم رکھا، حالانکہ اس کی سلطنت ناپائیدار ہے۔[۴۴]

۴۔ پاپائے روم کے نام:

دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ ہرقل کے پاس اس کے نام کا مکتوب لے کر گئے تو ایک نامہ مبارک روم کے پاپائے اعظم ضغاطر کے لیے بھی لے گئے۔ اس کا مضمون یہ تھا:

"اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے۔ سلام اس پر جو خدا پر ایمان لایا۔ میں اس عقیدے پر ہوں کہ عیسیٰ بن مریم اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں جسے خدا نے پاک دامن مریم پر القا کیا۔ میں خدا

پر اور اس کے احکام پر اور اس کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں جو مجھ پر نازل ہوئیں اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر اتاری گئیں اور جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دیگر انبیاء کو ان کے رب کی جانب سے دی گئیں۔ نبیوں میں ہم کسی نبی کی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے آگے سر تسلیم خم کرنے والے ہیں۔ سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے"۔

پاپائے اعظم نے گرجے میں جا کر نامۂ مبارک پڑھا اور اس کی تصدیق کی۔ اس پر سامعین سخت مشتعل ہو گئے اور اپنے پیشوا کو اتنا پیٹا کہ ضغاطر جاں بحق ہو گئے۔

۵۔شاہ فارس کے نام مکتوب:

اس زمانہ میں خسرو پرویز ایران کی عظیم الشان سلطنت کا فرماں روا تھا۔ حضورؐ نے اپنا نامہء مبارک عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ کے ہاتھ خسرو کے پاس بھیجا۔ اس وقت وہ نینوا میں مقیم تھا۔ بادشاہ بڑے جاہ و جلال اور شکوہ سلطانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تخت پر متمکن تھا کہ معمولی لباس پہنے ایک سادہ لیکن جرأت مند شخص کو دربان اس کے حضور لائے۔ عبداللہؓ نے نامہ مبارک پیش کیا جو یوں تھا:

"اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے۔ اللہ کے رسول محمد کی طرف سے شاہ فارس کسریٰ کے نام۔ اس پر سلامتی ہو جو اللہ کی ہدایت کی پیروی کرے، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، نیز یہ کہ محمدؐ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں آپ کو اللہ کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں کیونکہ میں تمام لوگوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں، تاکہ ہر زندہ انسان کو خبردار کر دوں اور انکار کرنے والوں پر اللہ کا فرمان ثابت ہو جائے۔ اگر آپ اسلام قبول کر لیں گے تو محفوظ رہیں گے۔ اگر انکار کریں گے تو تمام مجوسیوں کا گناہ آپ کے کندھوں پر ہوگا"۔

خسرو اس طرح کے طرز خطاب سے آشنا تھا اور نہ درباری آداب کی خلاف ورزی کا تصور کر سکتا تھا۔ وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے مکتوب گرامی کو چاک کر دیا اور غضبناک ہو کر گرجا، ہمارے غلام کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ ہمارے نام اس طرح کے خط لکھے۔ اس نے فوراً یمن کے گورنر باذان کو حکم نامہ بھیجا کہ عرب کے مدعی نبوت کو گرفتار کر کے اس کے دربار میں حاضر کر دے۔ عبداللہ بن حذافہؓ نے دربار میں مختصر تقریر کی۔ بادشاہ کو تنبیہ کی اور برے انجام سے ڈرایا اور مدینہ کو چل دیے۔ انہوں نے بارگاہ نبوت میں تمام واقعہ بیان کیا تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا

کہ کسریٰ نے جس طرح میرا نامہ چاک کیا ہے، اس کی حکومت کے پرزے بھی عنقریب اڑ جائیں گے۔

ادھر باذان نے اپنے آدمی مدینہ بھیجے۔ انہوں نے گورنر کا حکم سنایا اور بتایا کہ اگر کسریٰ کے حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو وہ آپ کے ملک کو تباہ کر دے گا۔ حضورؐ نے فرمایا، تم جاؤ۔ خسرو خود ہلاک ہو چکا ہے اور اس کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا ہے۔ اپنے آقا کو بتاؤ کہ جلد اسلام کی حکومت کسریٰ کے دارالحکومت تک پہنچ جائے گی۔ باذان کے آدمی واپس پہنچے تو جلد اس کو فارس کے دارالحکومت سے یہ اطلاع ملی کہ خسرو کو اس کے بے پناہ مظالم کے سبب سے قتل کر دیا گیا ہے۔ اب نبی عربی کے ساتھ کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ باذان کو یقین ہو گیا کہ محمدؐ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ چنانچہ وہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

رسول اللہ کا مکتوب گرامی جو باریک جھلی پر لکھا ہوا ہے اور پھٹا ہوا ہونے کے سبب سے اس کو پیوند لگائے گئے ہیں لبنان کے ایک سابق وزیر خارجہ ہنری فرعون کے آبائی ذخیرہ کتب میں ۱۹۶۳ء میں دریافت ہوا۔ مکتوبات نبوی میں اس کا عکس موجود ہے۔

۶۔ گورنر یمامہ کے نام:

عرب کا علاقہ یمامہ فارس کے تحت تھا اور ہوذہ بن علی اس کا گورنر تھا۔ حضورؐ نے سلیط بن قیس انصاری کے ہاتھ اس کو نامہ مبارک بھیجا جس میں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور یہ پیشکش بھی کی کہ اسلام لانے کی صورت میں تمہارا ملک تمہارے قبضہ میں رہے گا۔ ہوذہ نے جواب میں لکھا کہ آپ مجھے اپنی حکومت میں شریک کر لیں تو میں آپ کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ حضورؐ نے اس کا مشروط جواب قبول نہیں فرمایا۔ اس کے جلد بعد ہوذہ کا انتقال ہو گیا۔

۷۔ شاہ شام کے نام:

شام کے علاقہ پر آل غسان کی حکومت تھی اور حارث وہاں کا حکمران تھا۔ حضورؐ نے اس کے نام اپنا مکتوب شجاع بن وہب الاسدیؓ کے ہاتھ بھیجا جس میں یہ پیشکش کی کہ اسلام لانے کی صورت میں اس کا ملک اسی کے پاس رہنے دیا جائے گا۔ حارث کہنے لگا کہ کس کی مجال ہے کہ وہ میرے ملک کی طرف نگاہ اٹھائے۔ حضورؐ کے علم میں یہ واقعات آئے تو آپ نے فرمایا کہ اس کی حکومت باقی رہنے والی نہیں ہے۔ چنانچہ پانچ سو سال سے قائم اس حکومت کا ۱۴ھ میں خاتمہ ہو گیا۔

خطوط کا مضمون:

رسول اللہ ﷺ نے عیسائی حکمرانوں کو جو مکاتیب لکھے ان میں قرآن مجید کا بتایا ہوا وہ پورا عقیدہ لکھا جو حضرت مسیح بن مریم کے بارے میں ہے اور اس کے بعد اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دی ہے۔ تینوں خطوط میں آیات قرآنی من وعن نقل کی گئی ہیں۔ مشرک حکمرانوں کے خطوط میں توحید کی تعلیم نمایاں کی ہے لیکن ان میں آیات نقل نہیں کی گئی ہیں۔

حکمرانوں کو اس بات کا احساس دلایا گیا ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ پوری رعایا کی ذمہ داری بھی ان پر ہے۔ اگر ان کے کفر کے باعث رعایا ہدایت سے محروم رہی تو رعایا کے کفر کا وبال حکمرانوں کی گردن پر ہوگا۔

ہرقل اور کسریٰ کے ایمان نہ لانے پر حضورؐ نے پیشینگوئی فرمائی کہ ''کسریٰ ہلاک ہوا۔ اس کے بعد اب کوئی کسریٰ نہ ہوگا۔ جب قیصر (ہرقل) ہلاک ہوگا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم دونوں سلطنتوں کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے''۔[5]

فی الواقع یہی ہوا۔ ہرقل جب ایلیاء سے قسطنطنیہ واپس گیا تو پھر بقیہ عمر اس کو شام آنا نصیب نہ ہوا۔ طبری کے مطابق چلتے ہوئے ہرقل نے سرزمین شام پر نظر ڈالی اور کہا کہ ''اے سوریا! میں اب ہمیشہ کے لیے تجھ سے رخصت ہو رہا ہوں''۔ کسریٰ کو جب حضورؐ کا نامہ مبارک پہنچا اس وقت وہ روم سے فیصلہ کن جنگ کی تیاری کر رہا تھا۔ اس جنگ میں اس کو شکست ہوئی۔ ادھر اس کے گھر کے اندر بغاوت ہوگئی اور اس کے بیٹے شیرویہ نے بادشاہ اور اس کے اٹھارہ بیٹوں کو قتل کر دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں ایرانی شہنشاہیت بالکل ختم ہوگئی۔ اسی طرح شام، فلسطین اور مصر کا علاقہ بھی خلافت اسلامیہ کا حصہ بنا۔ بعد کے ادوار میں اسلام مشرق، مغرب اور شمال میں پھیلتا چلا گیا اور یوں دنیا کی اقوام حضورؐ کی رحمۃ اللعالمینی سے فیض یاب ہوئیں۔

شمالی عرب کی مہمات:

جنوبی عرب، جہاں یہود و نصاریٰ دونوں کا خاصا اثر تھا، ہجرت کے بعد کئی سالوں تک نبی ﷺ کی توجہ اس لیے حاصل نہ کر سکا کہ اس کے رستے میں قریش حائل تھے اور مسلمانوں کی جماعتوں کے وہاں جانے میں خطرہ تھا کہ وہ گھیر لی جائیں گی اور غیر معمولی جانی نقصان ہوگا۔ اس کے برعکس شمالی عرب کے راستہ میں صرف یہود کے علاقے حائل تھے۔ چنانچہ اس علاقہ میں تبلیغی ٹیمیں بھی بھیجی جاتی رہیں اور قبائل کے ساتھ معاہدے بھی ہوئے۔ ربیع الاول

۵ھ میں نبی ﷺ ایک مہم لے کر دومۃ الجندل کے اہم شہر کو گئے جو شام اور عراق کی طرف جانے والے تجارتی رستوں کو کنٹرول کرتا تھا اور جہاں ایک عیسائی سردار اکیدر بن عبدالملک کی حکومت تھی۔ مدینہ میں یہ خبر پہنچی تھی کہ دومہ الجندل میں مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے کوئی فوج تیار ہو رہی ہے۔ آنحضرت ﷺ وہاں پہنچے تو ایسا کوئی اجتماع نہ تھا اور اگر تھا تو وہ آپ کی آمد سے قبل منتشر ہو چکا تھا۔ لہٰذا آپ نے اس سفر سے مختلف قبائل کے ساتھ روابط قائم کرنے کا فائدہ اٹھایا۔

اگلے سال حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو ایک بھاری جمعیت کے ساتھ بنوکلب کے پاس بھیجا گیا۔ یہ لوگ کئی روز تک علاقہ میں تبلیغ کرتے رہے۔ بالآخر بنوکلب کے سردار الاصبغ بن عمرو نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے زیر اثر بہت سے لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح کی ایک تبلیغی مہم ذات اطلاح میں بھیجی گئی۔ اس کے سربراہ کعب بن عمیر الغفاریؓ تھے اور اس میں صرف پندرہ آدمی شریک تھے۔ ان کی مڈبھیڑ ایک جمعیت سے ہوگئی جس نے مسلمانوں پر تیراندازی شروع کردی۔ اس جنگ میں ایک کے سوا تمام مسلمان شہید ہو گئے۔

جنگ موتہ:

معاہدہ حدیبیہ کے بعد نبی ﷺ نے ایک مکتوب رومی حکومت کے اس گورنر کے نام بھیجا جو بصریٰ میں تعینات تھا۔ یہ مکتوب لے کر آنحضرت ﷺ کے سفیر حارثؓ بن عمیر الازدی جا رہے تھے کہ موجودہ جنوبی اردن میں واقع شہر موتہ کے مقام پر ایک غسانی سردار شرحبیل بن عمرو نے ان کو قتل کر دیا۔ سفیر کا قتل ایک اشتعال انگیز واقعہ تھا جو رومی حکومت کی عملداری میں پیش آیا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کو حکومت کے اہل کاروں نے سنجیدگی سے نہیں لیا، اس لیے ضروری ہو گیا کہ آئندہ ایسے اقدامات کا راستہ روکنے کے لیے سخت قدم اٹھایا جائے۔ نبی ﷺ نے تین ہزار کا ایک لشکر تیار کیا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اس کے امیر تھے۔ آنحضرتؐ نے ان کو بصریٰ رخصت کرتے وقت جو ہدایات دیں ان میں یہ بات بھی تھی کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالبؓ امیر لشکر ہوں۔ اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہؓ کمان سنبھالیں۔ یہ لشکر شام میں معان کے مقام پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ آگے بہت بڑی تعداد میں رومی فوج جمع ہے اور عیسائی عرب قبائل لخم، جذام اور قضاعہ بھی اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اہل لشکر کی ایک رائے یہ ہوئی کہ صورت حال سے نبی ﷺ کو آگاہ کر کے نئے احکام لیے جائیں لیکن صحابہ کرام کا جذبہ ایمانی اس رائے کو قبول کرنے میں مانع ہوا۔ عبداللہ بن رواحہؓ نے رائے دی کہ اہل ایمان کبھی اپنی تعداد کے بل بوتے پر کامیاب نہیں ہوئے۔ وہ فتح یاب ہو جائیں یا شہادت پالیں، یہ دونوں باتیں ان کے حق میں

بہتر ہیں۔ لہٰذا انہیں دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ یہ رائے تسلیم کر لی گئی اور لشکر اپنی منزل پر پہنچ کر رومی افواج کے بالمقابل آ گیا۔ موتہ کے مقام پر جنگ ہوئی تو اس میں تینوں کمانڈر۔۔۔ زید بن حارثہؓ، جعفر بن ابی طالبؓ اور عبداللہؓ بن رواحہ۔۔۔ یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے۔ تینوں نے بڑی دلیری اور پامردی سے لشکر کی قیادت کی اور جب شہید ہوئے تو ان کے جسموں پر زخموں کا شمار ممکن نہ تھا۔ عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کے بعد، ایک قول کے مطابق، خالد بن الولیدؓ نے علم سنبھالا اور لڑتے ہوئے اپنی فوج کو دشمن کے گھیرے سے نکال لائے۔ دوسرے قول کے مطابق، اور یہی قول زیادہ قرین قیاس ہے، عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کے وقت شام ہو گئی۔ قاعدہ کے مطابق دونوں فوجیں اپنے اپنے کیمپ میں چلی گئیں۔ اگلی صبح کو اہل لشکر نے خالد بن الولیدؓ کو امیر نامزد کیا تو انہوں نے فوج کی نئی ترتیب قائم کی۔ لشکر کے مختلف حصوں کی پوزیشنیں بدل دیں۔ میمنہ کی جگہ میسرہ اور میسرہ کی جگہ میمنہ نے لے لی۔ مقدمہ کو ساقہ سے اور ساقہ کو مقدمہ سے بدل دیا۔ جب لشکر میدان میں اترا تو رومیوں نے اپنے بالمقابل مختلف اشخاص کو پایا۔ وہ سمجھے کہ مسلمانوں کو شب میں مدینہ سے کمک پہنچ گئی ہے۔ اس سے ان کا حوصلہ پست ہوا۔ پھر خالدؓ نے نہایت بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ روایات میں آتا ہے کہ اس جنگ میں ان کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹ گئیں۔ جب مدمقابل کا دم خم ختم ہوا تو اپنے لشکر کو پیچھے ہٹا لے گئے۔ حیرت انگیز طور پر اس لڑائی میں مسلمان لشکر میں سے صرف بارہ افراد نے شہادت پائی جبکہ رومیوں کا جانی نقصان بے پناہ ہوا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس سریہ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور خالد بن ولیدؓ کو مدینہ پہنچ کر لوگوں کے طعنے سننے پڑے۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر فی الواقع مسلمان شکست سے دوچار ہوئے ہوتے تو رومی افواج ان کا تعاقب کر کے ان کو تہس نہس کر دیتیں۔ ان کا تعاقب نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں نے ان سے سخت مقابلہ کیا جس سے رومیوں کا بے حد جانی نقصان ہوا اور مزید خطرہ مول لینے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ نیز اہل لشکر جب مدینہ پہنچے تو نبی ﷺ نے ان کا استقبال کیا اور خالد بن ولیدؓ کو جہاں شاباش دی، وہیں ان کو سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا لقب عطا فرمایا۔ اگر وہ شکست سے دوچار ہوئے ہوتے یا میدان جنگ سے فرار اختیار کر کے مدینہ آئے ہوتے تو نبی ﷺ کا ان کو شاباش دینا بالکل بے محل ہوتا۔

سریہ موتہ کا مقصد کسی رومی علاقہ کو فتح کرنا تو تھا نہیں، اس مہم سے شمالی عرب میں اسلام کو ایک روبہ ترقی طاقت کی حیثیت سے منوانا مقصود تھا اور یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ عرب قبائل کو پیغام ملا کہ خود عربوں کے اندر رومیوں سے ٹکر لینے والے پیدا ہو رہے ہیں اور ان کی جدوجہد سیاسی نہیں بلکہ دینی و اخلاقی ہے۔ رومیوں نے اگر اب تک اسلام کے حاملین کو اہمیت نہیں دی تھی تو اب ان پر واضح ہو چکا تھا کہ اگر انہوں نے مسلمانوں کے معاملات میں

انصاف سے کام نہ لیا تو معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے اور ایک بڑی طاقت ان کے آگے صف آرا ہو سکتی ہے۔

اگلے ہی ماہ مدینہ میں یہ خبر پہنچی کہ رومی حکومت کے ساتھ ہمدردی اور وفاداری نبھانے کی خاطر عیسائی قبیلہ قضاعہ اپنی قوت کو مجتمع کر رہا ہے۔ نبی ﷺ نے تین سو صحابہ پر مشتمل ایک جماعت حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی زیر کمان قضاعہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کی اور امیر لشکر کو ہدایت فرمائی کہ رستے میں آنے والے قبائل بلی، عذرہ اور بلقین کے مسلمانوں سے مدد لیں۔ عمروؓ کو اطلاع ملی کہ مخالف لشکر کی تعداد زیادہ ہے۔ انہوں نے مدینہ منورہ سے مزید کمک طلب کی۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح دو سو کا ایک لشکر لے کر فوراً پہنچے۔ ذات السلاسل کے مقام پر مقابلہ ہوا تو قضاعہ تتر بتر ہو گئے۔ یہ مہم بھی شمالی عرب کے عیسائی قبائل کو مرعوب کرنے کا باعث ہوئی۔

حوالہ جات

۱۔ تاریخ طبری۔ محمد بن جریر طبری۔ ج ۳

۲۔ مثلاً متعدد مکتوبات نبوی کا عکس۔ مکتوبات نبوی مصنفہ سید محبوب رضوی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۳۔ صحیح بخاری۔ باب کیف کان بدء الوحی

۴۔ الطبقات الکبریٰ۔ ابن سعد۔ ج ۲، ص ۱۷۷

۵۔ سیرۃ النبیؐ۔ ابن کثیر۔ ج ۲، ص ۳۵۹

باب 39

معاہدہ حدیبیہ کی منسوخی

مشرکین کے ساتھ معاہدوں پر نظر ثانی کا حکم:

صلح اور امن کی فضا نے بعض مسلمانوں پر منفی اثر ڈالا۔ معاہدہ سے قبل باہمی روابط نہ ہونے کے باعث مسلمانوں کے اندر شرک اور اہل شرک کے لیے شدید نفرت تھی۔ بدلے ہوئے حالات میں دوبارہ رحمی رشتوں اور دوستوں کی محبت عود کر آئی اور ان کے نام نامہ و پیام بھی شروع ہو گیا۔ اسی طرح بعض مشرکین نے بھی صلح و آشتی کے تعلقات، مسلمانوں کے لیے خیر سگالی کے جذبات اور ان کے ساتھ معاشرتی روابط کو اطمینان بخش پایا لیکن دین کی دعوت کے لیے اپنے کانوں کو کھولنا ضروری نہیں سمجھا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز رسول اللہ ﷺ کے منصب رسالت کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ آنحضرتؐ کا ہدف ملک میں محض امن و امان کا قیام نہ تھا۔ آپ کو تو اس لیے مبعوث کیا گیا تھا کہ آپ اللہ کی ہدایت اور دین حق کو عرب کے تمام ادیان پر غالب کر دیں۔ اس مقصد کا تقاضا یہ تھا کہ عرب کے لوگ اپنے مذہبی تصورات و مواقف سے دستبردار ہوں اور اسلام قبول کریں۔ لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ مشرکین عرب پر اب یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی نظروں میں صلح اور خیر سگالی کی کوئی اہمیت نہیں، اصل چیز دین اسلام کو اختیار کرنا ہے۔ لہٰذا جن قبائل نے مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے معاہدات کو اپنے لیے پناہ گاہ بنا لیا ہے ان سے یہ پناہ گاہ چھین لی جائے گی اور ان کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اسلام قبول کریں یا پھر مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں آ جائیں۔ دوسری صورت میں اہل ایمان ان کا قلع قمع کرنے پر مامور ہوں گے۔

یہ حالات تھے جن میں نبی ﷺ کو یہ ہدایات دی گئیں کہ مشرکین کے ساتھ کوئی نیا معاہدہ نہ کریں بلکہ اب تک جو معاہدات ہو چکے ہیں ان کا نئے سرے سے جائزہ لیں۔ اس کے لیے قرآن مجید کی سورہ براءت کی ابتدائی پندرہ آیات میں حسب ذیل رہنما اصول دیئے گئے:۔

ا۔ مشرکین کے ساتھ ولا اور دوستی کا تعلق باقی رکھنا دین توحید کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ خود مشرکین کے حقیقی جذبات مسلمانوں کے لیے لحاظ اور دوستی کے نہیں ہیں۔ آخر اہل ایمان ان کے لیے دل میں نرم

گوشہ کیوں رکھتے ہیں۔

۲۔ جن مشرک قبائل کے ساتھ دوستی کے معاہدے ہیں لیکن ان کے لیے کسی مدت کا تعین نہیں کیا گیا ان کے معاہدات کو چار ماہ کے نوٹس پر ختم کر دیا جائے۔ اس مدت کے اختتام پر ان کی حیثیت وہی ہوگی جو دوسرے مشرکین کی ہے۔ان کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہوگا۔

۳۔ جن مشرکین نے مسلمانوں کے ساتھ کوئی میعادی معاہدہ کیا تھا لیکن اس کا احترام نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کی، ان کے معاہدہ کو چار ماہ کے نوٹس پر کالعدم کر دیا جائے، اگرچہ اس معاہدہ کی قرارداد مدت ابھی باقی ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی معاہدہ کو یک طرفہ طور پر تقدس نہیں دیا جاسکتا۔

۴۔ جن قبائل نے معاہدوں کی حرمت کا لحاظ کیا اور مسلمانوں کے دشمنوں سے کوئی ساز باز نہیں کی، ان کے معاہدات کالعدم نہیں ہوں گے بلکہ ان کو ان کی قرارداد مدت تک باقی رکھا جائے گا۔لیکن جب یہ مدت ختم ہو جائے گی تو مدت معاہدہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ قبائل بھی عام مشرکین کی صف میں آ جائیں گے۔ سیرت نگاروں نے بنوضمرہ، بنومدلج اور کنانہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے معاہدوں کی ہمیشہ پاسداری کی اور ان کے معاہدے موقت بھی تھے۔ لہٰذا ان کو معاہدوں کی باقی ماندہ مدت تک کے لیے تحفظ دیا گیا۔

۵۔ جو معاہدہ مسجد حرام کے پڑوس میں طے پایا صرف اس کو یہ تقدس حاصل ہے کہ جب تک فریق ثانی اس کا احترام ملحوظ رکھے مسلمان بھی اس کو قائم رکھیں۔ مسجد حرام کے پڑوس میں صرف ایک ہی معاہدہ ہوا تھا اور وہ حدیبیہ کا معاہدہ تھا۔ اس میں فریق ثانی قریش تھے۔اس کی مدت بھی نہایت طویل یعنی دس سال تھی۔ اس کے بارے میں یہ پالیسی دی گئی کہ معاہدہ کا انحصار قریش کے رویہ پر ہے۔ مسلمان اس کو بہر طور نبھائیں کیونکہ حدود حرم میں منعقد ہونے کے باعث یہ نہایت محترم معاہدہ ہے لیکن جونہی قریش اس کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں مشرکین کے لیے دی گئی عمومی پالیسی کے تحت مسلمان بھی اس سے آزاد ہو جائیں گے۔اس کے بعد قریش پر بھی وہی قانون لاگو ہوگا جو عام مشرکین کے بارے میں دیا گیا ہے۔

۶۔ معاہدات ختم ہونے پر مشرکین کے ساتھ مسلمان اس وقت تک حالت جنگ میں ہوں گے جب تک وہ ایمان نہیں لاتے، نماز کا اہتمام نہیں کرتے اور زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ اگر وہ دین کے یہ واجبات پورے کرنے لگ جائیں تو ان کو مسلمانوں کی برادری میں شامل کر لیا جائے گا۔ان کو وہ تمام حقوق حاصل

ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ اگر وہ مسلمانوں کے خلاف اقدام کرتے ہیں تو اہل ایمان ان کے خلاف ہر طرح کی جنگی کارروائی کرنے کے مجاز ہوں گے۔

۷۔ جب مشرکین کی پکڑ دھکڑ شروع ہو اور کوئی مشرک قرآن سننے اور دین سے واقفیت حاصل کرنے کا خواہش مند ہو تو اس کو اس کی مہلت دی جائے گی اور اس دوران میں وہ تحفظ کا مستحق ہوگا۔

۸۔ مشرکین کے بارے میں اس پالیسی کا اعلان عام حج کے موقع پر کر دیا جائے تا کہ جزیرہ نمائے عرب کے دور دراز قبائل کو بھی معلوم ہو جائے کہ اب ان کا وجود بحیثیت مشرک اس سرزمین پر برداشت نہیں کیا جائے گا۔

مشرکین عرب سے براءت اور قطع علائق کی ان آیات کے زمانہ نزول کے بارے میں تعین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے لیکن ہماری رہنمائی کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ان آیات میں قریش کے بارے میں یہ پالیسی دے دی گئی ہے کہ ان کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کو اس وقت تک نبھایا جائے جب تک قریش اس کو نبھالے جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے گی۔ آنحضرت ﷺ اور بیعت رضوان کرنے والے صحابہ نے ذی قعدہ ۷ ہجری میں مکہ جا کر عمرہ ادا کیا لہٰذا اس وقت تک حدیبیہ کا معاہدہ قائم تھا۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کے بعد مذکورہ پالیسی کے تحت قریش کے ساتھ جنگ کے لیے رمضان ۸ ہجری میں مکہ پر چڑھائی کی گئی۔ لہٰذا ہمارے نزدیک سورہ براءت کی مذکورہ آیات کا نزول ان دونوں اہم واقعات کے درمیان کی مدت میں غالباً ۸ ہجری کے وسط میں کسی وقت ہوا ہوگا۔ اس وقت تک مشرکین عرب کو صلح کی فضا میں رہ کر اسلام کے بارے میں اپنے خدشات کو رفع کرنے کے لیے تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت مل چکی تھی اور آثار بتاتے ہیں کہ اس مہلت سے انہوں نے خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھایا تھا۔ باقی ماندہ ہٹ دھرم مشرکین کے لیے معاہدوں کی امان کو ختم کرنے کا یہ نہایت مناسب موقع تھا۔

بعض مورخین نے ان آیات کے نزول کا امکانی زمانہ ۹ ہجری کا موسم حج قرار دیا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ اس حج کے لیے بطور امیر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تقرر ہوا تھا۔ وہ جب سفر پر روانہ ہو گئے تو ان کے پیچھے نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکہ روانہ کیا اور ان کو ہدایت فرمائی کہ سورہ براءت کی مذکورہ آیات حج کے مجمع میں سنا دیں۔ اگر یہ آیات پہلے نازل ہو چکی تھیں تو ان کا اعلان حضرت ابوبکرؓ خود کر سکتے تھے۔ عام منادی کے لیے حضرت علیؓ کا بھیجا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آیات کا نزول حضرت ابوبکرؓ کے روانہ ہونے کے بعد ہوا۔ اگر یہ

رائے قبول کی جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ قریش کے ساتھ جنگ کا حکم فتح مکہ کے سوا سال بعد آیا۔ یہ بات نہایت مضحکہ خیز ہے کہ ایک حکم اس وقت دیا جائے جب اس کے مطابق عمل سوا سال قبل ہو چکا ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ قریش کے متعلق آیات پہلے نازل ہو چکی ہوں گی لیکن باقی پالیسی ۹ ہجری میں نازل ہوئی تو یہ بات بھی قرین قیاس نہیں۔ ان آیات میں قریش کو تو دوسرے مشرکین کے مقابل میں خاص اہمیت دے کر ان احکام سے مستثنیٰ کیا ہے جو دوسرے مشرک قبائل کے لیے تھے۔ یوں بھی آیات کو پڑھیے تو کلام میں تسلسل ہے۔ کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بعض آیات مختلف وقتوں میں نازل ہوئی ہوں۔

مزید برآں سورہ براءت کی انہی ابتدائی آیات کی روشنی میں نبی ﷺ نے مکہ کے بعض لوگوں کو چار ماہ سوچ بچار کی مہلت دی، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہو چکا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کے متعدد مقامات پر دیے گئے احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک کام کا پورا پلان دے دیا جاتا تھا اور آپ وقت کے تقاضے کے مطابق اس پر عمل فرماتے رہتے تھے، یہاں تک کہ پورے پلان پر عمل مکمل ہو جاتا۔ اسی طرح کا ایک پلان سورہ براءت میں بھی دیا گیا۔ اس کے بعض حصوں پر صلح کی مدت ہی میں عمل ہوا، بعض پر فتح مکہ کے مراحل میں اور بعض پر ۹ ھ کے حج میں جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امارت میں ہوا۔

رہ گئی یہ بات کہ موسم حج میں آیات کی منادی کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھیجا جانا آیات کے نزول کا قریب العہد ہونا ظاہر کرتا ہے تو یہ ضروری نہیں۔ آیت میں یہ ہدایت تھی کہ حج اکبر کے دن ان آیات کی عام منادی کر دی جائے۔ تو پہلا حج جس میں مسلمان شریک ہو سکے یہی ۹ ہجری کا حج تھا۔ ۸ ہجری کے زمانہ حج میں قریش، ثقیف اور ہوازن کے خلاف معرکوں کے باعث مسلمان ابھی اس قابل نہ ہوئے تھے کہ وہ سکون کے ساتھ حج کر سکیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اعلان کے لیے نامزد کرنا معاملہ کو اہمیت دینے کی غرض سے تھا۔ جب شرکائے حج میں یہ چرچا ہوا ہو گا کہ ان ہدایات کو ان تک پہنچانے کے لیے رسول اللہؐ کے ایک خاص ایلچی تشریف لائے ہیں تو ہر شخص کی نگاہوں میں معاملہ کی اہمیت دو چند ہو گئی ہو گی۔ اس لیے کسی حکم پر عمل درآمد کے زمانہ سے اس کے نزول کا زمانہ متعین کرنا دانشمندی نہیں ہے۔

سورہ براءت کی جس آیت میں معاہدہ حدیبیہ کے بارے میں پالیسی دی گئی ہے وہ یوں ہے:

كَيفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهد" عِندَاللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوله اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَام

فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. (براءت۹:۷)

مشرکین کے کسی عہد کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول پر کس طرح باقی رہ سکتی ہے؟ ہاں جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا ہے تو جب تک وہ قائم رہیں تم بھی ان کے لیے معاہدے پر قائم رہو۔ بے شک اللہ نقض عہد سے بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اسی سلسلہ کلام میں آگے فرمایا:

وَ اِنْ نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ بَعْدَ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَا اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ. (براءت۹:۱۲)

اور اگر عہد کر چکنے کے بعد یہ اپنے قول و قرار توڑ دیں اور تمہارے دین پر نیش زنی کریں تو تم کفر کے ان سرخیلوں سے بھی لڑو، ان کے کسی قول و قرار کا کوئی وزن نہیں، تاکہ یہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔

آیت میں لفظ ائمة الکفر استعمال ہوا ہے۔ یعنی کفر کے امام اور سرخیل۔ اس کا اطلاق قریش کے سوا کسی اور پر نہیں ہو سکتا۔ سارا عرب دین کے معاملات میں ان کا تابع تھا۔ پیشوائی اور سرداری کا مقام انہی کو حاصل تھا۔ اسلام کے خلاف کوئی پروپیگنڈا مہم ہوتی یا کوئی سیاسی اقدام، قریش اس کی پشت پر ہوتے اور نبی ﷺ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے دریغ نہ کرتے۔ لہٰذا ان کے حق میں یہ ہدایت فرمائی کہ ان کے ساتھ معاہدہ کو نبھانا۔ لیکن اگر یہ اپنی پوزیشن کے زعم میں معاہدہ توڑنے کے مرتکب ہوتے ہیں تو ان کا معاہدہ ان کے منہ پر دے مارنا۔

اعلان براءت کی پاسداری کی تلقین:

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ صلح کے ماحول نے بعض مسلمانوں پر بھی منفی اثر ڈالا تھا۔ چنانچہ جب مشرکین سے اعلان براءت کر دیا گیا، ان سے کیے گئے معاہدے چار ماہ کے نوٹس پر کالعدم قرار دیے گئے اور اس مدت کے خاتمہ پر ان کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا تو یہ احکام ان مسلمانوں پر گراں گزرے جن کے عزیز و اقارب ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ قرآن مجید نے ان مسلمانوں کو نہایت سخت الفاظ میں تنبیہ کی کہ وہ اپنے اور اللہ کے دشمنوں سے ہمدردی اور دوستی نہ رکھیں۔ یہ تو ان کی خیر خواہی کر رہے ہیں لیکن مشرکین اسلام دشمنی میں اندھے ہو رہے ہیں اور اگر وہ موقع پا جائیں تو اپنے ان خیر خواہوں کو بھی کچل کر رکھ دیں گے۔ قرآن مجید نے اہل ایمان کو اسوہ ابراہیمی پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ جب ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم سے اور اس کے معبودوں سے اعلان براءت کر دیا تو اس کے بعد انہوں نے قوم سے محبت کو بالائے طاق رکھ دیا اور دوبارہ صلح کے لیے ان کے ایمان سے کم کسی شرط کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ وہ اپنے اس اقدام پر بالکل نہیں گھبرائے اور پورا بھروسہ اللہ کی نصرت پر کیا۔ اہل

ایمان کو یہی طرز عمل زیبا ہے، نہ یہ کہ وہ در پردہ مشرکین سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کریں۔ یہ ہدایات سورہ الممتحنہ میں نازل ہوئیں۔ فرمایا:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَ مَآ اَعْلَنْتُمْ. وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ. اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ. لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ. وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَ مَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ. رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ.

(ممتحنہ ۶۰: ۱۔۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو اور ان کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اس حق کا انکار کیا ہے جو تمہارے پاس آیا۔ وہ رسول کو اور تم کو بھی اس بنا پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اللہ، اپنے خداوند، پر ایمان لائے۔ اگر تم میری راہ میں جہاد اور میری رضا جوئی کو نکلتے ہو، ان کی محبت میں رازدارانہ نامہ و پیام کرتے ہوئے، درآنحالیکہ میں جانتا ہوں جو تم چھپاتے اور جو ظاہر کرتے ہو، تو جو تم میں سے ایسا کرتے ہیں وہ راہ راست سے بھٹک گئے۔ اگر وہ تم کو پا جائیں تو وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے اور تم پر دست درازی بھی کریں گے اور زبان درازی بھی، اور چاہیں گے کہ تم کافر ہو جاؤ۔ تمہارے رشتے ناتے اور تمہارے آل و اولاد قیامت کے دن تمہارے کچھ بھی کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ اس دن اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔

تمہارے لیے بہترین نمونہ تو ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ہے جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے، جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بالکل بری ہیں۔ ہم نے تمہارا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے مابین ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بیزاری آشکارا ہو گئی تا آنکہ تم اللہ وحدہ لاشریک لہ پر ایمان لاؤ۔ بجز ابراہیم کی اپنے باپ سے اتنی بات کہ میں آپ کے لیے مغفرت مانگوں گا اگرچہ میں آپ کے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اے ہمارے رب، ہم نے تیرے اوپر بھروسہ کیا اور تیری طرف رجوع ہوئے اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔

روایات کے مطابق ان آیات کا رخ بالخصوص ایک صحابی حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی طرف ہے جنہوں نے مکہ پر حملہ کے پروگرام کی خبر قریش کو پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ چیز ثابت کرتی ہے کہ مشرکین کے معاہدوں سے اعلان براءت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی تلقین کی گئی کہ اب وہ بھی مشرکین سے دلی بیزاری اور براءت کا اظہار کریں۔ لہٰذا مذکورہ تمام آیات کا زمانہ نزول فتح مکہ سے چند ماہ قبل ہے، ۹ ہجری ہرگز نہیں۔

قریش کی طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی:

یاد ہوگا کہ قریش کی لیڈر شپ میں ایک گروہ ایسا تھا جس نے حدیبیہ میں مصالحت کی ہر کوشش کی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے ان رؤسا کی تحقیر کی جنہوں نے صلح کے حق میں رائے دی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کے جذبات بھڑکا کر ان کو جنگ کی راہ اختیار کرنے پر تیار کرنا چاہا لیکن مسلمانوں نے ان کی ہر ایسی کوشش ناکام بنا دی۔ انہوں نے نبی ﷺ کے سفیر پر قاتلانہ حملہ کر کے معاملہ کو بگاڑنے کی کوشش کی لیکن اس سے بھی مسلمان مشتعل نہ ہوئے۔ چونکہ قریش کی اکثریت اور ان کی موثر لیڈر شپ مسلسل حالت جنگ سے بیزار ہو چکی تھی اس لیے معاہدہ صلح طے پا گیا۔ یہ جذباتی لیڈر اپنی مرضی کا کوئی فیصلہ مسلط کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب بنوخزاعہ مسلمانوں کے اور بنوبکر قریش کے حلیف بن کر معاہدہ صلح کے فریق بن گئے تو قریش کے ان جذباتی لیڈروں کو فساد کا بیج بونے کا موقع مل گیا۔ ان دونوں قبیلوں کے درمیان پرانی مخاصمت تھی۔ کسی موقع پر وہ آپس میں الجھ پڑے تو قریش کے ان لیڈروں نے بنوخزاعہ کو مسلمانوں کی حمایت کرنے پر سبق سکھانے کی ٹھانی اور بنوبکر کو مال، اسلحہ اور افرادی قوت مہیا کر کے ان پر حملہ کے لیے اکسایا۔ بنوبکر نے بنوخزاعہ پر شب خون مارا ان کے بیس آدمی قتل کر دیے۔ بنوخزاعہ مدافعت کرتے ہوئے حدود حرم میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے لیکن حملہ آوروں نے قریش کی شہ پا کر حرم کے تقدس کو بھی پامال کیا۔ اس تعدی کی اطلاع بنوخزاعہ نے پہلے اپنے نمائندہ عمرو بن سالم کے ذریعے نبی ﷺ کو دی، پھر ان کا سردار بدیل بن ورقا خود ایک وفد لے کر مدینہ پہنچا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے حلیفوں کو تسلی دی کہ اس تعدی کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

قریش سرداروں نے جب تمام معاملہ پر سنجیدگی سے غور کیا تو ان کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ بنوخزاعہ کے مقابل میں بنوبکر کا ساتھ دے کر معاہدہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے تھے کیونکہ فریقین کے حلیفوں پر حملہ خود فریقین پر حملہ کے مترادف تھا۔ اپنی تعدی کی تلافی کے لیے قریش نے اپنے سردار ابوسفیان کو مدینہ بھیجا کہ وہ نبی ﷺ سے معذرت کریں اور معاہدہ باقی رکھنے کی استدعا کریں۔ ابوسفیان نے نہ صرف خود نبی ﷺ کے

سامنے یہ درخواست پیش کی بلکہ سرکردہ مسلمان زعماء ---حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ--- سے بھی آنحضرت ﷺ سے سفارش کرنے کی درخواست کی مگر کسی نے ابوسفیان کی بات پر کان نہیں دھرا۔ چونکہ اس واقعہ سے قبل وہ آیات نازل ہو چکی تھیں جن میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس معاہدہ کے مستقبل کا انحصار قریش کے رویہ پر ہوگا، جب تک وہ اس پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو اور جب وہ اس کی خلاف ورزی کریں تو تم بھی معاہدہ ختم کر دو، لہٰذا ابوسفیان کی درخواست کے جواب میں معاہدہ سے اعلان براءت کر دیا گیا۔

بعض سیرت نگاروں کا خیال ہے کہ ابوسفیان مدت معاہدہ میں اضافہ کا خواستگار تھا۔ یہ بات لایعنی ہے کیونکہ صلح کی مدت تو دس سال طے تھی اور ابھی اس میں سے صرف ڈیڑھ برس کا عرصہ گزرا تھا۔ ابوسفیان کی مدینہ آمد کا مقصد معاہدہ کو ٹوٹنے سے بچانے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح بعض سیرت نگاروں نے ایک شاذ روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قریش کے نقض عہد کے بعد نبی ﷺ نے ان کے سامنے تین تجاویز رکھیں کہ بنوخزاعہ کے مقتولین کی دیت ادا کی جائے یا قریش بنوبکر کی حمایت سے دستکش ہو جائیں یا معاہدہ حدیبیہ کے ٹوٹنے کا اعلان کر دیا جائے۔ قریش نے ان میں سے تیسری تجویز مان لی۔ یہ روایت کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ اول تو اس کی رو سے جس شخص نے قریش کی طرف سے تیسری تجویز ماننے کا پیغام مدینہ بھجوایا وہ کوئی غیر معروف آدمی ہے جبکہ بین الاقوامی معاہدات میں ہمیشہ فریقین کے ذمہ دار لوگ ہی پیغام وصول کرتے اور اس کا جواب دیا کرتے ہیں۔ دوسرے، واقعہ کی اس شکل میں ابوسفیان کے مدینہ جانے کا مشن بامقصد نہیں رہ جاتا۔ تیسرے، معاہدات کے بارے میں سورہ براءت کی آیات کے نزول کے بعد نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات پر مامور تھے کہ وہ معاہدہ کو ختم کر دیں اور کفر کے اماموں سے قتال کریں تاکہ بیت اللہ پر ان کا تسلط ختم ہو اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے وعدہ فتح کی تکمیل ہو۔ آنحضرت ﷺ وحی کی ہدایات کی خلاف ورزی میں کوئی قدم اٹھاتے، یہ بات تصور میں بھی نہیں لائی جا سکتی۔ لہٰذا ہمارے نزدیک یہ روایت بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ابوسفیان نے مدینہ جا کر معاہدہ باقی رکھنے کی استدعا کی جس کو آنحضرت ﷺ نے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ اب نہ صرف قریش بلکہ حالات پر نظر رکھنے والے ہر شخص پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح تھی کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کی کشیدگی پھر لوٹ آئی ہے اور اب یہ دونوں فریق پہلے کی طرح حالت جنگ میں ہیں۔ دوسرے الفاظ میں معاہدہ حدیبیہ فی الواقع فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور قریش کی طرف سے اس کی ایک دفعہ کی خلاف ورزی نے اس عظیم الشان فتح کی راہ ہموار کر دی۔

باب 40

فتح مکہ

فتح مکہ اسلام کی تاریخ کا سب سے اہم اور درخشاں واقعہ ہے۔ ہجرت کے فوراً بعد نبی ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کو جو ہدف دیا گیا وہ یہ تھا کہ اللہ کے گھر کو شرک کی نجاست سے پاک کریں اور اس پر قابض مشرکین کو وہاں سے بے دخل کریں۔ مسلمانوں کو اسی لمحے بتا دیا گیا تھا کہ اس منزل کو پانا آسان نہیں ہوگا۔ اس کی طرف لے جانے والا راستہ نہایت کٹھن ہے۔ قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں گی جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جان و مال کا نقصان برداشت کرنا ہوگا۔ قدم ڈگمگائیں گے لیکن اللہ پر بھروسہ کرنے اور ثابت قدمی دکھانے والے بالآخر کامران ہوں گے۔ پھر جس طرح معاہدہ حدیبیہ کے بعد سورہ فتح نازل ہوئی جس میں معاہدہ کو فتح مبین قرار دے کر پیشگوئی کی گئی کہ یہ معاہدہ فتح مکہ کی کلید ثابت ہوگا اسی طرح فتح مکہ سے قبل سورہ نصر نازل ہوئی جس میں پہلے سے خبر دے دی گئی کہ نصرت خداوندی کے طفیل مکہ فتح ہوگا اور اس کے بعد مشرکین عرب جوق در جوق اسلام میں داخل ہوں گے۔ شرک پر اسلام کے اس غلبہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کے مشن کی تکمیل ہو جائے گی۔ حیرت ہے کہ تاریخ اسلام کے اس اہم موڑ کے بارے میں تاریخ اور سیرت کی کتابیں جو نقشہ کھینچتی ہیں وہ کچھ یوں ہے کہ نبی ﷺ نے اس مہم کو ایک سربستہ راز بنا دیا جس کی خبر اپنے معتمد ترین ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بھی نہیں ہونے دی۔ قریش جو اس مہم کی زد میں آنے والے تھے، اس کی طرف سے ایسے غافل رہے کہ انہیں کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور آنحضرت ﷺ دس ہزار کا لشکر لے کر ان کے سروں پر جا پہنچے۔ پھر مکہ میں داخلہ کی جو روداد بیان کی گئی ہے وہ کچھ ایسی ہے کہ ہمارے فقہا آج تک یہ طے نہیں کر پائے کہ مکہ جنگ کے نتیجہ میں فتح ہوا یا بغیر جنگ کے اس پر قبضہ ہو گیا۔ شاید سیرت نگاروں کی اعجوبہ پسند طبائع کو اسی سے تسکین حاصل ہوتی ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے مشن کی تکمیل کی اس شاندار اور کامیاب مہم کو اس قدر غیر حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کریں۔

مکہ پر حملہ کی تیاری:

ابوسفیان کی معاہدہ حدیبیہ کو برقرار رکھنے کی درخواست کو مسترد کرنے کے بعد نبی ﷺ نے کفار قریش پر آخری ضرب لگانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آپ نے مدینہ اور گردونواح کے مسلمانوں کو جنگ کے لیے تیار ہونے کا حکم دیا اور تمام حلیف قبائل اور نومسلم قبائل میں بھی اپنے داعی بھیجے کہ وہ لوگوں کو جنگ کے لیے تیار کریں۔ حدیبیہ کی مہم کے ضمن میں ہم بتا چکے ہیں کہ نبی ﷺ کے سفر عمرہ میں بہت سے بدوی قبائل نے اس بنا پر شمولیت سے انکار کر دیا تھا کہ وہ اس سفر کو موت کے منہ میں جانے کے مترادف سمجھتے تھے۔ معاہدہ حدیبیہ کی تکمیل کے بعد جب سورہ فتح نازل ہوئی تو اس میں ان قبائل کی کمزوری اور ضعف ایمانی کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ یہ خبر بھی دی گئی کہ ایک قریبی مہم میں مال غنیمت ملنے کے مواقع نظر آئیں گے تو یہ لوگ اس میں شامل ہونا چاہیں گے لیکن ان کو اس مہم میں شرکت کی ہرگز اجازت نہ دی جائے البتہ اس کے بعد ایک بڑی مہم اور طاقتور دشمن سے مقابلہ کے اسباب پیدا ہوں گے، اس مہم میں ان لوگوں کو بلایا جائے تا کہ یہ اپنی وفاداری کا ثبوت دے سکیں۔ قریبی مہم غزوہ خیبر کی تھی جس میں صرف بیعت رضوان کرنے والے صحابہ کو شمولیت کی اجازت دی گئی۔ بڑا معرکہ اور سخت جان دشمن سے مقابلہ اب درپیش تھا۔ قریش ملک کی سب سے بڑی قوت تھے اور مکہ کو فتح کرنا ایک مشکل مہم تھی۔ چنانچہ سورہ فتح کی مذکورہ ہدایات کے مطابق آنحضرت ﷺ نے اقدام فرمایا۔ وہ آیات یوں ہیں:۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْيُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا. لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ. وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا. (فتح ۴۸: ۱۶-۱۷)

اہل بدو میں سے ان پیچھے چھوڑے ہوئے لوگوں سے کہہ دو کہ عنقریب تم لوگ ایک طاقتور حریف سے لڑنے کے لیے بلائے جاؤ گے، تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ اسلام لائیں گے۔ تو اگر تم نے اس حکم کی اطاعت کی تو اللہ تم کو ایک اچھا اجر دے گا اور اگر تم نے منہ موڑا، جیسا کہ تم نے پہلے منہ موڑا، تو وہ تم کو ایک دردناک عذاب دے گا۔ نہ نابینا پر کوئی گناہ ہے، نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ مریض پر کوئی گناہ ہے۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہے گا اللہ اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور جو روگردانی کرے گا تو اللہ اس کو ایک دردناک عذاب دے گا۔

روایات کے مطابق آنحضرت ﷺ نے بدوی قبائل اسلم، جہینہ، غفار، بنوضمرہ، بنوالحصین، اشجع، مزینہ،

بنوسلیم اور بنوکعب کی طرف انہی قبائل سے تعلق رکھنے والے اصحاب کو بھیجا کہ وہ لوگوں کو جنگ میں شرکت پر ابھاریں اور ان سے کہیں کہ جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ رمضان میں مدینہ پہنچے۔ ان اصحاب کے نام کتب سیرت میں بیان ہوئے ہیں اس لیے ان کو دہرانا تحصیل حاصل ہوگا[1]۔ سورہ فتح کے نزول کے بعد جہاد کی ترغیب دینے کے لیے داعیوں کو بدوی قبائل میں بھیجنے کا اہتمام نمایاں طور پر اسی مہم میں نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اہتمام حکم خداوندی کی تعمیل میں تھا۔ اس مہم سے قبل ایک جنگ موتہ کے مقام پر لڑی گئی لیکن اس میں نبی ﷺ شریک ہوئے اور نہ اس میں بڑے پیمانے پر لشکر کشی کی نوبت آئی کہ اہل بدو کو اس میں شمولیت کی دعوت دی جاتی۔ لیکن فتح مکہ کے لیے خود قرآن مجید نے مسلمانوں کو غیرت دلائی کہ اگر وہ اس مرحلہ پر نہیں اٹھیں گے تو دوبارہ کب اٹھنے کا وقت آئے گا۔ قرآن کے الفاظ ہیں:۔

> اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (براءت ۹:۱۳)
>
> کیا تم ایسے لوگوں سے نہ لڑو گے جنھوں نے اپنے قول و قرار توڑ دیے اور رسول کو نکالنے کی جسارت کی۔ اور وہی ہیں جنھوں نے تم سے جنگ چھیڑنے میں پہل کی۔ کیا تم ان سے ڈرو گے؟ اصلی حقدار تو اللہ ہے کہ تم اس سے ڈرو، اگر تم واقعی مومن ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ قریش ہی تھے جنھوں نے مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے وجود کو برداشت نہ کیا اور آپ کو ہجرت پر مجبور ہونا پڑا، پھر یہ قریش ہی تھے جنھوں نے بدر، احد اور احزاب کی جنگوں میں سردھڑ کی بازی لگادی کہ وہ مسلمان گروہ کا استیصال کردیں۔ اس کے بعد جب معاہدہ حدیبیہ ہوچکا تو یہ قریش ہی تھے جو اپنے قول و قرار توڑ کر معاہدہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے۔ ان کے جرائم گنا کر مسلمانوں کو اکسایا ہے کہ وہ ان کی طاقت سے مرعوب نہ ہوں اور صرف خدا کا ڈر دل میں رکھتے ہوئے اس اسلام دشمن گروہ سے برسرپیکار ہوجائیں۔ ان آیات کا اطلاق قریش کے سوا کسی دوسرے گروہ پر نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن مجید میں موجود اس واضح ہدایت اور نبی ﷺ کے داعیوں کو قبائل میں بھیجنے کے اقدام کے بعد کتب سیرت کی یہ روایت صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ نبی ﷺ نے اس مہم کے مقاصد سے مسلمانوں کو بے خبر رکھا۔ جب خود قرآن اس مہم کے لیے مسلمانوں کو ابھار رہا تھا تو آنحضرت ﷺ کیوں اس کے برعکس طرز عمل اختیار کرتے اور مسلمانوں میں جہاد کے لیے جوش و جذبہ پیدا کرنے سے اجتناب فرماتے۔ قرآن نہ صرف جذبہ جہاد کو ابھار رہا تھا

بلکہ واضح الفاظ میں اس مہم میں کامیابی کی بشارت بھی دے رہا تھا:

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ. وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ. وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ" حَكِيْمٌ". (براءت ۹: ۱۴۔۱۵)

تم ان سے لڑو، اللہ تمہارے ہاتھوں ان کو سزا دے گا، ان کو رسوا کرے گا، تم کو ان پر غلبہ دے گا، اہل ایمان کے ایک گروہ کے کلیجے ٹھنڈے کرے گا اور ان کے دلوں کا غم وغصہ دور فرمائے گا۔ اور جن کو چاہے گا اللہ توبہ کی توفیق دے گا۔ اللہ علم وحکمت والا ہے۔

ان آیات کی موجودگی میں ہمارے نزدیک وہ روایات قابل ترجیح ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ نبی ﷺ نے لوگوں کو جہاد کی تیاری کا حکم دیا اور ان پر واضح کر دیا کہ آپ کا ارادہ مکہ پر حملہ کا ہے۔ امام ذہبی اپنی تاریخ اسلام کے حصہ المغازی میں لکھتے ہیں:

ثم امر رسول الله ﷺ بالجهاد و امر اهله ان يجهزوه ثم اعلم الناس بانه يريد مكه

پھر رسول اللہ ﷺ نے جنگ کی تیاری کا حکم دیا، اپنے گھر والوں کو بھی آپ کے لیے تیاری کرنے کی ہدایت دی، پھر لوگوں کو بتا دیا کہ آپ کا ارادہ مکہ پر حملہ کا ہے۔

زادالمعاد میں ہے:

اعلم الناس انه سائر الى مكه فامرهم بالجد و التجهيز

آپ نے لوگوں کو خبر دی کہ آپ مکہ کو جانے والے ہیں۔ پھر ان کو معاملہ سنجیدگی سے لینے اور اس کے لیے تیاری کرنے کا حکم دیا۔

اس مضمون کی روایات تاریخ طبری اور الکامل فی التاریخ میں بھی ملتی ہیں۔

بعض سیرت نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ نبی ﷺ نے مکہ جانے کا جو راستہ اختیار کیا وہ دشمن کو اندھیرے میں رکھنے کے لیے نہایت غیر معروف اختیار کیا گیا۔ حقائق اس بیان کے بھی منافی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ لوگوں کو منزل کا علم تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو روانگی کا پورا ٹائم ٹیبل اور سفر کی تمام منزلیں بھی بتا دی گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ سے ۱۰ رمضان ۸ ہجری کو جب مجاہدین مکہ کو روانہ ہوئے تو ان کی تعداد ساڑھے سات ہزار تھی۔ مدینہ اور مکہ کے درمیان پڑنے والی منزلوں پر اردگرد کے قبائل کے مسلمان ان میں شامل ہوتے گئے حتیٰ کہ مکہ کے قریب مــر الـظهـران کی منزل پر پہنچتے پہنچتے لشکر کی تعداد دس ہزار ہو چکی تھی۔ جو قبائل راستے میں شامل ہوئے ان میں غفار، اشجع، بنوسلیم، خزاعہ اور بنوضمرہ کے نام آتے ہیں۔ عام زندگی میں بھی جب تک پوری منصوبہ بندی کر کے مہم

کے نظام الاوقات سے لوگوں کو آگاہ نہ کر دیا جائے اس میں ان کی شرکت کو یقینی نہیں بنایا جا سکتا۔ یہاں تو معاملہ طاقتور دشمن پر حملہ کا تھا، راستے کے قبائل کو نظام الاوقات سے بے خبر رکھ کر کوچ کے دوران ان کی شمولیت کی توقع کیسے کی جا سکتی تھی جبکہ یہ سارا سفر سات آٹھ دن میں طے کیا گیا۔

یوں بھی جس بڑے پیمانے پر لشکر کشی کا انتظام کیا گیا وہ عرب کی تاریخ میں اپنی مثال آپ تھا۔ ڈیڑھ دو درجن قبائل کی طرف فرستادے بھیج کر پیش نظر مہم میں شرکت کے لیے متحرک کیا گیا۔ سورہ فتح کی آیت نمبر ۱۷ کی رو سے، معلوم ہوتا ہے، مسلمانوں کے ہر قابل جنگ فرد پر لازم کیا گیا تھا کہ وہ اس مہم سے پیچھے نہ رہے۔ صرف معذور و مریض افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ مختلف علاقوں اور قبائل سے ہزاروں افراد کا مسلح ہو کر خاص تاریخوں میں یکجا ہو جانا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ تھا جس کو چھپائے چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار ہی سے ایسے واقعہ کی دھوم مچ جاتی ہے اور خاص طور پر ان لوگوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں جن کے خلاف کسی کارروائی کا امکان ہوتا ہے۔

رازداری کا نظریہ قائم ہونے کے اسباب:

دو باتیں ایسی ہیں جن کی بدولت سیرت نگاروں کا ذہن اس طرف گیا ہوگا کہ مکہ پر لشکر کشی بالکل رازدارانہ انداز میں ہوئی۔ ایک حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کا قریش لیڈروں کے نام خط جس کو لے کر ایک خاتون مکہ جا رہی تھی اور وہ راستے میں پکڑا گیا اور اس پر حاطبؓ کی جواب طلبی ہوئی۔ دوسری نبی ﷺ کی یہ دعا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی آنکھوں اور کانوں پر پٹی باندھ دے اور مسلمان ان کو دفعتہً جا لیں۔ یہ دعا آپ نے سفر شروع کرنے سے بہت پہلے مدینہ میں کی تھی۔

حاطبؓ کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے اقربا مکہ میں تھے۔ وہاں ان کا کوئی حامی نہ تھا۔ حاطبؓ کو جب مکہ پر فوج کشی کا علم ہوا تو انہوں نے ایک مکتوب قریش میں اپنے بعض دوستوں کے نام لکھا جس میں خبر دی کہ نبی ﷺ اتنا بڑا لشکر لے کر تم پر حملہ آور ہونے والے ہیں جو رات کی طرح چھا جانے والا اور سیلاب کی طرح بہا لے جانے والا ہو گا۔ وہ تنہا بھی ہوں تو اللہ ان کی نصرت فرماتا ہے۔ اب تو وہ ان کے ساتھ اپنا وعدہ فتح و نصرت پورا کرنے والا ہے اس لیے تم اپنا بندوبست کر لو۔ مکتوب پکڑے جانے پر حاطبؓ کی جواب طلبی ہوئی تو انہوں نے وضاحت پیش کی کہ اس خبر کے پہنچانے سے مجھے یہ توقع تھی کہ قریش میرے احسان مند ہوں گے اور میرے اقربا کو کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے۔ اس وضاحت پر حاطبؓ کو معاف کر دیا گیا۔ ہمارے نزدیک حاطب کا واقعہ خود اس بات کا شاہد ہے کہ مدینہ میں لوگوں کو یہ اطلاع تھی کہ فوج کشی مکہ پر ہونے والی ہے۔ اس معاملے کو راز نہیں رکھا گیا تھا۔ جہاں تک

حاطبؓ کی جواب طلبی کا تعلق ہے تو عسکری نظام میں کبھی یہ بات برداشت نہیں کی جاتی کہ اس کے فوجیوں کی وفاداریاں دشمن فریق کے ساتھ ہوں۔ اگر ایسے واقعات نوٹس میں آئیں تو ان کی تحقیق ضروری ہوتی ہے ورنہ اپنے ہی نادان فوجیوں کے ہاتھوں بڑا نقصان ہوسکتا ہے۔ حضرت حاطبؓ نے اعلان براءت کے ان تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا تھا جن کا ذکر ہم اوپر سورہ الممتحنہ کے حوالہ سے کر چکے ہیں۔ دیکھا جائے تو حاطبؓ کے خط کی نوعیت ایسی نہیں کہ وہ کوئی فوجی راز افشا کرنے کے مرتکب ہوئے ہوں۔ بلکہ یہ خط منزل تک پہنچ جاتا تو دشمن کو خوفزدہ کرنے ہی کا باعث بنتا۔

نبی ﷺ کی دعا کا معاملہ یہ ہے کہ جب معاہدہ کو قائم رکھنے کے لیے ابوسفیان کی کوشش ناکام ہوگئی اور اس پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اب مسلمان قریش کے خلاف حالت جنگ میں ہیں تو وہ مدینہ سے پریشانی کے عالم میں نکلا۔ اس کو جاتے دیکھ کر آنحضرت ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے **اللھم شد علی ابصارھم و اسماعھم فلا یرونی الا بغتة** (اے اللہ، قریش کی آنکھوں اور کانوں پر پٹی باندھ دے، اب وہ مجھے اچانک ہی دیکھیں) یہ الفاظ واقدی کے ہیں۔ زادالمعاد میں دعا کے الفاظ یوں ہیں **اللھم خذ العیون و الاخبار عن قریش حتی نبغتھا فی بلادھا** (اے اللہ، قریش سے مشاہدات واطلاعات روک لے جب تک ہم ان کے علاقے میں ان کو اچانک نہیں جالیتے) اس دعا کی قبولیت کی واحد شکل یہ نہیں ہے کہ قریش ایک عرصہ تک مدینہ کی تیاریوں سے بالکل تاریکی میں رہے ہوں اور ان کو قبائل میں مسلمانوں کی آمدورفت اور تحریک جہاد کی مطلقاً خبر نہ ہونے پائی ہو۔ ایسا ہونا عملی زندگی میں کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔ قبائل میں سب مسلمان ہی نہ تھے مشرک بھی تھے جن کی ہمدردیاں قریش کے ساتھ تھیں۔ نیز مسلمانوں کے بعض حلیف قبائل مکہ سے اس قدر قریب آباد تھے کہ ان کی ہر حرکت قریش کے علم میں ہوتی تھی۔ ہمارے نزدیک نبی ﷺ کی دعا اس طرح قبول ہوئی کہ قریش بے بسی کے ساتھ تمام صورت حال کو دیکھتے رہے لیکن یہ حوصلہ ان سے چھین لیا گیا کہ وہ مقابلہ کے لیے تیاری کر کے میدان میں اترتے اور مسلمانوں کو راستہ ہی میں جا لیتے۔ آنکھیں اور کان رکھتے ہوئے مزاحمت کی توفیق نہ پانا نبی ﷺ کی دعا کی قبولیت نہیں تو اور کیا ہے؟ اسی بات کو بعد میں آنحضرت ﷺ نے اس اسلوب میں بیان فرمایا کہ **نصرت بالرعب** کہ دشمن کی مرعوبیت کے ذریعے میری نصرت فرمائی گئی۔

حقیقت یہ تھی کہ صلح کے دو سالوں میں حالات میں بڑا تغیر واقع ہو چکا تھا۔ قریش کے چیدہ نوجوان لیڈر

-- خالد بن ولید، عمرو بن العاص، عثمان بن طلحہ، معاویہ بن ابی سفیان وغیرہم -- مسلمان ہو کر مدینہ کو ہجرت کر چکے تھے۔ مکہ کے گھر گھر میں اسلام کی دعوت نے لوگوں کو متاثر کر رکھا تھا۔ آٹھ سالہ کشمکش میں قریش کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔ جنگوں میں ان کے بڑے بڑے سردار مارے جا چکے تھے۔ عرب قبائل میں ان کی ساکھ ختم ہو چکی تھی۔ پہلے جہاں مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ تین ہزار افراد میدان جنگ میں لائے جا سکتے تھے آج ان کا دس ہزار کا لشکر جرار مکہ پر یلغار کے لیے تیار تھا۔ ابوسفیان کی کوشش سے اگر مصالحت ہو جاتی تو قریش کی عزت رہ جاتی لیکن اس کے مشن کی ناکامی سے قریش کی کمر ٹوٹ گئی اور ان کا دم خم جاتا رہا۔ فی الواقع جب مسلمانوں کا لشکر مکہ کے مضافات میں پہنچا تو طویل فاصلہ طے کرنے کے دوران قریش کی کسی مزاحمت کا اسے سامنا نہیں کرنا پڑا۔

قریش کی امان طلبی:

اسلامی فوج کا مر الظہران کا پڑاؤ مکہ سے ایک منزل پر ہوا۔ دس ہزار افراد کی لشکر گاہ ایک وسیع علاقے پر محیط تھی اور رات کے وقت جب مجاہدین نے آگ روشن کی تو دور دور تک پھیلی ہوئی روشنیاں غیر معمولی لشکر کشی کی غمازی کر رہی تھیں۔ روایات کے مطابق ان روشنیوں کو دیکھ کر مکہ کے تین سردار -- ابوسفیان، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقا خزاعی -- تحقیق کے لیے نکلے کہ دیکھیں کون سا قبیلہ یہاں فروکش ہے۔ مر الظہران پہنچ کر قریشی لیڈروں کا خیال ہوا کہ یہ بنو خزاعہ ہیں اور بدیل نے بھی اسی گمان کا اظہار کیا لیکن پھر سب کو خیال آیا کہ بنو خزاعہ کی نفری اس قدر زیادہ نہیں ہو سکتی، یہ کوئی دوسرا قبیلہ ہے۔ یہ لوگ باتیں کرتے ہوئے لشکر گاہ میں گھوم رہے تھے کہ حسن اتفاق سے حضرت عباس بن عبدالمطلب نبی ﷺ کے خچر پر سوار ادھر سے گزرے۔ یہ مکہ جانے والے کسی آدمی کی تلاش میں تھے جس کے ذریعے قریش کو یہ پیغام بھجوا سکیں کہ مسلمانوں کا لشکر ان کے سروں پر پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا ان کے لیے مناسب ہو گا کہ وہ از خود نبی ﷺ سے رابطہ کریں اور جنگ سے بچ جائیں۔ عباسؓ نے اندھیرے میں ابوسفیان کی آواز پہچان لی، ان تینوں ملکی لیڈروں کو ساتھ لیا اور نبی ﷺ کی خدمت میں لے گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار لہراتے چلے آ رہے تھے اور ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ابوسفیان اب قابو میں ہے۔ حکم ہو تو اس کی گردن اڑا دوں۔ نبی ﷺ نے حضرت عمرؓ کو ٹھنڈا کیا اور حکم دیا کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھی رات یہیں گزاریں، صبح ان سے بات چیت ہو گی۔

یہ روایت جتنی مشہور ہے اتنی ہی غیر حقیقی اور غیر فطری ہے۔ اولاً بنوخزاعہ کا اہل مکہ کے ساتھ اتنا قریبی رابطہ تھا کہ ان کا کوئی بڑا اقدام قریش کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر ہزاروں خزاعی کسی مہم پر ہوتے تو اس کی تیاری ہی کے مراحل میں قریش کو اس کی خبر ہو جاتی۔ لہٰذا لشکر کو دیکھ کر ان کی طرف خیال جانا بالکل غیر فطری بات ہے۔ ثانیاً، خود خزاعہ کے سردار بدیل ان تین افراد میں شامل تھے۔ کیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ آج کل میرے قبیلہ کی سرگرمیاں کیا ہیں؟ اور کیا یہ قبیلہ اتنا خودسر تھا کہ اپنے سردار کی لاعلمی میں لشکر کشی تک کر لیا کرتا تھا؟ ثالثاً، جاسوسی کے مشن پر سرداران قوم اور سالار لشکر خود نہیں جایا کرتے۔ اس مہم پر ہمیشہ دوسرے لوگوں کو بھیجا جاتا ہے تاکہ اگر کوئی افتاد پڑے تو بہت بڑا نقصان نہ ہو۔ اس روایت میں دو تو سرداران قبیلہ ہیں اور ایک اشراف مکہ کے نہایت اہم رکن۔ اور یہ سب بالکل نہتے ایک اجنبی گروہ کی تحقیق کرنے کے لیے رات کے وقت نکلتے ہیں۔ ایسا ہونا روایت اور عادت کے خلاف ہے۔ رابعاً، روایت کے مطابق حضرت عباسؓ ابھی تین دن پہلے اسلام قبول کر کے اسلامی لشکر میں شامل ہوئے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ لشکر کے لیے خود اجنبی تھے۔ ان کو پہچاننے والے صرف مہاجرین ہو سکتے تھے۔ ان کا پورے اعتماد سے لشکر گاہ میں گھومنا ایک ایسا کام ہے جو ایک نووارد آدمی نہیں کر سکتا۔ علیٰ ہذا القیاس تین نووارد لوگوں کا لشکر گاہ میں داخل ہو کر آزادی سے گھومنا پھرنا ہرگز قرین قیاس نہیں۔ کیا مسلمانوں کی لشکر گاہوں میں محافظوں کو تعینات کرنے کا رواج نہیں تھا؟ خامساً، حضرت عباسؓ اپنے طور پر جو کام کرنے چلے تھے وہ بظاہر رسول اللہ ﷺ کی ساری مہم کے مقاصد کے منافی تھا۔ حضورؐ تو اہل مکہ کو زیر کرنے کے لیے یلغار کر رہے تھے اور یہ درپردہ ان کو یلغار سے بچانا چاہتے تھے۔ اگر حاطبؓ بن ابی بلتعہ ایک خط لکھنے پر زیر عتاب آ سکتے ہیں تو حضرت عباسؓ کا معاملہ تو ان سے بھی زیادہ سنگین ہے کہ وہ اپنے طور پر قریش کو فوجی نوعیت کی اطلاع پہنچانے کے مقصد سے نکل کھڑے ہوئے لیکن ان سے باز پرس کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ سادساً، حضرت عمر فاروقؓ جیسے مدبر بغیر یہ جانے کہ تین مکی سردار لشکر گاہ میں کیوں آئے ہیں ابوسفیان کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں حالانکہ اگر قتل ہی مقصود ہوتا تو یہ کام اس وقت بھی ہو سکتا تھا جب ابوسفیان معاہدہ حدیبیہ کو برقرار رکھنے کی درخواست لے کر مدینہ گیا تھا اور اس کی وہاں شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں وہ خود عمرؓ سے بھی ملا تھا۔ لہٰذا ہمارے نزدیک صورت واقعہ وہ نہ تھی جو اس مشہور روایت میں بیان کی گئی ہے۔ بلکہ اس سے بالکل مختلف تھی لیکن اس کو اس مشہور لیکن خلاف حقیقت روایت نے دبا دیا اور اب اس کی

بازیافت بھی مشکل ہوگئی ہے۔بہرحال اس کے کچھ اشارات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ صحیح بخاری کی کتاب المغازی کی ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں:۔

لما سار رسول الله ﷺ عام الفتح فبلغ ذلک قریشا خرج ابوسفیان و حکیم بن حزام و بدیل بن ورقاء یلتمسون الخبر عن رسول الله ﷺ فاقبلوا یسیرون حتی اتوا بمرالظهران فاذاهم بنیران کانها نیران عرفه --- فرآهم ناس من حرس رسول الله ﷺ فادرکوهم فاخذوهم فاتوا بهم رسول الله ﷺ. [۲]

فتح کے سال جب رسول اللہ ﷺ (مدینہ سے) روانہ ہوئے اور قریش کو اس کی خبر ہوئی تو آنحضرت ﷺ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ابوسفیان، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقا مکہ سے نکلے۔ چلتے چلتے وہ مرالظہران پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وسیع پیمانے پر آگ جل رہی ہے جیسی کہ میدان عرفات میں ہوتی ہے--- پھر ان کو رسول اللہ ﷺ کے پہرہ داروں نے دیکھا تو ان کو جالیا اور گرفتار کر کے نبی ﷺ کی خدمت میں لے گئے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ قریش مدینہ کے عزائم کے بارے میں بالکل اندھیرے میں نہیں تھے۔ان کو لشکر کی روانگی کی اطلاع مل چکی تھی۔مرالظہران ان کی روشنیاں ان کو مکہ میں نظر نہیں آئیں بلکہ عین وادی میں پہنچ کر نظر آئیں۔نبی ﷺ کا لشکر ایسا بےخبر ہو کر فروکش نہیں تھا کہ جو چاہے اس میں گھس آئے بلکہ اس کے اردگرد پہرہ تھا تاکہ کوئی غیر متعلق آدمی لشکرگاہ میں داخل نہ ہوسکے۔حضرت عباسؓ مکی سرداروں کو اپنی معیت میں آنحضرت ﷺ کے پاس نہیں لے گئے بلکہ پہرہ داروں نے ان لوگوں کو اجنبی سمجھ کر گرفتار کر لیا اور آنحضرت ﷺ کے حوالہ کر دیا، جیسا کہ فوجی نظم وضبط کا تقاضا تھا۔

۲۔ طبری نے اپنی تاریخ میں حضرت ہشام بن عروۃؓ کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے ایک استفسار کے جواب میں فتح مکہ کے احوال لکھ بھیجے۔اس کے مطابق قریش نے رسول اللہ ﷺ کے عزائم معلوم کرنے کے لیے دو آدمیوں کا ایک وفد تشکیل دیا۔اس میں ابوسفیان اور حکیم بن حزام شامل تھے۔ان دونوں نے روانہ ہوتے وقت بدیل بن ورقاء کو بھی ساتھ لینا مناسب سمجھا۔یہ لوگ مرالظہران پہنچے، آنحضرت ﷺ سے ملاقات کی اور اسلام قبول کر لیا۔آنحضرتؐ نے ان کو مکہ روانہ کر دیا کہ وہاں پہنچ کر لوگوں کو اطاعت قبول کرنے کی دعوت دیں۔اس کی علامت کے طور پر جو شخص ابوسفیان یا حکیم بن حزام کے مکان میں داخل

ہو جائے گا یا اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا اور ہتھیار نہیں اٹھائے گا اس کو امان حاصل ہو گی۔

۳۔ طبقات ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ قریش کو مسلمانوں کے لشکر جرار کے متوقع حملہ سے سخت پریشانی لاحق تھی۔ انہوں نے ابوسفیان کو بھیجا کہ اگر وہ نبی ﷺ سے ملاقات کر پائیں تو اہل مکہ کے لیے عفو عام کے طالب ہوں[3]۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عفو عام طلب کرنے کے لیے یہ وفد خود تشکیل دیا تھا۔ یہ لوگ مـر الـظهـران گئے تو پہلے خود اسلام قبول کیا اور پھر اہل مکہ کو نبی ﷺ کی اطاعت قبول کرنے کی دعوت دینے کے لیے واپس گئے اور یہ نوید لے کر گئے کہ ہر اس شخص کو امان حاصل ہے جو اسلامی لشکر کا مقابلہ نہ کرے اور ہتھیار نہ اٹھائے۔ یہ ایک عفو عام تھی لیکن ہتھیار نہ اٹھانے سے مشروط تھی۔

ان تمام روایات کی روشنی میں جو صورت واقعہ سمجھ میں آتی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ قریش کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ رسول اللہؐ ایک لشکر جرار کے ساتھ مکہ کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ان کو اپنی وعدہ خلافی بھی یاد تھی اور وہ یہ جانتے تھے کہ ان کے معاہدہ توڑنے کے باعث آنحضرتؐ نے ان کے لیے نہایت سخت رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ لیکن اب ان میں پہلے کا سا دم خم نہیں تھا۔ ان کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ مجاہدین کے مقابلہ پر نکلنا ان کو خودکشی کے مترادف نظر آتا تھا۔ لہٰذا قریشی لیڈروں نے نہایت حقیقت پسندانہ فیصلہ کیا۔ وہ نہ لشکر مجاہدین کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلے، نہ ان کا راستہ روکنے کی کوئی تدبیر کی۔ بلکہ اپنے سالار لشکر کو ہتھیار ڈالنے اور اس کے بدلے میں اپنی قوم کے لیے عفو عام طلب کرنے کے لیے آنحضرتؐ کی خدمت میں بھیجا۔ اس بدگمانی کے سد باب کے لیے کہ یہ فیصلہ کہیں ابوسفیان کا محض ذاتی فیصلہ نہ سمجھا جائے بلکہ تمام قریش اس میں شریک نظر آئیں، انہوں نے حکیم بن حزام اور بدیل کو ساتھ کر دیا۔ آنحضرتؐ نے اس وفد کی پذیرائی فرمائی۔ ان کی پیش کش پر غور کیا۔ ہو سکتا ہے رات کے وقت اپنے معتمد ساتھیوں سے بھی اس کے بارے میں مشورہ کیا ہو۔ پھر یہ خیال فرما کر کہ ہو سکتا ہے تمام قریش اس مسئلہ میں متحد الخیال نہ ہوں آپ نے عفو عام صرف ان لوگوں کو دی جو ہتھیار نہ اٹھائیں اور گھروں میں بیٹھ رہیں۔ لشکر کی آگے روانگی سے قبل آنحضرتؐ نے ارکان وفد کو امان کا یہ حکم سنانے کے لیے مکہ روانہ کر دیا۔

صورت واقعہ کی اس تصویر کی تائید قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں یہ پیشینگوئی کی گئی تھی کہ 'عنقریب تم لوگ ایک طاقتور حریف سے لڑنے کے لیے بلائے جاؤ گے، تم کو ان سے جنگ کرنی ہو گی یا وہ اطاعت

قبول کرلیں گے'۔ (فتح:١٦) آیت میں 'یسلمون' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ہتھیار ڈالنے پر بھی دلالت کرتا ہے اور اسلام قبول کرنے پر بھی۔ مرالظہر ان کی کارروائی میں دونوں باتیں پیش آئیں اور اسی کا مظاہرہ اگلے روز مکہ میں اس وقت ہوا جب مجاہدین وہاں پہنچے۔

وفد قریش:

قریش کے سہ رکنی وفد کی تشکیل اس مقصد کے لیے نہایت موزوں ہے جس کا حصول اس کے پیش نظر تھا۔ ابوسفیان قریش کا سردار اور سالار جنگ تھا۔ جو دلچسپی اپنی قوم کے مستقبل کے ساتھ اس کو تھی وہ کسی دوسرے لیڈر کو نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ جو فیصلہ کرتا وہ عرب کے معروف کے مطابق پورے قبیلہ کا فیصلہ تھا۔ آدمی نہایت حقیقت پسند تھا۔ وہ یہ بات سمجھ چکا تھا کہ اب رسول اللہؐ اور ان کے دین کو شکست دینا کسی کے بس میں نہیں۔ اسی لیے کچھ عرصہ قبل جب رسول اللہ ﷺ نے شاہ روم ہرقل کو اسلام کی دعوت دینے کی غرض سے مکتوب بھیجا تو شاہ روم کے سوالوں کے جواب میں اس نے نبی ﷺ کے بارے میں پوری دیانت داری کے ساتھ رائے دی اور سیاسی و مذہبی مخالفت کے باوجود اس نے آنحضرتؐ کے امیج کو خراب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس پر جب شاہ نے یہ تبصرہ کیا کہ یہ تمام علامات ایک سچے نبی کی ہیں اور ایک دن اس کا اقتدار اس جگہ پر بھی ہوگا جس جگہ میں بیٹھا ہوں تو ابوسفیان نے نہایت درست رائے قائم کرتے ہوئے ساتھیوں سے کہا کہ ابن ابی کبشہ (حضرت محمد ﷺ) کا معاملہ اب آگے نکل چکا، اب تو گوروں کا بادشاہ بھی اس سے ڈرنے لگا ہے۔ گویا ابوسفیان یہ رائے قائم کر چکا تھا کہ اب اسلام کی دعوت کے آگے بند باندھنا ممکن نہیں رہا۔ چونکہ وہ سالار جنگ بھی تھا اس لیے اس کا ہتھیار ڈالنا تمام قریش کے ہتھیار ڈالنے کی علامت تھا۔ وفد کا دوسرا رکن حکیم بن حزام قریش کی اشرافیہ کا نہایت معتدل مزاج رکن تھا۔ یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بھتیجا اور نبی ﷺ کا بچپن کا دوست تھا۔ بدیل بن ورقاء بنوخزاعہ کا سردار قبیلہ تھا جو مکہ میں قیام پذیر تھا۔ اس کا قبیلہ شروع ہی سے نبی ﷺ اور مسلمانوں کے لیے اچھے جذبات رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب حدیبیہ کا معاہدہ ہوا تو اس قبیلہ نے مسلمانوں کا حلیف ہو کر معاہدہ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ لہٰذا بدیل کی نمائندگی ایک حلیف قبیلہ کی نمائندگی اور قریش کے حق میں ایک سفارش تھی۔ مرالظہر ان پہنچ کر وفد کے تینوں ارکان نے اسلام قبول کیا اور اپنی قوم اور اہل مکہ کے لیے عفو عام کی درخواست کی۔ نبی ﷺ کے لیے اس سے بڑی خوشخبری کیا ہوسکتی تھی کہ تمام

اہل مکہ اطاعت کرلیں اور امن وامان سے شہر میں داخلہ ممکن ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے تینوں لیڈروں کی درخواست کو شرف قبول بخشا۔

ابوسفیان کا قبول اسلام:

ابوسفیان کے قبول اسلام کے بارے میں دو مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق جب وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے دریافت فرمایا 'ابوسفیان کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم مان جاؤ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں'۔ انہوں نے جواب دیا، خدا کی قسم، اگر اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو ہمارے کچھ کام آتا۔ پھر آپ نے پوچھا 'کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم مان جاؤ کہ میں اللہ کا رسول ہوں'۔ ابوسفیان نے کہا 'میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ کتنے حلیم وکریم اور درگزر کرنے والے ہیں۔ بخدا میں ابھی تک اس معاملے میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔ اس جواب پر حضرت عباسؓ نے ابوسفیان سے کہا 'تمہارا ناس ہو۔ اس سے پہلے کہ تمہیں قتل کر دیا جائے گواہی دے دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں'۔ اس پر ابوسفیان نے گواہی دے دی۔ اس کے بعد حضرت عباسؓ نے نبی ﷺ سے سفارش کی کہ ابوسفیان سردار قوم ہیں۔ ان کو فخر وامتیاز کی بات پسند ہے۔ آپ ان کو کوئی خصوصیت عطا فرمائیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ مامون ہے۔

اس روایت میں ابوسفیان کو قتل کی دھمکی دے کر اسلام قبول کروانا دین سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ ایسا کلام آنحضرتؐ کی موجودگی میں نہیں ہوسکتا۔ مشرکین کے اسلام کے لیے جو ضابطہ تھا وہ سورہ براءت کی ابتدائی آیات میں بیان ہو چکا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ مشرکین کو چار ماہ کا نوٹس دیا جائے۔ اس کے باوجود اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو وہ قتل کیے جاسکتے ہیں۔ باقی رہی ابوسفیان کے فخر وامتیاز کی بات تو جب سرداران مکہ کی آمد کا مقصد ہی یہ طے پایا کہ وہ قوم کے لیے امان کے طالب بن کر آئے تھے تو ان کی قدر افزائی کے لیے یہی مناسب تھا کہ ان کے مکانوں کو لوگوں کے لیے دارالامان قرار دے دیا جائے۔ اس کام کے لیے ان کے فخر ومباہات کو پسند کرنے کی بات غیر ضروری ہے۔ مکہ میں تو ہر اس شخص کو تحفظ کی یقین دہانی کرائی گئی تھی جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے۔ پھر اس معاملہ میں ابوسفیان کی خصوصیات کیا رہ گئی؟

اس کے برعکس حافظ ذہبیؒ نے دوسری روایت نقل کی ہے۔ اس کی رو سے نبی ﷺ کے استفسار کے جواب میں ابوسفیان کا جواب یہ تھا کہ میں نے اس جدو جہد میں اپنے معبودوں سے مدد طلب کی اور آپ نے اپنے خداوند سے۔ بخدا ایک بار بھی تو ایسا نہیں ہوا کہ ہمارا مقابلہ ہوا ہو اور آپ غالب نہ رہے ہوں۔ اگر میرے معبود برحق اور آپ کا خدا باطل ہوتا تو کبھی تو میں بھی آپ پر غلبہ پاتا۔ لہٰذا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہ روایت موقع ومحل کے مطابق صحیح معلوم ہوتی ہے۔

مکہ میں مجاہدین کا داخلہ:

لشکر کو مکہ کی جانب کوچ کا حکم ملا تو نبی ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ ابوسفیان کو اسلام کی شوکت کا مشاہدہ کرایا جائے۔ چنانچہ حضرت عباسؓ کے ہمراہ وہ ایک ٹیلے پر کھڑے ہو گئے اور مہاجرین، انصار اور دوسرے قبائل عرب کے لشکروں کا کروفر دیکھتے رہے۔ روایات میں ہے کہ جب حضرت سعد بن عبادہؓ جو انصار کے لیڈر اور ایک دستہ کے سالار تھے ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا: الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحل الکعبہ الیوم اذل اللہ قریشا (آج گھمسان کا دن ہے، آج کعبہ کی حرمت باقی نہ رہے گی، آج اللہ تعالیٰ قریش کو ذلیل کرے گا) ابوسفیانؓ کو بجا طور پر ان جملوں سے وحشت ہوئی کیونکہ یہ الفاظ اس امان کی نفی کرتے تھے جس کا وعدہ نبی ﷺ نے ابوسفیان سے کیا تھا۔ انہوں نے آنحضرتؐ سے اس طنزیہ کلام کی شکایت کی۔ آپ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا: الیوم یوم المرحمہ الیوم تعظم فیہ الکعبہ الیوم اعز اللہ فیہ قریشا (آج شفقت کا دن ہے، اس دن میں کعبہ کی عظمت بحال ہوگی، آج اللہ تعالیٰ قریش کو عزت عطا فرمائے گا) اس کے بعد حکم دیا کہ سعدؓ اپنے دستے کی کمان اپنے بیٹے قیس بن سعدؓ کے حوالے کر دیں تاکہ امان کے معاملہ میں اہل مکہ کے دلوں میں کوئی بدگمانی پیدا نہ ہو۔ اسلامی لشکر کا نظارہ کرنے کے بعد وفد کے ارکان عفو عام کے اعلان کے لیے مکہ روانہ ہو گئے۔ انہوں نے وہاں جا کر اس قرارداد کی منادی کی اور لوگوں کو گھروں میں بند رہنے کا مشورہ دیا۔ اس دوران میں آنحضرتؐ نے فوجوں کو مکہ کے نواحی علاقہ ذوطویٰ میں رکنے کا حکم دیا۔

ذوطویٰ میں نبی ﷺ نے لشکر کی ترتیب نو کی اور ان کو سختی سے یہ ہدایت کی کہ وہ کسی کو قتل کریں اور نہ ہتھیاروں کے استعمال میں پہل کریں۔ مکہ میں داخلہ بالکل پرامن ہو اور اہل مکہ کے لیے امان کے حکم کی پوری پوری

تعمیل کی جائے۔ آپ نے خالد بن ولیدؓ کو مکہ کی زیریں جانب سے داخل ہونے کا حکم دیا اور زبیر بن العوامؓ کو بالائی جانب سے، قیس بن سعدؓ کا لشکر شہر کے مغرب میں کدا سے داخل ہوا اور آنحضرتؐ خود اذاخر کے راستے سے مکہ میں داخل ہوئے۔ اپنے مشن کی تکمیل کے اس مرحلہ میں آپ کی زبان سورہ نصر اور سورہ فتح کی تلاوت میں مصروف تھی۔ اوپر کے مباحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ان دونوں سورتوں میں فتح مکہ کے بارے میں پیشنگوئیاں ہیں۔ اللہ رب العزت کے عظیم احسان کو دیکھتے ہوئے کہ اس نے مکہ میں پرامن داخلہ ممکن بنایا رسول اللہ ﷺ کا دل عاجزی اور شکرگزاری کے جذبات سے معمور تھا جس کا اظہار سواری پر آپ کی جھکی ہوئی گردن سے ہو رہا تھا۔

خالد بن ولیدؓ کے دستے کو قریش نوجوانوں کی ایک ٹکڑی نے روکنے کی کوشش کی۔ اس کا انتظام تین قرشی لیڈروں صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل اور سہیل بن عمرو نے کیا تھا جو ہتھیار ڈالنے کے فیصلہ کے مخالف تھے۔ لیکن یہ مزاحمت اتنی کمزور تھی کہ مسلمانوں کا تو کوئی نقصان نہ ہوا البتہ شرپسندوں کے بارہ تیرہ آدمی کھیت رہے۔ باقی تمام افواج کا داخلہ بالکل پرامن رہا۔ نبی ﷺ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ خالد بن ولیدؓ کے دستے نے جنگ کی ہے تو آپؐ کو اس کا بڑا قلق ہوا۔ لیکن تحقیق سے جب پتہ چلا کہ غلطی خالد کی نہیں بلکہ زیادتی کا ارتکاب قریش کے بعض شرارتی عناصر نے کیا تو آپ نے اس کو تقدیر کا لکھا قرار دیا۔

تمام مسلمان سپاہ مکہ کی مختلف اطراف سے داخل ہو کر شہر کے وسط میں جمع ہوئی جہاں مقام حجون میں نبی ﷺ کے لیے خیمہ نصب کیا گیا۔ فتح مکہ کا یہ عظیم واقعہ ۲۰ رمضان ۸ ہجری کو پیش آیا۔ اس واقعہ سے ہزاروں برس پہلے کی ایک پیشین گوئی پوری ہوگئی۔ تورات میں بتایا گیا تھا:

> ''خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے دہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی''۔

علامہ عنایت رسول چریاکوٹی کی تحقیق کے مطابق سینا، بحر احمر کے شمالی سرے پر دو خلیجوں کے درمیان کا علاقہ ہے۔ جہاں حضرت موسیٰؑ کو نبوت عطا ہوئی، پھر اس کے ایک پہاڑ کی ایک چوٹی پر ان کو تورات عطا ہوئی۔ صحرائے سینا کی نمکین جھیل اور خلیج سویز کے درمیان ایک پہاڑ ہے جس کا عبرانی نام سعیر ہے۔ اسی کے آس پاس بنی اسرائیل عبور دریا کے بعد رہے اور اللہ سے عہد و پیمان کیا۔ فاران وہ مقام ہے جہاں حضرت اسماعیلؑ آباد ہوئے۔ گویا اس سے مراد مکہ کی وادی ہے۔ قدوسی سے مراد پاکیزہ صفات، خداترس، نیک اور عبادت گزار

بندے ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر ان صفات کے حامل صحابہ کرام کی تعداد دس ہزار تھی۔

پیشینگوئی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سینا میں بنی اسرائیل کے عظیم فرزند موسیٰ علیہ السلام کو رسالت سے سرفراز فرمایا۔ سعیر کی دشت پیمائی میں ان کو تورات سے نوازا۔ اس کے بعد خداوند نے اپنی ہدایت کا کامل اظہار مکہ میں محمد ﷺ کی بعثت کی صورت میں کیا اور ان کو مکہ پر غلبہ عطا فرمایا۔ وہ اپنے دس ہزار پاکباز ساتھیوں کے ساتھ یہاں متمکن ہوئے اور شریعت نافذ کی۔

ابتدائی مصروفیات:

مکہ فتح ہونے پر جب لشکر اسلام کے تینوں حصے کامیابی سے شہر میں داخل ہو کر حجون میں یکجا ہو گئے تو آنحضرتؐ نے بیت اللہ کا قصد فرمایا جو اب تک آپ کی ساری جدوجہد کا مرکز رہا تھا۔ آپ حرم کعبہ میں پہنچے تو مسلمانوں کے جم غفیر کے باعث مسجد حرام کا صحن تنگ پڑ گیا۔ لہٰذا آپ نے قصواء ہی پر سوار ہو کر طواف کیا۔ آپ حجر اسود کی سیدھ میں آتے تو اپنے عصا کے اشارہ سے استلام کر لیتے۔ طواف کے بعد سواری سے اترے اور بلند آواز سے اللہ اکبر کہا۔ صحابہ کرام نے بھی یک زبان ہو کر نعرہ تکبیر بلند کیا۔ آنحضرتؐ نے دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد زم زم پیا۔

اب آپ نے عثمان بن طلحہ کو طلب فرمایا جن کے پاس خانہ کعبہ کی چابیاں رہا کرتی تھیں۔ انہوں نے خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا۔ آنحضرتؐ اپنے دو صحابہ --اسامہؓ اور بلالؓ-- کے ہمراہ بیت اللہ کے اندر داخل ہوئے اور دو رکعت نماز ادا کی۔ اس کے بعد جائزہ لیا تو دیواروں کے ساتھ کچھ بت اور تصویریں نظر آئیں۔ آپ نے بتوں کو گرایا اور ساتھیوں کی مدد سے تصاویر کو مٹاتے رہے۔ کعبہ کے اندرون کو بتوں اور تصویروں سے پاک کرنے کے بعد آپ نے اس کو دھلوایا۔ زبان مبارک پر جَـاءَ الْـحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا۔ باطل ہے ہی نابود ہونے والا) کی آیت رواں تھی۔

آپ باہر تشریف لائے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ بنو ہاشم کے پاس سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانے کا منصب ہے۔ اگر اس منصب کے ساتھ ساتھ حجابہ کا منصب بھی انہیں دے دیا جائے اور خانہ کعبہ کی چابی ان کے پاس رہے تو بنو ہاشم کے لیے یہ بات باعث فخر ہو گی۔ نبی ﷺ کے پیش نظر خانہ کعبہ کی تولیت کے حوالہ سے قریش کی فضیلت بحال کرنے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ اس لیے آپ نے عثمان بن طلحہ کو بلا کر چابی ان کے حوالے

کرتے ہوئے فرمایا: ''آج وفا شعاری کا دن ہے۔ تم یہ چابی ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھو۔ بجز ظالم کے کوئی شخص اس کو تم سے چھین نہیں سکے گا''۔

حرم کعبہ میں خطاب:

اس کے بعد فتح مکہ کی مہم کی کامیابی کی تقریب سے آنحضرتؐ نے اہل مکہ کو حرم کعبہ میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ لوگ صحن میں جمع ہو گئے تو آپ نے خانہ کعبہ کے دروازے میں کھڑے ہو کر ان سے خطاب کیا۔ سب سے پہلے آپ نے توحید کا اعلان اور اس بات کا برملا اعتراف کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے سے نصرت کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ سچا کر دکھایا اور آپ کے تمام مخالفین مغلوب کر دیے۔ فرمایا:

لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ صدق وعدہ و نصر عبدہ و ھزم الاحزاب وحدہ.

تنہا اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اپنے بندے کی نصرت فرمائی اور اکیلے تمام مخالف گروہوں کو شکست دی۔

آپؐ کی بیس سالہ دعوت کا مرکزی نقطہ یہی تھا کہ اللہ ایک ہے، وہی حقیقی معبود ہے جس کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں۔ مشرکین کا دین اللہ سے بغاوت کا دین ہے جس کے حق میں کوئی سند نہیں۔ بیت اللہ کی تعمیر اللہ کے موحد بندے ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی اور اسکو توحید کا مرکز قرار دیا تھا۔ لہٰذا مشرکین کا حرم کعبہ پر قبضہ بالکل ناجائز ہے۔ توحید کا یہ مضمون اس لائق تھا کہ اسے اہل مکہ سے خطاب کا سرنامہ بنایا جاتا۔ مشرکین نبی اکرم ﷺ کی اس دعوت کا ہمیشہ انکار کرتے رہے تھے۔ وہ اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ یہ دعوت کچھ مدت تک اپنی جولانیاں دکھانے کے بعد خود بخود ختم ہو جائے گی اور عربوں کا ذہن اس کو کسی صورت میں قبول نہیں کرے گا۔ نبی ﷺ نے ان پر بار بار یہ حقیقت واضح کی کہ جب کسی قوم میں خدا کا رسول مبعوث ہوتا ہے تو اس کے لیے نجات کا واحد راستہ اس کی دعوت کو قبول کرنے ہی کا رہ جاتا ہے۔ قوم اگر رسول کا انکار کرتی یا اسے جھٹلاتی ہے تو اپنے لیے تباہی کا سامان کر لیتی ہے۔ آنحضرتؐ جس حقیقت سے اپنی قوم کو بارہا آگاہ کر چکے تھے، آج اپنے خطاب میں اسی کے نتائج ان کے سامنے رکھ رہے تھے کہ اللہ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی نصرت فرمائی اور اس کے دشمنوں کو مغلوب کیا۔ حضورؐ کے خطاب کے اس حصے کو سورہ صافات کی آیات ۱۷۱ تا ۱۷۳ کے مقابل رکھ کر دیکھیے تو ان کا صحیح زور سمجھ میں آئے گا۔ وہاں فرمایا ہے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ. اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ. وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ.

(الصافات ۳۷:۱۷۱-۱۷۳)

اپنے فرستادہ بندوں کے حق میں ہمارا حکم پہلے سے موجود ہے کہ انھی کی نصرت کی جائے گی اور یہ کہ ہمارا لشکر ہی غالب آنے والا ہے۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے خطاب کے مذکورہ تینوں جملے انھی آیات سے ماخوذ ہیں۔

اس کے بعد آپؐ نے قریش کے مختلف خانوادوں کے مابین ایک دوسرے پر برتری کے دعوے اور خون اور مال کے مطالبات یکسر ختم کرتے ہوئے فرمایا:

الا کل مأثرة او دم او مال يدعى فهو تحت قدمي هاتين الا سدانه البيت و سقاية الحاج.

جان لو کہ ترجیح یا خون یا مال کے تمام دعوے میرے ان پاؤں کے نیچے ہیں۔ البتہ بیت اللہ کی حفاظت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت باقی رہے گی۔

مطلب یہ کہ حفاظت بیت اللہ اور حاجیوں کو پانی پلانے جیسے خدمت کے کام قریش سے لیے جائیں گے لیکن ان کے سوا ان کے تمام انتظامی و سیاسی اختیارات ختم کیے جارہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح کی تمام ذمہ داری اب خود اسلامی ریاست پوری کرے گی مثلاً جنگ و جدل کا معاملہ ہوگا تو یہ لازماً بنوامیہ کے حوالے نہیں کیا جائے گا بلکہ مرکزی حکومت جس شخص سے چاہے گی یہ خدمت لے گی، اور سفارت کا مسئلہ درپیش ہوگا تو لازماً بنوعدی کا کوئی فرد اس کے لیے منتخب نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ کام اسلامی حکومت اپنے مصالح کے تحت مختلف لوگوں سے لے گی۔ اصل میں یہ بیت اللہ شریف کا کنٹرول خود سنبھالنے کا اعلان تھا۔ حرم شریف کی خدمت اور حجاج کو پانی پلانے کے کام مراعات و اختیارات سے بوجھل نہیں تھے بلکہ ایک دینی ذمہ داری و خدمت کے کام تھے، اس لیے ان کی گنجائش باقی رکھی۔

اس موقع پر آنحضرتؐ نے قریش کو باقاعدہ مخاطب کر کے ان کو یہ تلقین فرمائی کہ اسلام میں خاندانی شرف کوئی معنی نہیں رکھتا۔ باپ دادا کی عظمت کے حوالے سے اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے برتر سمجھنا ایک عبث کام ہے۔ تمام انسان برابر ہیں، یہ ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اور ان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ لہٰذا اپنی بڑائی کا اظہار اور دوسروں کی تحقیر کسی سلیم الطبع آدمی کو زیب نہیں دیتی۔ آپ نے فرمایا:

يا معشر قريش ان الله قد اذهب عنكم نخوة الجاهلية و تعظمها بالآباء . الناس من آدم و آدم من تراب.

اے گروہ قریش، اللہ تعالیٰ نے زمانہ جاہلیت کا غرور اور آباء واجداد کا نام لے کر اپنی برتری کا دعویٰ تم سے دور کر دیا ہے۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔

آپؐ نے فرمایا کہ اللہ رب العزت کی نگاہوں میں قدر و قیمت رکھنے والی صفت آدمی کے اندر تقویٰ ہے۔ جو آدمی اللہ سے زیادہ ڈرنے والا اور اس کی نافرمانی سے زیادہ بچنے والا ہوگا اللہ کے ہاں وہی زیادہ عزت پائے گا۔ آپ نے سورہ الحجرات کی آیت پڑھی:۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا. اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ. (الحجرات ۴۹:۱۳)

اے لوگو، ہم نے تمہیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا اور تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بلاشبہ تم میں سب سے معزز اللہ کے ہاں وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اس کے بعد آپ نے اہل مکہ کو بالعموم اور قریش کو بالخصوص مخاطب کر کے سوال کیا کہ جانتے ہو، میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ یہ وہی سوال ہے جو ہر فاتح اپنے مفتوح دشمن سے کرتا ہے۔ وہ اس وقت طاقت کے نشے میں ہوتا ہے۔ وہ کبھی تو شہریوں کے قتل عام کا نادرشاہی حکم سناتا، کبھی ان کی عزت، مال اور جان اپنے فوجیوں پر مباح کر دیتا اور کبھی اپنے حریفوں کی تذلیل کی نئی نئی صورتیں پیدا کرتا ہے۔ لیکن اللہ کے رسول کا انداز یہ نہیں ہوتا۔ وہ تو عین میدان جنگ میں بھی کوئی ناروا حرکت اپنے یا اپنے سپاہیوں کے لیے جائز نہیں سمجھتا، مفتوحوں کے لیے وہ ایسا کیوں کرے گا۔ اہل مکہ رسول اللہ ﷺ کی نجابت اور کریمانہ اخلاق سے بخوبی واقف تھے۔ وہ آپ کے سوال کا مقصد سمجھ گئے۔ چنانچہ مجمع سے آواز آئی خیرا اخ کریم و ابن اخ کریم (بھلائی کا سلوک، آپ ایک شریف بھائی اور ایک شریف بھائی کے بیٹے ہیں) اس پر آپؐ نے فرمایا! میں تمہارے حق میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے حق میں کہی تھی کہ لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا و انتم الطلقاء (آج تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں جاؤ، تم آزاد ہو۔)

رسول اللہ ﷺ کا حضرت یوسف علیہ السلام کے قول کا حوالہ دینا بڑی ذومعنی بات ہے۔ اس میں آپ کا اشارہ سورہ یوسف میں بیان کردہ قصہ کی طرف تھا۔ یہ سورہ اس وقت نازل ہوئی تھی جب ہجرت سے قبل آپ مکہ میں قریش کے مظالم سہہ رہے تھے۔ اس میں آپ کو تسلی دینے اور حالات کی تبدیلی کی ایک جھلک دکھانے کے لیے حضرت یوسفؑ کی زندگی کا حیرت انگیز واقعہ سنایا گیا۔ یوسف علیہ السلام نے پے در پے آزمائشوں کا مقابلہ صبر اور تقویٰ کے ساتھ کیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ مصر کے بادشاہ نے ان کو ملکی وسائل پیداوار کا منتظم اعلیٰ مقرر کیا۔ ملک میں

قحط پڑا تو برادران یوسف بھی سرکاری وسائل سے طالب مدد ہوئے اور یوسفؑ کے دربار میں پہنچے۔ ان کی حالت زار دیکھ کر حضرت یوسفؑ کو ان پر ترس آ گیا۔ ان کی تمام ضرر رسانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے بھائیوں کو یہ کہتے ہوئے معاف کر دیا کہ آج تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں، اللہ تعالیٰ تم لوگوں کی مغفرت فرمائے۔

فتح مکہ کے بعد قریش کی حالت زار ٹھیک وہی تھی جو حکومت مصر کے افسر اعلیٰ کے سامنے برادران یوسف کی تھی۔ وہ سائل بن کر حاضر ہوئے تھے۔ جو سلوک قریش نے ماضی میں آنحضرتؐ سے روا رکھا تھا وہ بھی ٹھیک وہی تھا جو برادران یوسف کا حضرت یوسفؑ کے ساتھ رہا تھا۔ ہجرت کے موقع پر قریش یہی توقع رکھتے تھے کہ مکہ سے دور اپنے قبیلہ سے کٹ کر آنحضرتؐ نہ کہیں قدم جما سکیں گے اور نہ آپ کی دعوت پنپ سکے گی۔ لیکن حقیقت اسکے برعکس نکلی۔ مدینہ میں اس دعوت کو بے حد سازگار ماحول ملا۔ نبی ﷺ کو بڑے مخلص و جانثار ساتھی ملے۔ اس کے بالمقابل قریش کمزور تر ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ انہیں نبی ﷺ کے اقتدار کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی نوبت آئی۔

نبی ﷺ کے خطاب کے آخری الفاظ ہیں اذھبوا و انتم الطلقاء (جاؤ تم آزاد ہو) ان کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اہل مکہ قیدی بنا لیے گئے تھے تو آپ نے ان کو آزاد کر دیا۔ ابوسفیان کے ہتھیار ڈالنے اور اہل مکہ کے لیے امن کا پروانہ حاصل کرنے کے بعد نہ کسی کے قید کیے جانے کا امکان تھا نہ کسی کو قید کیا گیا۔ لہٰذا آپ کے اس اعلان کا مطلب تھا کہ آج میں قریش کے تمام مظالم کا انتقام لینے پر قادر اور ان کی بے بسی کا مشاہدہ کر رہا ہوں لیکن اس کے باوجود میرے دل میں ان کے خلاف کوئی بغض نہیں ہے اور میں ان کو معاف کر کے چھوڑ رہا ہوں۔

نبی ﷺ کا عفو عام:

آنحضرتؐ نے معافی کا اعلان صرف انہی لوگوں کے حق میں نہیں کیا جو صحن کعبہ میں آپ کا خطاب سننے کے لیے جمع تھے بلکہ وہ لوگ بھی اس سے مستفید ہوئے جنہوں نے اپنی زندگی حضورؐ کی مخالفت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ جب ان کو عفو عام کی اطلاع دی جاتی تو اپنے کانوں کی سماعت پر انہیں یقین نہ آتا۔

آنحضرتؐ کے بڑے دشمن اور بالخصوص وہ لوگ جنہوں نے جتھا بنا کر حضرت خالد بن ولیدؓ کے لشکر کا راستہ روکا تھا، فتح مکہ کے بعد یا تو بھاگ گئے یا روپوش ہو گئے۔ تمام سیرت نگاروں حتیٰ کہ مستشرقین کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ بھاگنے والوں کا تعاقب ہوا نہ روپوش ہونے والوں کی جستجو کی گئی۔ بھاگنے والے لوگوں میں سے چند سرداروں --- عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبدالعزیٰ --- کا ذکر سیرت

نگاروں نے کیا ہے کہ وہ جان بچاتے پھر رہے تھے کہ لوگوں نے ان کو یقین دلایا کہ اگر وہ نبی ﷺ کے سامنے پیش ہو جائیں گے تو ان کے ساتھ معاملہ عفو ورحمت ہی کا ہوگا۔ چنانچہ وہ ایک ایک کر کے حاضر ہوئے اور امان پائی۔

عکرمہ حضرت خالد بن ولیدؓ سے شکست کھا کر یمن کی طرف بھاگ گئے۔ ان کی بیوی ام حکیم بنت حارث نے اسلام قبول کر لیا اور نبی ﷺ سے عکرمہ کی جان بخشی کی درخواست کی۔ آپ نے یہ درخواست منظور فرمائی۔ ام حکیم فوراً ان کے پیچھے روانہ ہو گئیں اور عکرمہ کو واپس چلنے کو کہا۔ عکرمہ کو اپنی وہ تمام زیادتیاں یاد تھیں جو انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ کی تھیں۔ اس لیے ان کو یقین نہ آتا تھا کہ مکہ جا کر ان کی جان محفوظ ہوگی۔ بیوی نے ان کے دل سے شک کا کانٹا نکالا اور بتایا کہ آنحضرتؐ سب سے زیادہ وفا شعار، قبیلے کے حقوق کا لحاظ کرنے والے اور نیک ہیں۔ میں ان سے امان طلب کر چکی ہوں اور انہوں نے یقیناً تمہیں معاف کر دیا ہے۔ چنانچہ عکرمہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نبی ﷺ نے ان کو آتا دیکھ کر اپنے ساتھیوں کو ان کے خیر مقدم کی ہدایت فرمائی اور انہیں ان کی یا ان کے والد کی اسلام دشمنی کا کوئی تذکرہ کرنے سے روکا۔ عکرمہ نے اس حسن سلوک سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا اور آئندہ زندگی میں اسلام کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنے کی قسم کھائی[5]۔

صفوان بن امیہ فتح مکہ کے بعد بھاگ کر جدہ پہنچے۔ ان کے ایک عزیز عمیر بن وہب نے مسلمان ہو کر نبی ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ، صفوان اپنی قوم کا سردار ہے۔ وہ فرار ہو گیا ہے۔ اپنے تئیں سمندر میں غرق کر لے گا، آپ اس کو امان عطا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا اس کے لیے امان ہے۔ امان کی علامت کے طور پر آپؐ نے اپنا عمامہ عمیر کو دیا۔ عمیر نے جدہ پہنچ کر صفوان کو معافی کی اطلاع دی اور واپس چلنے کو کہا۔ انہوں نے اس پر ہچکچاہٹ کا اظہار کیا تو عمیر نے یقین دلایا کہ آنحضرتؐ بے حد حلیم و کریم انسان ہیں۔ وہ تمہارے چچا زاد بھائی ہیں۔ ان کی عزت تمہاری عزت، ان کا شرف تمہارا شرف اور ان کی حکومت تمہاری حکومت ہے۔ اس پر صفوان مکہ آئے، آنحضرتؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے، عمیر کا گمان ہے کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں یہ سچ ہے۔ صفوان نے کہا کہ آپ مجھے دو ماہ کی مہلت دیں تا کہ میں اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا، تمہیں چار ماہ کی مہلت ہے، جو چاہو فیصلہ کرو۔ صفوان نے چند ہفتوں کے بعد اسلام قبول کر لیا[6]۔

سہیل بن عمرو نے معاہدہ حدیبیہ پر دستخط کیے تھے لیکن بعد میں نقض عہد کے بھی مرتکب ہوئے۔ فتح مکہ

کے دن اسلامی لشکر کا مقابلہ کرنے والوں میں شامل تھے۔ شکست کے بعد دروازہ بند کر کے گھر کے اندر بیٹھ گئے۔ ماضی میں اپنے دشمنانہ رویہ کی بنا پر خوف زدہ تھے کہ انہیں ہرگز معاف نہیں کیا جائے گا۔ ان کے بیٹے عبداللہ نے ان کے لیے امان کا پروانہ حاصل کیا۔ سہیل نے فوراً اسلام قبول نہ کیا لیکن لشکر اسلام میں شامل ہو کر حنین کی لڑائی میں حصہ لیا اور واپسی پر جعرانہ کے مقام پر اسلام قبول کیا۔

حویطب کسی احاطہ میں روپوش تھا کہ ابوذرؓ وہاں جا نکلے۔ وہ بھاگنے لگا تو انہوں نے آواز دے کر روکا کہ تمہیں امان ہے۔ چاہو تو میں تمہیں رسول اللہ کے پاس لے چلوں اور چاہو تو تمہارے گھر پہنچا دوں۔ حویطب نے حیرت سے پوچھا، مجھے میرے گھر تک پہنچنے کون دے گا۔ رستے ہی میں قتل کر دیا جاؤں گا۔ ابوذرؓ اس کے ہمراہ ہو لیے اور امان کا اعلان کرتے ہوئے اس کو اس کے گھر پہنچا دیا۔ بعد میں آنحضرتؐ سے اپنے اس فعل کی تصویب کرالی۔

آنحضرتؐ کی طرف سے امان اور عفو عام کا اثر یہ ہوا کہ نبی ﷺ اور دین اسلام کے بارہ میں اہل مکہ کے شبہات رفع ہو گئے اور انہیں احساس ہوا کہ اب تک ہم بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ نبی ﷺ کو اپنا دشمن سمجھا اور آپ کے پیغام کی قدر نہ کی۔

اہل مکہ کے اسلام کے لیے مہلت:

بعض مستشرقین نے فتح مکہ کے بارے میں یہ تاثر قائم کر دیا ہے کہ اہل مکہ چونکہ مغلوب کر لیے گئے تھے اس لیے ان کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ واقعات سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اوپر جن سرداروں کا ذکر کیا گیا ہے انہوں نے فی الفور اسلام قبول نہیں کیا بلکہ سوچنے کی مہلت مانگی جو ان کو دے دی گئی۔ عملاً یہ سردار چند ہفتے بعد جعرانہ میں یا اس کے بعد کسی وقت مسلمان ہوئے۔ روایات کے مطابق جعرانہ میں نبی ﷺ نے قریشی سرداروں کی تالیف قلب کے لیے ان کو مال غنیمت میں سے بہت سا مال و منال عطا فرمایا تھا۔ اس تالیف کا مقصد یہی تھا کہ ان کے دل اسلام کی دعوت قبول کرنے کے لیے کھلیں اور وہ مسلمان ہو جائیں۔ اگر یہ پہلے ہی زبردستی مسلمان کر لیے گئے ہوتے تو اس داد و دہش کا کوئی موقع نہ تھا۔

سورہ براءت کے نزول کے ساتھ جو احکام دیے گئے تھے ان کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔ ان احکام کی رو سے مشرکین کو چار ماہ کی مہلت دینے کا حکم تھا۔ اس مدت کے گزر جانے کے باوجود اگر وہ اسلام نہ لاتے تو ان کو قتل کیا جا سکتا تھا۔ اہل مکہ پر اسی حکم کا اطلاق ہوا۔ ان کے ہتھیار ڈالنے پر ان کو مہلت دی گئی کہ وہ چار ماہ کی مدت

کے دوران اسلام یا کفر میں سے ایک کا انتخاب کر لیں۔ اور صفوان بن امیہ کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ انہوں نے فیصلہ کے لیے دو ماہ کی مہلت مانگی لیکن آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تمہیں چار ماہ کی مہلت ہے۔ اس ارشاد کا سبب یہی تھا کہ قرآن مجید کے احکام میں چار ماہ ہی مقرر کیے گئے ہیں۔ اس عرصہ میں مشرکین کو قرآن کی تعلیم سے آشنا کرنے کا حکم بھی تھا۔ جوں جوں لوگ اسلام کی تعلیم اور اس کے اخلاق سے آگاہ ہوتے گئے وہ اسلام کی طرف کھنچے چلے آئے۔ کسی نے فتح مکہ کے موقع پر ہی اسلام قبول کر لیا۔ کسی نے فیصلہ کرنے میں چند روز یا چند ہفتے صرف کیے لیکن چار ماہ کی معینہ مدت کے اندر اندر مکہ کی تمام آبادی مسلمان ہو گئی۔ ان کے ساتھ تلوار کا معاملہ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

اہل مکہ سے دوسرا خطاب:

دو قبائل ہذیل اور خزاعہ کے مابین دشمنی تھی۔ ایک ہذلی ابن الاثوع نے خزاعہ کے احمر نامی ایک بہادر شخص کا قتل کیا تھا۔ فتح مکہ کے اگلے روز ابن الاثوع کو خزاعہ کے خراش بن امیہ نے مکہ میں دیکھ لیا اور موقع پا کر اسے قتل کر دیا۔ نبی ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو آپ نے ایک خطاب میں حرم مکہ کے حقوق بیان فرمائے۔ آپؐ نے فرمایا:

> ''اے لوگو! جس دن سے اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان بنائے ہیں اسی دن سے مکہ کی سرزمین کو محترم بنایا ہے۔ یہ سرزمین روز قیامت تک محترم ہے۔ کسی شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، یہ جائز نہیں کہ وہ حدود حرم میں خون بہائے اور نہ یہ جائز ہے کہ یہاں سے درخت کاٹے۔ مجھ سے پہلے جو لوگ گزرے ان میں سے کسی کے لیے حرم حلال نہیں ہوا اور جو میرے بعد ہوں گے ان کے لیے بھی یہ حلال نہیں ہوگا۔ میرے لیے بھی بس ایک ساعت کے لیے اس کی حرمت ساقط کی گئی۔ پھر یہ اسی طرح لوٹ آئی جیسی کل تھی۔ موجود لوگ غیر موجود لوگوں کو یہ احکام پہنچا دیں۔ اے خزاعہ! قتل سے ہاتھ روکو۔ قتل کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس وقت جس شخص کو تم نے قتل کر دیا ہے اس کی دیت تو میں ادا کروں گا۔ لیکن اس خطاب کے بعد کوئی قتل ہوا تو مقتول کے اہل خاندان کو اختیار ہوگا کہ چاہیں تو وہ قاتل کی جان لیں اور چاہیں تو اس سے خون بہا طلب کریں۔
>
> یہ بات بھی سن لو کہ غلطی سے قتل ہونے والا بھی کوڑے یا لاٹھی سے عمداً مارے جانے والے کی مانند ہے۔ قتل خطا میں کامل دیت ادا کرنی ہوگی یعنی سو اونٹ جن میں چالیس گابھن اونٹنیاں

ہوں گی''۔

خطاب کے اس آخری حصہ کو سیرت نگاروں نے پہلے دن کے خطاب میں شامل کیا ہے حالانکہ اس میں یہ بالکل غیر مربوط ہے۔ قتل کا واقعہ پیش آ جانے کے بعد اس کا موقع پیدا ہوا اور یہ اسی دوسرے خطاب کے لیے موزوں موضوع تھا۔ ہمارے نزدیک اس کو پہلے خطاب کا حصہ بنانا صحیح نہیں۔

حرم شریف کی حرمت کے بارے میں یہ آپ کی نہایت بروقت تنبیہ تھی جس کے شاہد عرب کے متعدد قبائل سے آئے ہوئے لوگ اور خود اہل مکہ بنے۔ اس تنبیہ کا مقصد یہ تھا کہ مکہ پر آپ کی چڑھائی کو مثال بنا کر لوگ مستقبل میں اس کی حرمت کو پامال نہ کریں۔ خود آپ کے لیے حرمت ساقط کی گئی تو اس لیے کہ اہل مکہ آپ کی رسالت کے اولین مخاطب تھے اور رسولوں کے بارے میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ اگر ان کی قوم تکذیب کی مجرم ہو تو اس کو تباہ کر دیا جاتا ہے اور اگر اہل ایمان کی تعداد کافی ہو تو ان کی تلواروں سے مکذبین کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔ بہر طور اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو ہمیشہ ان کے دشمنوں پر غالب کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو قبل از وقت اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔

حرم مکہ کی حرمت ساقط کرنے کے بارے میں ہدایت آپ کو پہلے ہی دی جا چکی تھی جب فرمایا:

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ۔ (بقرہ۲:۱۹۱)

اور ان کو جہاں کہیں تم پاؤ قتل کرو اور ان کو وہاں سے نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس خود پہل کر کے جنگ نہ کرو جب تک وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں۔ پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان کو قتل کرو۔ یہی کافروں کا بدلہ ہے۔

حرمت بیت اللہ کے بارے میں حضورؐ کا دیا ہوا یہ چارٹر رہتی دنیا تک اہل اسلام کے لیے مشعل راہ ہے۔

حرم کو مظاہر شرک سے پاک کرنے کی مہم:

مکہ فتح ہوتے ہی آپ نے اہل مکہ اور اطراف کے قبائل میں پارٹیاں بھیجیں تاکہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ مظاہر شرک کو ختم کرائیں لیکن کسی سے جنگ نہ کریں۔ جہاں آپ نے خود حرم کعبہ کے اندر سے بتوں اور تصاویر کو ختم کرنے میں حصہ لیا وہیں اس بات کی منادی بھی کرائی کہ لوگوں نے گھروں کے اندر جو بت رکھے ہوں وہ ان کو توڑ دیں۔ فتح مکہ کے دوسرے روز اہل مکہ کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ نبی ﷺ کوہ صفا پر تشریف فرما ہو

گئے ۔لوگ آتے اور اسلام اور سمع و طاعت پر بیعت کرتے ۔ مردوں کے بعد خواتین نے اسلام قبول کیا۔ بعد ازاں آنحضرتؐ کے پندرہ دن کے قیام کے دوران اطرف مکہ سے بھی لوگ آ آ کر اسلام قبول کرتے رہے۔

فتح مکہ کے چند یوم بعد اطراف میں نصب شدہ بتوں کو توڑنے کے لیے آپ نے پارٹیاں تشکیل دیں۔ نخلہ کے مقام پر عزیٰ کا بت نصب تھا جو قریش، کنانہ اور مضر کا خاص بت تھا۔ بنو شیبان اس کے مجاور تھے۔تیس سواروں کے ہمراہ حضرت خالد بن ولیدؓ اس کو گرانے گئے ۔ جب وہ اسے گرا کر واپس آئے تو حضورؐ نے فرمایا! اب کبھی عزیٰ کی پرستش نہیں ہوگی ۔ ہذیل کا خاص بت سواع مکہ سے تین میل دور نصب تھا۔عمرو بن العاصؓ کو اس کا معبد ڈھانے کے لیے بھیجا گیا۔خزاعہ اور بنو کلب کو خاص عقیدت منات سے تھی اور مدینہ کے قبائل اوس و خزرج بھی اس کی تعظیم کیا کرتے تھے۔حضورؐ نے اس کو گرانے پر انصار ہی کے ایک فرزند سعد بن زید اشہلیؓ کو مقرر فرمایا۔ انہوں نے بیس ساتھیوں کے ہمراہ اس بت کا نام و نشان مٹا دیا۔ اس طرح چند روز کے اندر مسلمانوں کا قبلہ آزاد اور شرک و مظاہر شرک سے پاک ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے خاص ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے اپنی مدت قیام ہی میں حدود حرم مقرر فرمائیں اور تمیم بن اسید خزاعیؓ کو حکم دیا کہ وہ ان حدود پر پتھر لگا دیں۔ انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس طرح حرم کعبہ کو پھر اس کی اصل پر لوٹا دیا گیا جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے قائم کیا تھا۔ اب یہ دین حنیف کے اصل وارثوں کے قبضہ میں تھا۔

بعض اہم فیصلے:

مکہ کی فتح کے اس اہم موقع پر کئی نئے مسائل پیدا ہوئے جن کے ضمن میں آنحضرتؐ نے نہایت اہم فیصلے فرمائے اور ہدایات دیں جن سے دین کا مزاج سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ مثلاً:

(۱) مکہ فتح ہونے پر بعض لوگوں کا، جو مدینہ کو ہجرت کر چکے تھے، خیال یہ تھا کہ مکہ میں ان کی املاک ان کو لوٹا دی جائیں گی۔ خود نبی ﷺ کو بھی مشورہ دیا گیا کہ آپ اپنے مکان میں قیام فرمائیں۔ آپ نے ایسے لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ ہجرت کر جانے کے بعد وہ اپنے مکانوں میں دلچسپی نہ لیں بلکہ توقع رکھیں کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کو ان مکانات کے بدلے میں کہیں بہتر مکان عطا فرمائے گا۔

اس ہدایت میں یہ پیغام پوشیدہ تھا کہ ہجرت تو نام ہی اللہ کے لیے ہر چیز سے دستبردار ہو جانے کا ہے۔ جب ایک مرتبہ املاک کی قربانی دی جا چکی ہے تو اب ان کو واپس حاصل کرنے کی طمع صرف ہجرت کو ناقص کرنے کا سبب بنے گی۔ لہٰذا ایک مہاجر کے اندر اپنے قدیمی گھر کے لیے کوئی رغبت نہیں ہونی چاہیے۔

انصار کو یہ خیال ہوا کہ فتح مکہ کے بعد نبی ﷺ کے اندر آبائی وطن کی محبت نہ جاگ اٹھے۔ آنحضرتؐ کو ان کے خیالات کا علم ہوا تو وضاحت فرمائی کہ ہجرت کے بعد اب میرا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہے۔

(ب) مجاشع بن مسعودؓ نبی ﷺ کی خدمت میں اپنے بھائی کو لے کر آئے اور بتایا کہ میرا یہ بھائی ہجرت پر بیعت کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے جواب دیا ہجرت کرنے والے ہجرت کی برکات سے مستفید ہو چکے۔ مکہ فتح ہونے کے بعد کوئی ہجرت نہیں۔ اب میں صرف اسلام، ایمان اور جہاد پر بیعت لوں گا۔

یہ ایک اہم نکتہ تھا۔ ہجرت ہر نقل مکانی کا نام نہیں۔ وہ تو دین کے قیام کی جدوجہد اور اپنے دین کے تحفظ کے لیے کی جاتی ہے۔ فتح مکہ سے پہلے دینی جدوجہد کے لیے تمام مسلمانوں کا یکجا ہونا ضروری تھا۔ اس لیے ملک بھر کے مسلمانوں کو اپنے مرکز مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ فتح مکہ سے قبل ہجرت اسلام اور نفاق میں امتیاز کی علامت بن گئی۔ جب مکہ سے مدینہ تک دارالاسلام بن چکا تو اب ہجرت کا کیا موقع باقی رہا۔ اگلا مرحلہ تو جہاد کا تھا تاکہ دین کو پورے جزیرہ عرب میں پھیلا دیا جائے۔ لہٰذا آپ نے یہ وضاحت فرمائی کہ اب جہاد کرنا اور نیت رکھنا ہوگا۔ یعنی ہر مسلمان کی نیت یہ ہونی چاہیے کہ اگر مجھے دین کی حفاظت کے لیے وطن چھوڑنا پڑا تو ہجرت سے دریغ نہیں کروں گا۔

(ج) قیام مکہ کے دوران آنحضرت ﷺ کے سامنے چوری کا ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں فاطمہ نام کی ایک قریشی خاتون سے یہ جرم سرزد ہوا تھا۔ اس کے متعلقین کو بڑی تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے اسامہ بن زیدؓ کو سفارشی بنا کر حضورؐ کے پاس بھیجا کہ ملزمہ معزز خاندان کی خاتون ہے، اس کو معاف کر دیا جائے۔ آپ نے نہایت تند لہجے میں فرمایا کہ اسی طرح کی حرکتیں پچھلی قوموں کو لے ڈوبیں کہ وہ مالداروں کے جرائم معاف کر دیتے اور غریبوں پر قانون نافذ کرتے۔ اللہ کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی اس جرم کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کٹوا دیتا۔ یہ کہہ کر آپ نے خاتون پر حد جاری فرمائی۔

یہ اسلام کے تصور عدل وقسط کی عملی وضاحت تھی۔ آنحضرتؐ نے یہ سبق دیا کہ قانون کا اطلاق چھوٹے بڑے، امیر وغریب سب پر یکساں ہونا چاہیے اور اس میں کسی کے خاندانی مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے اسے مستثنیٰ قرار دینا قوم کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس موقع پر آپ نے نفاذ قانون کے معاملہ میں سفارش کرنے پر اسامہؓ کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

(د) انہی دنوں دوسرے مقدمات میں آپؐ نے شریعت کے بعض اہم اصول بیان فرمائے۔ مثلاً:

(i) وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی۔ یہ صرف غیر وارثوں کے حق میں کی جا سکتی ہے۔
(ii) وراثت انہی کو پہنچے گی جو ایک ہی ملت سے تعلق رکھتے ہوں۔
(iii) بچہ جس کے گھر میں پیدا ہوا اسی کا مانا جائے گا۔ بدکار نامراد ہوگا۔
(یہ فیصلہ حضور نے عتبہ بن ابی وقاص کے اس دعویٰ کے باب میں کیا کہ زمعہ کی لونڈی سے جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ زمعہ کا نہیں، میرا ہے۔ آنحضرتؐ نے یہ دعویٰ رد کر دیا)

حوالہ جات

۱۔ کتاب المغازی۔ واقدی، موسسہ الاعمی بیروت، ج ۲، ص ۷۹۹
۲۔ صحیح بخاری۔ کتاب المغازی، باب این رکز النبیؐ الرایہ یوم الفتح
۳۔ الطبقات الکبریٰ۔ ابن سعد۔ ج ۱، ص ۴۴۱
۴۔ عہد نامہ قدیم، استثنا باب ۳۳: ۲
۵۔ کتاب المغازی۔ واقدی، موسسہ الاعلمی بیروت۔ ج ۲، ص ۸۵۱
۶۔ ایضاً، ص ۸۵۲

باب 41

غزوہ حنین

نبی ﷺ کی مکہ پر لشکر کشی کی نقل وحرکت رازدارانہ نہ تھی بلکہ اس کی منزلیں اور اوقات معلوم تھے۔ مہم کا ہدف بھی معین ومعلوم تھا۔ اس کے باوجود مکہ سے آگے طائف کی جانب آباد قبائل ہوازن اور ثقیف نے اپنے طور پر مسلمانوں سے ٹکر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی جانب بڑھتے ہوئے جب لشکر اسلام ابھی مرالظہر ان بھی نہیں پہنچا تھا کہ اس سے پہلے عرج کی منزل پر ایک جاسوس پکڑا گیا۔ اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے بتایا کہ وہ قبیلہ ہوازن سے تعلق رکھتا ہے اور مسلمانوں کی مہم کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنے کے لیے اسے بھیجا گیا ہے۔ اس جاسوس نے انکشاف کیا کہ ہوازن مسلمانوں کے ساتھ ٹکر لینے کا فیصلہ کر چکے ہیں کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اہل مکہ کے بعد انہی کی باری آنے والی ہے۔ جاسوس نے اپنی قوم کی منصوبہ بندی کی بعض تفصیلات بیان کیں اور یہ تک بتایا کہ ہوازن کے دو ذیلی قبیلے بنوکعب اور بنوکلاب اس مہم جوئی سے الگ ہیں، باقی تمام خاندانوں نے مالک بن عوف کی سربراہی پر اتفاق کر لیا ہے اور لشکروں کو جمع ہونے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ یہ انکشافات مسلمانوں کے لیے نہایت تشویش ناک تھے۔ تاہم نبی ﷺ نے اپنے اصل ہدف یعنی قبلہ کی آزادی سے توجہ نہ ہٹائی اور ہوازن کے خلاف فوری اقدام مناسب نہیں سمجھا۔ البتہ آپ نے جاسوس کو گرفتار کر کے ساتھ رکھا تاکہ دشمن کو اس کی مطلوبہ اطلاعات نہ پہنچ سکیں۔ مکہ کی فتح کے بعد آپ مکہ میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے اقدامات کرتے رہے۔

مکہ میں قدم جمانے کے بعد آنحضرتؐ نے عبداللہ بن ابی حدرد الاسلمیؓ کو حکم دیا کہ وہ ہوازن کے علاقے میں جائیں اور وہاں چند روز مقیم رہ کر حقیقت حال کا مشاہدہ کریں اور مالک بن عوف کی جنگی تیاریوں کی خبر لائیں۔ عبداللہؓ نے ایسا ہی کیا اور واپس آ کر ان اطلاعات کی تصدیق کی جو پہلے سے جاسوس سے حاصل ہو چکی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ دشمن کی تیاری مکمل ہے اور وہ اوطاس کے علاقہ میں جمع ہو رہا ہے جو مکہ سے شمال مشرق کی جانب تین منزل کی مسافت پر واقع ہے۔ نبی ﷺ نے پیش قدمی کر کے اوطاس ہی میں ہوازن اور ثقیف کے خطرہ کو کچلنے

کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے مجاہدین کو مہم کی تیاری کا حکم دیا۔ اہل مکہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ انہوں نے اظہار وفاداری کے لیے لشکر میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی ایک قلیل تعداد بھی لشکر میں شامل ہوگئی جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے چار ماہ کی مہلت کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اس طرح لشکر کی تعداد دس ہزار سے بڑھ کر بارہ ہزار ہوگئی اور اس کو مسلح کرنے کے لیے نبی ﷺ کو قریشی سردار صفوان بن امیہ سے ہتھیار مستعار لینے پڑے۔

لشکر کی روانگی:

۵ شوال سنہ ۸ ھ کو مکہ سے بارہ ہزار کا لشکر روانہ ہوا تو یہ اس دور کے لحاظ سے بہت بڑی قوت تھا۔ قدرتی طور پر مسلمانوں کے اندر فخر کا احساس پیدا ہو گیا کہ ہوازن اور ثقیف اتنی بڑی نفری کے سامنے بھلا کہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ مہم ایک مختصر جنگی کارروائی ثابت ہوگی۔ اس طرح کے خیالات ہوں تو آدمی میں غلط قسم کی خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ معاملے کو ذمہ داری اور سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر بھی قدرے بے پروائی پیدا ہوگئی اور نظم وضبط اور ہوشیاری کا وہ اہتمام باقی نہ رہا جو ان کا طرہ امتیاز تھا۔ دوسری طرف ہوازن نے اس جنگ کے لیے غیر معمولی اہتمام کیا۔ انہوں نے چار ہزار کی تعداد میں نفری تو جمع کر ہی لی تھی، اس کے اندر سرفروشی اور غیرت مندی کے جذبات پیدا کرنے کے لیے انہوں نے مال مویشی اور اہل وعیال بھی میدان جنگ میں جمع کر لیے تاکہ کوئی شخص میدان چھوڑ کر بھاگنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

نبی ﷺ نے اپنے گھوڑ سوار جائزہ لینے کے لیے آگے بھیج رکھے تھے۔ ان میں سے ایک نے آ کر اطلاع دی کہ میں نے پہاڑ پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ ہوازن پہاڑوں کے درمیان وادی میں اکٹھے ہوئے ہیں اور ان کی خواتین، مال مویشی اور ریوڑ ان کے ہمراہ ہیں۔ نبی ﷺ نے تبسم فرمایا اور خوشخبری دی کہ ان شاء اللہ کل یہ سب کچھ ہمارے لیے مال غنیمت ہوگا۔ آپ نے اس رات وادی کی طرف کی گھاٹی پر ایک پہرہ دار مقرر کیا تاکہ دشمن رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر نقصان نہ پہنچا سکے۔

ہوازن سے جنگ:

ہوازن تیر اندازی میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ انہوں نے وادی کے ارد گرد واقع پہاڑی دروں اور گھاٹیوں میں تیر انداز متعین کر دیے۔ اگلی صبح دھندلکے میں جب لشکر اسلام وادی میں داخل ہوا تو چاروں طرف سے

چاہیے نہ کہ اپنی قوت بازو پر۔ سورہ انفال میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ قریش جب مکہ سے نکلے تو شیطان نے ان کے دل میں یہ خیال جمادیا کہ لا غالب لکم الیوم من الناس (آج لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا) لیکن انہوں نے بدر میں جا کر دیکھا کہ تعداد اور اسلحہ کے لحاظ سے نہایت فروتر جماعت نے ان کے تمام کس بل نکال دیے۔ اوطاس کے لیے روانہ ہوتے وقت بعض لوگوں کی طرف سے اپنی تعداد پر فخر کا جو اظہار ہوا تھا اس سے سورہ انفال کی ہدایات کی خلاف ورزی ہوئی۔ اس پر سرزنش کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آغاز جنگ میں اہل ایمان کو تشویش ناک حالات سے دوچار کیا۔ پھر جب ان کے اندر انابت اور استقلال کی صفات ظاہر ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے غیر مرئی لشکر اتارے اور اہل ایمان کو نصرت بہم پہنچائی جس کے مستحق تمام اہل ایمان ہوتے ہیں۔ یوں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مومنین کو فتح حاصل ہوئی۔

روایات میں جنگ میں شکست کا یہ سبب بھی بیان ہوا ہے کہ ابتداء میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گئی تھی۔ پھر جب وہ مال غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے تو کفار نے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ ہمارے نزدیک یہ صورت واقعہ قرآن مجید کی آیات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس لیے پہلی توجیہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

غزوہ حنین کے بارے میں ایک سوال یہ بھی اٹھایا گیا ہے کہ حجاز میں کہیں حنین کے نام کی وادی موجود نہیں۔ لہٰذا اگر قرآن نے یہ لفظ استعمال کیا ہے تو یہ وادی کے نام کے طور پر نہیں ہے۔ بعض اہل تحقیق نے یہ توجیہ پیش کی ہے کہ مویشیوں کے بلبلانے، ممیانے اور ڈکرانے کے شور کے لیے بھی حنین کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ اس جنگ کے دوران جانوروں کا شور نہایت نمایاں تھا اس لیے قرآن نے 'یوم حنین' کہہ کر اس جنگ کے ایک نمایاں وصف کی طرف توجہ دلائی۔

ہوازن شکست کھا کر بھاگے تو تتر بتر ہو گئے۔ لشکر کا ایک حصہ نخلہ کی طرف فرار ہوا اور دوسرا حصہ اوطاس کی طرف بھاگا جو وادی سے ذرا آگے واقع تھا۔ اس حصہ کا تعاقب ابو عامر اشعریؓ نے کیا اور اس کو زک پہنچائی۔ تیسرا حصہ سالار لشکر مالک بن عوف کے ہمراہ طائف جا کر قلعہ بند ہو گیا۔ ان مہمات میں بڑی مقدار میں مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہوازن اپنے مویشی تک بھی میدان جنگ میں لے آئے تھے۔ شکست ہونے پر وہ ہر چیز چھوڑ کر میدان سے بھاگ گئے اور یہ مال اہل ایمان کے ہاتھ آیا۔ نبی ﷺ نے مال غنیمت اور عورتوں اور بچوں کو مکہ کی جانب جعرانہ کے مقام پر بھجوانے کا حکم دیا اور اس فریضہ کا ذمہ دار مسعود بن عمرو الغفاریؓ کو بنایا جو جعرانہ کیمپ کے انچارج تھے۔ خود آپ نے مجاہدین کی بڑی تعداد کے ہمراہ طائف کا رخ کیا اور وہاں جا کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ

چاہیے نہ کہ اپنی قوت بازو پر۔ سورہ انفال میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ قریش جب مکہ سے نکلے تو شیطان نے ان کے دل میں یہ خیال جما دیا کہ لا غالب لکم الیوم من الناس (آج لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا) لیکن انہوں نے بدر میں جا کر دیکھا کہ تعداد اور اسلحہ کے لحاظ سے نہایت فروتر جماعت نے ان کے تمام کس بل نکال دیے۔ اوطاس کے لیے روانہ ہوتے وقت بعض لوگوں کی طرف سے اپنی تعداد پر فخر کا جو اظہار ہوا تھا اس سے سورہ انفال کی ہدایات کی خلاف ورزی ہوئی۔ اس پر سرزنش کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آغاز جنگ میں اہل ایمان کو تشویش ناک حالات سے دوچار کیا۔ پھر جب ان کے اندر ثابت اور استقلال کی صفات ظاہر ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے غیر مرئی لشکر اتارے اور اہل ایمان کو نصرت بہم پہنچائی جس کے مستحق تمام اہل ایمان ہوتے ہیں۔ یوں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مومنین کو فتح حاصل ہوئی۔

روایات میں جنگ میں شکست کا یہ سبب بھی بیان ہوا ہے کہ ابتداء میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گئی تھی۔ پھر جب وہ مال غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے تو کفار نے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ ہمارے نزدیک یہ صورت واقعہ قرآن مجید کی آیات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس لیے پہلی توجیہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

غزوہ حنین کے بارے میں ایک سوال یہ بھی اٹھایا گیا ہے کہ حجاز میں کہیں حنین کے نام کی وادی موجود نہیں۔ لہٰذا اگر قرآن نے یہ لفظ استعمال کیا ہے تو یہ وادی کے نام کے طور پر نہیں ہے۔ بعض اہل تحقیق نے یہ توجیہ پیش کی ہے کہ مویشیوں کے بلبلانے، ممیانے اور ڈکرانے کے شور کے لیے بھی حنین کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ اس جنگ کے دوران جانوروں کا شور نہایت نمایاں تھا اس لیے قرآن نے 'یوم حنین' کہہ کر اس جنگ کے ایک نمایاں وصف کی طرف توجہ دلائی۔

ہوازن شکست کھا کر بھاگے تو تتر بتر ہو گئے۔ لشکر کا ایک حصہ نخلہ کی طرف فرار ہوا اور دوسرا حصہ اوطاس کی طرف بھاگا جو وادی سے ذرا آگے واقع تھا۔ اس حصہ کا تعاقب ابو عامر اشعریؓ نے کیا اور اس کو زک پہنچائی۔ تیسرا حصہ سالار لشکر مالک بن عوف کے ہمراہ طائف جا کر قلعہ بند ہو گیا۔ ان مہمات میں بڑی مقدار میں مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہوازن اپنے مویشی تک بھی میدان جنگ میں لے آئے تھے۔ شکست ہونے پر وہ ہر چیز چھوڑ کر میدان سے بھاگ گئے اور یہ مال اہل ایمان کے ہاتھ آیا۔ نبی ﷺ نے مال غنیمت اور عورتوں اور بچوں کو مکہ کی جانب جعرانہ کے مقام پر بھجوانے کا حکم دیا اور اس فریضہ کا ذمہ دار مسعود بن عمرو الغفاریؓ کو بنایا جو جعرانہ کیمپ کے انچارج تھے۔ خود آپ نے مجاہدین کی بڑی تعداد کے ہمراہ طائف کا رخ کیا اور وہاں جا کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ

محاصرہ اٹھارہ روز جاری رہا۔ اسی دوران میں آپ نے گردونواح کے علاقہ میں مجاہدین کے دستے بھیج کر پورے علاقہ کو زیر کرلیا۔ جب آپ نے محسوس کیا کہ اب اس علاقہ میں اسلامی حکومت نے قدم جما لیے ہیں تو طائف کا محاصرہ اٹھالیا کیونکہ اسلام کی وسیع مملکت میں کفر کے ایک جزیرے کے پنپنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وقت نے بتایا کہ آنحضرتؐ کا یہ فیصلہ درست تھا۔

مال غنیمت کی تقسیم:

طائف سے آنحضرتؐ جعرانہ تشریف لے گئے اور مال غنیمت کی تقسیم شروع کی۔ مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول یا دوسرے الفاظ میں حکومت کا تھا۔ اس حصہ میں سے آپ نے متعدد سرداران قبائل کو سو سو اور پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے۔ ان میں غطفان کے عیینہ بن حصن، تمیم کے اقرع بن حابس اور قریش کے ابوسفیان، صفوان بن امیہ، حکیم بن حزام اور سہیل بن عمرو وغیرہ شامل تھے۔ اس داد و دہش کا مقصد لوگوں کو یہ پیغام دینا تھا کہ اسلامی حکومت میں کفار کی ماضی کی مخالفانہ سرگرمیوں کا انتقام نہیں لیا جاتا۔ نیز لوگوں کے ساتھ ان کے مرتبہ اور حیثیت کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا لوگ بے خوف وخطر اسلام میں داخل ہوں۔ تحفظ بھی حاصل کریں اور عزت بھی۔ اس موقع پر آپ نے مالک بن عوف کا ذکر بھی فرمایا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو یہ تمام مراعات اس کو بھی حاصل ہوں گی۔ نبی ﷺ کے اس حسن سلوک نے سرداران قبائل اور ان کے پیروؤں پر یکساں اچھا اثر ڈالا۔ اس سے ان کو اسلام کے بارے میں یکسو ہونے میں مدد ملی۔ چنانچہ قریشی سرداروں میں سے جو بھی تک سوچ بچار کی حالت میں تھے وہ جعرانہ میں مسلمان ہو گئے۔ صفوان بن امیہ کہا کرتے تھے کہ نبی ﷺ میرے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض تھے لیکن ان تحائف کے باعث آپ نے میرا دل جیت لیا۔ پھر جوں جوں میں آپ کے قریب آیا تو میرا یہ حال ہو گیا کہ آپ میرے لیے محبوب ترین شخص تھے۔ اصل میں برس ہا برس کی محاذ آرائی کے باعث اسلام اور مسلمانوں کے لیے بعض لوگوں کے دلوں میں بدظنی پیدا ہوگئی تھی۔ آنحضرتؐ کے افضال وعنایات نے اس تاثر کو زائل کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

مال غنیمت تقسیم ہو چکا اور قیدیوں کا معاملہ ابھی باقی تھا کہ ہوازن کا ایک نمائندہ وفد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور اپنے قبیلہ کے اسلام قبول کرنے کی خبر لائے تھے۔ یہ ملتمس ہوئے کہ ان کے قیدی اور اموال ان کو لوٹا دیے جائیں۔ بنوسعد قبیلہ، جس میں آنحضرتؐ نے اپنا بچپن گزارا تھا، کے لوگوں نے آپ کو بتایا کہ آپ کی رضاعی پھوپھیاں اور خالائیں بھی قید میں ہیں۔ ان پر رحم کرتے ہوئے انہیں آزاد کر دیا

جائے۔ نبی ﷺ نے ہوازن کے وفد کو بتایا کہ میں نے جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ کئی ہفتے تمہارا انتظار کرنے کے بعد میں نے تمہارا مال تقسیم کیا ہے۔ انہوں نے عرض کی کہ پھر ہمارے قیدی آزاد کر دیے جائیں۔ حضورؐ نے مجاہدین سے خطاب فرمایا کہ یہ تمہارے بھائی تائب ہو کر آئے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ ان کے قیدی واپس کر دوں۔ آپ لوگ خوش دلی سے ایسا کر دیں تو اچھا ہوگا۔ جہاں تک مال کا تعلق ہے میں بنوعبدالمطلب کو دیا ہوا مال واپس کرتا ہوں۔ دوسرے لوگ اگر یہ پسند کریں کہ ان کا حصہ ان کو ضرور ملے تو کسی آئندہ مال غنیمت میں سے میں ان کو ان کا حصہ واپس کر دوں گا۔ آنحضرتؐ کی اس اپیل کا یہ اثر ہوا کہ پورے لشکر نے سامان واپس کر دیا اور ہوازن اپنے بیوی بچوں کو آزاد کرا کے خوش خوش اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔ عرب جاہلیت کے معاشرہ میں دشمنوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک بالکل ناپید تھا لہٰذا مسلمانوں کے طرز عمل کا جو اثر ہوازن اور دوسرے قبائل پر، جن تک یہ خبر پہنچی ہوگی، پڑا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

انصار کا شکوہ:

نبی ﷺ جب قبائل کے اکابرین کو مال و منال عطا فرما رہے تھے تو انصار کے بعض نوجوانوں نے اس کو اقربا نوازی سے تعبیر کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ آپؐ اپنے قبیلہ کو نواز رہے ہیں اور ہمیں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ ہماری تلواروں سے قریش کا خون ٹپک رہا ہے۔ جان دینے کا وقت ہو تو انصار کو پکارا جاتا ہے اور مال عطا کرنے کے لیے قریش ہیں۔ اس بات کا تذکرہ آنحضرتؐ سے کیا گیا تو آپ نے انصار کو اپنے خیمہ میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ جب وہ آئے تو آپؐ نے پوچھا یہ میں تمہاری طرف سے کیا سن رہا ہوں۔ انصار کے اکابر نے عرض کی، یارسول اللہ! ہمارے لیڈروں میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی البتہ کچھ نوجوانوں نے اس طرح کے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ''اے انصار میں جب تمہارے پاس آیا تو کیا تم گمراہ نہ تھے پھر اللہ نے تمہیں ہدایت دی۔ کیا تم محتاج نہ تھے تو اللہ نے تمہیں غنی کر دیا۔ کیا تم باہم دشمن نہ تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی''۔ انہوں نے جواب دیا، جی ہاں! اللہ اور اس کا رسولؐ ہمارے بڑے محسن ہیں۔ آپ نے فرمایا 'اللہ کی قسم اگر تم چاہتے تو یہ جواب دے سکتے تھے' اور تم اس جواب میں سچے بھی ہوتے کہ آپ جب ہمارے ہاں تشریف لائے تو آپ کو جھٹلایا جا چکا تھا۔ یہ ہم تھے جنہوں نے آپ کی تصدیق کی، آپ بے یار و مددگار تھے ہم نے آپ کی مدد کی، آپ کو جلاوطن کر دیا گیا تھا ہم نے آپ کو پناہ دی۔ آپ محتاج تھے ہم نے آپ کو دلاسا دیا'۔ خطاب کا یہ انداز انصار کو یہ حقیقت سمجھانے کے لیے تھا کہ ان کو اصل دولت جو ملی ہے وہ اسلام کی دولت ہے اور نبی ﷺ کی ذات کے لیے انہوں نے جو قربانیاں دی

ہیں آنحضرتؐ دل سے ان کے قدردان ہیں لہٰذا ان کا یہ تاثر غلط ہے کہ قریش کے قرب کے باعث نبی ﷺ کی نگاہوں میں انصار کا مقام کم ہوگیا ہے۔

پھر آپ نے قریش کو دینے دلانے کی وضاحت فرمائی۔ آپ نے پوچھا 'کیا تم نے میرے اندر کوئی دنیاداری محسوس کی ہے۔ میں نے ایک قوم کی تالیف قلب چاہی کہ وہ ایمان لے آئیں اور تمہارا معاملہ تمہارے اسلام پر اعتماد کرتے ہوئے چھوڑ دیا۔ قریش کے بھائی بند قتل اور قید ہوتے رہے ہیں۔ میں ان کے نقصان کی قدرے تلافی کرنا چاہتا تھا۔ اے انصار! کیا تم اس سے راضی نہیں ہو کہ دوسرے لوگ تو بھیڑ بکریاں اور اونٹ لے کر رخصت ہوں اور تم اللہ کے رسولؐ کو اپنے گھروں میں لے جاؤ۔ اللہ کی قسم! تم جو کچھ لے جاؤ گے وہ اس سے کہیں اچھا ہے جو دوسرے لوگ لے کر جائیں گے'۔ اس پر انصار نے یک زبان ہو کر کہا، یارسول اللہ! ہم آپ کے فیصلہ پر راضی ہیں۔ اس پر آنحضرتؐ نے انصار کے ساتھ یک جہتی کے اظہار کے لیے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار میں سے ہوتا۔ اگر انصار ایک گھاٹی میں چلیں اور لوگ دوسری گھاٹی میں تو میں انصار کی گھاٹی ہی کو اختیار کروں گا۔ انصار میرا اصلی لباس ہیں اور دوسرے لوگ بیرونی پہناوا۔ اس کے بعد آپ نے دعا کی کہ پروردگار! رحم فرما انصار پر، انصار کے بیٹوں پر اور انصار کے پوتوں پر، انصار کے ساتھ محبت اور اپنائیت کے اس اظہار نے لوگوں کو اس قدر شرمندہ اور متاثر کیا کہ آنسوؤں سے ان کی ڈاڑھیاں تر ہو گئیں۔

جعرانہ سے مکہ جانے کے لیے نبی ﷺ نے عمرہ کی نیت سے احرام باندھا۔ مکہ پہنچ کر آپ نے عمرہ ادا کیا۔ علاقے کے امور ریاست چلانے کے لیے مکی قرشی نوجوان عتاب بن اسیدؓ کو عامل مقرر کیا اور معاذ بن جبلؓ کو ان کی رہنمائی کے لیے ساتھ چھوڑا۔ اس کے بعد آپ مدینہ روانہ ہو گئے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رؤسائے طائف میں سے عروہ بن مسعود ثقفی پہلے شخص تھے جو دوران سفر ہی حضورؐ سے آملے اور اسلام قبول کیا۔ مالک بن عوف کو اس کی توفیق بعد میں ملی۔ ان کے اسلام لانے پر نبی ﷺ نے انہی کو امیر علاقہ مقرر کیا۔

مکہ کی مہم کے مقاصد:

رسول اللہ ﷺ کی یہ مہم جس میں نہ صرف مکہ زیرنگیں آیا بلکہ طائف کی قوت بھی ختم ہو گئی اور پورے علاقہ میں مظاہر شرک کا خاتمہ کر کے اسلام کے نقوش ثبت کیے گئے، اللہ کے رسولؐ کی اس جدوجہد کا اصلی ہدف تھی جس کا آغاز آپ کی ہجرت اور پھر مدینہ کے دفاع کی جنگوں سے ہوا تھا۔ اس میں کامیابی کے بعد دوسرے اہداف ضمنی

تھے۔ مثلاً مختلف علاقوں اور قبائل میں دین کی تبلیغ اور دشمنوں کی گوشمالی۔ حضورؐ کی جدوجہد کو اس کے حقیقی پس منظر میں پیش کرنے کے بجائے مغربی محققین بالکل دوسرے تناظر میں پیش کرتے ہیں اور ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کے قارئین اس میں پیغمبرانہ اہداف کی جھلک دیکھنے کی بجائے اس کو ایک دنیادار لیڈر کی تگ و دو کے طور پر دیکھیں۔ دور حاضر کے مشہور محقق منٹگمری واٹ، جن کو ہمارے دانشور بڑا انصاف پسند قرار دیتے ہیں، فتح مکہ کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ محمدؐ کے پیروکم تھے۔ ان کو اپنے پیروؤں کو دشمنوں سے بچانے کی تدبیر یہ سوجھی کہ عربوں کو متحد کرنے کے بعد ان کا رخ عرب سے باہر کی جانب موڑ دیا جائے اور اس اسکیم میں مکہ کے لوگوں کے انتظامی تجربہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس منصوبہ پر عمل درآمد کے لیے انہوں نے اہل مکہ کو برانگیختہ کیا، ان کو گھبرایا، پھر ان سے صلح کر لی، پھر ان کو خوفزدہ کیا چنانچہ انہوں نے اسی خوفزدگی کے عالم میں ہتھیار ڈال دیے۔ خاص مکہ کو ہدف بنانے میں یہ مصلحت تھی کہ محمدؐ اس کو قبلہ قرار دے چکے تھے لہٰذا مسلمانوں کے لیے یہاں آمد و رفت کی آزادی ضروری تھی۔ اس کی فتح سے محمدؐ کی عزت میں بڑا اضافہ متوقع تھا۔ نیز مکہ کے لوگ بڑی فوجی و انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے اور محمدؐ کی ریاست کے رقبہ میں اضافہ کے بعد ضرورت تھی کہ یہ منتظم لوگ امور مملکت کو چلانے میں مدد دیں۔ فتح مکہ پر یہ تبصرہ جتنے بڑے شہرت یافتہ مورخ کے قلم سے ہے، اتنا ہی زیادہ غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ ایسی باتیں حقائق سے آنکھیں بند کر کے غلط مفروضے قائم کر کے ہی کہی جا سکتی ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا معاملہ یہ ہے کہ آپ نے چالیس برس تک کی عمر میں کوئی قوم پرستانہ یا مصلحانہ پروگرام پیش نہیں کیا حالانکہ نوجوانی کا زمانہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب آدمی کے اس طرح کے عزائم چھپے نہیں رہ سکتے۔ اس عمر میں وہ بڑے بڑے کام کر گزرتا ہے۔ چالیس برس کی عمر کو پہنچ کر بھی آنحضرتؐ جو پروگرام پیش کرتے ہیں اس میں عرب قوم کو اٹھانے اور اس کو رومیوں پر غالب کرنے کے مقاصد دور دور تک کہیں نظر نہیں آتے۔ اس پروگرام میں اللہ کی وحدانیت پر ایمان اور اس کے تقاضے نمایاں مقام پاتے ہیں۔ تیرہ سالہ مکی دور میں آنحضرتؐ انہی تقاضوں کو بیان کرتے نظر آتے ہیں اور قریش ان پر عمل درآمد کو اپنے اقتدار کے لیے زبردست خطرہ اور اپنی پرتعیش زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں۔ آنحضرتؐ پر ایمان لانا اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اگر واٹ کا قیاس درست ہے تو اس دور میں نبی ﷺ قریش کو یہ یقین دہانی کیوں نہیں کرتے کہ میں تو عرب قوم کو اقوام عالم پر غالب کرنے کی

جدوجہد کر رہا ہوں۔ تم میرا ساتھ دو۔ کی دور میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب قریش نے یہ پیشکش کر دی کہ اگر آپ کو تاج وتخت چاہیے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں۔ اگر آنحضرتؐ کے پیش نظر بیرونی دنیا کو زیر کرنے کا مقصد تھا تو آپ نے اس پیشکش سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا۔ ظاہر ہے کہ آپ توحید کی جو دعوت پیش کر رہے تھے اس کے سامنے کسی بھی اقتدار کو ہیچ سمجھتے تھے۔ آپؐ نے مکہ سے جلاوطنی قبول کر لی لیکن اپنی دعوت پر کوئی سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

اہل مکہ کو برانگیختہ کرنے، گھبرانے، پھر صلح کرنے اور بالآخر ان کو شکست دینے کی کہانی بھی واٹ کی خودساختہ ہے۔ وہ قریش اور اہل مکہ کو مظلوم اور مسلمانوں کو ظالم سمجھتے ہیں لہٰذا ان کے نزدیک تمام جنگیں گویا نبی ﷺ نے اہل مکہ پر مسلط کیں حالانکہ ہم نے اوپر دیکھا کہ غزوہ احزاب تک قریش نے یہود کے ساتھ ملی بھگت کر کے مسلمانوں کے استیصال کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس دوران میں مسلمان برابر اپنا دفاع کرتے رہے۔ غزوہ احزاب میں شکست کے بعد البتہ قریش کا وہ دم خم باقی نہ رہا جس کا مظاہرہ وہ پہلے کرتے آئے تھے۔ پھر بھی ان کا غرور کم نہیں ہوا۔ اس کا بھرپور مظاہرہ انہوں نے حدیبیہ میں کیا۔ صورت حال میں بنیادی تبدیلی صلح حدیبیہ نے کی۔ اس کے نتیجہ میں اسلام اس قدر تیزی سے عربوں میں پھیلا کہ قریش کو اب اپنی حیثیت عربوں سے منوانے میں دقت پیش آنے لگی اور وہ شکست خوردہ ہو کر آنحضرتؐ کے قدموں میں آ گرے۔

جہاں تک مکہ کو ہدف بنانے کا تعلق ہے، تو یہ اس لیے نہیں تھا کہ آنحضرتؐ قریش کے انتظامی تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے بلکہ یہ اس لیے تھا کہ قریش اور اہل مکہ آنحضرتؐ کی دعوت کے مخاطب اول تھے۔ ان پر اتمام حجت ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت رسولوں کے مخاطبین کے باب میں یہ ہے کہ اتمام حجت کے بعد وہ فیصلہ کی میزان میں ہوتے ہیں۔ وہ ایمان لاتے ہیں یا ان کا قلع قمع کر دیا جاتا ہے۔ مکہ کی مہم کے نتیجہ میں قریش نے ہتھیار ڈال دیے تو آنحضرتؐ نے ان کو انتظامی ذمہ داریاں نہیں سونپیں بلکہ ہم نے دیکھا کہ آپ نے حرم کعبہ میں اپنے پہلے خطبہ ہی میں قریش کے مختلف خاندانوں کی سابقہ ذمہ داریوں کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور حرم کا کنٹرول خود سنبھال لیا۔ مدینہ اگرچہ دارالحکومت تھا لیکن اس کی طرف ہجرت پر پابندی عائد کر دی۔ اگر پیش نظر قریش کی انتظامی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا ہوتا تو ان کو مدینہ آنے کی پیش کش کی جاتی یا حضورؐ اپنا دارالحکومت عرب کے مرکزی شہر مکہ

ہی میں منتقل کر لیتے۔ آنحضرتؐ کی حیات مبارکہ کے بقیہ دو سالوں میں مملکت کی مختلف ذمہ داریوں پر جن لوگوں کو تعینات کیا گیا ان کی مکمل فہرستیں تاریخ کی کتابوں میں دستیاب ہیں۔ ان کو دیکھ لیجئے۔ مہمات کے لیے برابر مہاجرین وانصار پر اعتماد کیا جاتا رہا۔ قریش کے نومسلموں میں سے تین چار سے زیادہ نام ایسے نہیں ملتے جن کو کوئی معمولی ذمہ داری سونپی گئی ہو۔ اگر پروفیسر واٹ کی رائے مبنی بر حقیقت ہوتی تو کیا گورنر اور کیا امرائے لشکر، ہر طرف قریشی سردار چھائے ہوئے دکھائی دیتے۔

جزیرہ نمائے عرب سے باہر نبی ﷺ نے اس وقت توجہ فرمائی جب حدیبیہ کی صلح ہوئی۔ آپؐ نے مختلف حکمرانوں کو اپنے گرامی نامے بھیجے۔ ان میں بھی جو مضمون مشترک ہے وہ رسالت کی ذمہ داری کے حوالہ سے اسلام قبول کرنے کی دعوت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن حکمرانوں نے اسلام قبول کرلیا آنحضرتؐ نے ان پر قریش کو مسلط نہیں کیا بلکہ زمام اقتدار انہی کے پاس رہنے دی۔

جب کسی بھی اعتبار سے پروفیسر واٹ کا تھیسس ثابت نہیں ہوتا تو ہم یہ نتیجہ نکالنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ انہوں نے تعصب کی عینک چڑھا رکھی ہے اور ہر معاملہ کو اسی عینک سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ آخر انہیں یہ بھی تو سمجھنا چاہیے کہ ان کے بعض قارئین معاملات کو ان کی عینک سے نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہیں گے۔

باب 42

غزوہ تبوک

اوپر بیان ہو چکا ہے عرب کے شمالی علاقے، جو موجودہ شام و اردن سے متصل تھے، رومی حکومت کے وفادار تھے۔ وہاں کے عرب قبائل کے سرداروں کی وفاداریاں بھی شاہ روم کے ساتھ تھیں۔ ان علاقوں میں اسلام کا اثر و نفوذ اور بعض سرداروں کا قبول اسلام ایسی چیز نہ تھی جس کو اس زمانہ کی سب سے طاقتور حکومت نظر انداز کر سکتی۔ ہرقل کو اس بات کا یقین تھا کہ اگر عرب میں ابھرنے والے یہ رسول وہی ہیں جن کی خبر سابق آسمانی صحیفوں میں دی گئی ہے تو ان کی فتح مندی نوشتہ تقدیر ہے اور وہ میری حکومت کو بھی روند ڈالیں گے۔ تاہم اپنے درباریوں اور عیسائی مذہبی رہنماؤں کے دباؤ کے باعث وہ دین اسلام کو قبول کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا اور سیاسی مخالفت کی راہ اپنائی۔ شمالی عرب میں مسلمانوں کی کامیابیوں کی راہ روکنے اور ان کو مرعوب کرنے کے لیے اس نے ۹ھ میں بڑی تعداد میں افواج شام میں جمع کرنی شروع کر دیں۔ وہ مدینہ کی جانب پیش قدمی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے وفادار قبائل لخم، جذام، غسان اور عاملہ کو ساتھ ملایا اور ہراول دستے بلقاء کو روانہ کر دیئے۔ اس کے عزائم کی اطلاع نبی ﷺ کو مل گئی۔ آپ نے مقابلہ کے لیے شمالی عرب تبوک کی سرزمین کا انتخاب کیا۔ چونکہ یہ علاقہ مدینہ سے بہت دور اور موسم سخت گرم تھا اس لیے غیر معمولی جنگی تیاریاں درکار تھیں۔ لہٰذا آپ نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے اپنے مقدور کے مطابق سب کچھ پیش کر دیں۔ مالی اعانت کریں، اسلحہ فراہم کریں، سواریاں مہیا کریں اور پوری تیاری کے ساتھ اس جنگ کے لیے نکلیں۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ مسلمان اس کو ایک سادہ مہم کے طور پر نہ لیں بلکہ اسلام اور مخالف اسلام قوتوں کے درمیان ایک معرکہ کے طور پر لیں۔

جنگ کی تیاری:

آنحضرت ﷺ کی اپیل کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ مخلص مسلمانوں نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر جہاد کے لیے خرچ کیا۔ اسی مہم کے سلسلہ میں روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے گھر کی ہر چیز جہاد پر نچھاور کر دی

اور جب نبی ﷺ نے پوچھا کہ ابوبکر! گھر میں کیا چھوڑا تو ان کا جواب یہ تھا کہ گھر میں اللہ اور اس کا رسول ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کا عزم تھا کہ وہ اس مرتبہ انفاق فی سبیل اللہ میں حضرت ابوبکرؓ پر سبقت لے جائیں گے۔ وہ گھر کا نصف مال پیش کرنے آئے۔ جب سنا کہ حضرت ابوبکرؓ نے گھر کا تمام مال و اسباب راہ خدا میں دے دیا ہے تو انہیں احساس ہوا کہ وہ ابوبکرؓ پر سبقت نہیں لے سکتے۔ حضرت عثمانؓ نے، جن کی دریا دلی ایسے مواقع پر زیادہ جوش و جذبہ سے ظاہر ہوتی تھی، ایک تہائی لشکر کے لیے سرو سامان مہیا کیا۔ عورتوں نے جنگ کی تیاری کے لیے اپنے زیورات پیش کر دیے۔ غریب سے غریب صحابہ، جو بمشکل اپنے لیے شام کی روٹی کماتے تھے، اس موقع پر پیچھے نہ رہے اور ذرا سے کھجور، جو اور ستو ہی انہوں نے زادراہ کے لیے پیش کر دیے۔ جن لوگوں کے پاس سواریاں نہ تھیں وہ جہاد کے جذبہ سے سرشار آنحضرت ﷺ کے پاس یہ درخواستیں لے کر آئے کہ آپ ان کے لیے سواری کا بندوبست کر دیں۔ چونکہ ممکنہ وسائل میں اس کی گنجائش نہ تھی اس لیے جب حضورؐ معذرت کرتے تو یہ لوگ نہایت آزردہ خاطر وہاں سے لوٹتے۔ ان لوگوں کی حالت زار دیکھ کر بعض خوش حال صحابہ نے اپنے طور پر ان کے لیے سواریوں کا بندوبست کر دیا لیکن اس کے باوجود بعض لوگ سفر پر روانہ ہونے سے محروم رہ گئے۔

روایات میں آیا ہے کہ اشعریوں نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو رسول اللہؐ کے پاس بھیجا کہ ان کے لیے سواریاں مہیا فرمائیں۔ وہ حضور کے پاس ایسے وقت پہنچے جب آپ کسی معاملہ میں بہت خفگی کا اظہار فرما رہے تھے۔ ابوموسیٰ کی بات پر آپ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم، میں تمہیں کوئی سواری مہیا نہیں کر سکتا۔ ابوموسیٰ حضورؐ کی ناراضی کے اندیشہ سے نہایت رنجیدہ اپنے لوگوں کے پاس آئے اور صورت حال سے ان کو آگاہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کو بلالؓ نے آواز دی۔ وہ گئے تو حضورؐ نے اونٹوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا 'یہ جوڑی لے لو، اور یہ جوڑی، اور وہ جوڑی'۔ ان کو اپنے ساتھیوں کے پاس لے جاؤ اور بتاؤ کہ اللہ نے تمہاری سواری کا انتظام کر دیا ہے۔ ابوموسیٰ نے حکم کی تعمیل کی اور ساتھیوں کو بتایا کہ رسول اللہؐ تم لوگوں کو ان اونٹوں پر سوار ہونے کا حکم دے رہے ہیں۔ لیکن اللہ کی قسم، میں چاہوں گا کہ تم میں سے جس کسی نے رسول اللہؐ کی پہلی بات سنی تھی وہ میرے ساتھ چلے تاکہ تمہیں یہ گمان نہ ہو کہ میں نے حضورؐ کی طرف سے کوئی بات خلاف حقیقت منسوب کر دی ہے۔ یہ لوگ گئے اور رسول اللہؐ کو یاد دلایا کہ آپ نے قسم کھا کر سواری مہیا کرنے سے انکار فرما دیا تھا، پھر اونٹ دیتے وقت آپ اپنی قسم کو بھول نہ گئے ہوں۔ آپ نے فرمایا میں جب قسم کھا لیتا ہوں، پھر اس کے بعد کوئی بہتر صورت پیدا ہو جاتی ہے تو قسم کا کفارہ ادا کر دیتا اور اس بہتر صورت کو اختیار کر لیتا ہوں[1]۔

جنگ پر نکلنے کا حکم ہر مسلمان کے لیے یہ تھا کہ انفروا خفافا و ثقالا (جنگ کے لیے نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بھاری) ہلکے اور بھاری کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا اطلاق امیر و غریب، مسلح و غیر مسلح اور سوار و پیادہ ہر شخص پر تھا۔ اس جنگ کے لیے دوسرے قبائل اور اعراب کو بھی متحرک کیا گیا تھا۔ لہذا اصل مطالبہ یہ تھا کہ ہر شخص اس نفیر عام میں اپنی خدمات پیش کردے اور اس کی پروا نہ کرے کہ اس کے پاس زاد و راحلہ ہے یا نہیں۔ اپنے آپ کو پیش کر دینا اس کے اظہار وفاداری کے لیے کافی تھا۔ لیکن غزوہ کا زمانہ بہت سے لوگوں کے لیے فتنہ بن گیا۔ یہ موسم شدید گرمی کا تھا اور فصلیں تیار تھیں۔ ان کو سمیٹنے اور ذخیرہ کرنے یا ٹھکانے لگانے کا یہ بہترین وقت تھا۔ لوگ گرمی کا مقابلہ کر لیتے اور فصلوں کو سمیٹنے کا معاملہ بھی موخر کر لیتے، اگر مہم کسی قریبی علاقہ میں ہوتی۔ لیکن یہاں تو سینکڑوں میل کی مسافت درپیش تھی۔ دوسرے خطرات کے علاوہ محض جانے کے لیے ہفتوں کا وقت درکار تھا۔ لہٰذا بہت سے مسلمانوں کی ایمانی کمزوری اور منافقین کی منافقت اس موقع پر ظاہر ہوگئی۔

ایک طبقہ تو ایسا سامنے آیا جس نے برملا یہ مشورہ دیا کہ شدت کی اس گرمی میں جنگ کے لیے نکلنا دانشمندی نہ ہوگی، لہٰذا مہم کو موخر کر دیا جائے۔ اگر اس وقت نکلنے پر اصرار کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ بہت سے مسلمان گرمی کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو جائیں گے۔ بعض لوگوں نے رومی فوج کا خوف دلا کر لوگوں کے جذبہ جہاد کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔ منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی تو یہ تک کہہ گزرا کہ اس موسم اور حالات کی تنگی میں جنگ کے لیے نکلنا اور رومیوں سے لڑنا کوئی کھیل نہیں۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ جو لوگ تبوک جائیں گے وہ زنجیروں میں جکڑ کر پہاڑوں میں ڈال دیے جائیں گے۔ اس گروہ کے لوگ مخلص مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کرتے رہے۔ لوگ جب جہاد کے لیے اپنی اعانت پیش کرتے تو اگر دینے والا زیادہ مال پیش کرتا تو یہ اس پر ریاکاری کا الزام لگاتے۔ اگر وہ کوئی غریب آدمی ہوتا تو یہ اس کے معمولی انفاق پر پھبتیاں کستے کہ اسے دیکھو یہ حاتم کی گور پر لات مارنے آیا ہے۔ بسا اوقات یہ سلسلہ اس قدر بڑھتی کہ خود اللہ اور رسول کے احکام پر یہ لوگ پھبتیاں کسنے لگتے۔ جب اس پر گرفت کی جاتی تو کہہ دیتے کہ یہ کوئی سنجیدہ بات نہیں تھی۔ ہم تو صرف آپس میں دل لگی کی باتیں کر رہے تھے۔

اس موقع پر یہ بات دیکھنے میں آئی کہ بکثرت لوگ مختلف حیلوں بہانوں سے جنگ میں شرکت سے مستثنیٰ کیے جانے کی درخواستیں پیش کرنے لگے۔ وہ قسمیں کھا کھا کر اپنی مجبوریاں بیان کرتے۔ نبی ﷺ کو معلوم ہوتا کہ یہ سب بناوٹی باتیں ہیں لیکن آپ ان کو قبول فرما لیتے۔ ان لوگوں میں بکثرت وہ تھے جن کی منافقت پہلے بھی ظاہر ہو چکی تھی۔ اس لیے ان کا رویہ قابل فہم تھا کہ وہ ایک پر مشقت سفر جہاد میں حصہ لینے کے لیے تیار نہیں اور چاہتے ہیں

کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے اجازت مل جانے کے بعد ان پر کوئی الزام بھی نہ لگایا جا سکے۔ اس میں سے بعض نے اپنی غیر حاضری کو دینداری کا تقاضا قرار دینے کی کوشش بھی کی۔ انہوں نے اپنے اہل سے طویل غیر حاضری کو اپنے ایمان و اخلاق کے لیے فتنہ کا باعث بتایا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو صحت مند اور مال دار تھے اس لیے جہاد میں شمولیت کی استطاعت رکھتے تھے۔ ان کے سفر میں جو چیز رکاوٹ بنی وہ یہ تھی کہ مسافت بے حد زیادہ اور موسم شدید گرم تھا اور مقابلہ رومی فوج سے متوقع تھا جو اپنے زمانے کی سب سے زیادہ منظم اور تربیت یافتہ فوج تھی۔ اور جس نے تھوڑا عرصہ قبل فارس کی نہایت مضبوط فوج کو شکست دی تھی۔ نیز اس جنگ کے نتیجہ میں مال غنیمت حاصل ہونے کی توقع بھی زیادہ نہ تھی۔ اس صورت حال میں کون اپنے عیش و آرام کو مکدر کرتا۔ لہٰذا منافقین بالعموم عذر پیش کرنے کے لیے نبی ﷺ کے ہاں جاتے اور جنگ سے رخصت کی اجازت لیتے رہے۔ البتہ انہوں نے یہ اہتمام کیا کہ دوران سفر کے حالات کی رپورٹیں لینے کے لیے سن گن کی خاطر اپنے آدمی ساتھ کر دیے۔

غزوہ تبوک کے سلسلہ میں جو روایات نقل ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدینہ کے اہل کتاب، جنہوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں زک اٹھائی اور جلاوطنی پر مجبور ہوئے تھے، رومیوں کو لڑائی پر آمادہ کرنے کا سبب بنے تھے۔ ان کے تعلقات وہاں کے مذہبی اکابر کے ساتھ تھے۔ انہوں نے مذہب کے بچاؤ میں انہیں اپنا کردار ادا کرنے پر ابھارا۔ چونکہ یہ مذہبی رہنما شاہ روم کے ہاں خاصا اثر و رسوخ رکھتے تھے اس لیے انہوں نے بادشاہ کو قائل کر لیا کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کی نصرت کے لیے اٹھے۔ مذکورہ اہل کتاب نے مدینہ کے منافقین کے ساتھ رابطوں اور اطلاعات کے تبادلہ کے لیے یہ سازش تیار کی کہ مدینہ کے مضافات میں ایک مسجد تعمیر کروائی جس کا مقصد منافقین کو ایک مرکز پر جمع کرنا اور ان کے ساتھ سازشوں کو مربوط کرنا تھا۔ پھر یہ مسجد مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کا موجب ہوتی اور کفار کے نمائندوں اور جاسوسوں کے لیے ایک مسکن کا کام دیتی۔ ان مصالح کے پیش نظر منافقین نے مسلمانوں کے دشمنوں کے اشارہ پر قبا کی بستی میں یہ مسجد تعمیر کی۔ انہوں نے اس دام ہم رنگ زمین کا وجود باقاعدہ تسلیم کرانے کے لیے نبی ﷺ سے درخواست کی کہ وہ اس میں تشریف لائیں اور نماز پڑھا کر اس کا افتتاح کر دیں۔ چونکہ اس وقت جنگ کی تیاریوں کی ہماہمی تھی اس لیے نبی ﷺ نے شدید مصروفیت کے باعث معذرت کر دی اور اس معاملہ کو تبوک سے واپسی تک مؤخر کر دیا۔

چونکہ جنگ میں شرکت ہر صحیح و سالم مسلمان مرد کے لیے ضروری قرار دی گئی تھی اس لیے اس سے پیچھے رہ جانا کسی کے لیے روا نہ تھا۔ تاہم بعض مخلص مسلمان بروقت لشکر کے ہمراہ نکل نہ سکے۔ ان کا خیال تھا کہ بعد میں لشکر کو

جا لیں گے لیکن بعد میں سستی کے سبب سے یا دوسرے کاموں میں الجھ کر وہ آمادہ سفر نہ ہو سکے۔ بعض مسلمان چند منزل بعد لشکر سے جا ملے لیکن باقی اس سے محروم رہے اور یوں ظاہری طور پر جنگ سے کترا کر گھر میں بیٹھ رہنے والوں کی طرح ہو گئے۔ ان میں تین قدیم الاسلام انصاری کعبؓ بن مالک، ہلال بن امیہؓ اور مرارہؓ بن ربیع بھی تھے جنہوں نے دین کے لیے ماضی میں بڑی قربانیاں دی تھیں لیکن اس موقع پر وہ بلا عذر محض سستی کے سبب سے بروقت لشکر میں شامل نہ ہو سکے لیکن اپنی عظیم قربانیوں کے پیش نظر انہیں اپنی کوتاہی کا کچھ زیادہ احساس بھی نہ ہوا۔

نبیؐ تبوک میں:

مدینہ سے روانگی کے وقت عبداللہ بن ابی نے وہی حرکت کی جو اس سے قبل جنگ احد میں کر چکا تھا، یعنی وہ اپنا لشکر ساتھ لے کر باہر نکلا لیکن جب حضورؐ نے کوچ کا حکم دیا تو وہ لشکر سمیت یہ کہہ کر پیچھے ہٹ گیا کہ وہ اپنے لوگوں کو اس خطرے میں نہیں جھونکنا چاہتا۔ روایات کے مطابق جو لشکر تبوک پہنچا اس میں تیس ہزار سپاہی اور دس ہزار گھوڑے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے شام کی سرحد پر تین ہفتے انتظار کیا کہ رومی فوج مقابلہ پر آئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رومی سرحد پر آنحضرتؐ کی، جنگ موتہ کے مقابلہ میں دس گنا زیادہ سپاہ کے ساتھ، دلیرانہ آمد نے رومیوں کے حوصلے پست کر دیے اور انہوں نے مقابلہ پر نہ آنے ہی میں مصلحت سمجھی۔ ہوسکتا ہے کہ ہرقل کے دل میں یہ جو خیال جاگزیں ہو چکا تھا کہ رسول عربی بالآخر اس کا تخت شاہی چھین لیں گے اسی نے اس کو بے حوصلہ کر دیا ہو اور اس نے اقتدار کو مزید طول دینے کے لیے رسول اللہؐ کے مقابلہ پر فوج بھیجنے کا خطرہ مول نہ لیا ہو۔ بہرحال نبی ﷺ نے تبوک میں تین ہفتے قیام فرمایا اور اس دوران میں علاقہ میں کئی اہم سیاسی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد لشکر کی واپسی کا اعلان کیا۔ یہ واپسی رمضان ۹ ھ میں ہوئی۔

فتوحات اور صلح نامے:

تبوک کے قیام کے دوران حضورؐ نے خالد بن ولیدؓ کو دومۃ الجندل پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ وہاں کے عیسائی حکمران اکیدر نے ہتھیار ڈال دیئے اور امان کا طالب ہوا۔ خالدؓ اسے گرفتار کر کے نبی ﷺ کے پاس لے گئے تو آپ نے جزیہ عائد کر کے اس سے صلح کا معاہدہ کر لیا اور اسے امان کی تحریر لکھ دی۔ دومۃ الجندل کی اہمیت یہ تھی کہ یہ مقام شام اور عراق دونوں کے راستوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ شمالی عرب کے دوسرے حکمران جو بازنطینی ریاست کے باجگزار تھے علاقہ میں مسلمانوں کی موجودگی سے سخت خوفزدہ ہو گئے۔ انہوں نے اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھتے

ہوئے مسلمانوں سے صلح کو ترجیح دی اور بازنطینی حکومت کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ شاہ ایلہ، یحنہ بن روبہ، جرباء اور اذرح کے علاقوں سے ایک وفد لے کر خود حاضر خدمت ہو گیا۔ نبی ﷺ نے اس پر جزیہ عائد کیا اور صلح نامہ لکھ دیا۔ ابوعبید کی روایت کے مطابق نبی ﷺ نے تبوک سے قیصر روم کو ایک اور مکتوب بھجوایا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی اور بتایا کہ اگر تم اسلام قبول کر لو تو جو مراعات دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہیں وہ تمہیں بھی حاصل ہوں گی اور جو واجبات ان پر شرعی طور پر عائد ہوتے ہیں وہی تم پر بھی عائد ہوں گے۔ اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو پھر جزیہ کی ادائیگی پر صلح کر لو۔ بصورت دیگر اپنے عوام اور اسلام کے درمیان حائل ہونے کی کوشش نہ کرو۔ انہیں اس بات کا اختیار ہو کہ وہ اسلام میں داخل ہونا چاہیں تو داخل ہو سکیں ورنہ جزیہ پر معاملہ کر لیں۔ ظاہر ہے اس وقت کی یہ عظیم سلطنت عربوں کی قیادت قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اس مکتوب نبوی کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔ اگر کوئی جواب آتا تو تواریخ میں اس کا تذکرہ موجود ہوتا۔

تبوک کی اس مہم نے شمالی عرب کی ریاستوں اور ان سے باہر روی علاقے پر مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی۔ چنانچہ شام کے متعدد قبائل اور عراق کی سرحد کے قریب آباد بنو بکر بن وائل اور بنو تغلب نے جلد اسلام کے ساتھ زکوٰۃ سے دوگنا جزیہ پر صلح کا معاہدہ کر لیا۔

منافقین کے ساتھ سخت رویہ:

تبوک کے سفر کے دوران نبی ﷺ کو منافقین کے ساتھ معاملہ میں نرمی کی روش چھوڑنے اور سخت گیری سے کام لینے کا حکم دیا گیا۔ آپ کو بتایا گیا کہ اس مہم نے مخلص مسلمانوں اور مسلمانوں کے ساتھ اپنے مفادات کی خاطر چمٹے ہوئے لوگوں کے درمیان فرق کو نہایت واضح کر دیا ہے اور اب معاملہ اسی بنیاد پر آگے بڑھے گا۔ انہی ہدایات کی روشنی میں آپ نے واپسی کے سفر میں مدینہ کے قریب پہنچ کر صحابہ کو حکم دیا کہ جب تک میں اجازت نہ دوں، نہ کسی منافق سے بات کی جائے اور نہ ان کی مجلس میں شریک ہوا جائے۔ چنانچہ مدینہ کے قریب ذی اوان کے مقام پر جب منافقین استقبال کو آئے تو لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر آپ نے عاصم بن عدی العجلانی اور مالک بن الدخشم السالمی کو منافقین کی تعمیر کردہ مسجد کو ڈھا دینے اور ملبہ کو آگ لگا دینے کی ذمہ داری سونپی تاکہ سازشیوں کا یہ اڈا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ اس طرح دشمنان اسلام کا یہ مورچہ زمین بوس ہو گیا۔ اسی طرح مخلص مسلمانوں میں سے پیچھے رہ جانے والوں سے حضورؐ نے نہایت سرد مہری کا معاملہ کیا جس کی ندامت کے باعث ان کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ ان میں سے بعض نے اظہار ندامت اور طلب عفو کے لیے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا اور

عزم کیا کہ معافی ملنے پر ہی وہ خود کو آزاد کریں گے۔ تین قدیم الاسلام صحابہ کعب بن مالکؓ، ہلال بن امیہؓ اور مرارہ بن ربیعؓ جن کا معاملہ معرض التوا میں تھا، کا معاشرتی مقاطعہ کیا گیا اور جب تک ان کے دلوں میں سوز و گداز نہیں پیدا ہوا انہیں معافی نہ ملی۔ اس موقع پر توبہ واستغفار کے متمنی صحابہ نے اپنی توبہ کی قبولیت کے لیے غیر معمولی قربانی پیش کرنے کی نظیر بھی قائم کی۔ ایک صحابی ابولبابہؓ کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ میں اس گھر کو اللہ کی راہ میں چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہوں جس کے آرام و آسائش نے مجھے جہاد میں نکلنے سے روکا۔ نیز اپنا تمام مال اللہ اور رسول کے حوالہ کرتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا، نہیں صرف اپنا ایک تہائی مال اللہ کی راہ میں پیش کرو اور اپنی کوتاہی پر توبہ کرو۔

مدینہ کے گردونواح کے دیہاتیوں میں سے بعض نے کسی عذر معذرت کی ضرورت ہی نہ سمجھی لیکن دوسرے بہانہ سازی کرتے اور اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ منافقین میں سے جو لوگ صفائی پیش کرنے آئے انہیں بتایا گیا کہ ہمیں تمہاری باتوں کا یقین نہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے پہلے سے آگاہ کر دیا ہے کہ تمہارے عذر لایعنی ہیں۔ وہ قسمیں کھا کر یقین دلاتے لیکن ان سے کہا گیا کہ آئندہ تمہاری روش نگاہ میں رکھی جائے گی اور تمہاری وفاداری کا ثبوت تمہارا عمل مہیا کرے گا۔ ایسے لوگوں کو، جن کا نفاق بالکل واضح تھا، کسی رعایت کا مستحق نہیں گردانا گیا۔ ان کے متعلق یہ ہدایت تھی کہ مدینہ واپسی پر آئندہ کسی مہم میں وہ ساتھ دینے کی پیشکش بھی کریں تو ان کو اس کی اجازت نہ دی جائے۔ ان پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ تبوک کی مہم کے لیے نفیر عام کے دوران جب تم گھروں میں بیٹھ رہنے پر قانع رہے تو اب تم ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے۔ اب ہمیں اپنے کسی دشمن کے خلاف جنگ میں تمہاری شرکت گوارا نہیں۔ وہ لاکھ صفائیاں پیش کریں گے اور قائل کرنے کے لیے قسمیں کھائیں گے لیکن انہیں بتانا کہ اللہ تمہاری کرتوتوں سے اچھی طرح واقف ہے اور اس نے ہمیں بھی ان سے آگاہ کر دیا ہے، لہٰذا ہم تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کر سکتے۔ اب تمہارا رویہ خود ہی اللہ کے حضور ناطق ہوگا۔

غزوہ تبوک کے اثرات:

فی الجملہ بدطینت منافقین کی غزوہ تبوک میں عدم شرکت کا نقد فائدہ مسلمانوں کو یہ ہوا کہ اس سفر کے دوران اس طرح کا کوئی فتنہ نہ اٹھایا جا سکا جو پہلے کئی مہموں کے دوران اٹھایا گیا تھا اور جس کے باعث مہاجرین اور انصار کے درمیان تلواریں سونت لینے کی نوبت آ گئی تھی۔ منافقین کے کچھ جاسوس تو ضرور لشکر کے ساتھ تھے لیکن اپنی باقی جمعیت کے بغیر وہ کوئی فتنہ برپا کر کے اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ سامنے آیا

کہ ہر طرح کے منافقین بالکل بے نقاب ہو گئے۔ ان کے لیے آئندہ کی پالیسی اتنی سخت کر دی گئی کہ ان کے لیے منہ چھپانا بھی ممکن نہ رہا، چہ جائیکہ وہ پہلے کی طرح دوغلی پالیسی پر گامزن رہتے اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتے رہتے۔ غزوہ تبوک کا تیسرا بڑا فائدہ اس صورت میں سامنے آیا کہ نادان لیکن مخلص مسلمانوں کے کردار کی کمزوریاں بھی سامنے آ گئیں اور ان کا تدارک ممکن ہوا۔ اس موقع پر بے لاگ محاسبہ کے عمل نے قدیم الاسلام مسلمانوں کی آنکھیں بھی کھول دیں۔ انہوں نے اپنی کمزوریوں کا جائزہ لیا اور اپنی اصلاح کی۔ اسی طرح بدو مسلمانوں کو احساس ہوا کہ انہوں نے دین سیکھنے کے لیے خاطر خواہ اہتمام نہیں کیا اور محض مسلمانوں میں نام لکھوا کر یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے اپنا دینی حق ادا کر دیا، حالانکہ دین کے اعلیٰ تقاضے اور تھے اور ان کو پورا کیے بغیر وہ دین کی کوئی خدمت کرنے پر قادر نہ تھے۔ غزوہ تبوک کے یہ فوائد تو داخلی محاذ پر تھے، خارجی محاذ پر اسلام کی دعوت شمالی عرب میں دور دور تک پھیل گئی۔ وہاں کے عرب قبائل اسلام کی طرف راغب ہوئے، رومیوں کے ہاتھوں دبائے ہوئے عوام کو ایک متبادل سیاسی قوت نظر آنے لگی، جو آئندہ کسی بھی وقت رومیوں کے اقتدار کو چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی، اور یہ عوام رومیوں کے جبر واستبداد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ان سے توقع وابستہ کر سکتے تھے۔

غزوہ تبوک کے لیے لشکر اسلام کی روانگی یکم رجب ۹ھ کو ہوئی۔ یہ اپریل کا مہینہ تھا۔ واپسی آخر شوال میں ہوئی۔

حوالہ جات

۱ صحیح مسلم۔ باب ندب من حلف یمینا فرانی غیرہا خیرا منہا

باب 43

حج ۹ھ اور عام الوفود

فتح مکہ کے فوراً بعد ۸ھ کا موسم حج تھا لیکن خود رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ بعض قبائل کی مخالفت کو کچلنے میں مصروف تھے۔ اسی میں حج کے ایام گزر گئے اور یہ حج مشرکین کے اندر پہلے سے رائج طریقہ پر منعقد ہوا۔ ۹ھ میں حالات نسبتاً پرسکون تھے اس لیے نبی ﷺ نے اس حج کو اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ آپ نے تین سو صحابہ کی معیت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیر حج بنا کر رخصت کیا اور ان کے جانے کے بعد اپنے خصوصی ایلچی کے طور پر حضرت علیؓ کو بھیجا۔ عرب قبائل میں سے جو مشرکین حج کے لیے آئے تھے وہ اپنے قدیم طریقہ پر حج کر رہے تھے اور مسلمان اس طریقہ پر جس کی تعلیم قرآن نے دی تھی۔ مکہ فتح ہو جانے کے بعد چونکہ اب اسلام ایک غالب قوت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے عرفات میں خطبہ دیا اور اس میں یہ اعلان کیا کہ آئندہ کوئی مشرک حج نہ کر سکے گا اور نہ برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا جائے گا۔ مشرکین کے لیے آئندہ حدود حرم میں داخلہ بند ہو گا۔ قریش عرفات کی حاضری سے اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتے اور مزدلفہ میں قیام کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عمل سے اس بدعت کا خاتمہ کیا۔

خطبہ کے بعد حضرت علیؓ نے رسول اللہؐ کے خصوصی ایلچی کی حیثیت سے حجاج سے خطاب کیا۔ انہوں نے سورہ توبہ کی ابتدائی آیات سنائیں جن میں مشرکین سے اللہ اور اس کے رسول نے اعلان براءت کیا ہے اور ان کو خبردار کیا ہے کہ حج کے بعد چار مہینے کی مہلت ان کو دی جا رہی ہے۔ اس میں ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں یکسو ہو جائیں، اسلام قبول کریں اور اس کا عملی مظاہرہ نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت میں کریں۔ اس طرح وہ تمام مسلمانوں کے دینی بھائی بن جائیں گے اور ان کے جان و مال محفوظ ہو جائیں گے۔ اس عرصہ کے دوران میں اگر وہ اسلام دشمنی سے باز نہیں آتے اور رسول اللہؐ کی تکذیب پر اڑے رہتے ہیں تو

اسلامی حکومت تکذیب رسول کے جرم میں ان کو گرفتار کرے گی اور ان سے جنگ کرے گی تا آنکہ وہ مطیع ہو جائیں۔ حضرت علیؓ نے مشرک قبائل پر یہ بات واضح کی کہ اب ان سے کوئی نرمی نہیں برتی جائے گی۔ اس لیے اگر وہ جان کی امان چاہتے ہیں تو چار ماہ کی مہلت سے فائدہ اٹھائیں۔ اسی پیام کی منادی صحابہ کرامؓ کے وفد نے منیٰ کے قیام کے دنوں میں خیموں میں جا جا کر کی تا کہ اگر کسی شخص نے قیام عرفات کے دوران میں یہ پیغام نہ سنا ہو تو اب وہ اس کو سن لے اور اپنے جاننے والوں کو بھی اس سے آگاہ کر دے۔

حضرت علیؓ کے پاس جو پیغام تھا اس میں یہ بات بھی تھی کہ مشرکین کے ساتھ اب مسلمان کوئی معاہدہ نہیں کریں گے اور بقائے باہمی کا کوئی وعدہ کار آمد نہ ہوگا۔ اسی طرح دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے بھی اسلام لانا ضروری ہوگا۔ البتہ اگر وہ اسلامی حکومت کی ماتحتی قبول کر لیں گے اور سالانہ زر فدیہ جزیہ کے طور پر ادا کرتے رہیں گے تو اپنے دین پر قائم رہ سکیں گے اور ان کے جان و مال کو تحفظ دیا جائے گا۔

۹ھ کے حج میں مسلمانوں کے بعض اہم افراد اور چند سو صحابہ کی شمولیت کے باوجود مشرکین کی گرفت مناسک حج پر مضبوط رہی۔ انہوں نے قدیم طریقہ اپنایا۔ مناسک کی تکمیل کے بعد بنو کنانہ کی ذیلی شاخ بنو فقیم کے قلمس نے، جس کا کام نسی کے نظام کو چلانا ہوتا تھا، سابقہ کروفر کا مظاہرہ کرتے ہوئے حجر میں کھڑے ہو کر آخری اعلان نسی کیا اور آنے والے ماہ محرم کے بعد کا مہینہ کبیسہ کا مہینہ قرار دیا۔

قبائل کے وفود کی مدینہ آمد:

فتح مکہ کے بعد اور بالخصوص ۹ھ کے حج کے بعد عرب کے کسی قبیلہ کو اشتباہ نہیں رہا کہ پورے ملک میں اب واحد قوت اسلام کی ہے اور اب جو قبیلہ اسلام قبول نہیں کرے گا تو اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کی خبر ایک عرصہ سے رسول اللہؐ دیتے رہے ہیں، یعنی یہ کہ مشرکین کے لیے اسلام قبول کرنا ضروری ہے ورنہ وہ جنگ کے لیے تیار رہیں۔ اب ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جائے گی۔ اسی طرح اہل کتاب کو اسلام کی دعوت دی جائے گی۔ اگر وہ انکار کرتے ہیں تو ان سے کہا جائے گا کہ وہ اسلامی حکومت کی اطاعت کر لیں اور جزیہ ادا کرنا شروع کر دیں۔ اگر یہ شکل ان کو گوارا نہ ہو تو پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ اہل عرب نے فی الفور اپنے بارے میں فیصلہ کر لیا اور جوق در جوق مدینہ پہنچنے لگے۔ اس سے وہی صورت حال پیدا ہوگئی جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا تھا کہ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (اور تم دیکھو گے کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہو رہے ہیں) اسی لیے سال ۹ھ کو عام الوفود یعنی وفود کی آمد کا سال کہا جاتا ہے۔ یوں تو اس سال اتنے وفود مدینہ پہنچے کہ ان کا شمار ممکن نہیں لیکن ہم چند اہم وفود کا تذکرہ کریں گے۔

۱۔ ثقیف:

فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے جعرانہ کے مقام پر مکہ کے جنوب مشرق میں بسنے والے قبائل سے حاصل ہونے والا مال غنیمت تقسیم کیا اور وہاں سے مکہ اور پھر مدینہ کو لوٹ گئے۔ طائف کے قبیلہ ثقیف نے اسلام قبول نہ کیا لیکن ان کے ایک سردار عروہ بن مسعودؓ ذاتی طور پر مسلمان ہو گئے اور قبیلہ کو اسلام کی دعوت دینے لگے۔ اس سے برہم ہو کر اہل قبیلہ نے ان کو قتل کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد ثقیف کو احساس ہوا کہ سارا عرب تو اب مسلمان ہو رہا ہے، ہم کس کس سے دشمنی رکھیں گے۔ انہوں نے اپنے سردار عبد یا لیل بن عمرو کو رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا۔ اس نے کہا 'یہ کام تنہا میرے کرنے کا نہیں'۔ چنانچہ بنو مالک کے تین اور حلیف قبائل کے دو آدمی اس کے ہمراہ بھیجے گئے۔ انہوں نے خالد بن سعید بن العاصؓ کو رسول اللہؐ تک رسائی کا ذریعہ بنایا۔ ان لوگوں نے اسلام قبول کرنے کے لیے یہ شرائط پیش کیں کہ تین سال تک ان کا بت لات منہدم نہ کیا جائے، نماز معاف کی جائے، اور شراب، جوا، بدکاری وغیرہ کے معاملہ میں فی الحال انہیں رخصت دی جائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ لات کو منہدم کرنے کا کام تم سے نہیں کروایا جائے گا بلکہ ابوسفیانؓ اور مغیرہ بن شعبہؓ یہ خدمت سرانجام دیں گے۔ نماز میں کوئی معافی نہیں ہوگی کیونکہ جس دین میں نماز نہیں اس میں کوئی خیر نہیں۔ منکرات اور فواحش میں کسی مسلمان کو رخصت نہیں دی جاسکتی۔ بالآخر یہ لوگ مسلمان ہو گئے۔ حضورؐ نے ان کو دین سکھانے کے لیے عثمان بن ابی العاصؓ کو مامور فرمایا۔

۲۔ جذام:

فروہ بن عمرو جذامی شمالی عرب کے علاقوں پر رومیوں کا عامل تھا۔ اس نے اپنا نمائندہ حضورؐ کی خدمت میں اپنے اسلام کی خبر دینے کے لیے بھیجا۔ بعد میں رفاعہ بن زید جذامی نے مدینہ پہنچ کر اسلام قبول کیا۔ حضورؐ نے ان کے ہاتھ ان کی قوم کے لیے ایک مکتوب بھیجا کہ رفاعہ کی دعوت پر اگر وہ اسلام قبول کر لیں گے تو اللہ اور رسول کی پارٹی متصور ہوں گے۔ اگر مخالفت کریں گے تو دو ماہ تک ان کو امان دی جاتی ہے۔ یہ خط قبیلہ میں پہنچا تو سب نے اسلام قبول کر لیا۔

۳۔ بنو عذرہ:

اس قبیلہ کی طرف سے زمل بن عمرو نے مدینہ آ کر اسلام قبول کیا۔ حضورؐ نے ان کی قوم کے لیے اسی طرح

کا مکتوب لکھوایا جیسا جذام کے لیے لکھوایا تھا۔ یہ قبیلہ بھی زرعہ کی دعوت پر مسلمان ہو گیا۔

۴۔ ھمدان:

یہ قبیلہ یمن میں آباد تھا۔ ان کی طرف سے مالک بن نمط وفد لے کر آئے اور تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ وفد ہمدان کے بہترین افراد پر مشتمل ہے اور وہاں کے ہر شہری اور دیہاتی کی نمائندگی کر رہا ہے۔ یمنی قبائل مخلاف، یام اور شاکر نے اسلام کی دعوت قبول کر لی ہے اور تمام یمنیوں کو اب اسلام نے جوڑ رکھا ہے۔ ان سب کا عہد پہاڑ کی طرح مستحکم ہے۔ حضورؐ نے وفد کی تحسین فرمائی اور ان کے لیے تحریر لکھوائی کہ جب تک نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے رہیں، اپنے علاقہ کے بلند و پست پر ان کا حق ہوگا۔ تمام پیداوار انہی کی ہوگی۔

اسی مضمون کا مکتوب آپ نے بنو جوین، بنو زہیر، بنو مہرہ اور بنو لخم وغیرہ کو بھی بھجوایا۔

۵۔ شاھان حمیر:

ملوک حمیر حارث بن عبد کلال، نعیم بن عبد کلال اور نعمان نے زرعہ ذویزن مالک کو اپنا نمائندہ بنا کر حضورؐ کو اپنے اسلام کی اطلاع دینے اور شرک و اہل شرک سے اپنی بیزاری کی خبر دینے کے لیے مدینہ بھیجا۔ حضورؐ نے ان کو دینی احکام کے بارے میں مفصل ہدایات لکھوا کر بھیجیں۔ آپ نے ان کی تعلیم اور وصولی صدقات کے لیے معاذ بن جبلؓ، عبداللہ بن زیدؓ، مالک بن عبادہؓ اور چند اور افراد کو ذویزن کے ہمراہ بھیجا۔ ان کو ہدایت کی کہ وہ لوگوں سے نرمی کا معاملہ کریں، اسلام لانے پر بشارت دیں اور اس سے ان کو متنفر نہ کریں۔ اگر اہل کتاب میں سے کوئی شخص یہ سوال کرے کہ جنت کی کنجی کیا ہے تو جواب دیں کہ اللہ کی وحدانیت کی شہادت اور شرک کی نفی۔

۶۔ بنو حارث بن کعب:

یہ قبیلہ یمن سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی طرف خالد بن الولیدؓ کو کچھ نفری دے کر بھیجا گیا۔ خالد نے اپنے سواروں کو مختلف سمتوں میں تبلیغ کے لیے بھیجا۔ ان کو ہدایت کی کہ اگر لوگ اسلام قبول کر لیں گے تو ان کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہوگی۔ دین کی دعوت سے لوگ متاثر ہوئے اور اسلام، کتاب اللہ اور سنت نبوی کی اطاعت کا وعدہ کیا۔ خالد بن الولیدؓ نے حضورؐ کو صورت حال سے مطلع کیا تو آپ نے بنو حارث کے اسلام پر خوشی کا اظہار فرمایا اور خالد کو لکھا کہ واپس آ جائیں اور قبیلہ کا ایک وفد بھی ساتھ لائیں۔ وفد آیا تو حضورؐ نے قیس بن الحصین کو ان کا سردار

مقرر کیا۔ آپ نے ان کے ہمراہ عمرو بن حزمؓ کو ایک مفصل تحریر دے کر بطور معلم بھیجا جس میں دین کی اساسات اور سنت رسول اللہ بیان ہوئی تھی۔ اس میں طہارت، نماز، زکوٰۃ، عشر، حج، عمرہ، جہاد، مال غنیمت، جزیہ وغیرہ کے متعلق ہدایات درج تھیں۔ حضورؐ نے وفد کو رخصت کیا تو ان کو چاندی بطور تحفہ عطا فرمائی۔

۷۔ وفد نجران:

یمن میں نجران عیسائیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس شہر میں ان کا ایک عظیم الشان گرجا تھا اور بڑے بڑے اسقف اور پیشوا یہاں رہتے تھے۔ حضورؐ نے ان کو مکتوب لکھا جس میں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس پر ایک بڑا وفد، جس میں ساٹھ سوار، شرفائے قوم اور بڑے اسقف شامل تھے، عاقب عبدالمسیح کی قیادت میں مدینہ منورہ آیا۔ یہ وفد کئی روز ٹھہرا اور عقائد کے حوالہ سے سوالات کرتا رہا۔ حضورؐ نے ان کو ہر طرح سے مطمئن کر دیا لیکن وفد نے اسلام قبول نہ کیا۔ قرآن میں ہدایت نازل ہوئی کہ ان کو دعوت مباہلہ دی جائے۔ لیکن وفد کے ارکان چونکہ دل میں یہ مان چکے تھے کہ آنحضرتؐ واقعی آخری موعود رسول ہیں لہٰذا مباہلہ کی صورت میں ہماری تباہی یقینی ہے، اس لیے انہوں نے خراج دینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ یہ جزیہ یمنی سوٹوں کی شکل میں قبول کرنا طے پایا۔ معاہدہ کی رو سے ہر سوٹ ایک اوقیہ کی قیمت کا تھا اور سال بھر میں دو ہزار سوٹ دو شش ماہی قسطوں میں فراہم کرنے ضروری تھے۔ یہ بھی گنجائش رکھی گئی کہ اگر سوٹ فراہم کرنے میں دشواری ہو تو ان کی قیمت میں اونٹ اور گھوڑے بھی محسوب ہو سکیں گے۔ جزیہ کے بدلہ میں ان کے مذہبی امور، عبادت گاہوں اور اصنام وغیرہ میں کوئی دخل اندازی نہیں کی جائے گی۔ ان کے پیشواؤں کو ان کے عہدوں سے نہیں ہٹایا جائے گا اور ان کے جان و مال کو تحفظ حاصل ہوگا۔

روایت کے مطابق وفد مدینہ سے لوٹا تو اسقف اعظم اس کے استقبال کے لیے نکلا۔ جب حضورؐ کی تحریر پڑھی تو کہنے لگا 'بے شک یہ شخص نبی مرسل ہے۔ یہ سنتے ہی اس کے چچازاد بھائی بشر بن معاویہ نے اپنے اونٹ کا رخ مدینہ کی طرف موڑ دیا اور وہاں جا کر اسلام قبول کر لیا۔

۸۔ بنو محارب:

اس قبیلہ کا وفد آیا تو حضورؐ اس کے ایک رکن کو غور سے دیکھنے لگے۔ اس نے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے پہلے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ اس نے کہا حضورؐ درست فرما رہے ہیں۔ عکاظ کے میلے میں آپ سے

میں نے بڑی قبیح گفتگو کی تھی اور آپ کی دعوت کو برے انداز میں رد کیا تھا۔ اب میں اسلام قبول کرتا ہوں۔ آپ میری مغفرت کی دعا فرمائیے۔ حضورؐ نے فرمایا اسلام کفر کے دور کے سب گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

اس زمانہ میں بنو کلب، بنو ہند، بنو البکاء، خولان، صداء، ذی مرہ، بلی، بہرا، بنو اسد، بنو خزارہ وغیرہ متعدد قبائل کے وفد آئے اور اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوئے۔ حضورؐ نے دور دراز علاقوں میں بھی مبلغین بھیجے تاکہ وہ لوگوں کو دین کی دعوت اور اس کی تعلیم دیں۔

بعض یہودی قبائل نے جزیہ پر معاملہ کر لیا۔ ان میں بنو غادیا، اہل مقنا، جن کی آبادی خلیج عقبہ کے ساحل پر تھی، اور اہل اذرح، جو شام کی سرحد پر تھے، شامل ہیں۔

باب 44

ختم نبوت اور جمع وتدوین قرآن

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آسمانی بادشاہت کی جو خبر دی اور اس کی جو علامات بیان کیں وہ اس کتاب کے پہلے حصہ میں تفصیل کے ساتھ واضح کی جا چکی ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے بعد آنے والے رسول کی ایک خصوصیت یہ بیان کی تھی کہ "خدا تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے"۔ (یوحنا ۱۴:۱۶) قرآن مجید نے تو یہ تصریح بھی کی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اس رسول کا نام تک بتا دیا جو 'احمد' تھا لیکن موجود انجیلوں میں اس نام کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

مذکورہ خصوصیت کا ایک تقاضا یہ ہے کہ وہ رسول آخری ہو جس کے بعد قیام قیامت تک اور کوئی نبی یا رسول مبعوث نہ ہو اور وہ اپنے عمل سے دین کی تعلیم کو ایسی بنیاد پر قائم کر دے جس کو ڈھانا کسی کے لیے ممکن نہ ہو۔ اس کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اس رسول کو جو صحیفہ ہدایت عطا ہو اس میں وقت کے ساتھ کوئی تغیر و تبدل یا تحریف راہ نہ پا سکے۔ رسول اللہ ﷺ کے معاملہ میں یہ دونوں تقاضے پورے ہوئے۔ آپ کی بعثت پر ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا اور قرآن مجید کی محفوظیت کا ذمہ خود اللہ رب العزت نے اٹھالیا۔

ختم نبوت:

رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح کیا تو منافقین نے پروپیگنڈا کا طوفان کھڑا کر دیا جس کی کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ اس صورت حال میں حضورؐ کو استقامت کی تلقین ہوئی۔ اس ضمن میں قرآن نے یہ بھی فرمایا:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلٰكِن رَّسُولَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۔ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا۔ (احزاب ۳۳:۴۰)

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں اور اللہ ہی ہر چیز

سے باخبر ہے۔

حضورؐ کے اللہ کا رسول ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ آپ اپنے مخاطبوں کو دین حق کا ابلاغ کامل طریقہ سے کریں گے اور ان لوگوں پر اتمام حجت ہو جائے گا جن تک آپ کی دعوت پہنچے گی۔ نبیوں کے خاتم ہونے کے معنی ہیں آخری نبی۔ خاتم کسی قوم کے آخری فرد کو کہتے ہیں۔ نبیوں کے خاتم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زمرۂ انبیاء کے آپ آخری فرد ہیں۔ آپ کی ذات کے آجانے کے بعد قصر نبوت کی اس طرح تکمیل ہوئی ہے کہ اب اس میں کوئی رخنہ باقی نہیں رہا جس کو بند کرنے کے لیے مزید کسی نبی کی بعثت کی ضرورت پڑے۔ خاتم النبیین ہونا رسول اللہؐ کی وہ خصوصیت ہے جس میں کوئی نبی آپ کا شریک و سہیم نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اس منصب کا تقاضا یہ تھا کہ آپ وہ تمام کام انجام دیں جو تکمیل دین وشریعت کے لیے ضروری ہوں۔ اسی تقاضا کو پورا کرنے کے لیے آپ نے قرآن کے احکام کی وضاحتیں کیں۔ ان کے اوپر خود عمل کر کے وہ طریقہ روشن کیا جس پر چل کر آدمی دین کی رہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔ حضور کی بیان کردہ یہی وضاحتیں اور اعمال وافعال آپ کی سنت کہلاتے ہیں جو عہد صحابہ سے لے کر متواتر طریقہ سے ہم تک پہنچی اور امت کے عمل میں رچ بس گئی۔

ماضی میں وقت گزرنے کے ساتھ ہدایت کا کچھ حصہ گم یا ناپید ہو جاتا رہا۔ بعض اوقات کوئی بدبخت امت اپنے نبی کی تعلیم کو مسخ کرنے اور اس میں تحریف کر دینے کی مرتکب ہوئی۔ تب یہ ضروری ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کے ساتھ کیے گئے وعدہ کے مطابق دوسرا رسول یا نبی بھیج کر اپنی ہدایت کو پھر سے واضح کرے۔ حضورؐ پر جو ہدایت اتاری گئی اس کی تکمیل کر دی گئی اور اعلان کر دیا گیا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا.

(المائدہ ۵:۳)

آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل اور تم پر اپنے انعام کو مکمل کر دیا اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔

اس کو ناپید ہونے سے بچانے کے لیے اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود اٹھا لیا تاکہ یہ کتاب ابد تک انسانوں کے ساتھ رہے۔ یہ انتظام ضروری تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ وعدہ پورا ہوا۔ قرآن مجید کا ایک ایک حرف اسی طرح محفوظ ہے جس طرح رسول اللہؐ نے اسے امت کے حوالہ کیا تھا۔ چونکہ نبی کی بعثت ہدایت کے ابلاغ کے

لیے ہوتی ہے اور حضورؐ کی لائی ہوئی ہدایت اقوام عالم کے استفادہ کے لیے محفوظ ہے اس لیے حضورؐ پر نبوت ختم کر دی گئی اور آپ خاتم النبیین ہیں جن کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اگر دین کوئی ایسی چیز ہوتا جس کی تکمیل کبھی ہونے والی نہ ہوتی، تب بلاشبہ سلسلہ نبوت کو جاری رکھنا ضروری ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے جب دین کو کامل کر دیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔

خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے منصب کے مختلف پہلوؤں کو راز نہیں رکھا بلکہ اپنے قول اور عمل سے ان کو اچھی طرح اجاگر کیا۔ مثلاً حضورؐ نے اپنے خاتم النبیین ہونے کو ایک تمثیل سے سمجھایا۔ آپ نے فرمایا کہ میری اور دوسرے انبیاء کی تمثیل یوں ہے جیسے ایک آدمی نے عمارت بنائی تو نہایت حسین و جمیل بنائی مگر عمارت کے گوشوں میں سے ایک گوشہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رکھی۔ لوگ عمارت کے گرد گھومتے تو عمارت ان کو لبھاتی۔ پھر وہ اس آدمی سے یہ کہتے کہ تو نے کیوں ایک اینٹ یہاں نہ لگا دی کہ تمہاری عمارت مکمل ہو جاتی۔ حضور نے فرمایا' وہ اینٹ میں ہوں اور میں آخری نبی ہوں[1]' اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کا قصر تعمیر ہوا تو خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء نے اس عمارت کی تعمیر کی، خوبصورتی اور دلکشی میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا۔ رسول اللہؐ کی بعثت سے پہلے یوں تو عمارت تعمیر ہو چکی تھی لیکن ایک اینٹ لگنا ابھی باقی تھا۔ رسول اللہؐ نے یہ خلا بھر دیا اور عمارت کی تکمیل کر دی۔ اب اس میں مزید ایک اینٹ لگنے کی گنجائش بھی باقی نہیں ہے۔ لہذا سلسلہ انبیاء کو ختم کر دیا گیا۔

ایک اور حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

> انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد رسالت اور نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب نہ کوئی رسول آئے گا اور نہ کوئی نبی۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ یہ بات لوگوں کے دلوں پر شاق گزری۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ مبشرات رہیں گی۔ لوگوں نے سوال کیا کہ یہ مبشرات کیا ہیں، یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا کہ مسلم مرد کے خواب، اور یہ چیز نبوت کے اجزا میں سے ایک جزو ہے[2]۔

اس حدیث سے چند باتیں واضح ہو جاتی ہیں:۔

- رسول اللہ ﷺ کے بعد وحی کا سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ اب نبوت کے اجزا میں سے صرف نیک لوگوں کے اچھے خواب باقی رہ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ وحی کا بدل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح الہام اور مکاشفہ کا دعویٰ بھی اگر کوئی شخص کرے گا تو وہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

- اچھے خواب دیکھنے والوں کو نبوت کا کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا۔
- اب نبی یا رسول دونوں کے طبقے میں سے ہونے کا کوئی بھی دعویدار ایک جھوٹا مدعی سمجھا جائے گا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر نبی کی ذمہ داری کون ادا کرے گا۔ تو اول تو قرآن کے محفوظ ہونے کے بعد آسمانی رہنمائی قیامت تک موجود رہے گی۔ دوسرے جو خرابیاں، عقائدی و عملی پیدا ہوں گی، ان کی اصلاح امت مسلمہ بحیثیت مجموعی کرے گی۔ آنحضرت ﷺ نے یہ بات واضح کی ہے کہ امت مسلمہ میں ایسے علماء و مصلحین برابر پیدا ہوتے رہیں گے جو مفسدین کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کرتے رہیں گے، اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو۔

تصور ختم نبوت پر اعتراضات:

بعض لوگ ختم نبوت کے تصور پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی بعثت کو تو چودہ سو سال کا عرصہ بیت گیا۔ اس دوران میں انسان ترقی کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ تہذیب و تمدن میں اتنی بڑی تبدیلیاں رونما ہوگئی ہیں جس کی نظیر ماضی میں نظر نہیں آتی۔ اس صورت میں ختم نبوت کا نظریہ نسل انسانی کو پیغمبروں کی رہنمائی سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نبوت و رسالت کا ادارہ انسان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ ادارہ ہے جس کے اصول و ضوابط خود اسی کے معین کردہ ہیں۔ ان اصول و ضوابط کے مطابق رسول اس وقت بھیجا جاتا ہے جب اللہ کا کلام تلف کر دیا گیا ہو اور وہ رہنمائی کے لیے موجود نہ ہو۔ رسول دوبارہ اس کو پیش کرتا اور اس کی وضاحت کرتا ہے۔ حضورؐ کے بعد اللہ کا کلام بھی محفوظ ہے اور آپ کی پیش کردہ وضاحتیں بھی۔ ان دونوں سے آج بھی ایک نیک نیت انسان رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ باقی رہا ہدایت دینے کا کام تو یہ اللہ کے اختیار کی چیز ہے۔ رسول کی موجودگی میں بھی اللہ تعالیٰ خود ہی بندوں کو ہدایت کی توفیق عطا فرماتا ہے اور اس کی عدم موجودگی میں بھی وہی بندوں کو ہدایت سے نوازتا ہے۔ لہٰذا قرآن اور سنت رسول کی حفاظت کے باعث نئے نبی کی بعثت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جہاں تک نئے مسائل کے پیدا ہونے کا تعلق ہے تو رسول اللہؐ نے اپنی امت کو اس کی تربیت دے دی کہ وہ کس طرح قرآن و سنت کے احکام کی روشنی میں ان پر قیاس کر کے نئے مسائل کا حل اجتہاد کے عمل سے نکالے۔ اس رہنمائی کے طفیل اسلام ہر دور کے مسائل کا بخوبی مواجہہ کر سکتا ہے۔

جہاں تک انسان کی ترقیوں کا تعلق ہے یہ اخلاقی و روحانی دائرہ میں نہیں ہوئیں جس دائرہ سے نبیوں کو بحث ہوتی ہے۔ یہ ترقیاں طبیعی (Physical) میدان میں ہوئی ہیں جس سے دین صرف اسی وقت تعرض کرتا ہے جب یہ اخلاقی اقدار سے متصادم ہوں۔ قرآن نے جو نظام اخلاق پیش کیا ہے وہ آج بھی انسانیت کی رہنمائی کے لیے موجود ہے اور اتنا جامع وارفع ہے کہ انسان اپنی خیرہ کن ترقیوں کے باوجود اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اگر انسان محمد ﷺ کے پیش کردہ نظام اخلاق اور خیر وشر کے تصورات کو اختیار کر چکا ہوتا اور اس سے اس کے شوق پرواز کی تسکین نہ ہوتی بلکہ اس سے مزید بہتر نظام اخلاق کا طالب ہوتا اور قرآن سے اس کی یہ ضرورت پوری نہ ہوتی تب ختم نبوت کے تصور پر تنقید کرنا جائز ہوسکتا تھا۔ لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ اخلاقی اعتبار سے پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے۔ قرآن ہدایت کے لیے موجود ہے لیکن اس کی طرف سے وہ آنکھیں بند کیے ہوئے ہے۔

اجتماعی معاملات میں قرآن نے تعلیم کا جو انداز اختیار کیا ہے اس میں دین کے بنیادی مطالبات بتا دیے ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ہر حال میں ضروری ہے۔ باقی رہ گیا ان کا تفصیلی ڈھانچہ تو اس کی تعمیر کو انسانوں پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ دین کے بنیادی مطالبات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان میں اپنے دور کی ترقیوں کے مطابق کوئی سی شکل دے لیں۔ انسان اگر اس طریق کار کو اپنا لے تو نہ وہ آسمانی ہدایت سے محروم رہتا اور نہ تہذیب وتمدن کی ترقیاں اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرتی ہیں۔

ایک اور اعتراض جو ختم نبوت کے تصور پر کیا جاتا ہے، یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد متعدد لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور لوگوں کو اپنے پیغام سے متاثر بھی کیا ہے۔ لہٰذا تاریخی طور پر یہ تصور حقیقت ثابت نہیں ہوتا۔ جہاں تک سلسلہ نبوت کا تعلق ہے اس کی کڑیاں باہم دگر پیوست ہیں۔ تمام انبیاء کا دین اپنی بنیاد واساس کے حوالہ سے ایک ہی رہا۔ ان کی دعوت اللہ کی وحدانیت کے اقرار، اس کی صفات کے تقاضوں کے استحضار، نیکی وبدی کے شعور کو پختہ کرنے، نیکی کو پھیلانے اور برائی کا قلع قمع کرنے، اور آخرت کا یقین پیدا کرنے پر مشتمل رہی اور اس کے بارے میں رہنمائی ان کو وحی کے ذریعہ سے ملتی رہی۔ انبیاء اعلیٰ اخلاق وکردار کا ایسا نمونہ ہوتے کہ ان کی شخصیت اپنے ہم عصروں میں سب سے نمایاں ہوتی۔ دعوت دین دیتے ہوئے اللہ کے قانون کے مطابق ان کو کئی مراحل سے گزرنا پڑتا جس کے بعد ان کے مشن کی تکمیل ہوتی۔ محمد رسول اللہؐ کے بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ان کے

پاس وحی کی کوئی تعلیم نہ تھی جس کو لوگ پہچان کر کہہ سکتے کہ یہ تعلیم اسی سرچشمہ سے پھوٹی ہے جس سے تورات، انجیل اور قرآن مجید کی تعلیمات پھوٹی تھیں۔ ان کی دعوت میں سلسلہ انبیاء کی دعوت کے عناصر نظر نہیں آتے بلکہ ان مدعیان نبوت نے عفت و پاکیزگی کے اس نظام کو پاش پاش کرنے کی کوشش کی جس کو انبیاء نے قائم کیا۔ انہوں نے اباحیت کا دروازہ کھولا اور بالعموم اخلاق سے عاری لاخیرے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔ ان کے پاس اخلاق و کردار اور خلوص وللہیت کی وہ بلندی نہ تھی جو اصل نبیوں کے ہاں نظر آتی ہے۔ معدودے چند لوگوں کے سوا ان کے ہم عصر انسانوں نے ان کی نبی ہونے کی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا۔ لہذا ان کی دعوت کو بقا حاصل نہیں ہوئی۔ ایک وقتی ہیجان برپا کر کے وہ ایک محدود سا فرق بنا سکے اور اسی دوران دنیا کے منظر سے ہٹ گئے۔ بیشتر مدعیوں کی موت کے ساتھ ان کا مذہب بھی ختم ہو گیا۔ یہ لوگ جب تک زندہ رہے وہ ان مراحل سے نہیں گزرے جن سے انبیاء کا گزرنا اللہ کے قانون کے تحت ضروری ہے۔ لہذا یہ تمام مدعیان نبوت اصل نبیوں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ان کی حیثیت اسی طرح کی ہے جس طرح کوئی کوا سفید روغن لگا کر ہنسوں کی ڈار میں شامل ہونے کی کوشش کرے۔ محمد رسول اللہؐ اپنی دعوت، اپنے اخلاص و کردار، اپنے آسمانی کلام، اپنے پیروکاروں کی نیکی، اپنی جدوجہد کے نتائج اور دین کی وسعت کے لحاظ سے بالکل ممتاز ہیں۔ حضور کے مماثل نہ کوئی نبی آپ سے پہلے آیا نہ آپ کے بعد پیدا ہوا۔

جمع وتدوین قرآن:

رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنی امت کے لیے جو سب سے بڑی امانت تھی وہ قرآن حکیم تھا۔ یہی وہ الہی پیغام تھا جس کو تمام انسانوں تک پہنچانے پر آپ مامور تھے اور جس کو قیامت تک صحیح و سالم حالت میں محفوظ رکھنے کی ذمہ داری میں آپ کے بعد آپ کی امت بھی شریک ہے۔ لہذا قرآن حکیم کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں آپ نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔

قرآن مجید کے حوالے سے کچھ باتیں طے اور وحی الہی کے ذریعہ سے ثابت شدہ ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید کے نزول میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ باطل اس میں داخل نہ ہو سکے گا۔ نیز یہ کہ اللہ تعالی خود اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔ فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر ۱۵:۹)

بے شک اس یاد دہانی کو ہم نے نہایت اہتمام سے اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (حٰم السجدہ ۴۱:۴۲)

بلاشبہ یہ ایک محفوظ صحیفہ ہے جس کے اندر باطل نہ سامنے سے گھس سکتا اور نہ اس کے پیچھے سے۔

دوسری یہ کہ قرآن ضرورت وقتی کے مطابق متفرق آیات کی صورت میں جو نازل ہو رہا تھا تو اس کو ایک نظم میں پرونا اور پھر نئی ترتیب پر حضورؐ کو سنانا بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ تھا۔ اس کے بارے میں حضورؐ کو حکم تھا کہ جب نئی ترتیب پر آپ اس کو سن لیں تو اس کے مطابق لوگوں کو سنائیں۔ فرمایا

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (القیامہ ۷۵: ۱۷۔۱۸)

بلاشبہ ہماری ذمہ داری ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو پڑھانا۔ پھر جب ہم اس کو پڑھ کر سنا چکیں تو اس کے پیچھے تم اسے سنایا کرو۔

ان وعدوں کے ایفا کی شکل یہ ہوئی کہ نزول قرآن کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے سب سے طاقتور اور معتمد علیہ فرشتے جبریل علیہ السلام کے سپرد ہوئی۔ شیاطین و جنات کی دخل اندازی کو روکنے کے لیے نزول قرآن کے زمانہ میں ان کی نقل و حرکت پر آسمانوں میں پہرے لگا دیے گئے۔ جبریلؑ نے براہ راست رسول اللہؐ کے قلب پر قرآن کو اتارا اور اس طرح شیاطین کی دراندازی کی راہیں بالکل مسدود کر دیں۔ پھر قرآن نے بالکل آغاز ہی میں یہ اشارہ دے دیا کہ اللہ تعالیٰ نے قلم کو تعلیم کا ذریعہ بنایا۔ فرمایا:

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. (علق ۹۶: ۳۔۴)

پڑھو اور تمہارا رب بڑا فیاض ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی

یعنی مطلوب کام یہ تھا کہ قرآن کو لکھوا کر کتابی شکل میں محفوظ کرنا ہوگا۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے مکہ ہی میں قرآن کو لکھوانے کا اہتمام کر لیا تھا جس پر قریش کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ یہ شخص خود کلام گھڑتا ہے اور اس نے کچھ ایسے لوگ بھی فراہم کر لیے ہیں جو صبح و شام اس کو لکھواتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ زندگی بھر آپ نے جاری رکھا یہاں تک کہ کامل قرآن حتمی ترتیب پر اپنی امت کے لیے تیار کروا دیا۔

سورہ قیامہ کی مذکورہ آیت سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ یہ وعدے حضور کی زندگی ہی میں پورے ہوں گے نہ کہ اس کے بعد، ورنہ آپ کو یہ حکم دینے کے کیا معنی کہ جب ہم قرآن کو جمع کر کے آپ کو سنا چکیں تو پھر اس ترتیب کے

مطابق آپ اسے لوگوں کو سنائیں۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ قرآن جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق مرتب ہوتا، حضورؐ اس حتمی ترتیب کے مطابق لوگوں کو سناتے اور اس کے مطابق لکھوا کر امت کے حوالہ کرتے۔ گویا تکمیل قرآن کے بعد بھی آپ کو اتنی مہلت ملنی ضروری تھی کہ آپ یہ کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ ذمہ داری کس طرح ادا کی:

تلاوت قرآن:

قرآن مجید کے حوالہ سے حضورؐ کی پہلی ذمہ داری تلاوت آیات کی تھی۔ آپ کا معمول تھا کہ جتنا قرآن نازل ہوتا وہ آپ بار بار کفار کو سناتے تاکہ اسلام کی دعوت کے لیے ان کے ذہن صاف ہوں اور وہ حق کو قبول کریں۔ مکہ میں آپ خانہ کعبہ کے پاس بلند آواز سے تلاوت کرتے تاکہ قرآن کا پیغام کفار کے کانوں میں پڑے اور وہ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ جو لوگ اسلام لا چکے تھے ان کے لیے یہ نئی تعلیم ایک نعمت ثابت ہوتی جس کو وہ لپک کر قبول کرتے۔ اس کی روشنی میں اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کرتے، اس کو اپنے سینوں میں محفوظ کرتے اور اس پر باہم مذاکرے کرتے۔ اس طرح یہ قرآن ان کی زندگیوں میں داخل ہو جاتا اور ذہنوں کی کشادگی کا باعث بنتا۔

حفظ قرآن:

حضورؐ کی دعوت کے مکی دور ہی سے نماز با جماعت کا اہتمام ہوتا تھا۔ حضورؐ کا طریقہ یہ تھا کہ عشا اور فجر کی نمازوں میں طویل سورتوں کی تلاوت کرتے۔ اس طرح جو قرآن بار بار پڑھا جاتا اس کا معتد بہ حصہ مقتدیوں کو بھی ازبر ہو جاتا۔ بعض صحابہ کو قرآن سے بے حد شغف تھا اور وہ ساتھ ساتھ حفظ کرتے رہتے۔ ایسے صحابہ سے حضورؐ وقتاً فوقتاً قرآن سنانے کی فرمائش کرتے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ سے قرآن سننے کی روایتیں کتب حدیث میں موجود ہیں۔

جن صحابہ کو قرآن زیادہ یاد ہوتا ان کو اسلام میں نئے داخل ہونے والوں کو قرآن پڑھانے کی ذمہ داری سونپی جاتی۔ روایات میں ہے کہ عمار بن یاسرؓ حضرت عمرؓ کی ہمشیرہ فاطمہ بنت الخطابؓ کو قرآن پڑھایا کرتے۔ تعلیم قرآن کی اولین درس گاہ دار ارقم تھی جہاں صحابہ کرام جمع ہو کر قرآن سیکھتے اور اس کو حفظ کرتے۔ صحابہ کرام میں قرآن کے ساتھ شغف ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ حبشہ جانے والے مسلمانوں کو جب نجاشی نے دربار میں طلب کیا اور ان

سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے موقف کی بابت سوال کیا تو جعفرؓ بن ابی طالب نے برسر موقع قرآن کی ان آیات کی تلاوت کردی جن میں نجاشی کے سوالوں کا جواب تھا۔

تعلیم قرآن:

بیعت عقبہ میں اوس وخزرج کے وفد نے یہ درخواست کی کہ دین سکھانے کے لیے کسی آدمی کو ان کے ہمراہ بھیجا جائے تو حضورؐ نے مصعب بن عمیرؓ کو یثرب بھیجا تا کہ وہ مسلمانوں کو قرآن سکھائیں۔ ہجرت کے بعد کئی قبائل کے اندر آپ نے معلمین قرآن بھیجے۔ جب بعض معلمین کے ساتھ قبائل نے بدعہدی کی اور ان کو نقصان پہنچایا تو حضورؐ نے مسجد نبوی کے پاس قرآن کی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے ایک چبوترہ بنوادیا اور قبائل کو پیغام دیا کہ وہ اپنے آدمیوں کو قرآن سیکھنے کے لیے مدینہ بھیجیں۔ قبائل سے آنے والے لوگ اسی چبوترہ پر قیام کرتے، قرآن حفظ کرتے اور رسول اللہؐ سے دین سیکھتے۔ اسلامی معاشرہ ان کی جملہ ضروریات کو پورا کرتا۔ یہ لوگ اصحاب صفہ کہلاتے۔ ابوداؤد کی روایت کے مطابق عبادہ بن الصامتؓ تعلیم قرآن پر مقرر تھے۔ جب ایک گروپ دین کی ضروری باتیں سیکھ لیتا تو اپنے قبیلہ میں واپس چلا جاتا اور اس کی جگہ دوسرا گروپ آجاتا۔

اسلامی معاشرہ میں ان لوگوں کو زیادہ عزت کا مستحق سمجھا جاتا جو قرآن کا زیادہ علم رکھتے تھے۔ حضورؐ ان کو دوسروں پر فوقیت دیتے اور ان کی رایوں پر زیادہ اعتماد کرتے۔ لوگوں میں حلقے بنا کر قرآن پر غور وفکر کرنے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ روایتوں میں آیا ہے کہ نبی ﷺ جب مسجد میں تشریف لاتے اور لوگوں میں یہ انہماک دیکھتے تو مسرت کا اظہار فرماتے اور ان حلقوں میں بیٹھ جاتے۔ متعدد مثالیں موجود ہیں کہ آپ نے قرآن فہمی میں فوقیت کی بنا پر کم سن نوجوانوں کو قبائل کی رہنمائی کا کام سونپ دیا۔ مکہ صنادید قریش کا بڑا مرکز تھا جہاں کی امارت کے لیے ایک سے ایک بڑا نام زیر غور آ سکتا تھا لیکن فتح مکہ کے بعد آپ نے شہر کی امارت پر ایک نوجوان عتاب بن اسیدؓ کا تقرر کیا۔ اس کی وجہ ان کا قرآن کے ساتھ شغف تھا۔

کتابت قرآن:

قرآن مجید کی کتابت کا کام حضورؐ نے مسلسل جاری رکھا۔ کم وبیش چالیس صحابہ کے نام کتابوں میں ایسے آئے ہیں جنھوں نے کتابت وحی میں حصہ لیا۔ ان میں مکی بھی ہیں اور مدنی بھی۔ جب بھی قرآن کی کچھ آیات نازل

ہوتیں تو حضورؐ کتابت جاننے والے صحابی کو طلب فرماتے اور اس کو یہ ہدایت دیتے کہ ان آیات کو فلاں سورہ میں فلاں آیت کے بعد اور فلاں آیت سے پہلے لکھ دو۔ یہ ہدایت اس لیے دی جاتی کہ قرآن کو نزولی ترتیب پر لکھوانا مدنظر نہ تھا بلکہ قرآن اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق جمع ہو رہا تھا اور اس کو نئی ترتیب دی جا رہی تھی۔ یہ ترتیب توقیفی کہلاتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت مقرر کردہ ترتیب۔ قرآن آج تک اسی ترتیب سے لکھا جاتا اور اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں دشمنوں کی یہ کوشش ہے کہ وہ اپنی من گھڑت ترتیب پر نیا قرآن مدون کریں۔ اسی لیے وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ موجودہ ترتیب صحابہ اور خصوصاً زید بن ثابتؓ کی قائم کردہ ہے اور اس کی اصلاح ضروری ہے کیونکہ اس میں ایڈیٹنگ کے نقائص ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ترتیب اللہ کے حکم سے حضورؐ کی نگرانی میں قائم ہوئی۔ اس میں کسی انسانی کاوش کو دخل نہیں ہے۔ مستشرقین نے قرآن کی ترتیب نو کی متعدد کوششیں کی ہیں لیکن ان کو ان کے اپنے اہل تحقیق نے ایک لایعنی کام قرار دیا ہے اور کسی کو بھی قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

نبی ﷺ جو کتابت کرواتے وہ اپنے خاص مصحف میں ترتیب سے رکھواتے۔ ابتداءً یہ مصحف مسجد نبوی کے ایک ستون کے پاس ایک صندوق میں رکھا رہتا۔ اس ستون کا نام ہی 'اسطوانہ مصحف' پڑ گیا۔ صحابہ یہیں بیٹھ کر اپنی ضرورت کا قرآن لکھ لیا کرتے۔ اس طرح اصل مصحف محفوظ رہتا۔ زید بن ثابتؓ کا قول روایات میں نقل ہوا ہے کنا عند رسول الله نؤلف القرآن من الرقاع [3]۔ ہم رسول اللہؐ کے پاس اوراق کی مدد سے قرآن مرتب کیا کرتے تھے۔ بعد میں جب منافقین و معاندین کی ریشہ دوانیاں بڑھ گئیں تو رسول اللہ ﷺ نے حفاظت کے نقطہ نظر سے یہ مصحف مسجد سے اٹھوا دیا اور اس کو ام المومنین حضرت حفصہؓ کے حجرہ میں رکھوا دیا۔

جبریلؑ سے مذاکرہ:

حضورؐ کو توقیفی ترتیب پر قرآن سنانے کا انتظام من جانب اللہ ہوا۔ حضورؐ ہر رمضان میں مسجد میں معتکف ہوتے اور جبریل امینؑ کے ساتھ قرآن کا مذاکرہ ہوتا۔ جب قرآن کی تکمیل ہوگئی تو آخری رمضان میں حضورؐ نے بیس دن کا اعتکاف کیا اور حتمی ترتیب پر قرآن دو مرتبہ سنایا۔ اس طرح ایک طرف جمع قرآن کا کام مکمل ہوا، وعدہ الٰہی کے مطابق آپ کو قرآن مرتب شکل میں سنا دیا گیا اور پھر آپ نے اس ترتیب پر جبریلؑ کو قرآن سنایا اور اسی کی تعلیم امت کو دی۔

یہ بات روایات سے ثابت ہے کہ حضورؐ کی حیات مبارکہ ہی میں لوگوں نے مصحف کی نقول اپنے استعمال کے لیے تیار کر لی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق حضورؐ نے مصحف میں دیکھ کر تلاوت کرنے والے کے لیے بن دیکھے تلاوت کرنے والے کی نسبت دوہرے اجر کی بشارت دی۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب حضورؐ کی حیات مبارکہ میں مصاحف میسر آ چکے ہوں[4]۔ ایک اور روایت کے مطابق حضورؐ نے سفر میں قرآن کو ساتھ لے جانے کی ممانعت کی تا کہ اس کے اوراق کفار کے ہاتھ نہ لگیں اور وہ ان کو ضائع نہ کر دیں[5]۔

روایت کے مطابق حضورؐ اپنے زمانہ میں قرآن کو ہڈیوں، لکڑی کی تختیوں، چمڑے اور اس طرح کی متفرق چیزوں پر لکھواتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن حضورؐ کی رحلت کے وقت مرتب شکل میں نہ تھا۔ یہ بات اس صورت میں صحیح مانی جا سکتی ہے جب آنحضرت ﷺ لکھنے کے کسی دوسرے میٹریل سے آشنا نہ ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں جس طرح قلم کو ذریعہ تعلیم بنانے کا اشارہ ہے اسی طرح توریت کے 'رق منشور' میں لکھے جانے کا حوالہ بھی دیا ہے۔ رق کھال کے باریک پارچے کو کہتے ہیں۔ قدیم زمانہ سے یہ میٹریل، جو نہایت مضبوط اور پائیدار ہے، تورات کی کتابت کے کام میں لایا جا رہا ہے۔ اس کا طومار یعنی رول بنا لیا جاتا ہے۔ اس رول کو کھول کر پارچوں کو پھیلا کر تورات کی تلاوت ہوتی۔ اسی لیے قرآن نے ان کو رق منشور سے تعبیر کیا۔ آج بھی یہود کے پیشوا توریت کا جلوس نکالتے ہیں تو اس طومار کو لے کر جلوس کے آگے چلتے ہیں۔ رسول اللہؐ کے جو مکاتیب زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں اور مختلف عجائب گھروں میں ملتے ہیں وہ اسی رق پر لکھے گئے تھے۔ جب حضورؐ اپنے زمانہ کے اس اعلیٰ میٹیریل سے واقف تھے اور خطوط کے لیے اس کو استعمال فرماتے تھے تو قرآن کے معاملہ میں کیوں اس کو کام میں نہ لاتے جب کہ قرآن میں اس کا اشارہ بھی موجود تھا۔ لہٰذا ہمارے نزدیک حضورؐ نے جو نسخہ مرتب کروایا اور ام المومنین حفصہؓ کے حجرہ میں رکھوایا وہ رق پر لکھا گیا ہوگا۔ ہڈیوں اور تختیوں پر اس کو لکھوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہڈیاں اور تختیاں یا چھال اگر استعمال میں لائی گئی ہوں گی تو سفر وغیرہ میں یا عارضی طور پر، جب رق کا انتظام نہ رہا ہوگا۔

پس ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی امانت کا حق اپنی وفات سے پہلے ادا کر دیا۔ یہ امانت ہزاروں سینوں میں بھی محفوظ ہو گئی اور اس کا ایک معیاری نسخہ بھی کتابت شدہ حالت میں محفوظ کر دیا گیا۔ اس کے

بعد یہ امت مسلمہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ اسی اصلی حالت میں قرآن کی اشاعت کرتی اور حفظ کے ذریعے بھی کتاب اللہ کو محفوظ کرتی۔ الحمد للہ کہ امت نے یہ دونوں کام کیے ہیں۔

خلافت ابی بکرؓ میں جمع قرآن کی روایت:

ہمارے نزدیک صحیح صورت حال وہی ہے جو بیان ہوئی لیکن روایات میں خلفائے راشدین کے دور میں ترتیب و تدوین قرآن کا تصور دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ حیات رسول اللہؐ کے بعد کا ایک تذکرہ ہے، اس لیے ہمارے موضوع سے متعلق نہیں لیکن چونکہ اس کا اثر رسول اللہؐ کی اعلیٰ کارکردگی پر نہایت منفی پڑتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ان روایات کا مجمل جائزہ لیا جائے۔ پہلی روایت، جسے امام بخاری نے اپنی صحیح میں جگہ دے کر اس کو قبول عام دلوا دیا ہے، یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں جنگ یمامہ میں بہت بڑی تعداد میں حفاظ قرآن شہید ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کو خیال ہوا کہ اگر آئندہ جنگوں میں بھی یہی صورت حال رہی تو اس بات کا خطرہ ہے کہ قرآن کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے اور اس کا جاننے والا کوئی نہ رہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو قائل کیا کہ رسول اللہؐ کے لکھوائے ہوئے قرآن کو باقاعدہ مصحف کی شکل میں مرتب کروا دیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ فریضہ زید بن ثابتؓ کو سونپا۔ بڑی مشکلوں اور تگ ودو کے بعد نہ معلوم کہاں کہاں سے آیات اکٹھی کی گئیں اور ان کو لکھوایا گیا۔ سورہ براءۃ کی آخری آیتیں خزیمہ یا ابوخزیمہ سے ملیں[6]۔

یہ روایت اگر درست مان لی جائے تو کئی حقائق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اولاً، اللہ تعالیٰ کا وعدۂ جمع قرآن معاذ اللہ غیر ایفا شدہ ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر قرآن جمع ہو چکا تھا تو پھر زید بن ثابتؓ کو کون سی مشکل درپیش تھی کہ انہوں نے اس مجموعہ قرآن کو نقل نہیں کیا بلکہ آیتوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ثانیاً، یہ ماننا پڑے گا کہ مہاجرین وانصار اتنا عرصہ رسول اللہؐ کے ساتھ وابستہ رہے لیکن مکمل قرآن حفظ کرنے کی سعادت حاصل نہ کر سکے۔ چنانچہ جب آیات کی تلاش ہوئی تو کوئی حافظ قرآن سامنے نہ آیا جو کہہ سکتا کہ میں نے حضورؐ سے سن کر یوں حفظ کیا۔ جب قدیم صحابہ میں کوئی حافظ قرآن نہیں تھا تو جنگ یمامہ میں شہید ہونے والے حفاظ کہاں سے آ گئے تھے؟ ثالثاً، روایت کے الفاظ سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ کامل قرآن یمامہ کے شہدا کے پاس بھی نہیں تھا بلکہ دوسرے لوگ بھی کچھ حصے ہی یاد کرتے تھے، اسی لیے تو حضرت عمرؓ کو قرآن کے بعض حصوں کے ضائع ہونے کا خطرہ محسوس

ہوا۔ اگر صدر اول کے مسلمان مکمل قرآن حفظ کرتے تھے تو پھر حضرت عمرؓ کی بات کا کیا مطلب ہے؟ رابعاً، اس روایت کو تسلیم کر کے آدمی اس نتیجہ کو ماننے سے بچ نہیں سکتا کہ رسول اللہؐ کے حوالے جو امانت کی گئی اور جسے سارے عالم میں پھیلانے کی ذمہ داری آپ پر ڈالی گئی، معاذ اللہ آپ اس کا حق ادا نہ کر سکے۔ نہ قرآن کو اس کی اصل ترتیب پر جمع کیا اور نہ لوگوں کو اس ترتیب پر حفظ کرایا۔ خامساً، یہ نتیجہ بھی سامنے آتا ہے اور یہی درحقیقت دشمنان دین اس روایت سے منوانا چاہتے ہیں کہ موجودہ قرآن کی حیثیت مشکوک ہے۔ معلوم نہیں یہ اصل کے مطابق ہے بھی ہے یا نہیں؟ کیا معلوم اس میں بعض آیات شامل نہ ہو سکی ہوں جو بعض لوگوں کے پاس رہ گئیں اور وقت پر دستیاب نہ ہو سکیں؟ پھر اس کا الزام بہ آسانی خلفائے راشدین کو دیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ایک ناتمام نسخہ مرتب کروا کر امت میں رائج کر دیا۔

حدیث کی حیثیت سے اس روایت کی سند پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کے اولین واحد راوی زید بن ثابتؓ ہیں، جو اس کی خبر ایک ہی شخص عبید بن السباق کو دیتے ہیں، جو آگے ایک ہی شخص ابن شہاب زہری کے علم میں یہ بات لاتے ہیں۔ زہری اس کو اپنے سینکڑوں شاگردوں میں سے صرف چار اشخاص یونس، شعیب، ابراہیم اور عبدالرحمٰن بن خالد کو یہ روایت سناتے ہیں۔ اتفاق سے یہ چاروں ثقہ شیعہ راوی ہیں۔ امام بخاری کی اپنی تحقیق کے مطابق عبید بن السباق کا انتقال ۱۱۸ھ میں ۶۸ برس کی عمر میں ہوا۔ گویا ان کا سال پیدائش ۵۱ھ ہونا چاہیے۔ زید بن ثابتؓ کے سال وفات کے بارے میں کئی قول ہیں۔ مثلاً ۴۵ھ، ۴۸ھ، ۵۴ھ۔ پہلے دو سالوں میں تو عبید ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور آخری قول کے مطابق زید کے انتقال کے وقت ان کی عمر دو یا تین سال رہی ہو گی۔ یعنی زید سے روایت حدیث کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ روایت پہلی صدی ہجری میں خبر واحد عن واحد عن واحد رہی اور اس کا دوسرا کوئی شاہد موجود نہیں رہا۔ حالانکہ اگر قرآن کی ترتیب کا واقعہ حقیقت میں پیش آیا ہوتا تو وہ اتنا مہتم بالشان تھا کہ اس کے بیسیوں راوی صحابہ کرام میں سے ہوتے اور وہ فخر سے بیان کرتے کہ وہ بھی اس عظیم کام میں شریک رہے۔ پس ہمارے نزدیک یہ روایت شیعہ کی خود ساختہ ہے۔ عملاً ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

خلافت عثمانؓ میں جمع قرآن کی روایت:

دوسری روایت حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت کی ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ قرآن کی قرأت میں ایسا اختلاف سامنے آیا کہ مختلف لوگ اپنی اپنی قرأت کو درست اور دوسروں کی قرأت کو غلط قرار دیتے جس کے نتیجہ میں باہم ہاتھا پائی کی نوبت آ جاتی۔ جب یہ صورت حال خلیفہ سوم کے نوٹس میں لائی گئی اور اس کی وجہ یہ سامنے آئی کہ لوگ قرآن کو اس کی اصل زبان پر نہیں پڑھتے بلکہ علاقائی تلفظ اختیار کرتے ہیں تو انہوں نے تین قرشی زبان آوروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی اور ان کو حکم دیا کہ قرآن چونکہ قریش کی زبان پر نازل ہوا ہے لہٰذا اسی زبان پر زید بن ثابتؓ سے لکھوایا جائے۔ زید نے کتابت کی اور مصحف کی کچھ نقول اہم مرکزی شہروں میں سرکاری اہتمام سے بھجوا دی گئیں۔ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ صرف انہی نقول سے اپنے استعمال کے لیے مصحف تیار کریں اور قرآن کو صرف قریش کی زبان میں پڑھیں۔ چنانچہ اس خدمت پر حضرت عثمانؓ کو جامع القرآن کا لقب دیا جاتا ہے [1]۔

یہ روایت بھی لاکھوں صحابہ میں سے صرف حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں اور ان سے واحد شخص ابن شہاب زہری اسے قبول کر کے آگے پھیلاتے ہیں۔ کوئی دوسرا صحابی یا تابعی اس عظیم الشان کارروائی کو بیان نہیں کرتا۔ اگر یہ روایت صحیح تسلیم کی جائے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت سے پہلے کسی کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ ایک آیت اِنَّمَا یَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِکَ (ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان پر نازل کر کے نہایت موزوں بنا دیا ہے) بھی نازل ہو چکی ہے جس کے مطابق قریش کی زبان ہی قرآن کے معاملہ میں واحد قابل قبول زبان ہے اور اسی پر لوگ قرآن کو سیکھتے اور سکھاتے رہے۔ یہ زبان عربوں کے نزدیک بھی نہایت پسندیدہ اور معیاری زبان تھی جس میں قرآن پڑھنے پر ان کو کوئی تکلف نہیں تھا۔ پھر حضرت عثمانؓ کے جامع القرآن ہونے کی صورت میں آیت اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ (بلاشبہ اس کو جمع کرنے کی ذمہ داری ہم پر ہے) کے وعدہ کی کیا حیثیت رہی جس کے مطابق جامع القرآن خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے بطور امیر المومنین قرآن مجید کی نقول تیار کروا کے مختلف شہروں میں ارسال کیں تو اس واقعہ کو ابن شہاب زہری نے ایک افسانہ کا رنگ دے دیا تاکہ حضرت ابوبکرؓ کے جمع قرآن کے موہوم واقعہ کو تقویت پہنچائی جائے اور اس طرح قرآن مجید کی محفوظیت کو مشکوک قرار دیا جائے۔

قرآن کی قرءات:

جہاں تک قرآن مجید کی مختلف قراءتوں کا تعلق ہے وہ سب بعد کے دور کی چیز ہیں۔ تمام معروف قراء کا تعلق دوسری یا تیسری صدی ہجری سے ہے جبکہ قرآن ایک ہی قرأت پر رسول اللہؐ کے زمانہ سے پڑھا جا رہا تھا۔ عملاً ان قراءتوں کو امت نے عام نہیں ہونے دیا اور یہ کتابوں کے اندر بند ہو کر رہ گئیں یا کبھی کبھار کسی قاری نے اپنی دھاک بٹھانے کے لیے ان کو کسی مجلس میں پڑھ دیا اور لوگوں سے داد وصول کر لی۔ امت کا اتفاق اور اجماع ایک ہی قرأت پر رہا جو عامۃ الناس کی قرأت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ہمیشہ اسی قرأت پر لکھا گیا۔ قرآن کے قدیم ترین نسخ جو عجائب گھروں کی زینت ہیں اسی عام قرأت پر لکھے گئے ہیں۔ تیرہ سو برسوں تک کسی نے کسی دوسری قرأت پر قرآن شائع کرنے کی جسارت نہیں کی۔ مسلمانوں کے دور انحطاط میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں مصر میں ورش عن نافع کی قرأت پر قرآن شائع کیا گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی سوڈان میں ۱۹۷۸ء میں الدوری عن ابی عمرو اور ۱۹۸۱ء میں تیونس میں قالون عن نافع کی قراءات پر قرآن شائع ہوئے۔ یہ قرأتیں شمالی اور مغربی افریقہ کے بعض حصوں میں رائج ہیں۔ باقی تمام اسلامی دنیا کا قرآن وہی ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

قراء نے دوسری قرأتوں کو مقبول بنانے کی خاطر من گھڑت باتیں مشہور کر رکھی ہیں تاکہ امت اس کڑوی گولی کو نگل لے لیکن ان کو اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ان قراءات کو سچ تسلیم کر لیا جائے تو آدمی قرآن میں تحریف کا مرتکب تو فی الفور ہو جاتا ہے اور عملاً اللہ تعالیٰ کے وعدہ حفاظت پر سے اس کا ایمان اٹھ جاتا ہے۔ یہ بات بالکل غلط طور پر مشہور کر دی گئی ہے کہ ان قراءتوں سے کوئی معنوی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ان پر خالی الذہن ہو کر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے قرآن کے متن میں اضافے کر دیے ہیں۔ بعض نے حرکتوں کو تبدیل کر کے معانی تبدیل کر دیے ہیں۔ چونکہ آغاز میں متن پر نقطے اور حرکات نہیں تھیں تو بعض لوگوں نے، معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ پر طبع آزمائی کر کے تمام ممکنہ شکلیں وضع کر دیں اور ان کو قراءات کا نام دے دیا۔

قراءات کی تعداد لامحدود ہے۔ لوگوں نے بڑی کوششوں سے تعداد کو چودہ، دس یا سات تک محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کو اگر دین کا حصہ مان لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حفاظت قرآن دھرا کا دھرا رہ گیا اور یار لوگوں نے قرآن میں تحریف کر ڈالی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی قرأت ایک ہی ہے جس کو

امت مسلمہ کے عظیم حصہ نے قبول کیا ہوا ہے اور خود نبی ﷺ نے اس قراءت کو رائج فرمایا، اسی پر قرآن لکھوایا اور اپنی زندگی میں محفوظ کر دیا۔ امت مسلمہ نے پہلے دن سے اس قراءت کی حفاظت کی ہے اور اس کو باقی رکھا ہے۔ کروڑوں انسانوں نے اسی پر قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ کیا اور تحریف کی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔

حوالہ جات

۱۔ صحیح مسلم۔ کتاب الفضائل۔ باب ذکر کونہ خاتم النبیین۔ ج ۲، ص ۲۱۵
۲۔ جامع ترمذی۔ ابواب الرویا۔ باب ۲
۳۔ الاتقان فی علوم القرآن۔ السیوطی۔ مکتبہ مصطفیٰ البابی الحلبی ۱۹۵۱۔ ج ۱، ص ۵۷
۴۔ مشکوٰۃ۔ باب فضائل القرآن۔ ص ۱۸۰
۵۔ صحیح مسلم۔ باب النہی ان یسافر بالمصحف الی ارض الکفار۔ ج ۲، ص ۱۳۳
۶۔ صحیح بخاری۔ باب جمع القرآن۔ حدیث رقم ۴۹۸۶
۷۔ ایضاً، حدیث رقم ۴۹۸۷

باب 45

حجۃ الوداع ۱۰ھ

ہجرت کے دسویں سال کے رمضان المبارک میں رسول اللہ ﷺ کو قرآن مجید اس کی حتمی ترتیب پر مکمل کر کے جبریل امینؑ نے سنا دیا اور اس ترتیب پر اس ماہ دو مرتبہ حضورؐ نے جبریلؑ کو سنایا۔ یہ تکمیل دین کی طرف اشارہ تھا جس سے حضورؐ کو اندازہ ہو گیا کہ آپ کا مشن اب پورا ہونے والا ہے۔

غزوہ تبوک کے بعد پورے ملک عرب میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا اور مدینہ منورہ میں قبائل عرب کے وفود کا تانتا بندھ گیا۔ یہ وہ علامت تھی جس سے آپ نے پہچان لیا کہ اب حیات جاوداں کی طرف رخصت کا مرحلہ قریب ہے۔ حضورؐ کو ہدایت کی گئی تھی کہ:

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِي دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا. فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ. اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا. (النصر ۱۱۰:۱-۳)

جب اللہ کی نصرت آ جائے اور (مکہ) فتح ہو جائے اور تم دیکھو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرنا اور اس سے مغفرت طلب کرنا۔ بلاشبہ وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

چونکہ قبائل عرب کے اکثر لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے ان سے خطاب کرنے کے لیے اسی سال حج کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے قبائل میں اعلان عام کروایا کہ آپ اس سال حج ادا کرنے کے لیے مکہ جا رہے ہیں، لہٰذا زیادہ سے زیادہ مسلمان اس عبادت میں شریک ہوں۔ مشرکین کو اس سال حج پر آنے اور اپنے طریقہ سے حج کرنے کی ایک برس قبل ہی ممانعت کر دی گئی تھی۔

اعلان ہوتے ہی ہزاروں مسلمانوں نے حج کا ارادہ کر لیا۔ ایک کثیر تعداد نے حضورؐ کی روانگی سے قبل

پیدل یا سوار ہو کر مدینہ کا رخ کیا تا کہ آپ کی ہمراہی میں وہ حج کی سعادت حاصل کریں۔ حضورؐ نے اس حج کو مناسک کی تعلیم کا ذریعہ بنایا اور لوگوں کے سامنے ہر عمل کا خود مظاہرہ فرمایا۔ روانگی سے قبل آپ نے مسلمانوں کو حرم مکہ کی میقاتوں کے بارے میں احکام دیے تاکہ لوگ آئندہ ان مقامات سے احرام باندھیں اور لبیک کا ورد شروع کریں۔

حج کے لیے روانگی اور مناسک حج کی ادائیگی:

ذوالقعدہ کے پانچ دن باقی تھے کہ حضورؐ تیار ہو کر مسلمانوں کے ایک جم غفیر کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور ذوالحلیفہ (جس کو آج کل 'ابیار علی' کا نام دیا گیا ہے) میں جا کر احرام باندھا، منیٰ میں قربانی کرنے کے لیے ہدی کے جانور ساتھ لیے اور حج کی نیت کر کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ۴ ذوالحجہ کو مکہ پہنچے اور طواف وسعی کی لیکن احرام نہیں کھولا۔ البتہ ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ عمرہ ادا کریں اور احرام کھول دیں۔ دوبارہ احرام حج کی نیت سے اس وقت باندھیں جب منیٰ کو روانگی کا دن آئے۔ اپنے بارے میں حضورؐ نے وضاحت فرمائی کہ میں ہدی کے جانور ساتھ لایا ہوں، اس لیے جب تک ان کی قربانی کا وقت نہ آئے، میں احرام نہیں کھول سکتا۔ دوسرے لوگ اپنے حج کو حج تمتع قرار دیں لہذا عمرہ کے مناسک ادا کر کے احرام کھول لیں۔

۸ ذوالحجہ کو آپ منیٰ گئے اور اگلے دن طلوع آفتاب کے بعد عرفات کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں آپ کے لیے اس جگہ خیمہ نصب کیا گیا جہاں اب مسجد نمرہ ہے۔ آپ نے اس خیمہ میں آرام فرمایا۔ سورج ڈھلنے کے بعد آپ میدان میں نکلے۔ آپ اونٹنی پر سوار تھے۔ لوگوں کو جمع کیا گیا اور حضورؐ نے نہایت فصیح و بلیغ خطبہ حج ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں آپ نے رسالت کے مشن کی تکمیل کی اطلاع دی، بعض اہم موضوعات پر اسلام کے احکام بتائے، کمزوروں کے حقوق ادا کرنے پر خاص طور پر توجہ دینے کی ہدایت کی، حج کو شمسی تقویم کے مطابق ادا کرنے کے لیے نسی کی جو بدعت رائج تھی اس کو ممنوع قرار دیا اور عامۃ المسلمین سے اس بات کی شہادت لی کہ آپ نے اپنا حق بلاغ پوری طرح ادا کر دیا۔ پورے مجمع نے یک زبان ہو کر یہ شہادت دی اور آپ نے فرمایا اے اللہ! اس پر گواہ رہنا۔

خطبہ حج:

اس حج میں ایک لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی، اتنے بڑے مجمع تک آواز نہیں پہنچ سکتی تھی، لہذا آپ نے

ربیعہ بن امیہ بن خلفؓ کو کچھ فاصلہ پر کھڑا کیا۔ آپ جو کچھ فرماتے ربیعہ اس کو بلند آواز سے لوگوں کے سامنے دہراتے۔ حضورؐ کا مکمل خطبہ اس وقت قلمبند نہیں ہوا۔ اس کے مختلف حصے لوگوں کے حافظہ میں محفوظ رہ گئے اور انہی کی روایت سے وہ کتب حدیث میں نقل ہوئے ہیں۔ ان روایات کو جمع کر کے خطبہ کے بنیادی نکات اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

سب سے پہلے رسول اللہؐ نے لوگوں کو خاموشی سے خطبہ سننے کی ہدایت فرمائی اور بتایا کہ اس مقام پر شاید یہ میرا آخری خطاب ہو:

> ''اے لوگو! میری بات غور سے سنو کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ اس سال کے بعد اس مقام پر تم سے کبھی مل سکوں گا''۔

جان و مال کا تحفظ:

جب لوگ خاموش ہو کر متوجہ ہو گئے تو آپ نے مجمع سے سوال کیا کہ یہ کون سا مہینہ ہے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ ذوالحجہ کا محترم مہینہ ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا:

> ''اللہ نے تم پر تمہاری جانیں اور تمہارے مال، اس مہینہ کی حرمت کی مانند، حرام کر دیے ہیں، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو''۔

آپ نے پھر سوال کیا کہ آج کونسا دن ہے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ حج اکبر کا دن ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا:

> ''اللہ نے تم پر تمہاری جانیں اور تمہارے مال، اس دن کی حرمت کی مانند، حرام کر دیے ہیں، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو''۔

آپ نے پھر مجمع سے پوچھا کہ یہ شہر کون سا ہے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ مکہ کا محترم شہر ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا:

> ''اللہ نے تم پر تمہاری جانیں اور تمہارے مال، اس شہر کی حرمت کی مانند، حرام کر دیے ہیں، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو۔ تم جلد ہی اپنے پروردگار سے ملنے والے ہو تو وہ تمہارے اعمال کی بابت تم سے سوال کرے گا۔ میں نے یہ بات تم تک اچھی طرح پہنچادی''۔

> ''جاہلیت کے زمانہ کے خون کے تمام دعوے ختم کیے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے میں

اپنے قرابت دار ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کے خون کو معاف کرنے سے ابتدا کرتا ہوں۔ آئندہ قتل عمد کا قصاص لیا جائے گا، اور قتل عمد کے مشابہ قتل جو لاٹھی یا پتھر کی ضرب سے واقع ہو جائے تو اس کے لیے دیت کے طور پر ایک سو اونٹ ادا کرنے ہوں گے۔ جس نے اس سے زیادہ کا مطالبہ کیا تو وہ اہل جاہلیت میں سے ہے"۔

"جس شخص کے پاس کوئی امانت ہو تو وہ اس کے حق دار کو ادا کرے جس نے اس کو امین بنایا۔ اور تمام سود ختم کر دیا گیا۔ البتہ تم اپنے اصل زر کے حقدار ہو۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو نہ تمہاری حق تلفی کی جائے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ سود کا چلن اب نہیں ہوگا۔ لہٰذا میں سب سے پہلے عباس بن عبدالمطلب کا تمام تر سود کالعدم کرتا ہوں"۔

بیویوں کے حقوق:

"اے لوگو! تمہاری بیویوں پر ایک حق تمہارا ہے اور تم پر ایک حق اپنی بیویوں کا۔ ان پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو کسی سے پامال نہ کرائیں جو تمہیں ناگوار ہے۔ ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب نہ کریں۔ اگر وہ ایسا کریں تو اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے کہ انہیں خواب گاہوں میں اپنے سے الگ کر دو اور تم ان کو ایسی بدنی سزا بھی دے سکتے ہو جو بدن پر نشان نہ چھوڑے۔ تب اگر وہ باز رہیں تو ان کو دستور کے مطابق کھانے اور پہناوے کا حق حاصل ہے"۔

"میری یہ وصیت گرہ کر لو کہ بیویوں کے ساتھ بھلائی کا رویہ اختیار کرو کیونکہ وہ تمہارے زیر نگیں رکھی گئی ہیں۔ وہ اپنے لیے خود کچھ نہیں کر سکتیں۔ بلاشبہ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات اللہ کے احکام کے تحت حلال کیے ہیں"۔

غلاموں سے حسن سلوک:

"دیکھو، غلاموں کا خیال رکھو! اپنے غلاموں کو توجہ دو۔ ان کو اسی کھانے میں سے کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور ویسا ہی لباس دو جیسا کہ خود پہنتے ہو۔ لوگو! میری بات کو اچھی طرح سمجھ لو کیونکہ

میں نے پیغام پہنچا دیا''۔

کتاب و سنت:

''اے لوگو: شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا کہ تمہاری اس سرزمین میں آئندہ کبھی اس کی عبادت کی جائے گی۔ لیکن وہ اس بات پر بھی قانع ہو چکا ہے کہ عبادت کے سوا تم جن اعمال کو حقیر سمجھتے ہو انہی میں اس کی اطاعت کی جائے۔ لہٰذا اپنے دین کے معاملہ میں چوکنے رہنا۔ میں تمہارے درمیان ایک واضح چیز چھوڑ رہا ہوں۔ اس کو اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ یہ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت ہے۔ اے لوگو! میری بات غور سے سنو اور خوب اچھی طرح سمجھ لو''۔

مساوات انسانی:

''لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تم سب کا باپ ایک ہے۔ تم سب آدم سے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے۔ اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر، یا کسی عجمی کو عربی پر، یا کسی گورے کو کالے پر، یا کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ تقویٰ کی بنا پر ایک دوسرے سے برتر ہو۔ جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ پس کسی شخص کے لیے اپنے بھائی کی کوئی چیز لینا روا نہیں الا یہ کہ وہ اپنی دلی رضامندی سے اسے دے دے۔ پس باہم دگر ہرگز حق تلفی نہ کرنا۔ میرے بعد کفر کی روش کی طرف نہ پلٹ جانا کہ تم میں سے کچھ لوگ دوسروں کی گردنیں مارنے لگیں''۔

''اے لوگو! اللہ نے ہر وارث کا حصہ میراث میں مقرر کر دیا ہے۔ مال میں وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ کرنا جائز نہیں۔ اولاد جس کے بستر پر پیدا ہوئی اس کی کہلائے گی اور بدکار کے لیے محرومی ہے۔ جس کسی نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے سوا کسی اور سے منسوب کیا یا کسی غلام نے آزاد کرنے والے کے سوا کسی اور سے تعلق جوڑا تو اس پر اللہ، اسکے فرشتوں اور تمام

انسانوں کی لعنت ہے۔قیامت کے دن اس جرم کا کوئی فدیہ یا بدل قبول نہیں کیا جائے گا''۔

''اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں اور نہ تمہارے بعد کوئی اور امت آئے گی۔ خبردار رہو، اپنے رب کی عبادت کرو، پانچ نمازیں ادا کرو، ماہ رمضان کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوٰۃ خوش دلی کے ساتھ دو، اپنے رب کے گھر کا حج کرو اور اپنے سربراہوں کی اطاعت کرو۔تم اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے''۔

نسی کی ممانعت:

''اے لوگو! نسی کا طریقہ کفر میں مزید اضافہ ہے جس کے باعث کافر گمراہ کیے جاتے ہیں۔ وہ ایک سال اضافی مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام ٹھہرا دیتے ہیں تاکہ اس طرح مہینوں کی اس تعداد کو پورا کر دیں جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا۔ پس اس کے نتیجہ میں وہ اللہ کے حرام ٹھہرائے ہوئے کو حلال اور حلال ٹھہرائے ہوئے کو حرام کر دیں۔ آج وقت گھوم پھر کر اسی شکل کو اختیار کر چکا ہے جیسا کہ اس دن تھا جب اللہ نے زمین و آسمان بنائے۔ بے شک مہینوں کی تعداد اللہ کے ہاں بارہ ہے۔ ان میں سے چار محترم ٹھہرائے گئے ہیں۔ تین تو مسلسل ہیں (یعنی ذی القعدہ، ذوالحجہ اور محرم) اور چوتھا قبیلہ مضر کا رجب ہے جو جمادی الاخری اور شعبان کے درمیان پڑتا ہے''۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کہا 'اے میرے رب، کیا میں نے پیغام پہنچا نہیں دیا'؟ اس پر مجمع سے آواز آئی ''ہاں، اے اللہ، آپ نے پیغام پہنچا دیا''۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے کہا 'اے اللہ، تو خود گواہ رہ!' پھر آپ نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا: تم لوگوں سے میرے بارے میں سوال کیا جائے گا تو اس کا کیا جواب دو گے۔ لوگوں نے جواب دیا 'ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے پیغام پہنچانے کا حق ادا کر دیا، امت کی خیر خواہی کی، تاریکی کا پردہ چاک کر دیا اور امانت اس طرح ادا کی جیسا کہ اس کے ادا کرنے کا حق تھا'۔ اس پر آپ نے فرمایا 'اے اللہ! گواہ رہیو، اے اللہ! گواہ رہیو، اے اللہ! گواہ رہیو'۔

اس کے بعد آپ نے تلقین فرمائی کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ ساری باتیں ان لوگوں تک پہنچا دیں جو

یہاں حاضر نہیں ہیں۔

بعض وضاحتیں:

حضورؐ کے خطاب میں کچھ باتیں وضاحت طلب ہیں:

آپ کا مجمع سے پوچھنا کہ یہ دن، مہینہ اور شہر کون سا ہے، ان کی پوری توجہ خطبہ پر مرکوز کرنے کے لیے تھا۔ دوسرے یہ بات بھی تھی کہ زمانہ جاہلیت میں بھی یوم عرفہ، حرم مکہ اور شہر حرام کا تقدس ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ ان کی حرمت کو بٹہ لگانا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا۔ چنانچہ حضورؐ نے دوسروں کے مال و جان کے تقدس کو ایام حج اور خانہ کعبہ کے تقدس کے مشابہ ٹھہرایا۔

حضورؐ نے ربیعہ بن الحارث کے قتل کو معاف فرما دیا۔ یہ قتل زمانہ جاہلیت میں ہوا۔ جب ربیعہ کو دودھ پلوانے کے لیے بنولیث میں بھیجا گیا تو ہذیل نے اس بچے کو قتل کر ڈالا۔ یہ قتل بنو ہاشم میں ابھی تک فیصلہ طلب تھا۔ اسی طرح عباس بن عبدالمطلبؓ کا مکہ میں سودی کاروبار وسیع پیمانہ پر چلتا تھا۔ آپؐ نے اس کو سب سے پہلے ختم کر کے سود کے خاتمہ کے لیے پہلی مثال قائم فرمائی۔

نسی قریش کی رائج کردہ بدعات میں سے ایک تھی۔ وہ ہر آٹھ سالوں میں تین ماہ کا اضافہ کر کے قمری مہینوں کو شمسی مہینوں میں لے آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حج ہمیشہ ایک ہی خوشگوار موسم میں آتا۔ لیکن دوسری طرف حرمت والے مہینے اپنی جگہوں سے ٹل جاتے۔ اس طرح حلال کو حرام میں اور حرام کو حلال میں تبدیل کر دیا جاتا۔ مہینوں کا یہ چکر ۳۲ سالوں کے بعد ٹھیک رسول اللہؐ کے حج کے موقع پر پورا ہو گیا اور ۱۰ ہجری کا یہ حج اس وقت ہوا جب ذوالحجہ حقیقی ذوالحجہ تھا۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا کہ وقت گھوم پھر کر اب پھر اپنی اصل پر لوٹ چکا ہے۔ آئندہ سے نسی کا قاعدہ کالعدم کیا جائے گا اور حج قمری تقویم کے مطابق ہوا کرے گا۔

خطبہ سے فارغ ہو کر آپ نے بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا اور ظہر اور عصر کی نمازیں الگ الگ اقامت کے ساتھ ایک ہی وقت میں جمع کر کے پڑھائیں۔ پھر آپ جبل رحمت کے پاس تشریف لے گئے اور وہاں چٹانوں پر وقوف کیا یہاں تک کہ سورج غروب ہونے لگا۔ غروب آفتاب کے فوراً بعد آپ مزدلفہ کے لیے روانہ ہوئے۔ لوگ آپ کی اونٹنی کے ساتھ بھاگتے تو آپ ان کو سکون سے چلنے کی ہدایت فرماتے۔ مزدلفہ پہنچ کر آپ نے مغرب

اور عشا کی نمازیں الگ الگ اقامت کے ساتھ اکٹھے پڑھائیں اور فجر تک مکمل آرام فرمایا۔ فجر کی نماز کے بعد آپ نے مشعر حرام کے پاس پہاڑی پر وقوف فرمایا یہاں تک کہ روشنی پھیل گئی۔ اب آپ منیٰ کو روانہ ہوئے۔ رمی جمرہ کے بعد آپ نے ہدی کے 63 اونٹ اپنے ہاتھوں سے ذبح کیے اور باقی جانور حضرت علیؓ کے سپرد کر دیے کہ وہ ان کو ذبح کریں۔ منیٰ کے قیام کے دوران حضورؐ نے لوگوں کو مناسک حج سیکھنے کا موقع فراہم کیا اور بکثرت لوگوں کے سوالوں کے جواب دیے۔ حج کے ارکان اور دوسرے مناسک ادا کرنے کے بعد آپ مدینہ منورہ کو لوٹ گئے۔

باب 46

بلند و برتر رفاقت کی جانب سفر

ماہ صفر ۱۱ ہجری کے کچھ دن باقی تھے کہ ایک شب میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام ابومویہبہ کو آدھی رات کے وقت نیند سے بیدار کیا اور فرمایا کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں اس وقت مدینہ کے قبرستان بقیع میں جا کر ان اہل ایمان کے لیے مغفرت کی دعا کروں جو اپنے رب کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ ابومویہبہ! تم بھی میرے ساتھ چلو۔ حضورؐ قبرستان گئے اور اہل قبور کے لیے استغفار کرتے رہے۔ آپ واپس گھر تشریف لائے تو سر میں درد ہونے لگا۔ آپ اس درد کے ساتھ اپنے تمام فرائض ادا فرماتے رہے اور قیام کے لیے ازواج کی باری کا بھی اہتمام فرماتے رہے۔ سر درد بدستور جاری رہا اور اس کے ساتھ بخار ہونے لگا۔ جس روز آپ ام المومنین میمونہؓ کے ہاں مقیم تھے تو درد میں شدت آ گئی اور بخار تیز ہو گیا۔ آپ نے تمام ازواج مطہرات کو طلب فرمایا اور بتایا کہ مرض شدت اختیار کر گیا ہے۔ اگر ازواج اجازت دیں تو میں بیماری کے ایام عائشہؓ کے ہاں گزار لوں۔ سب نے بخوشی اجازت دے دی تو آپ دو آدمیوں کا سہارا لے کر ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے حجرہ میں منتقل ہو گئے۔

دنیا چھوڑنے کا انتخاب:

اسی تکلیف میں آپ مسجد تشریف لے گئے اور منبر پر بیٹھ کر غزوہ احد کے شہدا کے لیے مغفرت کی دعا کی اور بڑی دیر تک ان کے لیے رحمت خداوندی طلب کرتے رہے۔ پھر سامعین کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو اختیار دیا کہ وہ دنیا میں رہے یا ان نعمتوں میں چلا جائے جو اللہ کے پاس ہیں تو اس بندے نے اللہ کے ہاں جانے کا انتخاب کیا۔ یہ سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ رونے لگے، وہ سمجھ گئے کہ بندے سے مراد خود حضور ﷺ کی ذات ہے اور اب آپ عنقریب اس دار فانی سے رخصت ہونے والے ہیں۔ پھر آپ نے ہدایت فرمائی کہ مسجد کی جانب لوگوں کے گھروں کے جو دروازے کھلتے ہیں وہ سب بند کر دیے جائیں مگر ابوبکر کا دروازہ بند نہ کیا جائے کیونکہ میں ان سے افضل کسی صحابی کو نہیں پاتا۔ میں اگر کسی کو جگری دوست بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن میرا تعلق ان سے مصاحبت کا اور

ایمانی بھائی چارے کا ہے۔ یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اللہ ہمیں اپنے ہاں جمع نہیں کر لیتا۔

آخری جنگی مہم کا انتظام:

بیماری کے آغاز سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ کی آخری جنگی مہم کا انتظام کر دیا تھا۔ آپ نے ایک لشکر تیار کر کے اس پر اسامہ بن زیدؓ کو کمانڈر مقرر فرمایا۔ ان کو حکم تھا کہ وہ اس علاقہ میں جائیں جہاں جنگ موتہ لڑی گئی تھی اور جس میں اسامہؓ کے والد زید بن حارثہؓ امیر لشکر تھے۔ اس جنگ میں زیدؓ، عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت جعفر بن ابی طالبؓ تین کمانڈر شہید ہو گئے تھے۔ اسامہؓ کو فلسطین کے قریب بلقاء کے علاقہ پر حملہ کرنا تھا۔ ان کی ماتحتی میں تجربہ کار اور بزرگ انصار و مہاجرین کی ایک بڑی تعداد تھی۔ ابھی لشکر کی تیاری کا مرحلہ تھا کہ حضورؐ بیمار ہو گئے تو قدرتی طور پر لشکر کی تیاری میں بھی دھیما پن آ گیا۔ اس دوران میں بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ تجربہ کار اور عمر رسیدہ صحابہ پر اسامہ جیسے کم عمر نوجوان کا بطور امیر تقرر مناسب نہیں۔ یہ بات حضورؐ کے علم میں آئی تو آپ مسجد میں سر درد کے باعث سر پر پٹی باندھے ہوئے تشریف لائے اور خطبہ دیا کہ اسامہ کی امارت پر کچھ لوگوں کا اعتراض میرے علم میں آیا ہے۔ لیکن اسامہ کو جانے دو۔ میری جان کی قسم، تم لوگوں نے اس سے پہلے اسامہ کے باپ کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا حالانکہ وہ بلاشبہ اس کے اہل تھے۔ اسامہ بھی اس ذمہ داری کا اہل ہے۔ یہ خطبہ سنتے ہی لوگ تیزی سے مہم پر جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ اسامہ نے حکم دیا کہ لشکر مدینہ سے چند میل کے فاصلہ پر مقام جرف میں جمع ہو۔ وہ خود بھی جرف میں پہنچ گئے لیکن مدینہ کے حالات جاننے کے لیے رابطہ قائم رکھا۔

لشکر تیار ہو گیا۔ ادھر رسول اللہ ﷺ کی بیماری میں مزید شدت آ گئی۔ اسامہ نے انتظار کا فیصلہ کیا کہ حضورؐ کی بیماری کیا رخ اختیار کرتی ہے۔

شدت مرض میں حق نصیحت:

شدت مرض میں حضورؐ کے لیے مسجد کی ذمہ داریاں نبھانا مشکل ہو گیا تو آپ نے حکم دیا کہ ابو بکرؓ کو کہو، وہ میری جگہ نمازوں کی امامت کریں۔ حضرت عائشہؓ نے رائے دی کہ ابو بکرؓ ایک رقیق القلب آدمی ہیں وہ آپ کے مصلے پر کھڑے نہیں ہو پائیں گے۔ ان کی آواز میں بھی ضعف ہے۔ قرآن پڑھتے ہوئے شدت تاثر سے رونے لگتے ہیں۔ لہٰذا ان کی بجائے کسی اور کو امامت کرانے کا حکم دیا جائے۔ حضورؐ نے اس مشورہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور مصر رہے کہ ابو بکر ہی یہ ذمہ داری ادا کریں۔ چنانچہ اس کے بعد امامت کا فریضہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ادا کیا۔

بیماری کی شدت میں بھی حضورؐ اہل ایمان کا حق نصیحت ادا فرماتے اور ہدایات دیتے رہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ بار بار یہ بات فرماتے کہ اللہ اس قوم کو غارت کرے جس نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔ اسی طرح آپ نے ہدایت دی کہ جزیرہ عرب میں دو دین نہ رہنے دیے جائیں۔ یہ بات بھی آپ نے بار بار بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہر نبی کو اس کی وفات سے پہلے اختیار دیتا ہے کہ اگر وہ مزید زندگی چاہتا ہے تو وہ اس کا انتخاب کر سکتا ہے۔

آخری تحریر لکھوانے کی روایات:

رسول اللہ ﷺ کے مرض الموت کے بارے میں بعض ایسی روایتیں بھی نقل ہوئی ہیں جن کے مطابق حضورؐ نے امت کے لیے کوئی تحریر لکھوانے کا عندیہ دیا لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا۔ مثلاً سعید بن جبیر راوی ہیں کہ ابن عباسؓ کہا کرتے 'ہائے جمعرات کا دن۔ یہ دن بھی کتنے غضب کا تھا'۔ یہ کہہ کر روتے یہاں تک کہ آنسوؤں سے کنکریاں تر ہو جاتیں۔ سعید کہتے ہیں میں نے پوچھا 'اے ابن عباس! یہ جمعرات کا دن کون سا تھا'۔ کہنے لگے 'اس دن رسول اللہ کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو آپ نے حکم دیا کہ سامان لاؤ کہ میں تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے۔ اس پر موجود لوگوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا، حالانکہ نبی کے پاس اظہار اختلاف مناسب نہیں ہوتا، لوگوں نے کہا 'آپ کی کیفیت تو دیکھو، بحران کی ہے۔ آپ سے بات سمجھ لو'۔ اس پر آپ نے فرمایا 'مجھے چھوڑ دو، میں جس حال میں ہوں اچھا ہوں۔ میں تم کو تین چیزوں کی وصیت کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دینا، دوسری یہ کہ میں جس طرح وفود کی پذیرائی کرتا رہا ہوں تم بھی کرتے رہنا۔ تیسری بات پر ابن عباسؓ خاموش ہو گئے یا اگر انہوں نے وہ بات بتائی تو میں بھول گیا[1]۔

اس بارے میں دوسری روایت زہری سے ہے۔ اس میں ابن عباسؓ یوں بیان کرتے ہیں کہ جب حضور کا وقت آخر آیا تو گھر میں کچھ لوگ جمع تھے جن میں عمر بن الخطابؓ بھی تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا 'سامان لاؤ، میں تمہیں ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے'۔ عمرؓ نے کہا 'اس وقت رسول اللہؐ پر بیماری کی شدت ہے۔ تمہارے پاس قرآن موجود ہے تو اللہ کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے'۔ اس پر لوگوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور وہ تکرار کرنے لگے۔ ان میں سے بعض یہ کہتے تھے کہ چیزیں لا دو، رسول اللہؐ تحریر لکھوا دیں گے جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے۔ دوسرے لوگ عمرؓ کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ جب بحث اور شور زیادہ ہو گیا تو حضورؐ نے حکم دیا 'تم لوگ اٹھ جاؤ'۔ ایک راوی عبید اللہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ کہا کرتے تھے کہ یہ کتنی بڑی آفت تھی جو رسول اللہؐ اور اس تحریر کے

درمیان حائل ہوگئی اور اس کا سبب لوگوں کی تکرار اور شور تھا[1]۔

یہ وہ روایتیں ہیں جن کی بنا پر شیعہ حضرات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضورؐ حضرت علیؓ کے حق میں خلافت کا حکم لکھوانا چاہتے تھے لیکن موقع پر موجود لوگوں نے، جن میں عمر بن الخطابؓ پیش پیش تھے، لکھنے کا سامان مہیا نہ کیا اور اس طرح یہ اہم تحریر لکھنے سے رہ گئی۔

مذکورہ دونوں روایتوں پر غور کیا جائے تو اگرچہ یہ ایک ہی موقع کے بارے میں خبر دیتی ہیں لیکن ان میں کوئی چیز مشترک نہیں، اگر کچھ مشترک ہے تو وہ ابن عباسؓ کا ایک ذاتی تاثر ہے۔

پہلی روایت سے حضرت عمرؓ کی موجودگی ثابت نہیں ہوتی، لیکن زہری کی روایت میں ان کا نام بطور خاص لیا گیا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس آفت کا ذمہ دار ٹھہرانا مقصود ہے جو رسول اللہؐ کی تحریر میں رکاوٹ بنی۔

جہاں تک تحریر کے اس مقصد کا تعلق ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے تم کبھی گمراہ نہ ہو گے، یہ ایک ناممکن الحصول مقصد ہے اور اس حقیقت سے آنحضرتؐ بخوبی آگاہ تھے۔ بندوں کی ہدایت اور گمراہی کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ پر واضح کر دیا گیا تھا کہ:

اِنَّکَ لَا تَهْدِی مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِی مَنْ یَّشَاءُ. (القصص ۲۸:۵۶)

جس کو تم پسند کرو اس کو ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ یہ اللہ ہے جو ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔

ہدایت کی کتاب قرآن مجید ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد بندوں کے لیے ہدایت پانا اسی کتاب کے وسیلہ سے ممکن ہے۔ دوسری کوئی تحریر کلام اللہ کے مساوی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہمارے نزدیک حضورؐ ایک ایسی بات نہیں فرما سکتے تھے جو واضح طور پر قرآن کی تعلیم کے خلاف ہو۔ اگر کوئی اتنی ضروری ہدایت آپ نے مرض سے قبل امت تک نہیں پہنچائی جس پر عمل سے لوگ گمراہ ہونے سے بچ سکتے تو یہ فریضۂ رسالت میں کوتاہی کہلائے گی، جبکہ رسول اللہؐ ایسی غلطی سے معصوم تھے۔

جب لکھنے کا سامان حضورؐ کو مہیا نہیں کیا گیا اور درخواست کی گئی کہ آپ زبانی وصیت فرما دیں تو جو دو باتیں آپ نے فرمائیں ان کا تعلق ہدایت اور گمراہی سے نہیں ہے۔ وہ انتظامی ہیں یا ان کا تعلق آداب سے ہے۔ تیسری بات راوی صاحب کے ذہن سے نکل گئی۔ گویا اگر حضورؐ لکھواتے تو اسی طرح کی کوئی تیسری ہدایت بھی ہوتی۔ لہٰذا مقصد تحریر وہ نہ ہوا جس کا ذکر روایت کے الفاظ میں ہوا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ روایت مضطرب تو ہے ہی، اس میں راویوں کی خیال آرائی کو بھی دخل ہے۔

شدت مرض میں اضافہ:

بیماری میں مزید شدت آئی تو حضورؐ پر غشی طاری ہوگئی۔ اسامہؓ کو خبر ہوئی تو وہ مدینہ آئے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے حضورؐ ہوش میں تو آ گئے لیکن ابھی بات کرنے پر قادر نہ تھے۔ آپ نے اسامہؓ کو پہچانا، ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیا اور اسامہ پر پھیرا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ ان کو دعا دے رہے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ تکلیف کی شدت میں حضورؐ بار بار فرماتے **بل الرفیق الاعلیٰ فی الجنة** (نہیں، بلکہ جنت میں بلند و برتر رفیق کی رفاقت چاہیے) چونکہ آپ پہلے یہ بتا چکے تھے کہ نبی کو زندگی یا موت میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ لہٰذا میں نے اس جملہ کو اس بات پر محمول کیا کہ اسی اختیار کا استعمال کرتے ہوئے آپ اہل جنت کی رفاقت کا انتخاب فرما رہے ہیں کہ دنیا میں اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد آپ مزید یہاں رہنے کی خواہش نہیں رکھتے، لہٰذا اب آپ کو اٹھا لیا جائے۔

آخری نماز کی ادائیگی:

۱۲ ربیع الاول کی فجر آپ کی بیماری میں قدرے افاقہ ہوا تو آپ بستر سے اٹھ کر حجرہ کے دروازہ میں کھڑے ہو گئے۔ لوگ ابوبکرؓ کی امامت میں نماز ادا کر رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر مسرت سے آپ کا چہرہ مبارک کھل گیا۔ لوگوں کی توجہ ہوئی تو انہوں نے مسجد میں آپ کے لیے رستہ بنا دیا لیکن آپ نے ہدایت دی کہ وہ اپنی اپنی جگہوں پر قائم رہیں۔ ابوبکر صدیقؓ نے نمازیوں میں ہلچل محسوس کی تو انہیں حضورؐ کی آمد کا اندازہ ہوا اور انہوں نے مصلیٰ آپ کے لیے خالی کرنا چاہا لیکن حضورؐ نے ان کو پیچھے ہٹنے سے روکا اور خود ان کے دائیں جانب بیٹھ کر نماز ادا کی۔ نماز کے بعد آپ کچھ دیر کے لیے نمازیوں کی طرف رخ کر کے بیٹھے اور فرمایا 'دوزخ بھڑکا دی گئی ہے۔ فتنے تاریک رات کی طرح چھا جانے کے لیے بڑھ رہے ہیں۔ جو کچھ قرآن نے حلال کیا میں نے بھی اسی کو حلال بتایا اور قرآن نے جو چیز حرام کر دی میں نے بھی اسی کو حرام کیا ہے'۔

وفات:

نماز کے بعد حضورؐ گھر تشریف لے گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے آپ سے اجازت لی کہ وہ عوالی مدینہ کے محلّہ سنح میں اپنے گھر سے ہو آئیں۔ ان کے جانے کے بعد حضورؐ کی حالت پھر بگڑ گئی۔ اسی اثنا میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ آپ کو دیکھنے آئے۔ ان کے پاس تازہ مسواک تھی۔ حضورؐ بڑے اشتیاق سے اس پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

حضرت عائشہؓ کو احساس ہوا کہ حضورؐ مسواک کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ انہوں نے بھائی سے مسواک لی، اس کو چبا کر نرم کیا اور حضورؐ کو تھما دی۔ آپ نے اچھی طرح مسواک کی۔ اس کے بعد لیٹ گئے۔ بیماری کا پھر سخت حملہ ہوا۔ حضرت عائشہؓ نے محسوس کیا کہ حضورؐ کی نظریں پتھرا گئی ہیں۔ انہوں نے آپ کو سہارا دیا، آپ کی زبان پر بل الرفیق الاعلی فی الجنة کے الفاظ تھے۔ اسی حال میں حضورؐ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ بارہ ربیع الاول کی دوپہر اور پیر کا دن تھا۔

حضور ﷺ کی وفات کی خبر آناً فاناً شہر میں پھیل گئی۔ ابوبکر صدیقؓ فی الفور سخ سے واپس آئے، حجرہ میں گئے، رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک سے کپڑا اٹھایا اور آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان! اللہ نے آپ کے لیے جو ایک موت مقدر کی تھی اس سے آپ دوچار ہو چکے۔ لیکن اب آپ کو کسی دوسری موت کا مزا نہیں چکھنا ہوگا۔

روایات کے مطابق حضرت ابوبکرؓ باہر نکلے تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ فرط جذبات میں ان لوگوں کو سخت سست کہہ رہے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ وفات پا چکے۔ ان کا کہنا تھا کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ چالیس روز کے لیے پہاڑ پر گئے تو بنی اسرائیل کے منافقوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ موسیٰ وفات پا چکے اور اب واپس نہیں آئیں گے، ہمارے لوگ بھی آج اسی طرح کی بات کر رہے ہیں۔ حقیقت میں حضورؐ کی وفات نہیں ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عمرؓ کو روکا لیکن وہ پھر بھی بولے جا رہے تھے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا رہا ہے تو وہ جان لے کہ آپ وفات پا چکے لیکن جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو یاد رکھے کہ اللہ زندہ ہے، وہ مرنے والا نہیں۔ پھر آپ نے لوگوں کو آیت یاد دلائی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ. اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا. (آل عمران ۳:۱۴۴)

محمد تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ وفات پا گئے یا قتل کر دیے گئے تو تم پیٹھ پھیر جاؤ گے۔ جو پیٹھ پھیرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔

لوگوں پر اس خطبہ کا اتنا اثر ہوا کہ انہیں یہ احساس ہوا کہ اس سے پہلے وہ اس آیت کے مضمون سے کبھی آگاہ ہی نہیں ہوئے حالانکہ یہ آیت غزوہ احد کے بعد اتری تھی۔ حضرت عمرؓ اس خطبہ سے دہشت زدہ ہو کر زمین پر بیٹھ گئے۔

جانشین کا انتخاب:

کچھ دیر بعد مسجد میں یہ اطلاع آئی کہ انصار کا ایک گروہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوا ہے۔ وہ اس معاملہ پر بحث کر رہے ہیں کہ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کا سربراہ کون ہوگا۔ انصار کے بااثر سردار سعد بن عبادہؓ بھی سقیفہ میں موجود ہیں۔ یہ خبر بے حد اہم تھی جس سے دین اسلام کا مستقبل وابستہ تھا۔ اس موقع پر کوئی غلط فیصلہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے سقیفہ کا رخ کیا۔ وہاں سعد بن عبادہؓ لیٹے ہوئے تھے اور انصار کے بااثر لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ اس خیال کے حامل تھے کہ اسلام کے لیے اور مسلمانوں کے لیے انصار کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے حضورؐ کی رحلت کے بعد آپ کی خلافت انصار کا حق ہے، اور اس ذمہ داری کے لیے سعد بن عبادہؓ موزوں آدمی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے تقریر کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ فی الواقع انصار کی خدمات بے پناہ ہیں اور اس علاقہ میں ان کا اثر و رسوخ بھی کافی ہے۔ لیکن دین اب پورے ملک عرب میں پھیل چکا ہے اور عرب قبائل قریش کے سوا کسی کی سربراہی کو قبول نہیں کریں گے۔ اس پر انصار کی جانب سے یہ تجویز سامنے آئی کہ مسلمانوں کے دو خلیفہ ہوں۔ ایک انصار میں سے اور دوسرا مہاجرین میں سے۔ اور وہ مل کر مملکت کا انتظام کریں۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کا ارشاد یاد دلایا کہ آپ نے واضح طور پر فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے امام قریش میں سے ہوں۔ یہ سنتے ہی تمام لوگ مطمئن ہو گئے تو آپ نے فرمایا، یہ عمر اور ابوعبیدہ بن الجراح موجود ہیں۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لیجیے۔ یہ امارت کے لیے موزوں ترین اشخاص ہیں۔ حضرت عمرؓ آگے بڑھے اور کہا کہ ابوبکرؓ رسول اللہؐ کے معتمد ترین صحابی اور غار کے ساتھی ہیں۔ انہی کو حضورؐ نے اپنی حیات مبارکہ میں اپنی نیابت کے لیے اور نمازیں پڑھانے کے لیے نامزد فرمایا۔ ان سے بہتر کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ عمرؓ نے یہ کہا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ان کے بعد انصار نے بھی بیعت کی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خلیفۃ الرسول کے طور پر انتخاب ہو گیا۔

حضورؐ کی تدفین کے بعد کچھ لوگوں کی طرف سے کہا گیا کہ حضورؐ نے آخری وقت میں حضرت علیؓ کو اپنا وصی مقرر کیا تھا تو حضرت عائشہؓ نے اس سے اختلاف کیا۔ انہوں نے بتایا کہ آخری وقت تک حضورؐ کا سر مبارک میری گود میں تھا۔ اس مرحلہ میں آپ نے ایک طشت میں پانی ضرور منگوایا لیکن ساتھ ہی آپ کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے۔ اس صورت حال میں آپ نے حضرت علیؓ کے حق میں وصیت کس وقت کر لی!

اسی طرح یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ آپ نے کون سی وصیت چھوڑی ہے۔ جب یہ بات سامنے آئی کہ حضورؐ

نے کوئی وصیت نہیں کی تو کچھ اہل خانہ میں بحث پیدا ہوئی۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے وضاحت کی کہ جب حضورؐ نے درہم و دینار یا بھیڑ بکریاں اور اونٹ ترکہ میں نہیں چھوڑے تو آپ وصیت کس بارے میں کرتے! [۳]

تجہیز و تکفین:

بدھ کے روز حضورؐ کو غسل دے کر کفن پہنایا گیا۔ سوال پیدا ہوا کہ قبر مسجد میں بنائی جائے یا جنت البقیع میں۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کا ارشاد سنایا کہ نبی جس جگہ وفات پاتا ہے اسی جگہ اس کی قبر بنائی جاتی ہے۔ چنانچہ حضورؐ کے بستر کی جگہ ابوطلحہ زید بن سہل نے قبر کھودی۔ حضورؐ کا جسد مبارک کمرے سے باہر نہیں نکالا گیا اس لیے با جماعت نماز جنازہ کی نوبت نہ آئی۔ لوگ ٹکڑیوں کی صورت میں کمرے میں داخل ہوتے اور انفرادی طور پر نماز جنازہ ادا کرتے رہے۔ بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب میں حضورؐ کے چچازاد بھائیوں نے آپ کو لحد میں اتارا اور اس طرح یہ آفتاب عالم تاب جہان والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذو الجَلَالِ وَالاِكْرَام

حوالہ جات

۱۔ صحیح مسلم۔ کتاب الوصیۃ۔ باب ترک الوصیۃ لمن لیس لہ شیء یوصی فیہ۔ ج ۲، ص ۱۵

۲۔ ایضاً، ص ۱۶

۳۔ ایضاً، ص ۱۶

باب 47

امہات المومنینؓ

بعثت سے پندرہ سال قبل رسول اللہؐ کا پہلا نکاح ہوا جو پچیس سال قائم رہا۔ ان ۲۵ سالوں میں آپ نے کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا۔ اس کے بعد کے آٹھ نو سالوں میں دس خواتین آپ کے حبالۂ عقد میں آئیں۔ جب حضورؐ دنیا سے رخصت ہوئے تو نو ازواج بقید حیات تھیں۔ حضورؐ کی ازواج کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ا۔ خدیجہؓ بنت خویلد بن اسد:

قریش کی شاخ بنو اسد سے تعلق رکھنے والی ان زوجہ محترمہ کا نسب پانچویں پشت میں حضورؐ سے جا ملتا ہے۔ ان کے پہلے دو نکاح عتیق بن عائذ بن عبداللہ مخزومی اور ابو ہالہ بن نباس تمیمی سے ہوئے۔ ان دونوں کا انتقال ہو گیا۔ ابو ہالہ کے بچے خدیجہ کی گود میں تھے جب حضورؐ سے ان کا نکاح ہوا۔ سیدہ خدیجہؓ کے ساتھ حضورؐ کی رفاقت ۲۵ برس رہی۔ اس دوران میں آپ نے دوسری شادی کا کبھی سوچا تک نہیں۔ ان کے انتقال سے آپ بے حد مغموم ہوئے۔ بعد میں آپ ان کی تعریف میں کہا کرتے کہ وہ اس وقت ایمان لائیں جب سب لوگ کافر تھے، انہوں نے اس وقت میری تصدیق کی جب سب نے مجھے جھٹلایا، انہوں نے اپنا مال اس وقت مجھ پر قربان کیا جب دوسروں نے مجھے محروم رکھا اور اللہ نے ان سے مجھے اولاد عطا فرمائی۔ فی الواقع مکہ کی کٹھن زندگی میں جب ہر طرف سے حضورؐ کی مخالفت ہو رہی تھی انہی زوجہ محترمہ نے آپ کا غم بٹایا اور ہر طریقہ سے آپ کی مدد کی۔ ان کے بطن سے نبی ﷺ کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بیٹوں کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا جبکہ بیٹیوں کی شادیاں ہوئیں۔ جب رسول اللہؐ نے دنیا سے رحلت فرمائی اس سے قبل آپ کی تین بیٹیاں زینبؓ، رقیہؓ اور ام کلثوم وفات پا چکی تھیں۔ چوتھی بیٹی فاطمہؓ حضورؐ کے بعد صرف چھ ماہ زندہ رہیں۔

۲۔ سودہؓ بنت زمعہ بن قیس:

حضورؐ کی عمر پچاس برس تھی جب آپ نے دوسرا نکاح سودہؓ سے کیا۔ یہ تقریباً آپ کی ہم عمر تھیں۔ یہ قدیم الاسلام صحابیہ تھیں جن کا تعلق قریش کی شاخ عامر بن لوی سے تھا۔ ان کے پہلے شوہر سکرانؓ بن عمرو نے ان کے ہمراہ حبشہ کو ہجرت کی۔ وہاں سے واپس لوٹے تو سکرانؓ کا انتقال ہوگیا۔ خدیجہؓ کے انتقال سے پیدا ہونے والی صورت حال میں گھر کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے حضورؐ نے ان کا انتخاب فرمایا۔ ہجرت کے بعد جب حضورؐ نے مزید نکاح کیے تو عدل وانصاف کی خاطر بیویوں کے پاس قیام کے لیے ان کی باریاں مقرر کردیں۔ سودہؓ نے از رہِ ایثار اپنی باری عائشہ صدیقہؓ کو عطا کردی۔

۳۔ عائشہؓ بنت ابی بکرؓ بن ابی قحافہ:

ان کا تعلق قریش کی شاخ بنو تیم سے ہے۔ ایک ایسے باپ کی بیٹی ہیں جو اسلام سے پہلے بھی اخلاق و کردار میں قریش میں بے حد معزز ومکرم تھے۔ اسلام میں وہ اولین سبقت کرنے والوں میں تو ہیں ہی، وہ دینی خدمات میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہ شخصیت، جس کی احسان مندی کا رسول اللہ ﷺ کو بھی اعتراف تھا، ابوبکر تھے جو آپ کے ہجرت کے ساتھی اور تمام ملی ودینی کاموں میں آپ کے معتمد علیہ مشیر ومعاون تھے۔

خدیجہؓ کے انتقال کے بعد جب گھر کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے آپ کو نکاح ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو دو رشتے تجویز کیے گئے۔ ایک سودہؓ کا اور دوسرا عائشہؓ کا۔ اس وقت عائشہؓ مطعم بن عدی کے بیٹے جبیر کے ساتھ منسوب تھیں، لہٰذا حضورؐ نے سودہؓ سے نکاح کرلیا۔ ابوبکرؓ نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے مطعم بن عدی سے مل کر اس کا عندیہ معلوم کرنا چاہا تو اس نے رشتہ کرنے میں کچھ تحفظات کا اظہار کیا۔ اس پر ابوبکرؓ نے نسبت توڑ دی اور حضورؐ کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کردیا۔ آپ نے اپنے جاں نثار ساتھی کی قدر افزائی کے لیے عائشہ سے نکاح کرلیا لیکن عرب دستور کے مطابق رخصتی موخر کردی۔ اس کی نوبت ہجرت کے بعد مدینہ میں آئی۔ حضورؐ کی ازواج میں یہ واحد باکرہ بیوی اور اپنی خوبیوں اور کمالات کے باعث تمام ازواج سے زیادہ عزیز تھیں۔

سیدہ عائشہؓ کے بارے میں عام تصور یہ ہے، اور یہ کتب حدیث کی ایک روایت پر مبنی ہے۔ کہ وہ چھ سال کی تھیں جب رسول اللہؐ سے ان کا نکاح ہوا، رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ شوہر کے گھر آکر کھلونوں سے کھیلنا

اورلڑکیوں بالیوں کوگھر بلا کران سے گانے سنناان کی دلچسپی کے مشاغل تھے۔ جب اٹھارہ برس کی ہوئیں جو تمیز کی عمر سمجھی جاتی ہے تو حضورؐ کی رحلت ہوگئی۔ دوسری طرف کئی سیرت نگار مثلاً محمد بن اسحاق، عسقلانی، اورزرقانی، ان کا شمار سابق الایمان صحابیات میں کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعثت نبوی کے وقت ان کی عمر اتنی رہی ہوگی کہ انہوں نے کفروشرک اوراسلام میں فرق سمجھا اور اسلام کو اختیار کیا۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ کی روایات ان سے مروی ہیں اوران کا انداز بیان وہ نہیں جو چھوٹے بچوں کا ہوتا ہے بلکہ اس میں تاثر اور گہرا مشاہدہ شامل ہے۔ وہ خود فرماتی ہیں کہ مجھے سورہ قمر کا نزول یاد ہے۔ یہ سورہ ۴ نبوی میں نازل ہوئی۔ گویا اس وقت عمر اتنی تھی کہ وہ ایک علمی چیز کے بارے میں جان سکتی تھیں۔ بچوں کو اکا دکا واقعات تو یاد رہ جاتے ہیں لیکن قرآن کی ایک مخصوص سورہ کا زمانہ نزول یاد ہونا بہت چھوٹی عمر میں ممکن نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کی رفاقت تقریباً آٹھ سال کی ہے۔ لیکن اس عرصہ میں انہوں نے دینی معاملات میں وہ مقام حاصل کیا جو کئی قدیم الاسلام صحابہ کو بھی حاصل نہ ہوسکا۔ انہوں نے حضورؐ سے سوادو ہزار احادیث کی روایت کی ہے۔ کئی دینی امور میں بڑے بڑے صحابہ سے دلائل پر مبنی اختلاف کیا ہے۔ احکام دین کی مصلحتوں، حکمتوں اور ارتقاء سے جس قدر واقف آپ تھیں، اتنا باخبر اور کوئی نہ تھا۔ ان جیسی فکر کی گہرائی اور گیرائی کا ایک نوعمر کھلنڈری لڑکی میں پایا جانا ایک محال بات ہے۔

حضرت عائشہؓ کو اتنا کم عمر ماننے میں بعض باتیں عرف وعادت کے خلاف بھی ماننی پڑتی ہیں۔ اولاً، ۱۰ نبوی میں وہ جبیر بن مطعم کے ساتھ منسوب تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نسبت پر کافی عرصہ گزر چکا تھا اور رخصتی کی نوبت نہیں آرہی تھی۔ اسی لیے تو ابوبکرؓ کا جبیر کے والدین سے فیصلہ کن گفتگو کرنا معقول ٹھہرا۔ ورنہ وہ کہہ سکتے تھے کہ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ آپ کو شکایت پیدا ہوگئی۔ جبیر بڑے والدین کا نوجوان بیٹا تھا۔ اس کے لیے مناسب وہم عمر رشتوں کی کمی نہیں ہوسکتی تھی۔ آخراس کے والدین کو کیا مجبوری تھی کہ انہوں نے چار پانچ سالہ بچی سے اس کی نسبت ٹھہرادی جس کو بالغ ہونے میں ابھی سات آٹھ سال درکار تھے۔ ایسا ہونا عرف وعادت کے خلاف ہے۔

ثانیاً، نبی ﷺ کے سامنے یہ رشتہ اس وقت رکھا گیا جب آپ کو گھر سنبھالنے کے لیے ایک باتمیز بالغ لڑکی کی ضرورت تھی، نہ کہ ایک چندسالہ بچی کی۔ اگر عائشہؓ فی الواقع چھوٹی ہوتیں تو حضورؐ اس رشتہ کی تجویز پیش کرنے والی

خاتون کو اسی وقت ٹوک دیتے کہ میرے گھر کے مسائل حل کرنے کے لیے یہ گڑیوں سے کھیلنے والی معصوم بچی کیا خدمت انجام دے سکتی ہے۔

ثالثاً، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد ایک سال کے عرصہ میں جب حضورؐ نے عائشہؓ کی رخصتی نہیں لی اور آپ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اس کی بلوغت کا انتظار کر رہا ہوں بلکہ یہ فرمایا کہ میرے پاس مہر میں دینے کے لیے ابھی کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ حضورؐ کے لیے قرض کا انتظام کیا گیا اور عائشہؓ کی رخصتی عمل میں آئی۔

حضرت عائشہؓ کی کم عمری کا تصور ہشام بن عروہ کی ایک روایت سے پیدا ہوا ہے۔ یہ ان کا بیان ہے کہ وہ چھ برس کی تھیں جب ان کا نکاح ہوا۔ نو برس کی تھیں جب رخصتی ہوئی اور اٹھارہ برس کی تھیں جب بیوہ ہو گئیں۔ اہل تحقیق کے نزدیک اس نادر روایت کا کوئی راوی مدنی نہیں ہے حالانکہ ہشام بن عروہ مدینہ کے رہنے والے تھے اور ۱۴۵ھ تک وہیں مقیم رہے۔ اس سال انہوں نے ایک سفر عراق کا کیا جب ان کی عمر ۸۴ برس کی تھی۔ وہاں اس روایت کے ایک دو نہیں اکٹھے گیارہ راوی پیدا ہو گئے، پھر غیر ثقہ راویوں نے اس بنیادی روایت کے حق میں اس کی شاہد روایات مہیا کر دیں۔ اب اس کو ہشام کا ذہول قرار دیجیے یا عراقیوں کا ہشام کے نام کو ایک خلاف حقیقت بیان کے لیے استعمال کرنا کہ اس کے باعث یہ اعجوبہ روایت صحاح میں راہ پا کر پوری امت میں پھیل گئی۔ ہمارے نزدیک قرائن اس بات کے حق میں ہیں کہ سولہ سال کی عمر میں نکاح اور انیس برس کی عمر میں رخصتی مانی جائے۔ اس طرح حضورؐ کی رحلت کے وقت عائشہ صدیقہؓ کی عمر ۲۸ برس رہی ہو گی، اس عمر کے ساتھ ان کا دینی فہم، احکام الٰہی کے مصالح اور حکمتوں سے واقفیت اور فقیہ صحابہ کے ساتھ ان کے معارضے ہر چیز سمجھ میں آتی ہے اور کوئی بات محیر العقول نہیں رہ جاتی۔

۴۔ حفصہؓ بنت عمر بن الخطابؓ:

ان کا تعلق قریش کی شاخ بنو عدی سے ہے۔ ان کے شوہر خنیس بن حذافہ بن قیس سہمیؓ سابقون الاولون میں سے تھے۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کے ساتھ پہلے حبشہ کو ہجرت کی۔ وہاں سے واپس آئے تو مدینہ کو ہجرت کی۔ غزوہ احد میں زخمی ہو گئے تو زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ رسول اللہؐ نے حفصہؓ کی خدمات دینی اور ان کے والد کے مرتبہ و

مقام کا لحاظ رکھتے ہوئے ان سے نکاح کر لیا۔ ان کا شرف یہ ہے کہ رسول اللہؐ قرآن مجید کو جس مصحف میں مرتب کرا کے محفوظ کرتے تھے وہ حضرت حفصہؓ کی تحویل میں رہتا۔ حضورؐ کی رحلت کے بعد بھی وہ انہی کی حفاظت میں رہا۔ کتب حدیث میں حفصہؓ سے ۱۶۰ احادیث مروی ہیں۔

۵۔ زینبؓ بنت خزیمہ بن الحارث:

ان کا تعلق قبیلہ قریش سے نہیں تھا۔ ان کے پہلے دو نکاح رسول اللہؐ کے تایا زاد بھائیوں طفیل اور عبیدہ سے ہوئے جو حارث بن عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ عبداللہ بن جحشؓ کے نکاح میں آئیں جو غزوہ احد میں شہید ہو گئے۔ عبداللہ حضورؐ کے پھوپھی زاد تھے۔ زینب کی کٹھن زندگی اور قدامت اسلام کو دیکھتے ہوئے رسول اللہؐ نے ان سے نکاح کر لیا۔ دو تین ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

۶۔ ام سلمہؓ ہند بنت ابی امیہ بن مغیرہ:

ان کا تعلق قریش کے با اثر اور متمول خانوادہ بنو مخزوم سے تھا۔ ام سلمہؓ قدیم الاسلام تھیں اور ان کا نکاح حضورؐ کے پھوپھی زاد اور رضاعی بھائی ابو سلمہ بن عبدالاسدؓ سے ہوا۔ انہوں نے خاندان کی سختیوں سے تنگ آ کر حبشہ کو ہجرت کی۔ وہاں سے واپس آئے تو کچھ عرصہ ابو طالب کے جوار میں گزرا۔ یثرب میں اسلام کے حق میں فضا ہموار ہوئی تو وہاں جا کر بسنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی مکہ سے نکلے ہی تھے کہ بنو مخزوم نے ام سلمہؓ کو روک لیا۔ ابو سلمہؓ تنہا یثرب گئے۔ ان کے خاندان نے ماں سے بچہ بھی چھین لیا۔ اس طرح ام سلمہؓ نے نہایت بے چینی کی زندگی گزاری۔ ایک سال اسی حالت میں گزرا تب ان کو یثرب جانے کی اجازت ملی۔

ابو سلمہؓ غزوہ احد میں زخمی ہو گئے، ان کے یہی زخم جان لیوا ثابت ہوئے۔ شوال ۴ھ میں حضورؐ نے ام سلمہؓ کو پیغام نکاح بھیجا۔ ابو سلمہؓ کی اولاد دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ انہوں نے بچوں کی وجہ سے تامل کیا لیکن حضورؐ تو ان کی ذمہ داری خود ادا کرنے کے خواہش مند تھے اس لیے نکاح ہو گیا۔

فضل و کمال میں حضرت عائشہؓ کے بعد ام سلمہؓ کا نام آتا ہے۔ ۳۷۸ احادیث ان سے مروی ہیں۔ سفر عمرہ میں معاہدہ صلح حدیبیہ کے موقع پر یہ حضورؐ کے ہمراہ تھیں۔ مسلمان شرائط صلح سے مطمئن نہ تھے اس لیے احرام کھولنے پر آمادہ نہ تھے۔ رسول اللہؐ اس صورت حال سے نہایت متفکر تھے۔ ام سلمہؓ نے مشورہ دیا کہ آپ خود اپنا

احرام کھول دیں اور اونٹ ذبح کر دیں۔ حضورؐ نے ایسا کیا تو باقی مسلمانوں نے فوراً حکم کی تعمیل کر دی۔

۷۔ زینبؓ بنت جحش بن رئاب:

ان کا تعلق قبیلہ بنو اسد بن خزیمہ سے تھا۔ یہ حضورؐ کی پھوپھی زاد اور سابقون الاولون میں سے تھیں۔ نبی علیہ السلام نے ان کا نکاح قبیلہ کی مرضی کے خلاف زید بن حارثہؓ سے کر دیا جو آپ کے منہ بولے بیٹے تھے لیکن میاں بیوی میں نباہ ممکن نہ ہو سکا اور زید نے ان کو طلاق دے دی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس صورت حال سے بڑا قلق ہوا۔ چونکہ آپ کے اصرار پر رشتہ ہوا تھا اس لیے رشتہ ٹوٹنے کی ذمہ داری آپ نے محسوس کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو ایک اہم معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا اور رسول اللہ کو زینب سے نکاح کرنے کا حکم دیا۔ متبنیٰ کی مطلقہ یا بیوہ عرب معاشرہ میں حقیقی بہو سمجھی جاتی تھی اس لیے منافقین کو حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈا کا موقع ملا اور وہ ناگفتنی باتیں کہنے لگے۔ یہی باتیں اس دور کے مستشرقین نے رسول اللہؐ کی کردار کشی کے لیے استعمال کی ہیں۔ حضورؐ نے حکم الٰہی کی تعمیل کی۔ زینبؓ کو زندگی بھر اپنی اس قدر افزائی پر ناز رہا۔

۸۔ ام حبیبہؓ رملہ بنت ابی سفیان بن حرب:

ام حبیبہؓ نسب کے اعتبار سے خدیجہؓ کے بعد حضورؐ سے قریب ترین تھیں۔ ان کا پہلا نکاح عبید اللہ بن جحش سے ہوا۔ میاں بیوی دونوں نے حبشہ کو ہجرت کی۔ وہاں کے ماحول میں عبید اللہ نے عیسائیت اختیار کر لی اور بعد میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ام حبیبہؓ کے لیے اب ایک اجنبی ملک میں کس مپرسی کی زندگی بسر کرنے کا مسئلہ تھا۔ حضورؐ کو خبر ہوئی تو آپ نے ان کی خاندانی وجاہت اور خدمات دینی کو دیکھتے ہوئے ان کو اپنے حبالۂ عقد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے عمرو بن امیہ الضمریؓ کو شاہ حبشہ کے پاس بھیجا۔ شاہ مسلمان ہو چکے تھے۔ انہوں نے ام حبیبہؓ کو حضورؐ کا پیغام نکاح پہنچایا جسے ام حبیبہؓ نے منظور کر لیا۔ شاہ نے خود خطبہ نکاح پڑھا اور حق مہر کی گراں بہا رقم اپنی جیب سے ادا کر دی۔ غزوہ خیبر کے فوراً بعد ام حبیبہؓ مسلمانوں کے قافلہ کے ہمراہ مدینہ پہنچیں۔ ان کی بیٹی حبیبہ نے حضورؐ کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی۔ ان سے ۶۵ روایات حدیث منقول ہیں۔

۹۔ جویریہؓ بنت الحارث بن ابی ضرار:

یہ قبیلہ بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں۔ اس قبیلہ کی عداوت اور شرارتوں کے باعث حضورؐ نے اس پر حملہ

کیا تو اسے شکست ہوئی۔ جویریہ قید ہو کر مدینہ آئیں۔ یہ ثابت بن قیسؓ کے حصہ میں آئیں تو ان سے آزادی خریدنے کے لیے ایک رقم ٹھہرالی۔ طلب مدد کے لیے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ سردار قبیلہ کی بیٹی ہیں تو ان کو تجویز دی کہ میں تمہیں ثابت سے خرید کر آزاد کر دیتا ہوں اور تم سے خود نکاح کر لیتا ہوں۔ جویریہؓ نے یہ تجویز مان لی تو ان کے والد نے حضورؐ سے ان کا نکاح کر دیا۔ بنو مصطلق اس سلوک سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے اور مسلمانوں نے بھی ان کا مال ان کو واپس کر دیا۔ اس طرح ایک قبیلہ کی مخاصمت اس نکاح کے باعث محبت میں بدل گئی۔ جویریہ کی پہلی شادی مسافع بن صفوان سے ہوئی تھی۔

۱۰۔ صفیہؓ بنت حیی بن اخطب:

یہ یہودی قبیلہ بنو نضیر کے سردار کی بیٹی تھیں جو غزوہ خیبر میں گرفتار ہوئیں۔ ان کا خاندان اولاد ہارون علیہ السلام میں سے تھا۔ نبی ﷺ کو جب صفیہؓ کی خاندانی وجاہت کا علم ہوا تو عرب دستور کے مطابق ان کو اپنے لیے خاص کر لیا اور خود ان سے نکاح کر لیا۔ یہ پہلے سلام بن مشکم اور پھر کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں رہیں۔ کنانہ غزوہ خیبر میں مارا گیا۔

۱۱۔ میمونہؓ بنت الحارث:

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ واحد خاتون ہیں جنہوں نے خود کو حضورؐ کے لیے ہبہ کر دیا اور آپ نے ان سے نکاح کرنا پسند کیا۔ اس طرح کے رشتہ کا اذن اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ملا ہوا تھا۔ ان کا پہلا نکاح ابورہم بن عبدالعزیٰ سے ہوا جس کا انتقال ہو گیا۔ ان سے مرویات کی تعداد ۷۶ ہے۔

۱۲۔ ماریہؓ قبطیہ:

مقوقس والی مصر نے رسول اللہ ﷺ کا ایک مکتوب گرامی پانے پر آپ کے لیے دو لونڈیاں بھیجیں۔ یہ دونوں بہنیں تھیں۔ چنانچہ ایک لونڈی آپ نے حسان بن ثابتؓ کو عطا کر دی اور ماریہؓ اپنے لیے خاص کر لی۔ ان سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک فرزند عطا کیا جس کا نام آپ نے ابراہیم رکھا۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں ان صاحبزادے کا انتقال ہو گیا۔

حضورؐ کی عائلی زندگی پر ایک نظر:

دشمنان اسلام نے حضورؐ کی پاکیزہ و مطہر زندگی پر کیچڑ اچھالنے کی بہت کوششیں کی ہیں اور آپ کے

سامنے یہود اور منافقین نے جو بے اصل پروپیگنڈا کیا اور آپ کی اخلاقی دھاک کو نقصان پہنچانے کی غرض سے جو افسانے تراشے، ان کو نئے نئے اسلوبوں سے بیان کرکے اس دور کے مخالفین نے آپ کی ذات پر ناروا حملے کیے ہیں۔ حضورؐ کی حیات مبارکہ کے حقائق خود ہی دشمنوں کے بیانات کے باطل ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان حقائق کو ذہن میں مستحضر رکھنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ رسول اللہ ﷺ کی ابتدائی زندگی نہایت پاکیزہ اور تعمیری کاموں سے بھرپور رہی۔ اسی لیے مکہ کے معاشرہ نے آپ کو پختہ خیالات و کردار کا حامل اور ایک راست باز و دیانت دار نوجوان کی حیثیت سے عزت و وقار دیا۔ پچیس سالہ زندگی میں آپ کے کردار پر کوئی حرف نہیں آیا۔ ۲۵ برس کی عمر میں آپ نے شادی کی تو ایک ایسی خاتون سے، جو اگرچہ بچوں والی تھیں اور ان کے سابق دو شوہر انتقال کر چکے تھے، لیکن وہ طاہرہ کی صفت سے موصوف کی جاتی تھیں۔ حضورؐ نے ان کی رفاقت میں اپنی ساری جوانی گزار دی اور کبھی دوسری شادی کا سوچا تک نہیں جبکہ اگر آپ ایسا کرتے تو عرب معاشرہ میں یہ ایک نارمل رویہ ہوتا۔ ان ۲۵ برسوں کی متاہلانہ زندگی کی یاد بعد کے دور میں بھی حضورؐ کے لیے ایک سرمایہ رہی۔ پچاس سال کی عمر تک اس طرح کا رویہ کسی دل پھینک یا جنس زدہ کا نہیں ہوتا۔

۲۔ پچاس برس کی عمر میں گھر درکی ذمہ داریوں کے لیے آپ کو دوسری گھر والی کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ نے اپنی عمر ہی کی خاتون سے نکاح کیا جن کی خوبی دین پر استقامت اور اس کے لیے جانثاری کا جذبہ تھی۔ ان کے سابق شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔

۳۔ چون سال کی عمر میں ایک جوان باکرہ خاتون سے آپ نے نکاح کیا۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ حضورؐ کے ایک سرد و گرم حالات میں قابل اعتماد ساتھی، بچپن کے مخلص دوست، معاشرہ کے باعمل و باکردار فرد کی صاحبزادی تھیں جو خود حضورؐ سے رشتہ کے تعلق کی خواہش رکھتے تھے۔ حضورؐ نے اپنے دیرینہ دوست، جس کے آپ احسان مند بھی تھے، کی قدر افزائی اور ان کی دینی خدمات کی پذیرائی کے لیے یہ رشتہ قبول کیا۔ اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کے مشن کو آگے بڑھانے اور خواتین میں اس کو مقبول بنانے میں جو خدمات حضور کی ان زوجہ محترمہ نے سرانجام دیں ان کی گرد کو بھی کوئی دوسری خاتون نہ پہنچ سکیں۔

۴۔ غزوہ احد میں مسلمانوں کا جانی نقصان بہت زیادہ ہوا۔ معاشرہ میں مجاہدین کی بیوگان اور ان کی یتیم اولادوں کی نگہداشت ایک ملی مسئلہ کے طور پر سامنے آئی۔ قرآن نے مسلم معاشرہ کو توجہ دلائی کہ وہ دو دو، تین تین،

چار چار بیوگان سے نکاح کر کے اس مسئلہ کو حل کریں۔ حضورؐ نے اس ہدایت کے مطابق یکے بعد دیگرے تین نکاح ایسی خواتین سے کیے جو آپ کے قریبی اعزہ کی بیویاں رہی تھیں اور ان کے شوہر غزوہ احد میں شہادت پا چکے تھے۔ ان نکاحوں میں بڑا عامل بیوگان اور ان کے بچوں کی کفالت اور مسلمانوں کے لیے اس خدمت کی ایک عملی مثال قائم کرنا تھا۔

۵۔ رسول اللہؐ نے جنگ احد کے شہدا کی بیوگان سے نکاح کر کے بیک وقت چار ازواج کی حد پوری کر لی تو اس کے بعد زید بن حارثہؓ کے زینب بنت جحشؓ کو طلاق دینے کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کو اللہ رب العزت نے دو غلط تصورات کی اصلاح کا ذریعہ بنایا تا کہ کارِ نبوت کی تکمیل رسول اللہؐ کی عملی مثال سے ہو۔ ایک غلط تصور منہ بولے بیٹے کی حیثیت کے بارے میں تھا، دوسرا ایسے بیٹے کی مطلقہ یا بیوہ سے منہ بولے باپ کے نکاح کا معاملہ۔ عرب منہ بولے بیٹے کے حقوق حقیقی بیٹے کی طرح کے سمجھتے تھے اور اس کی بیوی کو حقیقی بہو کا درجہ دیتے تھے۔ قرآن نے اس تصور کو خلاف حقیقت قرار دیا اور فیصلہ کیا کہ جب منہ بولے بیٹے کو اپنی بیوی سے سروکار نہ رہے اور اس کو طلاق دے دے تو منہ بولا باپ اس سے شادی کر سکتا ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔ اللہ رب العزت نے اس معاشرتی اصلاح کے لیے خود رسول اللہؐ کو عملی مثال قائم کرنے کا حکم دیا اور اس عمل میں حائل چار شادیوں کے حکم میں صرف آپ کے لیے گنجائش پیدا کر دی تا کہ آپ یہ نکاح بھی کریں اور اس کے بعد ان خواتین کو بھی حبالۂ عقد میں لے آئیں جو لونڈی بن کر ملکیت میں آئیں۔ نیز اگر کوئی خاتون رسول اللہ سے عقد کرنے کی خواہش مند ہو اور آپ مناسب سمجھیں تو اس کو قید نکاح میں لا سکتے ہیں۔

۶۔ اس خصوصی استثنائی حکم کے تحت آپ نے زینبؓ بنت جحش سے نکاح کیا، اس کے بعد بنو مصطلق اور بنو نضیر کے سرداروں کی بیٹیوں سے، جو غزوات میں لونڈی بن کر آئی تھیں، ان کو آزاد کر کے نکاح کیے اور میمونہ بنت الحارثؓ کو زوجیت میں قبول کیا۔ یہ آخری نکاح ۵۹ برس کی عمر میں ہوا۔ اور میمونہؓ تعلیمات نبوی کو پھیلانے کا اہم ذریعہ بنیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی پوری زندگی نہایت پاکیزہ اور مطہر گزری۔ پچاس سال کی عمر تک کا زمانہ، جس میں جنسی ہیجان ہوتا ہے، آپ نے ایک بیوی کے ساتھ گزارا۔ اسی دوران میں آپ رسول مبعوث ہوئے اور آپ کی تمام تر توجہ کارِ نبوت کی تکمیل کی جانب مبذول ہو گئی۔ اس میں آپ کی مصروفیات کی نوعیت ایسی تھی جس میں دنیاوی امور بالکل ثانوی حیثیت میں باقی رہے۔ چنانچہ نکاحوں میں بھی دین وملت کے

مصالح اصل کے طور پر ملحوظ رہے۔

ازواج مطہرات کی ذمہ داریاں:

حکمرانوں اور مملکت کے سربراہوں کی زندگی کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ دنیا اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ان کے قدموں میں ڈھیر ہوتی ہے۔ وہ جیسے چاہتے ہیں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی بیگمات نہایت پر آسائش زندگی گزارتی ہیں۔ ان کی خدمت وسہولت کے لیے نعمتوں کی فراوانی اور خدمت گار خواتین کی کثرت ہوتی ہے۔ اقتدار کا نشہ ان کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکنے دیتا۔ اللہ کے نبیوں اور رسولوں کا معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ کبھی دنیا کو خاطر میں نہیں لاتے، ان کا مطمح نظر صرف آخرت ہوتی ہے۔ ان کی زندگی اللہ کے احکام کی تعمیل اور اس کا پیغام انسانوں تک پہنچانے سے عبارت ہوتی ہے۔ ان کی بیویوں میں بھی انہی کی زندگیوں کا عکس ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ازواج مطہرات کو نہایت اہتمام سے ان کی ذمہ داریاں بتائی گئیں۔ انہیں بتایا گیا کہ اللہ کے رسول کی رفاقت قبول کرتے وقت انہیں چند باتوں کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ وہ یہ کہ:

الف) اگر انہیں دنیا کی زیب وزینت اور آسائش درکار ہے تو وہ ان کو نبی ﷺ کے ہاں میسر نہیں آسکتی۔ جس طرح پیغمبرؐ کے پیش نظر آخرت کی سرخروئی ہے، یہی مقصد انہیں بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ معیار زندگی بہتر بنانے کا شیوہ دنیاوی سرداروں کا ہوتا ہے، نبیوں کا نہیں ہوتا۔ لہذا ازواج نبیؐ کو تنگی ترشی کی زندگی پر قناعت کرنی ہوگی۔

ب) پیغمبر خداترسی، عفت و پاکیزگی اور اخلاقی بلندی کا علمبردار ہوتا ہے۔ یہی شان اس کی ازواج میں بھی ظاہر ہونی چاہیے۔ لہٰذا انہیں پیغمبر کی رفاقت کے لائق ہونے کے لیے احساس ذمہ داری پیدا کرنا ہوگا۔ وہ گھروں میں ٹک کر بیٹھیں۔ نمود و نمائش اور پبلک میں آنے سے اجتناب کریں۔ اپنی خواہشات پر اور اپنی گفتگو پر کڑا پہرہ رکھیں تاکہ وہ اپنے کسی قول وفعل سے نبی کے لیے مشکلات پیدا کریں اور نہ اس کے مرتبہ ومقام سے فروتر کسی کردار کا مظاہرہ کریں۔

ج) ازواج نبی کی دلچسپیاں پیغمبرؐ کی دلچسپیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونی چاہئیں۔ وہ ان سے ہٹ کر اپنی الگ دنیا نہیں بسا سکتیں۔ اللہ چاہتا ہے کہ نبی کے گھرانے اور اس کے کسی فرد پر شرک، منافقت یا کسی طرح کی اخلاقی کمزوری کی پرچھائیں بھی نہ پڑیں۔ یہ گھرانہ طہارت وپاکیزگی کے لحاظ سے ایک نمونے کا گھرانہ ہونا چاہیے۔

د) رسول اللہؐ خود ایک معلم ہیں جو قرآن کی تعلیم دیتے، اس کے احکام کی وضاحت کرتے، اس کی حکمتوں کی گرہیں کھولتے اور لوگوں کے اخلاق و کردار کو سنوارتے ہیں۔ یہی حیثیت ان کی ازواج کی ہے۔ انہیں معلمات کے فرائض ادا کرنے ہیں۔ لہٰذا وہ نماز کا اہتمام کیا کریں، زکوٰۃ کی ادائیگی کیا کریں اور اللہ و رسول کے تمام احکام و فرامین کی تعمیل کریں۔ رسول اللہؐ جو پیغام وحی ان تک پہنچاتے ہیں اور دین کی وضاحت کرتے ہیں اس کو امت کی خواتین تک پہنچانا ازواج نبی کی ذمہ داری ہے۔ وہ خواتین کو ان کے مسائل کے بارے میں معلومات مہیا کریں اور رسول اللہؐ سے ان کی رہنمائی میں وسیلہ بنیں۔

ہ) ازواج نبی کے معلمات ہونے کے رول کو آسان بنانے کے لیے رب کائنات نے ان کو امہات المومنین یعنی اہل ایمان کی ماؤں کا منصب عطا کیا۔ گویا ہر صاحب ایمان آدمی مسائل دریافت کرنے کے لیے ان تک اسی طرح رسائی حاصل کر سکتا تھا جس طرح ایک بیٹا اپنی ماں تک رسائی رکھتا ہے۔

ان کے اس منصب کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی مسلمان ان سے بات چیت کرتے وقت دل میں میلے خیالات نہ لائے اور رسول اللہؐ کی رحلت کے بعد ان سے نکاح کرنے کا تصور بھی نہ کرے۔ ازواج نبی کے بارے میں ہر مسلمان کے جذبات وہی ہونے چاہئیں جو ایک نیک بخت اور سعادت مند بیٹے کے اندر اپنی حقیقی ماں کے لیے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ ان ذمہ داریوں کو ازواج مطہرات نے بطریق احسن نبھایا۔ وہ دنیاداری کے مطالبات سے بالکل دستبردار ہوگئیں اور آخرت کی سربلندی کو اپنا مطمح نظر بنائے رکھا۔ گھر میں بقدر کفاف جو کچھ میسر آتا اسی پر اکتفا کرتیں۔ زہد کی زندگی پر ہمیشہ قناعت کی۔ احکام دین پر عمل کرنے میں پیش پیش ہوتیں۔ حضورؐ سے نجی زندگی میں جو کچھ سنتیں یا آپ کے عمل میں جس چیز کا مشاہدہ کرتیں اس کو اپنے عزیزوں یا پوچھنے والوں سے بیان کرتیں۔ زندگی کی راہوں کو منور کرنے کے لیے ازواج مطہرات نے جو محنت کی اس کا تذکرہ کتب حدیث میں ملتا ہے۔ اس کا ثبوت روایات کی اس غیر معمولی تعداد سے ملتا ہے جو ان کی وساطت سے امت کو ملیں۔

ازواج مطہرات پر یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ وہ نبی ﷺ کو دین کی جدوجہد کے لیے بالکل فارغ ہو کر کام کرنے دیں۔ اگر وہ ان کو پوری توجہ نہ دے سکیں تو اس کی شاکی نہ ہوں بلکہ حضورؐ اپنے اوقات میں سے جتنا وقت ان کو دے سکیں اسی کو غنیمت جانیں۔ اسی طرح اگر حضورؐ بعض ازواج کو دوسری ازواج پر فوقیت دیں تو

انہیں اس کا ملال نہیں ہونا چاہیے کیونکہ پیغمبر ہر کام مصلحت دینی کے تحت کرتے ہیں۔قرآن مجید میں یہ بات دوٹوک انداز میں بیان کردی گئی کہ ازواج کے معاملہ میں رسول اللہ پر وہ ذمہ داریاں نہیں ہیں جو دوسرے شوہروں پر اخلاقاً وشرعاً عائد ہوتی ہیں۔

اس معاملہ میں حضورؐ کا رویہ یہ رہا کہ حتی الامکان کسی زوجہ محترمہ کوشکوہ کا موقع نہیں دیا۔ آپ روزانہ سب کے گھروں میں تشریف لے جاتے اور حال احوال پوچھتے۔اس کے بعدان زوجہ کے گھر قیام فرماتے جن کی باری ہوتی۔آپ نے ان کے درمیان عدل وانصاف کرنے کی خاطر اس معمول کو مرض الموت میں بھی نہیں بدلا۔ جب مرض کی شدت اور نقاہت کے باعث نقل مکانی مشکل ہوگئی تب آپ نے سب ازواج کی اجازت سے آخری چند یوم حضرت عائشہؓ کے ہاں قیام فرمایا۔ گھریلو اخراجات میں بھی، حضورؐ کے اپنے حالات جب بہتر ہوئے، آپ نے ازواج مطہرات کے لیے کشائش پیدا کردی اوران کے لیے غلہ اور دوسری ضروریات کی فراہمی کو یقینی بنایا۔ ازواج مطہرات نے تاحین حیات اپنی منصبی ذمہ داریاں ادا کیں اورامت کے لیے تعلیم دین کی مشعل ہمیشہ فروزاں رکھی۔

حوالہ جات

1۔ تحقیق عمر عائشہ۔حکیم نیاز احمد۔ مشکور اکیڈمی کراچی

باب 48

رسول اللہؐ کے فرائض اور ذمہ داریاں

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کی پیشینگوئیوں اور خود آپ کی تئیس سالہ جدوجہد پر آدمی کی نظر ہو تو آپ کے فرائض اور ذمہ داریوں کو سمجھنے میں اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اس کے باوجود غیر مسلموں میں تو کجا، خود مسلمانوں میں ان کا شعور بے حد کم ہے۔ غیر مسلموں کا معاملہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ اگر وہ حضورؐ کو اللہ کا پیغام لانے والا رسول مان لیں تو ان کو اپنے ہر عقیدہ و فعل پر نظر ثانی کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا وہ تو آپ کی ذات والا صفات میں جب تک عیوب و نقائص ثابت نہ کریں اس وقت تک انہیں چین نہیں آتا۔ لیکن مسلمانوں کے اندر حضورؐ کی حیثیت کا صحیح شعور نہ پایا جانا ایک المیہ سے کم نہیں۔

مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے نبی معاشرے کے نیک لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضورؐ بھی بہت نیک آدمی تھے جو چودہ سو برس پہلے عرب میں ہوئے، اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق انہوں نے معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اس میں کامیابیاں حاصل کیں۔ ہمارے زمانہ کا معاشرہ اس زمانہ کے معاشرہ سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے، لوگوں کے تصورات اور وقت کے تقاضے بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ لہٰذا حضورؐ کی نیکی کے باعث آپ کے ساتھ عقیدت و احترام کا معاملہ تو ہونا چاہیے لیکن عملاً ان کے ہاں ہمارے لیے کچھ نہیں ہے۔

دوسرا طبقہ، جو یہ آگاہی رکھتا ہے کہ اللہ کے رسول خدا کا پیغام بندوں تک پہنچانے پر مامور ہوتے ہیں، اس تصور کا حامل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیثیت وہی تھی جو ایک چٹھی رساں کی ہوتی ہے۔ آپ کو جو پیغام اللہ کی جانب سے ملا وہ آپ نے اپنے ماننے والوں تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو گئے۔ آپ کے ماننے والے اب اپنے احوال کے لحاظ سے ان کے لائے ہوئے پیغام کے ساتھ جو معاملہ مناسب سمجھتے ہیں، اس کو اختیار کرنے میں آزاد ہیں۔

مسلمانوں کا ایک تیسرا طبقہ حضورؐ کے ساتھ محبت وعقیدت رکھتا ہے۔ ان کا تصور یہ ہے کہ حضورؐ کے اندر

الوہی صفات تھیں، وہ بشریت سے اتنے بلند مقام پر فائز تھے کہ رب کائنات ہی کے ہم پلہ تھے اور تمام امور میں انہی کی رضا کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ وہ اب بھی موجود اور دنیا میں تصرف کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طبقہ کو نبی اور رسول کی حیثیت کا کوئی شعور ہے اور نہ ان کے حقیقی فرائض سے کوئی لگاؤ ہے۔ یہ طبقہ خوش فہمیوں میں مبتلا ہے۔

ارباب تصوف کا طبقہ رسول اللہؐ کے لائے ہوئے کے علم کو ظاہری علم اور شریعت کو پھل کے ایک چھلکے کی طرح غیر اہم چیز قرار دیتا ہے۔ اس کے بالمقابل ان کے نزدیک اصل علم باطنی علم ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا اور پھل کے مغز کی طرح اہم ہوتا ہے۔ یہ علم طریقت کہلاتا ہے جو کسی مرشد کا دامن تھامے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ مرشد اس طریقت کے رازوں کا امین ہوتا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی کاوشیں جو قرآن کا علم پھیلانے کے لیے تھیں وہ عام لوگوں کے لیے تھیں، ورنہ علم حقیقی تو آپ نے چند مخصوص لوگوں کو ہی دیا جو نہایت راز داری سے اس کو اپنے متوسلین کو منتقل کرتے رہے۔ گویا جن ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کھپا دی وہ صرف ایک بے مغز اور ضمنی سا کام تھا۔

مذکورہ بالا چاروں طبقات کا تصور رسالت قرآن سے بے خبری، رسول اللہؐ کی جدوجہد سے عدم واقفیت، حضورؐ سے اندھی بہری عقیدت، آپ کی محبت میں غلو، اور آپ کی حیثیت و فرائض کے بارے میں غلط قیاس آرائیوں پر مبنی ہے۔ جب بنیاد ہی غلط ہو جائے تو اس پر تعمیر کی جانے والی عمارت کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے فرائض اور ذمہ داریوں کو واضح کیا جائے۔

رسول اللہؐ کی منصبی ذمہ داریاں:

حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے جب اپنی نسل میں ایک عظیم رسول کی بعثت کی دعا کی تھی تو اس کی ذمہ داریاں بھی گنوا دی تھیں یعنی تلاوت آیات، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ نفوس۔ ان ذمہ داریوں کو جس عظیم شخصیت نے بھرپور انداز میں ادا کیا وہ محمد رسول اللہؐ کی واحد ذات پاک تھی۔ آپ پر جو آیات نازل ہوئیں انہی کا مجموعہ قرآن مجید ہے جس کی حیثیت وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب تورات اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی تعلیم انجیل کی تھی۔ یہ سب کتابیں آسمانی تھیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی ہدایت کے لیے مختلف ادوار میں نازل ہوئیں اور جن رسولوں پر نازل ہوئیں وہ اللہ تعالیٰ کے نظام نبوت کے تحت ایک ہی سلسلہ کے پیغمبر تھے جو آسمانی ہدایت کو لوگوں تک پہنچانے پر مامور ہوئے۔

تلاوت آیات:

تلاوت آیات کا مفہوم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے والی آیات کو پڑھنا ہے۔ خود نبی ﷺ کے متعلق

قرآن میں بیان ہوا ہے کہ آپ بعثت سے قبل نہ ان آیات کی تلاوت کرتے پائے گئے تھے اور نہ ان کو لکھتے لکھاتے تھے۔ بعثت کے بعد آپ یکایک ان آیات سے واقف بھی ہو گئے اور اس تعلیم کو لوگوں تک پہنچانے بھی لگے۔

رسول اللہؐ کی بعثت چونکہ امیوں میں ہوئی جس سے مراد بنی اسماعیل کے سوا کوئی نہیں، اس لیے آنحضرت ﷺ کی اصل ذمہ داری یَتۡلُوا عَلَيۡهِمۡ آيَاتِهٖ ،یعنی ان کے سامنے آیات کو پڑھنا یا دوسرے الفاظ میں ان کو آیات سنانا تھی۔ چنانچہ مکہ میں اکابرین قریش کو قرآن سنانا اور اس کی تعلیم کو قبول کرنے کی دعوت دینا آپ کا معمول تھا۔ آپ مسجد حرام میں عین خانہ کعبہ کی دیواروں کے سایہ میں بلند آواز سے تلاوت فرماتے تاکہ قرآن کا پیغام قریش کے کانوں میں پڑ جائے۔ بعض لوگ آپ سے بحث میں الجھتے تو آپ ان کو بھی قرآن کی آیات سنا کر اس کی تعلیم سے آگاہ فرماتے۔ بعض لوگ یہ کلام سننے کی خود خواہش کرتے اور جن میں یہ جرأت نہ ہوتی کہ دوسرے لوگوں کے سامنے سنیں وہ اس وقت کی تلاش میں رہتے جب آپ رات کے وقت خانہ کعبہ کے پاس نماز ادا کرتے۔ یہ لوگ بیت اللہ کے غلاف کے پیچھے چھپ کر اپنی خواہش کو پورا کرتے۔

حضورؐ پر ایمان لانے والوں کے لیے قرآن مجید کا پڑھنا اور اس کو یاد کرنا ازبس ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعثت کے جلد بعد ہی اہل ایمان نے دارارقم کو اپنی نشست و برخاست کا مرکز بنالیا اور رسول اللہ ﷺ سے استفادہ کی سبیل پیدا کی۔ یہ لوگ وہاں قرآن پڑھتے پڑھاتے، اس پر مذاکرہ کرتے اور اس کی روشنی میں اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کرتے۔ یہاں کی تربیت حاصل کرنے والی جماعت اسلام کی زبردست جانثار جماعت ثابت ہوئی اور وہ بھی تلاوت آیات کے کام میں حضورؐ کی شریک کار بن گئی۔

قریشی لیڈروں کو تلاوت آیات کے اس فریضہ سے بے حد وحشت ہوتی اور وہ کانوں پر کپڑے لپیٹ لیتے۔ حضرت ابوبکرؓ جب اپنے گھر کے صحن میں تلاوت کرتے تو بعض لوگ سننے کے لیے گوش برآواز ہو جاتے۔ ان لوگوں کے قرآن کی تعلیم سے متاثر ہونے کے خدشہ کے پیش نظر قریش نے حضرت ابوبکرؓ پر پابندیاں لگائیں کہ وہ گھر کے اندر یہ کلام پڑھا کریں۔

نبی ﷺ کو بھی قریش ٹوکتے کہ وہ اپنی دعوت پھیلانے سے باز رہیں تو آپ فرماتے کہ مجھے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ 'اَنۡ اَتۡلُوَ الۡقُرۡآنَ' میں قرآن سناتا رہوں۔ جو شخص اس سے ہدایت پائے گا وہ خود اپنے فائدہ کے لیے ایسا کرے گا۔ لیکن قریشی لیڈر اگر قرآن سن بھی لیتے تو تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے سنی ان سنی کرتے اور اگر سننے کا اقرار کرتے تو کبھی اس کو سحر کہتے، کبھی پچھلی قوموں کے افسانوں کا ایک مجموعہ قرار دیتے۔ وہ اس کو اللہ کا کلام سمجھنے پر تیار نہ ہوتے۔

یہی رویہ مدینہ کے یہود نے روا رکھا۔ وہ قرآن سنتے تو اس کا انکار کرتے اور طرح طرح کے اعتراضات کرتے، جبکہ وہ خود آسمانی کلام کے پہچاننے والے اور اس کی بنیادی تعلیمات سے آگاہی رکھنے والے تھے۔ چنانچہ قرآن نے ان پر واضح کیا کہ جب اللہ کی آیات تمہیں سنائی جا رہی ہیں اور اس کے رسول تمہارے اندر موجود ہیں تو قرآن کے انکار کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔

حضورؐ نے اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے مدینہ میں بھی اصحاب صفہ کے ادارہ کی داغ بیل ڈالی اور حفاظ صحابہ مدینہ منورہ کے باہر سے آنے والے مسلمانوں کو قرآن سکھاتے۔ نمازوں کے اندر تلاوت کا حصہ شامل کرنے سے ہر مسلمان کو حفظ قرآن کی تحریک ملی۔ حضورؐ نے اس تحریک کو یہ فرما کر دو گونہ کر دیا کہ جس سینے میں قرآن کا کوئی حصہ محفوظ نہیں وہ ایک اجڑے گھر کی مانند ہے۔ حضورؐ رمضان المبارک میں کثرت سے تلاوت کرتے۔ وہی ذوق وشوق امت میں منتقل ہوا اور آج بھی دنیا کے ہر حصہ میں مسلمان تلاوت آیات کرتے اور قرآن حفظ کرنے کو سعادت کا کام سمجھتے ہیں۔ رمضان المبارک میں ان کا یہ اہتمام دیدنی ہوتا ہے۔

تعلیم کتاب:

رسولوں کے حوالہ سے کتاب کا ایک مفہوم وحی آسمانی اور اس پر مشتمل کتاب کا ہے۔ قرآن مجید کے بارے میں ہے ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیہ (یہ آسمانی کتاب ہے جس کے آسمانی کتاب ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں) کتاب کا دوسرا مفہوم قانون شریعت ہے۔ مثلاً فرمایا وَاُولُوا الاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِی کِتَابِ اللّٰہِ (اور قرابت دار اللہ کے قانون میں ایک دوسرے سے قریب تر ہیں) تعلیم سے مراد کسی کو بڑے اہتمام سے علم سکھانا ہے۔ اس اہتمام کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی کتاب سنائی اور پڑھائی جائے تو اس کو ہر پہلو سے واضح کیا جائے، سننے والوں کے کچھ سوالات ہوں تو ان کو جواب مہیا کیے جائیں، ان کی جانب سے اعتراض پیدا ہو تو اس کو رفع کرنے کے لیے وضاحتیں پیش کی جائیں، اس کے اندر کچھ ایسے معانی مضمر ہوں جن کی طرف سرسری طور پر توجہ نہ ہوتی ہو تو ایسے معانی کھولے جائیں اور مخاطبین کو پوری طرح مطمئن کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اوپر نازل ہونے والی کتاب، یعنی قرآن مجید کی تعلیم میں یہ تمام باتیں ملحوظ رکھیں۔ احادیث میں بدوؤں کے سوالات اور آپ کے جوابات نقل ہوئے ہیں۔ اسی طرح مدینہ کے یہود آپ سے طرح طرح کی وضاحتیں طلب کرتے اور آپ نہایت خندہ پیشانی سے ان کو مطمئن کرتے۔ چونکہ سوال وجواب کی یہ عادت آدمی کی غلط تربیت بھی کر دیتی ہے اور وہ غیر ضروری سوالات کر کے معاملات کو مشکل بنا سکتا ہے۔ اس لیے جب اہل ایمان کی طرف سے کچھ نامناسب

سوالات سامنے آئے تو قرآن نے ان کو اس سے روک دیا اور بتایا کہ قرآن کے نزول کے دوران اگر تم اس طرح کے سوالات کرو گے تو دین کو اپنے لیے مشکل بنالو گے۔

وحی آسمانی کا ایک اہم حصہ شرعی احکام پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہود کی تمام اصولی شریعت تورات میں تھی جس پر اضافے ان کے فقہا نے کیے۔ قرآن کے بیشتر احکام مدنی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں ہیں۔ یہ بھی اصولی شریعت ہے۔ لہٰذا ان احکام کی وضاحت اور تبیین کرنا تعلیم کتاب کا تقاضا تھا جسے رسول اکرم ﷺ نے پورا فرمایا۔ آپ کو خاص نور عطا ہوا تھا جس کے باعث آپ کی روح بیدار تھی۔ اگر کسی معاملہ میں آپ کو وحی الٰہی کی رہنمائی نہ بھی حاصل ہوتی تو آپ اس نور کی مدد سے کوئی حکم دے دیتے۔ اس اعتبار سے آپ کی ذات معروف ومنکر میں شناخت کا سرچشمہ تھی۔

تعلیم کتاب کے اس فریضہ کو ادا کرتے ہوئے حضورؐ نے تمام عبادات واصطلاحات ۔۔۔ وضو، صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، طواف، قربانی، عمرہ، حدود حرم وغیرہ ۔۔۔ کی عملی شکل متعین فرمائی اور امت کو اس کی تربیت دی۔ اسی طرح احکام شرعیہ جو قرآن میں اصولی طور پر بیان ہوئے تھے آپ نے ان پر عمل کر کے ان کی تفصیلی شکل واضح فرمائی اور امت کو ان کا یہی قالب اختیار کرنے کا حکم دیا۔ اسی کا نام سنت رسول ہے یعنی رسول اللہؐ کا متعین کردہ وہ طریقہ جس کو اختیار کرنے کی حضورؐ نے امت کو تلقین فرمائی۔ اس طرح دین اسلام قرآن کریم کی اصولی تعلیمات اور سنت نبوی کی روشنی میں ان کی وضاحت دونوں کے مجموعہ سے متشکل ہوا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی آپ غیر ضروری قرار دے دیں تو اپنے دین کی عمارت کو آپ قائم نہیں رکھ سکتے۔

تعلیم کتاب کے فریضہ کو ادا کرتے ہوئے حضورؐ نے امت کو جو دین سکھایا وہ رہتی دنیا تک دین اسلام کا قالب ہے۔ جو شخص اسلام قبول کرے وہ اپنی عملی زندگی میں اس کے کسی حصہ سے پہلوتہی یا اس کا انکار کر کے مسلمان نہیں رہ سکتا، خواہ وہ حضورؐ کے ساتھ کتنی ہی عقیدت کا اظہار کرے۔

تعلیم حکمت:

حکمت سے مراد عقل ودانش کی وہ پختگی ہے جس سے صحیح فکر اور صحیح عمل وجود میں آتا ہے۔ آسمانی ہدایت میں جس طرح احکام شریعت دیے جاتے ہیں اسی طرح اس میں زندگی کا صحیح فلسفہ اور ہر ضروری معاملہ میں درست فکر بھی واضح کی جاتی ہے۔ اس ہدایت کو قبول کرنے والا شخص زندگی کے تمام مسائل میں صحیح سوچ اختیار کرتا اور اس کی روشنی میں اقدام کرتا ہے۔ حکمت اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ ہے اور نبی ﷺ کو اس کا معلم بنایا گیا۔ آپ نے اس حوالہ

سے اپنی حیثیت یوں بیان فرمائی کہ اِنَّمَا اَنَا قَاسِم'' و المُعْطِي هُو اللّٰه میں تو تقسیم کنندہ ہوں، عطا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ حکمت کی تعلیم کا طریقہ عقلوں کی تربیت اور کردار کی تعمیر ہے، کسی کو حکمت منتقل کرنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کی بکثرت مشق کرائی جائے۔ فہم کے لیے روشنی مہیا کی جائے اور غور و فکر اور تعقل و تدبر کی عادت ڈالی جائے۔ اس معاملہ میں حکمت کا سب سے بڑا خزانہ کتاب اللہ ہے جو ان چیزوں کو متعین کر کے بتا دیتا ہے جو حکمت پر مبنی ہیں اور جن کو اختیار کر کے آدمی حکیم بن جاتا ہے۔ ان میں بنیادی چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف وہ توجہ ہے جو خشیت، محبت اور عاجزی کے ساتھ ہو۔ دوسری چیز لوگوں کے ساتھ رحمت، شفقت کا سلوک اور ان کی خیر خواہی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید نے دین کے تمام اصولی احکام کو بھی حکمت قرار دیا ہے۔ نبی ﷺ نے ان میں سے ہر چیز پر عمل کے صحیح اسلوب واضح فرمائے۔

رسول اللہ ﷺ قرآن پر غور و فکر اور تدبر کی تربیت فرماتے۔ صحابہ کرامؓ کی مجالس میں ان سے ایسے سوالات کرتے جن سے وہ سوچنے پر مجبور ہوں اور ان میں قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ مثال کے طور پر آپ نے ایک مرتبہ صحابہ سے پوچھا کہ وہ کون سا درخت ہے جو ایک بندۂ مومن کی طرح ہے۔ لوگ صحرا کے درختوں پر غور کرنے لگے لیکن آپ نے فرمایا کہ کھجور کا درخت ایک مومن کی مثال ہے۔ قرآن مجید میں کلمہ لا الہ الا اللہ کی تمثیل یوں بیان ہوئی ہے جیسے ایک نہایت بلند و بالا مثمر درخت ہو جس کی جڑیں زمین میں نہایت گہری اتری ہوئی ہوں اور وہ اللہ کی توفیق سے ہر وقت پھل دیتا ہو۔ ایک بندہ مومن اسی کلمہ طیبہ پر ایمان رکھتا ہے، اس کے موقف میں ثبات ہوتا ہے، اس کے اعمال و اخلاق نہایت بلند اور بافیض ہوتے ہیں۔ گویا ایک مومن کی مشابہت کھجور کے درخت کے ساتھ بالکل واضح ہے۔

حضورؐ نے کئی چیزوں کی حکمت اسی طرح تمثیلات کی مدد سے سمجھائی، مثلاً آپ نے صحبت صالح کے فوائد عطر فروش کے پاس جانے اور بری صحبت کے نقصانات ایک لوہار کی بھٹی کے پاس بیٹھنے کے اثرات کی مدد سے سمجھائے۔ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ جب مسجد میں تشریف لے جاتے اور دیکھتے کہ کچھ صحابہ مل کر دین کے مسائل پر غور کر رہے ہیں تو آپ ان کے پاس بیٹھ کر ان کی گفتگو میں حصہ لیتے اور مسائل کی تفہیم میں ان کی مدد فرماتے۔ کبھی کبھی بعض صحابہ کوئی ایسا سوال کر دیتے جس میں وہ قرآن کے بیانات کی حکمت سے آگاہ ہونا چاہتے تو حضورؐ ان کو تعلیم کا ایسا خلاصہ بتا دیتے، جس کو وہ گرہ کر لیتے تو وہ ہمیشہ کے لیے ان کی رہنمائی کا باعث ہوتا۔ مثال کے طور پر ایک شخص نے آ کر پوچھا کہ مجھے وہ عمل بتا دیجیے جو مجھے جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کر دے۔ آپ نے فرمایا: تم اللہ کی

عبادت کرو، اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ، نماز کا اہتمام کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ مجھے دو لفظوں میں وہ تعلیم دے دیجیے جو میری نجات کے لیے کافی ہو تو آپ نے فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (تو یہ شہادت دے کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر استقامت رکھ) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ ایسے جملے ادا فرماتے جن میں دین کی حکمت ہوتی اور وہ اس قدر جامع اور خوب صورت ہوتے کہ زبانوں پر چڑھ جاتے۔ ایک شخص نے دین کی حقیقت جاننا چاہی تو آپ نے فرمایا اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ دین خیر خواہی کا نام ہے۔ اس نے پوچھا کس کی؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی، اس کے رسول کی اور مسلمانوں کے عوام و خواص کی خیر خواہی۔

رسول اللہؐ کے بہت سے تربیت یافتہ صحابہ بہت بڑے حکیم تھے۔ وہ جب مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے ذمہ دار بنائے گئے تو ان کے فیصلوں میں اس تعلیم حکمت کے اثرات صاف نظر آتے تھے جو انہیں نبی ﷺ سے حاصل ہوئی۔ مثال کے طور پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے عہد خلافت میں جب یہ اعلان کیا کہ جو شخص زکوٰۃ دینے سے انکار کرے گا تو میں اس کے ساتھ قتال کروں گا یہاں تک کہ وہ بیت المال میں اپنی پوری زکوٰۃ جمع کرا دے۔ جب صحابہؓ نے مشورہ دیا کہ زکوٰۃ کے منکر یہ لوگ نماز پڑھنے کے لیے تیار ہیں، لہٰذا مصلحت کے تحت فی الوقت ان کے ساتھ رعایت کر دی جائے تو سیدنا ابوبکرؓ نے فرمایا کہ قرآن نے نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے لہٰذا میں بھی ان دونوں میں تفریق نہیں کر سکتا۔ دونوں کے منکروں کے ساتھ یکساں سلوک ہوگا۔

تزکیہ نفوس:

رسول اللہ ﷺ کے تمام مذکورہ فرائض ۔۔۔ تلاوت آیات، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت ۔۔۔ کا اصل مقصود تزکیہ نفوس ہے جو تمام انبیاء کی بعثت اور جدوجہد کا حقیقی مقصد ہوتا ہے۔ انبیاء کی جدوجہد کا اصلی ہدف ہر انسان اور ہر معاشرہ کا تزکیہ ہوتا ہے۔ آخرت میں نجات اور فلاح حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ انسان اپنا تزکیہ کرے۔ اس کے بغیر وہ جنت کی خواہش رکھتا ہو تو یہ ایک احمقانہ خواہش ہے۔ اس لیے تزکیہ ایک عام ضرورت کی چیز ہے۔ اس کے علم کو چند اشخاص تک محدود نہیں کیا گیا اور نہ اس کو راز بنایا گیا ہے۔ رسول اللہؐ اپنے تمام ساتھیوں کی تربیت فرماتے اور ان کے علم، اخلاق اور کردار کی تعمیر کے لیے ان کو لائحہ عمل دیتے۔ آپ صحابہ کرام کو اس بات کی تاکید فرماتے کہ وہ جو کچھ آپ کی صحبت میں سنیں اور دیکھیں، اس کو دوسروں تک پہنچائیں۔ آپ نے تمام اخلاقی و روحانی بیماریوں کی اصلیت واضح فرمائی اور ان کے علاج کا طریقہ بتایا۔

تزکیہ کا مفہوم کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا، اس کو نشو و نما دینا اور اس کو پروان چڑھانا ہے۔ تزکیہ نفس کا مفہوم

یہ ہے کہ نفس کے اندر جو غلط افکار ونظریات جڑ پکڑ گئے ہوں ان کی جڑیں اکھاڑ دی جائیں، عادات واخلاق کی جو ناہمواریاں اور کمزوریاں اس کے اندر پیدا ہوگئی ہوں ان کو درست اور ہموار کیا جائے۔ فانی اور نفسانی لذتوں کی دلدل سے آدمی کو نکالا جائے اور اس کے رجحانات کو تبدیل کر کے اس کو نیکی اور خدا ترسی کے راستہ پر ڈال دیا جائے۔ انسان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ نیکی اور بدی کی کشمکش میں نیکی کا ساتھ دے اور اس کو بدی پر غالب کرنے کی کوشش کرے۔

تزکیہ ایک وسیع الاطراف عمل ہے۔ اس میں زندگی کا ہر پہلو، خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی، عقلی ہو یا عملی، اخلاقی ہو یا اجتماعی وسیاسی، زیر بحث آتا ہے۔ اس میں اس بات کی تربیت ہوتی ہے کہ انسان کا رویہ صحیح علم پر مبنی ہو۔ وہ ایسے کام کرے جن سے اس کو اپنے پروردگار کا قرب حاصل ہو سکے اور وہ دوسرے انسانوں کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہو۔ اس میں معاملات کی اصلاح اور کنبہ، خاندان، معاشرہ اور قوم سب کے ساتھ درست نہج پر تعلقات کی تعمیر کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ تزکیہ کے عمل سے نکلنے کے بعد ایک انسان کامل وجود میں آتا ہے اور پیغمبر اسی طرح کے انسان کامل تیار کرتے ہیں جن کے دم قدم سے یہ دنیا قائم ہے۔

رسول اللہؐ کے بنیادی فرائض یہی ہیں جن کو آپ نے بدرجہ اتم پورا فرمایا اور ان کو امت میں رائج کیا۔ دوسرے فرائض مثلاً تبلیغ دین، انذار اور تبشیر انہی سے پھوٹتے ہیں اور ان کا زیادہ تعلق طریق کار سے ہے۔ امت مسلمہ نے رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے راستہ کو اختیار کیا اور ہر زمانہ میں اس کو زندہ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس شخص پر حضورؐ کی لائی ہوئی ہدایت سورج کی طرح روشن ہے جو اس کا طالب ہو۔ امت نے اس خزانہ کی حفاظت اپنی جانوں سے بڑھ کر کی اور آج بھی ہر طالب اس خزانہ سے متمتع ہو سکتا ہے۔ جب اس حقیقت کو مدنظر رکھا جائے کہ رسول اللہؐ خدا کے آخری نبی ہیں اور قرآن قیام قیامت تک باقی رہنے والی آسمانی کتاب ہے جس کی شرح سنت نبوی کی شکل میں امت مسلمہ کے عمل میں پیوست ہے تو امت کے مختلف طبقات کے وہ رویے، جن کا ذکر اوپر ہوا، کسی پہلو سے درست نظر نہیں آتے۔ یہ نہ تو رسول اللہؐ کی حیثیت عرفی کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور نہ آسمانی ہدایت کو وہ مقام دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام کے اندر فی الواقع اس کا ہے۔

باب 49

رسول اللہ ﷺ کے حقوق

جس طرح رسول اکرم ﷺ کے منصبی فرائض تھے اور آپ پر امت کی کچھ ذمہ داریاں تھیں اسی طرح آپ کے بعض حقوق بھی تھے جن کو ادا کرنا آپ کے مخاطبین، اہل ایمان اور بالعموم امت مسلمہ کی ذمہ داری تھی، اور ہے۔ ان میں سے بعض حقوق وہ ہیں زمانہ قدیم کے اہل ایمان پر واضح کر دیے گئے تھے اور ان سے قول و قرار لے لیا گیا تھا کہ وہ آخری نبی کی بعثت پر ان کے ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ اس قول و قرار کی روایت اہل کتاب میں صدیوں تک محفوظ رہی اور نبی ﷺ کی بعثت کے موقع پر اس کی یاد دہانی بھی کرائی گئی۔ بہتر ہوگا کہ اس کا تذکرہ رسول اللہؐ کے عمومی حقوق سے الگ پہلے کیا جائے۔

اہل کتاب میں نبی موعود کے حقوق کی روایت کے تقاضے:

نبی موعود کے بارے میں انبیائے بنی اسرائیل کی پیشینگوئیوں کے ضمن میں اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل سے وقتاً فوقتاً یہ عہد لیا جاتا رہا کہ جب فلاں فلاں صفات کے حامل پیغمبر مبعوث ہوں تو وہ ان پر ایمان لائیں گے اور ان کے دست و بازو بنیں گے۔ اس عہد کا تذکرہ قرآن مجید میں بطور خاص کیا گیا تاکہ دور رسالت کے اہل کتاب ہوش میں آئیں۔ انہیں جس ہستی کے خیر مقدم کے لیے صدیوں سے تیار کیا جاتا رہا وہ تو دنیا کے لیے رحمت بن کر سامنے آ چکی لیکن ان کا حال یہ ہے کہ وہ خوابِ غفلت سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔ فرمایا:

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ. قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ. قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا. قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ. (آل عمران ۳:۸۱)

اور یاد کرو جب کہ خدا نے تم سے نبیوں کا میثاق لیا۔ ہر گاہ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت عطا فرمائی، پھر آئے گا تمہارے پاس ایک رسول، مصداق بن کر ان پیشین گوئیوں کا جو تمہارے پاس موجود ہیں، تو تم اس پر

ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ پوچھا: کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور اس پر میری ڈالی ہوئی ذمہ داری تم نے اٹھائی؟ بولے کہ ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ تو جو لوگ اس عہد کے بعد پھر جائیں گے وہی لوگ نافرمان ٹھہریں گے۔

اس عہد اور قول وقرار کے بارے میں سورہ آل عمران کی آیت ۱۸۷ میں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ اہل کتاب کو اس بات کا پابند کیا گیا تھا کہ وہ اس عہد کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرتے رہیں گے اور کسی مرحلہ میں اس کو چھپانے کی کوشش نہیں کریں گے تاکہ اس عہد کی ایک مضبوط روایت لوگوں کے اندر پھیل جائے اور وہ نبی آخرالزماں کی بعثت کے ساتھ ہی اپنی وفاداریاں ان کے لیے وقف کر دیں۔

اوپر نقل کردہ آیت سے بعض باتیں نہایت واضح ہیں۔ ایک یہ کہ اہل کتاب سے یہ عہد پے در پے متعدد انبیاء نے لیا، اسی لیے اس کی شناخت 'میثاق النبیین' کے الفاظ سے ہوئی۔ دوسری یہ کہ عہد جس شخصیت کے بارے میں لیا گیا وہ مستقبل میں آنے والے ایک رسول تھے اور ان کے بارے میں کئی علامات بتا دی گئی تھیں۔ ہدایت کی گئی تھی کہ جس رسول میں یہ علامات پوری ہوں گی صرف اسی کو اس عہد کا مصداق سمجھا جائے گا۔ تیسری یہ کہ یہ عہد اس رسول پر ایمان لانے اور اس کے فرائض کی ادائیگی میں اس کو مدد ونصرت فراہم کرنے کا تھا۔ مطلب یہ کہ جب وہ گرامی قدر شخصیت رسول مبعوث ہو تو ان کو دل کے یقین کے ساتھ اللہ کا رسول تسلیم کیا جائے، وہ جس حق کو پیش کریں اس کو خدائی پیغام کے طور پر قبول کیا جائے، اس کی تبلیغ واشاعت میں ان کا بھرپور ساتھ دیا جائے اور ان کے دشمنوں سے ان کا دفاع کیا جائے۔ چوتھی یہ کہ اہل کتاب ہر دور میں اس عہد کا اقرار کرتے اور اس پر اللہ کو گواہ ٹھہراتے رہے۔

اسی عہد کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن مجید نے رسول اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اہل کتاب کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دیں۔ وہ اس دعوت کو قبول کریں گے تو راہ راست کو اختیار کرنے کی توفیق پا سکیں گے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا نِ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَ يُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ. (الاعراف ۷:۱۵۸)

کہہ دو: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس اللہ کا جس کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ جلاتا اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے نبی امی رسول پر، جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر، اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ یاب ہو۔

یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ اہل کتاب کے لیے اگر فلاح کی کوئی راہ ہے تو وہ یہی ہے کہ اس قدیمی عہد پر عمل کرتے ہوئے یہ رسول اللہؐ پر ایمان لائیں، دین کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیں، اپنی قوتیں اور صلاحیتیں ان کی تائید و نصرت میں صرف کریں اور ان کے دشمنوں کے مقابل میں ان کے لیے سپر بن جائیں۔ پھر اپنی زندگی اپنی خواہشات کے پیچھے لگ کر نہیں بلکہ اس روشنی میں بسر کریں جو آپ کے ساتھ آسمان سے نازل کی گئی ہے۔ فرمایا:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.

(الاعراف ۷:۱۵۷)

تو جو اس پر ایمان لائے، جنھوں نے اس کی حمایت کی، اس کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اہل کتاب کو یہ بشارت بھی دی گئی کہ اگر وہ اپنی کتابوں پر ایمان رکھتے ہوئے نبی آخر الزمان کو پہچان کر ان پر ایمان لے آئیں گے تو ان کو اللہ کی رحمت میں سے دہرا اجر عطا کیا جائے گا۔ ایک اس تعلیم پر کاربند رہنے کا جو ان کو اپنے انبیاء سے ملی اور دوسرا ایفائے عہد کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا۔

پس اہل کتاب کے اندر صدیوں سے قائم روایت کے تحت رسول اللہؐ کے حقوق حسب ذیل تھے:

یہ کہ آپ کو دل کے پورے یقین کے ساتھ اللہ کا رسول تسلیم کیا جائے یعنی یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اور سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی ہیں۔ آپ کے پاس جو تعلیم ہے وہ حق پر مبنی اور اللہ تعالیٰ کا وہ پیغام ہے جو اس نے انسانوں کی بھلائی کے لیے اتارا ہے۔ اس کو قبول کرنا اور اس کو زندگی میں مشعل راہ بنانا ہر انسان پر فرض ہے۔ اس کو نظر انداز کرنے کے نتائج بے حد خطرناک ہوں گے جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں مجرم بنا کر کھڑا کرنے کا باعث ہوں گے۔

یہ کہ حضورؐ کی تعزیر کی جائے۔ 'عزر' کے معنی کسی کو روکنا اور واپس پھیر دینا ہے۔ اسی سے لفظ تعزیر بنا ہے، جس کا مفہوم کسی کے دشمنوں اور مخالفوں کو اس سے دفع کرنا اور اس کی حمایت میں اس کے لیے سپر بن جانا ہے۔

یہ کہ آپ کی نصرت کی جائے۔ نصرت میں ہر طرح کا تعاون اور ہر قسم کی تائید و مدد شامل ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ پیغمبرؐ کا ساتھ دے کر ان کے فریضۂ منصبی کی ادائیگی میں بھرپور تعاون پیش کیا جائے اور آپ کی دعوت کو پھیلانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔ اگر بعض لوگ ان کی راہ روکنے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں تو آپ کے دست و بازو بن کر ان کا مقابلہ کیا جائے۔

اور یہ کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب کو آسمانی ہدایت کے طور پر تسلیم کیا جائے اور اسی کو تمام امور میں مشعل راہ

بنایا جائے۔

ماضی بعید میں اہل کتاب سے لیے گئے اس قول وقرار کے تقاضے اگرچہ واضح تھے لیکن قرآن نے ان کو نام لے لے کر بیان کر دیا تا کہ دور رسالت کے اہل کتاب کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ اس کے باوجود وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی اس تمثیل کے مصداق بن گئے جس کے مطابق کنواری دلہنوں کو دولہا کے آنے کی خبر دی گئی تو وہ ساری رات اس کے انتظار میں بیٹھی رہیں اور اس کی خاطر اپنی شمعیں روشن رکھیں، لیکن جب دولہا کے آنے کا وقت ہوا تو وہ اپنی شمعیں بجھا کر سو گئیں۔ نبی ﷺ کے بعد بھی ان تمام لوگوں پر، جو انبیائے بنی اسرائیل کے نام لیوا ہیں، یہ واجب ہے کہ وہ حضورؐ کی لائی ہوئی ہدایت اور آپ کے دین پر ایمان لائیں اور اس کی ترویج میں اپنا حصہ ادا کریں۔ ایسا کرنے پر ہی وہ فلاح پا سکتے ہیں۔

اب ہم رسول اللہ ﷺ کے ان عمومی حقوق کی قدرے وضاحت کرتے ہیں جن کی طرف قرآن مجید میں توجہ دلائی گئی ہے۔

ایمان:

چونکہ انسان اللہ کی زمین پر اس کا خلیفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے عمل کی راہیں روشن کرنے کی غرض سے نبوت ورسالت کا ایک باقاعدہ نظام رائج کیا اور اپنی ہدایات صحیفوں کی شکل میں نازل فرمائیں جن کی وضاحت انبیاء ورسل نے اپنے قول اور فعل دونوں سے کر دی۔ پھر رسول اللہؐ کو تمام انبیاء پر نمایاں فوقیت عطا کی اور آپ کے لائے ہوئے صحیفہ کو محفوظ وکامل ہدایت قرار دیا۔ لہٰذا رسول اللہؐ پر ایمان کا یہ مفہوم مراد لینا بالکل ناکافی ہے کہ آپ کو یکے از انبیاء مان لیا جائے۔ اس کے برعکس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ حضورؐ کو اپنے اور خدا کے درمیان رابطہ و تعلق کے لیے ایک لازمی واسطہ تسلیم کیا جائے۔ آپ پر بھرپور اعتماد ہو کہ آپ نے جو کچھ پیش کیا وہ فی الواقع اللہ کا پیغام ہے جس کو قبول کر کے انسان نجات پا سکتا ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا خدا سے بغاوت کے مترادف ہے۔ اس پیغام کی وضاحت میں حضورؐ نے جو کچھ فرمایا یا عمل کیا وہ بھی دین کا لازمی حصہ ہے جس سے صرف نظر کرنا دین کے ایک حصہ سے دستبرداری ہے۔ آپ کی دی ہوئی تعلیم دائمی اور ابدی ہے جس سے انسان رہتی دنیا تک مستغنی نہیں ہو سکتا۔ جب تک آدمی حضورؐ کی اس حیثیت کو تسلیم نہ کرے وہ خدا کے ہاں کبھی سرخرو نہیں ہو سکتا۔ اب ماضی بعید کے پیغمبروں کی لائی ہوئی تعلیم کسی کام نہیں آ سکتی۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا کہ آج موسیٰ علیہ السلام بھی دنیا میں آ جائیں

تو ان کے لیے میری پیروی کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ اور اگر عیسیٰ علیہ السلام آئیں تو وہ خود نماز میں امام بننے کی بجائے میرے کسی امتی ہی سے امام بننے کے خواستگار ہوں گے۔

اطاعت:

رسول کے پاس محض زبانی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ احکام و ہدایات بھی ہوتی ہیں جن کی اطاعت ہر اس شخص پر لازم ہوتی ہے جو اس رسول پر ایمان لاتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہؐ کی اطاعت آپ کا ایک ایسا حق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا:

وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ. (النساء۴:۶۴)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

سورہ محمد کی آیت ۳۳ میں ہدایت فرمائی کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ اگر اطاعت نہ کرو گے تو محض ایمان لانا بے معنی ہوگا اور تمہارے بظاہر نیک اعمال بھی رائیگاں ہو جائیں گے۔

اطاعت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی زندگی میں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے یہ معلوم کرے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اس معاملہ میں کیا رہنمائی دی ہے۔ جب معلوم ہو جائے کہ اس بارہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول میں فلاں طرز عمل درست قرار دیا گیا ہے تو پھر دنیا کا بڑے سے بڑا مفاد بھی اس درست طرز عمل کو اختیار کرنے سے آدمی کو نہ روک سکے۔ اپنوں کی محبت اور غیروں کی دشمنی اس کو صحیح قدم اٹھانے سے متزلزل نہ کر سکے۔ وہ اپنے مسائل اور قضیوں میں کتاب و سنت میں جو ہدایات پائے ان پر پورے اطمینان اور رضامندی کا اظہار کرے اور ان کے خلاف دل میں ذرا بھی ملال نہ آنے دے۔

قرآن مجید میں ان لوگوں کا ایمان تسلیم نہیں کیا گیا جو اللہ اور رسول پر ایمان لانے کا اظہار کریں اور وعدہ کریں کہ وہ ان کی اطاعت کریں گے لیکن پھر وہ اس وعدہ سے روگردانی کریں۔ (النور۲۴:۴۷) اسی طرح یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ اللہ اور رسول پر ایمان لانے کے بعد کسی صاحب ایمان کے پاس اس بات کا اختیار نہیں رہ جاتا کہ وہ پیغمبر کے فیصلہ کے خلاف کوئی اقدام کرے۔ رسول اللہؐ کی نافرمانی اس کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیل کر اس کی ہلاکت کا باعث بن سکتی ہے۔ (الاحزاب۳۳:۳۶)

نبی ﷺ نے لوگوں کی اس غلط فہمی کو بھی رفع کر دیا کہ آپ کے بعد وہ رہنمائی کہاں سے پائیں گے۔

چنانچہ آپ نے بطور وصیت فرمایا کہ میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے اس وقت تک تم گمراہ نہ ہو گے۔ وہ ہیں اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت (موطا، کتاب القدر، باب ۱) اس طرح حضورؐ نے اپنی سنت کو اپنی ذات کا قائم مقام قرار دیا۔ چونکہ یہ سنت امت مسلمہ کے عمل کا حصہ بن کر محفوظ ہو چکی ہے اس لیے جب تک دنیا قائم ہے اور اس میں مسلمان بستے ہیں اس وقت تک یہ سنت بھی انسانوں کی رہنمائی کے لیے موجود ہے۔

اتباع:

اتباع کا مطلب قدم بقدم کسی کے پیچھے چلنا ہے۔ اس میں یہ کوشش ہوتی ہے کہ آگے لگنے والے نے جیسا کچھ کیا پیچھے لگنے والا بھی وہی کچھ کرے۔ اپنے اندر وہی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے جو اس کے پیشرو میں ہیں۔ اللہ کا رسول جس طرح کوئی عمل کرتا ہے وہ اس عمل کے کرنے کا بہترین انداز ہوتا ہے۔ اس لیے رسول کا عمل دوسروں کے لیے کامل نمونہ یا اسوۂ حسنہ ہوتا ہے۔ ایک صاحب ایمان آدمی جس قدر اس نمونہ سے قریب تر ہو کر اپنا عمل کرتا ہے اتنا ہی اس کا عمل درست اور عند اللہ مقبول ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ کے ساتھیوں کی یہ عادت تھی کہ وہ حضورؐ کی ایک ایک ادا کو دیکھتے، اس کو نظر میں رکھتے اور پھر خود اس کی تقلید کرتے اور ان ساتھیوں کے آگے اس کا مظاہرہ کرتے جو رسول اللہؐ کی خدمت میں اس وقت حاضر نہ ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور کے بے شمار اعمال و افعال کا انداز امت کے عمل میں اس طرح داخل ہو چکا ہے کہ ہر شخص اس کی پیروی از خود کرتا ہے۔ کتب حدیث میں حضورؐ کے سونے، جاگنے، اٹھنے، بیٹھنے، کھانے، پینے اور گفتگو کرنے کے عمل کا نہایت واضح بیان موجود ہے۔ صحابہؓ نے اپنے ساتھیوں کو حضورؐ کے انداز پر وضو کرنے اور غسل کرنے کی تعلیم دینے کے لیے عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔ ان میں سے ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی کہ حضورؐ کی اتباع کر کے اپنی زندگی کو حضورؐ کے پسندیدہ طرز زندگی کے سانچے میں ڈھال لے۔

اتباع اس شخصیت کی کی جاتی ہے جس کے ساتھ آدمی کو عقیدت ہو۔ رسول چونکہ خدا کا نمائندہ ہوتا ہے اس لیے اس کے ساتھ عقیدت کا اظہار اور اس کے نتیجہ میں اتباع کر کے آدمی بالواسطہ اللہ سے محبت کا اظہار کرتا ہے اور یہ چیز خود اس بندے کو خدا کا محبوب بندہ بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳:۳۱)

"کہہ دو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا۔

یعنی اللہ سے محبت کے اظہار کا راستہ بھی رسول اللہؐ کی پیروی سے ہو کر آتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، امت نے آنحضرت ﷺ کے پسندیدہ طور طریقوں کو بڑی حد تک اپنے اعمال میں سمو لیا ہے اور حدیث میں ان کا بہت بڑا ذخیرہ بیانیہ انداز میں محفوظ ہو گیا ہے۔ اس لیے آج بھی ہر صاحب ایمان اس کی پیروی کر سکتا اور اپنی زندگی حضورؐ کی زندگی کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔ اللہ کے ہاں اس کا یہ عذر مسموع نہیں ہوگا کہ اس نے حضورؐ کا زمانہ نہیں پایا تھا اس لیے وہ آپ کی پیروی سے محروم رہا۔

محبت:

رسول اللہ ﷺ کا ایک اہم حق یہ ہے کہ آپ سے محبت کی جائے۔ بعض مسلمان حضورؐ کی حیات مبارکہ کے دوران ایمان کا دعویٰ کرتے لیکن دل میں حضورؐ کے لیے بغض رکھتے۔ اسی طرح منافقین حضورؐ کے بلاوے پر مسجد میں حاضری دیتے اور بظاہر حضورؐ کے احکام کی تعمیل بھی کرتے لیکن یہ سب کچھ اداکاری کے انداز میں ہوتا۔ ان کا دل ان کے عمل کا ساتھ نہ دیتا اور یہ لوگ موقع ملتے ہی کھسک جاتے اور اس بات کی پروا نہ کرتے کہ ان کی یہ حرکت حضورؐ کی ناراضی کا باعث ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے ایمان اور ان کی اطاعت کو تسلیم نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایمان اور اطاعت معتبر نہیں ہے جس کی بنیاد محبت پر نہ ہو۔ نبی ﷺ نے اس بات کو خود واضح فرمایا:

> تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کی اولاد، اس کے باپ، اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں[1]۔

حضورؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ساتھ یہ محبت ایسی ہونی چاہیے جو دوسرے تمام لوگوں کی محبتوں پر غالب آ جائے۔ جس کے لیے دنیا کی ہر چیز کو چھوڑا جا سکے لیکن اس محبت کو کسی قیمت پر نہ چھوڑا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی حضورؐ کی لائی ہوئی تعلیمات اور آپ کے بتائے ہوئے طریقہ یعنی سنت سے کسی صورت میں صرف نظر نہ کرے۔ اگر اس کا نفس اس راہ میں مزاحم ہو تو اس کی خواہشات کی قربانی دے دے اور اگر بیوی بچے، ماں باپ اور قوم و قبیلہ اس میں مزاحم ہوں تو ان کے مطالبات کو ٹھکرا دے۔ یہ حقیقت حضورؐ نے اپنے ارشاد میں بھی واضح فرمائی۔

> جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا[2]۔

اس محبت کا ایک تقاضا یہ ہے کہ آدمی رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ کی رحمت اور آپ کی سلامتی کی دعا برابر

کرتا رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر صاحب ایمان رسول اللہ ﷺ کا ممنون ہے کہ آپ نے محنت شاقہ کے بعد اللہ کا پیغام نہایت واضح طریقہ سے امت تک پہنچا دیا اور اہل ایمان کی فلاح کی راہ کھولی۔ جس طرح ہر اچھا آدمی اپنے والدین اور عزیزوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتا ہے اور ان کے انتقال کے بعد ان کی مغفرت کی دعا کرتا ہے، اسی طرح نبی ﷺ کے لیے آپ کی حیات مبارکہ کے دوران آپ پر فدا ہونا، آپ کو دشمنوں کے شر سے بچانا ہر مسلمان پر لازم تھا۔ علی ہذا القیاس دنیا سے آپ کے رخصت ہونے کے بعد آپ کے لیے رحمت و سلامتی اور درجات کی بلندی کی دعا کرنا بھی آپ کا حق ہے۔ حضورؐ نے اس امتی کو نہایت بخیل قرار دیا جو آپ کا اسم گرامی لینے پر آپ کے لیے صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا نہ کرے۔ نبی ﷺ کی محبت کے اس تقاضے کا قرآن میں بطور خاص ذکر ہوا ہے۔ فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا.

(احزاب ۳۳:۵۶)

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود و سلام بھیجو اچھی طرح۔

تعزیر:

جس طرح اہل کتاب کو رسول اللہ ﷺ کے دست و بازو بننے کی تلقین کی گئی تھی، اسی طرح امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری بتائی گئی کہ وہ حضورؐ کو تفویض کردہ مشن کی تکمیل میں آپ کا ہاتھ بٹائے۔ جب امت کو ابراہیمی قبلہ کی نعمت سے نوازا گیا تو اس پر واضح کیا گیا کہ ابراہیمی قبلہ عطا ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ کے فرض منصبی کی تکمیل میں تم کو بھی شریک کر رہا ہے۔ رسول تمہارے اوپر دین حق کی شہادت دیں گے اور تم اس حق کو اللہ کے دوسرے بندوں تک پہنچاؤ گے۔ اہل عالم تک دین حق کو پہنچانے کی ذمہ داری تمہارا رسول کے ادا کرنے کی نہیں ہے۔ فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا.

(البقرہ ۲:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔

پیچھے بیان ہو چکا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کس طرح تبلیغ دین کے دائرہ کو درجہ بدرجہ بڑھایا یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آپ کی دعوت جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر رومیوں، ایرانیوں اور اہل حبشہ میں بھی متعارف ہو

گئی اور کتنے حکمران اس کی قوت کو محسوس کرنے لگے۔ جن جن علاقوں میں لوگوں نے اسلام قبول کیا صحابہ کرام ان کو قرآن کی تعلیم دینے اور دین سکھانے کے لیے جا موجود ہوئے اور اپنا فرض ادا کیا۔ رسول اللہؐ کے بعد امت مسلمہ متحرک ہوگئی اور دین کی اشاعت کی خاطر ہر اس قوت سے ٹکرا گئی جو اس میں مزاحم ہوئی۔ اس نے ان تمام فرائض رسالت کو خود سنبھال لیا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کے تمام میدانوں میں اپنی قوتیں صرف کیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں سابقہ امتیں نہ اپنے عقائد کو درست رکھ سکیں، نہ اپنے صحیفوں کی حفاظت کر سکیں اور نہ اپنی عبادات پر قائم رہیں، امت مسلمہ نے اپنے صحیفہ ہدایت کو مشعل راہ بنایا، اس کو حفظ کیا، اس کی زبان اور اس کے علم کو محفوظ رکھا، پیغمبر ﷺ کے اقوال وافعال کو ان کی اصل شکل میں اگلی نسلوں کو منتقل کرنے کی کوشش کی۔ نماز، روزہ اور حج کی عبادات آج بھی اسی طرح ادا ہو رہی ہیں جس طرح حضورؐ کے زمانہ میں ادا ہوتی تھیں۔ صحیح عقائد کا علم ہر اس شخص کو آج بھی حاصل ہو سکتا ہے جو لادینی یا محرف عقائد سے بچ کر ان کی جستجو کرے۔ امت کے اندر دین حق کو پھیلانے اور غلط نظریات ونظامہائے زندگی کا مقابلہ کرنے کا جذبہ آج بھی موجود ہے، خواہ یہ جذبہ امت کے ایک قلیل حصہ ہی میں پایا جائے۔ رسول اکرم ﷺ کے بعد امت مسلمہ کے رول کو جس قدر بھی حقیر سمجھا جائے اس حقیقت کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں کہ دین حق کو اس کی اصل شکل میں باقی رکھنے میں اس کی خدمات سابقہ امتوں کے مقابل میں کہیں زیادہ قابل فخر ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے مشن کی تکمیل میں آج کے دور میں مزید محنت کی ضرورت ہے۔ امت اس تفرقہ کا شکار ہے جس سے قرآن نے مسلمانوں کو روکا تھا اور اس سے بچنے کے لیے اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کی ہدایت دی تھی۔ نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد اللہ کی کتاب اور پیغمبرؐ کی سنت کو ہرگز نہ چھوڑنا ورنہ راہ ہدایت کو کھو بیٹھو گے۔ اگر امت مسلمہ متحد ہو کر کتاب اللہ اور سنت کو تھامنے اور ان کو عملی زندگیوں میں رائج کرنے کا اہتمام کر لے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ پھر بھی زبوں حال رہے۔ اس وقت مسلمان دنیا کے تمام براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ ان میں دینی تعلیم کا فقدان ہے۔ مسلمانوں کے لیے کوئی ایسا مرکز نہیں ہے جو ان کا پرسان حال ہو، ان کے مسائل کو حل کرے اور دینی آگاہی کا سامان ان کی اپنی زبانوں میں کرے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے وسائل مجتمع کر کے ایک مرکز کو وجود میں لائیں۔ اس میں اپنے فیصلے خود ملی مفاد میں کریں، دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو کر ایک قوت بنیں اور دنیا پر ثابت کریں کہ وہ اپنے دین کے ساتھ

دل کی گہرائیوں سے وابستہ ہیں اور وہ دنیا بھر کے لوگوں کو اس نعمت سے شادکام کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔

توقیر:

توقیر کا مفہوم رسول اللہ ﷺ کی بلند و برتر حیثیت کو پہچاننا، آپ کو آپ کے عظیم مرتبہ کے مطابق عزت دینا اور آپ کی قدر افزائی کرنا ہے۔ بعض لوگوں کا طریقہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو غیر معمولی اہمیت دیتے اور باقی ساری دنیا کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی اور محترم و مکرم شخصیت کو بھی خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اگر کسی ایسی شخصیت کے ساتھ معاملہ ہو تو بناوٹی طریقوں سے اپنی شخصیت کا اظہار ایک معزز لیڈر کے طور پر کریں۔ حضورؐ کی توقیر کا تقاضا یہ ہے کہ ایک بندہ مومن اپنے آپ کو حضورؐ کے سامنے نہایت حقیر سمجھے اور دب کر رہے، کیونکہ آپ ہر صاحب ایمان کے معلم و مربی ہیں۔ اسے ہر دم یہ فکر لاحق رہے کہ میں کسی ایسی حرکت کا مرتکب نہ ہو جاؤں جس سے حضور کی بے ادبی کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔

قرآن نے نبی ﷺ کے ساتھ بے ادبی کے رویہ کو خدا سے بے خوفی قرار دیا اور مسلمانوں کو سخت تنبیہ کی کہ وہ اپنی حدود میں رہیں اور رسول اللہؐ سے اپنے آپ کو آگے بڑھانے کی کوشش نہ کریں۔ اسی طرح جب وہ آپ سے گفتگو کریں تو تحکم کا سا انداز اختیار نہ کریں بلکہ مودب ہو کر اپنے مسائل آپ کے سامنے پیش کریں۔ اس دوران میں ان کی آواز رسول اللہؐ کی آواز سے بلند نہیں ہونی چاہیے۔ فرمایا:

> يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ. اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ. (الحجرات ۴۹: ۱۔۲)
>
> اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ اور رسول کے سامنے اپنی رائے مقدم نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ایمان لانے والو! تم اپنی آواز نبی کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ اس کو اس طرح آواز دے کر پکارو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو، مبادا تمہارے اعمال ڈھے جائیں اور تم کو احساس بھی نہ ہو۔

صحابہ کرامؓ کو یہ ہدایات دینے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مدینہ منورہ میں جب اسلامی حکومت نے پے در پے کامیابیاں حاصل کر کے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی تو بہت سے قبائل نے مدینہ سے اظہار وفاداری ہی میں عافیت سمجھی۔ ان کے سرداروں کا خیال یہ تھا کہ چونکہ ہم نے اسلامی حکومت کی اطاعت بغیر اس سے جنگ کیے کر لی ہے

لہٰذا ہم نے رسول اللہؐ پر ایمان لا کر ان پر احسان کیا ہے۔ وہ اپنا حق سمجھتے کہ جب مدینہ میں آئیں تو حضورؐ احسان مندی کے جذبہ سے اپنے کام چھوڑ چھاڑ کر ان کی خدمت میں لگ جائیں اور وہ جو رائے یا مشورہ دیں اس کو بے چون و چرا تسلیم کریں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ حضورؐ کے لیے مسلمانوں میں مروج طرز تخاطب 'یارسول اللہؐ' کہنے کے بجائے برابری کی سطح پر 'یا محمدؐ' کہہ کر آپ کو آوازیں دیتے۔ پھر جب حضورؐ تشریف لاتے تو اپنی آراء و مسائل پیش کرتے وقت آپ کی آواز سے بلند تر آواز میں اپنا موقف پیش کرتے۔ ان کی اس عادت کی اصلاح کے لیے ان پر واضح کیا گیا کہ ایک شخص جب ایمان لاتا ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول پر کوئی احسان نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اس پر اللہ کا احسان ہوتا ہے کہ وہ اس کو ایمان کی توفیق دیتا اور اسے راہ راست کی طرف رہنمائی دیتا ہے۔ اللہ اس پر مہربان نہ ہوتا تو وہ کفر کی تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا اور انجام کار اس عذاب سے دوچار ہوتا جو کفار کے لیے مقدر ہے۔

آنحضرت ﷺ کی بےقدری کے اس طرز عمل کا ایک نہایت روح فرسا نتیجہ قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ ایسا کرنے سے ایمان لانے والے شخص کے تمام نیک اعمال اکارت جاتے ہیں اور اس کو اپنی اکڑفوں میں اس کا شعور ہی نہیں ہونے پاتا کہ وہ کتنے بڑے حادثہ سے دوچار ہو چکا ہے۔ جب وہ قیامت کے روز اللہ کے حضور پیش ہو گا تو اس کو پتا چلے گا کہ اس کے دامن میں تو کوئی نیکی نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں حضورؐ کی بےادبی کا گناہ اتنا بڑا ہے کہ وہ آدمی کی زندگی بھر کی نیکیوں پر غالب آ کر ان کو کالعدم کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سچے اہل ایمان آج بھی حضورؐ کے بارے میں گستاخی کا کوئی کلمہ زبان پر نہیں لاتے۔ روضہ نبوی میں حاضری کے وقت درود و سلام پیش کرتے ہیں تو نہایت عاجزی سے کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص بلند آواز سے کلام کر رہا ہو تو روضہ نبوی کے محافظ اس کو ٹوکتے اور مودب ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے بھی لوگ اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں۔

یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اپنی رایوں کو رسول اللہؐ کی رائے پر مقدم کرنے کا معاملہ صرف حضورؐ کی حیات مبارکہ کے دوران ہی ممکن تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ خاتم النبیین ہیں۔ آپ کی تعلیم، آپ کا طرز زندگی اور آپ کی سنت قیامت تک کے لیے موجود اور تمام انسانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ ہر سچا مومن آپ کو ماضی کے دبیز پردوں میں گم ہو جانے والی ایک شخصیت نہیں سمجھتا بلکہ آپ کی روحانیت کو زمانہ حال میں بھی محسوس کرتا اور آپ کے ساتھ تعلق خاطر قائم کر لیتا ہے۔ لہٰذا آج بھی ضروری ہے کہ حضورؐ کی توقیر و تعظیم کو بطور واجب الادا حق ادا کیا جائے۔ آپ کی لائی ہوئی تعلیم کو فرسودہ اور دور حاضر کی ضرورت سے ناآشنا قرار نہ دیا جائے اور حضورؐ کو دوسرے انسانوں

کی سطح پر لا کر آپ کے عظیم مرتبہ کی نفی کر کے اپنی نیکیاں برباد نہ کی جائیں۔

اس زمانہ میں مغرب زدہ طبقہ دین کے معاملات کو دقیانوسی سمجھتا اور دینی نظام حیات اور شرعی احکام کو از کار رفتہ قرار دے کر ان سے جان چھڑانے کے درپے رہتا ہے۔ یہ لوگ دل سے حضورؐ کے لائے ہوئے دین سے بے زار ہیں اور اس کی عائد کردہ حدود و قیود کو اپنی مادر پدر آزادی اور عیش کوشی میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں نے دین کے متوازی اپنے الگ نظام رائج کر رکھے ہیں اور لوگوں کو انہی کی بھول بھلیوں میں ڈالے رکھنا چاہتے ہیں وہ حضورؐ کے کسی بھی حق کو ادا نہیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے بظاہر تو ایمان کا دعویٰ کر رکھا ہے لیکن اس کا پول اس وقت کھلے گا جب وہ عالم الغیب والشہادۃ کے حضور پیش ہوں گے اور ان کے دعویٰ کی قلعی کھل جائے گی۔ ایسے لوگوں کے لیے قرآن مجید کی تلقین یہی ہے کہ:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ. وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. (النساء۴:۱۷۰)

اے لوگو! رسول تمہارے پاس، تمہارے رب کے پاس سے حق لے کر آ گیا ہے۔ پس ایمان لاؤ، اسی میں تمہاری بہتری ہے اور اگر کفر پر جمے رہو گے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔

حوالہ جات

۱ صحیح مسلم۔ کتاب الایمان، باب ۱۶

۲ تزکیہ نفس۔ امین احسن اصلاحی۔ بحوالہ جامع ترمذی

باب 50

اسوہ حسنہ

اللہ تعالیٰ جب رسول مبعوث کرتا ہے تو اس کے لیے صحیفہ ہدایت بھی نازل کرتا ہے۔ رسول کا کام، جیسا کہ پیچھے بیان ہو چکا ہے، اس صحیفہ ہدایت کو لوگوں تک پہنچانا اور اس پر خود عمل کرنا ہوتا ہے۔ بعثت سے قبل بھی رسول ابنائے زمانہ میں بہترین اخلاق و کردار کا حامل ہوتا ہے۔ اس کو جب وحی کی تعلیم ملتی ہے تو وہ پہلے سے بھی بلند تر درجہ کمال کو حاصل کر لیتا اور قول و فعل کا وہ بہترین ماڈل پیش کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہوتا ہے۔ اسی لیے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ رسول کے پیش کردہ عملی نمونہ کو اپنے لیے معیار بنائیں۔ یہ نمونہ اسوہ حسنہ کہلاتا ہے۔ قرآن مجید میں اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہارے ہر اس شخص کے لیے، جو اللہ سے ملاقات اور روز آخرت کے محاسبہ کی توقع رکھتا اور اللہ کو زیادہ یاد کرتا ہو، رسول اللہؐ کے عمل میں بہترین نمونہ ہے۔ (احزاب ۳۳:۲۱) ہر صاحب ایمان کے سامنے یہ ہدف ہونا ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی اسی کامل نمونہ کے مطابق ڈھالے کیونکہ زندگی کا یہی نہج اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا مزاج، کریمانہ اخلاق، صبر و شکر، توکل علی اللہ، استقامت، صدق و انابت آپ کی حیات مبارکہ کے ایک ایک شب و روز سے عیاں ہے۔ تاہم ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک جھلک قارئین کو دکھانے کے لیے گنتی کی چند احادیث یہاں درج کر دی جائیں تاکہ جو لوگ اس چشمہ صافی سے سیراب ہونا چاہتے ہوں ان کے لیے ذرا سی فوری رہنمائی میسر ہو۔ ورنہ حضورؐ کی سیرت کے بیان کے لیے کتنے دفتر درکار ہیں۔

نبی کریم ﷺ مکی زندگی میں ابھی دین حق کو پھیلانے کی جدوجہد میں مصروف تھے اور کفار قریش آپ کی مخالفت میں ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کر رہے تھے تو قرآن نے حضورؐ کے حسن اخلاق کی تحسین کرتے ہوئے فرمایا اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیمٍ (القلم ۶۸:۴) 'بلاشبہ تم عظیم کردار کا مظاہرہ کر رہے ہو'۔ اس عظیم کردار کی تعلیم آپ نے ایمان لانے والے ساتھیوں کو بھی دی اور اچھے اور برے کردار میں امتیاز کرنا سکھایا۔ چند احادیث حسب ذیل ہیں:

- نواس بن سمعانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: 'حسن اخلاق نیکی ہے۔ گناہ وہ ہے جو تیرے

دل میں کھٹک پیدا کرے اور تجھے یہ بات ناگوار ہو کہ دوسرے لوگوں کو اس کا پتہ چلے'۔

حضورؐ کے اس ارشاد میں ایک ایسی کسوٹی بتا دی گئی ہے جس پر پرکھ کر ہر عمل کو جانچا جا سکتا ہے کہ وہ خدا کے ہاں گناہ کا کام قرار پائے گا یا ثواب کا۔ گناہ اور برائی کی فطرت یہ ہے کہ وہ گناہ کرنے والے کے ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے اور آدمی دوسروں کی نظروں سے اس کو اوجھل رکھنا چاہتا ہے۔ اعلیٰ اخلاق اور نیکی کے کاموں سے آدمی شرم محسوس نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کی اعلیٰ فطرت کا مظہر ہوتے ہیں۔

- ابوذر غفاریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تم میں سے کوئی معمولی سے معمولی نیکی کو حقیر نہ سمجھے۔ اور کچھ نہ کر سکے تو اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے مل ہی لے۔
- ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے سوال کیا 'یا رسول اللہ! تمام لوگوں میں سے میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟' آپ نے فرمایا 'تمہاری ماں'۔ اس نے پوچھا: 'اس کے بعد کون؟' آپ نے فرمایا: 'تمہاری ماں'۔ اس نے عرض کی: 'اس کے بعد؟' آپ نے فرمایا: 'تمہاری ماں'۔ اس نے پوچھا 'پھر کون؟' آپ نے فرمایا 'تمہارا باپ'۔
- ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: کوئی بیٹا اپنے باپ کے احسان کا بدلہ نہیں اتار سکتا۔ اگر اتار سکتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ وہ باپ کو کسی کی غلامی میں دیکھے تو اس کو خرید کر آزاد کر دے۔
- عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہؐ کا فرمان ہے کہ رب کی خوشنودی والد کی خوشنودی میں اور رب کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے۔

حضورؐ کے ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے بعد بندوں کے حقوق میں فائق حق ماں کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد باپ کا حق آتا ہے۔ لیکن باپ کے مقابلہ میں ماں کا حق تین گنا ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں لوگ ان حقوق کو مادی ترازو میں تولنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ قرآن مجید میں ان کا حوالہ والدین کی اس شفقت اور خدمت و تربیت کے لحاظ سے ہے جو بچے کو گھر میں حاصل ہوتی ہے۔

- انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہؐ سے سوال کیا کہ 'قیامت کب آئے گی؟' آپ نے پوچھا: 'تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟' اس نے جواب دیا: 'اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں'۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: 'تو انہی لوگوں کے ہمراہ ہوگا جن سے تو محبت کرتا رہا ہوگا'۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس قسم کے لوگوں سے کوئی شخص دنیا میں محبت کا تعلق رکھتا ہوگا انہی کے ہمراہ اس کو اٹھایا جائے گا۔ سائل اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت ایمان کا جزو ہے۔ اس لیے جونہی اس نے اس محبت کو اپنا سرمایہ افتخار بتایا تو نبی ﷺ نے اس کو بشارت دی کہ آخرت میں تو میرے ساتھ ہوگا۔

- ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: 'حسد کرنے سے بچو کیونکہ حسد نیک اعمال کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ ایندھن کو کھا جاتی ہے'۔
- ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایک آدمی نے سوال کیا کہ ایک شخص یہ تو پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور جوتے خوبصورت ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا: 'اللہ خود خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر کی حقیقت حق کے بالمقابل اکڑنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے'۔
- ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: 'ایک آدمی سچ بولتا رہتا اور سچ ہی کی جستجو کرتا رہتا ہے تو بالآخر اللہ کے ہاں اس کے لیے صدیق کا مقام لکھ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی جھوٹ بولتا رہتا اور جھوٹ ہی کی جستجو کرتا رہتا ہے تو ایک وقت آتا ہے جب اللہ کے ہاں اس کو جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے'۔

کردار کسی صفت کے اتفاقی مظاہرہ سے وجود میں نہیں آتا۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ صفت انسان کی عادت ثانیہ بن جائے۔ کبھی کبھار سچ بولنے سے آدمی صدیق (بے حد سچا اور پکا) نہیں کہلاتا۔ اس کے لیے لازم ہے کہ آدمی کی زبان جھوٹ سے آشنا ہی نہ ہوتی ہو۔ وہ سچ کی خاطر اپنا مفاد قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا ہو اس کے لیے جب سچ کی قدر و قیمت اتنی بڑھ جائے گی کہ وہ اس سے بالکل پہلو تہی نہ کر سکے تب اللہ کے ہاں وہ 'سچا' لکھا جائے گا۔ اسی پر دوسری تمام اچھی صفات کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بری صفت جب کسی شخص کے اندر گھر کر جاتی ہے اور وہ اسی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے تو اس کو خدا کے ہاں اس بری صفت کا حامل قرار دے دیا جاتا ہے۔

- صفوان بن سلیمؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے پوچھا 'یا رسول اللہ! کیا ایک مومن بزدل ہو سکتا ہے؟' آپ نے فرمایا: 'ہاں'۔ پھر پوچھا گیا: 'کیا مومن کنجوس ہو سکتا ہے؟' آپ نے فرمایا: 'ہاں'۔ پھر دریافت کیا گیا: 'کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے؟' آپ نے جواب دیا 'نہیں'۔

یعنی ایک صاحب ایمان آدمی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امت مسلمہ حق کی شہادت کے لیے

وجود میں آئی ہے۔ جو شخص یہ فریضہ ادا نہیں کرتا وہ اپنی بدعملی کے باعث امت کے ایک فرد کے طور پر اپنے وجود ہی کی نفی کر دیتا ہے۔

- ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ایک آدمی کے جھوٹا ہونے کا یہی ثبوت کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اس کو (بلا تحقیق) آگے بیان کر دے۔
- عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہیں لیا۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ کی ٹھہرائی ہوئی کسی حرمت کی توہین کی جاتی تو آپ اللہ کی طرف سے اس کا انتقام لیتے۔
- سعید مقبریؓ راوی ہیں کہ جب حضورؐ کوئی اچھا عمل شروع کرتے تو اس پر ثابت قدم رہتے اور ہمیشہ اس پر عامل رہتے۔
- ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کو پسند وہ اعمال ہیں جن پر مسلسل عمل کیا جائے، اگر چہ وہ مقدار میں کم ہوں۔

یعنی کبھی کبھار جوش میں آ کر کسی نیکی کا بڑی مقدار میں مظاہرہ کرنے کے بجائے اللہ کو یہ بات زیادہ پسند ہے کہ اس نیکی کو مستقلاً اختیار کیا جائے خواہ عمل کی مقدار کم ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو نیکی مسلسل کی جائے وہ کردار سازی کا وسیلہ بن جاتی ہے جبکہ تھوڑے عرصہ کے اس کا مظاہرہ آدمی کے کردار پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

- عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کو ہر اچھے کام کا دائیں طرف سے آغاز کرنا پسند تھا۔ آپ وضو کے اعضاء دھونے میں، بالوں میں کنگھی کرنے میں اور جوتا پہننے میں اس کا لحاظ کرتے۔ جب کسی مجلس میں ہوتے اور کوئی چیز شرکاء میں تقسیم کرنی ہوتی تو خواہ دائیں جانب کوئی بچہ اور بائیں جانب بزرگ صحابہ بیٹھے ہوتے، آپ دائیں جانب ہی سے تقسیم کا آغاز فرماتے۔

دائیں بائیں کی تفریق اور ان کو اچھے اور گندے کام کے ساتھ وابستہ کرنے سے ذہن میں ایک کسوٹی قائم ہو جاتی ہے جو آدمی کو نیک اور بد میں تفریق کرنا سکھاتی ہے۔

- ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ چادر میں لپٹی ہوئی دوشیزہ سے زیادہ حیادار تھے۔ اگر آپ کو کوئی بات پسند نہ آتی تو ہم آپ کے چہرے کے اثرات سے پہچان لیتے۔
- عبداللہ بن عباسؓ راوی ہیں کہ حضورؐ بھلا کرنے میں تمام لوگوں سے بڑھ کر فیاض تھے۔ رمضان المبارک

میں جبریل امینؑ آپ سے قرآن کا مذاکرہ کرنے کے لیے آتے تو ان ایام میں آپ بھلائی میں بادتند سے بھی زیادہ سخی ہو جاتے۔

نبی ﷺ اپنی امت پر بہت مہربان اور اس کی فلاح کا بے حد خیال رکھنے والے تھے۔ آپ ان چیزوں کی نشان دہی فرماتے جو اہل ایمان کو مستقبل میں نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں آپ نے مختلف پیرایوں میں سمجھایا کہ فلاں فلاں گناہ اپنے اثرات کے لحاظ سے معمولی نہیں بلکہ انتہائی مہلک ہیں۔ ان سے بچ کر رہا جائے۔ اس سلسلہ کی چند احادیث ملاحظہ ہوں:

- ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ سات مہلک گناہوں سے بچ کر رہو۔ پوچھا گیا: یا رسول اللہ وہ کون سے گناہ ہیں تو آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا۔ جادو (کرنا اور کروانا)۔ کسی قانونی حق کے بغیر کسی محترم جان کو قتل کرنا۔ یتیم کا مال کھانا۔ زنا کرنا۔ بھولی بھالی مومنہ شریف عورتوں پر تہمت لگانا۔ گھمسان کے رن میں میدان جہاد سے بھاگنا۔
- ابوبکرہؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں تین سب سے بڑے کبیرہ گناہوں کی خبر نہ دوں؟ وہ ہیں: اللہ کا شریک ٹھہرانا۔ والدین سے قطع تعلق۔ جھوٹی گواہی دینا یا جھوٹ بولنا۔ ابوبکرہؓ بتاتے ہیں کہ جس وقت آپ یہ فرما رہے تھے تو ٹیک لگائے ہوئے نیم دراز تھے۔ پھر آپ بیٹھ گئے اور تیسرے گناہ کبیرہ کو اس قدر دہرایا کہ ہماری یہ تمنا ہوئی کہ کاش آپ خاموش ہو جائیں۔
- عبداللہ بن عمروؓ راوی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: چار خصلتیں جس شخص کے اندر پائی جائیں وہ کامل منافق ہوتا ہے۔ ان میں سے اس میں اگر ایک خصلت پائی جائے گی تو جب تک وہ اس کو چھوڑ نہ دے، اس میں منافقت کی ایک خصلت موجود رہے گی۔ وہ چار خصلتیں یہ ہیں:

☆ جب کوئی امانت اس کے حوالہ کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

☆ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

☆ جب عہد کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔

☆ جب جھگڑا کرے تو گالم گلوچ پر اتر آئے۔

- حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تمہیں

ضرور بھلائی کا حکم و مشورہ دینا اور برائی سے روکنا ہوگا، ورنہ قریب ہے کہ اس میں کوتاہی کے باعث اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر کوئی سزا مسلط کر دے۔ پھر تم اللہ کو پکارو تو وہ تمہاری دعا نہ سنے۔

امت سے رسول اللہؐ کی محبت اور اس کے لیے خیر خواہی کا ثبوت حسب ذیل واقعہ سے بھی ملتا ہے:

انسؓ فرماتے ہیں کہ ام سلیمؓ کے ہاں ایک یتیم بچی رہتی تھی۔ ایک دن نبی ﷺ نے اس کو دیکھا تو پوچھا تم فلاں لڑکی ہو۔ کتنی بڑی ہوگئی ہو، خدا تمہاری عمر نہ بڑھائے! بچی یہ سن کر روتی ہوئی ام سلیمؓ کے پاس گئی۔ انہوں نے پوچھا: بیٹی کیا ہوا؟ اس نے بتایا کہ نبی ﷺ نے مجھے بد دعا دی ہے کہ میری عمر نہ بڑھے۔ یہ سنتے ہی ام سلیمؓ نے دوپٹہ اوڑھا اور حضورؐ کے پاس پہنچ گئیں۔ حضورؐ نے پوچھا: ام سلیم، کیسے آنا ہوا؟ انہوں نے کہا، اے اللہ کے نبی! آپ نے میری بچی کو بد دعا دی ہے؟ آپ نے پوچھا: کون سی بد دعا؟ انہوں نے کہا: بچی کا کہنا یہ ہے کہ آپ نے اس کو عمر نہ بڑھنے کی بد دعا دی ہے۔ حضورؐ ہنسے اور فرمایا ام سلیم! اللہ کے ہاں میں نے جو شرط لگا رکھی ہے شائد تمہیں اس کا علم نہیں ہے؟ میں نے یہ شرط لگائی ہے کہ یا اللہ! میں ایک انسان ہوں، ہر انسان کی طرح میں بھی خوش ہوتا ہوں اور کبھی مجھے غصہ آ جاتا ہے۔ اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو بد دعا دے دوں جس کا وہ مستحق نہ ہو تو اس بد دعا کو اس کے حق میں اچھی دعا، پاکیزگی اور تقرب میں بدل دینا جو تو اسے قیامت کے روز عطا فرمائے۔

حضورؐ کی ایک مستقل عادت مبارکہ یہ تھی کہ آپ مشکل پسند نہ تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب بھی کوئی ایسا معاملہ آپ کے سامنے آتا جس کے دو پہلو ہوتے، ایک آسان اور دوسرا مشکل، اور آپ کو ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا برابر حق حاصل ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان پہلو کو اختیار فرماتے۔ ہاں اگر ان میں سے کسی میں گناہ کا احتمال ہوتا تو آپ اس کے قریب نہ جاتے۔ صحابہ کرامؓ کو بھی آپ کی تلقین یہی ہوتی کہ دین میں آسانی کی راہیں اختیار کرو، اس کو مشکل نہ بناؤ اور لوگوں کے دلوں میں اس کی دہشت نہ پیدا کرو۔ آپ ان صحابہ کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کرتے جو نیکی کی زندگی کی خاطر عبادات اور معاشرت میں اپنے اوپر غیر ضروری پابندیاں عائد کرنا چاہتے۔ قرآن مجید میں آپ کی اس صفت کی تحسین کی گئی ہے کہ 'عَزِیْزٌ'' عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ' جو چیز تم لوگوں کے لیے مشقت کا باعث ہوتی ہے وہ پیغمبر کی طبع پر گراں گزرتی ہے۔

حضورؐ کی ایک نمایاں صفت آپ کی نرم خوئی اور نرمی پسندی تھی۔ حضرت عائشہؓ سے سوال کیا گیا کہ حضورؐ گھر کے اندر کس طرح رہتے تھے تو انہوں نے جواب دیا کہ جب آپ گھر میں ہوتے تو نہایت نرم گو، عفو و درگزر سے

کام لینے والے، گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے والے اور بدزبانی اور فحش گوئی سے پرہیز کرنے والے تھے۔ آپ نے کبھی اپنی کسی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ حضورؐ کی اس صفت کی تحسین کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ 'یہ اللہ کی رحمت سے ہوا کہ تم لوگوں کے حق میں نرم خو ہو۔ اگر تم درشت مزاج اور سنگ دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے بھاگ جاتے'۔ (آل عمران ۳:۱۲۹) آپ کی اسی خصوصیت کے باعث منافقین کا گروہ آپ کے ساتھ چمٹا رہا اور اہم مواقع پر دغا بھی دے جاتا رہا۔ بالآخر آپ کو حکم ہوا کہ منافقین کے ساتھ معاملہ کرنے میں اب نرمی کی روش ترک کردو اور درشتی سے کام لو۔ آپ کی نرم خوئی کے سلسلہ کی چند احادیث بھی پیش نظر ہونی چاہیں۔

- عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ نرمی اور ملائمت جس چیز میں بھی ہو اس کو زینت بخشتی ہے اور جس چیز میں سے نکال لی جائے اس کو بدصورت اور عیب دار بنا دیتی ہے۔
- عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نرمی کا معاملہ کرنے والا ہے اور نرم خوئی ہی کو پسند کرتا ہے۔ وہ نرمی کی روش پر وہ کچھ عطا کر دیتا ہے جو سختی پر یا نرمی کے علاوہ کسی اور چیز پر عطا نہیں کرتا۔
- جریرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: 'جو شخص نرم خوئی سے محروم کیا گیا وہ ہر بھلائی سے محروم کیا گیا'۔

حضورؐ معاشرہ کے حقوق کی تلقین فرماتے رہتے۔ دو حدیثیں ملاحظہ ہوں:

- انسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: 'اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم'۔ ایک آدمی نے سوال کیا: یا رسول اللہ! کسی کے مظلوم ہونے کی صورت میں تو میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ جب وہ ظالم ہو تو فرمایئے میں اس کی مدد کیسے کروں؟ آپ نے فرمایا: 'تم اس کے ظلم کرنے میں رکاوٹ پیدا کر دیا اس کو روکو۔ یہ اس کی مدد کرنا ہوگا'۔
- ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: جو شخص راہ ہدایت کی طرف بلاتا ہو تو اس کا اجر ان تمام لوگوں کے اجر کی مانند ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے جبکہ ان لوگوں کے اجر میں اس کے باعث کوئی کمی واقع نہیں ہوگی اور جو شخص کسی گمراہی کا داعی ہوگا تو اس پر ان تمام لوگوں کا گناہ ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے۔ جبکہ ان لوگوں کا اپنا گناہ اس کے باعث ذرا بھی کم نہ ہوگا۔

جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی عبادات، کفار سے معاملہ کرنے میں سختی اور مومنین کے ساتھ رحمت و شفقت کے اظہار کا تعلق ہے تو اس پر خود قرآن شاہد ہے۔ فرمایا:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۚ (فتح ۴۸:۲۹)

محمد، اللہ کے رسول، اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت، آپس میں رحم دل ہیں۔ تم ان کو اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں رکوع و سجود میں سرگرم پاؤ گے۔ ان کا امتیاز ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان سے ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کفار کے لیے ایک چٹان کی طرح مضبوط، بھاری، نا قابل شکست اور سخت تھے لیکن اہل ایمان کے لیے نہایت شفیق و مونس، نرم خو، ہر پہلو سے لچک قبول کرنے والے تھے۔ آپ کی زندگی کے شب و روز خدا کی رضا طلبی میں گزرتے۔ خالق کے ساتھ تعلق نہایت محکم و استوار تھا۔ سجدوں کے نشان آپ کے چہرہ مبارک پر نمایاں تھے۔ یہی صفات ان صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں بھی اپنا پورا اثر ظاہر کرتی تھیں جو حضورؐ کی تربیت میں تھے۔ ظاہر ہے کہ یہی صفات ہر صاحب ایمان کی زندگی میں نمایاں نظر آنی چاہئیں جو حضورؐ کا نام لیوا ہے۔

احادیث و روایات میں میدان جہاد میں رسول اللہؐ کی شجاعت و شہامت کے متعدد واقعات آئے ہیں۔ تینوں بڑی جنگوں ۔۔ غزوہ بدر، غزوہ احد اور غزوہ احزاب ۔۔ میں آپ نے نہایت مشکل حالات میں اپنی قیادت کا لوہا منوایا۔ کئی صحابہ راوی ہیں کہ آپ استقامت کا پہاڑ تھے اور دشمن کے دھاوا کے وقت ہم حضورؐ کی اوٹ لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ کئی بار مدینہ پر کفار کی کسی پارٹی کے حملہ کا خطرہ ہوا تو آپ تن تنہا شہر کے اردگرد چکر لگا کر مسلمانوں کو تسلی دیتے کہ وہ اطمینان سے رہیں، حملہ کا کوئی خطرہ نہیں۔

عبادات میں آپ کا انہماک تمام ساتھیوں سے بڑھ کر تھا۔ اگر کوئی باہمت شخص آپ کی پیروی کرنا چاہتا تو وہ اس میں مشکل محسوس کرتا اور حضورؐ خود اسے یہ کہہ کر روک دیتے کہ اپنے رب کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت مختلف ہے۔ تم لوگ میرا ساتھ دینے پر قادر نہیں ہو۔ راتوں میں اٹھ کر آپ اتنی عبادت کرتے کہ آپ کے پاؤں سوج جاتے۔ جب آپ سے کہا جاتا کہ آپ تو اللہ کے مقبول بندے اور رسول ہیں، پھر اپنے تئیں کیوں مشقت میں ڈالتے ہیں تو آپ فرماتے کہ کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

ہمارے ہاں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلق کی بنیادیں چونکہ لوگوں پر واضح نہیں اور نہ آپ کے مشن کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جاتی ہے اس لیے لوگ عید میلاد النبی منا کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہؐ کا امتی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ یہ اپنے آپ کو دھوکا میں مبتلا کرنے والی بات ہے۔ ہم نے باب 49 میں رسول اللہؐ کے

حقوق بیان کیے ہیں اور اس باب میں آپ کے پسندیدہ طرز زندگی کا ایک جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے آپ کو ایک مخلص و باوفا مسلمان ثابت کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ حضورؐ کا ایک ایک حق اس طرح ادا کیا جائے جیسا کہ اس کا تقاضا ہے۔ اسی طرح آپ کے قائم کردہ اعلیٰ عملی نمونہ کو اپنی زندگیوں میں، اپنے گھروں میں اور اپنے معاشرہ میں اختیار کیا جائے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ایمان و عمل کو اپنے بتائے ہوئے اصولوں پر جانچنا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ ہماری پسند اور ناپسند کیا تھی۔ وہ ہمارے عمل کو کسوٹی نہیں بنائے گا۔

رب کریم کی بے پایاں عنایت اور اس کی عطا کردہ توفیق سے یہ کتاب مکمل ہوئی ہے۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے اپنے رب کا شکر ادا کرسکوں۔ اس کی تائید و نصرت کے بغیر میرے جیسے کم علم آدمی کا اس کے عظیم پیغمبر کی حیات پر قلم اٹھانا بھی ناممکن تھا۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو شرف قبول عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا اَنِ الحمدُ لِلّٰہِ ربِّ العَالَمِین والصلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُولِہِ الکَرِیمِ محمدٍ الامینِ و عَلٰی اٰلِہٖ و صحبہٖ اجمعین۔

فہرست کتب

تالیفات امام حمید الدین فراہی (علیه الرحمة)

تالیفات مولانا امین احسن اصلاحی (علیه الرحمة)

جناب خالد مسعود کا تعلق ضلع جہلم کے قصبہ للّہ سے ہے۔ دنیاوی تعلیم میں پنجاب یونیورسٹی سے .M.Sc کی ڈگری حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے کنگز کالج لنڈن سے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ کیا۔ 1958 میں دینی تعلیم کے حصول کے لیے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا تلمذ اختیار کیا اور اگلے چالیس برسوں میں ان سے عربی ادب، تفسیر قرآن، اصول تفسیر، حدیث واصول حدیث وغیرہ علوم میں بھرپور استفادہ کیا۔ انہوں نے مولانا اصلاحیؒ اور ان کے استاذ امام فراہیؒ کی متعدد کتابوں کی ترتیب و تدوین کی، خصوصاً مولانا اصلاحیؒ کے موطا امام مالکؒ اور صحیح بخاریؒ کے دروس کو مدون کر کے تدبر حدیث کے نام سے شائع کیا اور ان کی تفسیر تدبر قرآن کی روشنی میں ان کے ترجمہ قرآن کے ساتھ تلخیص شائع کی۔ جناب خالد مسعود نے عربی سے اردو اور بعض سائنسی کتابوں کے انگریزی سے اردو تراجم کیے۔ انہوں نے دینی تعلیمات کی روشنی میں بچوں کے لیے چھ آسان کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی ادارت میں 1981ء سے ایک سہ ماہی علمی مجلہ ''تدبر'' شائع ... ''حیات رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم'' ان کی علمی ... میں نیا قابل قدر اضافہ ہے۔